یورپ نامہ

حصہ اول

ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ

حکیم محمد سعید دہلوی

یورپ نامہ

(جلد اوّل)

ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا، اور سوئزرلینڈ

کے

حالاتِ سفر

جو ان کے

تاریخی، جغرافیائی، علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی اور
طبّی حقائق کے پس منظر میں قلمبند کیے گئے ہیں

حکیم محمد سعید دہلوی

ہمدرد اکیڈمی
نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵

بار اوّل
جون ۱۹۶۰ء

قیمت
آٹھ روپے

تعداد
دو ہزار

اپنی آپا کے نام

سفر سے انھیں طبعاً مناسبت نہیں تھی، اس کے باوجود جو سفر انھوں نے کیے ان کا حال وہ بڑے مزے لے لے کر بیان کرتی تھیں اور ہم بڑے مزے سے سنا کرتے تھے۔ سنہ ۲۷ء میں انھوں نے سفر ارضِ قرآن کیا تو میں اُن کے ساتھ تھا۔ اس وقت میں کوئی سات سال کا تھا۔ وہ ہر موقع پر مجھے آگے رکھتیں۔ اس سفر کا حال جب وہ سناتیں، میں سب سے زیادہ دل چسپی لیتا۔ خود مجھے وہ حالات آج بھی اس طرح یاد ہیں جیسے وہ سفر میں نے ابھی کیا ہو۔ مجھے انھوں نے سفر سے کبھی منع نہیں کیا، سیاحت سے کبھی نہیں روکا، بلکہ ہمت افزائی کی۔

اگر مشیتِ ایزدی کا پاس نہ ہوتا تو موت کے اُن ظالم پنجوں کو میں جھلس دیتا جنھوں نے میری مشفق ماں کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اُن کی بے پناہ محبت اور شفقت اور اُن کی مسلسل اور اعلا تربیت سے مجھے محروم کر دیا۔ میں سنہ ۴۹ء میں روم (اٹلی) میں تھا کہ مجھے اُن کی شدید علالت کی اطلاع ملی، اور جب میں دہلی آگیا تو انھوں نے ایک ایسا سفر اختیار کرلیا کہ جس کا حال وہ نہیں سنا سکیں گی۔

فہرست



مصنّف

پیش لفظ

آخر برادرِ عزیز حکیم حافظ محمد سعید متولّی ہمدرد (وقف) پاکستان نے اپنی بے شمار فنی اور کاروباری مصروفیتوں میں اتنا وقت نکال ہی لیا کہ وہ اپنے روزنامچۂ سفر کو، جو وہ ہماری مغربی ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران میں بالالتزام لکھتے رہے تھے، نظرثانی اور تہذیب و ترتیب کے بعد کتابی صورت میں پیش کر سکیں۔ یورپ نامے کی پہلی جلد صرف ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئزرلینڈ کے حالاتِ سفر پر مشتمل ہے۔ اگر ان کے روزنامچے کی وسعت اور آمد کا یہی حال رہا تو مغربی جرمنی، ہالینڈ، برطانیہ، فرانس، اسپین، یونان اور اٹلی بلکہ آخر میں دارالسّلطنت ایران کے مختصر قیام کی سیاحت کے حالات ایسی ایسی کئی جلدوں میں آسکیں گے اور اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے وہ ممتاز ہوں گے۔

اسلام و ترغیب سیر اور مسلمان اور سفر و سیاحت کے عنوانات پر اظہارِ خیال کا یہاں موقع نہیں لیکن جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، اس میں سفرناموں کی ابتدا دوسرے ممالک کے سیّاحوں کے سفرناموں کے ترجموں سے ہوئی ہے اور ان میں ابن بطوطہ کے عجائب الاسفار اور وقائع سیاحتِ برنیر کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اگر ہند کے مختلف حصّوں اور مقاماتِ مقدسہ کے حج و زیارت ناموں سے قطع نظر کی جائے تو ہماری زبان میں دیگر ممالکِ عالم کے حالاتِ سیاحت، یا کسی علمی اور مقصدی سیاحت کی تفصیلات کا وجود نہ ہونے کے برابر ہی ہوگا۔

سرسیدؒ کا سفرنامۂ انگلستان، علامہ شبلی کا سفرنامۂ روم و مصر و شام، خواجہ حسن نظامی کا سفرنامۂ حجاز و مصر و شام، محمد حسین آزاد کا سیرِ ایران، قاضی عبدالغفار کا نقش فرنگ، راس مسعود کا جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق، خواجہ احمد عباس کا مسافر کی ڈائری، نازلی رفیعہ سلطان نواب بیگم کا سیرِ یورپ اور سید سلیمان ندوی کا سیرِ افغانستان وغیرہ چند ممتاز سیاحت نامے نہ ہوں تو ہم کو اپنی زبان کے افلاس کا خیال اور ستانے لگے گا۔ ان حالات میں یورپ نامے کا منظرِ عام پر آنا باعثِ اطمینان اور ایک کمی کو پورا کرنے والا ہے۔

ہم دونوں بھائیوں میں جہاں اور بہت سی باتیں مشترک ہیں، وہاں سیر و سیاحت کا ذوق و شوق بھی ہم کو ساتھ ساتھ ملا ہے۔ البتہ اس کی کیفیت و کمیت میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس اختلاف کو متعین اور واضح کرنے کا موقع ہمیں اب تک نہیں ملا ہے۔ بچپن کی وہ یاد ہیں

اب بھی میرے دل کو گرماتی ہیں جب کہ میں گلستاں و بوستاں، دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم بغیر ان کا مطلب سمجھے سبقاً سبقاً پڑھتا تھا اور سعدی، حافظ اور مولانا روم کے دیار میں عقیدتمندی کے ساتھ آپ کو حاضر پاتا تھا اور اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتا تھا جب میں ایران اور ترکی کا مسافر ہوں گا۔ یا بقراط، ارسطو، جالینوس اور بو علی سینا اور ابن رشد اور امام غزالی کے سوانح پڑھتے پڑھتے یونان، ایران، اسپین اور عراق وغیرہ کے لیے رختِ سفر باندھ لینے اور سب علائق کو چھوڑ چھاڑ دینے کو دل چاہتا تھا، اور انگلستان، جرمنی، امریکا، روس اور چین کے حالات پڑھتے ہوئے اور ان کے مصنفوں اور ادیبوں کی کتابیں دیکھتے ہوئے ان ملکوں کی سیاحت مقصد عزیز بن جاتی تھی اور جب کہ ایک لدے پھندے ہشاش بشاش ٹپیکل مسافر کی ایک تصویر شوقِ سفر کا سہارا بنی رہتی تھی اور جب میرا یہ قول سب ہی کو معلوم تھا کہ چالیس سال تک "دنیاداری" کر کے بیس سال تک دنیا کا سفر کروں گا اور پھر وطن واپس آکر بقیہ عمر تصنیف و تالیف اور خدمتِ انسانی میں بسر کر دوں گا۔ کتنا معقول اور صاف ستھرا پروگرام تھا زندگی کا، جس میں کسی کی بھی حق تلفی اور کسی فرض سے چشم پوشی کا پہلو نہیں نکلتا تھا، لیکن وہ خدا کو منظور نہ ہوا اور اس نے اپنی مرضی سے جو چاہا کر دیا اور جیسی بھی ترمیمیں اس نے اس پروگرام میں کر دیں، وہ اب نافذ ہیں۔ ان ترمیموں کی رو سے میرا عزم و قصدِ سفر ختم نہیں ہوا ہے۔ سفر میں اب بھی کرتا رہتا ہوں اور جہاں تک بیرونی ممالک کا تعلق ہے ہم دونوں بھائی تقریباً آدھی دنیا اب تک دیکھ بھی چکے ہیں اور باقی دنیا بھی انشاء اللہ دیکھ لیں گے۔ بلکہ ممکن ہے دنیا کے علاوہ اور کسی سیارے کا سفر بھی کر لیں، لیکن جہاں تک میرے ذوقِ سیاحت کا تعلق ہے وہ صبا رفتار موٹروں، سو میل فی گھنٹہ چلنے والی ریلوں اور سینکڑوں میل فی گھنٹہ اڑنے والے ہوائی جہازوں سے تسکین نہیں پاتا۔ یورپ کے تین ماہہ سفر میں ہمیں یاد نہیں کہ ہم ایک دن کے لیے بھی اپنی قیام گاہ یا ہوٹل میں ستائے ہوں۔ صبح سے شام تک پروگرام کے ایک ایک جزو پر عمل ہوتا تھا اور دوسرے "مسافروں" کی طرح عیش و آرام ہمارا مقصد کبھی نہیں رہا اور نہ غالباً ہو سکتا ہے لیکن حقیقی مسافرت کا وہ لطف جو کم سے کم میرے جذبۂ سفر کی تسکین کا باعث ہو، وہ حقیقتاً حاصل نہیں ہوا۔ برادرِ عزیز کی قلبی حالت تو ان کی شب و روز کی مصروفیتوں کے نتیجے میں ایسی نہیں رہی ہے کہ وہ خالص جسمانی مشقت کے کام جیسے پہاڑوں پر چڑھنا اور چلنا، مناروں کی اترائی چڑھائی اور کودنا پھاندنا، مسلسل پیدل چلنا، کر سکیں، لیکن مجھ میں باوجود "پیرانہ سالی" کے اتنی سکت اب بھی ہے کہ حقیقی مسافرت

کے یہ کام کچھ نہ کچھ کرسکتا ہوں، لیکن جس طرح وہ جوش سفر جو ۱۹۳۹ء میں شملہ سے مسوری تک کے پیدل پہاڑی سفر میں تھا، وہ اب عمر کے تقاضے سے بہر حال کم ہے، اسی طرح آدھی دنیا کے بقیہ سفروں میں موجودہ سکت بھی فطرتاً کم ہو جائے گی، لیکن ابن بطوطہ، سعدی، واسکوڈی گاما اور ہیوانگ ٹسانگ کی سیاحتیں میرے لیے آخر تک رشک وحسرت کا سبب بنی رہیں گی اور آج کل کی "جہاں پیمائی" سے عدم سکون کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

ہم دونوں بھائیوں کے سفر و سیاحت کے ان نظریات کے پیش نظر یورپ نامے کے ناظرین جب یہ حالات سفر پڑھیں گے تو وہ ان کو آجکل کے سیاحت ناموں سے ذرا مختلف پائیں گے۔

مغربی ملکوں کا یہ سفر ہمارے اور سفروں سے زیادہ مطالعاتی اور مقصدی تھا۔ اس کا اندازہ ان مقاصد سے کیا جاسکتا ہے جو ہمارے سامنے تھے، اور وہ یہ تھے:

(۱) دواسازی کے کارخانوں کو دیکھنا۔
(۲) دواسازی کی مشینری بنانے والی فرموں سے تعلقات پیدا کرنا۔
(۳) فارمیسی کالجوں کو دیکھنا۔
(۴) تاریخ طب کے اداروں کا معائنہ، ان کے کارناموں کا مطالعہ اور ان کا لٹریچر حاصل کرنا۔
(۵) قدرتی علاج کے اداروں کو دیکھنا اور سمجھنا۔
(۶) نفسیاتی علاج کے کلینک دیکھنا۔
(۷) لائبریریوں اور کتب فروشوں سے قدیم طبی کتابوں کی فہرستیں حاصل کرنا۔
(۸) عوامی صحت کے اداروں کی معلومات حاصل کرنا۔
(۹) صحت اطفال کے مراکز کو دیکھنا اور ان کے طریقۂ عمل کو سمجھنا۔
(۱۰) اسلامی مطالعے اور تحقیق کے مرکزوں کو جہاں یہ موجود ہیں، دیکھنا۔

مقاصد سفر کی اس لمبی فہرست سے ہی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ سفر متنوع مقاصد کے لیے تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فنی خدمت کے کون کون سے پہلو تھے جو ہمارے پیش نظر تھے اور ان کا احاطہ کس قدر وسیع تھا اور وہ ہماری آئندہ فنی خدمتوں کے لائحۂ عمل کی نشان دہی کرتے تھے۔ اور سفر کے بعد گزشتہ تین سال میں جو خدمتِ فن ہم سے ہوسکی اس کا تعلق اس سفر سے کتنا رہا ہے اور آئندہ بھی ہم سے جو کچھ بن پڑے گا اس کا تعلق ہمارے سفر و سیاحت سے کتنا ہوگا۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے بھی سفر کے اس موقع سے مال غنیمت کی

طرح فائدہ اٹھایا اور دوران سفر میں ہمیں رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ دن اتنا چھوٹا کیوں ہوگیا ہے اور یہ کہ دفتروں اور کارخانوں اور اداروں کے اوقات دن کے چھ سات گھنٹے تک کیوں محدود ہیں! ہمارے شام... رات کے اکثر اوقات عوام کے حالات کے مطالعہ، شہری زندگی سے واقفیت حاصل کرنے یا لوگوں سے ملنے جلنے یا ایسے مذہبی اور تہذیبی اداروں کو دیکھنے پر صرف ہوتے تھے جو ان اوقات میں کھلے رہتے تھے۔ رات کو ہم اپنی قیام گاہوں پر ہوتے تھے اور اپنے اپنے متعلقہ کاموں میں لگ جاتے تھے۔ برادر عزیز اپنا روزنامچہ لکھتے تھے اور ان کو اس میں اتنا شغف ہوگیا تھا جو کبھی کبھی ہم پر گراں گزرتا تھا۔ میں دوسرے دن کا پروگرام بناتا تھا اور وقت کے لحاظ سے مشاغل کی کتر بیونت کرکے ان کو آخری شکل دیتا تھا یا مطالعہ کرتا تھا اور ہمارے دوسرے عزیز ساتھی سید برکات احمد صاحب، جو ہمارے اکثر سفروں میں حق رفاقت ادا کرتے رہے ہیں، سفر کے عمل، کاموں اور انتظامات کی دیکھ بھال میں اور سفری زندگی کی اونچ نیچ کو سنبھالنے کی تدبیروں میں لگ جاتے تھے۔ اس طرح ہم تینوں کے فرائض تقسیم شدہ تھے اور پارٹی کا تمام سفر ہمواری کے ساتھ پورا ہوتا تھا۔

سفر کے لوازم کا ہم عموماً خیال رکھتے ہیں۔ اکثر سفر چونکہ فضائی ہوتے ہیں، اس لیے ذاتی ضروریات کو کم سے کم کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور اس میں ہماری خاص طبیعتوں کی وجہ سے کامیابی بھی ہو جاتی ہے، لیکن جن چیزوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان ملکوں کے متعلق معلوماتی مواد ہے جہاں کا ہم سفر کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے اس سفر میں بھی ہم نے اپنے اپنے کتب خانوں اور فائلوں سے اتنا مواد جمع کر لیا تھا جو سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ ہم اس مواد میں حتی الامکان بڑا سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمیں وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے جب ہم نے اپنے جنوب مشرقی ایشیا کے سفر کے لیے ایک خاص قسم کی الماری اپنی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بنوائی تھی، جس میں کتابیں، رسالے فائل، پیڈ اور لکھنے پڑھنے کے دوسرے سامان کو قرینے سے جمع کیا گیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری یہ "جدت" ہمیں راس نہیں آئی اور سفر کے پہلے ہی مرحلے پر ہمیں اس الماری کو خیر باد کہنا پڑا۔ یورپ کے اس سفر میں بھی متعلقہ ملکوں کے بارے میں کثرت سے مواد موجود تھا۔ ہر ملک کا ایک ایک مستقل فائل تھا جس میں مختلف معلومات کے تراشے علیحدہ علیحدہ عنوانوں سے لگے ہوئے تھے اور معلوماتی کتابوں اور لٹریچر کا تو اتنا ذخیرہ ہوگیا تھا کہ اس کی ایک بار چھٹائی کراچی میں ہوئی، اس کے بعد انقرہ میں اس بوجھ کو کم کیا گیا اور پھر بون میں مہذب

انسانوں کا سا بوجھ ہمارے پاس رہ گیا تھا۔ یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ انسان کو سفر کرنے کا سلیقہ بھی آتے آتے آتا ہے اور سیّاح بننا بھی کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔

ہم دونوں جس علم و فن سے تعلق رکھتے ہیں وہ طب ہے۔ طب اور سیاحت ہماری تاریخ میں لازم و ملزوم رہے ہیں۔ فن تاریخ اور عام کتب تاریخ ہمیں بتاتی ہیں کہ ہمارے اطبّاء اور اصحابِ فن کس طرح سیاحت کے شائق تھے۔ رازی سفر کا بہت دلدادہ تھا۔ ابن البیطار نے نباتات کی معلومات کے لیے بیسیوں سال سفر میں گزارے۔ غافقی اور زہراوی نے اپنے سفروں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ابن سینا کو مجبوری کے سفروں نے جامع کمالات بننے میں مدد دی اور خود ہمارے زمانے میں مسیح الملک کے فنی کارنامے بڑی حد تک سفر اور تجربات و سیاحت کے مرہون تھے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ دنیا کے نشیب و فراز کے سمجھنے میں سفر اہم کردار ادا کرتا ہے اور طب جیسے موضوع کے حاملین کے لیے، جو بیک وقت سائنس اور آرٹ کے جامع ہوتے ہیں، سیاحت پختگی کے لیے ناگزیر ہے۔ یورپ نامے کے مصنف کی حیثیت بھی متنوع ہے۔ وہ بیک وقت طبیب بھی ہیں، کاروباری بھی ہیں، منتظم بھی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ شائقِ سفر بھی ہیں اور سیاحت میں بھی کافی تجربات رکھتے ہیں۔ ان کے اس سفر نامے میں ظاہر ہے کہ صرف ہم پیشہ اصحاب ہی کے لیے مفید اور کار آمد مواد موجود نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایسا بھی ہوگا جو دوسرے شائقین کے ذوق و طلب کی تسکین کا باعث ہوگا۔

جہاں تک فن طب اور علاج اور اس کے مختلف شعبوں کا تعلق ہے، ان کی تفصیلات تو اس سفر نامے میں بھی موجود ہیں اور مقاصد سفر میں اور جن عنوانات کا ذکر ہے، ان میں سے بہت سے عنوانات پر معلومات سفر نامے کے اس حصے میں بھی ناظرین کو ملیں گی اور بقیہ عنوانات پر معلومات اس کے دوسرے حصوں میں آئیں گی، کیونکہ بعض عنوانات کا تعلق بعض خاص ملکوں سے ہے اور ان کا ذکر ان ہی ملکوں کے سفر نامہ میں آسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یورپ نامے کے دوسرے حصے بھی مرتب ہو گئے تو ہمارے مقصد سفر کے سب ہی عنوانات پر شائقین کو مناسب اور ضروری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

فن طب اور علاج کے علاوہ ہم کو فنون لطیفہ سے بھی دل چسپی تھی، چناں چہ مصوری، سنگ تراشی اور آرٹ کے دوسرے اہم نمونوں میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کو ہم نے وقت نکال کر نہ دیکھ لیا ہو۔ طبیعت کے مذہبی رجحان کی بنا پر معابد، گرجا گھر اور خانقاہیں وغیرہ

تو اس سفر میں اتنی دیکھی گئی ہیں کہ ان سے آخر میں طبیعت واقعی سیر ہو گئی تھی۔ تعلیمات سے دل چسپی نے سیاحوں کو کئی یونیورسٹیوں میں بھی پہنچایا، جن کی تفصیلات آپ کو اپنی اپنی جگہ اِس سفرنامے میں ملیں گی۔

یورپ نامے کی ایک اہم خصوصیت جو نمایاں ہے وہ سیاح کی اسلامیت ہے، جس نے اکثر موقعوں پر مختلف صورتوں میں ظہور کیا ہے۔ مقاصدِ سفر کا ایک عنوان اسلامی مُطالعہ اور تحقیق کے مرکزوں کو دیکھنا بھی شامل تھا۔ ترتیب میں گو یہ آخر میں تھا لیکن سیاحوں کے دل سے جتنا قریب تھا، وہ حالاتِ سفر سے ناظرین پر ظاہر ہوگا۔ اس عنوان پر بھی یورپ میں جو اہم ادارے تھے، اِن میں سے اکثر ہم نے دیکھے ہیں اور یورپ نامے میں ان کی تفصیل ناظرین کو ملے گی۔

معلوماتِ عامہ کے باب میں بھی یورپ نامہ دل چسپ ہے "سائٹ سینگ" کے نتیجہ کے طور پر ان کو دل چسپ ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہونا چاہیے۔ مسافروں نے "سائٹ سینگ" کا حق بھی جہاں تک ان سے ہو سکا ہے، ادا کیا ہے۔

یورپ نامہ روزنامچے کے طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ سفر کے حالات کے بیان میں غالباً یہی طرز موزوں ترین ہے۔ اکثر سیاحت ناموں میں یہی طرز اختیار کیا گیا ہے جو پڑھنے والے کی نفسیات سے مطابق ہوتا ہے، البتہ مناسب موقعوں پر تاریخی اور سوانحی اضافات اور کہیں کہیں معاشرتی تفصیلات نے اس سفرنامے کو متعلقہ ملکوں اور ان کے باشندوں کے پس منظر کو سمجھنے میں بڑی مدد دی ہے۔

جہاں تک یورپ نامے کی زبان کا تعلق ہے وہ بامحاورہ اور سلیس ہے۔ کیوں نہ ہو، حکیم حافظ حاجی محمد سعید آخر دہلوی ہیں اور دہلویت ختم ہوتے ہوتے بھی دہلویوں میں اپنا اثر و نفوذ قائم رکھتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یورپ نامہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے مقبول ہوگا اور سیاح کے پیش نظر جو مقاصد اس کی تالیف کے ہیں، وہ باحسن وجوہ پورے ہوں گے۔

حکیم، عبدالحمید

دہلی
۱۵ اپریل ۱۹۶۰ء



میرے بھائی جان محترم
(حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی)

راہ نامہ

سفرِ یورپ سنہ ۱۹۵۶ء

حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی • حکیم حافظ محمد سعید دہلوی

بھائی جان محترم جناب حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی کی دُور رس تحریک تھی اور میری پُرخلوص تائید کہ یورپ کے چند ترقی یافتہ ملکوں کے سفر کا منصوبہ عمل میں آ گیا۔ وہ دہلی میں تھے اور میں کراچی میں تھا، لہٰذا مراسلات، تار اور ٹیلی فون پر گفتگو کے ذریعے سے بنیادی امور طے ہو گئے اور تفصیلاتِ سفر تکمیل کو پہنچ گئیں۔ رختِ سفر بندھا اور آغازِ سفر ہو گیا۔

اس وقت حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ مجھے حالاتِ سفر قلمبند کرنے ہوں گے لیکن روزِ اول جب میں نے بھائی جان محترم کو پروگرام کی فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے ہر ہر شق کی جانچ پڑتال کرتے دیکھا تو معاً خیال آیا کہ کیوں نہ میں حالاتِ سفر کو قلم بند کرتا رہوں، شاید وہ کوئی مفید مطلب پورا کر سکیں۔ یہ ایک فالِ نیک تھی۔ فرصت کے لمحات میں ہر مقام کے تاریخی، جغرافیائی، علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی اور طبی حقائق کا مطالعہ بھی جاری رہا، جو حالاتِ سفر کا پس منظر بن گیا۔

ظاہر ہے کہ رواروی میں بعض باتیں اجمالی طور پر لکھی گئیں اور تشنہ رہ گئیں۔ ان سب کو اطمینان سے بیٹھ کر سلیقے سے مرتب کیا تو کافی وقت لگا اور سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا، کُل ضخامت کئی ہزار صفحات تک پہنچ گئی۔

اس لیے فیصلہ کرنا پڑا کہ اس دفترِ طویل کو ایک سے زیادہ جلدوں میں شائع کیا جائے اور جس ترتیب سے سیاحت کی گئی ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلی قسط کو صرف ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئزرلینڈ تک محدود کر دیا جائے۔ یہ جلد ہدیۂ قارئین ہے۔ باقی کا سلسلہ جاری ہے۔

ذیل میں "راہ نامہ" کی تفصیل درج ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم نے آغازِ سفر سے پہلے راہیں کس طرح متعین کی تھیں۔ اس کے علاوہ ان ممالک میں جو جو کام ہمیں کرنے تھے وہ سفر سے پہلے ہی طے کر لیے گئے تھے اور ان ممالک میں وہاں کے اشخاص، تعلیمی اداروں، طبی اداروں اور

دوا ساز کمپنیوں وغیرہ سے رابطہ قائم کرلیا گیا تھا۔ (محمد سعید)

۲۰ر اگست	روانگی از دہلی (پالم)	ایک بجکر ۴۵ منٹ (سہ پہر)	پی۔ آئی۔ اے۔ ۲۰۵
پیر	آمد کراچی	۵ بج کر ۴۵ منٹ	
۲۲ر اگست	روانگی از کراچی	۵ بج کر ۱۵ منٹ صبح	پی۔ اے۔ اے ۱
بدھ	آمد بیروت	۱۱ بجے صبح	ایم۔ ای۔ اے ۲۴۱
	روانگی از بیروت	ڈیڑھ بجے دن	
	آمد انقرہ	۳ بج کر ۳۰ منٹ	
۳۰ر اگست	روانگی از استنبول	۸ بجے صبح	جے۔ اے۔ ٹی ۴۲۱
جمعرات	آمد (براہ سکوپیے) بلغراد	۱۲ بج کر ۱۵ منٹ	

(ہوٹل مجسٹک)

یکم ستمبر	روانگی از بلغراد	۱۲ بج کر ۵۴ منٹ دن	جے۔ اے۔ ٹی ۳۵۴
ہفتہ	آمد ویانا (آسٹریا)	۲ بج کر ۵۴ منٹ "	

(ہوٹل ڈی فرانس)

۷ر ستمبر	روانگی از ویانا (ویسٹ اسٹیشن)	۹ بج کر ۱۰ منٹ صبح	بذریعہ ریل
جمعہ	آمد زیورخ (مین اسٹیشن)	۱۰ بج کر ۲۳ منٹ شب	

(ہوٹل سیوائے)

۹ر ستمبر	روانگی از زیورخ (مین اسٹیشن)	۱۰ بج کر ۵۳ منٹ	بذریعہ ریل
اتوار	آمد لیوسرن	۱۱ بج کر ۳۸ منٹ	

(ہوٹل مونتانا)

۱۰ر ستمبر	روانگی از لیوسرن	۱ بج کر ۴۳ منٹ	بذریعہ ریل
پیر	آمد انٹرلاکن (ایسٹ اسٹیشن)	۲ بج کر ۴۳ منٹ	

(ہوٹل بیلویدیر)

۱۱ر ستمبر	روانگی از انٹرلاکن (ویسٹ اسٹیشن)	۹ بج کر ۸ منٹ صبح	بذریعہ ریل
منگل	آمد زوائسی مین	۱۰ بج کر ۱۰ منٹ	
	روانگی از زوائسی مین (تبدیلی ریل)	۱۰ بج کر ۱۶ منٹ	
	آمد مونٹرو	۱۲ بج کر ۲ منٹ	

(یہاں سے ریل چھوڑ کر پانی کے جہاز میں تبدیلی)

	روانگی از مونٹرو	ایک بج کر ۵۵ منٹ } شام	اسٹیمر
	آمد جنیوا	۶ بج کر ۱۳ منٹ	

(ہوٹل ڈیورھوین)

۱۵ر ستمبر	روانگی از جنیوا	۱۱ بجے صبح	بذریعہ ریل
ہفتہ	آمد برن	ایک بج کر ۱۳ منٹ سہ پہر	

(ہوٹل برسٹل)

۱۶ر ستمبر	روانگی از برن	۷ بج کر ۱۰ منٹ شام	بذریعہ ریل

اتوار	آمد بازل (ساؤتھ سٹیشن)	۸ بجکر ۴۶ منٹ شب	
	(ہوٹل شوائزرہاف)		
۱۸ر ستمبر	روانگی از بازل (ساؤتھ سٹیشن)	۱۰ بجکر ۱۵ منٹ	بذریعہ ریل
منگل	آمد ہائڈل برگ (جرمنی)	۱ بجکر ۵۸ منٹ	
	(ہوٹل بائنشرہاف)		
۲۰ر ستمبر	روانگی از ہائڈل برگ	۸ بج کر ۳۴ منٹ	بذریعہ ریل
جمعرات	آمد ڈامسٹاٹ	۹ بج کر ۱۹ منٹ	
	(ای مرک کی فیکٹری میں)		
	روانگی از ڈامسٹاٹ	۷ بج کر ۸ منٹ شام	بذریعہ ریل
	آمد فرینکفرٹ	۷ بج کر ۳۵ منٹ شام	
	(ہوٹل سیولئے)		
۲۲ر ستمبر	روانگی از فرینکفرٹ	۷ بج کر ۱۴ منٹ	بذریعہ ریل
اتوار	آمد ویزباڈن	۸ بج کر ۸ منٹ	
	(ویزباڈن سے اسٹیمر میں سواری)		
	روانگی از ویزباڈن	۹ بج کر ۵ منٹ صبح	بذریعہ اسٹیمر
	آمد بون	۴ بج کر ۲۵ منٹ شام	
	(ہوٹل اسٹرن)		
۲۶ر ستمبر	روانگی از بون	۹ بج کر ۱۰ منٹ صبح	بذریعہ ریل
بدھ	آمد کولون	۹ بج کر ۳۴ منٹ صبح	
	(ہوٹل ایکسیلشر ارنسٹ)		
۲۷ر ستمبر	روانگی از کولون	۹ بج کر ۳۶ منٹ صبح	بذریعہ ریل
جمعرات	آمد ڈسلڈورف	۱۰ بج کر ۶ منٹ صبح	
	(ہوٹل ایڈن)		
۲۸ر ستمبر	روانگی از ڈسلڈورف	۱۰ بج کر ۲۵ منٹ	اے۔ ایف (ائرفرانس)
جمعہ	آمد ہمبرگ	۱۱ بج کر ۳۰ منٹ	نمبر ۵۴۷
	روانگی از ہیمبرگ	ایک بجے دن	پی۔ اے۔ اے ۱۹۲
	آمد برلن	۲ بج کر ۱۰ منٹ	
	(ہوٹل کم پینسکی)		
یکم اکتوبر	روانگی از برلن	۶ بجے شام	پی۔ اے۔ اے ۱۹۳
پیر	آمد ہیمبرگ	۷ بج کر ۱۵ منٹ شام	
	(ہوٹل یورپائشرہاف)		
۳ر اکتوبر	روانگی از برلن	۱۲ بج کر ۱۵ منٹ دن	کے۔ ایل۔ ایم
بدھ	آمد ایمسٹرڈم (ہالینڈ)	۱ بج کر ۴۰ منٹ دن	
	(ہوٹل کراسنا پولسکی)		
۶ر اکتوبر	روانگی از ایمسٹرڈم	۹ بجکر ۴۵ منٹ صبح	بی۔ ای۔ اے ۴۲۵

ہفتہ	آمد لندن (انگلینڈ)	۱۱ بجے دن	
	(اتھینیم کورٹ ہوٹل)		
۱۹ اکتوبر	روانگی از لندن (وکٹوریا اسٹیشن)	۲ بجے دن	گولڈن ایرو
جمعہ	آمد پیرس (فرانس)	۹ بج کر ۴۰ منٹ شب	بذریعہ اسٹیمر
	(ہوٹل لوا)		
۲۲ اکتوبر	روانگی از پیرس	۱ بجکر ۴۰ منٹ دن	اے۔ایف (ائیر فرانس)
پیر	آمد میڈرڈ (اسپین)	۴ بجکر ۳۵ منٹ سہ پہر	نمبر ۳۱۵
	(ہوٹل پلازا)		
۲۵-۲۴ اکتوبر	روانگی از میڈرڈ (اتوشا اسٹیشن)	۸ بج کر ۳۰ منٹ شب	
بدھ جمعرات	آمد غرناطہ	۹ بج کر ۴۰ منٹ صبح	
	(ہوٹل الحمرا پیلیس)		
۲۹ اکتوبر	روانگی از غرناطہ	۸ بجے صبح	
پیر	آمد ولنشیا	۹ بجکر ۳۰ منٹ شب	
	تبدیلی ٹرین		
	روانگی از ولنشیا	۱۱ بجے شب	
	آمد بارسیلونا	۸ بجے صبح	
۳۰ اکتوبر	روانگی از بارسیلونا	۲ بج کر ۳۵ منٹ دن	ایل۔اے۔آئی
منگل	آمد میلان (اٹلی)	۶ بجے شام	۴۲۶
	(ہوٹل ڈیانا)		
یکم نومبر	روانگی از میلان	۸ بجکر ۲۲ منٹ صبح	ریل
جمعرات	آمد وینس	۱۲ بجکر ۲۰ منٹ شام	
	(ہوٹل لونا)		
۳ نومبر	روانگی از وینس	۱۱ بجے صبح	ریل
ہفتہ	آمد فلورنس	ایک بجکر ۲۵ منٹ سہ پہر	
	(ہوٹل باغ لیونی پیلیس)		
۵ نومبر	روانگی از فلورنس	۸ بجکر ۱۵ منٹ صبح	بس
پیر	آمد روم	۷ بجکر ۵ منٹ شام	
	(ہوٹل سان جارجیو)		
۹ نومبر	روانگی از روم	ایک بجے دن	بی۔ای۔اے ۱۲۴
جمعہ	آمد ایتھنز (یونان)	۴ بجکر ۵۰ منٹ شام	
	(ہوٹل گرانڈے برٹین)		
۱۳ نومبر	روانگی از ایتھنز	۱۰ بجکر ۱۰ منٹ صبح	بی۔ای۔اے ۱۲۲
منگل	آمد استنبول	۱۱ بجکر ۴۵ منٹ صبح	
۱۴ نومبر	روانگی از استنبول	۵ بجکر ۴۵ منٹ شام	پی۔آئی۔اے ۲
بدھ	آمد کراچی	۱۰ بجکر ۱۵ منٹ صبح	

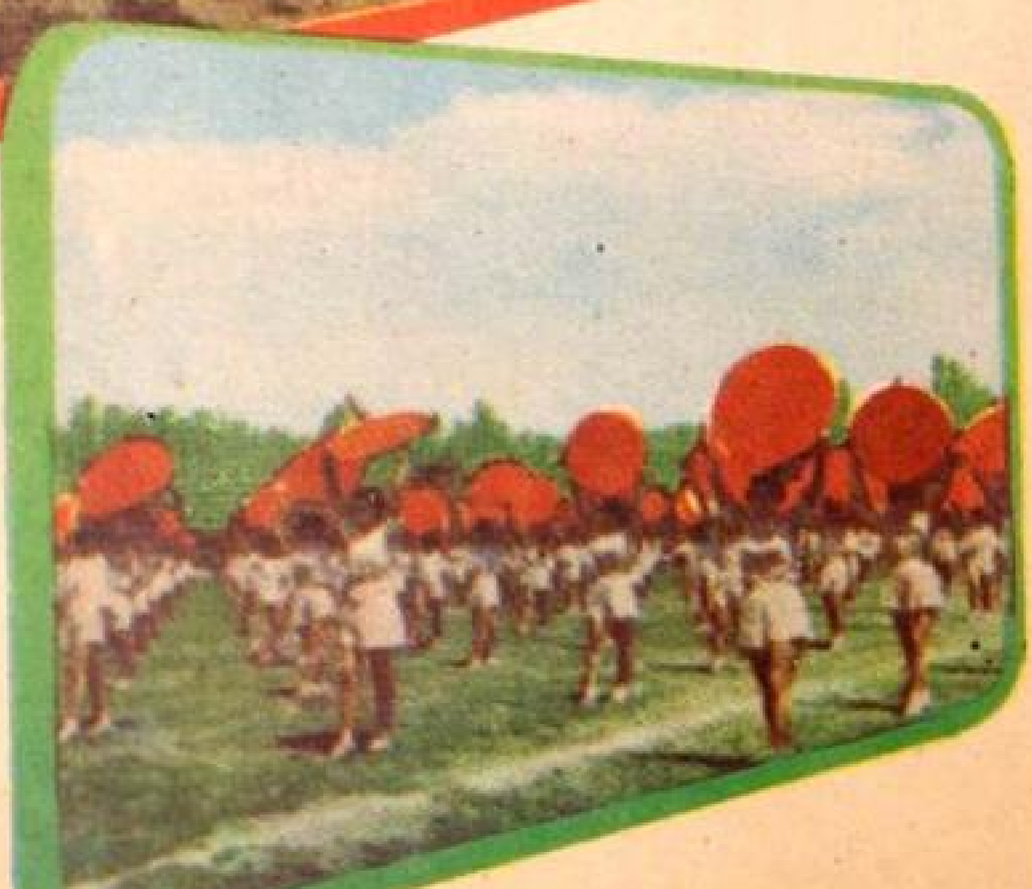


"اگر مرنے کے
بعد صرف ایک لمحے
کے لئے دوبارہ زندہ
ہونے کا موقع ملے





تو وہ ایک لمحہ
صرف سرزمین ترکی
پر گذارنے کے لئے
وقف کر دیا جائے"۔
لافونتین



ترکی

یورپ کی بساطِ سیاست

پر

ایشیا کا زبردست مہرہ

"خدا نے اور انسان نے،
قدرتی صلاحیت اور فنی کمالات نے،
مِل جُل کر ترکی کی صورت میں
ایک ایسا دل کش قطعۂ ارض تخلیق کیا ہے
جو چشمِ بصیرت کو روئے ارض پر
کِسی اور جگہ نظر نہیں آسکتا۔"

لامارٹائن

۲۲ر اگست سنہ ۱۹۵۶ء ــــــــ [illegible]

کراچی سے انقرہ

زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا کہ میں اور بھائی جان محترم ایک طویل سفر پر تقریباً تین ماہ کی مدت کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ ورنہ "ملّا کی دوڑ مسجد تک" کے مصداق یہ تو اکثر ہوا ہے کہ وہ اور میں کبھی مل کر دہلی سے کراچی آ گئے یا کراچی سے دہلی چلے گئے اور تقسیمِ برصغیر سے قبل کبھی دہلی سے قطب صاحب یا سلطان غازی تک چلے گئے۔ ہم دونوں بھائیوں نے ریل کے سفر بھی ایک ساتھ بہت کم کیے ہیں۔ آزادیٔ ملک سے پہلے ہم پر کچھ ایسی ذمہ داریاں عائد تھیں کہ دونوں کے لیے ایک وقت میں کام کاج کو کسی اور کے سپرد کر کے چلا جانا مشکل ہی سے ممکن ہوتا تھا۔ اس لیے وہ جاتے تو مَیں وطن میں رہتا اور مَیں جاتا تو وہ رہتے۔

سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد سے وہ ذمہ داریاں جو الگ الگ ہم پر عائد تھیں، جمع ہو کر برابر مسلط ہو گئیں۔ اس لیے طویل مدت کے لیے دواخانے یا مطب سے غیر حاضر رہنا ایک مرحلہ بن گیا تھا۔ لیکن اس سفر کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ہمارا ایک ساتھ جانا ضروری تھا۔ فنِ دواسازی میں نئی راہیں تلاش کرنا، ایسے اداروں کا دیکھنا جو تحقیق (ریسرچ) کا کام کر رہے ہیں، اور ایسی انجمنوں اور انسٹی ٹیوشنوں کے کاموں کا مطالعہ جو طب و سائنس کے میدان میں شب و روز مصروف ہیں۔ یہ کام ہم دونوں بھائی ساتھ مل کر ہی زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے تھے۔ اور پھر بھائی جان محترم بذاتِ خود ایک انسٹی ٹیوشن ہیں۔ ان کے ساتھ تین ماہ رہنا ہی بڑی خوش قسمتی ہے۔

منزل نہیں، منازلِ مقصود دور دور تھیں اور پہلے سے جو فہرستِ سفر تیار کی تھی، اس میں ہمارے اوقاتِ شام و سحر اس درجہ مصروفیات سے لبریز تھے کہ فرصت کا کوئی لمحہ ان

میں نظر نہ آتا تھا۔ ہر بڑے سے بڑے شہر کے لیے چند ہی دن مخصوص کیے گئے تھے۔ اور چونکہ پہلے سے فہرستِ سفر بھیج کر سب کو اپنی آمد و روانگی سے مطلع کر دیا گیا تھا، اس لیے پروگرام پر سختی سے عمل کرنا بھی ضروری تھا۔ ورنہ یہ اندیشہ تھا کہ ذرا کہیں جھول پیدا ہوا اور کام بگڑا اور ایک دفعہ بگڑا تو پھر بگڑتا ہی چلا گیا۔ ہمارے پروگرام میں بہت سے لوگوں سے ملنا جلنا، بہت سی چیزوں کو دیکھنا بھالنا اور طب و ادویہ کے سلسلے میں صلاح و مشورے کرنا شامل تھا، لیکن انتظار یا تاخیر کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

روانگی سے قبل یہ تمام احساسات بُری طرح ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہو گئے تھے، اس لیے خلافِ معمول کچھ گھبراہٹ ضرور تھی۔ بار بار سامان کی جانچ پڑتال کی گئی کہ ہر ضروری اور سوچی سمجھی چیز موجود ہے یا نہیں تاکہ اگر کوئی کور کسر باقی ہو تو فوراً اسے پورا کر دیا جائے۔ بار بار پاسپورٹ اور خصوصاً ان میں ویزا والے حصے دیکھے گئے کہ جہاں جہاں ہمیں جانا ہے، یا جن مقامات سے گزرنا ہے، ان کے پروانہ ہائے راہداری موجود ہیں یا نہیں صحت ناموں کی جانچ پڑتال کی گئی کہ بعض صورتوں میں ان کی اہمیت ویزا سے بھی بڑھ جاتی ہے اور ذرا سی کوتاہی یا سقم پر آگے جانے سے روک دیا جاتا ہے۔

غالب کے زمانے میں ہوائی جہازوں کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ اپنے ایک شعر میں زندگی اور موت کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہوئے نیند نہ آنے کی تاویل بیان کرنے کے بجائے یوں کہتے کہ ؎ وقتِ پرواز جب معیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مطلب یہ ہے کہ پان امریکن ایرویز کے طیارے کی روانگی کا وقت صبح پانچ بجے مقرر تھا، لیکن ہم رات بھر ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو سکے۔ خدا حافظ کہنے والے واقف کاروں کا ایک تانتا تھا کہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ ایک آتا، ایک جاتا۔ غرض مصافحوں اور معانقوں میں رات کا پورا حصہ گزر گیا۔ بہت سے احباب بھی ہماری "سرگرمیوں" میں شریک ہو کر صبح تک ہمارے ساتھ رت جگا کرتے رہے اور جب صبح کے ساڑھے تین چار بجے ہم گھر سے چلے تو پورا قافلہ ہمارے ساتھ جنبش میں آگیا۔

بزرگوں نے صدقہ اتارا اور آئندہ کے لیے منتیں مانیں۔ بہنوں نے امام ضامن بازوؤں پر باندھے۔ بچّیوں نے ایک بار پھر اپنی فرمائشیں دہرائیں اور تاکید کی کہ ہم ڈائری کے وہ صفحات روزانہ دیکھ لیا کریں، جن میں مختلف قسم کی سوغات لانے کے لیے متعدد

ہدایات درج کرائی گئی تھیں۔ دواخانے کے ایک کرم فرما آخر وقت تک یہی پوچھتے رہے کہ آپ کی غیر موجودگی میں فلاں فلاں کام کیسے کیے جائیں۔ اور یوں نہ ہو تو کیا کیا جائے اور جو یوں ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ "بخشش" پانے کی تمنا میں کچھ ملازم اور دوسرے لوگ صورتِ سوال بنے ایک طرف کھڑے تھے، ان کی بھی مٹھی گرم کی گئی اور خدا خدا کر کے صدر دروازے تک پہنچے۔

یہاں ڈرامائی انداز میں مذبح کا ایک سین پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ "قریشی برادری" کے ایک بزرگ نے فوراً بکرا پچھاڑ کر "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا اور بے زبان کے گلے پر چھری چلا دی۔ میں انسان کے اس فلسفے کو کبھی نہ سمجھ سکا کہ اپنی جان کی حفاظت چاہنے کے لیے کسی دوسرے بے تصور کی جان کیوں گنوا دی جاتی ہے۔ اس کا کوئی نفسیاتی اثر ہو تو ہو ورنہ علت و معلول ہونے کے اعتبار سے کوئی باہمی تعلق یا رشتہ نظر نہیں آتا۔

ہم کسی کے محبوب نہیں تھے اور ہمارا ایک ہم نامی محبوب بھائی جرمنی کے صدر مقام بون میں بغرض تعلیم مقیم تھا، پھر بھی ہم قتل گاہِ ناز میں دامن سمیٹ کر چلنے والوں کی طرح مرغِ بسمل کے خون اور اس کے چھینٹوں سے بچتے بچاتے باہر نکلے تو یہاں ایک عجیب مسئلہ درپیش تھا۔ ہوائی اڈے تک ساتھ جا کر واپس آنے والے پہلے سے چھے موٹروں میں سوار تھے اور بظاہر ہمارے بیٹھنے کے لیے کہیں جگہ نہیں تھی اور ہم اس سوچ ہی میں تھے کہ کیوں نہ ان سب کو ہوائی اڈے بھیج کر ہم یہیں رہ جائیں، کہ اتنے میں ایک اور موٹر، جس کا انتظار تھا اور وقت پر پہنچ جانے کی سب کو توقع تھی، سڑک کے تاریک حصے میں روشنی بکھیرتی اور ہارن نہ بجانے کی پابندی کو توڑتی، عین وقت پر آموجود ہوئی۔ میاں یٰسین اس کار کو چلا رہے تھے۔ جب وہ کار چلاتے ہیں تو زمین کی سطح اور سڑکوں کے موڑ ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ ہم اس گاڑی میں سوار ہو گئے اور وہ سامان بھی ساتھ رکھ لیا، جسے جہاز پر سیٹ کے ساتھ رکھنے کی اجازت تھی۔ باقی بک ہونے والا سامان پہلے سے ہوائی اڈے پہنچ چکا تھا۔

ہوائی اڈے کی عمارت پر ہم کو ہار پہنائے گئے اور پھولوں کی بارش کی گئی، بالکل اس طرح جیسے ہم سفرِ یورپ کی بجائے حج بیت اللہ کے لیے جا رہے ہیں۔ بکرے کی قربانی دینے کی طرح یہ بات بھی میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ پھولوں کی اس طرح توہین کرنا انسان نے

کب سے اور کیوں گوارا کیا ہے اور جب نچھاور کیے ہوئے پھول جوتوں کے نیچے مسلے جاتے ہیں تو اس کا دل کیوں نہیں دُکھتا، جبکہ اس کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ خوشبو والے پھول آنحضرت ؐ کے پسینے سے پیدا ہوئے ہیں۔

ٹھیک پانچ بجے یعنی اس وقت جبکہ ع

تھی بلبل شاخ گل پر اور شبنم گل کے دامن میں

ہمارا جہاز کراچی کے ہوائی اڈے سے کسی پرندے کی طرح "پھر" سے نہیں، بلکہ گرجتا، شور مچاتا تیزی سے اڑ گیا اور بہت جلد ہوائی اڈے پر کھڑے ہونے والوں کی نظر میں وہ خود اور اس میں بیٹھنے والوں کی نگاہ میں ہوائی اڈا آسمان پر ٹمٹمانے والے تارے کی طرح مختصر ہوتا چلا گیا۔

جہاز میں ہم اپنی نشستوں پر جم گئے، سامان کو درست کیا۔ جہاز ایسی سمت میں جا رہا تھا کہ ذرا دیر کو ہم آنکھیں بند کر سکتے تھے۔ اُدھر کپتان نے بھی جہاز کے اندر کی بڑی روشنیاں گُل کر دیں۔ شاید ہم دو ڈھائی گھنٹے سو لیے۔ اٹھے تو ناشتہ حاضر تھا۔ ہوائی جہاز میں میں بڑے آرام سے سو لیتا ہوں، اور نہ معلوم کیوں میری بھوک بھی کھل جاتی ہے۔ میں نے ناشتہ کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ شاید بھائی جان محترم نے احتیاط سے کام لیا۔

اگر جہاز کا کپتان نہ بتاتا تو ہم محسوس بھی نہ کرتے کہ ہمیں بجائے فرسٹ کلاس کے ٹورسٹ کلاس میں بٹھا دیا گیا ہے۔ کپتان نے معذرت چاہی کہ غلط فہمی کی وجہ سے ایسا ہوا، ہمیں یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی، لہٰذا ٹکٹ پر لکھوا لیا کہ ہم نے ٹورسٹ کلاس میں سفر کیا ہے۔ فرق کے پیسے واپس مل جائیں گے۔

اس جہاز کو انقرہ پہنچنے سے پہلے راستے میں کچھ دیر کے لیے بیروت ٹھیرنا تھا۔ بحیرۂ روم کے ساحل کے قریب لبنان کا یہ تاریخی شہر دنیا کی قدیم تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس ملک میں قدرے ٹھیر کر سب کچھ نہیں تو کم سے کم بعلبک کے کھنڈر تو ضرور دیکھ لیے جاتے جو بیروت سے زیادہ دور نہیں ہیں، لیکن نہ جہاز والے اجازت دیتے اور نہ ہم فہرستِ سفر میں مطلق لچک نہ ہونے کے باعث ایسا کر سکتے تھے۔ چناں چہ اپنی آرزو کی تکمیل کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھا۔

جہاز قاعدے کے مطابق صرف دو گھنٹے ٹھیرا اور پھر آگے روانہ ہو گیا۔ کچھ شرکائے

سفر وہاں اتر گئے تھے اور کچھ نئے مسافر ساتھ ہو لیے تھے۔ جہاز ہو یا ریل گاڑی یا معمولی بس کو لیجیے، ان سب کا دستور العمل عام انسانی زندگی سے کس قدر ملتا جلتا ہے۔ پرانے مسافر ساتھ چھوڑتے ہیں اور نئے مسافر آملتے ہیں اور کبھی ہم خود بھی منزل آجانے کے بعد اتر پڑتے ہیں۔ بالکل اسی طرح انسانی زندگی میں ہوتا ہے۔ کچھ رشتے دار اور دوست اپنی زندگی کے معینہ لمحات پورے کر کے داغ مفارقت دے جاتے ہیں اور ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے نئے رشتے دار اور دوست آملتے ہیں۔ ملنے اور جدا ہونے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ اچانک ہم ان سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر سرحدِ ادراک سے بھی پرے ایک انجان منزل کی جستجو میں سرگرمِ سفر ہو جاتے ہیں۔ اُستاد مرحوم نے صحیح کہا تھا ؎

موت زندگی کا ایک وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

چناں چہ بیروت میں دو گھنٹے دم لے کر ہم بھی آگے روانہ ہو گئے۔ یہاں ہم کو پان امریکن ایرویز کی بجائے مڈل ایسٹ ایر لائنز کے جہاز میں بیٹھنا پڑا۔ اس تبدیلی کے وقت بھی پاسپورٹ، ویزا اور صحت نامہ وغیرہ کی جانچ پڑتال ہوئی، لیکن کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔

بیروت میں عربی اور فرانسیسی اسی طرح بولی جاتی ہیں، جیسے یہ دونوں ہی یہاں کی قومی زبانیں ہوں۔ البتہ انگریزی بولنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ اس لیے عام طور پر مسافروں کو مترجموں کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو اِن تینوں زبانوں سے ناآشنا ہو، وہ اشاروں میں کام چلا لیتا ہے کیوں کہ اہل کار خاصے ملنسار ہیں اور دفترِ تعارف و تحقیقات بڑی مستعدی سے کام کرتا ہے، لیکن یہاں کی عرب نژاد عورتوں کو بھی دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ ہر قسم کے سامانِ تعیش کے ساتھ ساتھ وہ بھی یورپ اور خصوصاً امریکا کے کسی علاقے سے درآمد کی گئی ہیں۔

ہوائی اڈے سے روانہ ہوتے وقت ہم نے اپنی گھڑیاں درست کر لیں۔ اگرچہ ہم آفتاب غروب ہونے والی سمت ہی میں سفر کر رہے تھے لیکن جہاز کی رفتار سورج کی رفتار کا بھلا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اگر دونوں کی رفتار یکساں ہوتی تو شاید گھڑیوں کی سوئیاں گھمانی نہ پڑتیں۔

چوں کہ ہمارے جہاز کو انقرہ پر اترنا تھا، اس لیے ترکی کی حدود میں داخل ہو جانے

کے باوجود کافی دیر پرواز کرتا رہا، اور اس طرح بند کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھنے سے اس ملک کی طبقاتی ساخت، محلِ وقوع اور حدودِ اربعہ نہیں "حدودِ خمسہ" دیکھ لینے کا موقع مل گیا۔

چھے ملکوں اور تین سمندروں کے درمیان گھرے ہوئے اس ملک کو جب نقشے پر دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چوہا دُم سُکیڑ کر اور پاؤں اپنے پیٹ میں گھُسا کر خاموش بیٹھا ہے، لیکن جہاز خواہ کتنا ہی بلند ہو، سارا ملک ایک وقت میں نظر نہیں آسکتا۔

اس کا رقبہ دو لاکھ چھیانوے ہزار پانچ سو تین مربع میل اور کُل آبادی ایک سال پہلے کی مردم شماری کے مطابق دو کروڑ اکتالیس لاکھ گیارہ ہزار سات سو اٹھتّر ہے۔ گویا رقبہ بھارت کے رقبہ کی بہ نسبت ایک چوتھائی سے کچھ کم اور آبادی پاکستان کی آبادی کی بہ نسبت ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ ہے۔

اس ملک کو اپنے دفاع کے لیے بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ اس ملک کی سرحد کے ۱۲۷ میل یونان سے اور ۱۴۴ میل بلغاریہ سے ملے ہوئے ہیں۔ پھر بحیرۂ اسود آجاتا ہے، جس کا ۹۶۶ میل لمبا حصّہ شمال میں اس کا ساحلی علاقہ ہے۔ اس کے بعد اس کی سرحد کے ۳۶۷ میل رُوس سے، ۲۹۰ میل ایران سے، ۲۳۵ میل عراق سے اور ۴۹۰ میل شام سے ملتے ہیں۔ پھر جنوب میں بحیرۂ روم کی طرف ساحل کا طول ۹۷۵ میل اور مغرب میں بحیرۂ ایجین کی طرف ۱۴۸۶ میل ہے۔ بحیرۂ مارمرا بھی اگرچہ پانی کا بہت بڑا قطعہ ہے اور دونوں جانب خشکی سے ملے ہوئے اس کے ساحلوں کا طول ۵۹۲ میل ہے، لیکن چوں کہ یہ اندرونِ ملک واقع ہے، اس لیے یہاں زیادہ سختی سے اہتمام دفاع کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے دونوں سروں پر آبنائے باسفورس اور درّۂ دانیال، جن کے طول بہ مشکل ۲۵ اور ۶۰ میل ہیں، اس ملک کے لیے کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔

جس طرح دو برِّ اعظموں کے درمیان نہر سویز کا وجود دو سمندروں کے ملانے کے باعث بڑی اہمیت رکھتا ہے، اسی طرح باسفورس بحیرۂ اسود کو بحیرۂ مارمرا سے اور درّۂ دانیال جسے اب اہلِ ترکی چنا قلا کہتے ہیں، بحیرۂ مارمرا کو بحیرۂ ایجین سے ملاتا ہے۔ یہ آبنائیں نہ ہوں تو یورپ کے بہت بڑے حصّے کا ناطہ باقی دنیا سے ٹوٹ جائے اور

اُن کے درمیان سیاسی، ثقافتی اور خصوصاً تجارتی ابتری پھیل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی اکثر قوموں نے نہ صرف عہدِ عتیق میں بلکہ عصرِ جدید میں بھی قبضہ و اختیار حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے جتن کیے ہیں۔ کبھی کبھی اغیار کو کامیابی ہوئی ہے، لیکن اکثر منہ کی کھائی ہے۔ اور اب تو یہ قوم، جسے پہلی جنگِ عظیم کے بعد بعض یتیم العقل لوگ "بسترِ مرگ پر مردِ بیمار" کہتے تھے، اتنی طاقت ور اور جان دار ہو گئی ہے کہ اس کی طرف للچائی ہوئی نظر اٹھانے کے لیے بھی دل گردے کی ضرورت ہے۔ یہاں کے باتدبیر شاطر اب بساطِ سیاست پر اپنے کسی حریف سے مات کھانے والے نہیں ہیں۔ یہ معجزہ ہے ایک مردِ مجاہد ترک سپاہی مصطفےٰ کمال کا جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باعث ترقی کر کے اپنی قوم کا باپ (اتاترک) بن گیا اور رہتی دنیا اسی نام سے یاد کیا جائے گا۔

سُورج کی شعاعیں نہ عمودی رہی تھیں اور نہ زیادہ ترچھی ہونے پائی تھیں کہ ہمارا جہاز انقرہ کے ہوائی اڈے پر چکر کھانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے نیچے اتر گیا۔ اس ملک میں بھی کسٹم کی پابندیاں عائد ہیں، لیکن مشرق سے آنے والوں کی زیادہ جانچ پڑتال نہیں کی جاتی اور خاص طور پر پاکستان کے مسلمانوں پر تو یہ لوگ جاں نثاری کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ جہاں پاسپورٹ پر قومیت کے خانے میں لفظ "پاکستان" نظر آیا، تمام اصول و قواعد کچے بندھنوں کی طرح ٹوٹ گئے اور داخلے کی اجازت مل گئی۔ بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ بھی تقریباً اتنا ہی خلوص روا رکھا جاتا ہے۔ اس لیے مجھے اور بھائی جان کو کسٹم کے محکمے سے بہت جلد نجات مل گئی۔

ہوائی اڈے پر اپنے پرانے دوست سید برکات احمد صاحب پہلے سے موجود تھے جو ترکی کے سفارت خانۂ ہند میں پریس اتاشی ہیں۔ اس ملکے سے اختلاف سے قطعِ نظر جو سیاسی نظریات میں تضاد کے اعتبار سے میرے اور ان کے درمیان موجود ہے، اس رشتۂ خلوص کی کیفیت بیان کرنی محال ہے جس نے ہم کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب ہم آپس میں ملتے ہیں تو غیر شعوری طور پر سیاسی باتیں زیرِ بحث آتی ہی نہیں، اِس لیے اختلافِ رائے کا موقع کبھی نہیں آتا۔

وہ بھائی جان سے اور پھر مجھ سے لپٹ گئے، جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے اچانک مل جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کے بعد میں نے پوچھا کہ ترکی کی آب و ہوا آپ کو راس آئی یا نہیں اور انھوں نے سوال کیا کہ جہاز کا سفر کس طرح کٹا۔ کوئی دقّت تو پیش نہیں آئی؟

ان کی کار مستقر کے باہر موجود تھی۔ ہم سب اس میں جا بیٹھے اور بیٹھتے ہی میں نے سوال کیا کہ ہمارا قیام کہاں ہو گا؟ کس ہوٹل میں جگہ ملی ہے؟ —— اور انھوں نے کچھ اس انداز سے میری طرف دیکھا جیسے یہ سوال ہی مہمل ہو۔ میں نے ان کی نظروں سے دل کا راز معلوم کر لیا اور یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ اگر اس ضمن میں کوئی اور سوال کیا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ انقرہ میں ان کے ہوتے ہوئے ہمارا کسی ہوٹل میں قیام کرنا معرض بحث میں آسکتا تھا۔ چناں چہ موٹر چل پڑی اور میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

ہم دونوں بھائی اپنے عام لباس میں تھے یعنی ٹھنڈی شیروانیاں، سیدھے پاجامے اور باریک کرتے۔ انقرہ کی فضا میں پہنچتے ہی ہمیں کچھ خنکی سی محسوس ہونے لگی۔ ان دنوں یہاں کا درجۂ حرارت ۶۲ اور ۷۵ کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے جب کہ ہمارے ملک میں یہ کیفیت نومبر سے جنوری تک رہتی ہے جو سردی کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس کے برعکس یہاں اسے گرم موسم سمجھا جاتا ہے اور حقیقتاً لوگ گرمی سے پریشان ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ برکات صاحب نے یہاں کے موسم میں اپنے آپ کو سمو لیا تھا۔ وہ بھی ہلکے لباس میں ملبوس تھے۔

گاڑی ان کی کوٹھی پر پہنچی تو ان کی بیگم صاحبہ ہمارے خیر مقدم کے لیے برآمدے میں کھڑی مسکرا رہی تھیں گویا ان کے ہاں قیام کرنا ہر لحاظ سے طے ہو چکا تھا۔ وہ منتظر تھیں اور اگر ہم وہاں نہ جاتے تو خدا جانے کن الفاظ میں ہمارا فضیحتہ ہوتا۔ بیگم برکات بہرحال عورت ذات ہیں اور وہ بھی مشرقی دنیا میں بسنے والی ہیں۔

ان دونوں میاں بیوی کو اللہ تعالیٰ نے مشترکہ طور پر چار بچے دیے ہیں جن کی پیدائش اور تقسیم میں قدرت نے اور خود انھوں نے اسلامی مساوات کا خیال رکھا ہے۔ قدرت کی عنایت تو یہ ہے کہ چار بچوں میں سے دو لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں۔ اور انھوں نے تقسیم اس طرح کی ہے کہ دونوں لڑکے بھارت کے پہاڑی مقام نینی تال میں زیر تعلیم ہیں اور لڑکیاں ان کے ساتھ ترکی میں ہیں۔ مادری زبان کے علاوہ لڑکے انگریزی سیکھ رہے ہیں اور لڑکیاں ترکی زبان بولتی ہیں۔ انگریز ہمیشہ سے ترکوں کے حریف رہے ہیں۔ تاہم مجھے امید ہے کہ صرف زبان کا اکتساب ان بچوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں کرے گا یعنی انگریزی بولنے والے ترکی بولنے والیوں کے کبھی خلاف نہیں ہوں گے۔ اگر بچوں کی تقسیم اس طرح ہوتی کہ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو بھارت میں اور ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو ترکی میں رکھا جاتا تب بھی ان کی جدّتِ طبع کی داد دینی پڑتی لیکن

یہ ممکن نہیں تھا۔ مشرقی عورتیں اپنی بچیوں کو خواہ وہ کتنی ہی عمر کی ہوں اپنے سے جُدا کب کرتی ہیں۔

ان بچیوں کے نقش و نگار تو بالکل اپنی ماں سے ملتے جلتے ہیں لیکن لباس میں ان کی تقلید نہیں کی جاتی۔ اس پر ترکی رنگ چڑھ رہا ہے۔ حُسنِ اتفاق ہے کہ ان دنوں دونوں لڑکے بھی انقرہ آئے ہوئے تھے اور اس طرح مجھے بیک وقت ان چاروں کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے ان سب کو دہلی میں دیکھا تھا۔

ہم بچوں سے دل چسپ باتیں کرنے میں مشغول تھے اور بیگم برکات مُصر تھیں کہ ہم نہادھو کر جلدی سے چائے کی میز پر آجائیں۔ چائے کی میز تو رسماً کہہ دیا گیا، ورنہ وہ جانتی ہیں کہ ہم دونوں بھائی چائے کے عادی نہیں ہیں بلکہ حتی الامکان اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ بھائیجان تو کبھی کبھار اصرار کرنے والے کا دل رکھنے کے لیے بدپرہیزی کر لیتے ہیں لیکن میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح معذرت کر کے بچ جاتا ہوں۔ چائے کے مسلسل یا زیادہ استعمال سے جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ہمیں بخوبی علم ہے۔ دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو چائے کو مضر جانتے ہوئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندستانیوں کو اس خراب لت میں انگریزوں نے مبتلا کیا ہے۔ اگر چائے واقعی چائے ہو تو اس کے نقصانات میں کمی کا امکان ہے لیکن جن مسالوں کے زلال میں چائے کی پتیوں کو بھگو کر خشک کر کے اور مختلف ٹھپّے لگا کر پیش کیا جاتا ہے، ان میں یقیناً صحت کو گھُن لگانے والے اجزا شامل ہوتے ہیں۔

بیگم برکات نے ہم کو یقین دلایا کہ سبز چائے خاص ترکی انداز میں تیار کرائی گئی ہے۔ اسے پی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ چائے کے لوازم میں بھی ترکی ذوق اور رواج کا خیال رکھا گیا تھا۔ گویا ترکی کو سمجھنے کے باب میں یہ ہمارا پہلا سبق تھا اور اس لحاظ سے بیگم برکات ہمارے لیے خود ساختہ اُستانی بن رہی تھیں۔ اس منصب پر ان کی تقرری کے احکامات نہ جمہوریہ ترکیہ نے صادر کیے تھے، نہ سفارتی اسناد میں ان کا ذکر تھا اور نہ ہم کوئی پروانہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں نے چائے سے بچنے اور ان کی ضد پوری کرنے کے لیے یہ ترکیب کی کہ دودھ کا ایک چمچہ بھر کر اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

چائے کے لوازم میں سے دو چیزیں مجھے خاص طور پر یاد رہ گئیں کیوں کہ ان کی لذّت بہت دیر کام و دہن پر باقی رہی تھی۔ ایک خرما تطلیسی (ایک قسم کی نہایت شیریں پیسٹری) جو کھجوروں سے تیار کی جاتی ہے، اور ایک سُوبوریئی جسے اس لحاظ سے سنبوسہ کہا جاسکتا

ہے کہ ان کو بنانے کی ترکیب تقریباً وہی ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ ترک لوگ قیمے کے ساتھ پنیر کے ٹکڑے بھی میدے کے رقاقوں میں بھرتے ہیں۔

چائے کے بعد کچھ دیر نشست رہی۔ ہم نے پہلے سے بنائے ہوئے پروگرام پر جسے دوسرے روز سے عملی جامہ پہنانا تھا، برکات صاحب کی رائے لی تاکہ اگر ضروری ہو تو صرف اس حد تک ردّ و بدل کر لیا جائے، جس سے آئندہ کے پروگرام پر کوئی اثر نہ پڑے یا جن سے ملنے جلنے کے معاملات طے ہو چکے ہیں ان میں رخنہ نہ پڑے۔ خدا کا شکر ہے، کوئی ایسی تجویز پیش نہیں ہوئی جسے منظور کرنے میں تامل ہوتا۔ انقرہ میں ہم موجود تھے، قونیہ استنبول، ازمیر اور برسا فہرست میں شامل تھے۔

اس مختصر سی نشست میں بچے ہم سے کچھ مانوس ہو گئے بلکہ اپنی فطرت کے مطابق بے تکلفی کی سطح تک اتر آئے۔ میں نے بڑی لڑکی برجیس سے کہا کہ تم ترکی اسکول میں پڑھتی ہو اس لیے تم کو ترکوں کا قومی ترانہ ضرور یاد ہوگا۔ ہمیں اصل زبان میں سناؤ تاکہ ہمارے پروگرام کا آغاز ابھی ان مقدس الفاظ سے ہو جائے جن کی اثر انگیزی نے ترکوں میں روحِ عمل پیدا کی اور انھیں اقوامِ عالم میں سُرخرو کر کے سب کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔

برجیس دوڑ کر دوسرے کمرے میں گئی اور ترکی پرچم اٹھا لائی جو ایک پتلی چھڑ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ سرخ رنگ کے مستطیل کپڑے پر سفید چاند تارے کا نشان ترکوں کے جوشیلے پن اور اسلامی اتحاد کو ظاہر کرتا ہے۔ اکثر اسلامی ممالک میں چاند اور تارا کسی نہ کسی صورت اور پس منظر کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ برجیس کا بڑا بھائی سعد پرچم کو لہرا کے دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا اور بہن نے بڑے احترام کے ساتھ جھنڈے کو سلامی دے کر ترنم کے ساتھ ترانہ گایا جس کے الفاظ کم و بیش یہ ہیں:-

استقلال مارشی

کورکما سون مز بو شفقلاردا یوزن آل سنچارک
سون مدن یُردمن اُستندے توُتن ان سون اوچاک
او بنم دِر، او بنم ملتمِ من در آنچاک
او بنم ملتمِ من یلدیزی در پارلی یاچاک

چاتما قربان اولایم سهرینی اے نازلی ہلال

قہرمان ارکیما بیر گل نے بوشدت بوجلال

سنا اولماز ڈوکولن کنلاری منز سونرا ہلال

حقی در حقاتا پان ملّتے من استقلال

(اس ترانے کے دس بارہ بند ہیں اور محمد عاکف نامی ایک شاعر نے منظوم کیے تھے) برکات صاحب نے جو ترکی زبان سے خاصے واقف ہو گئے ہیں، ترانے کا اردو ترجمہ ان الفاظ میں کیا:-

ترانۂ آزادی

ڈر نہیں، شفق کے ساتھ ساتھ جو یہ سرخ پرچم لہرا رہا ہے

اس وقت تک سرنگوں نہیں ہوگا جب تک اس ملک میں ایک بھی گھر ہے

اور ہر گھر میں ایک بھی چمنی سے دھواں اُٹھ رہا ہے یہ پرچم میرا ہے

ساری قوم کا ہے۔ یہ میری قوم کا چمکتا ستارہ ہے اور ہمیشہ چمکتا رہے گا

میں تجھ پر سے قربان جاؤں، اے نازک ہلال، تو فکر نہ کر

اگر تو برابر فکرمند رہا تو جان قربان کرنے میں کوئی لطف نہ آئے گا

تو کبھی نہیں مٹ سکتا، کیوں کہ آزاد رہنا میری قوم کا حق ہے

اور یہ قوم ہمیشہ سے حق بات کی پرستار رہی ہے

بیگم برکات نے اپنے منجھلے لڑکے نعمان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ انھیں خواجہ نصرالدین کے لطیفے بہت پسند ہیں۔ چناں چہ انھوں نے نصاب کی کتاب کے علاوہ بھی کچھ لطائف دوسروں سے سن سنا کر یاد کر لیے ہیں اور خواجہ نصرالدین کے فلم بھی بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔

میں نے کہا، نصرالدین کے رنگین دستاویزی فلم جو ریاست ہائے متحدہ امریکا نے اشتراکیت کے خلاف پرچار کرنے کے لیے بنائے ہیں، میں نے بھی کراچی میں دیکھے ہیں، لیکن پسند نہیں ہیں کیوں کہ ان میں اصل کہانیوں کو بہت کچھ توڑ مروڑ کر نئے سانچوں میں ڈھالا گیا ہے۔ پھر فن کے اعتبار سے بھی انھیں کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ زندہ اداکاروں کے بجائے جن قدِ آدم پتلوں کے ذریعے انھیں پیش کیا گیا ہے، ان کو حرکت میں لانے والے

تمار واضح طور پر نظر آتے ہیں اور اس طرح اس گورکھ دھندے کا راز فاش ہو جانے سے سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ شروع میں تو بچے ان فلموں سے لطف اٹھاتے ہیں لیکن بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔ اس لیے اس سراب کی حقیقت ظاہر ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ امریکا نے یہ فلم بنا کر خواجہ نصرالدین کی فضیلت کو زیادہ بلند کرنے کے بجائے گھٹا دیا ہے۔ بہرحال نعمان میاں کوئی لطیفہ سنائیں جو انھیں بہت پسند ہو۔ وہ اپنے اصل روپ میں ہوگا اور ہم لطف اٹھائیں گے۔ چناں چہ صاحبزادے نے خواجہ نصرالدین کا یہ لطیفہ ہمیں سنایا:۔

"ایک روز خواجہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ کسی شخص نے اس کو سونے کے نو سکے دیے ہیں۔ اس نے اعتراض کیا کہ پورے دس ہونے چاہییں۔ اس بات پر بحث ہوئی اور جھگڑا شروع ہو گیا۔ نوبت مار پیٹ کی آئی اور خوب غل مچا۔ اسی شور میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنا خواب اچھی طرح یاد تھا۔ اس نے دیکھا کہ مٹھی بالکل خالی ہے۔ نو تو کیا ایک بھی سکہ ہاتھ میں نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور سوتا ہوا بن کر کہنے لگا، اچھا بھائی تکرار کی ضرورت نہیں۔ لاؤ نو سکے ہی دے دو۔"

یہ لطیفہ سن کر سارا ذرا تنک کر بولی، "واہ! یہ بھی کوئی لطیفہ سنانے کے لائق ہے۔ اس سے کہیں اچھا تو وہ لطیفہ ہے جس میں چیل جھپٹا مار کر خواجہ کے ہاتھ سے کلیجی لے گئی اور وہ منھ دیکھتا رہ گیا تھا۔

بچی نے یہ اعتراض کچھ اس انداز میں کیا کہ جیسے وہ خود پورا لطیفہ سنا دینے کے لیے بے تاب ہو۔ چناں چہ بھائی جان محترم نے اس کا دل رکھنے کے لیے بڑے پیار سے کہا، "تو پھر کیا مضائقہ ہے، وہ لطیفہ بھی سنا دو، تاکہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو انعام دے سکیں۔"

اور سارا نے مقابلے کے انداز میں ڈٹ کر لطیفہ سنانا شروع کر دیا:۔

"ایک روز خواجہ نصرالدین نے اپنے ایک دوست کے مکان پر بھنی ہوئی کلیجی کھائی جو بہت ہی مزے دار اور چٹپٹی تھی۔ نصرالدین نے چلتے وقت دوست کی بیوی سے کہا کہ اس کلیجی کو بھوننے اور ساتھ ملائے جانے والے مسالے کا نسخہ لکھ دو تاکہ میں اپنی بیوی سے اس کا تجربہ کرا سکوں۔ دوست کی بیوی نے فرمائش پوری کر دی۔ گھر واپس جاتے وقت خواجہ نے قصاب کی دکان سے ایک کلیجی بھی خرید لی۔ وہ ایک ہاتھ میں نسخہ

دو مرے میں کلیجی لیے چلے جارہے تھے کہ ایک دم آسمان کی طرف سے ایک چیل آئی اور جھپٹا مار کر کلیجی ہاتھ سے لے گئی۔ خواجہ نے ذرا بھی رنج و غم کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہنس کر کہا اری بے وقوف! صرف کلیجی لے جانے سے کیا فائدہ؟ اسے بھوننے اور مسالے ملانے کا نسخہ تو میرے پاس ہے۔ پرچہ ترکیب استعمال ساتھ نہ ہو تو دوا بھی بے کار ثابت ہوگی۔ جا۔ لے جا۔ آخر کار پچھتانا پڑے گا۔

یہ لطیفہ سنا کر سارا نے ذرا فخر سے سب کی طرف دیکھا۔ گویا اب ان کے انتخاب کی داد ملیگی۔ لیکن ان کے بھائی جان نہ چوکے۔ طنزیہ انداز میں بولے، چہ خوش! یہ لطیفہ رات کو کھانے کی میز پر سنایا جاتا۔ اس وقت بالکل بے موقع ہے اور پر جبیں نے فوراً تنک کر کہا، گویا تمھارا لطیفہ بہت موقع کا تھا کیوں کہ اس وقت آدھی رات ہے اور سب خواب دیکھ رہے ہیں!

اس نوک جھونک پر ایک قہقہہ پڑا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

خواجہ نصرالدین کو بعض لوگ فرضی انسان سمجھتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ ایک تاریخی شخصیت ہے اور اس کا ذکر ترکی کے بہت سے نوشتوں میں ملتا ہے۔ اسے ایک فرضی انسان سمجھنے کا شاید بڑا سبب یہ ہے کہ ایران اور دوسرے ممالک بھی دعویدار ہیں کہ وہ ان کا باشندہ تھا۔ اس کے بہت سے لطیفے فارسی زبان میں بھی موجود ہیں اور ملا نصرالدین کے نام سے شائع ہوئے ہیں لیکن کم و بیش وہ سب لطیفے بہت سی سلافی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اردو اور انگریزی میں بھی بعض کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ یہ تو اس کی مقبولیت کا عالم ہے کہ ہر شخص اسے اپنا ہم وطن بنا رہا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔

ترکی ثقافت اور نصرالدین کے لطیفوں کا بیک وقت مطالعہ کیا جائے، تب بھی یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ ترکی نژاد تھا۔ خود ترکی کے بہت سے صوبے اسے اپنا بتاتے اور اس پر فخر کرتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اس کا وطن عاک شہر کے قریب خورطو نامی گاؤں تھا۔

قدیم اناطولیہ کے اس گاؤں میں وہ سنہ ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام عبداللہ تھا جو گاؤں کی مسجد میں امامت کرتا اور لوگوں کی امداد پر گزارا کرتا تھا۔ نصرالدین نے مسجد سے ملے ہوئے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی اور چوں کہ وہ شروع سے بہت ذہین محنتی اور ہوشیار بچہ تھا، اس لیے باپ نے مزید تعلیم کے لیے قونیہ کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ قونیہ اسی صوبے کے دوسرے ضلع میں واقع ہے اور مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے وہاں دفن ہونے کے

باعث بہت ہی مشہور ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ایک اور گاؤں کے مدرسے میں اُستاد مقرر ہو گیا لیکن جلد ترقی کی اور قاضی شہر بن گیا۔ اس کے فیصلوں میں کبھی سختی ہوتی اور کبھی نرمی۔ کبھی طنز و مزاح کا عنصر شامل ہوتا۔ اس وقت کے اکثر فیصلے بھی ردّو بدل کے بعد لطیفے بن گئے ہیں بعض لطیفے فرضی بھی کہے جا سکتے ہیں جو بعد کے لوگوں نے گھڑ گھڑا کر اس طرح اس سے منسوب کر دیے ہیں جیسے ہمارے ادب میں بیربل اور ملا دوپیازے یا شیخ چلی کے لطیفوں کا کوئی شمار نہیں ہے، یا جس طرح اس زمانے میں ہر بے وقوفی اور بدحواسی کا لطیفہ سکھ قوم کے کسی فرد سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب وہ طالب علم تھا تو اس کے ہم جماعتوں نے ایک روز یہ شرارت کی کہ اپنے اُستاد کی بھیڑ پکڑ کر ذبح کی اور بھون کر کھا لیا۔ جب اُستاد کو پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوا پوچھ گچھ ہوئی تو شریر لڑکوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ ایک نے کہا کہ میں نے بھیڑ کو پچھاڑ کر دبوچا تھا۔ دوسرے نے کہا کہ میں نے چھری چلائی تھی۔ تیسرے نے کہا کہ میں نے کھال اتاری تھی۔ چوتھے نے پارچے تیار کرنے اور پانچویں نے آگ پر بھوننے کا اعتراف کیا۔ اُستاد نے پوچھا اور نصرالدین نے کیا کیا؟ سب ساتھی بولے "یہ ہم میں برائے نام شریک تھا۔ یہ دور کھڑا ہمیں دیکھتا اور ہنستا رہا۔" اُستاد نے سب شاگردوں کو ان کے کرتوت کے مطابق بددعا دی اور آخر میں نصرالدین کی بابت کہا کہ دنیا اس پر ہنسے گی اور یہ دنیا کو ہنسائے گا۔

باقی طالب علموں کی عاقبت کی خبر خدا جانے، البتہ نصرالدین کے بارے میں یہ حقیقت ہے کہ وہ زندگی بھر دوسروں پر ہنستا اور انہیں ہنساتا رہا اور سات سو سال کی مدت گزر جانے کے باوجود دنیا اب بھی اس پر ہنستی اور ایک لحاظ سے اس کے لطیفوں سے لطف اٹھاتی ہے۔

نصرالدین کا مذاق ایک دائمی نوعیت کا ہے۔ وہ کبھی فرسودہ ہونے نہیں پاتا۔ اب بھی ہر معیار زندگی کے لوگ اس کے لطائف میں دلچسپی لیتے ہیں۔ بہت سنجیدہ طبیعتیں بھی ان پر مسکرائے بغیر نہیں رہتیں۔ نہ صرف ترکی بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کی مقبولیت کا یہی عالم ہے۔ بعض لطیفے دوسری زبانوں میں منتقل ہو کر اس طرح رچ گئے ہیں کہ وہیں کا ثقافتی ورثہ معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک بار خواجہ نصرالدین کو ایک ضیافت میں مدعو کیا گیا۔ وہ حسبِ معمول اپنے معمولی بوسیدہ لباس میں جو میلا کچیلا بھی تھا، وہاں چلا گیا۔ تقریب کے منتظمین نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی اور وہ بے توقیر بنا ایک طرف کھڑا رہا لیکن بہت جلد اس نے اس بے رخی

کی اصل وجہ محسوس کرلی۔ وہ فوراً واپس گیا اور اپنے ایک دوست سے عمدہ لباس اور خوشنما چُغہ عاریتاً مانگ کر اور پہن کر دوبارہ وہاں آ گیا۔ اب اس کی اچھی طرح آؤ بھگت ہوئی اور اس کو ایک عمدہ جگہ پر بڑے احترام کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ جب کھانا چُنا گیا اور سب نے کھانا شروع کیا تو نصرالدین نے خود کھانے کے بجائے اشیائے خورونوش کو اپنے لباس پر اُنڈیلنا شروع کر دیا۔ میزبان اور دوسرے مہمانوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو نصرالدین بولا کہ یہ سب قدر و منزلت اس لباس کی ہے، ورنہ میں کس لائق ہوں۔ لہٰذا ان نعمتوں کا مستحق یہی لباس ہے۔

ذرا مختلف انداز اور بدلے ہوئے الفاظ میں یہ لطیفہ ہماری اُردو زبان میں بھی عرصہ دراز سے موجود اور مقبول ہے اور عام طور پر یہیں کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔

نصرالدین کے لطائف میں بہت سے پہلو قابلِ غور ہیں۔ کبھی وہ دوسروں کی بے وقوفی پر ہنستا اور مذاق ہی مذاق میں پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔ کبھی خود بے وقوف بن کر دوسروں کو اپنے اوپر ہنساتا ہے لیکن رمزیہ انداز میں بڑی معنی خیز باتیں کہہ جاتا ہے۔ بقول فانی ؂

ہم تو جنوں میں کہہ گئے جو منھ میں آ گیا
اب ایک ایک لفظ کو سمجھا کرے کوئی

نصرالدین کے اکثر لطیفوں میں اس کی بیوی، لڑکے اور لڑکی کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ ایک کم حیثیت لیکن بڑی اہمیت والا گدھا ہے جو اپنے مالک کی طرح کبھی بے وقوف بنتا اور کبھی دوسروں کو بے وقوف بناتا ہے۔ لوگ اس پر ہنستے ہیں اور وہ بھی دوسروں کا مذاق اُڑاتا ہے۔

نصرالدین کی زندگی ہمیشہ غربت و افلاس میں گزری۔ وہ چاہتا تو امیرانہ ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن دنیا کی نعمتیں اس کا دامن نہ کھینچ سکیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے بے حد کنجوس اور دوسرے کے لیے اتنا ہی فراخ دل اور فیاض تھا۔ اکثر لوگ اس کی زندگی کو بے رنگ سمجھتے ہیں اور وہ اسی زندگی میں مگن رہتا ہے۔ سب کے ساتھ سب کے بیچ میں رہنے سہنے کے باوجود اس کی دنیا کچھ اور ہی تھی جہاں ہر شخص کی رسائی مشکل ہے۔

زندگی کے ۷۰ سال پورے کرنے کے بعد دنیا بھر کو ہنسنے ہنسانے کا موقع دینے والا یہ شخص ۱۲۸۶ء میں فوت ہوا اور اپنے وطنِ مالوف کے بالکل نزدیک سوبری حصار میں دفن کر دیا گیا۔ شروع میں خود اس کی آرزو کے مطابق اس کی بالیں پر صرف ایک دیوار تعمیر کی گئی جس

کے وسط میں ایک بڑا سا دروازہ تھا اور دروازے کے کنڈے میں مضبوط قفل لگایا گیا تھا لیکن بعد میں اس ایک دیوار کے مقبرے کو مضحکہ خیز سمجھ کر ڈھا دیا گیا اور اب ایک عمدہ مقبرہ اس کی تربت پر موجود ہے جس میں مجاور رہتے اور زائرین کو مرحوم کے لطائف سُنا کر بخشش وصول کرتے ہیں۔

سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ برکات صاحب کے ڈرائنگ رُوم میں بھی اندھیرا چھانے لگا لہٰذا نشست برخاست ہوگئی۔ ہم نے وضو کیا۔ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ سرزمینِ ترکی پر پہلی بار نمازِ مغرب ادا کی اور اس وقت کو یاد کیا جب عرب مسلمانوں کے اوّلین لشکرِ جرار نے استنبول کے قریب کامیاب حملہ کیا تھا۔ ہرچند اس معرکے میں بہت سے مسلمان، جن میں حضرت ایوب انصاریؓ بھی شامل تھے، شہید ہوگئے، لیکن ان کے عزم و ارادے اور شجاعت کی دھاک بندھ گئی۔

ہم نے دورۂ استنبول کے سلسلے میں پہلے سے جو اشارات درج کیے ہیں، ان میں حضرت ایوبؓ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا اور اگر وقتِ نماز ہوا تو مزار کے قریب اِنھی کے نام پر بنی ہوئی مسجد میں فریضہ ادا کرنا شامل ہے۔

مغرب اور عشا کا درمیانی وقت ظاہر ہے کہ گھر میں نہیں گزارا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ ذرا بازاروں کی سیر کی جائے۔ موٹر تو موجود ہی ہے اور برکات صاحب اب اچھے خاصے ڈرائیور بن گئے ہیں، لہٰذا فیصلہ ہوا کہ ہم تینوں چل پڑیں بیگم برکات احمد گھر پر شاید اس لیے رہ گئیں کہ رات کے کھانے کا اہتمام کریں۔ بس اب میں کیا بتاؤں برکات صاحب موٹر کیسی چلاتے ہیں۔ بارہا دل چاہا کہ ان کے ہاتھ سے اسٹیرنگ لے لوں مگر ابھی یہ ذرا مناسب نہیں تھا جس طرح کسی تفریحی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لوگ نیچی پرواز کر کے شہر کا عام نظارہ کرتے ہیں، ہم نے بھی تیزی کے ساتھ بھاگتی ہوئی موٹر میں سے بڑے بڑے بازاروں کا سرسری جائزہ لیا جو بہت ہی بارونق ہیں۔ سڑکیں کشادہ ہونے کے باوجود ہر قسم کی گاڑیوں کی ریل پیل کا یہ عالم تھا کہ کئی بار ٹریفک رک کر رہ گیا۔ صرف پہرے کے سپاہیوں کی مستعدی اور چابکدستی کے باعث کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا۔

سُنا ہے کہ دوسرے ملکوں کے بڑے شہروں کی بہ نسبت انقرہ میں آمد و رفت کے بہت کم حادثات رونما ہوتے ہیں۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ برکات صاحب موٹر چلاتے ہیں اور کوئی حادثہ پیش نہیں آتا! اس کا ایک سبب یہ ہے کہ عوام کو اپنی ذمّہ داریوں کا پورا پورا احساس

ہو۔ پیدل چلنے والے سے لے کر گاڑی چلانے والے تک ہر شخص انتہائی احتیاط برتتا ہو اور اپنی جان کی طرح دوسرے کی حفاظت کرتا ہو۔ شہر کا بڑا حصہ جدید منصوبہ بندی کے اصول پر نئے سرے سے آباد کیا گیا ہو جس کے پہلو بہ پہلو اور اطراف واکناف میں وہ پُرانے علاقے بھی موجود ہیں جن کی گرد راہ میں چار ہزار سال سے اب تک کے حقائق کروٹیں لے رہے ہیں۔

دونوں علاقوں پر ایک ساتھ نظر ڈالنے سے ہر شخص ایک زبردست تضاد محسوس کرے گا۔ ایسے احساس ہو گا کہ کسی کاریگر نے پُرانی چادر کے بیچ میں سے پھٹ جانے کے بعد مغربی تہذیب کا پیوند بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ لگایا ہو کہ وہ پیوند نہ تو اصل کپڑے کے لیے بار ہو اور نہ چادر کے بوسیدہ پلّے اس کے لیے وبال ثابت ہو رہے ہیں۔

اس سرسری دورے کے وقت ہم نے دیکھا کہ اکثر چوراہوں پر غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے، جن کو بجا طور پر اتاترک کہا جاتا ہو، پورے مجسمے یا نیم تنے اونچے چبوتروں پر نصب ہیں اور چبوتروں کے گرد کیاریوں کے قریب بنچیں بچھی ہوئی ہیں تاکہ پیدل چلنے والے کچھ دیر سستانے کے لیے بیٹھ جائیں اور اس ہستی کو یاد کریں جس کے تدبر نے ترکی کے مرد بیمار کو بستر مرگ سے اٹھا کر جوانمردوں کی صف میں شامل کر دیا ہو۔

ایک بڑے چوک سے گزرتے وقت ہم نے چاہا کہ کچھ دیر کے لیے باہر چل پھر کر ٹانگوں کو ورزش کرا دیں اور کچھ تھکن بھی ہو جائے تاکہ گہری نیند سو کر دوسرے دن کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔

برکات صاحب نے اس ملک کے قواعد کے مطابق اپنی موٹر سڑک کے دائیں جانب روک کر کھڑی کر دی اور ہم باہر نکل کر بچوں کو ساتھ لے کر پٹڑی پر دکانوں کے سامنے گھومنے لگے تاکہ بازار میں عام خرید و فروخت کا جائزہ لے سکیں۔

ہم ایک دکان میں گھس گئے جسے جنرل پروویژن اسٹور کہنا چاہیے۔ اس میں اچار مربّے چٹنیوں سے بھرے ہوئے شیشے کے چھوٹے چھوٹے مرتبان، شربتوں کی بوتلیں، خشک دودھ ڈبے، مکھن اور پنیر کے ڈبے، مختلف قسم کے بسکٹوں کے پیکٹ، چاکلیٹوں، ٹافیوں اور مٹھائیوں کے جار رکھے تھے۔ ہم نے لیبلوں پر نظر ڈالی۔ ترکی زبان میں ہر چیز کا نام چھپا ہوا تھا ہم نے اٹکل سے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ یہ تمام چیزیں ساختہ ترکیہ ہیں، کیونکہ لفظ ترکی ہر پتے کے ساتھ درج تھا۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہمارا قیاس صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ترکی یہ مصنوعات اپنے ہی ملک میں

تیار کرتا ہے اور کسی غیر ملک کا محتاج نہیں ہے۔

ہم نے بچوں کے لیے چاکلیٹ اور ٹافی کے ڈبے خریدے اور باہر نکل کر موٹر میں رکھ دیے۔ پھر دوسری طرف ٹہل گئے۔

ہم سینما گھر کے سامنے تھے لیکن یہاں نہ تو تماش بینوں کی لمبی لمبی قطاریں کھڑکیوں پر لگی ہوئی تھیں اور نہ ٹکٹ چور بازاری میں فروخت کیے جا رہے تھے۔ فلم دیکھنے کا موقع نہیں تھا، ورنہ پہلے سے ہمارا ارادہ تھا کہ ترکی زبان نہ جاننے کے باوجود ایک فلم ضرور دیکھیں گے۔ اگر دہلی کے ایک نابینا شاعر اُس زمانے میں جب کہ فلم متکلم نہیں ہوتے تھے، ہفتے میں ایک بار ضرور سینما جاتے اور اپنے پاس والے سے، جو اُنھی کا آوردہ ہوتا تھا، چپکے چپکے پوچھتے رہتے تھے کہ اب پردۂ سیمیں پر کیا ہو رہا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ہم محض غیر ملکی زبان میں ہونے کی وجہ سے ترکی فلم دیکھنے سے باز رہیں جبکہ اللہ تعالےٰ نے ہم کو سماعت و بصارت سے پوری طرح سرفراز کر رکھا ہے۔

شوکیسوں میں لگی ہوئی تصویریں دیکھ کر ہم فلم کے بارے میں یہ اندازہ لگا سکے کہ کسی مزاحیہ کھیل کی عکاسی کی گئی ہے۔ خود ترکی نے بھی خواجہ نصرالدین کے چند دستاویزی فلم تیار کیے ہیں، جو اصلیت سے بہت قریب ہیں۔ ان میں پروپیگنڈے کا رنگ نہیں پایا جاتا۔ بچوں کی زبانی معلوم ہوا کہ برکات صاحب اور ان کی بیگم کو ترکی فلم دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ دوسرے نمبر پر فرانسیسی فلم ہیں جو ترکی میں بہت مقبول ہیں۔ کبھی کبھی انگریزی زبان کے فلم بھی آ جاتے ہیں۔

اس ملک میں کوئی فلم خواہ کتنا ہی اچھا ہو، دو ہفتے سے زیادہ نہیں چلتا بلکہ اصولی طور پر چلایا نہیں جاتا۔ شاید اس کے بعد تیسرا اور چوتھا شاندار ہفتہ منانے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، کیوں کہ ہر شخص ایک فلم کو ایک ہی بار دیکھتا ہے جب کہ ہمارے ملک میں بعض سر پھرے ایک ہی فلم کو کئی کئی بار دیکھتے ہیں اور اکثر سیر نہیں ہوتے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے عوام ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے والہانہ قسم کی محبت نہیں کرتے، صرف ان کی اداکاری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اکثر ایکٹریسیں شادی شدہ ہیں، لیکن امریکی ایکٹریسوں کی طرح وہ جلد جلد طلاقیں نہیں لیتیں۔ ان کے نکاح بھی باقاعدہ ہوتے ہیں۔ سول میرج کی قسم کے رشتے نہیں جوڑے جاتے، جن میں زیادہ لچک ہوتی ہے اور معمولی کشیدگی سے درمیانی فصل بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔

نو بجے کے قریب ہم گھر واپس ہونے لگے۔ برکات صاحب کا مکان ایک اونچائی پر ہے۔ سڑک واقعی بالکل اس طرح ہے جیسی پہاڑوں پر چڑھتے وقت ہوتی ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ٹریفک کی وجہ سے

ایک جگہ اس اونچائی پر برکات صاحب کو موٹر روکنی پڑی۔ اس کے بعد جب بھی انھوں نے موٹر چلانے کی کوشش کی موٹر پیچھے نچائی پر لڑھکنے لگی۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو برکات صاحب گھبرا گئے اور ان کی ڈرائیوری کا صحیح حال معلوم ہو گیا۔ بارے کسی نہ کسی طرح موٹر چڑھائی پر چل گئی اور برکات صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تک انھوں نے اپنی ڈرائیوری کا حال نہیں بتایا تھا مگر اب انھوں نے سب کچھ قبول دیا اور میرا حال یہ کہ اب ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھنے میں تامل ہونے لگا۔ نادر شاہ کے ہاتھ میں جب تک راس نہ ہو، وہ ہاتھی پر کیسے بیٹھ سکتا ہی!

کھانے پر بچے ہمارا انتظار کر رہے تھے اور بیگم برکات ریڈیو کے قریب بیٹھی کان لگائے ہندوستانی نشریات سن رہی تھیں۔ اس وقت کوئی خاص تقریر نشر ہو رہی تھی، اور شاید اسی وقت ختم بھی ہو گئی کیونکہ وہ جلدی ہی کھانے کے کمرے میں آ گئیں۔ ہم اس وقت بچوں میں مٹھائیوں کے ڈبے تقسیم کر رہے تھے۔ برکات صاحب کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ انھیں بہت زیادہ بھوک لگ رہی تھی۔

شام کی چائے کی طرح اس وقت بھی ترکی کھانے میز پر چنے گئے۔ یہاں کے لوگوں کو کھانے پینے کا اچھا ذوق ہی اور دعوتوں میں خاص طور پر بڑا اہتمام کیا جاتا ہی۔ دعوت کے لیے کسی خاص تقریب کی ضرورت نہیں۔ اکثر دوست احباب اور رشتہ دار ایک دوسرے کو باری باری اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے ہیں تاکہ دسترخوان پر کبھی کبھی معمول سے زیادہ لوگ نظر آئیں۔ انھیں کھانے اور کھلانے کا یکساں شوق ہی۔ مہمانوں سے اپنے کھانوں کی تعریف سن کر گھر کی مالکہ خوب خوش ہوتی ہی۔ وہ اپنے لیے اسے فن طباخی کی سند سمجھتی ہی۔

برکات صاحب کے ہاں ترکی باورچن ہی جو فخریہ کہتی ہی کہ میرے خاندان کے لوگوں نے عثمانی فرماں رواؤں کے محلوں میں دیگیں دم کی ہیں اور اپنے کمالاتِ فن پر انعامات اور جاگیریں لی ہیں۔ فرانس کے لوگ ترکوں کو "مشرق کے بانکے" ہی نہیں کہتے بلکہ "مشرقِ قریب کے خوش خوراک انسان" بھی کہتے ہیں۔ ایک ترکی ضرب المثل ہی کہ "روح انسان کے جسم میں اس خوراک کے ساتھ داخل ہوتی ہی جو وہ کھاتا ہی"۔ بولو نامی ضلع کے لوگ اکثر باورچی کا پیشہ اختیار کرتے اور بڑے گھرانوں میں داروغہ مطبخ کہلاتے ہیں۔ ان کا یہ خاص مقولہ بہت مشہور ہی کہ "بھوکا ریچھ کبھی نہیں ناچے گا"۔ ترکی کے بہت سے کھانے دوسرے ملکوں میں مقبول اور رائج ہو گئے ہیں، لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ترکی کی "پیداوار" ہیں۔ مثلاً برصغیر پاک و ہند میں کباب، دولمہ اور پلاؤ

بہت عام ہیں۔ یہ ترکی الاصل ہیں لیکن اس پہلو پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ مغربی دنیا کے لوگ بھی یہاں آکر مقامی کھانے کھاتے اور بہت پسند کرتے ہیں۔

کھانے کی ابتدا ایک شوربے سے ہوئی تاکہ اشتہا تیز ہو جائے۔ اس شوربے کا نام "دُوِین چورباسی" یعنی شادی کا شوربہ ہے۔ گوشت کی یخنی میں اُبلے ہوئے انڈوں کی باریک قاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ذائقے کے لیے نمک مرچ کے علاوہ لیموں کا رس بھی شامل کیا جاتا ہے بھوک ہمیں پہلے سے لگ رہی تھی "شادی کا شوربہ" پی کر بے تابی میں اضافہ ہو گیا۔

ایک سالن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ اس کا نام بتایئے، اور جب میں کسی نئی چیز کی طرف "دست درازی" کروں، فوراً اس کا نام بتا دیجیے۔ چناں چہ پتہ چلا کہ اس سالن کا نام "امام بایلدی" تھا۔ اسے بینگن، پیاز اور ٹماٹر کی بھجیا کہنا چاہیے جو زیتون کے تیل میں بھون کر تیار کی گئی تھی۔ اس کی بابت مشہور ہے کہ ایک امام صاحب، جن کو یہ بھجیا بہت مرغوب تھی، ایک روز اسے کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گئے تھے۔ چناں چہ سالن کا نام "امام بایلدی" پڑ گیا۔ یعنی ایسا کھانا جو امام کو بے ہوش کر دے۔ غنیمت ہے کہ اسے کھانے کے بعد ہمارے ہوش و حواس قائم رہے اور ہم بے ہوش نہیں ہوئے!

تیسرا نمبر "کادِن بُودُو" کا تھا۔ اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں "لیڈیز تھائی" (عورت کی ران) کیا جا سکتا ہے۔ عورت کی پتلی انگلیوں کی مناسبت سے بھنڈی کو انگریزی زبان میں لیڈیز فنگر کہتے ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہمارے ملک کے ایک مشہور سالن "کوفتے" سے ملتے جلتے کھانے کو ترک لوگ "عورت کی ران" کیوں کہتے ہیں۔ گول ہونے کے اعتبار سے کسی اور چیز سے بھی تشبیہہ دی جا سکتی تھی۔ شاید وجہ یہ ہو کہ کوفتے کے لیے گوشت بھیڑ یا گائے کی ران میں سے پسند کیا جاتا ہوگا۔ ہم نے یہ کوفتے زیادہ پسند نہیں کیے۔ اس کھانے کا لطف یہ ہے کہ مرچیں خوب تیز ہوں اور اسے کھاتے وقت آنکھوں سے پانی بہنے لگے۔ لیکن ترکی میں سرخ مرچ اگرچہ رائج ہے لیکن کم مقدار میں استعمال ہوتی ہے۔

"عورت کی ران" کی طرح "عورت کی ناف" کے نام سے ایک مٹھائی بھی ترکی میں بہت مشہور ہے جسے عام طور پر "نافِ معشوق" کہا جاتا ہے۔ یہ چیز کھوئے سے تیار کی جاتی ہے اور ملائی کے بڑے پیڑے سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے بالائی حصے میں اس طرح نشیب پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ پیڑا واقعی "نافِ معشوق" معلوم ہونے لگتا ہے۔ اہلِ ترکی اسے اپنی زبان میں "کادِن گوبیگی"

کہتے ہیں۔

ترکی پلاؤ کی ہم نے بہت تعریف سنی تھی، آج اسے نیت بھر کے کھایا۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ یخنی تیار کر کے اور اس میں چاول ڈالنے کے بجائے گوشت کا قورمہ بنا کر اور اس میں چاول ڈال کر دم پخت کیا جاتا ہے۔ سرخ مرچ اور گرم مسالے کے علاوہ بادام بھی پڑتے ہیں اور زعفران سے اس کی رنگت پلٹی جاتی ہے۔ حالاں کہ قورمے کی وجہ سے بھی چاولوں کا رنگ خود ہی بدل جاتا ہے۔ اسے "کوزو دولماسی" کہتے ہیں۔

اہلِ پنجاب کی طرح یہاں بھی کھانے کے ساتھ دہی کی لسی کا رواج عام ہے، چناں چہ بیگم صاحبہ نے بھی اس کا التزام کیا تھا مگر میں نے کوئی رغبت ظاہر نہیں کی۔ البتہ بھائی جان دو گلاس پی گئے۔

کھانے کے بعد پھلوں کا دور بھی چلا۔ بحیرۂ روم کے ساحل پر اگنے والے سنگترے بہت رسیلے اور میٹھے تھے۔ ازمیر (سمرنا) کے انجیر، بورسا کے آڑو اور کوہ ارارات کی رس بھریاں مزا دے گئیں۔ کھانے کے ساتھ خربوزے کا تو میں ہے لیکن تربوز دیکھ کر ہمیں تعجب ہوا۔ دہلی والوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ غذا کے فوراً بعد تربوز کھایا جائے تو ضرور ہیضہ ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا تجربہ کبھی نہیں ہوا لیکن بڑے بوڑھوں کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے ہم نے برابر یقین کیا۔ کچھ قرینِ قیاس بھی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ تربوز عام طور پر نفخ کرتا ہے، اس لیے خالی پیٹ اور عموماً سہ پہر کے وقت اسے کھانا مناسب ہے۔ اگر غذا کے بعد کھایا جائے تو یہ غذا سے بہت پہلے ہضم ہو جاتا ہے، کیوں کہ سریع الہضم ہے، غذا جو اس سے قبل کھائے جانے کے باعث آگے ہوتی ہے، راستہ روکے رہتی ہے اور یہ ہضم ہو جانے کے باوجود معدے میں سڑتا رہتا ہے، نفخ پیدا کرتا ہے اور اگر اس کے بعد زیادہ پانی پی لیا جائے تو متلی ہوتی ہے اور قے بھی ہو جاتی ہے۔

کھانا کھاتے وقت سعد میاں کو شام کی چائے کے وقت سنائے جانے والے لطیفے کی بات یاد آگئی اور انھوں نے نوالہ روک کر کہا، اب ہی صحیح موقع کہ خواجہ نصر الدین کا لطیفہ کھانے سے متعلق سنایا جائے۔ ہر چند کہ ان کو منع کیا گیا کہ ابھی نہیں، کھانے سے فارغ ہو کر سنا لینا، مگر وہ نہ مانے اور کھانا بھول کر بیان جاری کر دیا:۔

"ایک روز خواجہ نصر الدین نے قصائی سے ڈیڑھ سیر پارچے بنوا کر گھر بھیجے اور بیوی کے نام پرچہ لکھ دیا کہ ان کو خوب اچھے مرچ مسالے کے ساتھ تل تلا کر شام کو تیار رکھنا تا کہ میں خوب سیر ہو کر کھا سکوں۔ شام کو بیوی نے پارچے تلنے ہی شروع کیے تھے کہ چند عزیز سہیلیاں بلا اطلاع

آدھمکیں اور بیوی کو مجبوراً ان کی خاطر مدارات انھی پارچوں سے کرنی پڑی کیوں کہ گھر میں کھانے کی اور کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد خواجہ نے گھر میں قدم رکھا۔ وہ بھوک سے بے تاب تھا اور مزے دار کھانے کی توقع میں پانی اس کے منھ میں بھرا چلا آرہا تھا۔ بیوی سے کھانا مانگا تو وہ بہت سٹ پٹائی۔ خاوند کے غصّے سے غریب ڈرتی تھی اور تو کوئی بات بن نہ سکی، سارا الزام بلی کے سر تھوپ دیا کہ یہ کم بخت آنکھ بچا کر سب پارچے چٹ کر گئی۔ میں نے تو اس وقت دیکھا جب کہ طباق بالکل خالی تھا۔ خواجہ نے فوراً بلی کو پکڑا اور ترازو میں رکھ کر تولا۔ اس کا وزن پورا ڈیڑھ سیر تھا۔ وہ غصّے میں لال پیلا ہو کر بولا کہ پارچوں کا وزن بھی ڈیڑھ سیر تھا۔ اگر یہ بلی ہے تو پارچے کہاں گئے اور اگر پارچے ہیں تو بتاؤ کہ بلی کہاں گئی"۔

برجیس نے فوراً فقرہ کسا۔ "سعد کے پیٹ میں"۔ اس پر قہقہہ پڑا اور سعد میاں منھ بنا کر بل کھا کے رہ گئے۔

کھانے کے بعد قہوہ بھی پینا پڑا کہ یہ نہ صرف یہاں کی رسم ہے بلکہ مرغن غذا کو ہضم کرنے کے لیے ضروری بھی ہے۔ مجھے اپنی مرضی کے خلاف یہ گرم گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے پڑے۔

مزید چوندن کا اہتمام بیگم برکات نے یہ کیا کہ اپنے پسندیدہ ترکی گراموفون ریکارڈ سنانے شروع کر دیے۔ یہاں کی کلاسیکی موسیقی سن کر رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ اس پر قدرتی طور سے عرب موسیقی کا اثر ہے لیکن جدید موسیقار فرانسیسی، جرمنی اور سوئس موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ مقابلتہً ہم نے کلاسیکی موسیقی کو پسند کیا جس کے بول دل میں اتر جانے والی تاثیر پوشیدہ رکھتے ہیں اور بہت جلد اپنے دل کے تاروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

ایک ریکارڈ بجاتے وقت کمرے کی بتیاں گُل کر دی گئیں تاکہ گیت کا تاثر زیادہ تیز ہو جائے۔ یہ بہت ہی درد ناک اور دلدوز گیت تھا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ ایک دولھا حجلۂ عروسی میں جہاں تاریکی زیادہ اور روشنی کم ہے، دبے قدموں جاتا ہے تاکہ دلھن کو اپنی اچانک آمد سے چونکا دے اور اس کیفیت سے لطف اٹھائے لیکن جب وہ سیج کے قریب پہنچتا ہے تو خلافِ توقع دلھن کو مردہ پاتا ہے۔ ایک دل خراش چیخ اس کے سینے سے نکلتی ہے جو بتدریج اندوہناک تان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آواز سن کر دلھن کی سہیلیاں بے حجابانہ اندر گھس آتی ہیں اور وہ بین کر کر کے اس المیہ گیت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ گیت اپنے عروج پر اس وقت پہنچتا ہے جب کہ دولھا بھی ایک آخری چیخ مار کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔ یہ خاموشی کچھ اس

طرح طاری ہوتی ہو کہ سننے والوں کو تاریک کمرے میں ایک نامعلوم خوف سا محسوس ہونے لگتا ہو۔

کمرے میں روشنی ہو گئی لیکن تاثرات کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے سے بڑے تک کوئی بھی کچھ دیر کے لیے بول نہ سکا۔

محفل برخاست ہو گئی۔ ہم دونوں بھائیوں کے سونے کا انتظام اوپر کی منزل میں کیا گیا تھا۔ لہٰذا ہم اپنے میزبانوں کو "شب بخیر" کہہ کر اوپر چلے گئے۔

کچھ تو میری عادت ذرا دیر میں سونے کی ہو اور کچھ قہوے نے اثر کیا کہ خاصی دیر تک مجھے نیند نہ آسکی۔ بھائی جان نے چند ضروری خطوط لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اس لیے میں نے خواب گاہ میں رکھے ہوئے کتابوں کے ریک پر نظر ڈالی اور تاریخ ترکی پر ایک کتاب نکال کر پڑھنی شروع کر دی۔

کتاب مختصر مگر معلومات سے لبریز تھی۔ مصنف نے کوزے میں دریا کو بند کر دیا تھا میں نے جب تک اس کا تمہیدی باب ختم نہ کر لیا، بستر پر دراز نہ ہو سکا اور جب سویا تو رات بھر ترکی حکومتوں کے عروج و زوال اور زوال و عروج کے خواب دیکھتا رہا۔

ترکوں کا عہد قدیم : چودہ سو قبل مسیح کے بعد سے سرسری طور پر اور خصوصاً دو سو قبل مسیح کے بعد سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ چین کے تاریخی نوشتوں میں ایسے جنگجو اور خانہ بدوش قبائل کا ذکر ملتا ہو جو چینی زبان میں ھی اِنگ نو یا ھسی اِنگ نو کہلاتے تھے۔ ان کا زور سین پی نامی قبیلے نے توڑ دیا اور شمالی چین میں وئی خاندان کے نام سے حکومت کی داغ بیل رکھی۔ یہ لوگ ایسے پہاڑی علاقے میں آباد ہوئے جو اپنی وضع قطع کے لحاظ سے "ترکو" یعنی سر پر رکھنے کا خود کہلاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہی نام اس قبیلے کا پڑ گیا۔

بعض مورخین کا خیال ہو کہ ترک کے معنی طاقت ور کے ہیں اور چوں کہ یہ لوگ بڑے جنگجو تھے اور آس پاس کے رہنے والے ان کی طاقت کا لوہا مانتے تھے، اس لیے یہ ترک کہلانے لگے۔

چینی نوشتوں میں اس قوم کے لیے لفظ ترک سب سے پہلے سنہ ۵۴۵ء میں استعمال ہوا ہو۔ اس قوم کے لوگوں نے قتل و غارت کے ذریعے آس پاس کے رہنے والوں کو ختم کر دیا اور فاتحانہ انداز میں چاروں طرف پھیلنے شروع ہو گئے۔ وہ اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے سنہ ۵۶۰ء میں دریائے جیحوں کے کنارے آباد قبائلیوں کا مقابلہ کیا اور شکست دے کر مغربی سمت میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

اس وقت ان کا سردار تومن تھا جس نے آئی خاں کا لقب اختیار کر لیا۔ اس کا بھائی

اِنتساحی اُمہ کا بیٹا موکان اور بھتیجا ترددو اسی کی طرح بہادر اور لڑاکا تھے۔ ترددو نے سنہ ۵۶۸ء میں اپنا ایک ایلچی مشرقی روم کے شہنشاہ جسٹینین دوم کے پاس بھیجا اور تعلقات قائم کرنے چاہیے۔ چناں چہ رشتہ استوار ہو گیا اور جب ہرقلیس نے فارس کے خلاف سنہ ۶۲۰ء میں مہم شروع کی تو ترکوں نے امداد کے لیے اپنے سپاہی بھیجے لیکن اسی موقع پر اندرونی خلفشار کے باعث ترک دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور الگ الگ ان کے فرماں روا ہو گئے۔

مغربی علاقے کے ترک زیادہ تر فارس کے ایک حصے میں ڈیرے ڈال کر رہنے لگے اور ان کا بڑا مشغلہ زراعت ہو گیا۔ مشرقی علاقے کے ترک جو زیادہ تر منگولیا کی طرف بڑھے تھے، وہاں کے جغرافیائی حالات کے باعث خانہ بدوش ہی رہے اور اس لیے ان کا مشغلہ گھوڑے اور دوسرے جانور پالنا تھا۔ قدرت کی خودرو نعمتیں ان کو راہ میں مل جاتیں تو وہ ان کو بخوشی قبول کر لیتے تھے۔

یہ لوگ ان علاقوں میں پھیل گئے جو زنگاریہ، تاشقند، فرغانہ، بخارا، بدخشاں، غزنی اور بامیان وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ لیکن سنہ ۶۵۰ء میں مشرقِ قریب کی سیاست مسلمانانِ عرب کی چوکھی یلغار سے بدلنی شروع ہو گئی۔ انھوں نے ان سب علاقوں پر اپنا پرچم لہرا دیا، جہاں ترک قبائل کے لوگ آباد تھے۔ وہ ماوراء النہر کے علاقے تک پہنچ چکے تھے۔

جھیل بیکال کے جنوب میں دریائے اورخون کی وادی میں کھدائی ہوئی تو آٹھویں صدی عیسوی کے بعض کتبے ایسے نکلے ہیں جن سے ان محاربات کا پتہ چلتا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ترک وسطی ایشیا کی طرف کیوں بڑھتے چلے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ یونانیوں سے رشتہ استوار ہونا ان کے لیے اس قدر بھروسے کی بات تھی کہ وہ اس طرف بڑھنے کے سوا کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن یونان کی حکومت خود دم توڑ رہی تھی۔ مسلمانانِ عرب نے ان کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اس لیے اس کے بعد کی دو صدیاں، ترک قوم کے لیے حرفِ غلط کی طرح مٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

اِن دو سو سال میں انھوں نے نہ تو کہیں سر اٹھایا، نہ کسی سے ساز باز کر کے اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جرگے مختلف علاقوں پر قابض رہے۔ خود ان میں اتحاد و اتفاق نہیں تھا کہ وہ مل کر ہی کوئی پہاڑ ڈھا سکتے۔

ترکوں کا قبولِ اسلام : اس دوران میں بہت سے ترک قبیلے جن کا آبائی مذہب قدرت کی پرستش تھا، مسلمانوں کی بے پناہ قوت کے سامنے ہتھیار ڈال کر مسلمان ہو گئے تھے۔ انھیں زندہ رہنے کا یہی راستہ نظر آتا تھا۔ مقابلے کی سکت ان میں باقی نہیں تھی۔ ان میں سے بعض نے

اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد اپنے عقائد میں تبدیلی کی تھی۔

تاہم اس عہد کی دو صدیاں ترک قوم نے اس درجہ کس مپرسی کے عالم میں گزاری تھیں کہ تاریخ میں ان کا نام مشکل سے کہیں کہیں معمولی طور پر ملتا ہے۔ حتیٰ کہ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق نامی ایک سردار قبیلہ کے تین پوتے طغرل بیگ، شاکر بیگ اور ابراہیم نیال ذرا پر پرُزے سنبھال کر کھڑے ہوئے کیونکہ انھیں قبیلے کے لوگ تیموریالک یعنی "کمانِ آہن" کہتے تھے۔ بالفاظِ دیگر ان کے خیال میں ان کو کسی قوت سے جھکانا مشکل تھا۔ اس قبیلے کے لوگ ماوراءالنہر کے علاقے میں آباد تھے۔

انھوں نے پہلا قدم بڑھایا اور جیحوں کا علاقہ فتح کر لیا۔ اب ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ انھوں نے الگ الگ تین سمتوں میں یلغار کا فیصلہ کیا۔

سلجوقیوں کی یلغار: طغرل بیگ نے ایران کے مشرقی صوبہ مرو پر چڑھائی کی اور اپنی آزاد حکومت قائم کر لی لیکن تیسرا بھائی سب سے زیادہ تیز نکلا وہ ہمدان اور عراقِ عجم کو تاراج کرتا آرمینیا تک جا پہنچا۔ ایشیائے کوچک کے مشہور علاقوں ارض روم اور طربزون پر بھی قبضہ جمالیا۔

اس کی یہ فتح جذبۂ حسد کے باعث باقی دو بھائیوں کے دلوں میں کانٹا بن گئی۔ طغرل بیگ نے چاہا کہ مفتوحہ علاقوں کا بٹوارا اس کی مرضی کے مطابق ہو، کیوں کہ وہ سب سے بڑا بھائی تھا، لیکن ابراہیم کو یہ منظور نہیں تھا۔ اس لیے ان میں آپس ہی پھوٹ پڑ گئی۔ اول الذکر نے خلیفہ بغداد سے مدد مانگی اور اپنی حیثیت مستحکم کر لی اور وہ اس تمام علاقے پر قابض ہو گیا جسے اناطولیہ کہتے ہیں۔ اس طرح وہاں سلجوق خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔

اس سرزمین کو یہ نام اہلِ یونان نے دیا تھا۔ ان کی زبان میں یہ طلوعِ شمس کی سرزمین تھی، کیوں کہ وہ یہاں سے سورج کو طلوع ہوتا دیکھتے تھے۔ اسی انداز میں سمت کا تعین اور ملکوں نے بھی کیا ہے۔ مثلاً اہلِ روس نے سورج کو سائبیریا کے آخری سرے سے نکلتا دیکھا تو اپنے الفاظ میں اسے ولادی ووسٹوک کہنا شروع کر دیا اور یہی اس علاقے کا نام پڑ گیا جو آج بھی رائج ہے۔ اہل چین کے نزدیک جاپان طلوعِ شمس کا مقام تھا، انھوں نے اسے نپن کہا اور یہی اس ملک کا نام پڑ گیا آج جاپانی بھی اپنے ملک کو نپن کہتے ہیں۔

سلجوقیوں کے حملے کے وقت اناطولیہ پر یونان کے شاہی خاندان کا ایک فرد شہنشاہ رومانس ڈایوجی نیز حکومت کرتا تھا جسے قید کر لیا گیا سنہ ۱۰۷۱ء کا واقعہ ہے۔ یہ لڑائی جھیل وان کے جانب

شمال میلاشگرٹ کے مقام پر ہوئی تھی۔ ان سلجوقیوں نے عیسائیوں پر کوئی ظلم نہیں ڈھایا۔ البتہ عیسائی ثقافت کے بہت سے نادر نمونے ضائع کر دیے جو ان کے ذوق یا عقیدے کے خلاف تھے۔

انھوں نے قونیہ کو جو عین قلب اناطولیہ میں واقع ہے، اپنے استحکام کا مرکز بنا لیا۔ انھوں نے بارھویں صدی شروع ہونے تک اناطولیہ کا بیشتر حصہ اپنے زیر نگیں کر لیا۔ بازنطینی حکومت کے لیے یہ آغاز بردست دھکا تھا کہ وہ ذرا بھی نہ پنپ سکی بلکہ اسے برابر نقصان پہنچتا رہا۔

طغرل کے بعد الپ ارسلان نے اور پھر ملک شاہ نے عنانِ حکومت سنبھالی جو مرکز کے حاکم اعلیٰ رہے۔ ان کے ماتحت ہر علاقے کا ایک علیحدہ سردار مقرر کیا جاتا رہا کیوں کہ یہ خطرہ ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں آپس ہی میں چپقلش ہو جانے سے مرکزی حکومت کے استحکام پر ضرب نہ لگ جائے۔

ان سلجوقیوں نے اگرچہ شروع میں یونانی ثقافت کو تباہ کر دیا تھا اور بعض عمارتیں بھی ڈھا دینے کی کوشش کی لیکن بہت جلد انھوں نے محسوس کر لیا کہ یہ تو اپنا ہی نقصان ہوگا، کیوں کہ اب ملک اپنا ہی اور یہیں رہنا ہے۔ لہٰذا انھوں نے یونانی، ایرانی اور عرب ثقافتوں سے اثر لینا شروع کر دیا۔ فنون کے علاوہ علم و ادب کو نوازا۔ ایرانی تصوف سے متاثر ہو کر اس کی سرپرستی بھی کی۔ ایران کے شہرۂ آفاق صوفی مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ اسی زمانے میں گزرے ہیں، جن کی بارگاہ میں سلجوقی فرماں روا بھی جھک جانا باعث فخر سمجھتے تھے۔

سلجوقیوں کا زوال:۔ اگرچہ سلجوقیوں نے کوشش تو بہت کی لیکن ان کی حکومت کو زیادہ عرصہ استحکام نصیب نہ ہو سکا۔ اس کے دو سبب تھے۔ ملک کے بیشتر باشندے یونانی النسل تھے جنھوں نے قوت کے سامنے ہار مان کر اطاعت قبول کر لی تھی لیکن قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ میں بغاوت کا مادہ ہر وقت کھولتا رہتا تھا۔ دوسری طرف خود سلجوقی قبائل کے افراد فطرۃً خانہ بدوش تھے اور کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی اس طبعی افتاد نے ان کو حکومت سے پوری طرح وابستہ نہ رکھا۔ وہ اس پرندے کی طرح تھے جو ہر وقت قفس کا در کھلنے اور فضا میں پرواز کر جانے کی سوچ رہتا ہے۔ ان میں سے بعض طلب چاہتے تھے کہ کسی طرح اپنے وطن کو لوٹ جائیں۔ اسی لیے وہ سلجوقی فوج میں بھرتی ہونے سے کتراتے رہے۔ چنانچہ چودھویں صدی عیسوی میں جو یکایک منگولوں نے اس علاقے پر حملہ کیا تو ایک دم افراتفری مچ گئی اور ذہنی اعتبار سے یہ خانہ بدوش لوگ اپنے گھر بار، جانوروں کی پیٹھ پر لاد کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ میدانِ

کارزار میں مقابلے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا اور منگول لشکر تمام ایشیائے کوچک کو تباہ و برباد کرتا بحیرۂ اوسط (ایجین) کے ساحل پر سمرنا (موجودہ ازمیر) تک پہنچ گیا۔ لیکن ان منگولوں کا منشا بھی نئی سرزمین پر ڈیرے ڈالنا نہیں تھا۔ وہ زلزلے کے ایک جھٹکے کی طرح آئے اور دوسرے جھٹکے کی مانند لوٹ گئے۔

اس آمد و رفت میں تباہی کے بہت سے بیج بو دیے گئے۔ سلجوقی فرماں رواؤں میں سے کچھ تو لڑائی میں کام آگئے اور کچھ پردۂ گمنامی میں جا چھپے۔

سلیمان لی:۔ اس موقع پر ایک اور چھوٹے سے ترکی قبیلے کو جو کچھ عرصے سے وسطی ایشیا میں دریائے جیحوں کے کنارے آباد تھا نئی سرزمین پر قدم رکھنے کا شوق پیدا ہوا تاکہ اگر ممکن ہو تو اپنے مویشیوں کے لیے نئی چراگاہیں ڈھونڈھ نکالیں اور اپنے عیش کے سامان بھی مہیا کرلیں۔ اس قبیلے کی نقل و حرکت کا سربراہ ایک شخص سلیمان تھا اور اس کا بیٹا ارطغرل اس کے ہمراہ تھا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ اس قبیلے کے لوگ اوز غز ترکوں کی نسل سے تھے۔ سلجوقی فرمانروا نے ان کو کچھ زمین اناطولیہ میں ارزنجان کے آس پاس دے دی۔ چناں چہ اس منگولی قبیلے کے پچاس ہزار خاندان وہاں آباد ہو گئے۔ شروع میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور وہ مجبوروں کی طرح سلجوقی فرمانروا کو خراج ادا کرتے تھے لیکن اس شاہی خاندان کا سیاسی نظام دو صدی تک حکومت کرنے کے بعد درہم برہم ہو چلا تھا۔ یہاں تک کہ سیاسی کل پرزے چلانے کے لیے صحیح اہل کار موجود نہیں تھے۔ سلجوقی سلطان علاءُ الدین جس پر بھروسہ کرتا' زک اٹھاتا تھا۔ مصلحتاً اسے اس قبیلے پر اعتماد ظاہر کرنا پڑا اور اسی لیے ارطغرل کو اناطولیہ کے شمال مغربی علاقے کا نائب السلطنت بنا دیا۔ یہ علاقہ بازنطینی سرحد سے ملا ہوا تھا۔

علاءُ الدین سنہ ۱۲۳۶ء میں فوت ہو گیا تو اس کا بیٹا خسرو دوم تخت پر بیٹھا لیکن اگلے دس سال میں حکومت کی چولیں اور بھی ڈھیلی ہو گئیں۔ اس اثنا میں اس قبیلے کے افراد مختلف صوبوں کے گورنر بن چکے تھے اور صحیح معنوں میں حکومت اُنھی کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں سے بعض نے منگولیا کے فرمانروا سے ناطہ جوڑ لیا تھا کیوں کہ ان کی مٹی دراصل اسی سرزمین سے وابستہ تھی۔ یہ سلجوقیوں کے لیے ایک اور کاری ضرب تھی۔

عثمان لی:۔ ارطغرل کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے اقتدار حاصل کیا اور اس کے

نام پر قبیلے کا نام عثمان لی پڑ گیا۔ اس نے بڑی حد تک خود مختاری حاصل کر لی اور قبیلے کے جملہ افراد کو ارزنجان سے منتقل کر کے جانب غرب وادی کراسو میں لے گیا جہاں یونانیوں اور دوسرے مغربی اثرات سے براہِ راست واسطہ پڑنے لگا۔ ان میں سے بہت سے خاندان اس علاقے میں جا بسے جو اب قونیہ کہلاتا ہے۔ خود سردار قبیلہ عثمان نے اپنا مرکز ینی شہر میں قائم کیا اور اپنے لیے امیر کا خطاب اختیار کر لیا۔

عثمان لی قبیلے کے افراد بُت پرست تھے۔ وہ نصرانیت سے بالکل متاثر نہ ہوئے۔ البتہ چودھویں صدی میں جب عرب مبلغین کی جماعتیں اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں ان کے پاس پہنچیں تو وہ فوراً نیا مذہب قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ عثمان نے جو ثقافتی اعتبار سے یونانیوں سے بہت متاثر تھا، یونانی انداز کی بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ صرف مسجدوں کے مینار اسلامی طرز پر بنائے گئے۔

اس اثنا میں بعض یونانی شہروں کے حاکم اپنی اصل سلطنت کے مرکزی مقام قسطنطنیہ سے اعانت نہ ملنے کے باعث زچ ہو رہے تھے، چناں چہ ان میں سے اکثر نے مصلحتِ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا اور عثمان سے مل جانا بھی مناسب سمجھا۔ حاکموں کے نقوشِ قدم کی پیروی رعیت نے کی اور اس طرح عثمان کی طاقت بہت ہی مستحکم اور استوار ہو گئی۔ اس نے یونانیوں کی بہت ہی مضبوط چھاؤنی بُرسہ پر قبضہ کر لیا لیکن عوام پر بڑی نظرِ عنایت رکھی اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔

اور جب سنہ ۱۳۲۶ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اورخاں سریر آرائے سلطنت ہوا جس نے برسہ ہی کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ اس نے باپ سے جو رازِ حکومت سیکھا تھا اسے مزید فروغ دیتے ہوئے اعلیٰ طبقے کے اور بھی یونانیوں کو ان پر بارشِ لطف و کرم کر کے اپنا بنا لیا تاکہ میدان زیادہ ہموار ہو جائے اور کوئی دغدغہ باقی نہ رہے۔ اس نے ایک بازنطینی شہزادی سے شادی بھی کر لی۔

مراد:۔ اورخاں کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۵۹ء میں اس کا بیٹا سلطان مراد تخت پر بیٹھا، تو اس نے سب سے پہلے ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیا جو قسطنطنیہ کے بعد یونانیوں کا دوسرا مستحکم قلعہ تھا۔ مراد کو یہ موقع آسانی سے مل گیا کیونکہ بازنطینی فرمانرواؤں کی باہمی چپقلش زیادہ شدت اختیار کر کے ان کا شیرازہ بکھیر رہی تھی۔ عثمانیوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا

اور چاروں طرف پھیلنا شروع کر دیا۔ سلطان مراد نے گہری سیاسی حکمتِ عملی کو اپنا ہتھیار بنایا اور اس طرح جو بھی وار کیا، بھرپور اور کارگر ثابت ہوا۔ اس نے چنگیز خاں یا ہلاکو کی طرح تباہ کاری کو اپنا طرۂ امتیاز نہیں بنایا بلکہ جس سرزمین کی طرف قدم اٹھایا کم سے کم قتل و غارت گری کو روا رکھا۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ جس علاقے پر حکومت کرنی ہو، وہاں کے باشندوں کا دل موہ لیا جائے تاکہ وہ جواب میں اطاعت و فرماں برداری کا مظاہرہ کریں۔

بہت جلد مراد سارے یورپ کے لیے ایک "ہوّا" بن گیا۔ اس نے اسلامی اصول کے مطابق فرمان جاری کر دیا کہ مفتوحہ افراد جزیہ ادا کریں یا اسلام قبول کر کے مساوی حقوق حاصل کر لیں۔ چناں چہ اس کی مملکت میں نومسلموں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ مراد نے اپنے استحکام کے لیے جاں نثاروں کی جماعتیں بھی تیار کیں، جن کو بالکل فوجی انداز میں تربیت دی جاتی لیکن ان کا عام مشغلہ کچھ اور ہوتا تھا۔ ان جماعتوں میں شامل ہونے والوں کے لیے بڑی مراعات تھیں اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وفاداری کا جذبہ عوام کے دلوں میں گھر کر لے۔ بغاوت اور سرکشی کا احتمال تک پیدا نہ ہو۔

بایزید یلدرم: مراد کوسوو کے میدان میں مارا گیا اور اس کا بیٹا بایزید عثمانی سلطنت کا امیر بن گیا اور اس لڑائی کو، جس میں باپ ہلاک ہوا تھا، جاری رکھا اور انجام کار کامیابی پائی۔ اسے سربیا، بلغاریہ اور ہنگری تک پر اقتدار حاصل ہو گیا۔ پھر اس کی نگاہیں قسطنطنیہ کی طرف اٹھیں۔ بازنطین کا یہ مضبوط قلعہ جس کا روم کے بعد دوسرا نمبر تھا، ابھی تک ترکوں سے سر نہ ہو سکا تھا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یونانی ترکوں کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ عثمانیوں کے پاس بحری فوج بالکل نہیں تھی۔ قسطنطنیہ کا محاصرہ ہر بار بہت جلد دل شکن ہو جاتا تھا۔

بایزید کو سنہ ۱۴۰۲ء میں ویسے بھی اپنے منصوبے بدل دینے پڑے، کیوں کہ وسطی ایشیا کو فتح کرنے والا تاتار اعظم تیمور لنگ ایشیائے کوچک میں داخل ہو کر سیواس پر قبضہ کر چکا تھا اور مغرب کی طرف اس کی یلغار تھی۔ منگولوں کی طرح اس کا مقصد بھی اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ غیر علاقوں کو فتح کر کے لوٹ مار کا بازار گرم کرے۔ اس کی حریص نگاہیں شام و مصر تک اٹھی ہوئی تھیں۔

اس موقع پر بایزید کا فطری تدبر کام نہ آسکا۔ اس پر تیمور کی بڑھتی ہوئی فوج کا خوف اس طرح طاری ہوا تھا کہ اس کی عقل ماؤف ہو گئی تھی۔ سیاسی حکمتِ عملی سے کام لینے کے بجائے اس

نے غیر دانشمندانہ رویہ اختیار کیا۔ اس نے تیمور کو ہتک آمیز پیغامات بھیجے۔ تیمور کو قدرتی طور پر اس طرزِ عمل پر چراغ پا ہو جانا چاہیے تھا۔ چناں چہ ترکوں اور تاتاریوں کی فوجیں جولائی ۱۴۰۲ء میں انقرہ کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل ہو گئیں۔

ایک بار پھر بایزید نے کم عقلی کا ثبوت دیا۔ تیمور کی فوجیں پہاڑی علاقے پر مورچے بنا چکی تھیں۔ اسے چاہیے تھا کہ عثمانی لشکر کو دامنِ کوہ میں کھلے میدان سے دور رکھتا اور پہاڑی دروں سے لیجا کر تیمور کو چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ کامیابی کی امید صرف اسی طرح ممکن تھی۔ کھلے میدان میں اور وہ بھی پہاڑی کے دامن میں اس کی فوجیں بالکل بے بس تھیں۔ نتیجہ ظاہر ہے، بہت جلد عثمانی لشکر میں افراتفری پھیل گئی۔ بہادر سپاہیوں کے بھی چھکے "چھوٹ گئے"۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ بایزید گرفتار ہو گیا اور ایک ہی سال میں فوت بھی ہو گیا۔

انقرہ کے مقام پر یہ لڑائی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ترکوں کی تاریخ کے پہلے تین سو سال میں یہ اوّلین شکست تھی جس نے عثمانی سلطنت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اگر تیمور کا حملہ محض جارحانہ نوعیت کا نہ ہوتا تو سلطنتِ عثمانیہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن تیمور ایک سال بعد ہی لوٹ کر سمرقند چلا گیا اور وہاں جا کر خود بھی جلدی ہی فوت ہو گیا۔ اس نے ایشیائے کوچک کی سیاست میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی۔

مرادِ ثانی بایزید کے غلط اندازِ رویے کے باوجود تسلیم کرنا پڑے گا کہ سلاطینِ عثمانیہ سے وفاداری کا جذبہ اور کسی قدر ان کا رعب ملک کے غیر ترک باشندوں خصوصاً فوجیوں پر طاری تھا یعنی فوج کی شکست، سلطان کی موت اور دشمن کے تسلّط کے باوجود یونانیوں، یا سلافیوں نے جو بڑی تعداد میں فوج میں شامل تھے، ایک لمحے کے لیے بھی اپنی حکومت سے غداری نہیں کی۔ اگر وہ ذرا بھی راہِ فرار اختیار کرتے تو بکھری ہوئی تیلیوں کو دوبارہ سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔ چناں چہ تیمور کے جاتے ہی بایزید کے بیٹے محمد اوّل کو سب نے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ اس نے ۸ سال اور اس کے بیٹے مراد ثانی نے ۳۰ سال حکومت کی اور اس نصف صدی میں وہ خواب جو بایزید نے دیکھے تھے اور شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے تھے، عمل میں آ گئے۔ اناطولیہ کے چھوٹے چھوٹے امیر، جو برائے نام حکومتیں سنبھالے بیٹھے تھے اور سیدھے سبھاؤ اطاعت قبول نہ کرتے تھے، ایک مرکز کے ماتحت آ گئے" اور اس طرح یورپ میں سب سے بڑی اور مستحکم سلطنت قائم ہو گئی جس میں بلقان کی ریاستیں بھی شامل تھیں۔

مراد ثانی نے قسطنطنیہ فتح تو نہیں کیا لیکن رومی شہنشاہ کو اس حد تک مجبور کر دیا کہ وہ خراج ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ یہ بازنطینی تاریخ کے صفحات پر پہلا بدنما داغ تھا۔

محمد ثانی :۔ اور رجب سنہ ۱۴۵۱ء میں محمد ثانی نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو اس نے خراج کی رقم متعین کر کے آخری رومی فرمانروا سے جھگڑا کر لیا اور ایک معمولی معرکے میں اسے اور اس کی بچی کھچی فوجوں کو ختم کر دیا۔

محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ البتہ ثقافتی ادارے بدستور قائم رکھے۔ یونانی ناموں تک میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ صرف بعض کاموں میں ایسی ترمیم و تنسیخ کی جو مصلحتِ وقت کے اعتبار سے ضروری تھی۔

بعض متعصب مورخین نے لکھا ہے کہ اس موقعوں پر ترکوں نے زبردست لوٹ مار کی لیکن درحقیقت وہاں لوٹنے کے لیے رکھا کیا تھا۔ حکومت کا خزانہ خالی تھا اور ثقافتی نوادر پہلے ہی یورپ کے بازاروں میں لے جا کر فروخت کیے جا چکے تھے جو اس وقت تک وہاں کے عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ البتہ ترکوں کو اس معرکے میں وہ کلیدی مقام حاصل ہو گیا جو یورپ اور ایشیا کے درمیان زبردست اہمیت رکھتا ہے اور جس پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد ترک اقوامِ عالم کو آنکھیں دکھانے کے لائق ہو گئے۔

سلیم اوّل :۔ محمد ثانی کے بعد بایزید ثانی اور پھر سلطان سلیم کا دورِ حکومت شروع ہوا۔ سلیم نے پہلی بار ایران پر چڑھائی کی جہاں شاہ اسمٰعیل صفوی سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اس کا یہ شبہ قرینِ قیاس تھا کہ شاہ اسمٰعیل یورپ کی بڑی طاقتوں سے سازباز کر کے ترکوں کے خلاف ان کو اکسانا چاہتا تھا، کیوں کہ اس کے دل میں سیاسی رقابت کے علاوہ ترکی کے مسلمانوں سے مذہبی عناد بھی تھا۔ چناں چہ شاہ اسمٰعیل کو شکست دے کر اس نے کم سے کم مشرقی اناطولیہ میں اس کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

پھر اس نے جانبِ جنوب رخ کیا تاکہ عربوں کی سرزمین پر جو خلا پیدا ہو گئے ہیں ان کو پُر کر دے۔ اس نے مصر پر حملہ کر کے مملوک سلاطین کو شکست دی اور شمالی افریقہ کے ساحل تک جا پہنچا۔ بعض مورخین کی رائے ہے کہ سلیم سخت ظالم و جابر تھا۔ لیکن دراصل وہ انصاف پسند تھا اور بعض باتوں میں مشکل سے کسی پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ خاص طور پر عدالتوں میں صحیح فیصلے چکائے جانے کا متمنی تھا۔ چناں چہ اس نے بہت سے نام نہاد منصفوں پر جو بدقماش تھے،

باقاعدہ مقدمہ چلا کر انھیں سخت سزائیں دیں۔ اسی لیے تاریخ میں اسے سلیم عادل بھی کہا جاتا ہے۔

سنہ ۱۵۲۰ء میں سلیم کے بعد اس کا بیٹا سلیمان، جسے قانون ساز کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، تخت پر بیٹھا۔ اس وقت یورپ، خصوصاً مشرقی یورپ میں بہت سی حکومتوں کا حال خراب تھا۔ ان کی باہمی چشمک ان کے انحطاط کا باعث بن رہی تھی۔ وہ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی فکر میں اقتصادی حالت سدھارنے کی طرف سے خالی الذہن تھیں۔ اس لیے غریب کسان اور دست کار غربت و افلاس سے مرے جا رہے تھے۔ چناں چہ سنہ ۱۵۲۶ء میں جب اس نے یورپ کی طرف قدم بڑھایا تو زیادہ سخت مقابلہ نہیں ہوا۔ عوام نے یا تو بے تعلقی ظاہر کی، یا نجات دہندہ سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ صرف وائنا کے محاصرے میں اسے کامیابی نہیں ہوئی، ورنہ ہر جگہ کامرانی نے اس کے قدم چومے۔ اس نے مفتوحہ قوموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور ان اصولوں پر کاربند رہا جن کی تلقین دینِ اسلام نے کی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود سلیمان قانونی کے کردار کا ایک پہلو بہت مذموم تھا۔ وہ اپنی نکاحتہ بیوی کے بجائے قوم سلاف کی ایک کنیز —— رخسالینہ —— پر جو داشتہ کی حیثیت سے اس کے حرم میں رہتی تھی، اس قدر فریفتہ تھا کہ اس کی چشمِ ناز کے ہر اشارے کو ایک حکم کا درجہ دیا جاتا تھا۔ چناں چہ اس ظالم عورت یا خوبصورت ناگن نے جائز وارثِ تخت کو خود سلطان کے ایما سے موت کے گھاٹ اتروا دیا اور اپنے بیٹے سلیم کو جو سخت شرابی ہونے کے علاوہ نہایت جاہل، ظالم اور کمینہ تھا، ولی عہد قرار دے دیا۔ اسی عورت کے زیر اثر کسانوں سے مالیانہ وصول کرنے کا طریقہ ملک کی تاریخ میں پہلی بار رائج کیا گیا، جو سلطان کے خلاف عام برہمی پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا۔

سلطان سلیمان قانونی کے عہد میں ترکوں کی بحری فوج بھی اچھی طرح منظم ہو کر اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی اور تمام بحیرۂ روم میں اسے اجارہ داری حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن اسی عورت کی سازش سے اس نظام میں خرابیاں پیدا ہوئیں اور امیر البحر سمندری لٹیرے بن کر رہ گئے۔

اندرونی خلفشار کے علاوہ کچھ بیرونی سیاست بھی ملک کے حالات پر اثر انداز ہوئی۔ سنہ ۱۵۳۶ء میں فرانس کے شاہ فرانسس نے پادیہ کے میدانِ جنگ میں شاہ چارلس پنجم کی فوجوں سے شکست کھائی تو اس کی نگاہیں مملکتِ عثمانیہ کی طرف اٹھیں تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح یورپی طاقت کے ترازو میں اپنا پلڑا برابر رکھ سکے۔ چناں چہ سلطان سلیمان نے فوراً

شاہ فرانس کے ساتھ ایک تجارتی اور معاشرتی معاہدہ کرلیا جس کی تہ میں سیاست بھی کارفرما تھی۔

اس معاہدے کی رُو سے فرانسیسی صنعت کاروں کو بہت سی تجارتی مراعات دے دی گئیں۔ لیکن ان کی آمد ورفت نے عوام کے خیالات میں کچھ تغیرات پیدا کر دیے، خصوصاً عیسائیوں نے جن پر اس کے سوا کوئی پابندی نہیں تھی کہ انھیں اسلامی شرع کے مطابق جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا، غیرملکیوں سے ساز باز شروع کر دی۔ شاہی محل سے اس جذبے کو ہوا دینے کے لیے رخسالینہ کا تنہا وجود کافی تھا۔

سلطان سلیمان اور اس کی مجلسِ انتظامیہ کے نقطۂ نظر سے فرانس کے ساتھ معاہدہ کرنے کی ایک بڑی غرض یہ تھی کہ خود ترکی کو جنوب مشرقی یورپ کی سلطنتِ روما سے ڈر لگا رہتا تھا لیکن یہ ڈر اتنا شدید نہیں تھا جتنا اور لحاظ سے پھیلنے والے زہر کے باعث نقصان پہنچتا رہا۔

زوال کی طرف:- سنہ ۱۵۶۶ء میں سلطان سلیمان قانونی کا انتقال ہو گیا تو عثمانی حکومت زوال کی راہ پر چلنی شروع ہو گئی۔ لائق وزیر اعظم محمد سوقولی نے بہت کچھ سہارا دے رکھا تھا مگر کہاں تک۔ اس کی اور اس کے بعد البانوی خاندان کے محمد کوپرولو کی کوششیں رائگاں گئیں۔ ایک سے ایک کمزور سلطان عنانِ حکومت سنبھالتا رہا۔

سلیم دوم، ابراہیم اور محمد چہارم اپنی اپنی نوبت بجا کر چل دیے۔ سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ ان کمزور فرمانرواؤں نے تاریخ میں اپنے آبا و اجداد کے عروج کی داستانیں پڑھ لی تھیں، اور اسی لحاظ سے نئی فضاؤں میں پرواز کرنی چاہتے تھے، لیکن خود ان میں نہ سکت تھی اور نہ صلاحیت ان کے برعکس یورپ کی مشہور سی سالہ جنگ میں یورپ کے سپہ سالاروں نے لڑائی کے جدید ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ اعصابی جنگ کے داؤں پیچ بھی سیکھ لیے تھے، جن سے ترکی کے فرمانروا اور ان کے اربابِ حل و عقد لاعلم تھے اور حصولِ واقفیت کے ذرائع بھی محدود، بلکہ ناپید تھے۔ اس کے باوجود سنہ ۱۶۸۳ء میں ترکوں نے وائنا کو ایک بار پھر فتح کرنے کی کوشش کی، اور اس شکست میں جو نقصان ان کو پہنچا وہ اتنا شدید تھا کہ یورپ کی سرزمین سے قطعی طور پر ان کے کنٹے کٹ گئے۔

اس زمانے میں مغربی یورپ کے علاوہ مشرقی یورپ کے ملک نئی طاقت بن کر سامنے آرہے تھے۔ اس علاقے کی سلافی قوم، جسے پانچ صدیوں سے تاتاریوں نے مار مار کر جنگلوں میں دھکیل رکھا تھا، روس کے بل بوتے پر دم خم دکھانے لگی اور چوں کہ مغربی یورپ میں بھی

خانہ جنگیاں چل رہی تھیں، اس لیے اس کو زیادہ اُبھرنے کا موقع مل گیا۔ خود روس کی طاقت بہت زبردست تھی اور یہ ملک سارے یورپ پر چھا جانے کی فکر میں تھا۔

ترکی میں اسلامی حکومت تھی اور سلاطین عثمانیہ نظامِ حکومت میں سختی سے اسلامی شرع کے پابند تھے اس لیے قدرتی طور پر علمائے دین کو اقتدار حاصل تھا اور جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوا ہے، ترکی میں بھی اس جماعت نے عوام کو صابر و قانع بنائے رکھا۔ اس نے نئی قدروں سے ہم آہنگ ہونے کی نہ تو ضرورت محسوس کی اور نہ اس کا موقع مل سکا۔ ترکی کے زوال کا ایک بڑا سبب اس رجحان کو بھی کہا جا سکتا ہے۔

سترھویں صدی کے آخر میں روسیوں نے جنوب کی طرف پھیلنے کی تحریک شروع کی۔ وہ بہت سے ساحلی علاقوں پر قابض ہو کر اپنے لیے نئے افق پیدا کرنے چاہتے تھے اور چوں کہ ترکی کی سرحدیں قدرتی طور پر بعض ایسے سمندروں سے ملی ہوئی تھیں، جن کو یورپ کی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے اس ملک کا بار بار نرغے میں آنا بالکل قرین قیاس تھا۔ چناں چہ سنہ ۱۶۷۲ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک روسی اور ترکی فوجیں بارہ مرتبہ ایک دوسرے کے مقابل آئیں، اور چوں کہ یہ لڑائیاں عموماً ترکی علاقے میں یا اس کے آس پاس ہوئیں، اس لیے یہ ملک ہر بار خسارے میں رہا اور بتدریج اپنے علاقے کھوتا رہا۔ قریب کی اسلامی ریاستوں سے ترکی کی طرف دستِ تعاون بڑھا مگر وہ خود کوتاہ تھا، اس لیے صحیح دست گیری نہ ہو سکی۔

سیاسی اعتبار سے برطانیہ اور فرانس کبھی کبھی ترکی کا ساتھ دیتے رہے لیکن ذاتی مفاد کی خاطر ان کا ہر قدم اٹھتا تھا۔ کیوں کہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے درمیانی علاقے پر کسی ایسی حکومت کو اقتدار حاصل ہو جو ان کے مقابلے پر سامنے آکر خود ان کے لیے بھی دردِ سر بن سکتی ہے۔ روس کی ہر فتح کے بعد یہ دونوں ملک زور ڈال کر تھوڑا بہت مفتوحہ علاقہ ترکی کو واپس کرا دیتے تھے اور اس طرح ان کے بھی تجارتی فروغ پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا جو ترکی کے راستے ہوتی تھی۔

روسی سازشیں:۔ ترکی میں اندرونی خلفشار بھی بڑھ گیا خصوصاً انقلابِ فرانس نے یورپ کے اور بہت سے ملکوں میں زبردست ہیجان برپا کر دیا تھا۔ ترکی کے عیسائی دینی اعتبار سے اصلاحات چاہتے تھے اور ترقی پسند مسلمان سیاسی لحاظ سے جمہوریت کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان سب کو اُبھارنے والے وہ روسی جاسوس تھے جو ملک میں چپ چپاتے داخل ہو کر، اور

پس پردہ رہ کر ساز شیں کر رہے تھے۔

یہاں تک کہ سنہ ۱۸۴۰ء میں روس کے شہنشاہ نکولس اول نے منصوبہ تیار کیا کہ کسی طرح سلطنتِ عثمانیہ کو بالکل ختم کر کے اس ملک کو یورپی طاقتوں کے درمیان تقسیم کر لیا جائے۔ جنگِ کریمیا اسی منصوبے کو عمل میں لانے کی خاطر شروع کی گئی تھی۔ روس کی بے پناہ طاقت کے سامنے یہ سب کچھ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، لیکن اب بھی یورپ کی بہت سی مغربی طاقتوں نے روس کے بڑھتے ہوئے اثر کو خطرے سے خالی نہیں سمجھا اور اس لیے درپردہ انھوں نے ترکی کی تھوڑی بہت مدد کی تاکہ وہ "مردِ بیمار" مرے نہیں، صرف سسکتا رہے۔

مدحت پاشا:۔ ترکی میں تنظیمات کے نام سے قومی اصلاحات کا دور شروع کرنا ہی پڑ گیا۔ اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا مطلق العنان فرمانرواؤں کو اپنی سطح سے نیچے اترنا پڑا۔ اس ضمن میں پہلا مضبوط قدم سلطان عبدالمجید نے اٹھایا اور اس کو اس راہ پر لانے والا ملک کا بہی خواہ مدحت پاشا تھا، جس کا ہر مشورہ سلطان کے لیے لائقِ عمل ہوتا تھا، مگر سلطان کا انتقال سنہ ۱۸۶۱ء میں ہو گیا اور اس کے جانشین عبدالعزیز نے مدحت پاشا کے پُر خلوص مشورے پر کوئی توجہ نہیں کی، جو جمہوری انداز میں آئینی اصلاحات چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ملک کے عیسائی باشندے صرف اسی طرح محبِ وطن بن سکتے ہیں۔ اسے فوج کے سپہ سالاروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کی حمایت حاصل تھی۔ حتیٰ کہ علما کی جماعت بھی اس کے نظریات کو ماننے لگی تھی جب سلطان عبدالعزیز کسی طرح راہ پر نہ آیا تو مدحت پاشا نے اسے معزول کرنے کی تحریک چلائی اور سنہ ۱۸۷۶ء میں اسے تخت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

سلطان عبدالحمید:۔ اب نوجوان ترکوں کی ساری امیدیں مراد پنجم سے وابستہ تھیں لیکن بہت جلد قدرتی طور پر اس کا دماغی توازن بگڑ گیا اور چند ماہ بعد ہی اسے عبدالحمید ثانی کے حق میں حکومت سے الگ ہو جانا پڑا۔

سلطان حمید نے وقت کی رَو کے ساتھ بہنا مناسب سمجھا۔ اس نے نیا آئین بنانے اور قومی اسمبلی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ ترکی کی تاریخ میں پہلا بڑا موڑ تھا۔ اگرچہ پہلی اسمبلی میں سرکاری عنصر زیادہ تھا، کیوں کہ رائے شماری بالواسطہ عمل میں آئی تھی، تاہم ایک نئی منزل کی طرف قدم اٹھایا گیا تھا۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان حمید کی بدنیتی نے ملک و قوم کو سخت نقصان

پہنچایا کیوں کہ بہت جلد اس نے محسوس کیا کہ اسمبلی کا وجود کہیں اس کے اقتدار کو بالکل ختم نہ کردے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ روس سے ایک بار پھر لڑائی ناگزیر ہوتی جارہی تھی۔ چناں چہ اسی کو بنیاد بنا کر اس نے اسمبلی توڑ دی اور لڑائی کا ذمہ دار مدحت پاشا کو ٹھہراتے ہوئے اسے جلاوطن کر دیا۔

روس کا حملہ شدید تھا۔ ترک پسپا ہو کر قسطنطنیہ تک پہنچ گئے اور اگر اس وقت برطانوی بحری بیڑا آڑے نہ آتا تو خدا جانے ان کا کیا حشر ہوتا۔ معاہدۂ صلح کے لیے بہت سی قومیں برلن میں جمع ہوئیں۔ روس سخت شرائط پیش کرنی چاہتا تھا لیکن اس موقع پر بھی برطانیہ کی مداخلت سے کافی نرمی برتی گئی اور ترکی یکسر فنا ہونے سے بچ گیا۔

مصطفیٰ کمال — انور بے: سلطان حمید نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے انگریزوں کی حکمتِ عملی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کو مدنظر رکھا۔ یہ پالیسی قومی استحکام کے اعتبار سے یقیناً مذموم ثابت ہوئی۔ ملک کے مختلف صوبوں کے لوگ ایک دوسرے سے جلنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی بعض غیر ترک اقوام کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی۔ اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے بھی قدرتی طور پر پولیس اور فوج میں بھاری رقم خرچ کرنی پڑی، جس کا بار ملکی خزانے پر پڑا اور اقتصادی حالت تباہ ہونے لگی۔ قوم کے نوجوانوں کو اپنی اس تباہی کا احساس تھا مگر اس سے بچنے کے لیے کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔

ایک دم بغاوت اور سرکشی کے لیے اٹھ کھڑے ہونا بھی ان کے لیے ممکن نہیں تھا، کیوں کہ ملک کے عیسائی اب زیادہ بل کھانے لگے تھے اور ان کو قابو میں رکھنا مشکل نظر آتا تھا۔ کچھ اختلافات نسلی فرق و امتیاز نے بھی پیدا کیے تھے۔ اس وقت ملک کی نجات کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ شخصی اختیارات کو ختم کر کے نسلی اور مذہبی مساوات کی بنیاد پر نئی حکومت قائم کی جائے۔ خاموشی سے اس تحریک کو چلانے میں سب سے پیش پیش دو فوجی نوجوان مصطفیٰ کمال اور انور بے تھے۔ ایسے ملک میں جہاں جمہوریت کا جدید نظریہ عہدِ طفولیت میں ہو، لامحالہ فوج ہی کو میدانِ سیاست میں آکر انتہا پسندی کی تحریکات کا ردِ عمل پیش کرنا پڑتا ہے۔

نئی چال: ابھی یہ لاوا سینوں کی تہ میں پوشیدہ تھا کہ عالمی بساطِ سیاست پر ایک نیا مہرہ چلا گیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں برطانیہ کے شاہ ایڈورڈ ہفتم نے زارِ روس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور دیوال کے مقام پر یہ آرزو پوری بھی ہوگئی۔ ترکی کے ایک دیرینہ دشمن سے برطانیہ کا اس طرح

ملنا قسطنطنیہ والوں کے لیے حد درجہ تشویش ناک تھا۔ سلطان کے جاسوس یہ خبر لائے تھے کہ حکومتوں کے درمیان یہ معاہدہ ہوا ہے کہ مشترکہ طور پر ترکی پر زور ڈالا جائے کہ وہ مقدونیہ کے عیسائیوں کو صوبائی آزادی دے دے۔

اس منزل پر آکر ترکی کے انقلاب پسندوں کا منصوبہ اسقاطِ حمل کی طرح وقت سے پہلے باطل ہو گیا اور انھوں نے بغاوت کے بجائے سلطان پر زور ڈالا کہ فوراً نیا آئین نافذ کیا جائے ورنہ بصورت مجبوری فوجی نظام قائم کر دینا پڑے گا۔ سلطان کو اس طوفان کے سامنے جھک جانا پڑا اور اسی سال ۲۴ جولائی کو نیا آئین نافذ کر دیا تاکہ وہ اسمبلی جو ذاتی اغراض کے ماتحت سنہ ۱۸۷۶ء میں ختم کر دی گئی تھی، دوبارہ طلب کی جا سکے۔

نئی پریشانیاں :- ملک بھر میں جشن مسرت منایا گیا اور عیسائی دل کھول کر مسلمانوں سے آملے۔ وہ جو اصلاحات چاہتے تھے، ان کے نفاذ کا وقت آگیا تھا۔ نمائندہ اسمبلی کے نئے انتخابات بھی بہت جلد عمل میں آگئے۔ دسمبر میں اس اسمبلی کا افتتاح ہو گیا۔

لیکن تعلقاتِ خارجہ کے میدان میں ترکی کو خاص پریشانیوں کا سامنا تھا کیوں کہ وہ طاقتیں جو اس ملک کو ہمیشہ کمزور اور دست نگر دیکھنا چاہتی تھیں، اس انقلاب سے پریشان تھیں۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر ملک کے اندرونی معاملات سدھر گئے تو یہ ہم سے دبنے کے بجائے ہمارے سر چڑھے گا۔

اسی اندیشے کے ماتحت قریب کے ملکوں نے یہ بھی کیا کہ جو ملحقہ علاقے قبضے میں آسکتے تھے ہتیا لیے۔ مثلاً آسٹریا نے مقدونیہ کے وہ اضلاع جو معاہدہ برلن سے قبل ترکی کے پاس تھے، اور معاہدے کے بعد آسٹریا کے زیر نظام سمجھے جانے لگے تھے، پوری طرح اپنی تحویل میں لے لیے۔ بلغاریہ نے مشرقی رومیلیا کا وہ حصہ، جو ترکی کی جنوبی سرحد پر تھا، اپنی مملکت میں شامل کر لیا اقریطش نے یونان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔

ان جارحانہ تحریکات کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش کی گئی کہ ترکی کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو آپس میں لڑا کر ملک کی فضا خراب کر دی جائے۔ ان سازشوں سے کوئی خلفشار تو پیدا نہیں ہوا تاہم ملک کی بعض سیاسی جماعتوں کو قریب کے ملکوں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ اس سے ایک دور رس منصوبے کے ماتحت بڑے نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اکثریت برطانیہ کی بدنیتی اور جرمنی کے خلوص کی قائل تھی، لیکن برطانیہ کا جال دنیا کے جس حصے میں بھی پھیلا

سادہ لوح یا کم عقل انسانوں کو پھنسائے بغیر نہ رہا۔ چناں چہ ترکی میں بھی ان کا حربہ کسی قدر کامیاب رہا۔

سلطان عبدالحمید جسے اپنے اعلیٰ اقتدار کے گھٹ جانے کا قلق تھا، انگریزوں کے دام میں آگیا۔ اس نے فوج کے ان دستوں کو اپنے ساتھ ملا کر جو انجمنِ اتحاد و ترقی کے خلاف تھے، ۱۳ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کو اسمبلی کی عمارت پر قبضہ کر لیا۔ انجمن کے بعض عہدے داروں اور وزیرِ انصاف کو، جو زد میں آگئے تھے، قتل کرا دیا۔

سلطان سے مقابلہ :۔ بھلا انجمنِ مذکورہ کے اربابِ حل و عقد کس طرح خاموش رہتے، وہ اپنی عسکری قوت کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ محمود شفقت پاشا کے ماتحت مقدونوی فوج کا ایک دستہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھ گیا۔ شفقت کا چیف آف اسٹاف مصطفےٰ کمال تھا۔ خانہ جنگی شدید قسم کی ہوئی۔ انجامِ کار سلطان کے ہمنوا دستے کام آگئے۔ مصطفےٰ کمال نے بالادستی حاصل کرتے ہی ناقابلِ اعتماد فوجیوں سے ہتھیار رکھوا لیے۔ ان کے سرغنوں کو پھانسی دیں۔ فوراً اسمبلی کا جلسہ ہوا جس نے عبدالحمید کو تاج و تخت سے معزول کر دیا۔ اس کی جگہ اس کے بھائی رشید کو محمد پنجم کے نام سے سربراہِ حکومت بنا دیا۔ یہ سب کچھ برطانیہ کے وقار کے لیے ایک زبردست دھکا تھا۔

اب نوجوان ترکوں کو، جنھیں صحیح معنوں میں قوم پرست کہا جا سکتا تھا، باقاعدہ قسطنطنیہ میں رہ کر نئی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کرنے کا احساس ہوا، مگر یہ اسی وقت ممکن تھا کہ جب ملک کے حالات کم سے کم دس سال تک پُرامن رہتے۔ اس کے برعکس پریشانیوں کا سامنا روزِ اول سے کرنا پڑ گیا۔ علما کی جماعت ان نوجوانوں کے خلاف تھی اور ان کو لامذہب بتاتی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہو کہ ان علما کا بہت زیادہ اثر عوام پر تھا۔ دوسری طرف عیسائیوں نے حسبِ سابق مراعات مانگیں، بلکہ بعض لحاظ سے اپنی خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ انھیں بیرونی طاقتوں کی خفیہ اعانت پر اعتماد تھا۔ اس موقع پر انجمنِ مذکورہ کے اراکین کو بہت گہری حکمتِ عملی سے حالات پر قابو پانے کی کوشش کرنی پڑی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے ترکی کے علاقے طرابلس پر حملہ کر دیا اور افریقہ کا یہ صوبہ اپنے ساتھ ملا لیا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں روس کی ایما سے بلقان لیگ بنی اور یونان، سربیا اور بلغاریہ نے مل کر ترکی کے خلاف دھاوا بول دیا۔ ترکی کی عمدہ فوجیں مقدونیہ میں پھنسی ہوئی تھیں،

کیوں کہ بلقان کے عیسائیوں نے مقدونیہ کے تین ہزار مسلمان ترکوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا تھا لیکن ان سب پریشانیوں کے پردے میں اللہ کی رحمت کارفرما تھی۔

شدید نقصانات کے عوض سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ترک عوام کی آنکھیں کھل گئیں، وہ خوابِ غفلت سے چونک پڑے اور قومی جذبہ صحیح معنوں میں اور نہایت شدت کے ساتھ اس طرح بیدار ہوا کہ وہ قومی مفاد کے سامنے ذاتی نفع و نقصان کے احساس کو بھول گئے۔ ایک قوم کی تعمیر کے لیے یہ اتنا بڑا اثاثہ ہے کہ اصل قدر کا اندازہ مشکل ہے۔

تعمیر و ترقی:- قوم پرستوں نے پہلے کی طرح جرمنی پر اعتماد کیا اور جرمن مشیروں کی امداد سے ملک کی اقتصادی حالت سدھارنے کی کوشش کی۔ فروغ تعلیم کے لیے، خصوصاً عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے، مضبوط قدم اٹھائے اور اس ضمن میں جس کسی نے کسی لحاظ سے مخالفت کی، اس کا سر کچل کر رکھ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انتہا پسندی کے بغیر ترکوں کے لیے ابھرنا مشکل تھا۔

جرمنی مشرقِ وسطیٰ میں اپنی مصنوعات کے لیے عمدہ منڈیاں چاہتا تھا۔ ترکی نے اس مقصد کی تکمیل میں پوری طرح مدد کی۔ جرمنی نے بہت جلد ترکی میں ریلوے لائنوں کا جال بچھا دیا۔ تاکہ تجارتی سامان کے حمل و نقل میں سہولتیں میسر آجائیں۔ نوجوان ترک جانتے تھے کہ یہ نیا ذریعۂ مواصلات خود ان کے حق میں بھی کس درجہ مفید ہے۔ انگریزوں کی اجازت بلکہ ایما سے جرمنوں نے ترکی کے شہر حیدر پاشا سے بغداد تک بھی ریلوے لائن ڈال دی۔

لیکن سچ یہ ہے کہ مستقبل کا اندازہ صحیح طور پر کسے ہوتا ہے۔ جب روک تھام کی انتہائی کوششوں کے باوجود ۴ اگست سنہ ۱۹۱۴ء کو پہلی عالمگیر لڑائی چھڑ ہی گئی تو بہت سے معاہدے، اور منصوبے ملتوی یا کالعدم ہو گئے۔ ترکی کے لیے یہ دشوار مسئلہ تھا کہ وہ اس موقع پر کسی طاقت کا ساتھ دے یا غیر جانب دار رہے۔ لڑائی کے شعلے اس کی سرحدوں کے آس پاس بھڑکنے شروع ہوئے تھے، بظاہر الگ رہنا مشکل ہی تھا۔

وزیر داخلہ طلعت پاشا اور وزیر مالیات جاوید بے چاہتے تھے کہ ملک کی ترقی و اصلاح پر تمام تر توجہ دی جائے لیکن وزیر جنگ انور بے غیر جانب دار رہنے کی پالیسی کے خلاف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ترکی کو لامحالہ میدان میں آنا ہے، اس لیے کیوں نہ وہ شروع سے ان ملکوں کا ساتھ دے جو بعد میں بھی اس کے کام آسکتے ہیں، یا جن کی دوستی پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

اس موقع پر برطانیہ نے زور ڈالا کہ ترکی جرمن مشیروں کو اپنے ہر محکمے سے خصوصاً فوجی نظام

سے الگ کر دیے اور جرمنی کے جو دو جنگی جہاز ترکی کے ساحل پر پناہ گزیں ہو گئے تھے، برطانیہ کے حوالے کر دیے جائیں۔ اگر ترکی انگریزوں سے ڈر کر ان کی یہ باتیں مان لیتا اور لڑائی میں ان کا شریک ہو جاتا تو اس کی یکسر تباہی یقینی تھی اور شاید آج اس کا وجود بھی نہ ہوتا۔ لیکن اربابِ اقتدار کو پورے وثوق کے ساتھ یقین تھا کہ برطانیہ روس کا ساتھی ہونے کے باعث انجام کار ترکی سے کوئی واسطہ نہ رکھے گا اور جب روس کا اشارہ ہو گا تو ترکی کے حصے بخرے کر دیے جائیں گے۔

جرمنی کے ساتھ:- نوجوان ترکوں کی اس بالغ نظری کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے صحیح اندازہ لگایا۔ جیساکہ سنہ ۱۹۱۷ء میں روس کے بالشویکوں کے برسرِ اقتدار آنے اور ایک دستاویز شائع ہونے پر یہ ثابت بھی ہو گیا کہ ایسے عہد و پیمان حقیقتاً عمل میں آچکے تھے۔ لہٰذا ترکوں کا جرمنی کے ساتھ شریکِ جنگ ہونا قرینِ مصلحت تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بدقسمتی سے خود جرمنی اس لڑائی میں ہار گیا اور اس طرح ترکی کے لیے بھی نئی مشکلات پیدا ہو گئیں۔

ترکی کے لیے جرمنی کا ساتھ دینا تین وجوہ کی بنا پر تھا۔ پہلی وجہ تو اس وقت کے لحاظ سے بالکل واضح تھی کہ جرمنی کی کامرانی کا سب کو یقین تھا۔ اس وقت اس کی فوجی طاقت بڑھی ہوئی تھی اور وہ نئے آلاتِ حرب سے لیس تھا۔ صرف مصطفےٰ کمال کی واحد رائے تھی کہ جرمنی اس لڑائی میں نہیں جیت سکے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی رائے تھی کہ ترکی جب تک ممکن ہو اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھے اور جب غیر جانب دار رہنا ممکن نہ ہو تو جرمنی کے سوا کسی کا ساتھ نہ دے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ باشندگانِ ترکی کو روس سے ازلی نفرت تھی اور وہ یہ جانتے تھے کہ روس اس لڑائی میں برطانیہ کے ساتھ ہو گا۔ اس لیے بغضِ معاویہ کے مصداق ترکوں کی فوج انگریزوں کے دوش بدوش لڑنے کے لیے کبھی تیار نہ ہو گی۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ کچھ عرصے پہلے برطانیہ نے کھلم کھلا ترکی کے عیسائیوں کا ساتھ دیا، اور انھیں ورغلا کر قومی استحکام کے خلاف سرکشی کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ترکی کے اربابِ اقتدار جانتے تھے کہ فوج کا سپہ سالار لڑائی کے عمدہ نقشے بنا کر اور سپاہیوں سے ان پر عمل کرا کے میدانِ جنگ میں کامرانی حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر عام فوجی کسی محاذ پر لڑنے کے لیے تیار نہ ہوں تو کسی دباؤ سے ان کو ان کی مرضی کے خلاف آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہو گئی تو ترکی کو مختلف محاذوں پر لڑتے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر عسکری قوت کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی طاقت

پر بھی زبردست بار پڑ رہا تھا۔ سب سے زیادہ مصیبت اناطولیہ کے ترک کاشتکاروں کے لیے تھی۔ کئی سال سے نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کیا جا رہا تھا۔ ان کے چلے جانے اور عرصے تک واپس نہ آنے یا کسی میدان جنگ میں ختم ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے بوڑھے مرد اور عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ مویشی چرانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کا کام بچوں سے لیا جانے لگا۔ نوجوان فوجیوں کا معاوضہ ان کے رشتہ داروں کو مل جاتا تھا لیکن محض بے سود۔ ان نوٹوں یا سکوں سے خریدنے کے لیے ملک بھر میں روزمرہ کی ضرورت کا سامان کہاں تھا۔ وہ فاقے کرتے ننگے رہتے اور بیمار ہوتے تو سسک سسک کر مر جاتے تھے۔ کوئی پرسانِ حال بھی نہیں تھا۔

اس وقت ترکی پر جو زوال آیا تھا، اس کی مثال اس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر مرے پر سو دُرّے کے بمصداق، اتحادی کسی بے کس نعش پر گرنے والے گدھوں کی طرح چاہتے تھے کہ ترکی کی تکا بوٹی کر دی جائے اور نہ صرف یہ بلکہ اس سے تاوانِ جنگ وصول کرنے کا منصوبہ گانٹھ رہے تھے۔

روس، برطانیہ اور فرانس میں جو خفیہ معاہدہ ہوا تھا اور جس سازش میں شریفِ مکہ کو بھی لالچ دے کر شامل کر لیا گیا تھا، اگر وہ عملی جامہ پہن لیتا، تو سلطانِ ترکی کے پاس جو برائے نام مالکِ تاج و تخت تھا، اناطولیہ کا ایک بہت ہی بیکار حصہ باقی رہ جاتا اور اس کا دارالخلافہ برسہ یا قونیہ ہوتا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ قومی آزادی کا ایک بہت بڑا علمبردار ریاست ہائے متحدہ امریکا کا صدر ولسن بھی اتحادی لٹیروں کا پشت پناہ بنا ہوا تھا۔ اس کے مشہور چودہ نکات آج بھی سب کو یاد ہیں جو ترکی کے گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے مرتب کیے گئے تھے۔

ان منصوبوں کی پوری طرح تعمیل میں رخنہ مجلسِ اقوام کی تشکیل سے پڑ گیا جو دنیا کی رائے عامہ کو بظاہر تسکین دینے کے لیے قائم کی گئی تھی لیکن اس میں وہی حریص چہرے کام کر رہے تھے جن کو بساطِ یورپ پر بالادستی حاصل تھی اور علامہ اقبال مرحوم کے قول کے مطابق ان "کفن چوروں" نے محض "تقسیمِ قبور" کی خاطر یہ سارا سوانگ بھرا تھا۔

اپریل سنہ ۱۹۱۹ء میں اس سوچے سمجھے ڈرامے کا پہلا سین منظرِ عام پر آ ہی گیا۔ برطانیہ اور فرانس کی بندوقوں کے زیرِ سایہ اور امریکی جنگی جہازوں کے بل بوتے پر یونانی دستے سمرنا کے قریب ترکی ساحل پر لنگر انداز ہو گئے اور سمندری ہشت پا کی طرح تباہی کے چنگل سب طرف بڑھانے لگے۔

ایک ماہ بعد اطالوی دستے اسی ساحل پر ذراہٹ کر اتر پڑے۔ اس سے کچھ دن پہلے آرمینیا کا ایک وفد پیرس پہنچ چکا تھا اور اپنی آزاد حکومت بنانے کا پروگرام اس کے پاس تھا۔ وہ کوہ قاف کے دامن سے لے کر بحیرۂ روم کی خلیج اسکندریہ تک تمام مشرقی ترکی کو الگ کر لینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے دعوے کی بظاہر کوئی مضبوط بنیاد نہیں تھی جبکہ اس وسیع علاقے میں آرمینی نسل کے صرف تیس فی صدی باشندے تھے اور باقی ترک تھے۔

برطانوی چال:- اسی سال کے وسط میں مشرق وسطیٰ سے متعلق خود لائڈ جارج کی پالیسی میں تبدیلی رونما ہوئی اور انھوں نے کابینہ کی منظوری حاصل کر کے یہ خیال ترک کر دیا کہ قسطنطنیہ بین الاقوامی نظام میں رہے۔ ان کی رائے تھی کہ اس علاقے کو ترکوں کے پاس لیکن صرف برطانیہ کے زیر انتداب رکھا جائے۔

اس دوران میں سابق سلطان کو الگ کر کے اس کے بھتیجے وحید الدین کو جو انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا، تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ لائڈ جارج کو کامل یقین تھا کہ اگر اناطولیہ میں قوم پرستوں کی تحریک کو کچل دیا گیا تو اپنے پو بارہ ہیں، ورنہ پھر بھی بازی ہارنے والی نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ ایسے مدبر سیاست کا دماغی توازن بگڑ کر اتنی مذموم سطح پر آ گیا۔ برطانیہ کے بہت کم مورخین نے اس حکمتِ عملی کو سراہا ہے۔ سب سے پہلے اس پالیسی پر امریکیوں نے اظہار ناپسندیدگی کیا اور اپنے آپ کو بری الذمہ ٹھیرا کر علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے باوجود انگریزوں نے معاہدۂ صلح مضحکہ خیز شرائط کے ساتھ سلطانِ ترکی کے سامنے پیش کر دیا جو اس جیسے ناقص انسان کے لیے بھی باعثِ پس و پیش تھا لیکن ذرا دباؤ پڑنے پر ۱۰ اگست سنہ ۱۹۱۹ء کو اس پر دستخط ہو ہی گئے۔

اس موقع پر ایک ترک افسر مصطفےٰ کمال، جن کا نام سنہ ۱۹۰۸ء میں انجمن اتحاد و ترقی کی تحریکات کے وقت لوگوں کی زبان پر آیا تھا اور جو جرمن فوجی کمانڈر سانڈرز کے ماتحت پہلی جنگِ عظیم میں لڑ کر دادِ شجاعت لے چکے تھے، اناطولیہ میں تیسری ترکی فوج کے انسپکٹر تھے، اور بحیرۂ اسود کے کنارے مورچہ لگائے پڑے تھے، عام توقع کے مطابق انھیں نام نہاد سلطان بالفاظ دیگر اتحادیوں سے احکامات ملنے کا انتظار تھا، لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔

اس فوجی دستے کے پاس، جو مصطفےٰ کمال کے اشارے پر جاں نثار کرنے کو تیار تھا، وہ تمام سامانِ جنگ خفیہ طور پر موجود تھا، جسے جرمن سپاہی لڑائی کا پانسہ پلٹتے دیکھ کر چھوڑ گئے

تھے۔ اس سامانِ جنگ کے علاوہ انھیں عوام کے دلوں میں چھپے ہوئے جذبات کا بھی علم تھا۔

اس طرح اپنا کھونٹا مضبوط دیکھ کر انھوں نے سلطان کے نام پیغام بھیجا کہ برطانیہ سے ایک نئی کانفرنس طلب کرنے کے لیے کہا جائے، جس میں ترکی کی صحیح نمائندگی کرنے والا وفد شامل ہو کر جملہ شرائط پر تبادلِ خیال کرے۔ سلطان کو قدرتی طور پر یہ بات زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے مصطفےٰ کمال کی گرفتاری کے لیے ایک فوجی کمانڈر متعین کر دیا، جس نے چند دن بعد اپنی معذوری ظاہر کر دی کیونکہ وہ خود ترکی کے آئندہ نجات دہندہ کا ہم نوا تھا۔

نئی قومی تحریک:۔ اسی اثنا میں ترکی کے امیر البحر رؤف بے نے مصطفےٰ کمال سے خفیہ طور پر ساز باز کر لی اور اپنی اعانت کا یقین دلایا۔ چناں چہ قومی تحریک کی انجمن نے نئے جوش و خروش کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ اس نے ایک عارضی حکومت قائم کر کے مصطفےٰ کمال کو اس کا چیئرمین منتخب کر لیا۔ ادھر قسطنطنیہ میں بھی پارلیمان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے اور سلطانِ ترکی کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔

برطانیہ نے فوراً بوٹ ٹیک دینے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی دستوں نے ترکی پارلیمان کے اراکین کو دھڑا دھڑ گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ کچھ تو بچ بچا کر بھاگ نکلے اور کچھ نرغے میں آ گئے۔ جن میں رؤف بے بھی شامل تھے۔ ان سب کو ایک برطانوی جنگی جہاز پر لاد کر جزیرہ مالٹا میں جلاوطن کر دیا گیا لیکن قومی جذبے کے ابھار پر کوئی آنچ نہ آنے پائی۔ راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں زیادہ تیزی کے ساتھ لو دینے لگیں۔

پھر تو یہ ہوا کہ جو دستہ "باغیوں" کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا، وہ خود سلطان سے برگشتہ ہو گیا اور دوسری طرف لوگوں نے اپنا کاروبار چھوڑ کر قومی تحریک کی فوج میں نام لکھوانا شروع کر دیا۔

مقابلے کے لیے برطانیہ نے نئی کمک بھیج دی اور یونان کو لالچ دے کر کچھ دستے اس سے لیے مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ہر پانسہ اُلٹا پڑتا چلا گیا۔

مجلسِ عظمٰی:۔ ترکی پارلیمان کے اراکین جو بچ بچا کر نکل آئے تھے اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں انقرہ کے مقام پر جمع ہوئے۔ اب وہ کسی قدر نڈر تھے۔ انھوں نے اپنے اجتماع کو قومی مجلسِ عظمٰی کا نام دیا اور چند دن اجلاس جاری رکھنے کے بعد اسی کو مجلسِ دستور ساز قرار دے دیا گیا۔ تاکہ نئی ترکی حکومت کی بنیاد رکھی جا سکے۔

کثرتِ رائے نے مصطفےٰ کمال کو مجلس کا صدر منتخب کیا اور فیصلہ کیا کہ وہی سربراہِ حکومت

رہیں گے۔ یہ بھی طے ہوا کہ غیر ملکی عناصر سے سرزمین ترکی کو پاک کر لینے تک سلطان کی قسمت کے بارے میں کوئی حکم نامہ صادر نہ کیا جائے۔ اس پہلو پر بعد میں غور کر لیا جائے گا۔

اس طرح بیسویں صدی کے سلجوقیوں اور عثمانیوں نے تازہ دم ہو کر نئی سلطنت کی بنیاد رکھی، جس نے مغربی سیاست والوں کو محوِ حیرت کر دیا۔ انگریزوں کو خاص طور پر اس "گم شدہ جنت" کا ملال تھا۔ ترک نوجوانوں نے اپنی ذرا سی لغزش سے ۱۹۰۸ء میں جس چیز کو کھویا تھا اسے اپنے عزمِ صمیم سے زیادہ گہرے مفاد کے ساتھ سنہ ۱۹۲۰ء میں دوبارہ پا لیا۔

لیکن اصل مرحلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں کا پٹھو سلطان ترکی استنبول میں ان کے سایۂ عاطفت میں سانس لے رہا تھا اور ان کے اشارے پر سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ استنبول اس کا پایۂ تخت تھا، اس لیے قدرتی طور پر اس صوبے میں اس کے بہت سے ہم نوا موجود تھے اور یوں بھی ترکی عوام ہمیشہ سے شہنشاہ پرست تھے، اس لیے بہت سے لوگ اس کا اقتدار چاہتے تھے۔ خاص طور پر مذہبی علما بھی جو ہمیشہ سے فرمانروائے وقت کا ساتھ دیتے رہے ہیں، سلطان کے حق میں فتویٰ دے کر اس کی حکومت قائم رکھنے کے درپے تھے۔

عالمگیر لڑائی میں جو ملک فاتح تھے، انھوں نے مل کر ترکی کے مستقبل کا فیصلہ اپنے طور پر کیا اور سلطان سے ایک معاہدے پر ۱۰ اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو دستخط کرا لیے۔ جب اس کا متن شائع ہوا تو مصطفےٰ کمال اور ان کی قومی جماعت نے اس کو رد کر دیا اور عوام کو اس کے مذموم نتائج سے باخبر کر کے مخالفت کے لیے ابھارا۔ چناں چہ جذبۂ قومی کے ماتحت سلطان کے بہت سے ہم نوا اس سے برگشتہ ہو گئے۔

اس طرح استنبول اور انقرہ کو صدر مقامات بناتے ہوئے ملک میں بیک وقت دو حکومتیں قائم تھیں اور دونوں ایک دوسرے کو ختم کر دینا چاہتی تھیں۔ سیاسی چالیں تو دونوں طرف سے چلی جا رہی تھیں لیکن ایک طرف خود غرضی اور ریاکاری پوشیدہ تھی اور دوسری طرف خلوص اور وطن پرستی کا جذبہ کارفرما تھا۔ اور زیادہ تعجب تو یہ تھا کہ ایک طرف سرکاری خزانہ اور مفاد پرست غیر ملکیوں کا تعاون تھا اور دوسری طرف کیسہ بالکل خالی تھا صرف ضمیر کی طاقت کے بل بوتے پر سب کچھ ہو رہا تھا۔

غازی کا خطاب:۔ انگریزوں نے سازش کی اور یونانیوں سے ترکی کے ان علاقوں پر حملہ کرا دیا جو قوم پرستوں کے زیرِ اثر تھے۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی اور دفاعِ وطن کی خاطر

بہت سے نوجوان قربان ہو گئے۔ آخر فیصلہ کُن جنگ ۲۶ راگست سنہ ۱۹۲۲ء کو ہوئی، جبکہ ترکوں نے تمام طاقت جمع کر کے ایک زبردست حملہ بول دیا۔ یونانی بُری طرح تباہ ہوئے۔ ان کا سپہ سالار تک گرفتار کر لیا گیا۔ یورپ کے مُدبّرانِ جنگ حیران تھے کہ کوتاہ دامن ہونے کے باوجود بلا کی طاقت ان بھوکے ترکی فوجیوں میں کہاں سے آگئی ہے۔ اس زبردست کامرانی پر مجلسِ عظمہ نے مصطفےٰ کمال کو غازی کا خطاب دیا، جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق تھے۔

۹ ستمبر کو ترکی دستے فاتحانہ انداز میں سمرنا میں داخل ہوئے، جبکہ بچے کھچے سپاہی بوکھلاہٹ کے عالم میں اپنے آخری جنگی جہاز پر سوار ہو کر فرار ہو رہے تھے۔ اس سارے معرکے کا منصوبہ مصطفےٰ کمال اور ان کے دستِ راست عصمت انونو نے مل کر بنایا تھا۔

اتحادیوں نے مجبور ہو کر ترکی سے صلح کر لینی ہی مناسب سمجھی اور اس مقصد کے لیے ملک کے قوم پرستوں کو دعوت دی۔ تاریخ میں جو معاہدۂ لوزان مشہور ہے، وہ اسی موقع پر عمل میں آیا تھا۔ غازی موصوف نے اپنے نائب عصمت انونو کو ترکی نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اس معاہدے پر دستخط ہونے سے قبل کٹھ پتلی سُلطان انگریزوں کے ایک جنگی جہاز پر سوار ہو کر بھاگ چکا تھا۔ اب خلافت کو ختم کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی باقی نہیں تھا۔ پھر بھی ۲۹ راکتوبر کو مجلسِ ملّی نے اتفاق رائے سے فیصلے کر کے عثمانی سلطنت کو قانوناً ختم کر دیا اور اس کی جگہ جمہوریت قائم کر کے مستقل طور پر انقرہ کو اس کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

پہلا صدر:- مجلسِ ملّی نے غازی مصطفےٰ کمال کو کسی مخالفت کے بغیر اپنا پہلا صدر منتخب کیا اور قوم کی طرف سے ان کو "اتاترک" کا خطاب دیا، جس کو عوام نے اس حد تک پسند کیا کہ وہ خطاب کے بجائے ان کا نام ہی بن گیا۔ لوگ مصطفےٰ کمال کو بھول گئے، اتاترک کا ذکر کرنے لگے۔

آخر کار مصطفےٰ کمال کے خوابوں کی تعبیر نکل آئی۔ انھوں نے صرف اپنے ملک کو دشمنوں کے پنجے سے بچا لیا بلکہ دنیائے سیاست میں اس کے لیے ایک اعلیٰ مقام پیدا کر کے لوگوں سے اس کے صحیح وجود کو منوا لیا اور سب سے زیادہ یہ ہوا کہ مذموم طرزِ حکومت سے جو زہر قوم کے ناتواں جسم میں پھیل رہا تھا، اس کے استیصال کے لیے صحیح راستہ ہموار کر لیا گیا۔

سب جانتے ہیں کہ آزاد ہونا اتنا مشکل نہیں ہے، جتنا کہ اس آزادی کو قائم رکھنا دشوار ہے۔ چناں چہ جب اتاترک فاتحانہ انداز میں سمرنا میں داخل ہوئے تو انھوں نے عوام کو مخاطب کر کے کہا:-

"ہمارا کام ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ اب شروع ہو رہا ہے۔"

وہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے، جو ان کے دماغ کے پردوں پر عرصہ دراز سے ترتیب پا رہا تھا۔ ملک کو بچانا بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں تھا بلکہ بڑی بات یہ تھی کہ عوام ذہنی، اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے جس پستی میں گرے ہوئے تھے، وہاں سے کھینچ کر انھیں ابھارا جائے، تاکہ وہ اقوامِ عالم کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے لائق ہو جائیں اور دنیا میں افتخار کے ساتھ اپنا سر بلند کر سکیں۔

ترک قوم کو اس سطح پر پہنچا ہوا دیکھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھا اور دوسری منزل کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا جہاں سے سامنے کی وسیع سڑک کا چوراہا نظر آتا تھا اور جہاں اتاترک کا مرمریں مجسمہ قمقموں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ زیادہ رات گزر جانے کے باعث آمد و رفت ختم ہو چکی تھی۔ اس سنسان عالم میں "قوم کا باپ" اپنی اولادِ معنوی کی ترقی پر خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

بھائی جان محترم نے چپکے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "بھائی! نصف شب گزر چکی ہے۔ اب سو جاؤ۔ ورنہ طبیعت مضمحل ہو جائے گی اور کل کے پروگرام پر اثر پڑے گا۔" میں نے ہمیشہ کی طرح ان کی بات مان لی۔ بستر پر جا لیٹا۔

کچھ دیر تو بند آنکھوں سے ترک قوم کے عروج و زوال اور زوال و عروج کے مناظر دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کب سو گیا۔

---

۲۳ اگست سنہ ۶۵ ــ جمعرات

انقرہ کی سیر

پہلے سے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق ہماری آج کی مصروفیات یہ تھیں کہ ناشتے سے فارغ ہونے کے فوراً بعد برکات صاحب کے ساتھ روانہ ہوں۔ وہ احتیاط سے موٹر چلائیں اور ہم کو اتاترک کے مزار پر لے جائیں، جہاں ہم فاتحہ پڑھیں اور کچھ پھول چڑھائیں۔ اس کے بعد اتاترک کا وہ مکان دیکھیں، جہاں وہ ترکی کا پہلا صدر بننے کے بعد سے ایوانِ صدر تعمیر ہونے تک مقیم رہے تھے۔ ان کے بعد سے وہ عمارت صدرِ ترکی کی قیام گاہ نہیں رہی، بلکہ قومی عجائب گھر بن چکی ہے۔ ترکی کی سیر کرنے والے تقریباً تمام سیاح سب سے پہلے اِن دو مقامات کی زیارت کرتے ہیں۔

وطن میں رہتے ہوئے ہم دونوں بھائیوں کا معمول ہے کہ ہر روز صبح کو ذرا اچھا ناشتہ کر کے اپنے مطب چلے جاتے ہیں، جہاں عموماً چھ گھنٹے روزانہ مریضوں کا معائنہ، تشخیص امراض اور تجویز ادویہ پر صرف ہوتے ہیں۔ ہفتہ اور اتوار کو ہمیشہ مریضوں کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے، اس لیے دوپہر کا کھانا کھانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ترک ہی کر دیا ہے اور صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا ہمارے "بڑے کھانے" ہیں۔ شام تک بھوکے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ صبح کا ناشتہ کمیت کے اعتبار سے کم اور کیفیت کے اعتبار سے ذرا اچھا ہو، لیکن برکات صاحب کے ہاں کھانے کی میز پر جو ناشتہ لگایا گیا اس سے ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ مقدار اور اقسام کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ شاید بریک فاسٹ میں لنچ ہی نہیں ڈنر اور سپر کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ایسے موقعوں پر مجھے اپنے ایک دوست مولوی صاحب بُری طرح یاد آجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اپنی عمر میں سب سے زیادہ افسوس اس وقت ہوتا ہے کہ جب میز پر عمدہ لذیذ کھانے کافی مقدار میں بچے ہوئے ہوں اور پیٹ مزید گنجائش نہ ہونے کے باعث خطرے کی گھنٹی بجا دے۔

میں نے محسوس کیا کہ آج وہی کیفیت مجھ پر طاری ہونے والی ہے۔ جدید تہذیب میں غذائی

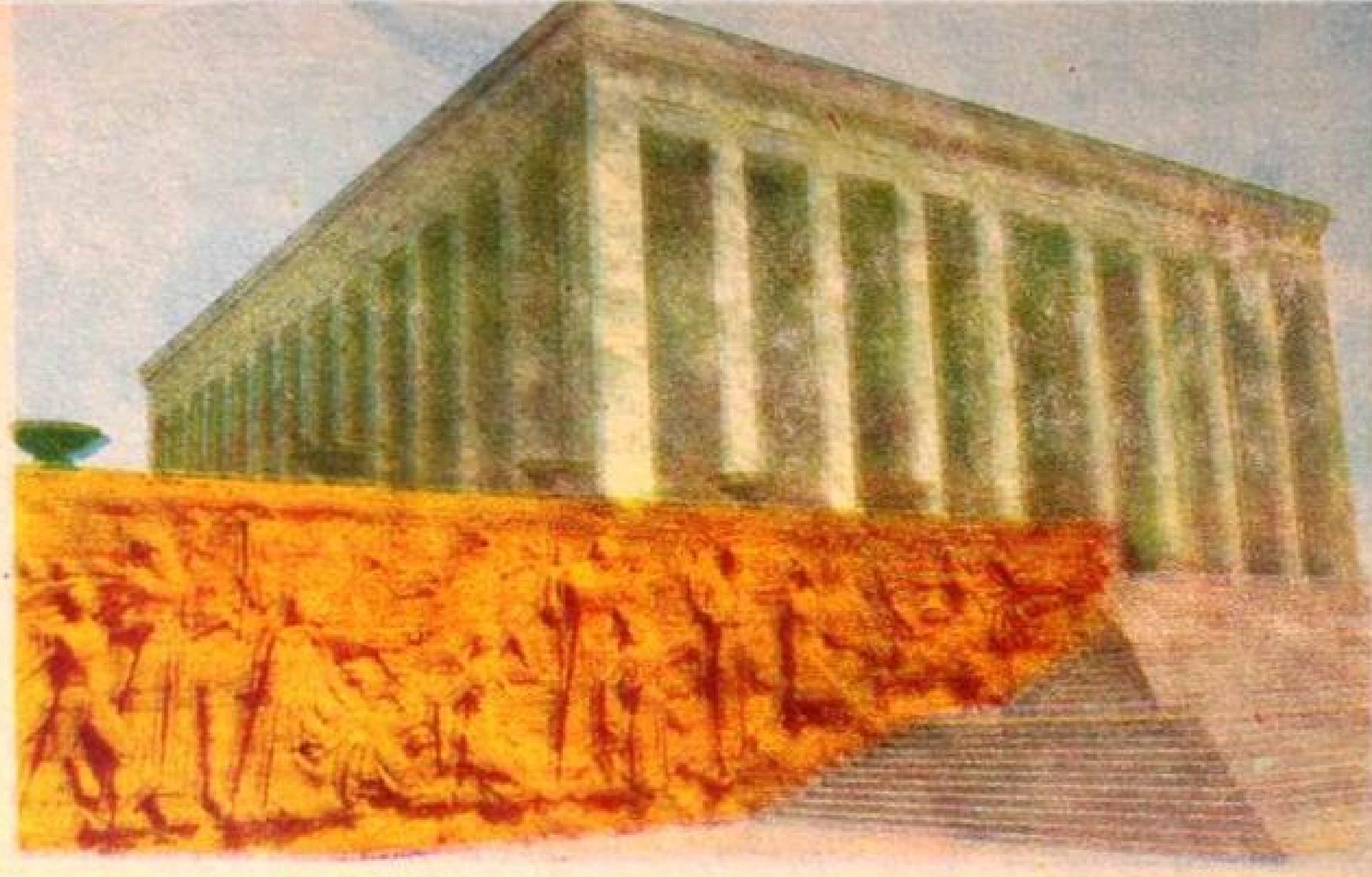
ترقی کا سب سے دل چسپ پہلو یہ ہے کہ انسان اپنی اشیائے خوراک کو دل پذیر اور دیدہ زیب بنانے کے لیے تقریباً بارہ سو مسالے محض خوش بُو اور رنگ بڑھانے کے لیے ملاتا ہے اور انھی اضافوں کی آمیزش سے اس کے صحیح ذوقِ لطیف کا پتہ چلتا ہے۔ خوراک کے معاملے میں کام و دہن کو لذت پہنچانا جس قوم نے نہیں سیکھا، وہ ہمیشہ بد تہذیب کہلاتی ہے۔

کھانے کی میز سے جس قسم کی خوش بوئیں آرہی تھیں اور رنگ برنگ کی چیزیں، جو لذت نگاہ کے بعد دعوتِ شکم دے رہی تھیں، ثابت کر رہی تھیں کہ بیگم برکات کو کھانے اور کھلانے کا ڈھنگ آتا ہے اور اسی لیے وہ بھی بڑی مہذب سمجھی جاتی ہیں۔

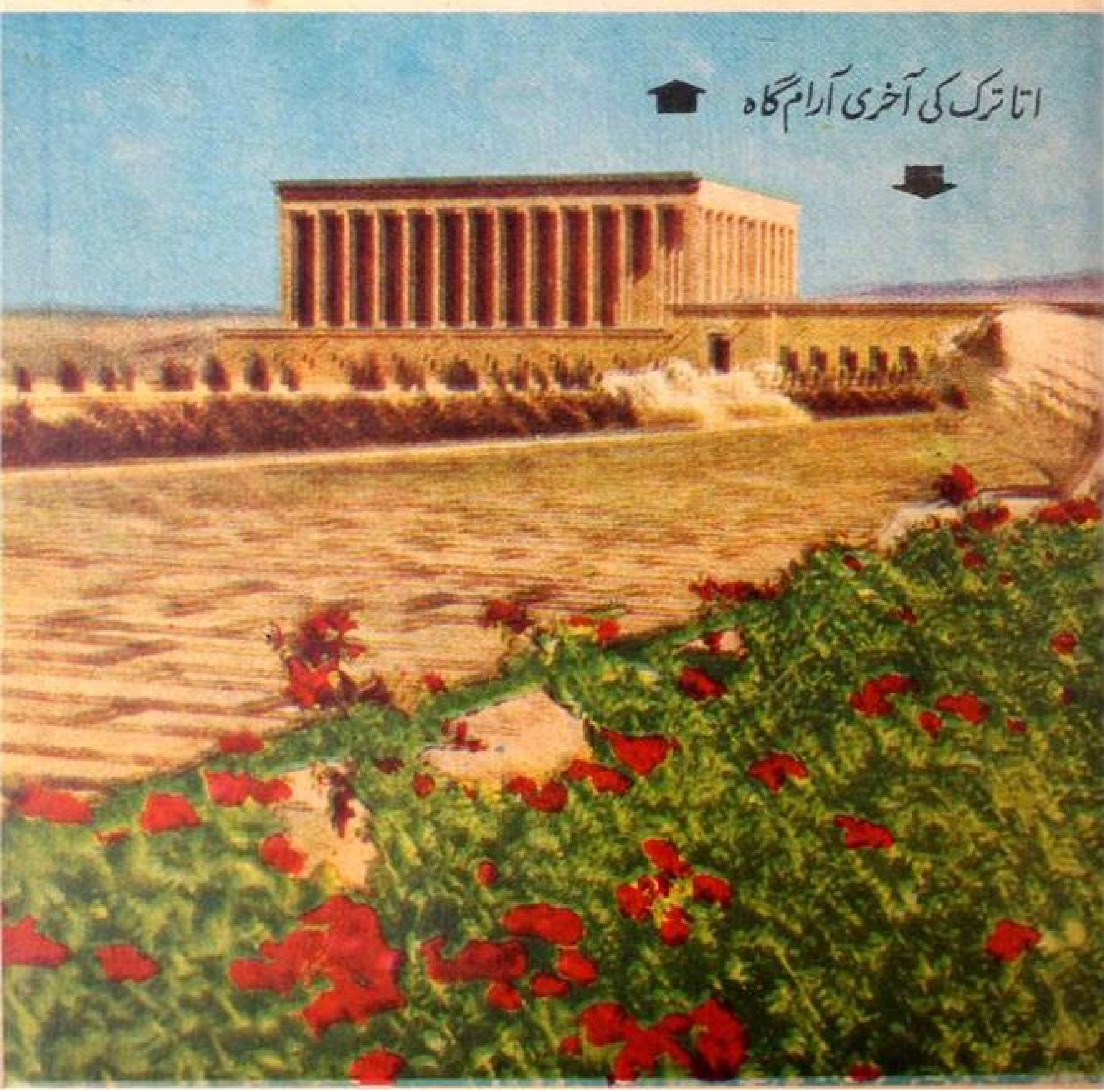
ہم دونوں بھائیوں نے، ان دونوں میاں بیوی نے اور چاروں بچوں نے ذرا بھی تکلف نہیں کیا، خوب سیر ہو کر کھایا، پھر بھی کسی قاب میں اتنا خلا پیدا نہیں ہوا جسے بھرنے کے لیے بیرے کو متوجہ ہونا پڑتا۔ مشروبات و ماکولات میں ہندستانی اور ترکی اشیا کی باہمی آمیزش نے زیادہ لطف پیدا کر دیا تھا۔

روانگی:۔ جب ہم گھر سے چلے تو برکات صاحب نے سرکاری فائلوں کا ایک پلندا اپنے ساتھ رکھوا لیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سی اہم مسلیں وہ اپنے ساتھ لا کر اطمینان سے پڑھتے اور پھر اپنی رائے یا فیصلہ لکھتے ہیں۔ سفارت خانوں میں کام کرنے والوں کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ عیش زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔ یہاں شاید کام کی نوعیت یا ذمہ داری کا احساس مختلف تھا۔

مقبرے پر:۔ ہم اپنی دانست میں اتاترک کے مقبرے پر بہت سویرے جا رہے تھے، لیکن جب وہاں پہنچے تو کافی لوگ موجود تھے ۔ زائرین میں مقامی اور غیر ملکی سبھی شامل تھے۔ فاتحہ پڑھ کر فوراً چلے جانے والوں کے علاوہ اِدھر اُدھر گوشوں میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ تلاوتِ کلام پاک بھی کر رہے تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا۔ سیاسی عناد کی بنا پر بعض بد طینت لوگوں نے جو یہ روایات پھیلا رکھی ہیں کہ اتاترک خدا اور رسولؐ کو نہیں مانتے تھے اور ہمیشہ مذہب کو کچل ڈالنے کے درپے رہے تھے، ایک دم حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں۔ اگر ان کا کردار ایسا ہوتا تو مرنے کے بعد یہ سعادت ان کو کبھی نصیب نہ ہوتی کہ ان کے مزار پر روزانہ تلاوت ہو۔ اس کے برعکس خدا کا عتاب ان پر نازل ہوتا اور شاید بھولے سے بھی اللہ کا نام ان کے مزار پر نہ لیا جاتا۔ ترکی میں آئے دن آنے والے زلزلے جو بعض پختہ عمارتوں تک کو ڈھا دیتے ہیں، ان کے مقبرے کو بھی منہدم کر دیتے جو ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے۔



اتا ترک کی آخری آرام گاہ



یہ پہاڑی انقرہ کے جنوب مغرب میں رصاتیپ کے نام سے مشہور ہے اور سامنے صدر مقام میں اسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جن لوگوں کے پاس اپنی موٹریں یا گاڑیاں نہ ہوں انھیں اُلوس میدان سے بسوں کے ذریعے چند میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ ٹنڈیان میدان تک پہنچ کر بسوں اور موٹروں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور ہر شخص کو پیدل ایک خیابان سے گزرنا پڑتا ہے۔ خوشبودار پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے درمیان چلتے وقت بڑی فرحت نصیب ہوتی ہے۔

اتاترک کا انتقال ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا اور ان کے جسدِ خاکی کو عارضی طور پر سُپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ بعض سیاسی الجھنوں اور دوسرے ضروری کاموں نے اربابِ اقتدار کو اتنی فرصت ہی نہ دی کہ مقبرے کی تعمیر فوراً شروع کر دی جاتی۔ چُناں چہ پانچ سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد سنہ ۱۹۴۴ء کے آغاز میں عمارت کی بنیاد پڑی جو ۱۹۵۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اس وقت ان کا تابوت عارضی جگہ سے نکال کر مقبرے میں دفن کر دیا گیا جہاں وہ ابد تک قومی امانت بنا رہیگا۔

عمارت کے تین بڑے حصے ہیں ـــــ اصل مقبرہ ـــــ ایک برآمدے کے ذریعے اس سے ملا ہوا ایک وسیع ہال اور چند دالان، جہاں زائرین عارضی طور پر اُٹھ بیٹھ سکیں اور ضرورت ہو تو چائے پانی وغیرہ سے لطف اُٹھا سکیں۔ ہم نے مقبرے میں یا آس پاس ایسے مجاوروں یا خدمت گاروں کو نہیں دیکھا جو ایسے مقام پر زائرین سے بخشش طلب کرنے کے لیے ان کے دامن کھینچتے رہتے ہیں۔ برآمدے تک پہنچنے کے لیے ۳۳ چوڑی سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں، جو سنگِ قیصریہ سے بنائی گئی ہیں۔

یہ برآمدہ سو فیٹ چوڑا اور دو سو پچاسی فیٹ لمبا ہے۔ اس کے دونوں طرف حطّی عہد میں تراشے ہوئے شیروں کے بارہ مجسمے نصب ہیں۔ پس منظر میں ایسے مختلف النّوع درختوں کے جھنڈ ہیں، جن کو ملک کے ہر حصے سے لا کر لگایا گیا ہے، یا جن کو غیر ملکوں نے بطور تحفہ بھیجا ہے۔ دونوں جانب دو بلند مینار استادہ ہیں۔ دایاں مینار شخصی آزادی کا اور بایاں قومی آزادی کا مظہر ہے۔ باہر جانے کے راستے پر دو اور مینار ہیں جو ترکی کے بہادر اور قوم پرست سپاہی کے ترجمان ہیں۔ وسیع ہال کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں، جو جمہوریت، فتح، انقلاب اور امن کے مظہر ہیں۔

خاص مقبرے کی عمارت دو سو پینتیس فیٹ طویل اور ایک سو اسی فیٹ عریض اور ستّر فیٹ بلند ہے۔ دائیں طرف کی دیوار پر اتاترک کی ایک معرکہ آرا تقریر کے جملے کندہ ہیں جو انھوں نے جمہوریۂ ترکیہ کی دسویں سال گرہ کے موقع پر کی تھی۔ بائیں طرف وہ پیغام کندہ ہے، جو ترک نوجوانوں کے نام بھیجا تھا۔ خیابان سے مقبرے تک جانے کے لیے بھی تینتیس ۳۳ وسیع سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں کے

دونوں جانب دیواروں پر ترکی کی دو مشہور لڑائیوں کے نقشے پیش کیے گئے ہیں۔

اتاترک کا تابوت ان کی پندرھویں برسی پر یعنی ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۵۳ء کو لاکر دوبارہ دفن کیا گیا تھا۔ مقبرے کے اندر قبر کا تعویذ سنگِ مرمر سے تراش کر بنایا گیا ہو جس پر خطِ طغریٰ میں آیاتِ قرآن کندہ ہیں اور سرخ مخمل کا جو غلاف اس پر ہر وقت پڑا رہتا ہو وہ بہت عمدہ اور دیدہ زیب ہو۔

"خانۂ اتاترک":۔ مقبرے کی سیر سے فارغ ہوتے ہوتے ہمیں تقریباً بارہ بج گئے اور ہمیں معلوم تھا کہ خانۂ اتاترک کے کھلنے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں، اس لیے ہم نے سوچا کہ برائے نام کچھ کھا پی لیں، نماز پڑھ لیں اور اگر موقع ہو تو ذرا بازار میں گھوم لیں۔

میں نے صرف گرم دودھ کا ایک گلاس اپنے لیے منگوایا اور بھائی جان نے دہی کی لسی طلب کی۔ البتہ برکات احمد صاحب نے ایک آدھ کباب اپنے لیے منگوایا۔ ہماری ان قلیل قسم کی فرمائشوں پر ہوٹل کے اربابِ انتظام بہت ہی متعجب تھے اور باقی گاہک بھی جو بہت کچھ سامنے رکھے اپنا پیٹ بھر رہے تھے، کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ممکن ہو ہماری قومیت اور ہمارا لباس ان کے زیرِ بحث ہو۔

ہمیں بتایا گیا کہ ترکی میں دوپہر کے وقت دودھ یا لسی پینے کا رواج نہیں ہو۔ اگر اس ملک میں دوپہر کے وقت ٹھوس غذا کے بغیر دودھ دہی استعمال کیا جائے تو اپھارا ہو جاتا ہو۔ لیکن ہمارے معدے نے وہاں بھی ہمارے معمولات کا ساتھ دیا اور ہمیں کوئی شکایت لاحق نہیں ہوئی۔

مسجد میں بڑی رونق تھی۔ ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگ نماز پڑھنے آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر ننگے سر تھے اور بعض نے صرف رومال کس کر باندھ لیے تھے۔ بہت سے نمازیوں نے دو اجنبیوں کو اپنے ساتھ دیکھ کر شوقِ ملاقات کا اظہار کیا اور برکات صاحب کی وساطت سے کچھ بات چیت بھی ہوئی۔ انھوں نے پاکستان سے اپنی دل چسپی کا اظہار اچھے الفاظ میں کیا۔

دو بجے ہم اتاترک کے مکان پر پہنچے جو ایوانِ صدر کے قریب چانکایہ پہاڑی پر واقع ہو۔ اسے ترکی زبان میں اتاترک اَن ایوی کہتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی سیدھا سادا دیہاتی وضع کا مکان ہو، جس کے بام و در زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ وہ زیب و زیبائش سے ہمیشہ بے نیاز رہے ہیں۔ اربابِ حل و عقد نے یہ اچھا کیا کہ ان کو ابتدائی حالت میں رہنے دیا، تصنع اور بناوٹ کا ٹھپہ ان پر نہیں لگایا۔

چھوٹے چھوٹے چند کمروں کے مکان میں ترکی کو نئی زندگی دینے والے شخص نے منصبِ صدارت

پرفائز ہونے کے بعد چند سال اسی چار دیواری میں گزارے تھے اور ملک کے شان دار مستقبل کے منصوبوں کی تشکیل وہیں بیٹھ کر کی گئی تھی۔

اتاترک کے استعمال کی سب چیزوں کو بجنسہ محفوظ کیا گیا، حتیٰ کہ وہ کتابیں بھی جو ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مختصر سی لائبریری میں جمع ہیں۔ اس وقت اس مکان کی سیر کرنے والے صرف ہم ہی تھے۔

اتاترک:۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا جب استنبول میں ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے تو ماں باپ نے عام دستور کے مطابق ان کا یک لفظی نام "مصطفےٰ" رکھا۔ اس زمانے کی ترکی میں چوں کہ خاندانی ناموں کے اضافے کا رواج نہیں تھا، اس لیے ایک عرصے تک وہ صرف مصطفےٰ کہلاتے رہے۔ جوان ہونے، تھوڑی بہت تعلیم پانے اور کچھ نام و نمود پیدا کر لینے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ مصطفےٰ بے کہلاتے جو عام دستور تھا۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ اس نام کے ساتھ ساتھ کیسے کیسے اعزازی اضافے ہوں گے، بلکہ لوگ ان کا اصل نام بھول کر قوم کی طرف سے ملنے والے صرف خطابات یاد رکھیں گے۔

ان کے والد ایک معمولی سرکاری اہلکار تھے اور والدہ ایک بے پڑھی لکھی دیہاتن تھیں، لیکن جو دودھ انھوں نے اپنے بیٹے کو پلایا، اس میں جہالت نہیں، ہوش مندی تھی۔ قابلیت، عزم اور خلوص وغیرہ کے عناصر شامل تھے۔ ابھی یہ بچہ کم سن اور نحیف و کمزور ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور تمام ذمہ داری ماں کے کندھوں پر جا پڑی اور غربت جو پہلے سے اس گھرانے میں موجود تھی، زیادہ بڑھنے لگی۔ اس بچے کی والدہ جاہل اور غریب سہی، لیکن اچھے کردار اور عزم و ارادے کی عورت تھیں اور بہت ہی پابندِ مذہب بھی تھیں۔ ان بچاری نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بڑی احتیاط سے پالا اور کھیتوں میں عموماً اپنے ساتھ کام کاج میں مشغول رکھ کر محنتی اور ہوشیار بنا دیا۔ دوسرے بچوں کی طرح وہ کاہل مزاج اور کام چور ہونے نہیں پایا۔

خاوند کے انتقال کے کچھ عرصے بعد مصطفےٰ کی والدہ اپنے بھائی کے گھر جا کر ان کے کام میں شریک ہو گئی تھیں، اس لیے ماموں کے کھیتوں میں نوجوان مصطفےٰ کا بڑا کام بکریاں چرانا تھا، لیکن بار بار والدہ یہ تلقین کرتی رہی تھیں کہ یہ کام عارضی ہے۔ میرے بیٹے کو تو بڑے شہروں میں جا کر ذمہ داری کے کام انجام دینے ہیں۔ چناں چہ فالتو وقت میں درختوں کے زیرِ سایہ ہری ہری گھاس پر لیٹ کر وہ مستقبل کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

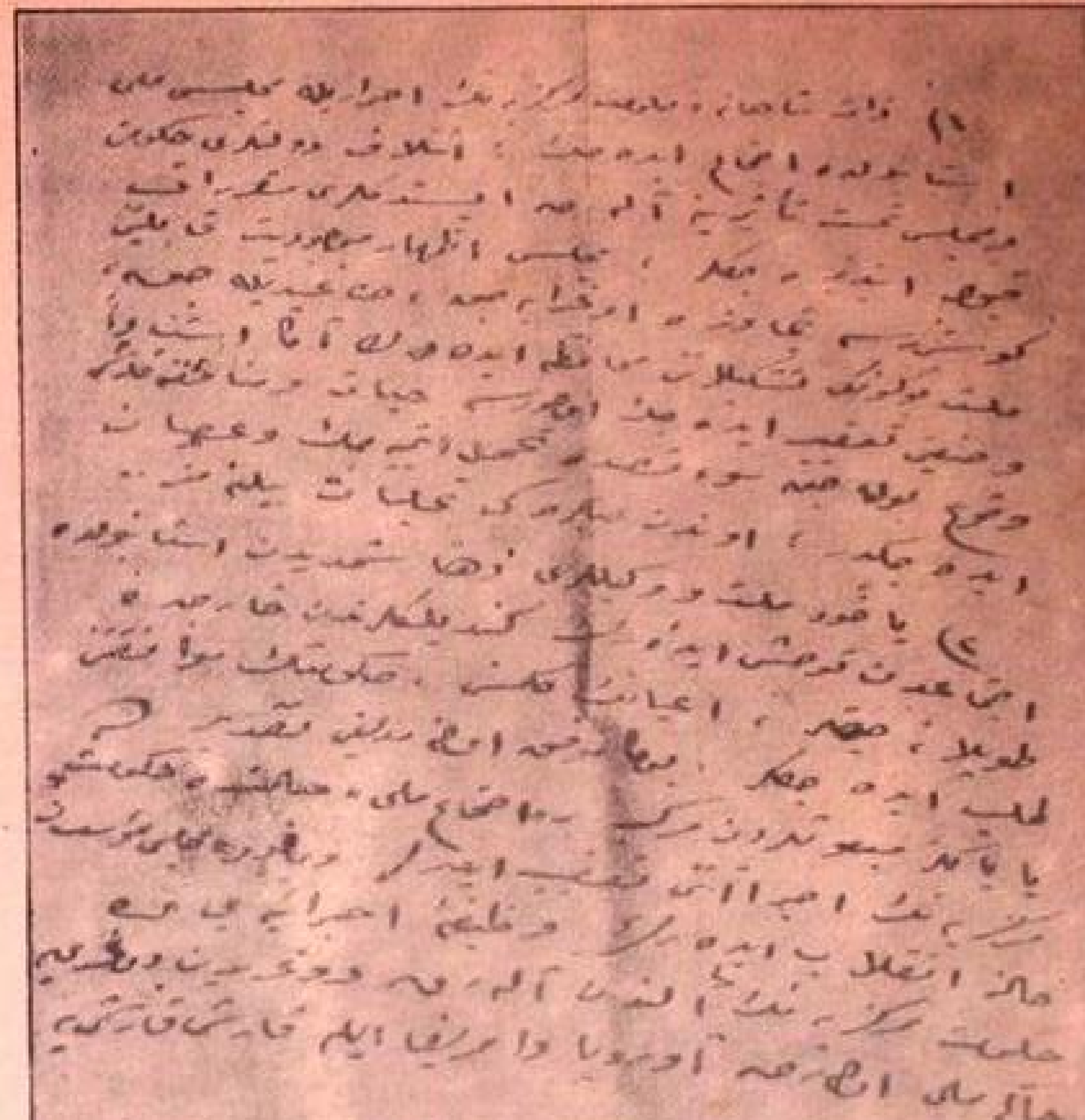
اس وقت مصطفےٰ کا شعور زیادہ بیدار نہیں ہوا تھا لیکن یہ نظامِ زمینداری انھیں اسی وقت سے کھلنے لگا تھا کہ کاشت کاروں کی محنت کا ثمرہ پوری مقدار میں ان کے پاس نہیں رہتا بلکہ زمیندار کے چنگل میں یا سرکاری خزانے میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ پیشۂ کاشت کاری سے بیزار ہو گئے۔ انھوں نے سوچا کہ کچھ پڑھ لکھ کر فوج میں داخل ہونا چاہیے۔ اس وقت ان کے خیالات کی پرواز اس منزل سے آگے نہیں تھی۔ والدہ اس فیصلے کے خلاف تھیں کیونکہ تعلیم کے لیے ان کے پاس پیسہ کہاں تھا لیکن ہونہار بیٹے نے ماں کو مطمئن کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ تم ماموں جان کے پاس رہو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

وہ گھر کو خیرباد کہہ کر سالونیکا گئے اور فوجی مدرسے میں داخل ہو گئے، جس میں داخلہ تو مشکل تھا لیکن تعلیم کا کوئی خرچ نہیں تھا۔ اس کے برعکس یہ فائدہ تھا کہ دورانِ تعلیم میں چوں کہ فنِ سپہ گری بھی سکھا دیا جاتا تھا، اس لیے فوج میں داخلہ نہ صرف آسان بلکہ لازمی تھا۔

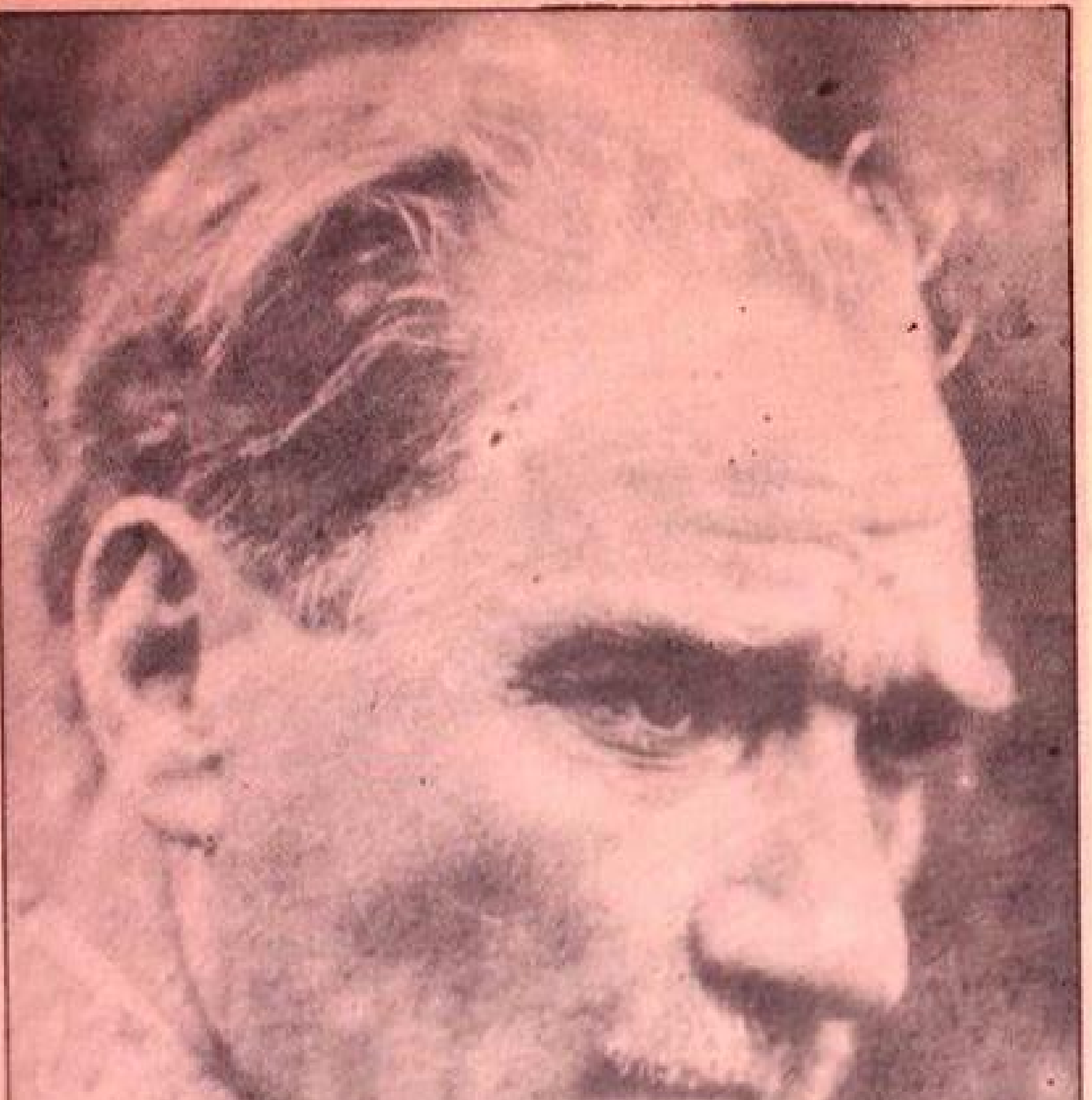
ان دنوں فوجی مدرسے میں مصطفےٰ نام کے کئی طلبا داخل تھے، لٰہذا استاد نے ان کو سب سے زیادہ ہونہار اور باکمال سمجھتے ہوئے لفظ کمال ان کے نام کا جزو بنا دیا تاکہ فرق و امتیاز ممکن ہو سکے۔ اس وقت نامِک کمال کا نام اُستاد کے ذہن میں تھا جو ترکی کے ایک بڑے محبِ وطن اور مشہور شاعر گزرے ہیں۔

سالونیکا میں فارغ التحصیل ہو کر مصطفےٰ کمال استنبول گئے اور ملٹری اکیڈمی میں داخل ہو گئے۔ وہاں ان کو چند ایسے نوجوانوں سے واسطہ پڑا جن کے دلوں میں آزادیٔ وطن کی تڑپ تھی اور وہ اکثر اکٹھے ہو کر بغاوت کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ مصطفےٰ کمال ایک حد تک ان کے ہمنوا ہو گئے لیکن برابر یہی تلقین کرتے رہے کہ ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے صحیح موقع کا انتظار کیا جائے ورنہ خود مصیبت میں پھنس جانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ظالم فرمانرواؤں کے اقتدار کو ختم کرنا اور سیاسی آزادی حاصل کرنا ہمارا نصب العین ضرور ہو لیکن اسکیم ایسی بنے جو کامیاب رہے، ورنہ مناسب وقت آنے تک خاموش رہا جائے۔

انھوں نے اعزاز کے ساتھ اعلیٰ سند حاصل کر لی لیکن فوج میں ایک عہدہ دے کر انھیں دمشق بھیج دیا گیا۔ یہ دراصل ایک قسم کی جلاوطنی تھی، کیوں کہ اربابِ حکومت کو اس ساری جماعت کی خفیہ سازشوں اور وطن پرستانہ سرگرمیوں کا علم ہو گیا تھا۔ باقی ساتھی بھی دور دراز علاقوں میں بھیج دیے گئے تاکہ ان کے جذبات سرد پڑ جائیں اور وہ حکمراں طبقے کے خلاف سر نہ اٹھا سکیں۔ اس جلاوطنی



انقرہ کو صدر مقام بنانے کے لیے
اتاترک کے فرمان کا ایک حصّہ



ترکی جمہوریت کے پہلے صدر
غازی مصطفیٰ کمال اتاترک

نے ان کے دل و دماغ میں زیادہ بغاوت کا مادہ پیدا کر دیا اور وہ خاص طور پر سلطان کو ایک ظالم اور وحشی انسان سمجھنے لگے۔ یہ سلطان عبد الحمید کا عہد تھا۔ چناں چہ سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلابِ عظیم میں وہ بھی شریک تھے، جس کے نتیجے کے طور پر سلطان کو معزول کر دیا گیا۔ ان کا بس چلتا تو وہ سلطنت عثمانیہ کا چراغ اسی وقت گل کر کے ملک میں جمہوریت قائم کرانے کی صورت پیدا کرتے لیکن دوسرے مصالحت پسندوں کی اکثریت تھی جنھوں نے خلافت کا سلسلہ قائم رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

جب پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو مصطفےٰ کمال نے ترکی کو غیر جانب دار رہنے کا مشورہ دیا لیکن اس وقت بھی ان کی آواز نہ سنی گئی۔ انھوں نے پورے یقین کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ جرمنی اس لڑائی میں ہار جائے گا۔ لیکن جب اپنا ملک لڑائی میں شامل ہو گیا تو وہ اس مہم سے الگ بھی نہ رہ سکے۔

درِ دانیال کا محاصرہ ہونے پر انھوں نے اس کا دفاعی نظام اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑی دلیری اور چابک دستی کا مظاہرہ کر کے کم سے کم اس وقت استنبول کو بلکہ سارے ملک کو دشمن کے نرغے سے بچا لیا۔

اس وقت پہلی بار ان کا نام ہر شخص کی زبان پر آیا اور زبردست بہادری کی بنا پر انھیں قابلِ تعریف سمجھا جانے لگا اور جب اتحادیوں کے بحری بیڑے کے ناکام ہو کر واپس چلے جانے کے بعد وہ استنبول میں واپس آئے تو ان کا نہایت شان دار استقبال ہوا، نہ صرف فوجی حلقوں میں بلکہ عوام نے ہار پہنا کر انھیں اپنے شانوں پر اٹھا لیا۔ ایک فوجی افسر کی یہ کامیابی اور قدر و منزلت، وزیرِ حرب کے دل میں جلن پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے فوراً مصطفےٰ کمال کو ارضِ روم کے محاذِ جنگ پر بھیج دیا، جہاں ترک روسیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

اسی اثنا میں سرزمین روس پر بالشویکی انقلاب برپا ہو گیا اور روسی فوجیں خود ہی مراجعت کر گئیں لیکن دوسری طرف مشرقِ قریب کے علاقے میں برطانوی دستوں نے نئی کمک حاصل کر کے حشر برپا کر دیا اور ترکی فوجوں کے چھکے چھڑا دیے۔

جب مصطفےٰ کمال ارضِ روم کے محاذ سے فارغ ہو کر استنبول پہنچے تو برطانوی افسران فاتح کی حیثیت سے محل میں بیٹھے شرائط طے کر رہے تھے اور کمزور طبیعت سلطان کے لیے ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ وہ ان مذاکرات میں حصہ لے کر مخالفت کرنا چاہتے تھے لیکن سلطان سے اجازت نہ ملی بلکہ اس طرح عتاب نازل ہوا کہ مئی ۱۹۱۹ء میں ان کو اناطولیہ کی فوجوں کا انسپکٹر جنرل بنا کر سمسون بھیج دیا گیا جو بحیرۂ اسود کے کنارے ایک بندرگاہ ہے۔ انھیں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ جو فوج وہاں تتر بتر ہو گئی ہے، اسے دوبارہ منظم کر لیا جائے۔

مصطفےٰ کمال کے اس جگہ پہنچنے سے چند دن پہلے یونان کی فوج سمرنا (ازمیر) کے مقام پر اتر چکی تھی۔ یہ ترکی کا دوسرا سب سے بڑا شہر اور ایک اہم بندرگاہ ہے۔ یونانیوں کو برطانوی اور فرانسیسی بیڑوں کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ لڑائی چھڑ گئی۔ ایک طرف یونان کے تازہ دم سپاہی تھے اور دوسری طرف ترکی کے منتشر سپاہی جو پوری طرح سامانِ حرب سے لیس بھی نہیں تھے۔ اس علاقے کے کاشتکار جان پر کھیل گئے اور وہ نہتے ہونے کے باوجود کچھ اس انداز سے میدان میں آئے کہ دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ان کاشتکاروں کو للکار کر اپنی مدد کے لیے بلانا مصطفےٰ کمال کا واقعی کمال تھا۔

اس معرکے کے بعد انھوں نے فوجی ملازمت ترک کر دی۔ اپنے عہدے کو خیرباد کہہ دیا اور کھلم کھلا میدانِ سیاست میں آ کر اربابِ حکومت سے ٹکر لینے لگے۔ انھیں اپنے عزائم میں بتدریج کامیابی ہوئی۔ ترکی کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی طاقت عروج کو پہنچ گئی تو خلافت کا دور ٹوٹ گیا اور انجامِ کار وہ جمہوریۂ ترکیہ کے پہلے صدر منتخب کر لیے گئے۔ یہ ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے۔ اس روز سے مرتے دم (۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء) تک انھوں نے ملک کی تعمیر اور استحکام کے لیے جو کارنامے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں لکھے جا چکے ہیں۔ وہ کارنامے جن کی بدولت ترکی نہ صرف سرزمین یورپ پر بلکہ ساری دنیا میں اپنے لیے ایک بلند مقام حاصل کرنے کے لائق ہو گیا ہے۔

ایک اہم کارنامہ:- اتاترک کے عہد کا ایک بہت ہی بڑا اور اہم کارنامہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی دانش مندانہ کوششوں سے سنہ ۱۹۲۸ء اور سنہ ۱۹۳۸ء کے درمیان بڑے پیمانے پر باشندگانِ ملک کا تبادلہ عمل میں آیا، بالکل اسی طرح جیسے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد ہوا تھا۔

سلاطینِ عثمانیہ کے لیے بھی نصرانی فرقوں کا وجود بطور خاص دردِ سر بنا ہوا تھا۔ ان پر اب بھی بھروسہ کرنا مشکل تھا اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو ترکی کے نیک باشندے ثابت کر سکیں گے۔ ان کی سازشیں خلافِ توقع اور اچانک رنگ لا سکتی تھیں۔ آرمینیا کے باشندوں کو جو ملک کے چند حصوں میں قلیل تعداد میں آباد تھے، مشورہ دیا گیا کہ ان کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنا تمام اثاثہ ساتھ لے کر اپنے وطنِ مالوف چلے جائیں۔

اہلِ مقدونیہ کا مسئلہ سنہ ۱۹۱۲ء کی لڑائی کے بعد خود ہی طے ہو گیا تھا۔ مشرقی تھریس اور مغربی اناطولیہ میں یونانی النسل لوگوں کی بڑی آبادی تھی اور اس کے برعکس شمالی یونان اور یونانی علاقۂ مقدونیہ میں ترک اسی تعداد میں رہتے تھے۔ دونوں حکومتوں کے مابین اس موضوع پر مذاکرات ہوئے اور ایسا حل نکال لیا گیا جو سب کے لیے مفید تھا اور آئندہ کی ممکنہ چپقلشوں کا سدباب کر سکتا تھا۔

ملک سے جانے والے ہر شخص کو اس کا اثاثہ یا اس کی قیمت ادا کر دی گئی۔ یہ سب کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پُرامن طریقے پر ہوگیا۔ ہزاروں خاندان اس پالیسی سے متاثر ہوئے۔ لیکن ایک دُور رس نظریے کے ماتحت کوئی نقصان میں نہیں رہا۔ عارضی افراتفری کے بعد سب کو مستقل بنیادوں پر زندگی نئے سرے سے مستحکم و استوار کرنے کا موقع مل گیا۔

ملک میں عیسائی عقیدے کے لوگ اب بھی آباد ہیں لیکن حکومت کو ان سے کوئی اندیشہ نہیں رہا ہے۔ ان کو واجب حقوق و مراعات حاصل ہیں، اس لیے ان کی طرف سے کبھی احتجاج کا ہلکا سا بھی امکان نظر نہیں آتا، چہ جائیکہ ان پر کسی سازش کا شبہ ہو۔ گویا ترکی کے جسمِ ناتواں میں جو زہریلا پھوڑا تھا، وہ نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ البتہ اس عمل جراحی کا ایک ہلکا سا نشان باقی رہ گیا ہے جو تشویش ناک نہیں کہا جا سکتا۔

بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ ترکی نے اپنے پڑوسی ملکوں خصوصاً یونان پر بڑا کرم کیا، کیوں کہ ترکوں کا وہاں سے چلا آنا خود وہاں کی حکومت کے حق میں بہتر ہوا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی آئندہ زمانے میں اس غیر ملک میں بسنے والے ترک سر اٹھاتے، اپنے حقوق کی حفاظت میں سازشیں کرتے اور حکومت کے لیے دردِ سر بن جاتے، جیسے ترکی فرمانرواؤں اور بعد کے اربابِ سیاست کے لیے یونانی و رومی اور آرمینیائی باعثِ پریشانی تھے۔

ترکی ٹوپی:- اتاترک کی جدت پسندی نے ترکی میں جو بہت سی انقلابی تحریکات چلائیں اور انھیں کامیاب کر دکھایا، ان میں اس پھندنے والی ٹوپی کے رواج کو کلیتہً ترک کرنا بھی شامل ہے جسے برصغیر پاک و ہند میں صرف اسی لیے ترکی ٹوپی نہیں کہا جاتا کہ اسے ترک قوم کے افراد بھی کبھی استعمال کرتے تھے بلکہ عام طور پر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ یہ ترکوں کی صنعت ہے اور اسی ملک سے درآمد کی جاتی ہے، حالاں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ ترکی ٹوپی جسے دراصل فیز کیپ کہنا چاہیے، خود ترکی میں ایسے علاقے سے درآمد ہوتی ہے، جو خالصتاً یہودیوں کا علاقہ تھا اور ساری صنعت انھی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔

اتاترک کو یہ بات کسی عنوان گوارا نہیں تھی کہ اپنے ملک کا رُپیہ ایک اسلام دشمن قوم کے پاس جائے، چناں چہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ فیز کیپ چھوڑ کر صرف ہیٹ استعمال کیا جائے۔ اگرچہ شروع میں سر کا یہ لباس بھی غیروں سے حاصل کیا گیا اور رفتہ رفتہ یہ صنعت ملک میں رواج پا گئی۔ معترضین کہہ سکتے ہیں کہ فیز کیپ کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا جاتا اور اس ساخت کی ٹوپیاں ملک میں تیار کی جاتیں لیکن اس قسم کا خام مال آسانی سے دستیاب نہ ہوسکنے کے باعث اس صنعت کو فروغ دینا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس ٹوپی سے خاص طور پر سلاطین عثمانیہ سے دل بستگی کی

یاد تازہ رہ سکتی تھی اور یہ بات اتاترک کو کسی عنوان گوارا نہیں تھی۔ انھوں نے قومی ڈھانچے کے جن مذموم حصّوں کو چھانٹ دینے کا فیصلہ کیا تھا، ان میں اکثریت ایسے عناصر کی تھی جن سے بُوئے شہنشاہیت آتی تھی۔ انھوں نے فیز دشمنی کا اصل راز عوام پر منکشف نہیں کیا بلکہ ہیٹ کے صرف مفید پہلو پر روشنی ڈالی کہ اس کا چھجہ سورج کی تیز شعاعوں سے محفوظ رکھنے میں کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ نہ صرف بڑے شہروں کے بازاروں میں، بلکہ دیہات کی تنگ گلیوں اور کھیتوں میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے، اور کام لیا جا رہا ہے۔ اگر آج اس ملک میں کسی شخص کے سر پر مضحکہ خیز پھندنے والی نام نہاد ترکی ٹوپی نظر آجائے تو نہ صرف اسے تعجب سے دیکھا جائے گا بلکہ حکومت کے کارندے فوراً احتساب کریں گے کیونکہ ملک بھر میں اس کا استعمال نہ صرف مذموم سمجھا جاتا ہے، بلکہ قانوناً ممنوع بھی ہے۔

ہیٹ کی مخالفت میں سب سے بڑی دلیل علمائے دین نے پیش کی تھی کہ اسے اوڑھ کر نماز کی ادائیگی خصوصاً سجود میں سخت دقت ہوتی ہے لیکن اس سوال کا کوئی معقول جواب ان کے پاس موجود نہیں تھا کہ اگر یورپ کے کسی اور حصے کے غیر مسلموں کو جن کا قومی لباس سر ہمیشہ سے ہیٹ ہے، دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا جائے تو کیا انھیں بھی مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے ٹوپ کو خیر باد کہہ دیں اور ایسی ٹوپی استعمال کریں جو رکوع و سجود میں حارج نہ ہو۔ اگر قبولِ اسلام کے لیے اس شرط کو لازمی قرار دیا جاتا تو شاید مغربی دنیا میں اشاعتِ اسلام کو زیادہ کامیابی نہ ہوتی۔ ترک ہیٹ اختیار کرنے اور فیز کیپ ترک کر دینے کے باوجود پوری خوش عقیدگی کے ساتھ پابندِ نماز ہیں اور کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت وہ اپنی جیب سے نکال کر معمولی کپڑے کی ایک ٹوپی سر پر منڈھ لیتے ہیں یا رومال باندھ لیتے ہیں اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو برہنہ سر بارگاہ الٰہی میں جھک جاتے ہیں جو جائز ہے۔

اس انقلابی تحریک کو قومی مجلسِ عظمیٰ نے ۲۵ نومبر سنہ ۱۹۲۵ء کو باقاعدہ منظور کر دیا اور حکم دیا کہ آئندہ بغیر چھجے والی کوئی ٹوپی نہ اوڑھی جائے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو قید کی سزا دی جائیگی۔

اس قانون کے نافذ ہوتے ہی سارے ملک میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ایک طرف لوگ ہیٹ فروخت کرنے والی دکانوں کی طرف دوڑ پڑے اور دوسری طرف وہ پرانی ترکی ٹوپیاں چھپانی چاہتے تھے کہ کہیں بھولے سے استعمال نہ کر لی جائیں۔ حکومت نے اس لحاظ سے سخت نگرانی کی کہ ہیٹ بیچنے والے ضرورتِ وقت کے لحاظ سے نفع اندوزی نہ کریں۔ حکم نافذ کرنے سے قبل ہیٹ بنانے والے کئی کارخانے بڑے شہروں میں قائم کر دیے گئے تھے جنھوں نے رات دن کام کر کے نصف مطالبات پورے کرنے کا انتظام کر دیا تھا۔ نہ صرف شہروں بلکہ دیہات کے باشندوں نے بھی ہیٹ خرید لیے

اور اس طرح سرکاری اور تجارتی دفاتر، دکانوں اور کارخانوں کے علاوہ کھیتوں میں بھی لوگوں کے سروں پر ہیٹ ہی ہیٹ نظر آنے لگے۔ شروع میں عام لوگوں نے اس کے استعمال میں کسی قدر دقت محسوس کی اور اس کے صحیح آداب کا خیال نہیں رکھا لیکن اب وہ اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ فیز کیپ یکسر ان کے دماغ سے مٹ چکی ہے۔

ناموں کا مسئلہ:۔ ترکی میں انقلابی تحریکات کا ایک قابلِ ذکر کارنامہ یہ بھی ہے کہ سب لوگوں کے ناموں میں خاندانی ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے یا ایسے الفاظ بڑھائے گئے ہیں جن سے فرق و امتیاز کرنا آسان ہو گیا ہے۔

انقلاب سے پہلے اکثر نام یک لفظی ہوتے تھے مثلاً محمد، علی، حسن، کمال، رؤف، خالدہ یا سلمٰی۔ بڑے ہونے یا کوئی اعلیٰ سرکاری منصب سنبھالنے پر زیادہ سے زیادہ نام کے ساتھ "بے" یا "پاشا" کا اضافہ کر دیا جاتا تھا لیکن اس طرح بھی کوئی تخصیص ممکن نہیں تھی۔ اس رواج کی سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ کسی مخصوص شخص کو تلاش کرنا یا اس کا حوالہ دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا تھا۔ ایک ہی نام کے متعدد اشخاص نہ صرف ایک شہر میں بلکہ ایک علاقے، ایک محلے، حتیٰ کہ ایک گھرانے میں پائے جاتے تھے۔ اگر ڈاکیہ کوئی خط پتر، پارسل یا منی آرڈر لاتا تو صحیح مکتوب الیہ کو ڈھونڈھنے میں بڑی دقت ہوتی اور اکثر غلطیاں ہو جاتیں جن کا کبھی کبھی ازالہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ بعض صورتوں میں باپ بیٹے ایک ہی نام سے پکارے جاتے اور خاصی غلط فہمی پیدا کر دیتے تھے۔ غیر شعوری طور پر بعض لوگوں نے کچھ اضافے خاص ناموں کے ساتھ کیے لیکن وہ بڑے معیوب اور قابلِ اعتراض تھے، مثلاً لمبا محمد، ٹھگنا علی، موٹی سلمٰی، گنجا رشید، دانت ٹوٹا حمید وغیرہ۔ یہ اضافے بدذوقی پر دلالت کرتے تھے۔

اتاترک کے ایما پر یہ مسئلہ اربابِ حل و عقد کے سامنے زیرِ بحث آیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ذاتی نام کے ساتھ ساتھ خاندانی ناموں یا دوسرے لاحقوں کو رائج کیا جائے۔ مصطفیٰ کے ساتھ کمال پاشا، غازی اور پھر اتاترک جیسے لاحقے اتنے نادر تھے کہ کسی اور اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ البتہ ترکی کے پہلے وزیر اعظم عصمت پاشا کے نام کے ساتھ ایک گاؤں "انونو" کا لفظ بڑھا کر پہلی قابلِ ذکر تخصیص کی گئی، کیونکہ اس مقام پر مورچہ لگا کر انھوں نے ایک زبردست مہم سر کی تھی۔ اسی طرح مشہور ترکی مصنفہ و مدبرہ خالدہ خانم کے نام میں "ادیب" کا لفظ بڑھا کر ان کو ایک امتیازی حیثیت دے دی گئی۔ چناں چہ اب ہر شخص کا نام دو تین بلکہ چار لفظوں تک

پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا حوالہ دینے یا اسے تلاش کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔

زبان کا مسئلہ:- ایک اصلاح کے بعد دوسری اصلاح عمل میں آتی رہی بلکہ بعض بوڑھے ترکوں کا کہنا ہے کہ ہم روزانہ صبح اٹھ کر ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ آج حکومت کی طرف سے کس تبدیلی کا اعلان ہوگا، بلکہ عام انسانی فطرت کے مطابق بعض لوگ کچھ باتیں خود ہی گھڑ کر سُناتے کہ حکومت نے فلاں کام پر پابندی لگائی ہے، یا فلاں طریقِ کار میں تبدیلی کی ہے، آئندہ یہ کام اس طرح کرنا ہوگا۔

اس زمانے میں معلوم نہیں حکومت کے ایما پر یا اپنی مرضی اور آزاد رائے سے بعض اخبارات نے یہ مہم شروع کی کہ ترکی حروفِ ابجد اور ترکی زبان میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں۔ بعض معترضین نے اپنی رائے مدلل پیش کی اور بعض نے محض جذبات سے کام لیا۔

عربوں نے ترکوں کے خلاف جو سازشیں کی تھیں، ان کی بنیاد پر بہت سے وطن پرست چاہتے تھے کہ عربی زبان اور عربی رسم الخط کو ترک کر دیا جائے۔ ان سے بھی دشمنی کی بُو آتی ہے۔ لیکن بیشتر کی رائے یہ تھی کہ ہمارے ملک کا زیادہ آباد حصّہ براعظم یورپ میں واقع ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ممالکِ مغرب کے دوش بدوش ترقی کرنے کے لیے وہ رسم الخط اختیار کیا جائے جو سارے یورپ میں رائج ہے تاکہ تبادلۂ خیالات اور مذاکرات میں سہولت پیدا ہو سکے۔ اس تحریک کی مخالفت کرنے والوں کے پاس صرف ایک ہی دلیل تھی اور وہ یہ کہ قرآنِ پاک کی زبان عربی ہے اور تمام احادیث بھی اسی رسم الخط میں ہیں، اِس لیے اس زبان کو ترک کرنا مناسب نہیں ہے لیکن مذہبی لوگوں کا فرمان تھا اور چوں کہ مذہب کا تصور ترکی میں محدود ہوتا جا رہا تھا، اس لیے ان کی سُنتا کون تھا۔

باہمی مفاہمت کے طور پر کچھ لوگ یہ مان لینے کے لیے تیار تھے کہ رسم الخط کو بدل دیا جائے تاکہ طباعت کا کام عمدہ ٹائپ کے ذریعے ممکن ہو جائے، لیکن زبان میں کوئی تبدیلی نہ ہو کیوں کہ عربی زبان کے الفاظ اپنی بول چال میں اس درجہ رس بس گئے ہیں کہ ان کو ترک کرنا غیر مناسب ہی نہیں، بلکہ دشوار بھی ہے۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی تمام علمی و ادبی دفاتر کو یا تو نئے انداز میں بدلنا پڑے گا، جو کوئی آسان کام نہیں ہے، یا مجبوراً حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا پڑے گا جو کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

غرض یہ کہ ہر مدرسۂ خیال سے ایک علیحدہ رائے پیش کی جا رہی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترکی میں بیک وقت ایک ہی نوعیت کی دو زبانیں بولی جا رہی تھیں۔ پڑھے لکھے لوگ جن کی تعداد

بہت کم تھی۔ نہایت فصیح و بلیغ اور مرصّع زبان بولتے جن میں عربی فارسی الفاظ کی ریل پیل ہوتی اور اس کے برعکس عوام کی بول چال میں ان الفاظ کا رچاؤ زیادہ ہوتا جو ترکی میں فروغِ اسلام سے پہلے مقبول تھے اور چونکہ زبان کی سند عوام سے ملتی ہے، اس لیے یکسر تبدیلی چاہنے والوں کی اکثریت ہوگئی، خصوصاً اناطولیہ کے بیشتر باشندے اس تحریک کی حمایت کرنے لگے۔

ارباب حل و عقد کے لیے اس پہلو پر بھی غور کرنا ضروری تھا کہ اگر رسم الخط اور زبان میں تبدیلی پیدا کی جائے تو موجودہ تعلیمی نظام اور نصاب کو بھی بدلنا پڑے گا اور اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری تھا کہ پرانے اُستاد بھی کچھ عرصے کے لیے باقاعدہ طالب علم بن جائیں پہلے خود نیا انداز سیکھیں اور پھر نئی پود کو سکھائیں۔

تاہم جب کوئی قوم عزمِ صمیم کے ساتھ کسی کام کا تہیہ کر لیتی ہے تو درمیانی مشکلات آہستہ آہستہ خود ہی مٹتی چلی جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے جب کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

صدر ترکی یعنی اتاترک کی سرکردگی میں ایک لسانی کمیشن قائم کیا گیا جس نے لاطینی حروف کے ساتھ ساتھ قریب کے ملکوں کے رسوم الخط کو بھی سامنے رکھا اور تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ کمیشن کا اولین مقصد حروف کو فوراً بدل دینا تھا کیونکہ زبان کی تبدیلی کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے اور اس کا صحیح رچاؤ صرف غیر شعوری طور پر ہی ممکن ہے۔ اس کمیشن نے اپنا انقطاعی فیصلہ بہت جلد صادر کر دیا۔ اس نے انگریزی زبان کی طرح مرکب حروف بالکل نہیں لیے، بلکہ اعراب لگا لگا کر بعض حروف کے تلفظ میں فرق پیدا کیا۔ یہ کام بھی اگرچہ مشکل تھا لیکن چند دن میں سب کچھ طے ہو گیا۔ غیر ملکی ماہرین کو بلا کر حروف کے سانچے بنوائے اور ڈھلائی کا کام شروع کر دیا گیا تاکہ نئے انداز میں چھپائی ممکن ہو جائے۔

اخباروں نے بھی اس نئی منزل میں قدم بڑھایا اور بیشتر اخبارات و رسائل نئے حروف میں شائع ہونے لگے۔

اسکول تو خیر ہوتے ہی ہیں تعلیمی مقاصد کے لیے، لیکن سرکاری عمارتوں حتیٰ کہ سینما گھروں میں رات دن لکھائی اور پڑھائی ہونے لگی۔ پانچ سال سے زیادہ اور چالیس سال سے کم عمر بچوں، مردوں، عورتوں کے لیے نیا طرزِ تحریر سیکھنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ اس طرح جن لوگوں نے اپنی عمر میں کبھی تعلیم نہیں پائی تھی، وہ بھی اس میدان میں آ کھڑے ہوئے۔ باپ بیٹے، میاں بیوی اور بھائی بہن سب کا قدم ایک ساتھ اٹھنے لگا۔

گھروں میں اور گھروں کے باہر صرف ایک ہی موضوع سخن رہ گیا تھا۔ نئے حروف لکھنے اور پڑھنے آ گئے ——— کوئی دشواری تو نہیں ہو ——— اب تک کتنے الفاظ سیکھ لیے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام باشندوں نے اس فرض کی ادائیگی کو زندہ رہنے کا واحد ذریعہ سمجھ لیا تھا۔

انتہائی جوش وخروش کی یہ کیفیت ترک قوم کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوئی۔ اسی وقت کے احساس فرض کا نتیجہ ہے کہ آج اس ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب اتنا زیادہ ہے کہ بہت سے نام نہاد ترقی یافتہ ممالک بھی اس لحاظ سے اس کے مقابلے میں پست کہے جا سکتے ہیں۔

اس تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ارباب حل وعقد نے صرف احکامات کے ذریعے الفاظ کا ڈھونگ نہیں رچایا بلکہ عملی طور پر تحصیلِ مقصد میں حصّہ لیا۔ خود اتاترک کا یہ عالم تھا کہ وہ خود اتالیق بن کر اور مختلف مقامات پر پہنچ پہنچ کر درس دیتے اور عوام کی مشکلات دور کرتے تھے۔ انھوں نے تمام اناطولیہ کا دورہ کیا اور ان دنوں ان کا رختِ سفر ایک تختۂ سیاہ اور سفید چاک کی قلموں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں سرکاری خزانے سے سب سے زیادہ رقم بھی درسی سامان اور تعلیمی انتظامات پر خرچ ہوتی تھی۔ ایک ہی سال کے پلٹے میں ملک کی حالت بالکل بدل گئی۔ اندازِ گفتگو اور اسلوبِ تحریر میں یکسر انقلاب آ گیا۔ اور یہ سب کچھ ایک شخص کے پختہ ارادے کی بدولت ہوا جسے بجا طور پر اتاترک کہا جاتا ہے۔ اتاترک اور ہمارے قائدِ اعظم میں جو بہت سی باتیں مشترک ہیں، ان میں ارادے کی پختگی سرِ فہرست ہے۔

مذہب کا معاملہ:۔ اتاترک نے اپنے ملک میں تمام تبدیلیوں کو بہت تیزی سے فروغ دیا اور ہر نئی راہ پر بہت جلد منزل کو جا لیا۔ لیکن مذہب کے معاملے میں تھوڑا بہت سوچ بچار کرنا ہی پڑ گیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ملّا اور نام نہاد مولوی عوام کے دل ودماغ پر بُری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اتاترک کا عقیدہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے اور علمائے کرام حکومت کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا تھا اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے، تاکہ ان میں کبھی آنکھیں دکھانے کی ہمت نہ ہو، لازمی تھا کہ سیاسی حکمتِ عملی پر پوری طرح کاربند رہا جائے۔ تاہم نام نہاد علما پس وپیش کا لحاظ رکھے بغیر لکیر کے فقیر تھے اور اس سے ایک انچ اِدھر یا اُدھر سرکنا نہیں چاہتے تھے۔

دنیائے اسلام کے اور ملکوں کی طرح ترکی میں بھی اس قسم کے نام نہاد مولویوں کے ہاتھوں اسلام کا چہرہ مسخ ہو چلا تھا، جو محض سلاطین اور خلفا کو خوش کرنے کے لیے من مانے مسائل

گھڑ کر اور ہر چیز کی نئی تاویل پیش کر کے اس طرح فتوے دینے لگے تھے جیسا کہ برصغیر پاک و ہند کے اکثر مولویوں کا وطیرہ تھا۔ اور یہی ہے فتوے دینا دھوکہ دینے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

اتاترک ان لوگوں میں سے تھے، جن کا اصول کار اور اندازِ فکر یہ ہوتا ہے کہ اگر پرانی بنیادوں پر کوئی نئی عمارت بنانی ہو تو اس عمارت کو پوری طرح مسمار کر دیا جائے اور تعمیر کا کام خشتِ اوّل سے شروع کیا جائے۔ اسی اصول کے ماتحت مذہب کی تجدید بھی صرف اسی طرح ممکن تھی کہ پرانے کورانہ عقیدوں کو جو بڑی حد تک ان مولویوں کے خود ساختہ تھے، یکسر مٹایا جائے۔ چناں چہ انھوں نے خود تو کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ ان کے ایما پر قومی مجلسِ عظمٰی نے ۳ر مارچ سنہ ۱۹۲۴ء کو اتفاقِ رائے سے ایک قانون منظور کیا جس کی رُو سے خلافت ختم ہو گئی اور مذہب سیاست سے علیحدہ کر دیا گیا۔ تاہم قومی دستور میں یہ الفاظ نمایاں طور پر شامل کیے گئے کہ ملک کا قومی مذہب اسلام ہوگا۔

اس موقع پر بعض فتنہ پردازوں نے مشہور کیا کہ اتاترک دہریہ ہیں اور وہ اسلام کا نام و نشان مٹا دینا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے کسی قول و فعل سے اس دعوے کا ثبوت نہیں ملتا۔ انھوں نے یا مجلسِ عظمٰی نے کبھی مذہبی فرائض کی ادائیگی پر پابندی عائد نہیں کی۔ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ مذہب کو نام نہاد مولویوں کے پنجے سے نکال کر خود افراد کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اپنے نیک و بد کو خود سمجھ کر اس دینِ متین کی پیروی کریں جو تیرہ سو سال پہلے پیش کیا گیا تھا اور اس کورانہ تقلید کو ترک کر دیں جس کی رُو سے پانچ وقت کی نماز تو ضرور پڑھ لی جاتی ہے لیکن ذاتی کردار بننے نہیں پاتا۔ اگر انسان پابندِ صوم و صلوٰۃ ہونے کے باوجود ریاکار ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے مذہب سے قوم و ملّت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، بلکہ ذہنیت زیادہ خراب ہوتی چلی جاتی ہے اور اس طرح انسانی ضمیر میں جو زہر پھیلتا ہے، اس کا استیصال یا کم سے کم انسداد آسان نہیں ہوتا۔

مجلسِ عظمٰی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اذان اور نماز ترکی زبان میں ہو اور اسی لیے بہت جلد قرآنِ پاک اور مذہبی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں کر دیے گئے۔ کم سے کم اس اقدام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلام کو مٹانے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ یہ فیصلہ متنازعہ فیہ ضرور ہے لیکن آسانی سے کوئی رائے اس لیے قائم نہیں کی جاسکتی کہ خود دنیائے اسلام کے تسلیم شدہ مجتہدین میں ایک جماعت ایسی پہلے سے موجود تھی جس کا فیصلہ تھا کہ اچھی طرح سمجھنے اور سمجھ کر صحیح طور پر عمل کرنے کی خاطر اگر کلامِ پاک کو کسی قومی زبان میں منتقل کر لیا جائے اور اس کے مطابق نماز ادا کی جائے تو

کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ درانحالیکہ افضل یہی ہے کہ الہامی الفاظ کو قائم رکھا جائے اور انہی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قرآنِ پاک کی اصل عبارت میں جو الہیت اور جاذبیت ہے، وہ ترجمے میں کسی طرح بھی منتقل نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے ربع صدی گزرنے سے قبل ہی انسانی ذہن نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور اپنے اس تجربے کو ناکام سمجھ کر یا غیر مناسب جان کر پرانا طریقہ اختیار کر لیا۔ چناں چہ اب عام زبان لاطینی حروف میں لکھے جانے کے باوجود مذہبی فرائض کی ادائیگی میں عربی رسم الخط اور عربی زبان استعمال ہوتی ہے۔

حکومت عوام کے ساتھ ہے اور اسے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کیوں کہ اربابِ حکومت نے بھی اپنے اس تجربے پر ناکامی کی مہر لگا دی ہے۔ البتہ پہلے دَور کے مقابلے میں جو زبردست کمی محسوس کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مسجدوں کے ملاؤں، خانقاہوں کے مجاوروں اور مقبروں کے سجادہ نشینوں کو وہ عروج حاصل نہیں ہے جس سے جمہوریہ ترکیہ اپنے قیام کے بعد بجا طور پر بدظن تھی مجلسِ عظمیٰ کا فیصلہ بدل گیا لیکن ۲۵ سال میں اس نے اپنے حقیقی مقصد کو پا لیا اور اس ضمن میں اس کی یہ بڑی کامیابی ہے۔

اذان و نماز:۔ ہم نے عصر کی نماز اُلوس چوک کے قریب قاضی بیرام کی مسجد میں ادا کی جس کے پیش امام خاصے بوڑھے تھے۔ ادائیگیٔ فرض کے بعد ہم نے ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات مناسب سمجھا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ عام مطالبے کے مطابق تلاوتِ قرآن کا سلسلہ دوبارہ اصل زبان میں شروع ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں تاہم وہ قومی مجلس کے اس فیصلے کو بھی برا نہیں سمجھتے تھے کہ اذان اور نماز ترکی زبان میں ہوا کرے۔ ان کے نزدیک بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے پیش امام سے درخواست کی کہ اگر سابقہ دور کے کچھ الفاظ حافظے کی لوح پر برقرار ہوں تو ہمیں کم سے کم اذان ہی ترکی زبان میں سُنا دیں، تاکہ ہم تبدیل شدہ صورت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ انھوں نے ذہن پر ہلکا سا زور ڈال کر اذان سُنائی، جس کے الفاظ کم و بیش یہ تھے:۔

تنری اُلودُر (۴ بار)

شُپ ھے سِز بلیرم بلدی رِم تنری دان باسکا یوکتُر تپاچاک (۲ بار)

شُپ ہے سنز بلیریم بلدی رِم تنری نن ال شی سی دِر محمد (۲ بار)

ہے دِن نمانا (۲ بار)

ہے دِن فلاحا (۲ بار)

تنری اُلُو دُر (۲ بار)

تنری دان باسکا یوکتنر تیا چاک (۲ بار)

اس اذان کو سن کر کوئی لطیف کیفیت طاری ہونے کے بجائے گھبراہٹ سی پیدا ہونے لگتی ہے اور یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ ترکوں نے مذہبی امور میں اگر ترکی زبان کو ترک کر کے عربی زبان کو دوبارہ اختیار کیا تو اس کا بڑا سبب اس کا صوتی تاثر بھی تھا۔

قدیم عمارتیں:۔ قاضی بیرام کی مسجد کے قریب ہی ایک قدیم ترین عبادت گاہ ہے، جس کا رکھ رکھاؤ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرد ہے۔ صنادید کے نوشتوں میں اس عبادت گاہ کا نام "مونیومنٹم انسائرانم" درج ہے اور کہا جاتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیحؑ میں یہ عمارت سائبیل کے اعزاز میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ دیوی عہدِ قدیم میں سب دیوتاؤں کی اور انسان کی مشترک ماں سمجھی جاتی تھی اور رومیوں کی یلغار سے قبل فراغیہ کے سارے علاقے میں اس کی پرستش ہوتی تھی۔ تاہم بعض ماہرین اثریات کا یہ بھی قول ہے کہ یہ عمارت پہلی صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی کیونکہ اس عمارت پر ایک کتبہ ہے جس میں شہنشاہ آگسٹس کی فتوحات کا ذکر ہے، لیکن یہ کتبہ بہت بعد میں بھی آسانی سے نصب کیا جا سکتا تھا اور ممکن ہے کہ یہی خیال صحیح ہو۔ رومیوں کی فتح کے بعد قدیم مورتیں عبادت گاہ سے ہٹا دی گئیں اور ان کی جگہ آگسٹس کے مجسّمے رکھ دیے گئے جسے اہل روما نے دیوتا کا درجہ دے کر پوجنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ مجسّمے بھی وہاں نہیں ہیں، بلکہ عجائب گھر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

اس چوک کے دوسری طرف تھوڑے فاصلے پر ایک شکستہ عمارت کے چند ستون باقی رہ گئے ہیں، جو چوتھی صدی کی یادگار ہیں اور شہنشاہ جولیانس کے ستونوں کے نام سے مشہور ہیں۔ یقین کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس عمارت کا اپنے اصل عہد میں کیا مصرف تھا۔ کوئی اسے بھی عبادت گاہ کہتا ہے اور کوئی شاہی محل سے تعبیر کرتا ہے، جو زیادہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ ستونوں کے علاوہ باقی عمارت کی جو بنیادیں باقی رہ گئی ہیں، وہ اس کے شاہی محل ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ خیال ہے کہ ابتدائی حالت میں اس کے اندر بہت سے کمرے، دالان، برآمدے،

غلام گردشیں وغیرہ ہوں گی۔

بائیں جانب کچھ اور آگے بڑھیں تو رومی حماموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو قابلِ استعمال تو نہیں ہیں، کیوں کہ وہ تیسری صدی کے شروع میں تعمیر ہوئے تھے، تاہم رومی معاشرت کے اس پہلو کے ترجمان ہیں کہ لوگ عام طور پر گھروں سے باہر غسل کرنے اور جسموں کی مالش کرانے کے عادی تھے اور یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ان کثیر حماموں کے قریب گرم پانی کا کوئی چشمہ ضرور ہوگا۔ اس ماحول میں کھڑے ہو کر چشمِ تصور سے دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے اب بھی موٹے مسٹنڈے رومی لنگوٹ باندھے، پانی کا ٹب سامنے رکھے جھانوے سے اپنے جسم رگڑ رہے ہیں اور جوں جوں میل اترتی ہے، دھوپ میں ان کی جلد زیادہ چمکتی جاتی ہے۔

پرانی مسجدیں :- انقرہ میں پرانے زمانے کی بہت سی قابلِ ذکر مسجدیں بھی موجود ہیں جو محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرد ہونے کے باوجود نماز کے لیے بدستور استعمال ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر سلطان علاؤ الدین کی مسجد (سنہ ۱۱۷۸ء) ارسلان خان کی مسجد (سنہ ۹۱-۱۲۹۰ء) اور اخی اشرف الدین کی مسجد جو چودھویں صدی کے نصف اول میں بنی تھی، قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کا طرزِ تعمیر اور آرائش تقریباً یکساں ہے اور چوں کہ جدید تہذیب کا رنگ سب پر چڑھ چکا ہے، اس لیے بھی وہ بہ ظاہر ایک ہی عہد کی یادگار معلوم ہوتی ہیں۔

شہر پناہ :- بعض نادر دستاویزات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انقرہ اپنے قدیم ترین دور میں صرف ایک قلعہ تھا جو شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً آنے جانے والے قافلوں کی راہ پر سب سے بڑا چوراہا اور ان کا مقامِ اتصال تھا۔ یہاں رک کر سوداگر اپنے سامانِ تجارت کا باہمی تبادلہ کرتے اور وطن لوٹ جاتے یا مزید نفع اندوزی اور سیر و سیاحت کے لیے آگے بڑھ جاتے تھے۔ قلعہ کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ پہاڑ کے دامن میں وسیع میدان کی نگرانی کی جائے، جہاں بہت سی بستیاں تھیں اور ان میں رہنے والوں کے مشاغل جداگانہ تھے لیکن وہ سب کی ضرورت پورا کرنے میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتے تھے۔ ایسی صورت میں اس بات کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ آس پاس کے قبیلے قتل و غارت اور لوٹ مار کی نیت سے اچانک حملہ آور نہ ہو جائیں۔ ہر لمحہ چوکنے رہنے کی ضرورت تھی۔ قلعہ کا وجود جارحانہ اقدامات کا ارادہ رکھنے والوں کی ہمت توڑ دیتا تھا اور عموماً وہ سر اٹھانے سے باز رہتے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی بہت مختصر تھی اور اس پر بنا ہوا قلعہ کسی بھی طرف سے دیکھنے پر اسی کا ایک جزو معلوم ہوتا تھا۔

اس میں جنگجو جوانوں کا پورا ایک دستہ رہتا اور اپنے ساتھ اس زمانے کا سامان حسب بڑی مقدار میں جمع رکھتا تھا۔ اب اس قلعہ کا نام و نشان بھی نہیں ہو لیکن روایتی اعتبار سے پہاڑ کی اس چوٹی کی نشان دہی ضرور کی جاتی ہو جس پر کبھی اس کا وجود ہو گا۔

یکے بعد دیگرے مختلف قوموں ـــــ حطّی، فراغی اور ایرانی ـــــ کے فاتحین نے اس چوٹی پر پہنچ کر قلعہ سر کیا اور اپنا پرچم لہرا دیا۔ بعض وہیں کے ہو رہے اور بعض وطن کی طرف مراجعت کر گئے۔

اسکندرِ اعظم نے بھی اس کا محاصرہ کیا اور قبضہ جما لیا۔ آگسٹس کے عہد میں قلعہ کے گرداگرد کافی گھیر میں فصیل کی بنیاد رکھی گئی اور ایک شہر آباد ہو گیا۔ کچھ تو برابر آنے جانے والے سوداگر مستقل طور پر وہیں کے ہو رہے اور کچھ میدان سے اٹھ کر پہاڑی پر جا بسے، اس لیے کہ وہاں قدرت کی نعمتیں زیادہ وافر تھیں اور ناگہانی حادثوں سے محفوظ رہنے کا امکان بھی زیادہ یقینی تھا۔ پھر جوں جوں آبادی اس علاقے میں بڑھتی رہی، فصیل کروٹیں بدل کر خود بھی وسیع ہوتی گئی۔ چناں چہ بازنطینی عہد میں اسے از سرِ نو دوسری بنیادوں پر بنانا پڑا اور پھر سلجوقیوں اور عثمانیوں کے عہد میں اس کو مزید استحکام نصیب ہوا۔

اب اس فصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہو اور جگہ جگہ سے شکستہ اور منہدم ہونے کے باوجود بہت بڑا حصہ باقی ہو اور تاریخی اہمیت رکھتا ہو۔ یہ شہر پناہ خاصی بلند، عریض اور پختہ ہو۔ ہم نے اس کے دروں، محرابوں اور اوپر بنے ہوئے گنبدوں کا معائنہ کیا اور واقعی اسے بھی تاریخ کا ایک اچھا نمونہ پایا۔

ایسے مواقع پر ہمارے برکات صاحب کی معلومات کافی کام آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس موضوع کو آج ہی صبح پڑھا ہو، اس لیے وہ ہمارے گائڈ بنے ہوئے ہیں۔ بعض موقع پر وہ اپنی رائے بھی استعمال کرتے ہیں اور تفننِ طبع کے لیے بعض فقرے بھی کستے رہتے ہیں۔ شہر پناہ کے بارے میں انھوں نے کئی باتیں بتائیں اور ہمیں ہنسایا بھی۔

شہر کا تاریخی پس منظر: محققین کا کہنا ہو اور غیر ملکی ماہرینِ اثریات بھی ان کے نتائج تحقیقات پر مہر توثیق لگاتے ہیں کہ انقرہ کے علاقے کی بستی عہدِ تاریخ سے لاکھوں سال پہلے آباد تھی جبکہ انسان بھی اپنی موجودہ شکل و صورت سے بالکل مختلف وضع قطع کا حامل تھا، تاہم تاریخی اعتبار سے کچھ آثار و روایات حطّی عہد کی ملتی ہیں جو ولادتِ مسیح سے دو ہزار سال پرانا تھا۔

حطّی قوم کے لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے، یہ کوئی نہیں جانتا، لیکن یہ لوگ بڑے جنگجو اور شورش پسند تھے۔ اکثر آپس ہی میں لڑتے اور ہنگامے برپا کرتے تھے، یہاں تک کہ ولادتِ مسیح سے ایک ہزار سال پہلے یہ قوم مختلف قبیلوں میں بٹ گئی۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ انتشار اور

اس طرح اس کا بکھرنا ہی اس کی تباہی کا باعث بن گیا۔ فراغی قوم اس پر حاوی آئی اور حکومت کرنے لگی۔

ایک نیم تاریخی روایت بھی مشہور ہے کہ انقرہ شہر کی بنیاد فراغی قوم کے بادشاہ میداس نے رکھی تھی لیکن اس کی تکذیب آسان ہے کیوں کہ حطی عہد کے آثار نہ صرف اس علاقے میں بلکہ سارے اناطولیہ میں ملتے ہیں۔

فراغی حکومت کے زوال کے بعد لائڈیا والوں نے اپنا رنگ جمایا، لیکن زیادہ مدت کے لیے نہیں، کیوں کہ بہت جلد یعنی ولادتِ مسیحؑ سے ۵۴۵ سال پہلے ایران کے شہنشاہ خسرو نے اناطولیہ فتح کیا اور اس کی فوجیں انقرہ تک پہنچ کر پایۂ تخت پر مسلط ہو گئیں۔ دو صدیاں گزرنے کے بعد مقدونیہ کے اسکندر اعظم نے ایرانی فاتحین کا زور ڈھا دیا۔

۲۷۸ قبل مسیحؑ میں قوم غلاطیہ نے انقرہ کے علاقے پر چڑھائی کی اور اسے اپنا صدر مقام بنالیا۔ اس کے بعد ۱۸۹ قبل مسیحؑ میں رومی فوجیں وہاں درآنہ گھس آئیں لیکن جب غلاطیوں نے ان کی شرائط صلح منظور کر لیں تو واپس بھی چلی گئیں۔ تاہم جب ان شرائط کا لحاظ نہ رکھا گیا تو "پومپی اس" نے اسے باقاعدہ رومی سلطنت کا ایک جزو بنالیا۔ حکومت کی اس تبدیلی کے باوجود قوم غلاطیہ کے افراد باجگزار ہو کر وہیں آباد رہے اور حکم حاکم کی تعمیل سر جھکا کر کرنے لگے۔

اگرچہ اس عہد میں انقرہ نے بڑی ترقی کی اور ایسا عروج پایا کہ عہد قدیم کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی لیکن مشرقی روم کے یعنی بازنطینی دور میں اسے فضائے امن کبھی نصیب نہ ہو سکی اور شاید اسی حالت کو دیکھ کر ساسانی فرمانرواؤں —— شاپور اور خسرو دوم —— نے متواتر حملے کیے اور اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

ساتویں اور آٹھویں صدی میں عربوں کی یلغار ہوئی اور پھر سلجوقیوں نے تابڑ توڑ چڑھائی کی۔ صلیبی جنگوں نے بھی اس سرزمین پر خون سے نقشے جمائے ہیں اور اس کے بعد عثمانی حکومت کا اقتدار استقلال جمہوریت تک قائم رہا ہے۔

اگرچہ کئی صدیوں تک اس شہر کو اپنے سینے پر پایۂ تخت رکھنے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ تاہم جب نئی حکومت وجود میں آئی تو مجلس عظمٰی نے ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کو اسے اپنا صدر مقام بنانے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر اب تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔

عجائب گھر:۔ برکات صاحب نے اپنی قیام گاہ پر ہمارے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا تھا اور ہم سے ملاقات کرنے کے لیے صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا تھا، اس لیے ہم کو وقتِ مقررہ

پر وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ تاہم کچھ وقت باقی تھا، اس لیے اس وقفے میں ہم نے مناسب سمجھا کہ چند عجائب گھروں کو، خصوصاً انھیں جو راہ میں آئیں، ایک نظر دیکھ لینا چاہیے۔ اگلے دن کی مصروفیات چوں کہ بے پناہ تھیں، اس لیے امکان تھا کہ شاید ان کے لیے کوئی وقت نہ نکل سکے۔

یوں تو انقرہ میں کئی عجائب خانے ہیں لیکن دو سب سے زیادہ دل چسپ اور تاریخی اعتبار سے اہم ہیں۔ ان میں سے ایک کا موضوع خاص علم الانسان ہے۔ اس میں قوموں کے ارتقا سے متعلق بہت سے نوادر جمع ہیں جن کو ایک سلسلے میں رکھ کر تاریخ انسانی کی کڑیاں مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں یہ زنجیر ٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اسے جوڑنے کے لیے ماہرین مسلسل جد و جہد کر رہے ہیں۔ درمیانی خلیج پُر ہونے کا نام اس لیے نہیں لیتی کہ بہت سے درمیانی حلقے ضائع ہو گئے ہیں یا دوسرے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں اور وہ ان کو اپنے سے جُدا کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

یہ عجائب گھر سرکاری اوپیرا کے بالکل سامنے خیابانِ اتاترک کے سرے پر ایک پہاڑی کے اوپر واقع ہے۔ اس کے صدر دروازے پر اتاترک کا مجسمہ دور سے نظر آتا ہے۔ شاید وہاں اس مجسمے کو نصب کرنے کا مقصد یہ بتانا ہو کہ نسلِ انسان ارتقا کی منزلوں سے گزر کر اپنی آخری کڑی کی صورت میں اس فرد تک پہنچی ہے، جسے ترک قوم کا نجات دہندہ کہا جاتا ہے۔

دوسرا عجائب گھر بھی آثار الصنادید سے تعلق رکھتا ہے اور حطّی قوم کے نوادر سے مالا مال ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس اعتبار سے وہ دنیا کا بہترین عجائب گھر ہے۔ آج سے چار ہزار سال پہلے کے فنی شاہکاروں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس عہدِ عتیق میں ثقافت کتنے عروج پر پہنچ گئی تھی اور پھر کس طرح زوال و انحطاط کی منزل سے گزر گئی۔ عجائب گھر دو عمارتوں پر مشتمل ہے اور وہ بجائے خود عجیب ہیں۔ ان میں سے ایک کسی پرانی سرائے کی عمارت تھی اور دوسری کبھی مُسقّف بازار یا منڈی کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ انھیں مناسب ترمیم اور مرمت کے بعد ضرورت کے مطابق بنایا گیا ہے۔

بڑی عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی دو عظیم الجثہ سنگین بت نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو حطّی قوم کے ایک بادشاہ کا مجسمہ ہے جو ولادتِ مسیح سے آٹھ سو سال پہلے ملاطیہ میں حکمراں تھا۔ یہ مجسمہ کھدائی کے بعد اس کے محل کے دروازے کے قریب ملا تھا۔ دوسرا بت حطّی قوم کے دیوتائے جنگ کا مظہر ہے۔ یہ دیوتا ایک رتھ میں بیٹھا ہوا حطّی سلطنت کے صدر مقام بوغز کوئی حطوسا س میں شہر کے بڑے دروازے کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ بوغز کوئی اب بھی انقرہ کے شمال مشرق میں ۱۴۱ کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ہے۔

چٹانوں پر نقاشی اور کندہ کاری کے نمونے، جو اس مخصوص عہد کے ترجمان ہیں، علم اور فن کے اعتبار سے بہت ہی اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے اس زمانے کے لوگوں کے عادات و اطوار، رسم و رواج، آرائش و لباس، موسیقی کے آلات اور لڑائی کے ہتھیاروں وغیرہ کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔

آج سے صرف اسی سال پہلے بعض ماہرین آثارِ قدیمہ کو حطی عہد کے ان نوادر سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی جبکہ ایک مقام پر کھدائی کے وقت چند ایسی سنگین سلیں برآمد ہوئیں جن پر عجیب و غریب اشکالی حروف میں عبارات کندہ تھیں۔ ان کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی تو بہت سے دلچسپ راز منکشف ہوئے اور پھر تلاش و تحصیل کا سلسلہ جاری رہا اور بہت جلد مغتنمات کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا جو دنیا میں کہیں اور میسر نہیں آ سکتا۔ یہ کھدائی شہر حلب میں حماص کے قریب ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ دنیا کے مشہور ماہرین نے اس طرف توجہ کی، یہاں تک کہ اس اجنبی زبان کو سمجھنے کا انداز بھی تحقیق کر لیا گیا۔

پھر آج سے پچاس سال پہلے استنبول کے عجائب خانہ آثارِ قدیمہ کے زیرِ اہتمام قدیم حطی سلطنت کے صدر مقام حطوساس میں کھدائی کرائی گئی اور دونوں کھنڈروں کے تختے الٹ کر بہت سے نوادر برآمد کر لیے گئے جو سب کے سب اس عجائب گھر میں موجود ہیں۔ وہاں سے خطِ میخی میں لکھی ہوئی پختہ مٹی کی بعض لوحیں بھی نکلی ہیں جو دورِ عکاد سے تعلق رکھتی ہیں۔ السنۂ قدیم کے ماہروں نے تقریباً بیس سال بعد ان لوحوں پر لکھی ہوئی عبارتوں کو پڑھا اور ان کا مطلب نکالا، جس سے حطی تاریخ پر حیرت انگیز روشنی پڑتی ہے۔

اناطولیہ میں حطی عہد کی یادگار عبارتیں ۵۰ مقامات پر اب بھی موجود ہیں لیکن ان کو پوری طرح سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ حطی عجائب گھر میں جا کر اس زمانے کے نوادر اور تحریروں کا مطالعہ نہ کر لیا جائے۔

عشائیہ میں:۔ وقتِ مقررہ سے محض چند منٹ پہلے ہم دونوں بھائی برکات صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر لباس تبدیل کیا اور باغیچے میں مہمانوں کے درمیان آگئے۔ سرسری طور پر ان سب سے ہمارا تعارف ہوا اور فوراً ہی کھانا شروع ہو گیا۔

برکات صاحب نے ہماری خاطر بڑے تکلف سے کام لیا تھا۔ چوں کہ عمائدین شہر کے علاوہ بھارتی پاکستانی سفارت خانوں کے افسران بھی اس محفلِ طعام میں شریک کیے گئے تھے، اس لیے کھانوں

میں پاکستانی، ہندستانی اور ترکی اقسام کا برابر لحاظ رکھا گیا تھا۔ ترکی کھانوں کی چند قسمیں تو وہی تھیں جن کی لذت سے کام و دہن ایک روز پہلے آشنا ہو چکے تھے۔ البتہ دُنر کباب ایک خاصے کی چیز تھی۔ ظاہری وضع قطع کے اعتبار سے اسے ایک قسم کے پارچے کہا سکتا ہے۔ اسے بنانے اور تیار کرنے کی ترکیب بھی عجیب ہے۔ گوشت کا ایک بہت بڑا بے ہڈی کا مدور ٹکڑا لوہے کی پتلی سیخ پر اس طرح لگا دیا جاتا ہے، جیسے ہمارے ملک میں باریک پسے ہوئے اور مسالے دار قیمے سے سیخ کے کباب تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ سلاخ ایک چرخی پر لگا کر خوب دہکتے ہوئے کوئلوں پر گوشت کے ٹکڑے کو سینکا جاتا ہے۔ جب وہ اچھی طرح بھُن جاتا ہے تو لمبے پھلے کے تیز چاقو سے بھنے ہوئے حصے کی ایک تہہ پارچے کی صورت میں اتار لی جاتی ہے اور پھر سیخ کو چرخی پر رکھ دیا جاتا ہے۔ تیار پارچے پر نمک، مرچ، لیموں یا سرکہ وغیرہ چھڑک کر رکابی میں رکھ لیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ گوشت کے ٹکڑے کی جب نئی سطح بھن جاتی ہے تو ایک اور پارچہ اتار لیا جاتا ہے۔ پارچے اتارنے کے لیے مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے کہ کہیں کچا حصہ تیار حصے کے ساتھ نہ اتر آئے۔ ان پارچوں کو گرم گرم کھانے میں مزا ہے۔ جن دکانوں یا محفلوں میں یہ دُنر کباب تیار کیے جاتے ہیں، وہاں بیک وقت کئی چرخیوں سے کام لیا جاتا ہے تاکہ جلدی جلدی پارچے پیش کیے جا سکیں۔

بریانی اور دُلمہ وغیرہ کا مزا ہم پہلے ہی چکھ چکے تھے۔ مٹھائی میں "آشورے" بہت مزے کی چیز تھی۔ مکئی کو دودھ میں گھنٹوں ابال کر اور کٹے ہوئے میوے ملا کر کھیر کی طرح اسے تیار کیا جاتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب سب مہمان بیٹھ گئے تو قہوے کا دور چلنا شروع ہوا اور اجمالی تعارف کو ذرا تفصیل کا رنگ دیا جانے لگا۔

بہت سے نوجوان شاعروں، افسانہ نگاروں اور اخبار نویسوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ لیکن ان میں سے اکثر کے نام لمبے عجیب تھے کہ پوری طرح یاد نہ رہ سکے۔ ہر نام دو یا تین الفاظ پر مشتمل تھا اور ان میں سے صرف ایک لفظ جو عربی یا فارسی لغت کا رہین منت ہوتا، سمجھ میں آتا اور باقی حصہ چیستاں بن جاتا تھا۔ مثلاً ایک شاعر صاحب فاضل حسنو دیبے لارسا تھے، یا ایک افسانہ نگار کا نام اوکتے اقبال تھا۔

اول الذکر کبھی ترکی فوج میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ اپنے عہدے کو چھوڑ چھاڑ کر وزارتِ امورِ عامّہ میں آ گئے۔ ان کی عمر چالیس کے قریب ہو گی۔ اپنا کلام ترنم سے سناتے اور دوسروں پر کیفیت طاری کر کے خود بھی جھوم جاتے تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز کچھ کچھ حفیظ جالندھری سے

ملتا جلتا تھا۔ انھیں اپنے کلام سے آمدنی بھی خوب ہوتی ہے۔ کئی مجموعے چھپ کر کثیر تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔

موخرالذکر کے افسانے طویل ہوتے ہیں۔ دو مجموعے "اونس المکلر بوزلدو" (روٹی ضائع ہوگئی) اور "بزانس ڈیفی نیسی" (بازنطینی خزانے) شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے سننے کا موقع نہیں تھا لیکن باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی تحریر میں طنز کا رنگ ضرور غالب ہوگا۔

انقرہ کا سب سے مشہور روزنامہ "وطن" ہے جس کے ایک نمائندے وہاں موجود تھے۔ ہر اتوار کو یہ اخبار آٹھ صفحات کا ایک ادبی ضمیمہ بھی شائع کرتا ہے۔ یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ اس کی اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ شاید اس لیے کہ اسے حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ ایک ماہنامہ "حصار" کے نائب مدیر نے بتایا کہ ان کا پرچہ پچاس ہزار شائع ہوتا ہے۔

ان میں سے اکثر مہمانوں کو انگریزی زبان پر اسی حد تک عبور حاصل تھا جتنا کہ ایک غیر زباں داں کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس لیے دو تین کے سوا سب انگریزی بول رہے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے لیے بات چیت کا لطف آدھا رہ جاتا۔

اسی مجلس میں ایک انشورنس ایجنٹ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ اب یا تو یہ کام چھوڑ دیں گے یا پھر برکات صاحب کی موٹر کی انشورنس کسی اور کو منتقل کرا دیں گے۔ وہ روز اپنی نئی موٹر کو کہیں ٹکرا دیتے ہیں اور انشورنس والوں کو اطلاع کرا دیتے ہیں کہ کرا دو اسے ٹھیک۔

برطانوی سفارت خانے کے پریس اتاشی صاحب کو طبِ مشرقی سے بڑی دل چسپی ہوگئی۔ انھیں مَیں نے اس طب کے بارے میں چند اصولی باتیں بتائیں۔ ہمارے ساتھ "طبِ عربی" پر ایک کتابچہ بھی تھا۔ میں نے ان کو دیا۔ یہ کتابچہ انگریزی میں ہے اور بھائی جان محترم نے سفر سے پہلے اس کو تیار کرایا تھا۔ جہاں ہم طبِ قدیم پر گفتگو کریں گے، یہ کتابچہ بھی دیں گے۔

یہ محفل بڑی ہی پُرلطف تھی اور تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔

ادیب و شاعر:۔ ترکی زبان میں ادب و شعر کا سرمایہ عثمانیہ عہد سے پہلے کا اتنا قلیل ہے کہ بعض تذکروں میں اس کا حوالہ دینا بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ بازنطینی، سلجوقی اور ساسانی عہد کے جو بھی نوادر کہے جا سکتے ہیں، وہ یا تو بڑے کتب خانوں میں اور یا عجائب گھروں میں مل سکتے

ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ترکی ادب و شعر کی تاریخ زیادہ سے زیادہ پانچ سو سال پرانی ہے اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے چونتیس[34] فرمانرواؤں میں سے اکیس[21] خود بھی اچھے شاعر تھے اور سلیم اول تو صحیح معنوں میں ایک مسلم الثبوت شاعر تھا۔ ان سلاطین میں سے اکثر کے دیوان عام طور پر خریدے بھی جا سکتے ہیں۔ پھر شاہان وقت کی گہری دل چسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام نے ادب و شعر کی طرف توجہ مبذول کی اور یہ لطیف و مفید فنون برابر ترقی کرتے رہے۔

ترکی میں اس صدی کا انقلاب جہاں اور اعتبار سے سودمند رہا، ادب و شعر کے لحاظ سے بھی باشندگانِ ملک کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ کہا جا سکتا ہے۔ کمال اتاترک نے سلاطین عثمانیہ سے کہیں زیادہ دل کھول کر ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی، کیوں کہ انھوں نے دور رس منصوبے بنا کر اور انھیں عمل میں لا کر میدانِ شعر و ادب کو ہمیشہ کے لیے وسیع کر دیا۔

البتہ اگر عہد جدید کا مقابلہ دورِ متوسط سے کیا جائے تو ایک دم بڑا فرق محسوس ہوگا۔ سلاطینِ عثمانیہ کے زمانے میں شاعروں اور ادیبوں کے احساسات و جذبات یکسر مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ قومی روایات سے ذرا بھی ہٹ کر کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ قیام جمہوریت کے بعد سے جہاں اور بہت سی چیزوں کو مغربی چھلنی میں چھان کر لوگوں نے استعمال کرنا شروع کیا، ادب و شعر کے اسالیب بھی وہیں کے رنگ میں ڈوب گئے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ خاص طور پر فرانس کا بہت گہرا اثر یہاں کے اربابِ علم و فن پر پڑا ہے۔

مثال کے طور پر یحییٰ کمال بھی جو سنہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور جن کو ترکی کے موجودہ بوڑھے شعرا کی صفِ اول میں سب سے ممتاز مقام حاصل ہے، ساری عمر قومی روایات کے گیت گاتے رہنے کے باوجود پچھلے بیس پچیس سال میں نئی طرزِ نگارش سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنی پرانی تحریروں کو طاق نسیاں پر رکھ کر ان سے بے تعلق ہو جانا چاہتے ہیں۔ جدید مدرسۂ خیال کے بانیوں میں بھی ان کو بڑا مرتبہ دیا جاتا ہے۔

قدیم طرز کے نثر نگاروں میں خالدہ ادیب خانم کی حیثیت بہت بلند ہے، بلکہ انھیں تو عالمگیر شہرت حاصل ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی کتابیں انگریزی زبان میں بھی تصنیف کی ہیں، جن کے ترجمے دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اگلے وقتوں کے ایک اور زندہ ادیب یعقوب قادری ہیں جو سنہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ناول نگاروں میں ان کی اہمیت سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ ان کی کتابوں کے ترجمے فرانسیسی اور جرمن

زبانوں میں تو ہوئے ہیں لیکن ان سے انگریزی کا دامن اب تک اس لیے خالی ہو کہ انھوں نے انگریزوں کے ناروا سلوک پر زبردست ادبی تیر چلائے ہیں۔ اور اس انگریز قوم کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہو کہ جس تحریر سے ان کی برائیوں کا پردہ چاک ہوتا ہو اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں۔ ان کی دو مشہور تصانیف "یابان" (اجنبی)، اور "سدوم وعمورہ" کا موضوع پہلی جنگِ عظیم کے بعد استنبول پر اتحادیوں کا ناجائز تسلط ہو۔ انگریزوں کے لیے ان کا مطالعہ زہر پی کر خودکشی کر لینے کے مترادف ہو۔

دوسرے ملکوں کی طرح ترکی میں بھی مختصر کہانیاں عوام میں زیادہ مقبول ہیں۔ اس باب میں رفیق خالد جو کافی ضعیف ہو چکے ہیں، بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ "مملکت حکایہ لیری" کے نام سے چھپا تھا جس کے بے شمار ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔

سعید فائق ابھی چند ماہ قبل فوت ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے "لوزم سزآدم" (مجبور انسان)، اور "ہوا دا بولوط" (آسمان پر بادل)، بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

ادب میں بے حد ترقی پسندی کے باوجود یہ حقیقت حیرت انگیز ہو کہ خواجہ نصرالدین کے لطائف اب بھی ادبی محفلوں میں بلا استثنیٰ مقبول ہیں اور حسبِ ضرورت بیان کر کے ان سے لطف اٹھایا جاتا ہو۔ چناں چہ برکات صاحب کی کوٹھی پر عشائیہ کے بعد جو مختصر سی نشست ہوئی اس میں بھی ایک لطیفہ سننے میں آیا جو اس لیے بیان کیا گیا کہ ایک شاعر صاحب قدرت کی بعض ستم ظریفیوں پر اعتراض کر کے اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے کہ یہ بات یوں ہوتی تو کیا ہوتا۔ فوراً ان کے ایک ہم عصر نے پھبتی کے طور پر یہ لطیفہ سنایا:

"ایک روز خواجہ اپنے ایک دوست کے ہمراہ گاؤں سے باہر کھلے میدان میں جا رہا تھا آسمان پر رنگ برنگ کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں اور کچھ زیادہ بلندی پر چیلیں وغیرہ اڑ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی پردار کیڑا بھی نظر کے سامنے سے پرواز کرتا گزر جاتا تھا۔ خواجہ پر کچھ فلسفیانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے مفکرانہ انداز میں دوست سے کہا کہ قدرت کا یہ غیر منصفانہ فیصلہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آسمان کی وسیع فضا صرف چھوٹے پرندوں یا کیڑے مکوڑوں کے لیے کیوں مخصوص رکھی جبکہ اس کی وسعت کے لحاظ سے گائے بھینسوں اور لونڈوں وغیرہ کو بھی آسمان پر اڑنے کا حق پہنچتا ہو۔ آخر اڑنے کے لیے ان کا بھی دل چاہتا ہوگا۔ اتنے ہی میں اڑتی ہوئی ایک چڑیا نے بیٹ کی، جو اس کی ناک پر آ گری۔ خواجہ کی عقل فوراً ٹھکانے آ گئی۔ اس نے کہا کہ قدرتِ خدا کے قربان جائیے، اس نے جو کچھ کیا ہو ٹھیک کیا ہو۔ اگر اس وقت کوئی بھینس آسمان پر اڑ رہی ہوتی تو نہ جانے کیا

حال ہو جاتا۔"

عشائیہ کے بعد کی محفل سوا دس بجے کے قریب برخاست ہوئی۔ ہم دونوں بھائی دن بھر کی سیاحت سے اس درجہ تھک گئے تھے کہ فوراً آرام کرنے کو جی چاہا۔ چناں چہ صاحبِ خانہ سے اجازت لی اور انھیں "شب بخیر" کہہ کر اوپر گئے۔

مجھ پر ہلکے زکام کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ ڈر لگ رہا ہے کہ دردِ نیم سر نہ ہو جائے۔ اُدھر بھائی جان محترم خائف کہ کہیں میرا زکام ان کو نہ لگ جائے۔ برکات صاحب نے ایک شرارت یہ کی کہ سرہانے نیلے رنگ کی کوئی سیّال چیز ایک فنجان میں بھر کے رکھ دی ہے اور مجھے زکام کی دوا بتا کر پینے کو کہہ دیا۔ میں دوا پیتا نہیں۔ یہ جام سرہانے ہی رکھا رہا۔ صبح معلوم ہوا کہ یہ "کونتور" تھی۔

---

۲۴ اگست ــــ جمعہ

انقرہ ــــ قونیہ ــــ انقرہ

آج کا پروگرام یہ تھا کہ ہم موٹر کار کے ذریعے انقرہ سے قونیہ جائیں گے اور بھائی جان محترم نے اپنے اثر سے کام لے کر برکات صاحب کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ دفتر کو خیرباد کہہ کر ہمارے ساتھ چلیں گے۔ ایک طرف کی مسافت تقریباً ڈیڑھ سو میل اور وہ بھی غیر سرزمین پر۔ بہت ڈرتے ڈرتے ہم نے موٹر میں جانے کی ہمت کی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا، کیوں کہ ریل کے ذریعے وہاں جا کر اسی دن واپس آ جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

انقرہ سے قونیہ ریل میں جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک جانب شرق قیصری، نگدا اور کرامان ہو کر اور دوسرا جانب غرب پولاٹلی، افیون اور عاک شہر ہو کر۔ ریل کے یہ دونوں سفر سڑک کے مقابلے میں تقریباً آٹھ گھنٹے سے بھی زیادہ طویل ہیں اور گاڑیوں کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوتی۔ موٹر میں ایک طرف کا جو راستہ چار گھنٹے میں طے ہوتا ہے، ریل میں کم سے کم بارہ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔

جغرافیائی اعتبار سے اس صورتِ حال کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ انقرہ سے قونیہ تک موٹر کار میں جانا ایسا ہے جیسے کوئی قطب شمالی سے چل کر محورِ زمین سے گزرتا، قطب جنوبی پہنچ جائے اور انقرہ سے قونیہ ریل میں جانا ایسا ہے جیسے کوئی کرۂ ارض کا نصف محیط طے کر کے قطب شمالی سے قطب جنوبی پہنچے اور راستے میں دم لینے کے لیے متعدد مقامات پر ٹھیرتا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم ریل کے ذریعے ایک راستے سے جاتے اور دوسرے راستے سے واپس آتے اور اثنائے سفر میں دو تین مقامات پر عارضی طور پر ٹھیرتے لیکن اس طرح ایک کے بجائے کئی دن لگ جاتے۔

قیصری :۔ شہر قیصری قدیم زمانے کے شہر قیصریہ کے مقام پر تعمیر ہوا ہے اور اناطولیہ کے سب سے اہم اور تاریخی شہروں میں سے ایک ہے۔ وہاں سلجوقی عہد کے بہت سے آثار اب بھی اپنی فنی خوبیوں اور تعمیری رعنائیوں سے سیاحوں کا دل موہ لیتے ہیں۔ اسے مقبروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے، حالاں کہ

سلجوقی فرمانرواؤں کے مقبروں کے علاوہ وہاں ان کے عہد کی بہت سی مسجدیں بھی اب تک موجود ہیں۔

اس سے پہلے کی عمارتیں رومیوں کے اس عہد کی ہیں جبکہ قیصریہ "یوسیبیا" کہلاتا اور قبادوسیہ سلطنت کا صدر مقام تھا۔ اس زمانے کے آثار موجودہ شہر سے تقریباً ایک تہائی میل دور جانبِ جنوب واقع ہیں۔ یوسیبیا لفظ یوسب سے مشتق ہے جو قبادوسی بادشاہ تھا۔ بازنطینی شہنشاہ جسٹنین نے شہر کے گرد فصیل تعمیر کی تھی۔ سنہ ۱۰۶۷ میں تاتاری بیرس نے قبادوسی حکومت کو شکست دے کر اس شہر پر بھی قبضہ کر لیا اور اس کا نام قیصریہ رکھ دیا۔

پہلی صدی عیسوی میں جب نصرانی تہذیب نے چوری چھپے اس علاقے میں فروغ پانا شروع کیا تو لوگ پہاڑوں کی کھو میں جا کر چپکے چپکے عبادت کرنے لگے۔ چناں چہ اب بھی ویران دروں کے درمیان کلیساؤں اور خانقاہوں کے آثار ملتے ہیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں عربوں نے اس شہر کو کئی بار فتح کیا اور پھر قبضہ اٹھا لیا۔ تاہم اس شہر کی خوبصورتی اور خوش حالی سلجوقیوں کے عہد میں درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔ اس قوم نے اناطولیہ میں کئی شہروں کو اپنا صدر مقام بنایا جن میں قیصریہ، قونیہ، سیواس وغیرہ شامل ہیں۔ البتہ علاء الدین کیقباد کا بیشتر عہد اس شہر میں گزرا۔ جب استنبول کے فاتح محمد ثانی نے سلجوقیوں کے کرمانی خاندان کو شکست دے دی تو قیصریہ سلطنتِ عثمانیہ کا جزو بن گیا۔

گوریم: قیصریہ جانے والے سیاح گوریم کی حیرت ناک وادی کا سفر ضرور کرتے ہیں، جو شہر سے صرف ساٹھ میل کے فاصلے پر قونیہ کے راستے میں ہے۔ ترکی کی سیاحت میں یہ منزل ہوشربا کہی جاسکتی ہے کیوں کہ ہر نووارد کو یہاں آکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خواب کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے سخت پتھر کی چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر انسان نے اپنے رہنے کے لیے مخروطی مکانات تعمیر کیے جو برابر برابر اس طرح نظر آتے ہیں جیسے دیو لبادے پہن کر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ہوں۔ خود قدرت نے بھی یہاں کی بعض چٹانوں کو گھس گھسا کر ہیبت ناک بنا دیا ہے۔

اس مقام کے تاریخی حالات بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ صرف یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بازنطینی قوم کے افراد شکست کھا کر اس علاقے میں پوشیدہ رہنے کی غرض سے جا بسے ہوں گے۔ ان کی ایک سب سے چھوٹی عبادت گاہ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے المائی کلیسی یعنی سیب والا

کلیسا کہلاتی ہی۔ عجیب بات یہ ہی کہ اس تک پہنچنے کا باقاعدہ کوئی راستہ نہیں ہو بلکہ ایک کنوئیں میں کود کر جو پہاڑی کو کھود کر بنایا گیا ہی، وہاں پہنچا جاسکتا ہی۔

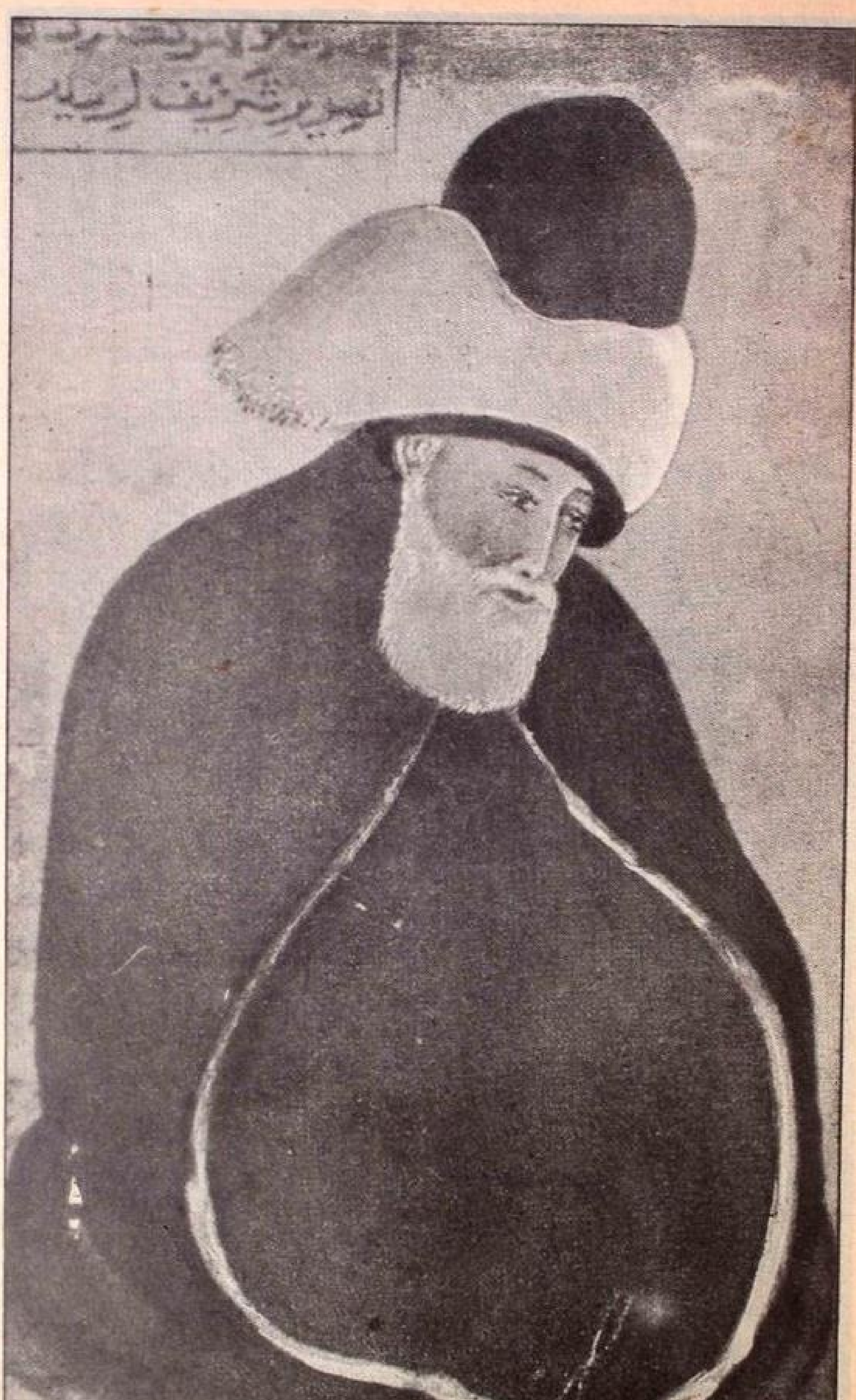
ایک اور عبادت گاہ کرانلک کلیسی یعنی تاریک کلیسا کہلاتی ہی۔ وہاں تک جانے کے لیے ایک سرنگ میں سے گزرنا پڑتا ہی، جو ہمیشہ تاریک رہتی ہی اور دیواروں پر بنے ہوئے نقش و نگار اور تصاویر دیکھنے کے لیے مصنوعی روشنی کی ضرورت پڑتی ہی۔ ایک اور بڑی چٹان کے اندر جہاں اس وقت کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں توکالی کلیسی یعنی بکلس والا کلیسا واقع ہی، کیوں کہ اندر کی دیوار پر بہت بڑا اور خوبصورت بکلس بنا ہوا ہی۔ یہاں عہدنامۂ جدید کی بعض روایات کو نقش بر دیوار کیا گیا ہی۔

عاک شہر ملا نصرالدین کی وجہ سے بہت مشہور ہی۔ اس کے علاوہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہی۔ البتہ شہر قدرتی مناظر کی وجہ سے خوبصورت کہا جاسکتا ہی۔

ان شہروں کو اپنی نظر سے نہ دیکھنے کا بہت افسوس رہا لیکن تنگیٔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ ہم بازنطینیوں، سلجوقیوں اور عثمانیوں کی جولانگاہوں کو موٹر کار کے پہیوں سے روندتے ہوئے تیزی کے ساتھ جائیں اور ملکۂ شب کی سیاہ زلفیں شانوں پر لہرانے سے قبل لوٹ آئیں۔ تخمینے کے مطابق چار گھنٹے میں جانا اور چار گھنٹے میں لوٹنا اور تین چار گھنٹے وہاں ٹھیرنا کافی تھا۔

دو چیزیں:۔ برصغیر پاک و ہند میں الٰہ آباد کسی وقت صرف دو چیزوں کے لیے مشہور تھا ـــــ اکبر الٰہ آبادی اور الٰہ آبادی امرود ـــــ اِسی طرح قونیہ صرف دو چیزوں کے لیے مشہور ہی ـــــ مولانا رومیؒ کی ابدی آرام گاہ اور قالین ـــــ جس طرح لوگ الٰہ آباد جاتے اور مشہور طنز نگار شاعر سے ملتے اور امرود کھاتے تھے، اسی طرح قونیہ جانے والے لوگ زیارتِ درگاہ کرتے اور قالین خریدتے ہیں۔ تاہم ہمارا ارادہ کوئی قالین خریدنے کا نہیں تھا، کیوں کہ ترکی کے بعد ہمیں اور ملکوں کی سیر کرنی تھی لہٰذا فی الحال ہمارے لیے یہی بہت کافی تھا کہ تیرھویں صدی کے اس صوفیٔ صافی کی خاموش بارگاہ میں حاضری دے کر کچھ تسکینِ قلب حاصل کریں۔

مولانا رُومیؒ:۔ مولانا جلال الدین رومیؒ خراسان کے شہر بلخ میں ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء مطابق ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد بہاءُالدین محمد بن الحسین الخطیبی البا قری اپنے وقت کے جید عالم باعمل تھے اور اسی لیے عام طور پر سلطان العلماء کہلاتے تھے۔ انھیں یہ تمام علمی سرمایہ اپنے والد حسین ابن احمد خطیبی سے ورثے میں ملا تھا جن کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ



چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمیدانم
نہ ترسا، نے یہودم من، نہ گبرم، نے مسلمانم
مکانم لامکاں باشد، نشانم بے نشاں باشد
نہ تن باشد، نہ جاں باشد کہ من از جانِ جانانم

رضی الدین نیشاپوری جیسی باکمال ہستیاں ان کے قدموں میں بیٹھ کر علم و فضل حاصل کرنا باعث فخر سمجھتی تھیں۔

مشہور مورّخ افلاکی کا بیان ہے کہ مولانا رُومی کے دادا کی اعلیٰ فضیلت سے متاثر ہو کر علاءُ الدین خوارزم شاہ نے اپنی بیٹی ملکہ جہاں ان کے نکاح میں دے دی تھی اور اس رشتے کو اپنی چہیتی نورِ نظر کے لیے ایک نعمتِ عظیم سمجھا تھا۔ ماں کی شانِ امارت اور باپ کی انتہائی کسرِ نفسی نے مولانا حسین ابن احمد خطیبی کے کردار میں ایک نیا رنگ پیدا کیا جو تصوّف کے رُوپ میں جلوہ گر ہوا۔ ان کی صوفی منشی امام غزالیؒ کی دینی تعلیمات کی بھی رہینِ منّت تھی، جن کی وفات ان کی پیدائش سے چند سال پہلے واقع ہوئی تھی اور اس سے پہلے چار دانگِ عالم میں ان کی بزرگی و برتری کا ڈنکا بج چکا تھا، بلکہ ان کے بارے میں رائے عامّہ کے مطابق یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگر پیغمبری رسول مقبول صلعم پر ختم نہ ہوتی تو غزالیؒ سِلسلۂ رسالت کی ایک کڑی تسلیم کیے جاتے ۔ انھوں نے یونانی فلسفہ حکمت کی دھجیاں بکھیر کر اسلامی فکر و خیال کی رُوح اس انداز میں پہلی بار پیش کی تھی کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے تھے ۔

مولانا رومی کے والد نے امام غزالیؒ کی تعلیمات کا عمیق مطالعہ کیا اور قدرتی طور پر وہ اہلِ دنیا کی ہماہمی سے بیزار ہو کر ایک عالم جاوداں کی فکر میں رہنے لگے۔ انھوں نے عوام کو یہی تلقین کی کہ یہ دنیا جو ہر لحاظ سے بے ثبات ہے، کسی طرح بھی دل لگانے کے لائق نہیں ہے۔ ان کی جادو بیانی سے ان کے معتقدین کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہا۔ ان کی بڑھتی ہوئی شہرت شاہ خوارزم کے اُستاد و مصاحب اور اپنے وقت کے ایک بڑے عالم فخر الدین رازی کو بُری طرح کھلنے لگی اور انھوں نے مولانا خطیبی کی توڑ کے لیے ایسے مذموم طریقے اختیار کیے کہ وہ اپنے وطنِ مالوف ہی سے بیزار ہو کر ترکِ سکونت کے منصوبے تیار کرنے لگے۔

اسی اثنا میں چنگیز خاں کے لشکرِ جرار نے خراسان کی جانب یلغار کر کے عوام کے لیے اطمینان کا سانس لینا دشوار کر دیا۔ بہت سے لوگ نقلِ وطن کرنے لگے۔ چناں چہ مولانا رومی کے والد نے بھی اس موقع کو مناسب سمجھا، اپنے معتقدین کو ساتھ لے کر رختِ سفر باندھا اور ایشیائے کوچک کی طرف چل پڑے۔ اس وقت مولانا رومی بہت ہی کم سن تھے ۔

دورانِ سفر میں جب یہ قافلہ نیشاپور سے گزرا تو مشہور صوفی شاعر فرید الدین عطار سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے نو عمر جلال الدین کی پُر مغز باتوں سے بے حد متاثر ہو کر رائے ظاہر کی کہ

اگر اس برخوردار کی تعلیم و تربیت صحیح نہج پر ہوئی تو باپ دادا کا نام روشن کرے گا اور اپنے لیے ایسا بلند مقام پیدا کرے گا جس کو ساری دنیا رشک کی نظر سے دیکھے گی۔

واقعات شاہد ہیں کہ یہ پیشین گوئی توقع اور اندازے سے بھی زیادہ صحیح ثابت ہوئی۔

نیشاپور سے چل کر یہ قافلہ بغداد پہنچا تو وہاں کے لوگوں کو پہلے سے اپنا منتظر پایا کیوں کہ مولانا بہاؤالدین کی فضیلت کا چرچا ان سے بہت آگے آگے نیک نامی کی منزلیں طے کرتا جارہا تھا۔ بغداد میں مشہور صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی نے پرتپاک طریقے پر ان کا خیر مقدم کیا۔ مولانا بہا اپنے ساتھیوں سمیت چند دن مدرسہ مستنصریہ میں قیام پذیر رہے جو صرف آٹھ سال پہلے قائم ہوا تھا لیکن اس قلیل مدت میں مستنصر علوم ظاہری و باطنی کا ایک بہت بڑا مرکز بن چکا تھا۔ شیخ سہروردی اس کے سربراہ تھے۔ خلیفۂ بغداد نے بھی اس قافلے کی برگزیدہ ہستیوں سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی لیکن صاف انکار کر دیا گیا اور جو تحائف بابِ خلافت سے بھیجے گئے تھے، جُوں کے توں لوٹا دیے گئے۔ ان میں سے کسی کو بھی دنیا کی کم مایہ نعمتوں اور اس کے عارضی جاہ و جلال سے کوئی سطحی رغبت تک نہ تھی۔

بغداد سے شام ہوتے ہوئے یہ سب مکہ شریف پہنچے اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے بعد زنجان کی راہ لی جہاں ان دنوں فخرالدین بہرام شاہ سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس کی ذاتی عظمت اور علم دوستی کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ نظامی گنجوی نے اپنی مشہور تصنیف "مخزن الاسرار" کو انھی کے نام سے معنون کیا ہے۔ بہرام شاہ کو شرفِ ملاقات بخشا گیا جو یقیناً مناسب اور عینِ مسلک تھا۔

زنجان سے چل کر یہ جماعت لارندہ پہنچی تو اس وقت جلال الدین کی عمر ۱۸ سال ہو چکی تھی۔ جوانی کا عالم تھا لیکن عام لوگوں کی طرح ان کی جوانی دیوانی نہیں تھی۔ جدِ امجد کے نقوشِ قدم پر چلنا ان کا شعار بن چکا تھا۔ ہم نشینوں کا جمال ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں پر اثر کر رہا تھا۔ جو بھی ان سے ملتا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

اس موقع پر خواجہ لیلائے سمرقندی کی دختر نیک اختر گوہر خاتون کا رشتہ پیش کیا گیا، جو مولانا بہا نے اپنے لختِ جگر کے لیے فوراً قبول کر لیا۔ بہرحال ازدواجی زندگی بسر کرنی تھی اور ہونے والی دلہن کے حسب نسب سے واقف ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم تھا کہ لڑکی بذاتِ خود نیک سیرت اور ستودہ صفات ہے۔

شادی خانہ آبادی کے ایک ہی سال بعد مولانا جلال الدین ایک بچے کے باپ بن گئے، جس کا نام سلطان ولد رکھا گیا جو صحیح معنوں میں فرزندِ حقیقی ثابت ہوا۔ اس نے "مثنوی ولدی" لکھ کر شائقین علم و فن پر بڑا اکرم کیا۔ اس کے مطالعے سے مولانا موصوف کے حالاتِ زندگی اور ان کے مسلک کی اصل نوعیت کا پورا پتہ چلتا ہے۔

پانچ سال کی مسلسل اور طویل مسافرت کے بعد جو قیام لارندہ میں ہوا، وہ بظاہر دیرپا ہونا چاہیے تھا، خصوصاً اس لیے بھی کہ لختِ جگر کو رشتۂ گوہر میں منسلک کر دیا گیا تھا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قونیہ کے صاحبِ تاج و تخت، سلجوقی خاندان کے فرمانروا، سلطان علاءُ الدین کیقباد کا دعوت نامہ ملا کہ سرزمینِ روم آپ کے کفشِ مبارک کو اپنے سر پر اٹھانے کے لیے بے چین ہے۔ اس سلجوقی سلطان کی علم دوستی اور خدا ترسی سے کون واقف نہیں تھا۔ چناں چہ کھلا ہوا رختِ سفر چار سال بعد پھر بندھ گیا۔

سنہ ۱۲۲۹ء میں یہ جماعت لارندہ سے قونیہ پہنچ گئی۔ نئی سرزمین زیادہ راس نہ آئی۔ مولانا بہاءُ الدین کا بیشتر وقت علالت میں گزرا اور دو سال بعد وہ اس جہانِ فانی سے کوچ بھی کر گئے۔ مولانا جلال الدین کی عمر اس وقت ۲۲ سال تھی۔

بیٹے نے باپ کا منصب سنبھالا لیکن اس دیرینہ روایت کے مطابق نہیں کہ بادشاہ کی اولاد بھی تخت نشین ہوتی ہے بلکہ وہ اوائل عمر ہی میں عوام کے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ انھوں نے اس وقت باقاعدہ کسی مدرسے میں داخل ہوئے بغیر اپنے اتالیق برہان الدین محقق ترمذی سے، جو ان کے والد کے شاگردِ رشید اور بڑے معتقد تھے اور ہمیشہ شریکِ سفر رہتے تھے، ظاہری اور باطنی علوم کی ہر مد میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور محض اپنی اعلیٰ ذہانت کی بنا پر وہ کمال حاصل کیا تھا کہ خود استاد شاگرد کی قابلیت کا معترف ہو گیا تھا لیکن مولانائے روم نے بھی اپنے استاد کی فضیلت کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ ان کی مثنوی کے یہ دو شعر اگرچہ بعد میں منظوم ہوئے اس حقیقت کا ثبوت ہیں ؎

پختہ گرد و از تغیّر دور شو | رو چوں برہان محقق نور شو
چوں ز خود رستی، ہمہ برہاں شدی | چونکہ گفتی بندہ ام، سلطاں شدی

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے خیالات کو منظوم کرنے کی ابتدا کی، جن کو سن کر لوگوں نے داد و تحسین کے ساتھ ساتھ انھیں مولانائے روم بھی کہنا شروع کر دیا اور یہ خطاب ایسا چسپاں

ہوا کہ نام کا جزو بن گیا، بلکہ عوام جلال الدین کو بھول کر صرف رومی کو یاد رکھنے لگے۔

نجی طور پر تحصیل علم کے باوجود ایک قسم کی تشنگی ان کو محسوس ہوتی رہی اور انھوں نے مناسب سمجھا کہ اس سرزمین سے باہر نکل کر کسی اور مرکزِ علم سے مزید نورِ عرفاں حاصل کیا جائے۔ اس وقت یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں اسلامی تعلیمات کے ضمن میں حلب و دمشق کے علمی مراکز سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے اور حسن اتفاق ہے کہ منگولوں کے تباہ کن حملے کے وقت بھی لٹیروں کی دست بُرد سے بچ گئے تھے۔

مولانا رومی اپنی عمر میں پہلی بار ایک مدرسے یعنی حلب کے مدرسۂ حلویہ میں داخل ہوئے، جو حنفی فرقے کی تعلیمات کا سب سے عمدہ اور شہرۂ آفاق ادارہ تھا۔

روایت ہے کہ اس مدرسے سے وابستہ ایک بہت بڑی جائداد بھی تھی جس کی آمدنی پر ادارے سے تعلق رکھنے والے اُستادوں اور طالب علموں کا گزارا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وقف سے تین ہزار دینار سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی اور وقف کرنے والے کی وصیت تھی کہ رمضان شریف کے سارے مہینے میں اس رقم سے حلوا خرید کر استادوں اور شاگردوں میں تقسیم کیا جایا کرے۔ اسی رعایت سے اس کا نام مدرسۂ حلویہ پڑ گیا تھا۔

جب مولانا رومی وہاں داخل ہوئے تو کمال الدین ابن الآدم مدرسے کے صدر الاساتذہ تھے جو بڑے جیّد عالم اور باکمال شاعر تھے۔ افلاکی نے ان کو ایک روشن ضمیر صوفی لکھا ہے۔ رومی بہت جلد کمال الدین کی نظروں میں چڑھ گئے۔ کچھ تو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر اور کچھ اس لیے کہ اپنے وقت کے سُلطان العلما کے فرزند تھے، جن کی فضیلت کے معترف تمام علمائے عصر تھے۔

حلب میں چار سال قیام کرنے کے بعد رومی دمشق چلے گئے اور تین سال وہاں بھی رہے۔ علمی مرکز ہونے کے اعتبار سے دمشق کا درجہ حلب سے بھی زیادہ بلند تھا۔ رومی کے کلام میں جگہ جگہ اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے۔

اس طرح سرزمین شام پر سات سال گزارنے کے بعد رومی واپس قونیہ چلے گئے جہاں ان کے والد دفن اور اُستاد مقیم تھے۔ چُناں چہ انھوں نے اپنے اُستاد برہان الدین محقق کے ایما پر نفس کشی کے لیے مسلسل تین چِلّے کھینچے، یعنی ایک سو بیس دن تک علائقِ دنیوی سے بالکل الگ رہ کر ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ اور ترکِ ترک کی تینوں منزلیں ایک ساتھ طے کر لیں جن سے گزر جانا ہر صُوفیٔ صافی کے لیے ازبس ضروری ہے۔

اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ مولانا محقق کے ایما پر انھوں نے اپنے مسلک کے مطابق اپنے مُریدوں کا حلقہ الگ کرلیا، جن کی تعداد دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار سے بڑھ گئی ؎

دہ ہزارش مرید بیش شدند — گرچہ اول زصدق دور بدند
وعظ گفتے زجود بر منبر — گرم دگیرا چو وعظ پیغمبر

یوں تو میدانِ شاعری میں اُن کا قدم پہلے ہی اٹھ چکا تھا، لیکن زمینِ شعر کو جو آسمان درکار تھا، وہ چار ماہ کی نفس کشی کے بعد حاصل ہوگیا۔ اب وہ اس اعلیٰ سطح پر آگئے تھے کہ "پہلوی زبان" میں "قرآن" لکھ سکیں، جس کی بنیاد پر وہ اب تک زندہ ہیں اور رہتی دنیا زندہ رہیں گے۔

مثنوی معنوی کا عمیق مُطالعہ کرنے والوں کی رائے بڑی حد تک صحیح ہے کہ مولانا رومی اپنے والد کی تحریر سے بے حد متاثر تھے بلکہ بعض جگہ تو انھوں نے مولانا بہاؤالدین کی تصنیف "کتاب المعارف" سے اس درجہ استفادہ کیا ہے گویا نثر میں بیان کیے ہوئے خیالات کو منظوم کردیا ہے۔ اس مماثلت کی ایک اچھی نظیر حسب ذیل ہے۔ مولانا بہاءُ الدین "کتاب المعارف" میں لکھتے ہیں:-

" اکنوں چو تو خود را غلتی دیدی بہ اللہ وصفات اللہ می داں کہ آں تقاضائے اللہ است واگر میلت بہشت است و در طلب بہشتی آں میل بہشت است کہ ترا طلب میکند واگر ترا میل بآدمیت آں آدمی نیز ترا طلب میکند کہ ہرگز از یک دست بانگ نیاید"

لہذ مولانا رومی اس خیال کو اس طرح منظوم کرتے ہیں ؎

ہیچ عاشق خود نباشد وصل جو — کہ نہ معشوقش بود جویائی او
لیک عشق عاشقاں تن زہ کند — عشق معشوقاں خوش و فربہ کند
چوں دریں دل برق نورِ دوست جست — اندراں دل دوستی مداں کہ ہست
در دلِ تو مہرِ حق چوں شد دو تو — ہست حق را بے گمانی مہر تو
ہیچ بانگ کف زدن آید بدر — از یکی دست تو بی دستِ دگر

یہ کوئی انوکھی یا تعجب کی بات نہیں ہے جب ایک ہی قسم کے خیالات اور یکساں عقائد کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو انسان دانستہ یا غیر دانستہ طور پر دوسرے کے رموز کو اپنے الفاظ میں منکشف کرتا ہے اور اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ آج جو شمعِ عرفاں ہم روشن

کر رہے ہیں، وہ اس سے قبل کس کس دانش کدہ میں اپنا نور بکھیر چکی ہے۔ چناں چہ اپنے ملک میں اگر ہم کلامِ اقبال کا گہرا مطالعہ کریں تو محققین کی یہ رائے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ وہ مولانا رومی سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان سے باقاعدہ استفادہ کر کے اپنے کلام کو جِلا دیتے رہے تھے۔ خود انھوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ؎

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

اور چوں کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا بہاءُ الدین اپنی جگہ امام غزالیؒ کے فلسفے سے متاثر تھے اور اپنی تحریروں میں وہ رنگ بھرتے رہے تھے، اس لیے بالواسطہ مولانا رومی امام غزالیؒ سے متاثر ہو گئے اور یہ بھی حُسنِ اتفاق ہے کہ دونوں نے جن مکتبوں میں تعلیم پائی ان کا نصاب، تقریباً دو صدیوں کے تفاوت کے باوجود بالکل یکساں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی کے باب میں امام غزالیؒ کا فلسفہ مولانا رومی پر بے حد اثر انداز ہوا ہے۔ دوسرے خیالات میں ایک ہی رنگ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ امام غزالیؒ کی تصنیف "احیاءُ العلوم" اور مولانا رومی کی مثنوی کا بیک وقت مطالعہ اس دعوے کا کھلا ثبوت ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسالک کی اس قدر ہم آہنگی کے باوجود طریقت کے درجے دونوں کے ہاں جُداگانہ تھے اور اظہارِ خیال کا انداز بھی ذرا مختلف ہے۔ امام غزالیؒ نے جن حقائق کو اپنے آپے میں رہ کر کہا ہے، مولانا رومی انھی کو بیان کرتے وقت آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دونوں کی ابتدائی زندگی تقریباً یکساں ماحول اور کیفیات میں گزری۔ خود فارغ التحصیل ہوتے ہی دونوں کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا۔ دونوں نے مساجد میں جا کر محراب و منبر کے زیرِ سایہ اپنے معتقدین کو درس دینا شروع کیا کیوں کہ اس سے بہتر اور محفوظ جگہ کہیں اور ممکن نہیں تھی۔ دونوں نے عوام کو قانونِ الٰہی کے رموز سمجھائے اور امورِ متنازعہ پر فتوے دیے۔ پھر دونوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ عوام سے اس درجہ وابستگی کو ترک کر کے بلکہ ساری دُنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنے سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں اور پھر دونوں کا یہ دَور بھی عارضی ثابت ہوتا ہے۔

مولانا رومی کا پہلا دَورِ زندگی ۳۷ سال عمر تک جاری رہتا ہے۔ سنہ ۱۲۴۴ء میں اچانک ایک زبردست تبدیلی رونما ہوتی ہے، جب وہ پہلی بار قونیہ میں شمس تبریزؒ سے ملتے ہیں۔ اس پُر اسرار ہستی کے حالات بیان کرنے میں مورخین کسی ایک مرکز پر نہیں پہنچ سکے بلکہ ان میں سے بیشتر نے خود

ہی صحتِ حالات اور واقعات سے انکار کیا ہے۔ وہ قطعی رائے کے ساتھ یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکے کہ مولانا رومی سے ان کے تعلقات کس نوعیت کے تھے۔ یا یہ کہ ان میں ایسی کیا خوبی تھی جس نے رومی جیسے سرچشمۂ علم و عرفاں کو آنِ واحد میں نہ صرف مبہوت و مخبوط الحواس کیا، بلکہ مجذوبیت کی وہ بے پناہ کیفیت ان پر طاری کی کہ ایک نہ دو پورے سترہ سال کے لیے وہ اپنے دیرینہ مسلک سے بالکل ہٹ گئے۔ ان کے اصولِ حیات منقلب ہو گئے۔ وہ جو رقص و موسیقی کو مشاغل بے معنیٰ سمجھتے تھے، ان فنونِ لطیفہ کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ ان کی لانہایت وسعتوں میں گم ہو گئے۔ وہ جو پوشیدہ حقیقتوں کے چہرے سے نقاب اٹھاتے تھے، اپنی ہی زندگی کے پردوں میں چھپ کر رہ گئے۔ وہ جو دوسروں کو آدابِ محفل سمجھنے کا درس دیتے تھے، اخلاق کی بندشوں کو توڑ کر غیر ذمہ دار حرکتوں پر اتر آئے۔ لوگوں نے ان کو بازاروں اور گلیوں میں گاتے، تھرکتے اور شور مچاتے دیکھا۔ سب حیران ہوتے اور ان کے دل کا راز نہ سمجھ سکتے تھے۔

کہتے ہیں کہ شمس تبریز ۲۶ جمادی الآخر ۶۴۲ھ (۱۲۴۵ء) میں قونیہ آئے اور ایک سرائے میں مقیم ہو گئے۔ چند دن بعد وہ سرائے کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ مولانا ایک خچر پر سوار اپنے پاپیادہ مریدوں کے ساتھ وہاں سے گزرے۔ شمس نے آگے بڑھ کر خچر کی لگام تھام لی اور سوال کیا "بتا! خدا کا زیادہ خدمت گزار بندہ محمدؐ تھا یا بایزید بسطامی؟"

رومی نے جواب دیا "بلاشبہ محمدؐ کا درجہ بلند تھا"

شمس نے دوسرا سوال کیا "پھر کیا وجہ ہے کہ محمدؐ نے ما عرفناک حق معرفتک کہا اور بایزید نے اس منزل سے بہت آگے بڑھ کر سبحانی ما اعظم شانی کا نعرہ بلند کیا؟"

رومی یہ بات سنتے ہی بھونچکے رہ گئے اور بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑے۔ شمس وہاں سے غائب ہو گئے۔

یہ مشہور مورخ افلاکی کا بیان ہے لیکن زیادہ قابلِ قبول نہیں کہا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ رومی بہت بڑے عالمِ دین تھے اور بڑے سے بڑے اعتراض کا مسکت جواب دینا جانتے تھے۔ پھر وہ اس بے ربط سی گفتگو میں لاجواب ہو کر ہوش و حواس کیوں کھو بیٹھے؟

ایک اور مورخ محی الدین عبدالقادر کا، جو رومی کے بیٹے سلطان ولد کے ہمعصر تھے، یہ بیان کتبِ تاریخ میں ملتا ہے کہ رومی ایک روز حسبِ معمول اپنے مکان پر معتقدین کو درس دے رہے تھے کہ ایک اجنبی آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس کی صورت جاہلوں کی سی اور لباس فقیرانہ تھا۔ جہاں

وہ بیٹھا تھا، اس کے قریب ہی کتابوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک دم سوال کیا، "یہ کیا ہے؟"

رومی کو درس کے دوران میں یہ مداخلت بُری معلوم ہوئی اور انھوں نے طنزاً یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا کہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جونہی یہ الفاظ ادا ہوئے، ان کتابوں میں آگ لگ گئی۔ شعلوں کو دیکھ کر رومی گھبرا گئے اور چلّا کر پوچھا، "یہ کیا ہوا؟"

اجنبی نے جواب دیا، "تم نہیں سمجھ سکتے۔"

یہ کہا اور مکان سے باہر نکل کر ایسا غائب ہوا کہ تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ لیکن رومی پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور اسی کیفیت نے زیادہ پختہ ہو کر انھیں مجذوب بنا دیا۔

یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ رومی نے اس واقعہ کو ایک شعبدہ باز کا معمولی کرشمہ کیوں نہ سمجھا جیسا کہ اس زمانے میں بھی جادوگروں کے ایسے کھیل عام تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار غائب ہو جانے کے کچھ دنوں بعد شمس تبریز دوبارہ مل گئے اور رومی کے ساتھ بالکل خلوت میں ایک سو بیس دن اور بعض کے قول کے مطابق چھ ماہ تک رازونیاز کی باتیں کرتے رہے اور جب خلوت سے باہر آئے تو بالکل بدلے ہوئے تھے۔ شمس تبریز کا نہ جانے کون سا جادو اُن پر چل گیا تھا۔

شمس تبریز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حسن بن صباح کے پیرو اور حلقہ حشیشین میں داخل تھے بلکہ ان کے دادا نورالدین، حسن بن صباح کے دستِ راست تھے اور اس پیر فرتوت کی وفات کے بعد اس کے جانشین ہو گئے تھے۔ اور یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ اس فرقے کے سبھی لوگوں میں ایک عجیب سحرانگیز کشش پائی جاتی تھی۔ وہ الفاظ کا جادو چلا کر ہر شخص کا دل اس کے عقائد کے خلاف اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیتے تھے اور پھر اسے مشکل سے چھٹکارا نصیب ہوتا تھا (حشیش عربی زبان میں بھنگ کو کہتے ہیں۔ حلقہ حشیشین میں داخل ہونے والوں کو بھنگ پلا کر مرضی کے مطابق بعض لوگوں کو اپنے راستے سے الگ کرنے کے لیے قتل کرا دیا جاتا تھا۔ انگریزی زبان کا لفظ "ایسے سن" جس کے معنی قاتل ہیں، اسی لفظ حشیشین سے بنا ہے)

شاید اسی قسم کا کوئی جادو بچارے رومی پر بھی چل گیا اور وہ صوفی صومعہ عالم قدس ہونے کے باوجود "دیرِ مغاں" کے بھی اسفل ترین حصے میں جا پڑے۔ ان کے عزیز ان سے نالاں، ان کے عقیدت مند ان سے برگشتہ اور ان کے مُریدان کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ کوششیں صحیح راہ پر لانے کی سب نے کیں، مگر سب ناکام رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دم ان کی دماغی صلاحیتیں

جواب دے گئی ہیں۔ ان میں سوچنے اور سمجھنے کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے۔ ان کے حلقۂ احباب و اعزا میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو ان پر ترس کھاتے اور شمس تبریز سے جلتے اور اس سے نجات پانے کے منصوبے تیار کرتے تھے۔

دولت شاہ کا بیان ذرا ہمدردانہ ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ خود شمس تبریز کو ایک مردِ کامل کی تلاش تھی تاکہ اسے اس دانۂ فطرت میں اپنا حصّہ دار بنا سکیں جو نہاں خانۂ دل میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح اندر ہی اندر جلا کر ان کو بھی بھسم کیے جا رہا تھا۔ انھیں اعلیٰ سکت رکھنے والی ایک ایسی عظیم ہستی کی جستجو تھی، جسے وہ جھنجھوڑ کر، توڑ پھوڑ کر، تباہ و برباد کر کے اس کی مشتِ خاک سے ایک نیا ہیولہ تیار کر کے اسے ایسے عروج پر لے جائیں جس کی اولین منزل ماورائے ادراک ہو۔ چناں چہ ان کے اُستاد مولانا رکن الدین سنجانی نے ان کو مشورہ دیا کہ قونیہ جاؤ اور رومی سے ملو۔ وہ تمھاری گرمیٔ قلب کو ٹھنڈا کر سکے گا۔

لیکن غالباً یہ شمس تبریز سے والہانہ عقیدت کے اظہار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیوں کہ اس بات کا ثبوت کسی طرح نہیں ملتا کہ شمس کچھ بھی پڑھے لکھے انسان تھے۔ بعض مورخین نے اس بیان کی تکذیب کی ہے کہ وہ ادھیڑ عمر کے صوفی منش، پریشان حال رہنے والے انسان تھے۔ ان کا قول ہے کہ جب وہ رومی کی مجلس علم و ادب میں داخل ہوئے تو ایک خوبصورت نوجوان تھے اور اپنی عشوہ طرازیوں سے دل موہ لینے کے گر جانتے تھے۔ رومی انھیں دیکھتے ہی عاشق زار ہو گئے اور ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ان کی نجی زندگی ختم ہو گئی۔ دوست احباب سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ درس و تدریس کے دروازے بند ہو گئے۔ اسی لیے ان کے خلاف زبردست محاذ قائم ہوا اور جب انھیں اس شدید مخالفت کا پوری طرح احساس ہو گیا اور جان کی خیر نظر نہ آئی تو رومی کے ساتھ ۱۶ ماہ کے قیام کے بعد ۲۱ شوال ۶۴۳ھ (۱۲۴۶ء) کو قونیہ کو خیرباد کہہ کر دمشق چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ ان کی اچانک جُدائی رومی کو بہت شاق گزری اور وہ آپے سے باہر ہو کر مجذوبانہ حرکتوں پر اُتر آئے۔

شمس تبریز سے رومی کا عشق مجازی تھا یا حقیقی، کون فیصلہ انقطاعی دے سکتا ہے، لیکن یہ حقیقت ضرور ہے کہ اسی عشق کے طفیل ان کی طبیعت غزل گوئی کی طرف راغب ہو گئی اور اس زمین سے وہ اشعار پیدا کیے جن کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ چناں چہ مثنوی کو زبانِ پہلوی کا قرآن کہنے والوں نے بھی ان کی غزلوں کی تعریف کی ہے۔

شمس تبریز سے جُدائی کے بعد کا زمانہ ان پر بہت بُرا گزرا۔ وہ معمولی دیوانگی کی حد سے بھی آگے

بڑھ کر بالکل ہی مخبوط الحواس ہو گئے۔ گلی کوچوں میں پھر گھوم کر داستان قلب و نظر بیان کرنا ان کا وطیرہ بن گیا اور جب بھی کوئی شخص ان سے یہ کہہ دیتا کہ میں دمشق سے ابھی آیا ہوں، اور شمس تبریز کا پیغام ساتھ لایا ہوں تو والہانہ طور پر وہ اس سے لپٹ جاتے اور چونکہ انعام دینے کے لیے ان کے پاس کیا رکھا تھا، اس لیے اپنا لباس اتار کر اس کی نذر کرتے اور برہنہ ہو جاتے تھے۔ دوست احباب یا رشتے دار مجبوراً ان کو دوسرا لباس پہناتے اور پھر جب بھی وہ کسی مسخرے کے ہتھے چڑھ جاتے، وہ شمس تبریز سے ملنے اور پیغام لانے کا فریب دے کر ان کے کپڑے اُتروا لیتا تھا۔

ایک روز ایک شگفتہ مزاج دوست نے خیال ظاہر کیا کہ عین ممکن ہو کہ یہ سیاح محض تم کو خوش کرنے کے لیے من گھڑت پیغام سنا دیتے ہوں۔ رومی نے فوراً برجستہ کہا، ہاں ٹھیک ہے، اگر میں بھی ان پیغامات کو صحیح سمجھتا تو لباس اُتار کر دینے کے بجائے اپنی جان نذر کرتا، حالانکہ اس کی بھی کوئی وقعت میری نگاہ میں نہیں ہے۔

ایک روز کسی نے خبر اڑا دی کہ شمس کا انتقال ہو گیا ہے۔ رومی نے سنا اور یقین کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ تردید کرتے ہوئے فوراً یہ رُباعی منظوم کر دی ؎

کہ گفت کہ آں زندۂ جاوید بمرد کہ گفت کہ آفتابِ اُمید بمرد

آں دشمنِ خورشید برآمد بربام دو چشم بست وگفت خورشید بمرد

جب رومی کی بے قراری حد سے بڑھ گئی تو بعض لوگوں کو ترس آیا اور انھوں نے شمس کو واپس بلانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ان کا بیٹا سلطان ولد خود اس مہم پر روانہ ہوا اور کسی نہ کسی طرح شمس کو واپس لے آیا۔ کہتے ہیں کہ یہ واپسی بھی عجیب شان کے ساتھ ہوئی۔ سلطان ولد پاپیادہ اور شمس گھوڑے پر سوار آیا۔ رومی کو اس تجدید ملاقات سے کتنی خوشی ہوئی ہوگی، اسے بیان کرنا مشکل ہے، صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ رومی کے بہت سے معتقدین کو شمس تبریز سے للّٰہی بغض ہو گیا تھا اور وہ اس کے نام تک سے جلنے لگے تھے لیکن جب اس کی جدائی میں مرشدِ کامل کی بیقراری دیکھی تو سخت پشیمان ہوئے اور یقین دلایا کہ اگر شمس دوبارہ آ جائے تو ہم اس سے برا برتاؤ نہیں کریں گے۔ اور شاید انھی کے اشارے پر سلطان ولد دمشق گیا تھا لیکن جب وہ کامیاب واپس آیا تو لوگوں کے دلوں میں پرانی رقابت کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھی اور افلاکی کے بیان کے مطابق مخالفین میں سے ایک نے شمس تبریز کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ زخمی کی زبان سے ایک دل دوز

چیخ نکلی، جیسے سننے والے بے ہوش ہو کر گر پڑے اور جب ہوش آیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ خاک پر خون کے چند قطرے نظر آ رہے تھے۔

دولت شاہ نے شمس کے قتل کیے جانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ آیا اور اچانک غائب ہو گیا۔ خود رومی اس درجہ مدہوش تھے کہ انھیں نہ تو شمس کے واپس چلے آنے کا یقین آیا اور نہ غائب ہو جانے کا احساس ہوا۔ ان کی وارفتگی کا جو عالم پہلے تھا، بدستور رہا۔ دراصل شمس سے ان کا تعلق اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ اب اس کا وجود اور عدم وجود برابر تھا۔ وہ آئینِ تصوف کے مطابق اس مسلک کی سب منزلیں طے کر چکے تھے۔ وہ استغراق و محویت میں زیادہ تر خاموش رہنے لگے لیکن اس طرح کہ ان کا سکوت تکلمِ بلیغ بن کر دوسروں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔

مولانا رومی کی زندگی کا یہ دوسرا مجذوبانہ دور اگرچہ سترہ سال طویل تھا لیکن شمس تبریز سے عشق کی مدت آٹھ سال بتائی جاتی ہے، کیوں کہ اس دور کے بھی دو حصے ہیں اور دوسرا حصہ ایک اور ہستی سے وابستہ ہے جس کا نام صلاح الدین اور پیشہ ورق سازی تھا۔ اسی لیے عام طور پر صلاح الدین زرکوب کہلاتا تھا۔

۱۲۵۳ء کا ذکر ہے کہ ایک روز مولانا رومی اپنی دیوانگی کے عالم میں اس کی گلی سے گزر رہے تھے اور وہ اپنے معمول کے مطابق ورق کوٹنے میں مصروف تھا۔ مسلسل ہتھوڑا چلنے کی آواز ایک عجیب سا آہنگ پیدا کرتی ہے جس میں کبھی کبھی ایک کیفِ نغمہ پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ رومی نے اس آواز کو سنا، بے پناہ اثر لیا اور اس پر مستزاد یہ کہ جب آگے بڑھ کر اس زرکوب کو دیکھا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ سینہ پیٹنا اور سر دھننا ان کا شعار ہو گیا۔ وجدانی کیفیت زیادہ شدت سے طاری ہونے لگی۔ اس کے بارے میں خود ان کا بیان ہے ؎

یکے گنجے پدید آمد ازیں دکانِ زرکوبی   زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی، زہے خوبی

انھوں نے گلی کوچوں میں پھرنا گھومنا ترک کر دیا اور ایک بار پھر خلوت گزیں ہو گئے۔ ان پر بلا کی خاموشی طاری ہو گئی۔ صلاح الدین زرکوب چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ رہنے لگا۔

پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جاہل ورق ساز میں آخر ایسی کون سی خوبی تھی جس نے ایک اتنے بڑے صوفی، عالم اور مفکر کو متاثر کر کے اس کی دنیا بدل دی۔ مولانا موصوف کے صاحبزادے نے "ولد نامہ" میں زرکوب کی بابت لکھا ہے ؎

عامیٔ محض وسادہ و ناداں | پیش او نیک و بد بدہ یکساں
نتواند درست فاتحہ خواند | گر زو کسے سوالی ماند

شمس تبریز کی جُدائی سے جو انتشار رومی کی طبیعت میں پیدا ہوا تھا، زرکوب کی ملاقات اور اس کے ساتھ اختلاط سے مائل بہ سکون ہوگیا، یعنی کم و بیش وہی کیفیت طاری رہی، جو شمس تبریز کے ساتھ چھے ماہ تک خلوت نشین ہونے کی حالت میں رُونما ہوئی تھی۔

مولانا کی اکثر غزلوں میں زرکوب کا، لیکن بے شمار غزلوں میں شمس تبریز کا نام بطور تخلص استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے تمام غزلیات کا مجموعہ دیوان شمس تبریز کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اشارہ خود مولانا کا تھا، یا مرتّب کرنے والوں کی اپنی اُپج تھی، لیکن کچھ بھی ہو، دنیا جانتی ہے کہ دیوان شمس تبریز کی اصلیت کیا ہے۔

۱۲۶۱ء میں زرکوب کا انتقال ہوگیا اور شمس تبریز سے مولانا کی ملاقات ۱۲۴۵ء میں ہوئی تھی۔ گویا اپنی زندگی کے اس دوسرے دور میں جس کی مدت تقریباً سترہ سال تھی، انھوں نے کم و بیش پچاس ہزار اشعار کہے۔ انھی کا مجموعہ دیوان کی صورت میں چھپا اور کچھ مثنوی میں شامل کیے گئے۔ ان غزلیات کے مطالعہ سے ان کے نظریۂ محبّت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ان کے نزدیک محبت کسی ایسی کشش کا نام نہیں ہے جس کا مآل جسموں کا اِتصال ہو، بلکہ ان کے فلسفے میں محبت ایک بے غرض اِنہماک اور خود فراموش محویت کا نام ہے جو حُسن کو دیکھ کر طاری ہو، خواہ وہ حُسن ظاہری ہو یا باطنی۔ صرف محبّت ہے جو غیر فانی ہوتی ہے، باقی ہر چیز فنا ہو جاتی ہے۔ قیودِ الفاظ سے بالکل الگ وہ ایک ناشنیدہ پیغام ہے، جو غیر محسوس لبوں سے غیر مرئی کانوں تک پہنچتا ہے اور جسے پوری طرح سمجھنے کے لیے دل و دماغ سے بھی بالاتر ایک ایسے عضو کی ضرورت ہے، جو جسم کی مادّیت سے قطع نظر، صرف رُوح کی گہرائیوں میں ملتا نہیں، صرف محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے زندگی کا منتہائے مقصود یہی ہے کہ محبّت کی جائے، کیوں کہ محبت نہ کرنا ایک بد قسمتی ہے، کفرانِ نعمت ہے اور اس لیے ایک ایسا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

قالبِ انساں ازل میں عشق کی خاطر بنا | اس نشیلی مے کے لائق بس یہی پیمانہ تھا

اور مولانا کہتے ہیں ؎

آں روح را کہ عشقِ حقیقی شعار نیست | نابودہ بہ کہ بودنِ او غیر عار نیست
در عشق مست باش کہ عشق است ہر چہ ہست | بے کار و بارِ عشق بر یار بار نیست

عشق است و عاشق است کہ باقیست تا ابد　　دل جز بریں منہ کہ بجز مستعار نیست

ان کے نزدیک محبت زندگی کا آغاز اور انجام ہے۔ ہمارے تمام مصائب کا صحیح حل ہے۔ تمام بیماریوں کا واحد علاج ہے کیوں کہ وہ سرحدِ ادراک سے بھی دور چلے جانے کے بعد ایک کائناتی احساس ہے جس کی فضا میں وقت اور مقام کی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور انسان اپنی ہستی کو بھول کر سود و زیاں سے خالی الذہن ہو جاتا ہے۔ خرد زائل ہو چکتی ہے، اس لیے عقل و فہم سے کام لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ؎

لاابالی عشق باشد بے خرد　　عقل آں جوید کزاں سودے برد

نے خدارا امتحانے می کند　　نے در سود و زیانے می زند

فنی اعتبار سے ارفع و اعلیٰ ادب و شعر کو تخلیق کر نا رومی کی سرخوشی و وارفتگی کا منتہا ہرگز ہرگز نہیں تھا، کیوں کہ ان کے جوش و خروش کی کیفیت اتنی محدود نہیں تھی کہ ان کے افکار بلیغ کو الفاظ کے دائرۂ تنگ میں پیش کر کے اطمینانِ قلب حاصل کر لیا جاتا، اس لیے ان کی تشنگی کا سلسلہ دیرپا اور وسیع تر رہا۔ اور اسی لیے ان کے روحانی تقاضوں کو سمجھنا بھی ہر ایک کے لیے ممکن نہ تھا اور خصوصاً اس زمانے میں کہ مادیت کا دور دورہ ہے، اس قسم کا کوئی بھی دعویٰ دیوانے کا ایک خواب ہے۔ ان کی بعض طرب انگیز غزلوں پر سر دھننا کوئی بڑی بات نہیں ہے، لیکن روح کو ایسی کیفیاتِ رقصیہ میں بدل دینا کہ وہ اعضائے جسم کو شل کر دینے کے بعد ہی ظہور میں آئیں، صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ قلب و جگر میں سارا خون جمع کرنے کے بعد اس کا رنگ بن کر باہر نکل آیا جائے۔ یہ منزل ترکِ دنیا اور ترکِ عقبیٰ بھی نہیں ہے، ترکِ ترک کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ مولانا رومی نے اسی منزل پر پہنچ کر فلسفۂ حیات پیش کیا تھا۔

روانگی:۔ ہمیں ناشتہ وغیرہ کر کے ٹھیک آٹھ بجے صبح انقرہ سے روانہ ہونا تھا تاکہ جمعہ کی نماز سے قبل شہر قونیہ میں مسجد مولانا رومی تک پہنچ جائیں اور فریضۂ نماز وہیں ادا کریں اور اس خیال سے کہ کسی ایک شخص کے اعصاب پر بار نہ پڑے، یہ طے کر لیا تھا کہ میں اور برکات صاحب باری باری کار چلائیں گے۔ غیر متوقع صورتِ حالات پر قابو پانے کے لیے بھی پہلے سے اہتمام کر لیا گیا تھا مثلاً گاڑی میں پٹرول کی وافر مقدار کے علاوہ ایک فالتو پہیہ ہوا بھر بھرا کر اور پہیہ اتارنے اور چڑھانے کا سامان ساتھ رکھ لیا تھا۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ رونما ہو جائے تو فرسٹ ایڈ کا ایک عمدہ کِٹ بھی ذہنی پریشانی کو دور کرنے کے لیے لے لیا تھا۔ یہ یقین تھا کہ سب کے سب ایک دم کسی

مصیبت میں مبتلا نہیں ہوں گے، بلکہ ایک کی دست گیری دوسرا کرسکے گا۔

ناشتہ ذرا بھاری قسم کا کیا تاکہ اگر راستے میں خلاف توقع زیادہ دیر بھی ہوجائے تو آنتیں قل ہو اللہ نہ پڑھنے لگیں۔ برکات صاحب کو زیادہ چائے پینے کی بُری عادت ہے، اس لیے انھوں نے تھرموس چائے سے بھر کر ساتھ رکھ لیا۔ ہم دونوں بھائیوں نے اپنے لیے انگور کے چند خوشے لے لیے۔ انقرہ کے باغات کے انگور بہت بڑے، رسیلے اور میٹھے ہوتے ہیں اور بلا مُبالغہ چند ہی دانے کھانے سے نیت بھر جاتی ہے لیکن میری یہ عادت ہے کہ کوئی چیز نہیں کھاتا تو دنوں اور ہفتوں نہیں کھاتا اور جب شروع کرتا ہوں تو رسالے کا خاص ضخیم نمبر شائع کرنے کی طرح ایک ہی وقت میں اتنا کھا لیتا ہوں اور پھر معمول کے ساتھ اس طرح کھاتا رہتا ہوں کہ دوسروں کی طبیعت صرف دیکھنے ہی سے سیر ہوجاتی ہے اور میں بالکل نہیں اُکتاتا۔ اور آم کھانے کا جہاں تک تعلق ہے، اپنے اس اصول میں کبھی استثنیٰ نہیں ہوتا۔ چناں چہ ناشتہ میں نے اس اعتبار سے کیا کہ شام تک کچھ نہ کھایا جائے، تب بھی بھوک نہ لگے۔

راستے میں: لمبی ہکاری سڑک انقرہ سے قونیہ تک صراطِ مستقیم کی طرح گئی ہے۔ نہ راستے میں زیادہ موڑ ہیں اور نہ کوئی ایسا چوراہا کہ اجنبی سیاح اس مقام پر پہنچ کر تذبذب میں پڑجائے کہ "اب جاؤں کدھر کو میں؟" یہ نوبت نہیں آسکتی تھی، پھر بھی احتیاط کے طور پر ہم نے تمام بڑی سڑکوں کا نقشہ ساتھ لیا جو دراصل ایک گائڈ بک کے آخر میں شریک اوراق تھا۔

سفر کی ابتدائی اور آخری دو منزلیں طے کرانا برکات صاحب کے سپرد کیا گیا کیونکہ وہ سیلانی جوڑے، کئی بار موٹر کار میں قونیہ جاچکے ہیں اور انھیں دونوں شہروں کے اندرونی پُرپیچ راستوں کا اچھی طرح علم ہے۔ ہمارے لیے یہ منزلیں کسی راہنما کے بغیر طے کرنی مشکل تھیں۔

ڈیڑھ سو میل لمبی شاہراہ پر دونوں جانب حدِ نظر تک سرسبز کھیتوں اور کھیت والوں کی جھونپڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کسی ملک کے بڑے شہروں میں جائیے تو ان کی انفرادیت کی شان کسی نہ کسی صورت میں فرق و امتیاز پیدا کرتی نظر آتی ہے، لیکن دیہات کا ماحول سب جگہ یکساں محسوس ہوتا ہے۔ وہی ڈھلواں چھتوں والے جھونپڑے زیادہ تر سرکی اور پھوس کے بنے ہوئے۔ جھونپڑوں کے ساتھ مرغیوں کے ڈربے اور مویشیوں کے تھان۔ بچوں اور بھیڑوں کی ایک ساتھ کلیلیں، کیونکہ زندگی دونوں کی نظر میں کھیل کود کر وقت گزار دینے کا نام ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والوں اور کام کرنے والیوں کی مدھر تانیں تاکہ محنت و مشقت کا بار طبیعت پر گراں گزرنے کے بجائے ہلکا ہو جائے۔

بارہا میرا جی چاہا کہ زیادہ نہیں تو صرف چند دن کے لیے شہروں کے ہنگاموں اور شور شوں سے دامن بچا کر، دور، بہت دور کسی گاؤں کی پُرسکون سادہ فضا میں پہنچ جاؤں جہاں تصنّع اور بناوٹ نام کو نہ ہو، جہاں طبیعتوں کا فطری خلوص قدم قدم پر دل موہ لے اور انسان یہ تمنا کرنے لگے۔ کاش! ہمارے لیے ہمیشہ اس جگہ رہنا ممکن ہو جائے۔

اس سڑک پر چوں کہ زیادہ تر وہی گاڑیاں چلتی ہیں جن کو قونیہ سے انقرہ اور انقرہ سے قونیہ تک جانا ہوتا ہے، اس لیے ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ مسافروں کو لانے لے جانے والی بسیں بھی زیادہ نظر نہیں آتیں، کیوں کہ وہ عموماً منھ اندھیرے ایک شہر سے روانہ ہو کر ٹھنڈے ٹھنڈے دوسرے شہر پہنچ جاتی ہیں اور پھر شام کو جب ڈوبتے سورج کی کرنیں دراز زلفوں میں قدرتی شانہ کرنے والی باریک انگلیوں کی طرح نرم و نازک اور لوچدار ہو جاتی ہیں تو مسافروں کو لے کر لوٹتی ہیں اور قلم کا کھیلا شو ختم ہونے کے ذرا دیر بعد اپنی منزل کو جا لیتی ہیں۔

برکات صاحب اپنی ڈیوٹی بھگتا رہے تھے یعنی موٹر چلا رہے تھے، بھائی جان موٹر کی اگلی سیٹ پر انھی کے قریب بیٹھے تھے۔ میں پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو کر کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی باری آنے سے قبل ٹانگوں کو ذرا پھیلا کر آرام دے لوں اور پھر اگلی سیٹ پر ایسا جم کر بیٹھوں کہ قونیہ پہنچنے سے پہلے کسی اور کو چارج دینے کی نوبت نہ آئے۔

اطراف کے مناظر کی یک رنگی سے طبیعت کسی حد تک سیر ہو چکی تھی، اس لیے دل بستگی اور حصولِ معلومات کی غرض سے کتاب اٹھا لی جسے ارادتاً ساتھ لے آیا تھا۔ فالتو وقت کا بہترین مشغلہ مطالعہ ہے اور یوں بھی ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے کہ جب کسی نئے شخص سے ملتا ہوں تو پہلے اس سے غائبانہ متعارف ہو جانا پسند کرتا ہوں اور جب کسی نئی سرزمین پر قدم رکھتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اس کے تاریخی اور ثقافتی حالات سے تھوڑا بہت واقف ہو جاؤں تاکہ وہاں پہنچ کر بالکل ہی اجنبیت محسوس نہ ہو۔

قونیہ کی تاریخی اہمیت: قونیہ بھی ترکی کے اور بہت سے شہروں کی طرح قدیم ہے اور بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک یونانی روایت کے مطابق ولادت مسیحؑ سے تقریباً تین ہزار سال پہلے پرسی اس جو دیوتا جوپیٹر اور ڈیانا کا بیٹا تھا، اس علاقے میں وارد ہوا۔ اس طرح کہ گورگن میڈوسا کا کٹا ہوا سر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اس علاقے میں پہنچ کر وہ سر پتھر کے ایک ستون پر لٹکا دیا۔ اسی کی رعایت سے شہر کا نام آئی کونیم یعنی بت والا شہر مشہور ہو گیا۔

قدیم تہذیب کے حامل دنیا کے بہت سے ملکوں کی طرح یونانی اساطیر میں بھی دیوتاؤں اور دیویوں کے ایسے قصے شامل ہیں جن کو تاریخ کی عینک سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مثلاً اُسی پرسی اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آرگوس کے بادشاہ ایکری سی اُس کو ایک جوتشی نے بتایا کہ تمھارا نواسا بڑا ہو کر تم کو ہلاک کر دے گا۔ جب ایکری کی بیٹی ڈیانا نے بچہ جنا تو اس کے باپ نے اسے اور اس کے بیٹے کو ایک ٹوکرے میں رکھ کر دریا کی لہروں پر چھوڑ دیا کہ کہیں نہ کہیں پہنچ کر دونوں ڈوب کر مرجائیں گے۔ لیکن ٹوکرا بہتا بہتا جزیرہ سیسی فس کے ساحل سے جا لگا اور وہاں کے بادشاہ نے ترس کھا کر دونوں کو پناہ دی اور محل میں بچے کی پرورش شروع کرا دی۔

پرسی اُس جوان ہو کر بہت ہی شہ زور ہو گیا تو لوگوں نے اس سے کہا ہم تو جب جانیں کہ تم گورگن میڈوسا کا سرتن سے جُدا کر دو کہ اس نے دنیا بھر میں ستم ڈھا رکھا ہے۔ یہ دیوی نہایت بدصورت ہونے کے علاوہ یہ خصوصیت رکھتی تھی کہ جو بھی نگاہ بھر کر اس کی طرف دیکھتا، پتھر کا ہو جاتا تھا۔ پرسی اُس بڑے جتن سے اس دیوی کے قریب پہنچا اور نگاہ ملائے بغیر تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ جو مارا تو بھٹے کی طرح سرتن سے الگ ہو کر جا پڑا۔ دیوی کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ جو لوگ اس وقت تک پتھر کے ہو گئے تھے، اپنے اصل روپ میں آگئے۔

اس کارِ خیر کو انجام دینے کے بعد جب پرسی اُس گھر لوٹ رہا تھا تو اینڈرومیڈا نامی دیوی سے شادی کر لی، لہٰذا وہ سیسی فس اس لیے نہ پہنچا کہ اس اقدام پر کوئی اعتراض نہ ہو اور وہ آرگوس چلا گیا جو دراصل اس کا وطنِ مالوف تھا لیکن یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

وہاں پہنچ کر وہ کھیلوں کے ایک سالانہ مقابلے میں شریک ہوا اور جب اس نے تھالی پھینکی تو وہ سوئے اتفاق سے بل کھا کر بادشاہ کے جا لگی اور وہ تھالی کی تیز دھار سے وہیں ہلاک ہو گیا۔ اس طرح وہ پیشین گوئی صحیح ہو گئی۔ نانا اپنے نواسے کے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتر گیا۔

اب یہ روایت کہ میڈوسا کا سر ستون پر ٹانگ دینے سے اس علاقے کا نام آئی کونیم پڑا، ممکن ہے کہ من گھڑت ہو لیکن یہ حقیقت ضرور ہے کہ عہدِ قدیم میں یہ شہر بت پرستی کا بہت بڑا مرکز تھا اور چوں کہ یونانی اور لاطینی زبانوں میں بت کے لیے آئی کن استعمال ہوتا ہے، اس لیے اسی لفظ کی رعایت سے شہر کا نام آئی کونیم ہو گیا۔

مسلمانوں کے عہد میں اس علاقے کو قونیہ کہا جانے لگا۔ اپنی ذاتی رائے تو یہ ہے کہ یہ لفظ آئی کونیم کا معرب ہے، لیکن کسی قدامت پسند ترک سے پوچھیے کہ اسے قونیہ کیوں کہتے ہیں تو وہ ایک

دل چسپ روایت سُنائے گا جو پرسی اس والی روایت سے کچھ کم عجیب نہیں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ یہ فرشتوں کی سرزمین ہے، اس لیے نہیں کہ وہاں مولانا رومی اور ان کے معتقد دوسرے صوفیائے کرام دفن ہیں، بلکہ اس لیے کہ آج سے صدیوں پہلے جبکہ بنی نوعِ انسان کو کرۂ ارض پر آباد ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا، دو ملائکۂ آسمانی نے بارگاہِ قدس میں حاضر ہو کر اجازت مانگی کہ ہمیں نئی مخلوق کی سرزمین پر جانے اور وہاں چندے قیام کرنے کی اجازت دی جائے۔ بارگاہِ الٰہی سے یہ درخواست قبول ہو گئی۔ فرشتوں کو پروانۂ راہداری مل گیا۔ وہ فضا میں پرواز کرتے، کائنات کی سیر کرتے کرۂ ارض پر اس جگہ اترے جہاں قونیہ آباد ہے۔ انھیں دنیا کے حالات کا کوئی علم نہیں تھا، اس لیے آسمانی رضامندی لینی ضروری تھی۔ انھوں نے ربّ العزت سے دریافت کیا "کیا ہم بیٹھ جائیں؟" غیب سے آواز آئی، "ہاں بیٹھ جاؤ۔" گویا ایک لمحے میں یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ملائکۂ آسمانی اسی جگہ رہنے لگے۔ انھوں نے اپنی قیام گاہ کا نام اس ابتدائی گفتگو کی رعایت سے "قونیہ" رکھا۔ قدیم یونانی زبان میں قونیہ کے لفظی معنے "بیٹھ جاؤ" ہیں۔ معلوم نہیں فرشتے یہ زبان آسمان ہی سے سیکھ کر آئے تھے یا اس درجہ ماہرِ لسانیات تھے کہ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہاں کی زبان بولنے لگے!

یکے بعد دیگرے قونیہ (آئی کونیم) حطیوں، فرائگیوں، سمیریوں، یونانیوں، رومیوں اور ایرانیوں کے زیرِ اقتدار رہا۔ رومیوں کے عہد میں سنٹ پال اور سنٹ برناباس جب انطاکیہ سے فرار ہوئے تو انھوں نے قونیہ ہی میں آکر دم لیا۔ سنٹ تھکلا نے جو بڑے مقدس ولی اور یونانی لاطینی عقیدے کے مطابق، ایک قابلِ تعظیم شہید سمجھے جاتے ہیں، قونیہ میں سنٹ پال سے براہِ راست درس لیا۔ اس طرح عہدِ قدیم ہی میں قونیہ نصرانیت کو فروغ دینے کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔

پھر، ۱۰۷۰ء میں یہ شہر سلجوقی سلطنت کا پایۂ تخت بن گیا جبکہ سلطان قلیج ارسلان عنانِ حکومت سنبھالے ہوئے تھا۔ ۱۲۲۰ء سے ۱۲۳۷ء تک سترہ سال کی مدت میں اس شہر کی شان و شوکت بڑے عروج پر پہنچ گئی۔ اس وقت سلطان علاء الدین کیقباد سریر آرائے سلطنت تھا۔ استنبول کے فاتح محمد دوم نے ۱۴۶۶ء میں قونیہ کو سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصہ بنا لیا۔

عرصۂ دراز تک سلجوقی سلطنت کا پایۂ تخت رہنے کی وجہ سے قونیہ میں بہت سی ایسی عمارتیں تعمیر ہوئیں جو تاریخی اعتبار سے اہم ہونے کے باعث آثار الصنادید میں شامل کر لی گئیں۔ مثلاً علاء الدین کی مسجد، جو اسی نام کی ایک پہاڑی علاء الدین تپیسی پر واقع ہے، اس علاقے میں مسلمانوں

کی قدیم ترین عبادت گاہ ہے جو زمانے کی دست بُرد سے بالکل بچی رہ گئی ہے۔ اس کی بنیاد مسعود اوّل نے رکھی تھی اور تکمیل ۱۲۲۱ء میں علاءُالدین کے عہد میں ہوئی۔

سلاطین سلجوقیہ کے بہت سے مقبرے بھی قابلِ دید ہیں۔ پرانے زمانے کے ایک مدرسے کی عمارت بھی مثالی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ اس کے در دیوار اور گنبدوں کے نیلے اور سیاہ رنگ میں جو نقاشی کی گئی ہے، وہ سلجوقی فن کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ بے نظیر بھی ہے۔ اس فن کی جھلک تک کسی اور جگہ نہیں ملتی۔

ایک سلجوقی وزیر فخرالدین علی کی ایک یونیورسٹی جو ۲۶-۱۲۲۵ء میں تعمیر ہوئی تھی اور جس کا معمار خالق بن عبداللہ تھا، اب بھی دنیا کو درسِ عبرت دیتی ہے۔ اس کا صدر دروازہ اور میناروں کے کچھ حصّے باقی رہ گئے ہیں۔ باقی عمارت ایک بار بجلی گرنے سے تباہ ہو چکی ہے۔ فنِ سنگتراشی کے اعتبار سے اس کی شہرت نزدیک و دور پھیلی ہوئی تھی۔

عثمانی عہد کی بھی کچھ مسجدیں اور دوسری عمارتیں ہنوز برقرار ہیں۔

قونیہ میں:- موٹر کار چلتے چلتے ایک دم رک گئی اور میرے مُطالعہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دریافت کرنے پر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ہم قونیہ کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور سڑک پر بیک وقت دو تین گھوڑا گاڑیوں کے سامنے آجانے سے راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ میں نے باہر نظر ڈالی تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ کوئی بہت بڑا تو نہیں مگر اچھا خاصا شہر ہے۔ بچتے بچاتے راستہ کاٹتے ذرا آگے بڑھے تو ایک بڑے چوراہے پر برکات صاحب کے ترک سکرٹری اردغوان صاحب ہمارے منتظر تھے۔ قریب کے ہوٹل میں چلنے کا فیصلہ ہم نے اس لیے کیا کہ اس طویل مسافت نے حال ذرا خراب ہی کر دیا تھا۔ نماز کے لیے وضو کرنا ضروری تھا، لیکن راستے کی گرد نے جو حال خراب کر دیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ کپڑے بدل لیے جائیں اور موقع ہو تو غسل بھی کر لیا جائے۔ اُدھر اذان ہو چکی تھی، وقت کم۔ ہوٹل والے نے صرف غسل اور وضو کے منھ مانگے پیسے لے لیے۔ شاید پندرہ روپے دینے پڑے تھے۔

نماز اور تقریر:- اردغوان صاحب کی راہبری سے ہم بغیر رکے اس مسجد کے قریب پہنچ گئے، جو مولانا رومی کے مقبرے سے متصل ہے اور انھی کے نام سے مشہور ہے۔ ہم نے گاڑی سڑک کے ہنگاموں سے بچا کر ایک طرف کھڑی کی، اسے باقاعدہ مقفّل کیا اور مسجد میں جو بہت وسیع ہے، داخل ہو گئے۔

ہم نے جوتے اتار کر دہلیز کے قریب ہی چھوڑ دیے۔ وہاں اور لوگوں نے بھی جوتے اتار رکھے تھے ہمیں یقین تھا کہ اس ملک میں مسجدوں سے جوتے چرانے کا مذموم رواج عام ہوا بھی تو کم سے کم ہمارے

جوتوں پر کوئی چور ہاتھ صاف نہیں کرے گا کیوں کہ ان کی وضع قطع سے یہ حقیقت ضرور اس پر ظاہر ہو جائے گی کہ یہ کسی ترک کے نہیں، غیر ملکی کے ہیں۔ میں اور بھائی جان معمول کے مطابق سلیم شاہی وضع کی دیسی جوتیاں پہنے ہوئے تھے جو دُور سے پہچانی جا سکتی تھیں اور کم سے کم ترکی میں نہیں مل سکتی تھیں، اس لیے ان کو چُرانے کے لیے حوصلہ درکار تھا۔ برکات صاحب عمدہ قسم کا نیا شو پہن کر آئے تھے۔ ان کا اندیشہ قرین قیاس ہو سکتا تھا لیکن جلدی میں انھوں نے پروا نہیں کی۔ جوتے دہلیز کے قریب اتار کر اندر داخل ہو گئے۔

ہمیں غسل اور وضو کرنے میں جو کچھ دیر ہوئی تو نماز کی ایک رکعت نکل گئی اور اس لیے دوسری رکعت کے عین رکوع کے وقت شامل ہونا پڑا، تاہم یہ بھی غنیمت تھا، اگر نماز ختم ہو چکتی تو بہت ہی ملال رہتا۔ اس روز موٹر چلانے میں برکات صاحب کی چابک دستی کام آ گئی۔

نماز سے فارغ ہو کر ہم نے دیکھا کہ لوگ ایک مکبّر کے قریب جمع ہیں اور ایک مولانا صاحب تقریر کرنے کے انداز میں اس پر کھڑے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ترک عموماً ڈاڑھی مونچھیں صاف کرتے ہیں اور سر پر انگریزی بال رکھتے ہیں لیکن بعض پرانے شہروں میں کچھ قدامت پسند لوگ فارغ البال نہیں ہوتے ہیں۔ ڈاڑھی کے ساتھ ساتھ زلفیں بھی بڑھاتے ہیں اور اگرچہ ۱۹۲۳ء کے انقلاب کے بعد سے صوفیوں کے لیے محفل سماع منعقد کر کے حال کھیلنا یا رقص کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے، تاہم صوفیوں کی صورت بنانا اور تصوف کے انداز میں باتیں کرنا ہرگز منع نہیں ہے، اس لیے وہ جو کہا ہے کہ چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے، یہاں بھی صادق آتا ہے۔ کچھ لوگ اس رسم دیرینہ پر تبدیلیٔ وضع تک عمل کرتے ہیں۔

ہم نے سوچا کہ لاؤ اس مجمع میں شامل ہو کر سنیں اور کچھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہاں کے لوگ ایسے موقعوں پر کن خیالات کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جب ہم اور قریب پہنچے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہم کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، جیسے کہ ان سب کو ہمارا ہی انتظار تھا اور ہم بھی گویا انھی کے دعوت پر وہاں پہنچے تھے۔

کچھ نے مصافحہ کرنے پر اکتفا کیا اور کچھ نہایت گرمجوشی کے ساتھ بغلگیر ہو گئے۔ خیر اس حد تک بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ بہرحال اسلامی روایات کا تقاضا تھا کہ ہم اجنبیت کے باوجود آپس میں خلوص و محبت سے ملیں لیکن اشاروں میں ہم سے اور بھی فرمائش ہونے لگی جس پر میں ذرا گھبرایا اور برکات صاحب سے پوچھا کہ آخر مطلب کیا ہے۔ برکات صاحب نے فوراً اسی جملے

کا ترکی میں ترجمہ کردیا۔ جواب ملا کہ چوں کہ آپ حضرات لباس وغیرہ سے پاکستانی بھائی معلوم ہوتے ہیں اس لیے آج تقریر کرنے والوں میں پہلا نمبر آپ ہی کو دیا جائے گا۔ ہماری درخواست آپ قبول کرلیں۔

بھائی جان نے مجبوری ظاہر کی اور ساتھ ہی مجھے ہدایت کی کہ تم انکار نہ کرنا۔ چند جملے کہہ دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ مایوس ہو کر یہ لوگ ہماری بابت کوئی بُری رائے قائم نہ کریں۔ بس چند ہی الفاظ ادا کرکے بھرم قائم رکھ لو۔ بھائی جان کے حکم کی تعمیل نہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

لیکن بہت مشکل مسئلہ تھا "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم" والی مثل یہاں لفظ بہ لفظ صادق آتی تھی۔ چناں چہ اسی بنیاد پر معذرت چاہی، مگر لوگ نہ مانے۔ برابر اصرار کرتے رہے۔

آخر کار مجھے ممبر پر چڑھ کر بغیر سوچے سمجھے سلسلۂ تقریر شروع کر دینا پڑا۔ میں نے ان لوگوں کے خلوص کی تعریف کی۔ انقلاب کے بعد سے جو ترقیاں اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی اعتبار سے رونما ہوئی ہیں، ان کو سراہا۔ انھیں بتایا کہ جس طرح ترکی میں غازی مصطفےٰ کمال کو اتاترک کہا جاتا ہے، ہم بھی قائدِاعظم محمد علی جناح کو بابائے ملت کہتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کا احترام کرتے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ جس طرح اتاترک یورپ میں ترک مسلمانوں کے نجات دہندہ سمجھے جاتے ہیں، ایشیا میں محمد علی جناح مسلمانانِ برصغیر کے لیے یہی درجہ رکھتے ہیں۔ میں نے تاریخ کا سرسری حوالہ دیتے ہوئے یاد دلایا کہ جب بھی ترکوں پر کوئی مصیبت آئی ہے، پاکستان کے باشندے بیتاب اور پریشان ہوگئے ہیں اور ہمیں اعتراف ہے کہ پاکستانیوں کی مصیبت و پریشانی کے وقت اہلِ ترکی نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا ہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو امداد دی ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے قول و فعل سے ثابت کردیا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے درمیانی تفاوت کے باوجود ایک قریبی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ دونوں کے دل ایک ہی جذبے کے ماتحت دھڑکتے ہیں، گویا دو قالب اور ایک جان ہیں۔

میں نے مختصر الفاظ میں اپنا اور بھائی جان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ترکی آنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اس قدیم تاریخی ملک کی سیاحت کرنے کے علاوہ یہاں کے طبّی ادارے دیکھیں، اور معلوم کریں کہ یہاں مشرقی طب کا کس حد تک چرچا ہے۔ نیز یہ کہ یہاں کے طبیبوں نے خود اس میدان میں کتنی ترقی کی ہے۔ قونیہ آنے کا مقصد بھی بتایا کہ برصغیر پاک و ہند کے باشندے مولانا رومی کے صوفیانہ کلام سے بے حد متاثر ہیں اور ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اسی جوشِ عقیدت میں ہم لوگ زیارت کے لیے آئے ہیں اور شام ہونے سے پہلے انقرہ لوٹ جانا چاہتے ہیں، جہاں

درحقیقت ہمارا فی الوقت قیام ہے۔

میں آہستہ آہستہ تقریر کر رہا تھا اور برکات صاحب ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے جا رہے تھے۔ یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی ہم نے تنگیٔ وقت کے باعث مجبوری ظاہر کرتے ہوئے رخصت چاہی تاکہ مقبرہ کی زیارت کریں اور اس سے متصل عجائب گھر کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔

وہاں سے رخصت ہو کر ہم مسجد کے صدر دروازے پر آئے تو کچھ پریشان سے ہوئے کیوں کہ برکات صاحب کے نئے جوتے تو موجود تھے لیکن ہم دونوں بھائیوں کی زیادہ استعمال شدہ جوتیاں غائب تھیں۔ پریشانی یہ تھی کہ ننگے پاؤں موٹر تک جائیں تو لوگ اس حالت میں دیکھ کر ہم پر ہنسیں گے اور جب کسی بازار میں نئے جوتے خریدنے کے لیے کار میں سے اتریں گے تو دکان دار کیا رائے قائم کرے گا۔ جگہ جگہ اپنی اس بیچارگی کی صفائی پیش کرنی پڑے گی۔ ہمیں تعجب بھی تھا کہ اس ملک میں عام لوگوں کا کردار بہت اچھا ہے۔ چوری کی واردات بہت کم ہوتی ہیں۔ پھر یہ غیر متوقع حادثہ ہوا بھی تو مسجد میں، نمازِ جمعہ کے بعد اور وہ بھی ہم جیسے اجنبی کے ساتھ۔ اور جبکہ جوتیاں زیادہ قیمتی بھی نہیں تھیں۔

تاہم ہماری پریشانی اور استعجاب کا سلسلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ایک صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر دو جوڑے ہمیں تھما دیے اور ترکی زبان میں کچھ کہا۔ برکات صاحب نے فوراً ترجمہ کیا۔ ہم حیران رہ گئے۔ اس شخص نے جو قریب کے بازار میں جفت فروش ہے، ہم کو جوتوں کے دو نئے جوڑے پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری جوتیاں اٹھا کر محفوظ کر لی گئی ہیں اور شہر میں اس عجائب گھر میں رکھ دی جائیں گی، جہاں غیر ملکی سیاحوں سے حاصل کی ہوئی ان کے ملک کی نادر اشیا کی نمائش کی جاتی ہے۔

ہر چند ہم نے کہا کہ یہ جوتیاں نادر نہیں ہیں، ہم وطن جا کر کسی طرح نئے جوڑے بھیج دیں گے لیکن وہ شخص نہ مانا۔ اس نے کہا کہ ہم نے یہ نمونہ آج تک نہیں دیکھا۔ ہمارے عجائب گھر میں اس سے ایک نیا اضافہ ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اس عجائب گھر کی خصوصیت یہی ہے کہ وہاں ہر ملک کی وہی چیزیں محفوظ کی جاتی ہیں جن پر بالکل مقامی ہونے کا ٹھپہ لگ سکے۔ پھر ہم نے کوشش کی کہ اُن نئے جوتوں کی قیمت ادا کر دیں تو اس شخص نے ایسا ظاہر کیا جیسے ہماری اس غیر متوقع تجویز سے اس کو دکھ پہنچا ہو۔ لہٰذا ہمیں خاموش ہو جانا پڑا۔

بھائی جان کا جوتا ان کے پاؤں میں ٹھیک تھا، لیکن میرا کسی قدر پنجہ دباتا تھا اس لیے دکاندا

نے فوراً دوسرا جوڑا منگوا دیا۔ ہم کو بتایا گیا کہ اس وضع قطع کے جوتے ترکی میں عام طور پر سات سو سال پہلے یعنی مولانا رومی کے عہد میں رائج تھے لیکن اب ان کا رواج نہیں رہا ہے۔ لہٰذا سیاحوں کو سوغات کی صورت میں وہی پیش کیے جاتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال تو مجبوراً انکو پہن لیں گے لیکن وطن پہنچ کر ان کو بطور یادگار اپنے پاس محفوظ کر لیں گے۔

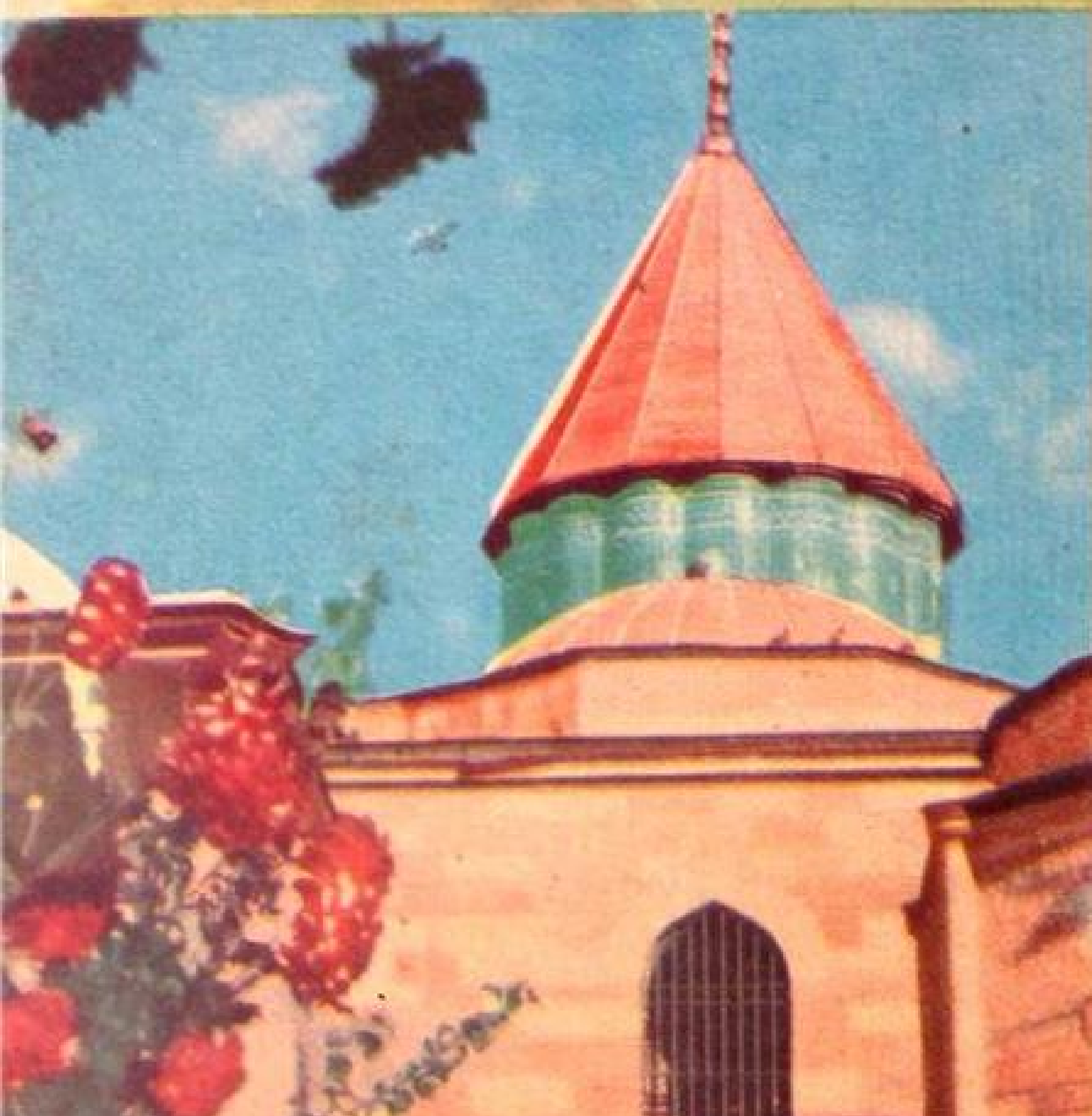
رومی کی قیام گاہ: مسجد سے کچھ فاصلے پر مولانا رومی کی وہ قیام گاہ ہے جہاں انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ گزارا، جہاں شمس تبریز سے پہلی ملاقات ہوئی اور ایک سال سے کچھ زیادہ مدت تک ان کے ساتھ رہے۔ وہیں صلاح الدین زرکوب کے ساتھ نشست و برخاست کا سلسلہ رہا۔ وہیں رہ کر مثنوی و جملہ غزلیات قلمبند کیں اور پھر اس کے قریب ہی دفن کر دیے گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی قیام گاہ ان کے مسلک میں داخل صوفیوں اور درویشوں کی خانقاہ بن گئی، جہاں رات دن محفلِ سماع منعقد رہا کرتی، دور دراز سے ان کے معتقدین وہاں آکر محفلوں میں شریک ہوتے، اور وجدانی کیفیت طاری ہونے پر رقص کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ فدایانِ طریقت کے اطوار میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور مقدس مشاغل میں ذمیم پہلو جھلک دکھانے لگے۔ درویشوں کی صف میں وہ لوگ بھی آکھڑے ہوتے جو محض نفس پرست اور زمانہ ساز تھے۔ تصوف سے دلی لگاؤ کسی کو نہ رہا۔ خواہشات کے بندے سب بن گئے۔ یہاں تک کہ نیک لوگوں نے اس طرف سے گزرنا ترک کر دیا۔ والدین کوشش کرنے لگے کہ ان کے کم سن بچے اس مقام کے قریب بھی پھٹکنے نہ پائیں۔ اظہارِ عقیدت کا ڈھونگ رچانے والے دراصل مولانا رومی کے پاک نام پر حرف لانے لگے۔

سلاطینِ عثمانیہ کی اپنی نجی محفلوں میں بھی یہی رنگ رلیاں ہوتی تھیں۔ اصلاح کا پہلو کس طرح نکلتا حتیٰ کہ جب جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا تو اس نے تمام خرافات کو نہ صرف روکا بلکہ قانوناً ممنوع قرار دیا۔ تمام نیک نہاد صوفیوں اور درویشوں کو وہاں سے چلتا کیا اور جس نے ذرا آناکانی کی، اس کی طبیعت باقاعدہ درست کر دی گئی۔ سُنا ہے کہ اس حلقے کے بعض بدچلن لوگوں کو ان کے جرائم کے مطابق سزائیں بھی دی گئیں۔ لنگر خانے کے دروازے بھی سابقہ مکروہات کے اعتبار سے بند کر دیے گئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ نئی حکومت کو مولانا رومی جیسی مقدس ہستی سے کوئی پرخاش تھی بلکہ دنیا سے ان کا صحیح احترام کرانے کے لیے اس نے خانقاہ کو ایک اعلیٰ عجائب گھر میں بدل دیا۔ اس میں تعمیری اعتبار سے مناسب اضافے کیے۔ مقبرے کی عمارت اور مقبرے کے تعویذ کو



قونیہ میں مولانا رومیؒ کا
مقبرہ اور مسجد



مولانا رومیؒ کے نوادر کا
عجائب گھر



قونیہ کی ایک صنعت ــــ قالین سازی
→

بھی درست کرایا اور سارے ماحول کو اس لائق کر دیا کہ غیر ملکی سیاح وہاں آ کر مولانا رومی سے عقیدت پیدا کر سکیں اور جنھیں پہلے سے عقیدت ہے وہ اسے غیر فانی بنا سکیں، ورنہ اس سے پہلے اکثر سیاح وہاں آ کر مایوس ہوتے اور بُری رائے قائم کر کے جاتے تھے۔ یا بصورتِ دیگر وہاں کے لہو و لعب میں شریک ہو کر عام مسلمانوں کے بارے میں غلط نظریہ قائم کر لیتے تھے۔

مقبرہ: ۔ مقبرہ بنیادی اعتبار سے پرانی وضع کا ہے، لیکن جدید انداز میں اس کی ٹیپ ٹاپ اور آرائش کر دی گئی ہے۔ دیواروں کی نقاشی عہدِ قدیم کی یاد دلاتی ہے تو قبر کا غلاف عہدِ جدید کی عکاسی کرتا ہے۔ حکومت کی طرف سے ایک مجاور متعین ہے جسے سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی ہے۔ زائرین کی بخششوں پر اس کا گزارا نہیں ہوتا۔ حکومت جب چاہے اسے بدل سکتی ہے۔ عمر بھر کا ٹھیکہ اس کے نام کا نہیں لکھا ہے۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور چند لمحے کے لیے ایک کونے میں خاموش کھڑے ہو گئے اور اس وقت کو یاد کرنے لگے جب مولانا رومی اور شمس تبریز اس عالم میں سارا سارا دن گزار دیتے ہوں گے۔ استغراق و محویت کی اس مختصر مدت میں جو سکون و راحت اور طمانیتِ قلب ہمیں حاصل ہوئی، اس کا اظہار مشکل ہے۔

اگر ہم اتنا طویل سفر طے کر کے نہ آتے، واپس جانے کی جلدی نہ ہوتی، اس شہر کے بازاروں سے پوری طرح واقف ہوتے تو ضرور پھولوں کی چادر خرید کر مزار پر چڑھاتے، اگر کی بتیاں اور لوبان روشن کرتے، در و دیوار پر عرق گلاب چھڑکتے، لیکن دیکھا جائے تو ہم نے جس خلوص و عقیدت کے ساتھ اپنے پروگرام میں اس زیارت کی گنجائش رکھی تھی، اس کے مقابلے میں پھولوں کی چادر زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مقبرے کی حدود میں اور اس کے آس پاس غالباً ان کے مریدوں کی بہت سی قبریں موجود ہیں۔ ایک عجیب بات ہم نے یہ دیکھی کہ قبروں کے سرہانے کتبوں کے بجائے ڈنڈے زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور ان کے بالائی سروں پر عمامے لٹک رہے ہیں۔ یہ رموزِ تصوف کا ایسا پہلو ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پاسِ ادب کے اعتبار سے کسی سے دریافت کرنا بھی مناسب نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم نے دہلی میں متعدد مقامات پر اور دو ایک جگہ کراچی میں یہ تو دیکھا ہے کہ کسی بزرگ کے مزار کے قریب بانس گاڑ کر مٹی کی ہنڈیاں منت کے طور پر ان کے ساتھ آویزاں کر دیں، لیکن عمامے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے۔ یہ مرنے والے کی نشانی ہوتے ہیں اور لگے لگے بوسیدہ ہو کر جھڑ جھڑ ہو جاتے ہیں مگر کوئی انھیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی سب قبریں مردوں کی ہوتی ہیں اور چوں کہ خواتین کے لیے صوفیائے کرام کے مسلک میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ

عورتوں کی قبروں پر ڈنڈے گاڑ کر کیا چیز لٹکائی جاتی ہوگی۔

عجائب گھر میں جو کبھی خانقاہ رہا ہے، وہ تمام نوادر جمع ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے مولانا رومی یا ان کے بہت ہی مقرب و محبوب ہم جلیسوں کی زندگی سے متعلق رہے ہیں۔ ایک شوکیس میں مکمل لباس کی نمائش کے علاوہ سات سو سال پرانا بستر بھی اس طرح بچھا ہوا ہے جیسے مولانا رومی ابھی اُٹھ کر کہیں تشریف لے گئے ہیں۔ ان کی تسبیح و مصلّیٰ، روزمرہ کے استعمال کے بعض برتن، کلام کے اصل مسودے اور دوسری تحریریں وغیرہ محفوظ ہیں۔ شمس تبریز اور صلاح الدین زرکوب کے لباس و کلاہ کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

عجائب گھر کے لیے بھی سرکاری طور پر ایک اہلکار متعین ہے جو سیاحوں کے استفسار پر ہر چیز کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتا اور تفصیل بیان کرتا ہے۔

ایک کمرے میں پرانے زمانے کے وہ تمام برتن وغیرہ موجود ہیں جو خانقاہ کے لنگر خانے میں استعمال ہوتے تھے۔ باورچی خانے کے باہر دہلیز کے قریب وہ گوشہ دیکھا جو "مقامِ آزمائش" کہلاتا تھا۔ رسم تھی کہ حلقۂ صوفیا میں داخل ہونے سے پہلے ہر شخص کو باورچی خانے کے دروازے کے پاس چالیس دن تک نہایت صبر و ضبط سے کام لے کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اسے انواع و اقسام کے مزے دار کھانوں کی خوشبو برابر آتی رہتی لیکن وہ لذتِ کام و دہن حاصل کرنے سے اتنی مدت تک محروم رہتا۔ آزمائش کے یہ دن بخیر و خوبی گزار دینے کے بعد اسے داخلے کا اجازت نامہ مل جاتا تھا۔ اگر اس دوران میں وہ بھول کر بھی حرص و طمع یا بے صبری کا اظہار کرتا تو پچھلی محنت ضائع جاتی اور نئے سرے سے چلّہ کھینچنا پڑتا اور اگر دو چار دفعہ یہ لغزش ہو جاتی تو ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ کر دیا جاتا۔

واپسی:- کافی وقت گزر چکا تھا، اس لیے واپس چلنے کی تیاری کی۔ اس بار میں نے آگے بڑھ کر "عنانِ موٹر" سنبھال لی تاکہ آتے وقت مطالعہ میں بے حد مصروف ہو جانے کے باعث اپنا جو کوٹا رہ گیا تھا، اسے پورا کر دوں، بلکہ ممکن ہو تو انقرہ تک خود ہی گاڑی چلاتے جاؤں۔

دن ڈھل رہا تھا اور سہانے موسم کی کیفیات پیدا ہو چلی تھیں۔ اس سمے موٹر چلانا کسی کو بھی گراں نہیں گزرتا، بلکہ لطف آتا ہے۔

برکات صاحب کی کوٹھی پر موٹر پہنچی تو نماز مغرب قضا ہو چکی تھی۔ ان کی بیگم اور بچے برآمدے میں کھڑے بیتابی سے ہم سب کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں تو کمرے کے اندر جاتے ہی بے حال ہو کر صوفے پر گر پڑا۔ تقریباً چار گھنٹے مسلسل گاڑی چلانے کے باعث شانوں میں درد ہو رہا تھا،



روز و شب در سماع رقصاں شد
بر زمیں ہمچو چرخ گرداں شد
یک زماں بے سماع و رقص نبود
روز و شب لحظۂ نمی آسود

اور نگاہ اِدھر اُدھر نہ ہٹانے کی وجہ سے آنکھیں پتھرا سی رہی تھیں - اور سر گھوم رہا تھا -

تاہم بھوک لگ رہی تھی۔ ہم سب کی آنکھیں قل ہو اللہ سی نہیں، تمام پارۂ عم ختم کر چکی تھیں، اس لیے سب نے فیصلہ کیا کہ کچھ ٹھیر کر غسل کیا جائے اور کھانا کھانے کے بعد چند ریکارڈ سنیں تاکہ اعضاء کا کھچاؤ ڈھیلا پڑ جائے - میں گرمی جاڑے ٹھنڈے پانی سے نہانے کا عادی ہوں لیکن برکات صاحب نے مشورہ ہی نہیں دیا، بلکہ اس وقت گرم پانی استعمال کرنے کے لیے مجبور کر دیا - بھائی جان نے خلافِ معمول ٹھنڈے پانی ہی سے غسل کرنا مناسب سمجھا - لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت گرم پانی نے میرے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا - جوڑ جوڑ کھل گیا اور میں تازگی سی محسوس کرنے لگا -

آج کے کھانے میں بیگم برکات نے ابتدا ایک لذیذ شوربے سے کی جو گاجر اور کھیرے کے قتلے جوش دے کر اور دہی اور انڈوں کی زردی پھینٹ کر ملانے سے تیار کیا جاتا ہے - نمک کے علاوہ کالی مرچ، زیرہ اور ادرک سے اس میں ذائقہ پیدا کیا گیا تھا۔ بعض لوگ اس شوربے میں مکھن بھی شامل کرتے ہیں لیکن بیگم برکات کی رائے صحیح ہے کہ شوربے کی سطح پر چکنائی کی ضرورت سے زیادہ تہہ ذوقِ نظر پر بار گزرتی ہے۔ صرف معمولی ترمراہٹ گوارا کی جا سکتی ہے - اس لیے انھوں نے مکھن سے اجتناب کیا تھا -

میں اس شوربے کی تین پیالیاں پی گیا، جس سے جسم میں بڑی توانائی آئی اور بھوک خوب کھُل گئی پھر جو ہم سب نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارا ہے تو ذرا سی دیر میں سب ڈشیں خالی کر دیں - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم صبح سے نہیں، کئی دن سے بھوکے ہیں -

کھانے سے فراغت پانے کے بعد بیگم صبیحہ برکات نے، جو بڑی نباضِ فطرت معلوم ہوتی ہیں، یہ سوچ کر کہ ہم قونیہ کی زیارت سے واپس آئے ہیں، مولانا رومی کی ایک غزل کا ریکارڈ شروع کر دیا جو قوالی کے رنگ کی ہے اور ملک کے ایک مشہور مغنّی حسن فرید النار نے اپنے سازینہ کے ساتھ والہانہ انداز میں گائی ہے - اگرچہ صوفیانہ طرز میں سماع کی محفلیں خصوصاً مقبروں اور خانقاہوں میں ممنوع قرار دے دی گئی ہیں، تاہم چھوٹی چھوٹی صحبتوں پر یا قوالی کے ریکارڈوں پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے - چناں چہ صاحبانِ ذوق انھی سے دل بہلاتے اور اپنے کمروں کی چار دیواری میں سُن سُنا کر اور رقص فرما کر اپنا ذوق پورا کر لیتے ہیں - ہم نے جس غزل کا ریکارڈ سُنا، اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

اے عاشقاں، اے عاشقاں! ہنگامِ کوچ است از جہاں

در گوشِ جانم میرسد، طبلِ رحیل از آسماں

نک، سار باں برخاستہ، قطار ہا آراستہ

ازما حلالی خواستہ، چہ خفتہ اید اے کارداں

اے دل، سوئے دلدار شو، اے یار سوئے یار شو

اے پاسباں بیدار شو، خفتہ نشاید پاسباں

ہر سوئے بانگ و مشغلہ، ہر کوئے شمع و مشعلہ

کامشب جہانِ حاملہ، زاید جہانِ جاوداں

یہی ریکارڈ دوبار سننے پر اکتفا کیا کیوں کہ کسی اور گیت سے وہ کیفیت زائل کرنی نہیں چاہتے تھے جو ہم پر طاری ہو چلی تھی۔ اگلے روز ذرا سویرے اٹھنا بھی تھا، اس لیے خواب گاہ میں جانے کی تیاری کرلی۔ دوسرے دن کا پروگرام بھائی جان کے پاس پہلے سے مرتب کیا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے بڑا اطمینان تھا۔ اب انقرہ میں چند معزز ہستیوں سے ملنا ملانا اور چند ادارے دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔

۲۵ اگست ــــــ ہفتہ

مُلاقاتیں

آج کا پروگرام بھی باقی دنوں کی طرح پہلے سے بنا لیا گیا تھا، پھر بھی کچھ ترمیمیں ترکی آنے کے بعد برکات صاحب کے مشورے سے کرنی پڑ گئیں۔ ہم نے انقرہ دیکھ لیا تھا اور انقرہ سے قونیہ جا کر کچھ روحانی قوت بھی حاصل کر چکے تھے۔ البتہ ترکی کے اربابِ حل و عقد میں سے اب تک کسی سے ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا یا یوں کہیے کہ ان سے ملنا ہمارے اب تک کے پروگرام میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ سب نے ملاقات کے لیے ایک ہی دن معین کیا۔ ممکن ہے، اس ملک میں ہفتے کا دن اس مقصد کے لیے اچھا سمجھا جاتا ہو، شاید اس لیے کہ اس روز سرکاری دفتروں میں عموماً کم کام کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے روز تعطیل منانے کی کیفیت لوگوں کے دل و دماغ پر اسی وقت سے طاری ہونے لگتی ہے۔ سرکاری دفاتر ہی نہیں، اکثر تجارتی ادارے بھی ہفتے کو آدھے دن سے بند ہونے لگتے ہیں، گویا تیزی سے کام کرنے کا زور جمعہ ہی کو ٹوٹ چکتا ہے۔

اگرچہ ہماری فہرست میں سب سے اُوپر غازی عصمت انونو اور خالدہ ادیب خانم کے نام درج تھے، لیکن اُن سے ملاقات کے اوقات بعد دوپہر مقرر ہوئے۔ عصمت انونو کی قیام گاہ پر ہمیں قاسم گلک کے ہمراہ جانا تھا جو مجلس کبیر ملّی میں حزب مخالف کے نائب قائد ہیں اور ہمیشہ سے عصمت انونو کے خاص معتمد رہے ہیں۔ چناں چہ اتاترک کے دستِ راست سے ملاقات کا تصفیہ انھی کی معرفت بلکہ ان کی ذاتی مرضی سے ہوا تھا۔

فہرست میں تیسرے اور چوتھے نمبر پر صدر ترکی جلال بایار اور وزیر اعظم عدنان مندریز کے نام درج تھے۔ ان سے نو اور دس بجے کے درمیان ملنے کے اوقات مقرر ہوئے تھے لیکن دو تین روز پہلے کے سیاسی حالات نے اس امکان کو ناممکنات میں شامل کر دیا۔ کچھ باہمی اختلافات کی بنیاد پر وزیر مالیات ندیم اوکمن نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی وزیر اعظم کو اٹھانا پڑ گیا۔ دوسرے یہ کہ صدر جمہوریت اور وزیر اعظم اس استعفے سے

صرف دو روز پہلے ازمیر کے صنعتی میلے سے واپس آئے تھے۔ خود صدر نے اس میلے کا افتتاح کیا تھا۔

ان مصروفیات اور سیاسی الجھنوں کا لازمہ نتیجہ یہی تھا کہ وہ پہلے سے طے شدہ ملاقاتیں منسوخ کردیں۔ چناں چہ اس بارے میں دونوں کے سکریٹریوں نے برکات صاحب کو اپنی اپنی مجبوری سے مطلع کر کے معذرت چاہی تھی۔ ہمیں صدر جمہوریت سے ملنے کا خاص طور پر اشتیاق تھا۔

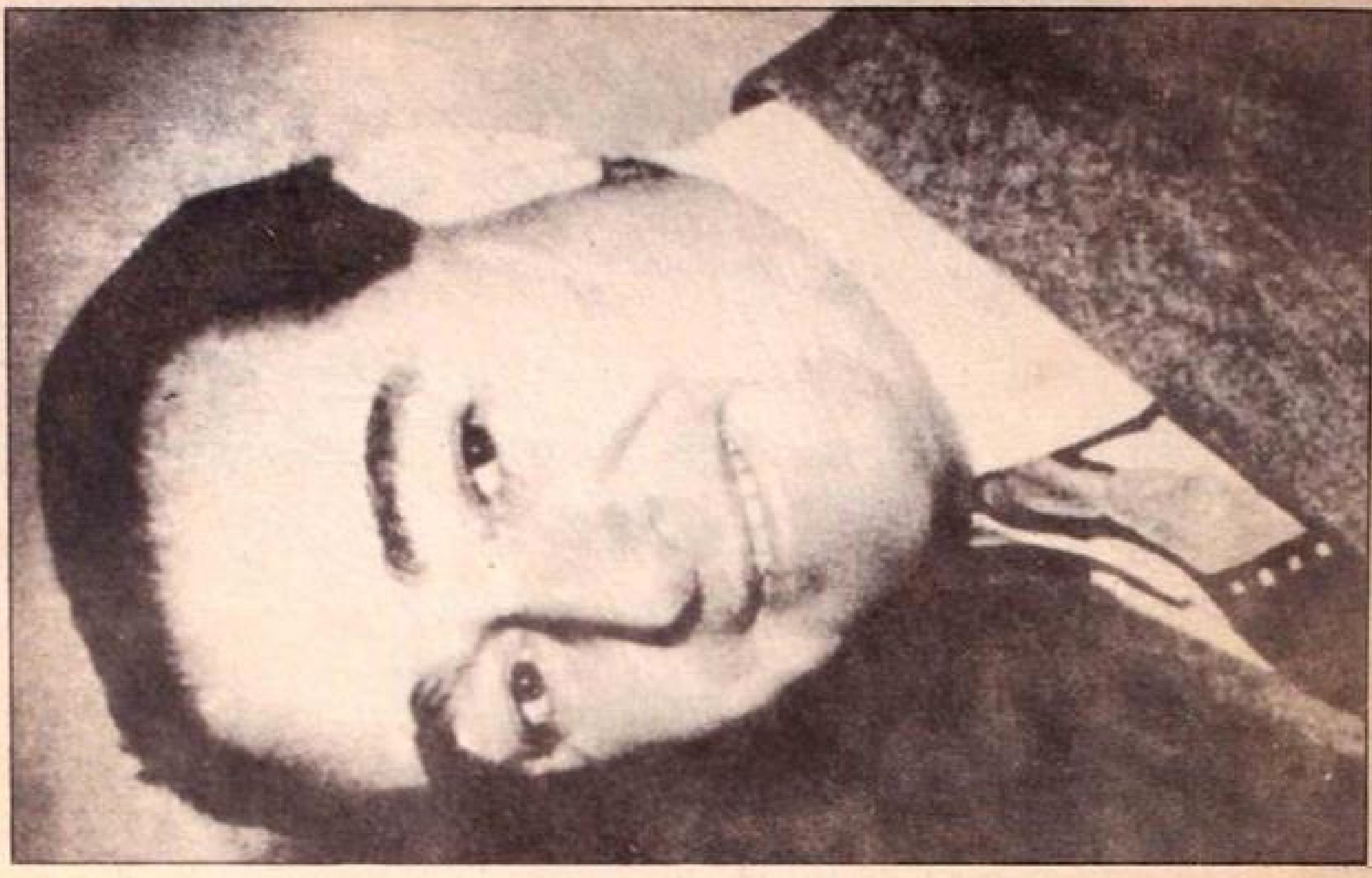
جلال بایار: محمود جلال بایار ترکی جمہوریت کے تیسرے صدر ہیں۔ وہ صوبہ برسہ کے ایک گاؤں عمر بے میں ۱۵ مئی ۱۸۸۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ عہدِ بچپن سرزمین وطن پر گزارا اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم اس مدرسے میں حاصل کی جس کے صدر الاساتذہ خود ان کے والد عبداللہ فہمی تھے۔ گھرانے کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی، اس لیے ضروری تھا کہ یہ جلد کوئی روزگار حاصل کریں۔ اس لیے یکے بعد دیگرے دو مقامی کمپنیوں میں ملازمت کر لینی پڑی۔ دوسری کمپنی قریب کے ایک ضلع میں تمباکو کی اجارہ داری سے تعلق رکھتی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس مشغلے کو چھوڑ کر اور اپنے افقِ نظر کو زیادہ وسیع کرنے کے خیال سے شہر برسہ چلے گئے۔ وہاں ترکی کے زراعتی بنک کے عملے کے لیے ایک امتحان ہورہا تھا جس میں وہ شامل ہوئے اور کامیاب ہو کر فوراً ملازم ہو گئے۔ وہیں رہتے ہوئے جبکہ ان کی عمر ۲۰ سال تھی، انھوں نے شادی بھی کر لی۔

۱۹۰۵ء میں وہ جرمن بنک میں چلے گئے جہاں ترقی دے کر ان کو مینجر بنا دیا گیا۔

اس وقت کے سبھی نوجوانوں میں سلاطینِ ترکی کے ظالمانہ برتاؤ اور ناقص نظامِ حکومت کے خلاف بغاوت کا مادہ پھیل رہا تھا۔ جلال بایار بھی قدرتی طور پر اس قسم کی تحریک سے الگ نہ رہ سکے۔ چناں چہ اس مقصد کی تحصیل کے لیے جب انجمن اتحاد و ترقی کی بنیاد پڑی تو وہ پُرجوش کارکنوں کی صف میں پیش پیش تھے اور ازمیر جیسے اہم صوبے میں ان کو انجمن کا ایگزیکٹو سکریٹری بنا دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔

۱۹۱۴ء میں انھوں نے ریلوے میں کام کرنے والوں کے لیے ایک نجی تربیتی مدرسہ قائم کیا۔ یہ یقیناً ایک ایسا کارنامہ تھا جسے قابلِ تعریف کہا جا سکتا ہو۔ ترکی ریلوے کی تاریخ میں اس کا ذکر اب بھی اچھے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم میں جب عثمانی حکومت کو شکست ہو گئی تو نوجوانوں نے اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا شروع کیا، چنانچہ ۱۹۱۸ء میں عثمانی حقوق کے دفاع کے لیے جو انجمن قائم ہوئی تھی، اس کا سہرا بڑی حد تک جلال بایار کے سر تھا لیکن اس انجمن کے





مقاصد کچھ اتنے مبہم اور اس کا طریق کار کچھ ایسا مشکوک تھا کہ اسے زیادہ حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ اپنے بہت سے ساتھیوں کے عام رجحانات کے ذرا برعکس ان میں شہنشاہیت پسندی کا بھی کچھ مادہ پایا جاتا تھا اور اس وقت کے حکمراں سے وہ بدظن تھے۔ چناں چہ ۱۹۱۹ء میں ایوانِ حکومت کے لیے جو انتخابات ہوئے، ان میں وہ شریک ہوئے اور منتخب ہو کر استنبول چلے گئے اور اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ چناں چہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۰ء کو جو آخری اجلاس اس ایوان کا ہوا، اس میں بھی وہ شامل تھے۔

اسی سال ماہ مئی میں جب حکومت سے باغی نوجوانوں نے انقرہ میں آزاد عارضی مجلسِ ملی قائم کی تو بایار فوراً وہاں جا کر اس میں بھی شامل ہو گئے۔ اسی موقع پر انقرہ میں پہلی بار انکی ملاقات مصطفےٰ کمال پاشا اور جنرل عصمت انونو سے ہوئی۔ اوّل الذکر مجلسِ ملی کے رُوحِ رواں اور صدر تھے۔ اپنی قابلیت اور ذہانت کی بنا پر جلال بایار نے بہت جلد اکثر لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا اور وہ مجلسِ ملی کے ماتحت اقتصادی امور کی کمیٹی کے سکریٹری بنا دیے گئے۔ وزارتِ اقتصادیات ہی سے وابستہ رہتے ہوئے انھوں نے غیر ملکوں کا دورہ کیا اور اپنی انتظامی صلاحیتوں سے نام ونمود حاصل کر لیا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ایک پارلیمانی وفد کتاہیہ بھیجا گیا تو وہ اس کے سربراہ بنائے گئے۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ مغربی محاذ پر جو عناصر قوم پرست فوجوں میں اِنتشار پھیلا رہے تھے، ان کو دور کیا جائے۔ وہ اپنے فرائض کی تکمیل میں کامیاب رہے۔

اگلے سال ان کو وزیر اقتصادیات بنا دیا گیا۔

فروری سے اپریل ۱۹۲۲ء تک وہ قائم مقام وزیر امورِ خارجہ بھی رہے اور انھی دنوں جب قیامِ امن کے نام پر پہلی لوازن کانفرنس عمل میں آئی تو وہ برطانیہ جانے والے ترکی وفد کے مشیر تھے۔

۱۹۲۳ء میں عام انتخابات ہوئے تو وہ ایک بار پھر ازمیر کے علاقے سے مجلسِ ملی کے لیے منتخب ہو کر آگئے اور اسی سال جب جمہوریت قائم ہوئی تو ترکی کے سرکاری بنک کی تنظیم میں مصروف ہو گئے اور ۱۹۳۲ء تک اس کے ترقیاتی کاموں میں شریک رہے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کابینہ میں شامل ہو کر وزیر اقتصادیات ہو گئے اور پانچ سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۳۷ء میں عارضی طور پر وزارتِ عظمیٰ کی ذمّے داریاں انھیں سونپ دی گئیں کیونکہ عصمت انونو کچھ عرصے کے لیے اس منصب سے الگ ہو گئے تھے۔

۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک کا انتقال ہوگیا تو ترکی کی دنیا کچھ بدلنے سی لگی۔ مجلس کبیر ملی نے عصمت انونو کو دوسرا صدر منتخب کیا اور انھوں نے جلال بایار سے جو اس موقع پر قانون کے مطابق اپنی کابینہ کا استعفیٰ پیش کر چکے تھے، دوبارہ کابینہ کی تشکیل کے لیے کہا۔ انھوں نے کابینہ بنا تو لی، لیکن چونکہ عصمت انونو سے پرخاش تھی، اس لیے وہ اس صورتِ حالات سے مطمئن نہیں رہ سکے اور کچھ ہی عرصے بعد انھوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء کو وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اپنے ہم خیال ساتھیوں سے مل کر ترکی میں ڈیموکریٹک نظام قائم کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ملک کی واحد سیاسی جماعت — ری پبلیکن پیپلز پارٹی سے بھی علیحدگی اختیار کر لی جس کے روحِ رواں عصمت انونو تھے۔

چونکہ اسی سال دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی اور یورپ میں فتح و شکست کے نت نئے نقشے بدلنے لگے، اس لیے ان سب مخالفین حکومت نے خاموشی اختیار کیے رہنا مناسب سمجھا۔ تقاضائے وقت بھی تھا۔ وہ اور ان کے ساتھی چاہتے تھے کہ ساری ذمّہ داری حکومتِ وقت کے سر رہے۔ آثار بتا رہے تھے کہ جرمن فوجوں کے سامنے جو حشر یورپ اور بہت سے ملکوں کا ہو رہا ہے، وہی ترکی کا بھی ہوگا۔ یہ کون جانتا تھا کہ ترکی اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھ کر اس دورِ آشوب سے صاف بچ نکلے گا۔

۱۹۴۶ء میں جلال بایار نے رفیق کورالتن، عدنان مندریز اور فواد کوپرولو کے تعاون سے ڈیموکریٹک پارٹی قائم کر لی۔

چار سال تک یہ لوگ اپنی جماعت کو مستحکم کرنے میں مصروف رہے اور جب ۱۹۵۰ء میں عام انتخابات کا وقت قریب آیا تو حکومتِ وقت کے خلاف ہر ممکن طریقے سے پرچار کرنے لگے۔ اگرچہ اس وقت کی حکومت بھی اصولاً مذہب کے خلاف نہیں تھی، بلکہ شروع دن سے ان مولویوں، صوفیوں اور سجادہ نشینوں کے بے جا منصب و اقتدار کو ختم کر دینے کے درپے رہی تھی، اس لیے قدرتی طور پر قدامت پسندوں کا ایک بڑا طبقہ اس کے خلاف تھا اور جب حزبِ مخالف نے یقین دلایا کہ عثمانی عہد کی تمام "برکتیں" دوبارہ میسّر آجائیں گی تو عوام اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس کے علاوہ عام انتخابات میں کچھ دھاندلیاں بھی ہوئیں اور اس طرح ڈیموکریٹک پارٹی نے اس موقع پر اکثریت حاصل کر لی۔ اس وقت سے آج تک یہی جماعت برسرِ اقتدار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے مذہبی روایات کی تجدید کر دی لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی پرانی برائیاں بھی عود کر آئی ہیں جو قدامت پسندی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ نئے انتخابات میں

کامیابی کی بنا پر جلال بایار ۲۲ مئی ۱۹۵۰ء کو تیسرے صدر ترکی بن گئے اور انھوں نے اپنے معتمد خاص عدنان مندریز سے کابینہ بنانے کے لیے کہا۔

۱۹۵۴ء کے انتخابات میں بھی اس جماعت کو کامیابی ہوئی اور اسی لیے جلال بایا بدستور صدر اور عدنان مندریز وزیر اعظم ہیں۔

جلال بایار کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ محنتی اور مستعد ہونے کے علاوہ حلیم الطبع اور نیک دل ہیں اور اپنے مقررہ طریقِ کار کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔

جلال بایار اور عدنان مندریز ایک دوسرے کے مشیر اور ہمیشہ کے ساتھی ہیں۔ ان میں کبھی اختلافِ رائے نہیں ہوا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر جلال بایار نہ ہوتے تو عدنان مندریز کو کبھی اتنی شہرت و نیک نامی نصیب نہ ہوتی اور اس کے برعکس بعض لوگ کہتے ہیں کہ عدنان مندریز کے بغیر جلال بایار کی سیاست اپنا رنگ نہیں جما سکتی تھی۔

عدنان مندریز:- عدنان مندریز ۱۸۹۹ء میں ایدن کے مقام پر زمینداروں کے ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے اور چوں کہ آباؤ اجداد صاحبِ ثروت تھے، اس لیے ازمیر کے امریکن کالج میں تعلیم و تربیت کے لیے داخل ہو گئے اور پھر انقرہ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے لیے آ گئے۔ اس کے باوجود ان کی اصل دل چسپی زراعت سے رہی، جو ان کے خاندان کا مشغلہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے اور اس لیے ان کو میدان سیاست میں آ جانا پڑا۔

۱۹۳۰ء میں وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے اور انقلاباتِ زمانہ کے باوجود آج تک رکن ہیں۔ اسمبلی میں ان کی حیثیت اس لحاظ سے ممتاز رہی کہ انھوں نے حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جبکہ ایک ہی سیاسی جماعت کا دور دورہ تھا ان کے اعتراضات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ پھر جس طرح ہمارے ملک میں بھی حزبِ مخالف کا راہنما مقبول عوام ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ زبانی جمع خرچ سے عوام کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے اور حکومت کے بعض ایسے اقدامات پر نکتہ چینی کر کے جو بظاہر مفادِ عامّہ کے خلاف ہوں، ان کا دل موہ لیتا ہے، اسی طرح ترکی میں بھی عدنان مندریز عرصے تک قومی ہیرو بنے رہے اور جب عام انتخابات میں ان کی جماعت برسرِ اقتدار آ گئی تو انھوں نے جاہ و منصب سنبھال لیا اور آج تک ان ذمّہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ عصمت انونو کے سخت خلاف ہیں۔

اور اگر ان کو موقع ملے تو اتاترک کا نقش بھی ترکوں کے دل سے مٹادیں، لیکن دراصل یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ترک عوام مصطفےٰ کمال کے اتنے ہی گرویدہ ہیں جتنے کہ ہم اپنے قائداعظم پر فدا ہیں اور اگر ان کے نام پر حرف آرہا ہو تو جان کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

طبّ فاکلتیسی :۔ ساڑھے دس بجے انقرہ یونیورستیسی کے ماتحت طب فاکلتیسی میں ان پروفیسر صاحب سے ملنا تھا، جو شعبۂ طب کے انچارج ہیں۔

یہ غنیمت تھا کہ برکات صاحب انقرہ کی سڑکوں اور راستوں سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اور وہ تیزی سے موٹر چلا کر یونیورسٹی کے احاطے میں پہنچ گئے۔ اگر راہ گیروں سے پوچھ پوچھ کر آگے بڑھا جاتا تو ہم مقررہ وقت پر کبھی بھی وہاں نہ پہنچتے۔ شکر ہے کہ پابندیٔ وقت کے اصول کی لاج رہ گئی۔ اور اس طرح پروفیسر صاحب کو جو ہمارے انتظار میں کمرۂ تشخیص کے باہر ٹہل رہے تھے، کوئی زحمت اٹھانی نہیں پڑی۔

وہ خندہ پیشانی اور تپاک کے ساتھ ہم سے ملے اور فوراً اپنے دفتر میں لے گئے لیکن وہاں ٹھیرے نہیں، بلکہ اپنے ایک اور ساتھی کو جو تجربہ گاہ سے تعلق رکھتے ہیں، ہمراہ لے کر آگے بڑھ گئے۔

کراچی اور دہلی کی ہمدرد فیکٹریوں کی طرح ان کی تجربہ گاہ آراستہ تھی۔ یہاں بھی مشرقی اور مغربی طریقوں کو سمو کر تحقیقات کی منزلیں طے کی جارہی تھیں۔ جدید آلات و سامان نظر آنے سے تو یہی گمان ہوتا تھا کہ ہم کسی مغربی سائنسی تجربہ گاہ میں آگئے ہیں لیکن دیسی دواؤں کی بوتلیں اور جار دیکھنے کے بعد رائے معتدل ہو کر اس منزل پر آگئی کہ دیرینہ نتائج تحقیقات کو جدید آلات کی کسوٹی پر نئے انداز میں جانچا اور پرکھا جارہا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ بہت سے کیمیائی تجزیوں اور اشیا کے جوہر نکالنے کے بعد اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ صدیوں پہلے ہمارے معالج کسی چیز کی ماہیت و خاصیت کے بارے میں جو انقطاعی فیصلہ دے گئے ہیں، وہ اب بھی اٹل ہے۔ البتہ مزید تحقیقات سے یہ فائدہ ہو رہا ہے کہ بعض چیزوں کے نئے جوہر معلوم ہو رہے ہیں، اور بعض اشیا کی روحیں زیادہ لطیف انداز میں نکالی جارہی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ترکی ان ملکوں میں شامل ہے جہاں اوّل دن سے طب کی باقاعدہ تربیت طلبا کو مریضوں کے سرہانے بٹھا کر اور ہر بات عملی طور پر سمجھا کر دی جاتی رہی ہے۔

ترکی میں پہلا طبی مدرسہ سلطان محمود ثانی کے عہد میں بمقام قسطنطنیہ ۱۸۲۷ء میں قائم ہوا تھا، جہاں یونانی، عربی، ہندی اور چینی طریقہ ہائے علاج کو برابر پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ ۱۸۴۷ء

میں فوجی نظام کے ماتحت پہلا طبی مدرسہ مغربی انداز پر قائم ہوا۔ وہ بھی قسطنطنیہ میں تھا۔ اور اس کے پچاس سال بعد عوام کے لیے طبی مدرسے بڑی تعداد میں کھول دیے گئے، لیکن آہستہ آہستہ ان پر مغربی رنگ چھاتا رہا۔ تاہم ہر بڑے شہر میں اب بھی دو دو چار چار ادارے طبِ مشرقی کے نام لیوا ہیں، کیوں کہ سرکاری طور پر اس طریقِ علاج کو پوری طرح نوازا جاتا ہے۔

انقرہ یونیورسٹی کا یہ شعبۂ طب بھی اسپتال سے ملحق ہے۔ طبی نصاب میں شامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار اپنے ملک میں ثانوی تعلیم کی سند حاصل کر چکا ہو یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی ڈپلوما لے چکا ہو۔ ترکی زبان کے علاوہ انگریزی یا فرانسیسی یا جرمن زبان جانتا ہو۔ اس کی صحت اطمینان بخش ہو اور کسی لحاظ سے بھی معذور نہ ہو۔ مدتِ تعلیم چھے سال ہے اور اسے تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصّے کی تعلیم ختم ہونے کے بعد امتحان ہوتا ہے اور صرف کامیاب طلبا کو اگلے حصّے میں شامل ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ایک سال کی مدّت کا پہلا حصّہ "قبلِ طب" کہلاتا ہے۔ اس ایک سال میں وہ تمام سائنسی علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کا طب سے قریبی تعلق ہے۔ دوسرے حصّے کی مدّت ڈیڑھ سال ہے۔ اس دوران میں جسمِ انسانی کی ساخت اور افعال کی پوری طرح تشریح کی جاتی ہے۔ تیسرے حصّے کی مدّت ساڑھے تین سال ہے۔ اس دوران میں تشخیصِ امراض و علاج، تجویزِ ادویہ اور متعلقہ طریقوں کو تفصیل کے ساتھ عملی طور پر سمجھایا جاتا ہے اور باقاعدہ مشق کرائی جاتی ہے۔ وضعِ حمل، امراضِ نسواں، امراضِ اطفال، امراضِ چشم، ذیابیطس اور نفسیاتی علاج میں الگ الگ مہارت پیدا کرائی جاتی ہے۔ نیز شفاخانوں کا نظام قائم رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انقرہ یونیورسٹی میں یہ شعبۂ طب ۱۹۴۵ء میں قائم ہوا تھا۔ تعلیم کے لیے پورے وقت کے ۳۰۰ اور کچھ وقت کے ۱۴۴ اساتذہ مقرر ہیں۔ طلبا اور طالبات کے داخلے میں کوئی تخصیص نہیں ہے، پھر بھی تعداد میں زبردست تفاوت ہے۔ چناں چہ اس وقت طلبا کی تعداد ایک ہزار دو سو اور طالبات کی صرف دو سو کے قریب ہے۔ ہر سال تقریباً دو سو طلبا آخری امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں اور اتنے ہی داخل کر لیے جاتے ہیں۔ اس علاقے کے معیارِ زندگی کو دیکھتے ہوئے فیس بہت زیادہ نہیں ہے یعنی تقریباً سو اسو روپے سالانہ وصول کیے جاتے ہیں۔

وقفۂ راحت و عبادت: ہمیں لائحۂ عمل کے مطابق ڈھائی تین بجے کے درمیان ترکی کی شہرۂ آفاق خاتون خالدہ ادیب خانم سے ملنا تھا۔ محترمہ نے تحریری اطلاع دی تھی کہ وہ نمازِ ظہر کے بعد آدھے پونے گھنٹے کے لیے موقعِ ملاقات دے سکیں گی کیوں کہ اس کے بعد وہ شام تک

آرام کرتی ہیں۔ ڈھائی بجنے میں ابھی کافی وقت تھا، لہٰذا ہم نے سوچا کہ کسی ریستوراں میں جاکر شغل، اکل و شرب کیا جائے اور پھر قریب کی کسی مسجد میں فریضۂ نماز ادا کرکے آگے بڑھا جایا جائے۔

میں اور بھائی جان محترم اکثر دوپہر کو کچھ نہ کھانے کے عادی ہیں لیکن برکات احمد صاحب بھوک کے ذرا کچے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ذرا "تگڑا" لنچ کروں گا۔ لہٰذا میں نے رائے پیش کی کہ کبابی کے ہاں چلنا چاہیے جس کا ذکر آپ نے بارہا کیا ہے، مگر ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس کے ہاں کباب اور کلیجوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بہرحال جیت ہماری رہی۔ ہم نے ان کو کبابی کے ہاں چلنے کے لیے مجبور کر دیا۔

ہمارا اجنبی ہونا اکثر جگہ توجہ کا مرکز بنا ہے لیکن اس دکان پر اس قسم کا کوئی اظہار نہیں ہوا۔ پتہ چلا کہ اس کی شہرت عالمگیر ہے اور انقرہ آنے والے اکثر سیاح اس کی دکان پر پہنچ کر شیش کباب ضرور کھاتے ہیں۔ چناں چہ اس وقت بھی چند غیر ملکی وہاں موجود تھے۔ ان کے چہرے مہرے اور وضع قطع کو دیکھ کر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ ان میں سے دو ایرانی، تین عراقی، دو فرانسیسی، اور ایک جرمن ہے۔ مقامی باشندوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ بالکل توڑ کا وقت ہے۔ یعنی اکثر لوگ کھا کر جا چکے ہیں یا کھا رہے ہیں، اس لیے بہت کم لوازمہ باقی ہے۔ تاہم کبابی نے اپنے ملازموں سے کہا کہ اب اور کوئی گاہک آئے تو اس سے صاف کہہ دیا جائے کہ اب سہ پہر کے بعد آئے۔ یہ پاکستانی بھائی آ گئے ہیں اس لیے ان کی فرمائش ضرور پوری کرنی ہے۔

کوئی دس منٹ بعد گرما گرم کبابوں کی پلیٹیں آنی شروع ہو گئیں۔ خاص وضع کے کلیجے بھی ساتھ تھے۔ بھائی برکات نے تنہا تین پلیٹیں صاف کر دیں جبکہ ہم دونوں بھائی مشکل سے ڈیڑھ پر اکتفا کر سکے۔ برکات صاحب اسٹارچ کم کھاتے ہیں۔ بل میری توقع کے خلاف آیا اور جب ہم نے اسے سمجھنا چاہا تو وہ سرے سے ہماری بات نہ سمجھ سکا۔ تاہم وسیلہ بننے کے لیے برکات صاحب موجود تھے۔ انھوں نے نہ صرف ترجمانی کی بلکہ بل کی رقم بھی ادا کرنی چاہی۔ میں نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا اور انھیں مجبور کر کے خود رقم ادا کر دی جو ۲۵ لیرا تھی (ایک لیرا پاکستان کے ایک روپیہ گیارہ آنے کے برابر ہوتا ہے) تقریباً بیالیس روپے کا یہ بل یقیناً بہت زیادہ تھا اور پھر دو ٹوپے چھے آنے بوائے کو ٹپ کے طور پر بھی دینے پڑے۔

قریب کی ایک مسجد میں نمازِ ظہر ادا کی اور نماز کے بعد نمازِ جنازہ بھی پڑھی جس میں بڑی خلقت شامل تھی کیوں کہ مرنے والے بزرگ جن کی عمر تقریباً سو سال تھی، انقرہ کے قدیم ترین باشندے

سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے ملک کے بہت سے سیاسی اور معاشرتی نشیب و فراز دیکھے تھے اور آخر وقت تک اس قدر ہوش و حواس تھے کہ لوگ ان سے پرانی باتیں دریافت کرتے تو ایک ماہر داستان گو کی طرح ان کی زبان چلنے لگتی اور وہ ایک سانس میں بہت کچھ بیان کر جاتے تھے۔ ویسے بالکل جاہل تھے۔ اگر پڑھے لکھے ہوتے اور اپنی یادداشت قلم بند کرتے تو یقیناً ایک قابلِ قدر چیز ہوتی۔

خالدہ ادیب خانم:۔ ترکی زبان کے حروف میں "خ" نہیں ہے۔ لہٰذا ترکی کی اس قابلِ تعظیم بزرگ ہستی کو "حالدہ ادیب حانم" کہا جاتا ہے اور انگریزی یا یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ان کا نام لکھتے وقت اسی لحاظ سے نام کا تلفظ کیا جاتا ہے۔ مجھ سے ان کا اولین تعارف اس وقت ہوا تھا جب کہ وہ ۱۹۳۵ء میں دہلی گئی تھیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لکچر دیے تھے۔ دہلی سے شائع ہونے والے ہمدرد صحت میں ان کی تصویر بھی چھپی تھی۔ وہ عموماً استنبول میں رہتی ہیں، لیکن ان دنوں انقرہ میں مقیم ہیں۔ جب میں ان کے خوبصورت سے مکان میں داخل ہوا اور وہ نشست گاہ میں تشریف لائیں تو ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ ۱۹۳۵ء کی خانم اور اب کی خانم میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ۱۹۳۵ء میں بھی ان کی عمر کافی تھی، لیکن اب زندگی کے تقریباً اکھتر سال گزار دینے کے بعد وہ کافی ضعیف اور نحیف تھیں۔ وہ انگریزی زبان اتنی صاف اور عمدہ بولتی ہیں کہ بس پردہ رہ کر یا منھ موڑ کر سُنا جائے تو یہی گمان ہوگا کہ کوئی انگریز خاتون اپنی مادری زبان میں بات چیت کر رہی ہے۔ وہ فرانسیسی بھی جانتی ہیں۔ ہم سے باتیں کرنے کے دوران میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیا سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لگاتی رہیں۔ سگریٹ انھوں نے ہم کو بھی پیش کیے۔ ہم دونوں بھائی تو اس سے بے نیاز ہیں اور برکات صاحب۔ نے محض تکلفاً یا احتراماً معذرت چاہی۔

انھوں نے ایک لمبا کش لگا کر بڑے سکون سے اپنے ہندستان جانے کی یاد تازہ کی۔ وہ اس ملک سے بہت متاثر ہیں اور وہاں کے باشندوں میں سے جناب ذاکر صاحب سے انہیں بڑا اُنس ہے۔ دورانِ گفتگو میں باربار جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ڈاکٹر ذاکر کا ذکر ان کی زبان پر آجاتا تھا۔ پاکستان کے موضوع سے وہ جان بوجھ کر کترانا چاہتی تھیں۔ پھر بھی اس ضمن میں اور دوسرے موضوعات پر بہت سی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے تاکید کی کہ ہم ان کے خیالات کو صرف اپنے تک محدود رکھیں۔ نہ تو کہیں ان کا چرچا ہو اور نہ دائرۂ تحریر میں لایا جائے۔ میرے دل میں ان کا اس درجہ احترام ہے کہ ان کے حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔

۱۸۸۵ء میں یعنی مصطفےٰ کمال سے پانچ سال اور عصمت انونو سے چار سال بعد خالدہ ادیب خانم

قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ترکی رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر اور پھر زنانہ اسکول میں پائی اور خلافِ معمول امریکن کالج نور دیمن میں داخلہ لے لیا، جہاں مقامی لڑکیوں کو تعلیم پانے کا مشکل ہی سے موقع ملتا تھا اور موقع مل جانے کے بعد بھی وہ بعض حالات کے ماتحت آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

وہ پہلی ترکی خاتون ہیں جنھوں نے ۱۹۰۱ء میں جب کہ ان کی عمر صرف سولہ سال تھی، اس سے گریجویٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور اپنی توجہ زنانہ تعلیم کی ترقی و ترویج پر مبذول کر دی۔ انھوں نے اپنے ملک میں حیثیتِ نسواں کو عروج دینے کی کامیاب کوشش بھی کی اور انھی کی سعی و کاوش سے عورتوں کو حق رائے دہندگی ملا۔ جب میں نے خانم کو یہ بات یاد دلائی تو ان کے جھرّی دار چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ پُرانی یادیں بڑی تیزی سے ان کے ذہن پر ابھرنے لگی ہیں۔

ملک کا غلط نظامِ حکومت شروع دن سے ان کی نگاہ میں کھٹکتا رہا، اور وہ کبھی کبھی اپنے غم و غصے کا اظہار بھی کرتی رہیں۔ شاید اسی جذبے کے ماتحت بار بار قلم اٹھاتے رہنے کے باعث وہ ایک ایسی ادیبہ بن گئیں جن کی تحریر میں طنزیہ اندازِ بیان سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور اسی جذبے کے ماتحت وہ ۱۹۰۹ء میں تحریکِ نوجوانانِ ترکیہ کی سرگرم رکن بھی بن گئیں۔

چوں کہ یہ تحریک حکومتِ وقت کے خلاف بالکل خفیہ طور پر چلائی گئی تھی، اس لیے ملک کا محکمۂ سُراغ رسانی برابر اس کے محرکین کی تلاش میں رہتا اور جب بھی کسی کا پتہ چلتا، اسے دھر لیا جاتا۔ چناں چہ کچھ عرصے بعد ہی وہ اپنے چند ساتھیوں سمیت سرکاری نرغے میں آگئیں اور عارضی طور پر جلاوطن کر دی گئیں۔

عام طور پہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے جلاوطنوں کے دل و دماغ میں بغاوت و انقلاب کا مادہ زیادہ تیزی سے نشو و نما پاتا ہے۔ لہٰذا قید ہونے والے ترک نوجوانوں کے لیے بھی حکومت کی طرف سے جلاوطنی کا حکم مفید ثابت ہوا اور انھوں نے قوم کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

یورپ میں پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو ترکی کا مستقبل بھی تاریک نظر آنے لگا۔ ایسے موقع پر ترک نوجوانوں نے بڑی ہی عقل مندی سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی حکومت سے برسرِ پیکار رہنے کے بجائے اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا مناسب سمجھا۔ انھوں نے سوچا کہ قصرِ قومی کی بنیادوں اور در و دیوار کو مضبوط و استوار رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ اندرونی خرابیوں کو دور کر کے نئے سرے



خالدہ ادیب خانم عوام سے خطاب کرتے ہوئے



اتاترک عصمت انونو سے مصافحہ کرتے ہوئے

سے زینت و آراستگی کا خیال رکھنا بعد کی بات ہو۔ چناں چہ ایسے سب نوجوانوں نے حکومت سے تعاون کا اعلان کیا اور عملی قدم اٹھانے کے لیے وہ عساکر ترکیہ میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے مصطفےٰ کمال عصمت انونو اور رؤف بے پہلے سے شریک تھے، خالدہ ادیب خانم کا نام بھی شامل فہرست ہو گیا۔ انھیں شروع میں گودپورل کا درجہ ملا اور بعد ازاں ترقی ملتی رہی۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی، معاہدۂ صلح پر دستخط ہو گئے لیکن نام نہاد اتحادی امن دعافیت کے اصول پر صحیح معنوں میں عمل پیرا نہ ہو سکے۔ شاید ان کے دلوں کا بخار پوری طرح سے نہ نکلا تھا۔ اس لیے کہیں کھلم کھلا اور کہیں چوری چھپوا ان کی جنگ جویانہ ذہنیت کارفرما رہی۔ ترکی کی سرزمین پر دونوں طرح عمل ہوا۔

سلطان ترکی کو اپنی مٹھی میں لیکر انگریزوں نے مختلف محاذِ جنگ قائم کیے اور سازشوں کے ذریعے آس پاس کے ملکوں کو اکسا کر بی جمالو نے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا رنگ دیکھنا بھی مناسب سمجھا۔ اس طرح جب لڑائی سارے یورپ سے سمٹ کر ترکی تک محدود ہو گئی تو یہاں کے نوجوانوں نے سلطانِ وقت سے تعاون کرنے کے بجائے اب اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا ہی مناسب سمجھا کیوں کہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر اس موقع پر قوم کو سسکتا ہوا چھوڑ دیا گیا تو اس کے پنپنے کا کوئی وقت نہیں آئے گا۔

ان نوجوانوں میں سے بیشتر کو فوج میں اعلیٰ منصب حاصل تھے، ماتحت ان کے ہم خیال تھے اور آلاتِ حرب ان کی تحویل میں تھے۔ لہٰذا اس اعتبار سے کوئی رکاوٹ درمیان نہیں تھی، لیکن دشمن بھی قوی تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھانے کے لیے موجود رہتے۔ چناں چہ اتاترک اور ان کے ساتھیوں کو بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑا۔ ایک محاذ پر وہ بادلِ ناخواستہ نبرد آزمائی کرتے کہ نقصان اپنے ہی بھائیوں کا ہوتا تھا۔ البتہ دوسرے محاذ پر انھیں کافی تدبر اور چابک دستی سے کام لینا پڑتا تھا۔ چار سال کی یہ طویل مدت بڑی ہمت شکن اور صبر آزما تھی لیکن اس وقت آزمائش کے دور سے منچلے نوجوان پوری کامیابی کے ساتھ گزر گئے اور ان کی دلی مراد بر آگئی۔

خالدہ ادیب خانم نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء تک اسی آزمائشی دور کو ایک یادداشت کی طرح ٹرکش آرڈیل کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس دور کی ترکی تاریخ کو سمجھنے کے لیے یہ تصنیف حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ اس آئینے میں

مصطفےٰ کمال، عصمت انونو، ڈاکٹر عدنان بے، خود خالدہ ادیب خانم اور دوسرے لوگوں کے چہرے نمایاں نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں جن کتابوں کو نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے، ان میں یہ عظیم تصنیف بھی شامل ہے۔

اس کے مطالعے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس میں نہ صرف ترکی کے دورِ آزمائش کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ جو چہرے یادداشت کے اس آئینے میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں، وہ خود بھی آزمائش کے ایک عجیب دور سے گزرے ہیں۔ اسے پڑھ کر یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس درجہ شیر و شکر اور ایک دوسرے کے رفیقِ کار رہنے کے باوجود ان میں سے بعض ہستیوں کے درمیان قیامِ جمہوریت کے بعد جو افتراق پیدا ہوا اور انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی یا خود مسلط کردہ جلاوطنی اختیار کر لی، اس کا حقیقی سبب کیا تھا۔ اس پہلو پر مفصّل روشنی ڈالنا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔ صرف اربابِ نظر کو دعوتِ فکر دینی کافی ہے۔

۱۹۲۳ء میں جب قوم پرستوں نے انقرہ میں قومی مجلس قائم کر لی، اتاترک اس کے صدر اور عصمت انونو پہلی کابینہ میں وزیرِاعظم مقرر ہو گئے تو خالدہ ادیب خانم کو بھی وزیرِ تعلیمات کا منصب دیا گیا اور اس میں شک نہیں کہ اپنے قلیل دورِ وزارت میں انھوں نے قومی تعلیم کو جس تیزی سے ترقی دی ہے، وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے جسے ترک قوم کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

اسی دوران میں خالدہ ادیب خانم نے ڈاکٹر عدنان بے سے شادی کر لی جو پہلی قومی اسمبلی کے اسپیکر تھے اور تحریکِ نوجوانان میں اور بعد کی جدوجہد میں سب کے شریکِ کار رہتے اور اسی وقت سے خالدہ ادیب سے متعارف تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی تو ہمیشہ خوش گوار رہی، لیکن بعد کی سیاسی زندگی سازگار ثابت نہ ہو سکی۔ بہت جلد انھیں اور ان کے شوہر کو سیاست سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ کیوں کہ اتاترک سے اختلافِ رائے کچھ زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن یہ کنارہ کشی بہت خاموشی کے ساتھ عمل میں آئی۔ کوئی ایسی ناگوار صورت پیدا نہیں ہوئی جو ملک میں یا ملک کے باہر جگ ہنسائی کا سبب بنتی۔ مخلص کارکنوں کا شیوہ یہی ہے۔

۱۹۲۸ء میں انھوں نے ریاست ہائے متحدہ کا دورہ کیا، جہاں بہت سے اداروں خصوصاً ویمنز کالج کے شعبۂ سیاست کو خطاب کیا۔ پھر ۱۹۳۱ء میں انھوں نے اسی ملک کا دوسرا دورہ کیا اور اس دفعہ بھی بہت سے کالجوں میں تقریریں کیں۔ ان کی اہم تقاریر کا مجموعہ کتابی صورت میں موجود ہے۔

اسی دوران میں انھوں نے چند کہانیاں بھی لکھیں جن کا موضوع نیم سیاسی ہے۔ انگریزی میں ان کا ترجمہ "شرٹ آف فلیمز" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کی ایک اور سیاسی تاریخی کتاب بھی بہت مشہور ہے، جس کا ترجمہ "مشرق و مغرب میں تصادم" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر وہ برصغیر پاک و ہند آئیں اور دس دن تک دہلی میں مقیم رہیں۔ دہلی اور علی گڈھ میں انھوں نے متعدد لکچر دیے جن کو سن کر جدید ترکی کو سمجھنا آسان ہو گیا تھا۔ میں نے پہلی بار ان کو اسی موقع پر دیکھا اور چند باتیں بھی کیں اور نہیں بتا سکتا کہ میں ان خاتون محترم سے کس درجہ متاثر ہوا تھا۔ ترکی کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد میری ایک آرزو یہ بھی تھی کہ اس قابلِ تعظیم ہستی سے چند لمحے باتیں کروں جس کی آنکھوں نے اتاترک کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ لمحاتِ فرصت سے لے کر اوقاتِ مصروفیات تک خلوت و جلوت میں برابر کی شریک رہی ہیں۔ اپنا خیال تو یہ ہے کہ اگر اتاترک لطیفہ خانم سے شادی نہ کرتے تو شاید انھی کو رفیقۂ حیات بناتے اور غالباً قوم و ملت کے لیے یہ رشتہ مناسب و سازگار ثابت ہوتا۔

ہم سب نے کافی کی ایک ایک پیالی ان کے ساتھ پی اور کچھ خشک میوے کھائے۔ خاموشی کے ان لمحات میں اور کبھی کبھی گفتگو کے دوران میں جب وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو جاتی تھیں میں نے محسوس کیا کہ ان کا دماغ ملک کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے۔ جب وہ کسی سوال کے جواب میں نگاہ اٹھا کر آہستہ آہستہ جواب دیتیں تو سمندروں سے زیادہ گہرائی رکھنے والی ان کی آنکھوں میں ترکی تاریخ کے مختلف النوع واقعات جلدی جلدی ورق گرداں دکھائی دیتے تھے۔

ہم نے بہت ہی بادلِ ناخواستہ ان سے اجازت لی۔ وہ زینے تک ہم کو الوداع کہنے آئیں۔ بڑی باہمت خاتون ہیں۔ ان کے بارے میں سُنا گیا ہے کہ اس اِکھتر سال کی عمر میں بھی ان کی پُرانی سپاہیانہ زندگی اس طرح اپنی جھلک دکھاتی ہے کہ روزانہ علی الصباح کم سے کم دو میل کی ہوا خوری ان کا معمول ہے۔

میں نے خالدہ ادیب خانم کی زندگی کا موازنہ اپنے ملک کی خواتین سے کیا جو عشرت کدوں میں رہ کر جھونپڑیوں میں رہنے والی اپنی نام نہاد بہنوں سے لفظی ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں اور ہوٹل میٹروپول یا پیچ لگژری میں ڈنر کھانے کے بعد اپنی انجمنوں کے زیر ایوان دنیائے خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے رضاکارانہ خدمات کی وہ تجاویز منظور کرتی ہیں جن کے مسودے

ان کے عزیز شوہروں کے سرکاری سکریٹری مرتب کرتے ہیں۔

قاسم گلگ :- اب ہمیں اتاترک کے دستِ راست غازی عصمت انونو سے ملاقات کے لیے جناب قاسم گلگ کے ہمراہ ان کی قیام گاہ پر جانا تھا۔ وقت کا تعین بھی انھی کی معرفت ہوا تھا اور برکات صاحب ان کے پرانے واقف کار ہیں۔ لہٰذا ہم سب ان کی کوٹھی کی طرف چل پڑے۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں چند منٹ کی دیر ہوگئی، اس لیے وہ باغیچے میں ٹہل ٹہل کر ہمارا انتظار کرنے لگے تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ برکات صاحب کے ذریعے ان سے ہمارا تعارف ہوا۔ چونکہ جنرل موصوف سے ملاقات کا جو وقت مقرر تھا، اس میں نصف گھنٹہ باقی تھا اور موٹر میں ان کی قیام گاہ تک پہنچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ دس منٹ درکار تھے، اس لیے کچھ دیر ان کے ساتھ وہیں بیٹھ کر علیحدہ باتیں کرنا مناسب سمجھا گیا۔

وہ ایک لمبے قد اور ذرا بھاری بدن کے آدمی ہیں جن کے بارے میں امریکا کے اخبار "ٹائمز" نے ۱۳ر اگست ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں یہ خبر چھاپی تھی کہ عدنان مندریز وزیر اعظم ترکی اس حجام کو سونے کی ایک گھڑی انعام دیں گے جو قاسم گلگ کے بال کاٹ کر انھیں لادے۔

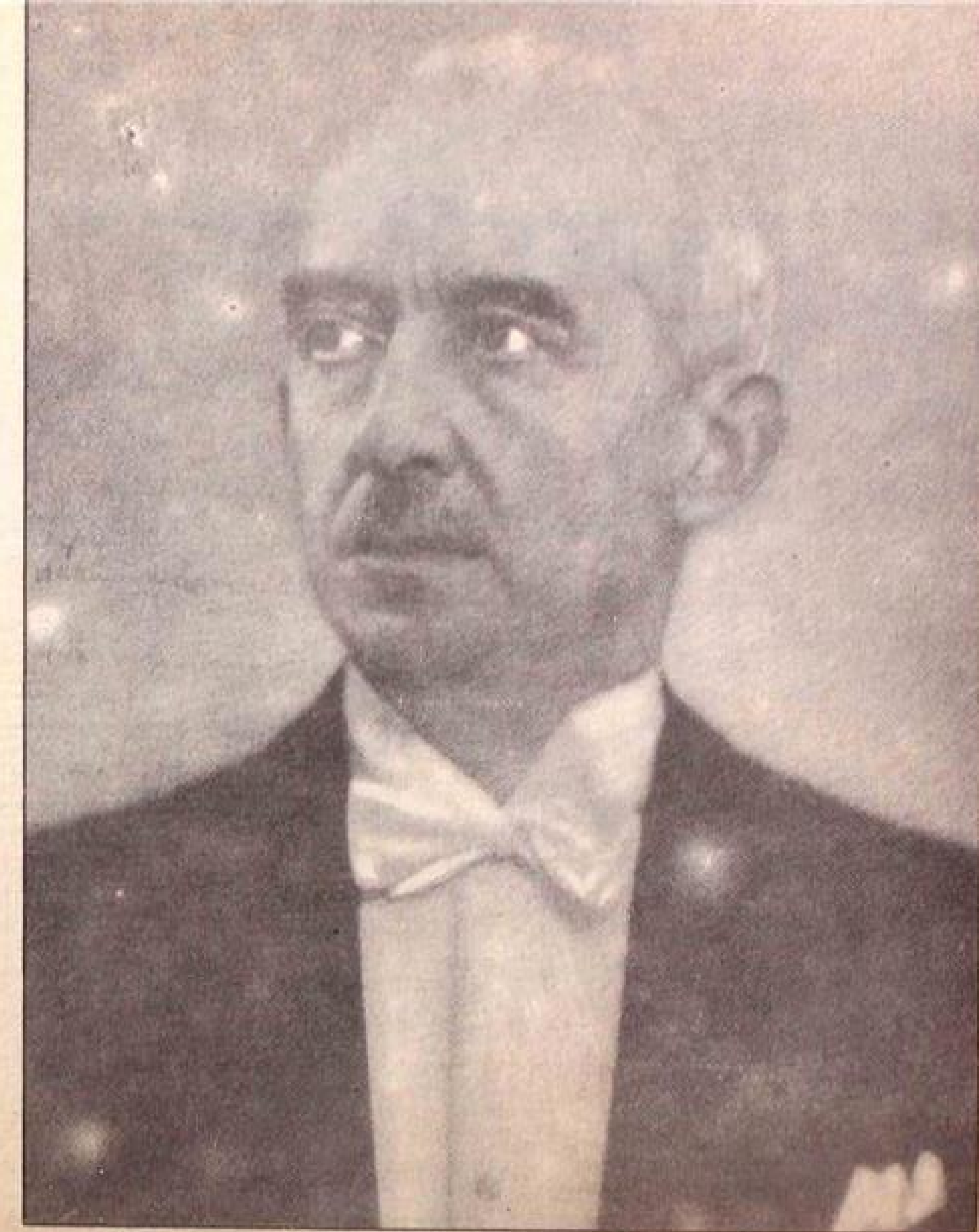
ہم ان سے ان کی نشست گاہ میں ملے جو نشست گاہ تو کم، لائبریری زیادہ ہے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ میں کس سے ملوں —— قاسم صاحب سے یا ان کی نادر کتابوں سے۔ غنیمت ہے کہ گلگ صاحب نے اپنی لائبریری سے خود ہی "ملاقات" کرا دی۔ کتابیں زیادہ تر سیاست اور کچھ مشرقی طب کے موضوع پر تھیں۔ ترکی اور انگریزی کے علاوہ چند نسخے یونانی زبان کے بھی تھے۔

عمر ۴۳-۴۴ سال ہے لیکن ہنوز مجرّد ہیں۔ انھوں نے قہوہ یا چائے پینے کی دعوت دی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ میری بیوی تو ہے نہیں جو صحیح معنوں میں ترکی رسم کے مطابق آپ کی خاطر مدارات کرتی، اس لیے جو کچھ ہے، پیش کر دیا جائے گا۔ اگر اس میں کوئی کمی یا خرابی ہو تو خیال نہ کریں۔ لیکن ہم نے بہت اصرار کے ساتھ اس لیے معذرت چاہی کہ ابھی کچھ دیر پہلے قہوہ پی چکے تھے اور اس مشروب کے زیادہ عادی نہ ہونا کیا معنی، اس کے استعمال سے حتی الوسع اجتناب کرتے تھے۔

میں نے ان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس کی بنیاد پر سوچا کہ ان میں کام کرنے کی جو قوت و صلاحیت ہے اور کبھی نہ تھکنے کی عادت ہے کیا اس لیے ہے کہ وہ مجرّد ہیں۔

قاسم صاحب کی باتوں میں بڑا لوچ ہے۔ وہ پورے اطمینان سے باتیں کرتے ہیں اور اپنی بات


Kasım Gülek



کو خوب سمجھاتے ہیں۔ میں نے ان سے ترکی سیاست پر قصداً بات نہیں کی اور نہ ترکی میں اسلام کے موضوع پر کوئی گفتگو مناسب سمجھی۔ البتہ خود انھوں نے اپنی لائبریری میں سے قرآن مجید کا ایک نسخہ دکھایا جو قلمی ہے اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے پاس اور بھی قرآن شریف ہیں اور وہ اس مجموعے کو بطور خاص دوسروں کو دکھاتے ہیں۔

وہ بڑی روانی کے ساتھ انگریزی بولتے ہیں اور چوں کہ ان کی تعلیم امریکا میں ہوئی ہے اس لیے لب و لہجہ کچھ امریکی انداز کا ہے لیکن اور معاملات میں وہ اس سے متاثر نہیں ہیں۔ وہ ترکی کی موجودہ حکومت سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ پچھلے دنوں ترکی پارلیمان میں جو ہنگامہ و فساد ہوا تھا اور اراکین مجلس میں جو مار پیٹ ہوئی تھی، نہ معلوم قاسم صاحب نے اس میں کس حد تک حصہ لیا تھا انھیں یہ شکایت ضرور ہے کہ پچھلے انتخابات میں بڑی ہی دھاندلی ہوئی ہے اس لیے چپقلش لازمی ہے۔ وزیر مالیات کے استعفے کے بارے میں بھی انھوں نے کہا کہ وہ خلافِ توقع نہیں ہے۔ حکومت کی کلیں صرف چند اناڑی میکانک چلا رہے ہیں۔ اسی لیے کبھی کبھی بعض پرزے ڈھیلے ہو کر الگ ہو جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اگر آئندہ انتخابات باقاعدہ ہوئے اور ان کی جماعت جیت گئی تو وہی ترکی کے نئے وزیر اعظم ہوں گے اور غازی انونو ایک بار پھر کرسی صدارت پر رونق افروز ہوں گے۔ قاسم گلک صاحب اس وقت ترکی پارلیمان میں حزبِ مخالف کے نائب قائد ہیں۔

تقریباً بیس منٹ بعد ہم سب ان کی کوٹھی سے روانہ ہوئے۔ انھوں نے بھی اپنی کار نکلوائی، لیکن ڈرائیور اسے چلاتا رہا۔ وہ ہمارے ساتھ برکات صاحب کی کار میں بیٹھے۔ دس منٹ بعد ہم غازی عصمت انونو سے ملنے ایک عظیم عمارت پر پہنچ گئے، جس کے ایک حصے میں ان کی سیاسی جماعت "ریپبلکن پیپلز پارٹی" کا دفتر قائم ہے۔

غازی عصمت انونو:- ایک بلند قامت ترک نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں کمرۂ انتظار میں بٹھا دیا۔ دراصل یہی ان کی نشست گاہ بھی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ذرا پستہ قد، سرخ و سفید، خوب رُو انسان ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ ہم سب ادب کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ سلام ہوا۔ ہاتھ ملے۔ تعارف کرایا گیا اور ہم سب آمنے سامنے ہو کر بیٹھ گئے۔

جس کے دل میں عصمت انونو کے کارنامے جاگزیں ہوں اور جس کے دماغ میں ان کی یاد تازہ ہو اس پر ان کی عظمت اور بڑائی کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا اور ضرور ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بڑی شخصیت، عظیم جرنیل، اعلیٰ مفکر اور اچھے مدبر و سیاست داں سے مل رہا ہوں۔

وہ خود ذرا اونچا سنتے ہیں، اس لیے دوسروں کو ذرا اونچی آواز میں بولنا پڑتا ہے، مگر وہ خود بہت آہستہ اور نرم آواز میں بولتے ہیں۔ لوزان کانفرنس میں ان کی سُنی اَن سُنی کر دینے کی داستان سبھی جانتے ہیں۔

تصویر میں جن لوگوں نے غازی موصوف کو دیکھا ہے، دراصل وہ اس سے بہت ہی مختلف ہیں، یا یوں کہنا چاہیے کہ اب عمر بڑھنے اور ضعیفی آجانے کے بعد مختلف ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ازراہِ کرم اپنی ایک حالیہ تصویر اپنے دستخط کر کے مجھے عطا کی، وہ اصل عصمت انونو ہیں۔

لمبی ستواں ناک، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، سفید بال، رخساروں کے قریب جھرّیاں ان کی طویل عمر کی غمازی کرتی ہیں، حالاں کہ اندازِ گفتگو اور لب و لہجے سے بڑھاپے کی کوئی صدا نہیں آتی۔

جب انھیں معلوم ہوا کہ ہم دونوں بھائیوں میں سے ایک پاکستانی اور دوسرا ہندستانی ہے تو انھوں نے مسکرا کر کہا کہ پاکستان اور ہندُستان بھی توام بھائی ہیں جنھیں سیاسی سرجری نے الگ الگ کر دیا ہے لیکن اب بھی دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہوں گے اور اگر ایک پر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا ضرور متاثر ہوتا ہوگا۔

تاہم غازی عصمت انونو خالدہ ادیب خانم کی طرح زیادہ "ہند نواز" نہیں ہیں۔ ان کی دُعا میں جملہ مسلمانانِ عالم کے لیے تقویت ہے۔ چناں چہ تقسیم برصغیر کے وقت اور اس کے بعد ہندُستان کے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کا انھیں صدمہ ضرور ہے۔

انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ پاکستان کا کیا حال ہے؟ تو میں نے "اچھا ہے" جواب دیا۔ اس پر وہ مسکرائے اور دعا کی کہ وہاں استحکام نصیب ہو۔ ہمدرد دواخانوں اور ان کے مقاصد کا ذکر بھی برکات صاحب نے کیا اور ہمارے مقصدِ سفر پر روشنی ڈالی۔ انھیں اس لحاظ سے خوشی ہوئی کہ ہم سائنس اور خصوصاً علم طب کے جدید دور میں بھی قدیم مشرقی طب کے حامی ہیں اور اسے کامیابی کے ساتھ فروغ دے رہے ہیں۔

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ جمہوریت کی دنیا میں شاید پانچ کا ہندسہ بہت ہی بھاگوان اور مبارک و مسعود سمجھا گیا ہے۔ چناں چہ انڈونیشیا اور بھارت کی پنچ شیلا کی طرح ترکی جمہوریت بھی پانچ اصولوں پر مبنی ہے، جس کی صراحت ترکی دستور العمل میں کی گئی ہے۔ یہ پانچ اصُول قومیت، جامعیت، مالکیت، دنیاویت اور اصلاحیت ہیں۔ ملک میں خواہ کتنی بھی سیاسی جماعتیں قائم ہوں اور ان کے نظریے اور طریقہ ہائے کار کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، انھیں اپنی عملی سرگرمیاں دکھاتے وقت بہر نوع ان پانچ اصولوں کو ضرور مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ان سے انحراف قوم سے غداری کے

مترادف ہیں۔ یہ اصول خود اتاترک نے وضع کیے تھے اور ایک طویل تقریر میں، جو مجلسِ کبیر ملّی کی طویل نشستوں میں پورے سات دن تک جاری رہی، ان کی صراحت کی گئی تھی۔ نہایت مختصر الفاظ میں جنرل عصمت نے ان اصولوں کا یہ مفہوم بیان کیا:۔

۱۔ **قومیت**:۔ نسلی و مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے باوجود ملکی اغراض و مقاصد میں اتحاد اور وحدتِ فکر کا لحاظ رکھنا لازمی ہوگا اور اسی اعتبار سے اس تہذیب و ثقافت کو مدِ نظر رکھا جائے گا جو مشترک تاریخی ورثے پر مبنی ہو۔ تمام باشندگانِ ملک خواہ ان کا نسلی یا مذہبی رشتہ ملک کے باہر کسی نسل یا مذہب سے ملتا ہو، ترکی زبان کو قومی زبان سمجھیں گے۔ اپنی انفرادیت قائم رکھنے یا علیحدگی کی پالیسی پر چلنے کے تمام رجحانات قابلِ تنسیخ ہوں گے۔ ان تمام تحریکات سے جو جذبۂ حُبّ الوطنی پر اثر انداز ہوں اور مغائرت و بیگانگی پھیلائیں، اجتناب کرنا ہوگا۔ اگر عملی طور پر ایسا کوئی مظاہرہ ہوا جو اتحادِ باہمی کے منافی ہو تو ارتکاب کرنے والوں کو قومیت کے اعتبار سے غدّار تصور کیا جائے گا اور اس کی سزا وہی ہوگی، جو تعزیرات میں غدّار کے لیے مقرر ہو۔

۲۔ **جامعیت**:۔ کسی ایک شخص، خاندان، قبیلے، فرقے یا کسی ایک جماعت کے لیے کسی خاص نوعیت کی مراعات کو کسی عنوان گوارا نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اپنا حق قائم کرنے کے لیے جو شرائط ضروری ہوتی ہیں، ان کی پابندی کا خیال رکھا جائے گا۔ بالفاظ دیگر حکومت کی جملہ کارگزاریوں میں مفادِ مشترک کا لحاظ بنیادی حیثیت رکھے گا اور چوں کہ حقوق کو فرائض سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس لیے ترکی معاشرے میں ہر شخص، جو بھی ذمے داری اپنے سر لے گا وہ دوسروں کی زندگی اور عوام کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر ایک فریضہ سمجھ کر پورا کیا جائے گا۔

۳۔ **مالکیت**:۔ عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے خیال سے حکومت اپنا فرض سمجھے گی کہ اقتصادی جدّوجہد میں افراد اور جماعتوں کے محدود وسائل کو دیکھتے ہوئے ان کی مالی اور عملی طور پر اعانت کرے۔ یہ اعانت نجی کاروبار کی رفتارِ ترقی کو تیز تر کرنے کی غرض سے ایسی صورت میں سرمایہ لگانے کے مترادف ہے، جسے مفادِ عامہ کے نقطۂ نظر سے مناسب و موزوں کہا جا سکے۔ اگر کسی کام میں امداد کے طور پر، یا قرضے کی صورت میں سرمایہ لگانے سے بھی مقصد پورا نہ ہوتا ہو تو بالواسطہ ذرائع کو چھوڑ کر حکومت براہِ راست اس کام کی ذمّے داری اپنے سر لے لے گی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ ملک میں صنعتی پیداوار کی صلاحیت اور اندرونی و بیرونی تجارت کے امکانات اس طرح فروغ پا سکیں کہ جو کاروباری خلا اس وقت موجود ہے یا جو آئندہ ظہور میں آسکتا ہے، حسبِ ضرورت

منشا پر ہوتا ہے۔

۴۔ **دنیاویت**:۔ حکومت کے معاملات کا جہاں تک تعلق ہو، مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے گا، کیوں کہ مذہب انفرادی طور پر ہر شخص کے ذاتی عقیدے اور کردار سے تعلق رکھتا ہو اور اسی وجہ سے ہر مذہب میں باور کیا گیا ہو کہ مرنے کے بعد جمعیتی یا قومی اعتبار سے نہیں، بلکہ ہر شخص کے ذاتی اعمال کی بنیاد پر اس کا محاسبہ ہو گا۔ لہٰذا ملک کے کسی قانون کی تشکیل اور اس کی تعمیل میں کوئی مذہبی عقیدہ اثر انداز نہیں ہو گا اور اسی لیے کسی بھی قانون یا قاعدے کو جس کا اطلاق من حیث القوم جملہ باشندگان ملک پر ہوتا ہو یا جس کا مفاد عوام سے وابستہ ہو، کسی طرح بھی خلافِ دین و مذہب نہیں سمجھا جائے گا، تاہم دوسری انسانی آزادیوں کی طرح مذہب کی آزادی کو بھی ایک مقدس فرض سمجھا جائے گا اور اس حق سے کسی فرد کو محروم نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ **اصلاحیت**:۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ملک میں اور ملک کے باہر حالاتِ زندگی متواتر اور بڑی سرعت کے ساتھ تغیر پذیر ہیں، ضروری ہو گا کہ حالات کا رنگ، رفتار اور قماش کا خیال رکھتے ہوئے ان سے ہم آہنگ ہونے کی ہر ممکن صورت پیدا کی جائے، اور نئی قدروں کو زندگی کے سانچے میں اس طرح ڈھالا جائے گا کہ ساری قوم ان سے مستفید ہونے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ صرف وہی طریقے اختیار کیے جائیں گے جو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مناسب و موزوں ہو سکیں۔ بالفاظ دیگر قومی اور بین الاقوامی اعتبار سے بامِ عروج تک پہنچنے کے لیے ہر شعبۂ زندگی میں ان دقیانوسی روایات کو جو انسان کے جوشِ عمل کو زنگ لگانے والی ہوں، ترک کر کے نئی امنگوں اور ان کی عملی سرگرمیوں کا سہارا لیا جائے گا، اور ہمیشہ ان کو نصب العین بنا کر آگے بڑھا جائے گا۔

اگرچہ یہ اصول شروع میں ملک کی اوّلین اور سب سے بڑی سیاسی جماعت یعنی ری پبلکن پیپلز پارٹی کے دستور العمل کی بنیاد تھے لیکن ملک میں جمہوریت قائم ہونے کے بعد انھیں جمہوریت کی قرار دادِ مقاصد میں شامل کر لیا گیا۔ یہ اصول اس قدر سوچے سمجھے ہوئے ہیں کہ جب ملک میں دوسری سیاسی جماعت یعنی ڈیموکریٹک پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تو اس نے بھی ان کی تکذیب و تنسیخ کو گوارا نہ کیا بلکہ ان کو بجنسہٖ دستور العمل کی اساس بنے دیا۔

عصمت پاشا ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو ترکی کے ایک تاریخی شہر سمرنا میں جواب ازمیر کہلاتا ہے، پیدا ہوئے تھے۔ یہ علاقہ ساحل سمندر کے قریب واقع ہے۔ ان کے والد محکمۂ بحری میں انسپکٹر جنرل تھے اور اس لیے کافی آسودہ حال تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں حاصل کر کے وہ اپنے فطری رجحان

کے باعث استنبول کے حربیہ کالج میں داخل ہو گئے، جو عساکرِ عثمانیہ کے لیے فوجی افسروں کو تربیت دیتا تھا لیکن چوں کہ اس کا نظم و نسق زیادہ تر غیر ملکیوں کے سپرد ہوتا تھا اور انھی کے زیرِ اثر تھا اس لیے ان کا دلی مقصد یہ ہوتا تھا کہ فوجی افسروں میں خود سلطانِ ترکی کی طرح برطانیہ پرستی اور شہنشاہیت پسندی کا جذبہ فروغ پائے۔ تاہم فوجی تربیت پانے والوں میں قدرتی طور پر سب سے پہلے حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی حفاظت میں غیر شعوری طور پر یہ پہلو بھی شامل ہوتا ہے کہ سرزمین وطن کو بیرونی اثر و اقتدار اور خارجی عناصر سے پاک کیا جائے۔ چناں چہ عصمت پاشا بھی ۱۹۰۶ء میں فارغ التحصیل ہو کر اور لفٹننٹ کا درجہ پا کر کالج سے باہر آئے تو اپنے اور بہت سے ساتھیوں کی طرح حالاتِ حاضرہ سے انحراف بلکہ بغاوت کا مادہ ان میں پیدا ہو چکا تھا۔ البتہ وقت کی مناسبت کا بھی احساس موجود تھا، اس لیے انھیں صحیح موقع کا انتظار رہا۔

۱۹۰۸ء میں جب غازی انور پاشا نے قصرِ شاہی پر یلغار کی تاکہ سلطان عبدالحمید کو جن کی وطن دشمنی ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی، قومی مجلس کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے معزول کیا جائے تو عصمت پاشا بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انور پاشا اس وقت وزیرِ حربیہ تھے۔

بہت جلد وہ فوج میں اسٹاف کیپٹن بنا دیے گئے اور ۱۹۱۲ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۲۸ سال تھی، انھیں میجر کا مرتبہ مل گیا کیوں کہ انھوں نے یمنی بغاوت کو دبانے میں کارِ نمایاں انجام دیا تھا۔

انھوں نے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مشرقی سرحدوں پر روسیوں کے خلاف اور شام میں برطانیہ کے خلاف مورچے لگائے اور کامرانی حاصل کی، حالاں کہ موخر الذکر محاذ قائم کرنے کے لیے سلطانِ وقت کی مرضی شاملِ حال نہیں تھی، بلکہ سب کچھ اعلیٰ فوجی کمان کے ماتحت کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں خود ان کو جنگ میں انھیں انڈر سکریٹری بنا دیا گیا لیکن وہ میز کرسی پر کام کرنے کے بجائے میدانِ جنگ کے عادی ہو چکے تھے اور اسی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے بہت جلد دفتر کے محدود دائرے سے نکل کر فوج میں آ گئے۔ انھوں نے قاف کے محاذ پر ایسی بہادری دکھائی کہ حکومت کو انھیں تمغۂ امتیاز دینا پڑا۔

اسی زمانے میں مصطفےٰ کمال پاشا سے ان کے تعلقات زیادہ استوار ہو گئے اور یہ دونوں انجمن اتحاد و ترقی کی عملی سرگرمیوں میں جس کا قیام خفیہ طور پر عمل میں آیا تھا، کھلم کھلا حصہ لینے لگے۔ اس وقت عصمت پاشا فوج کے دوسرے دستے کے چیف آف اسٹاف کے عہدے پر کرنل کے مرتبے کے ساتھ متعین تھے اور مصطفےٰ کمال باقاعدہ کرنل بن چکے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے کے کچھ عرصے بعد ۱۹۲۰ء میں بہت سے فوجی افسر انقرہ میں جمع ہوئے

اور ملک کی جنگِ آزادی کے لیے مکمل منصوبے بنا لیے، کیوں کہ وہ سب محسوس کر رہے تھے کہ اگر اس موقع پر کوئی مضبوط قدم نہ اٹھایا گیا تو برطانیہ کے سازشی اربابِ اقتدار انتہائی لوٹ کھسوٹ سے کام لے کر انھیں کسی جوگا نہ رکھیں گے اور سرزمین وطن کے اعلیٰ حصے قریبی ملکوں میں بٹ جانے کے بعد خشک صحراؤں اور سنگلاخ پہاڑوں کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا، اس لیے ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ جو کچھ کرنا ہے، فوراً کیا جائے۔

برطانیہ کی شاطرانہ چالیں ہمیشہ سے مشہور ہیں۔ اس نے جو بازی پلٹتی دیکھی تو فوج کے بعض افسروں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لینا چاہا۔ اس وقت فوج کے بے قاعدہ دستوں کے ایک سربراہ ادھم پاشا تھے، جو سرکیشیا کے باشندے تھے، وہ برطانوی سراب میں پھنس کر جادۂ وفا سے بھٹک گئے۔ مصطفےٰ کمال نے ان کو حکم دیا کہ عصمت پاشا کی قیادت میں یونانی حملے کو روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ انھوں نے یہ ماتحتی گوارا نہ کی اور عین ضرورت کے وقت ایسا ٹکا سا جواب دیا کہ لگے لگائے مورچوں کا نظام سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ بے قاعدہ دستوں کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ ساری ذمے داری تنہا عصمت پاشا نے سنبھال لی اور ذرا بھی تشویش کا اظہار نہ کیا۔ تاہم یونانیوں نے اس باہمی نزع سے فائدہ اٹھا کر بعض علاقوں پر اور خصوصاً سرحد کے قریب ریلوے نظام پر قبضہ کر لیا جو عصمت پاشا کی حکمتِ عملی سے بہت جلد واپس لے لیا گیا۔ یہ معرکہ ایک دیہی علاقے انونو کے قریب سر کیا گیا تھا اور چوں کہ وہ اس کے ہیرو تھے، اس لیے عام طور پر عصمت انونو کہلانے لگے اور یہ لفظ ہمیشہ کے لیے ان کے نام کا جزو بن گیا۔

اس لڑائی میں شاندار کامیابی پر مصطفےٰ کمال پاشا نے خوش ہو کر ان کے بارے میں کہا "عصمت نے صرف دشمن ہی کو شکست نہیں دی، انھوں نے ترک قوم کی آئی ہوئی بدقسمتی کو بری طرح پسپا کر دیا ہے۔"

ترکی کی پہلی مجلسِ کبیر ملی کے افتتاح پر وہ ادرنہ کے علاقے سے منتخب ہو کر شریکِ اجلاس ہوئے اور پہلی کابینہ میں بھی شامل کر لیے گئے۔ انھیں وزیرِ امورِ خارجہ کا منصب دیا گیا اور فوجی مرتبے کے لحاظ سے بریگیڈیر جنرل بنا دیے گئے۔

پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے کا اگرچہ اعلان کیا جا چکا تھا اور معاہدۂ صلح پر دستخط بھی ہو گئے تھے لیکن لڑائی حقیقی معنوں میں ختم نہیں ہوئی تھی۔ کہیں کہیں باقاعدہ فوجی تصادم یا معمولی

جھڑپوں کا سلسلہ جاری تھا۔ فاتح قوموں اور ان کے حواریوں نے غرورِ کامرانی اور زعمِ باطل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو علاقہ، جس طرح بھی ممکن ہو ہڑپ کر لیا جائے تاکہ اپنے مہرے ہر جگہ بٹھا دیے جائیں۔ اہم مقامات کی ناکہ بندی رہے اور جب ضرورت پڑے، وہاں سے نئے جارحانہ اقدامات شروع کیے جا سکیں اور یوں بھی تجارتی اور سیاسی اغراض پورے ہوتے رہیں۔

پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی حالت بھی خراب و خستہ ہو گئی تھی لیکن اس کے زور اور طنطنے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور لوٹ کھسوٹ کی نیت رکھنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ ترکی کا "مردِ بیمار" بسترِ علالت سے بھی ایسا کرارا جواب دے سکتا ہے، جو دوسروں کو محوِ حیرت ہی نہیں کرے دماغی الجھنوں میں مبتلا کر دے۔

اگست ۱۹۲۲ء میں یونانیوں نے انگریزوں کی شہ پا کر ایک اور حملہ کیا تو عصمت انونو وزیرِ خارجہ ہونے کے باوجود میدانِ جنگ سے دور نہ رہ سکے۔ انھوں نے باقاعدہ فوج کی کمان ہاتھ میں لی اور دشمن پر پل پڑے۔ یہ وار بھی خالی نہ گیا۔ اس دفعہ نہ صرف دشمن کے چھکے چھوٹے بلکہ اس کی فوج کے ہزاروں سپاہی وبائی دور میں مرنے والی مکھیوں کی طرح موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اس سے یونان کے عوام میں کھلبلی سی مچ گئی اور انھوں نے اپنی حکومت سے صاف کہہ دیا کہ اگر آئندہ ترکی کے کسی علاقے پر حملے کا ارادہ کیا تو ہم ملک میں بغاوت برپا کر دیں گے۔ منصوبوں کے اس طرح ٹوٹ جانے اور بازی کے بار بار پلٹ جانے سے خود برطانیہ کی ہمت بھی جواب دے گئی اور اس نے مناسب یہی سمجھا کہ کسی نہ کسی قیمت پر سمجھوتہ کر کے صلح کر لی جائے۔

چناں چہ لارڈ کرزن نے لوزان کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا اور ترکی کو دعوتِ شرکت دی۔ ترکی نے حصہ لینے پر آمادگی تو ظاہر کر دی لیکن چند ایسی شرائط کے ساتھ جو داعیانِ اجلاس کے لیے بظاہر ناقابلِ قبول تھیں لیکن اس کے سوا چارۂ کار بھی نہیں تھا کہ ترکی کو شریک کرنے کے لیے انھیں عارضی طور پر مان لیا جائے اور تفصیلات برسرِ اجلاس طے ہوں اور موقع لگا کر ترکی کو زچ کر دیا جائے۔

دیکھا جائے تو شرکت کی شرائط پیش کرنے میں جو دَم خم ترکی نے دکھایا، وہ اس کے عزائم پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی تھا لیکن پھر بھی شاطر اپنی چالیں چل رہے تھے اور کوشاں تھے کہ یورپی بساطِ سیاست کے اس اہم مُہرے کو اس طرح شہ دی جائے کہ اسے کوئی اور گھر نہ ملے۔ وہ گھبرا کر ہتھیار ڈال دے اور بازی اپنے ہاتھ رہے لیکن ترکی وفد کے سربراہ عصمت نے کوئی وار خالی

نہ جانے دیا۔ سارے یورپ، خصوصاً برطانیہ کے سیاسی پہلوانوں کو اس طرح چکت کیا کہ وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور ترکی کی من مانی باتوں کو قبول کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔

اس کانفرنس کا ایک دل چسپ واقعہ بھی ہے۔ عمارت کے وسیع ہال میں جو کرسیاں پہلے سے موجود تھیں، وہ اس اجلاس کے مندوبین کی تعداد سے بہت کم تھیں، اس لیے فالتو کرسیوں کا عین وقت پر انتظام کرنا پڑا جو یقیناً انمل بے جوڑ ثابت ہوئیں۔ وہ بغیر دستے کی تھیں اور ان کی پوشش بھی عمدہ نہیں تھی۔ یہی کرسیاں ترکی وفد کے لیے مخصوص کی گئیں۔ عصمت انونو نے دوسرے مندوبین کے ساتھ ساتھ ہال میں داخل ہوتے ہی اس فرق کو ایک نظر میں بھانپ لیا۔ انھیں گمان ہوا کہ اس فرق کا مقصد ترکی وفد کو دوسرے مندوبین کے مقابلے میں ایک ارتزالی درجہ دینا ہے۔ وہ بھلا یہ تحقیر کیوں کر گوارا کر لیتے۔ انھوں نے بلند آواز میں داعیٔ اجلاس برطانیہ کے وزیرِ خارجہ لارڈ کرزن کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "کیا سوئزر لینڈ میں تمام مندوبین کے لیے یکساں قسم کی کرسیاں میسر نہیں آسکتیں اور اگر یہ ممکن نہیں تھا تو کیا یہ ضروری ہے کہ صرف ترکی وفد کے لیے سب سے ادنیٰ قسم کی کرسیاں مخصوص کی جائیں؟"

لارڈ کرزن سرِ اجلاس اس بیباکانہ سوال پر گھبرا گئے۔ فوراً معذرت چاہتے ہوئے جواب دیا کہ یہ امتیازی کارروائی دانستہ طور پر نہیں کی گئی ہے بلکہ وقت کی کمی کے باعث مجبوراً ایسا ہوا ہے مگر عصمت انونو بھلا کب چوکنے والے تھے۔ انھوں نے دوبارہ طنزاً کہا کہ اگر واقعی یہ سب کچھ محض تنگیٔ وقت کی وجہ سے ہوا ہے تو اب آپ کو کافی مہلت دی جاتی ہے، حسنِ انتظام کے صحیح اصولوں کے مطابق مناسب تبدیلیاں کر لیں۔ اس اثنا میں ترکی وفد ہال سے باہر انتظار کرے گا۔ یہ کہا اور اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لے کر برآمدے میں نکل گئے۔

ایک دم سارے ایوان پر قبرستان کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ کچھ دیر بعد صرف روسی وفد کے سربراہ کا ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔

لارڈ کرزن نے منتظمین کو ہدایت کی کہ فوراً دوسرے ہال سے جو امرائے خاص کے لیے مخصوص تھا، فالتو کرسیاں اٹھوالی جائیں اور انھیں ان کرسیوں کی جگہ رکھ دیا جائے جو ترکی کے وفد کے لیے نامزد ہیں۔ اتفاق سے یہ کرسیاں سب سے زیادہ عمدہ اور نمایاں تھیں۔ پھر وہ باہر گئے اور صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے عصمت انونو سے استدعا کی کہ براہِ کرم آپ اپنے وفد کو لے چلیے۔ اب شکایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ترکی وفد نہایت طمطراق کے ساتھ اندر آیا اور نئی کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گیا ـــــ اور جب مذاکرات شروع ہوئے تب بھی ترکی نمائندے جرأت اور بے باکی کا اظہار کرتے رہے۔

اس کانفرنس میں صرف ترکی، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے نمائندے شریک ہونے تھے، لیکن روس نے مطالبہ کیا کہ اس کے نمائندوں کو بھی حصّہ لینے دیا جائے۔ قدرے بحث و تمحیص کے بعد اسے شرکت کی اجازت مل گئی۔

کانفرنس کے ایجنڈے میں سب سے اہم شق قسطنطنیہ اور آبنائے باسفورس کے مستقبل سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ مسئلہ آسانی سے حل ہونے والا نہیں تھا۔ لارڈ کرزن چاہتے تھے کہ ترکی کے لیے بھی اپنی اس روایتی پالیسی کو عمل میں لائیں جسے وہ مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے ملکوں کے ضمن میں عملی جامہ پہناتے رہے تھے۔

ترکوں کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ کسی غیر ملک کی دباغت میں رہیں گے۔ چناں چہ مذاکرات کے دوران میں جب یہ کہا گیا کہ ترکی کی اقتصادی حالت اتنی ابتر ہے کہ دوسروں سے امداد لیے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا اور اس لیے مناسب ہے کہ وہ مکمل آزادی کا خواب نہ دیکھے تو عصمت انونو نے فوراً تڑک کر جواب دیا کہ آپ حضرات کو اظہارِ تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ ترک قوم اپنے پاؤں پر کھڑی ہے اور کھڑی رہے گی اور کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گی۔

تمام بات چیت نہایت تلخ فضا میں ہوئی لیکن ترکی وفد وطن سے روانہ ہوتے وقت جو فیصلے کر آیا تھا، ان پر جما رہا، ایک انچ پیچھے نہ ہٹا اور ہر بار اس کی یہ دھمکی حاضرینِ اجلاس کو تشویش میں ڈال دینے کے لیے کافی تھی کہ اگر ہمارے موقف کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے تو ہم واپس جا رہے ہیں۔ آپ لوگ آپس میں فیصلے کرتے رہیے جن سے ہمیں کوئی سروکار نہ ہوگا۔ چناں چہ عملی طور پر ایسا ہوا بھی ـــ یہ کانفرنس ایک بار ملتوی کر دینی پڑی اور ترکی وفد واپسی کے لیے تیار ہو گیا، لیکن سمجھا بجھا کر بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منت سماجت کر کے اسے روک لیا گیا۔ اسی لیے تو یہ کانفرنس جو ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو شروع ہوئی تھی، ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء سے قبل ختم نہ ہو سکی۔ ترکی وفد کے عزمِ صمیم کا نتیجہ ظاہر ہے کہ انجام کار اس کے سارے مطالبات مان لیے گئے۔ ترکی کی وہ سرحدیں تسلیم کر لی گئیں جن کے مطابق اس نے اپنا نقشہ تیار کیا تھا۔ قسطنطنیہ اور تھریس سے غیر ملکی فوجیں ہٹانے کا فیصلہ ہو گیا۔ ترکی نے بحیرۂ روم کے بعض وہ جزیرے جن کا نظم و نسق قائم رکھنے سے وہ حقیقتاً قاصر تھا، اٹلی کے سپرد کر دیے اور بعض حصے یونان کو دے دیے جو تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے یا باشندوں کی اکثریت

کے لحاظ سے اس کی تحویل میں چلے جانے چاہیے تھے۔ جن ملکوں نے دورانِ جنگ میں ایک دوسرے کے ثقافتی نوادر ضبط یا غصب کر لیے تھے انھوں نے واپس کرنے کے وعدے کیے۔ ترکی نے مان لیا کہ درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس میں جہاز رانی کی تمام ملکوں کو عام اجازت ہوگی لیکن وہ مقررہ محصولِ بحری ضرور ادا کریں گے۔ اس معاہدے کی کُل ۱۴۳ دفعات تھیں اور ان کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بحیثیتِ مجموعی ترکی فائدے میں رہا۔ حتیٰ کہ اس نے کانفرنس کے اخراجات میں سے وہ رقم دینے سے بھی انکار کر دیا جو اس کے ذمے ڈالی جا رہی تھی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ بڑی طاقتوں نے اپنے مفاد کی خاطر اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ ہم خود اس کے طالب نہیں تھے۔

۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو اس معاہدے پر دستخط ہوئے اور جب ترک قوم کی پوری کامرانی کے ساتھ وہ وطن واپس آئے تو ابنائے وطن نے نہایت شاندار طریقے پر ان کا استقبال کیا۔ کانفرنس کے دوران میں ساری دنیا کی توجہ اس طرف مبذول تھی۔ ہر شخص یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کانفرنس کا آخری نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ ترکی برطانوی مدبروں کے سامنے زچ ہو جائے گا۔ بعض کا اندازہ تھا کہ اختلافِ رائے پیدا ہوتے ہی اجلاس تعینِ تاریخ کے بغیر ملتوی ہو جائے گا۔ اس لیے زیادہ تر تشویش کی فضا ہر طرف طاری تھی۔ البتہ اتاترک اور ان کے چند قریبی رفقائے کار مطمئن تھے اور انھیں عصمت انونو پر کامل اعتماد تھا کہ مردِ میدان نہ تو ناکامی کا منھ دیکھے گا اور نہ اس محاذ کو خالی چھوڑ کر واپس آئے گا۔

کامران واپسی پر خیر مقدم کے وقت مصطفےٰ کمال پاشا نے بھی ان کے حُسنِ تدبّر اور شانِ جرأت کی داد دی کہ کس طرح ۳۲ دانتوں کے درمیان گھری ہوئی زبان کی طرح انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور ترکی وقار پر آنچ نہ آنے دی۔

معاہدۂ لوزان کے بعد اتاترک اور دوسرے سیاست دانوں نے مناسب سمجھا کہ قریب کے ملکوں سے اور حکومتِ برطانیہ سے بھی کچھ ایسے مزید معاہدے اور اقرارنامے طے کر لیے جائیں کہ کم سے کم لڑائی کی طرف سے خالی الذہن ہو کر ملک کی اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی پر توجہ دی جا سکے۔ اسی جذبے کے ماتحت ایک بیان دیتے ہوئے عصمت انونو نے کہا کہ "صلح کا ایک دن جنگ کے ہزار سال سے بہتر ہے" —— ان کا یہ مقولہ اس درجہ مقبول ہوا کہ تاریخِ محاربات کے صفحات میں ایک قولِ زریں بن کر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔

چناں چہ اسی خیال اور احساس کے ماتحت میثاق بلقان، میثاق سعد آباد اور معاہدۂ انقرہ دائرۂ تحریر میں آئے اور ان سے ترکی کی طاقت اور حیثیت اِتنی مسلمہ ہوگئی کہ دشمنوں کے لیے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بھی خطرے سے خالی نہ رہا۔ ان سب موقعوں پر بھی عصمت انونو ہی برات کے دولھا قرار دیے گئے اور کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر رہا۔ کیوں کہ یہ تسلیم کرلیا گیا کہ عین وقت پر دشمن کے ہتھکنڈوں کو پوری طرح سمجھنا اور بلاجھجک منھ توڑ جواب دینا صرف اسی عالی دماغ اور قوی دل کا کام ہے۔ شاید اسی وقت سے ترکی بہ ترکی جواب دینے کا محاورہ وجود میں آیا ہو۔

ابتداً میثاق بلقان پر ۹ رفروری ۱۹۳۴ء کو اتھنز کے مقام پر ترکی، یونان اور یوگوسلاویہ نے دستخط کیے تھے۔ رومانیہ اور بلغاریہ کو اصولی طور پر اختلاف تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ خلیج پر ہوگئی، اور یہ دونوں ریاستیں بھی شامل ہوگئیں۔

میثاق سعد آباد کا سلسلہ تو ۱۹۳۰ء میں شروع ہوگیا تھا اور ابتدائی گفتگو عراق، ایران اور ترکی کے مابین تھی لیکن پھر افغانستان بھی اس صف میں آ کھڑا ہوا۔ ۷ رجولائی ۱۹۳۴ء کو ان چاروں نے دستخط کر دیے۔ اس میثاق کو موجودہ بغداد پیکٹ کا ایک لحاظ سے پیش رو کہنا چاہیے۔ یہ میثاق بہت سے ملکوں کے لیے باعثِ تشویش تھا۔ چناں چہ امریکا کے ایک ماہنامے "ایشیا" نے لکھ ہی دیا کہ جمال الدین افغانی نے جو تحریک پان اسلامزم چلائی اور ناکام ہوگئی تھی، اتاترک اور عصمت انونو کی کوششوں سے اب کامیاب ہوگئی ہے۔ امریکا جیسے ملکوں کی رائے تھی کہ اسلامی ممالک کے مابین رشتۂ اتحاد قائم ہونا بنیادی اعتبار سے زیادہ برا نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ترکی سربراہ نہ ہو۔

ترکی کی بڑھتی ہوئی طاقت اتنی پریشان کُن تھی کہ فرانس اور برطانیہ کو بھی الگ الگ ترکی سے تجارتی معاہدے کرنے پڑے، کیوں کہ اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا۔

۱۹۲۳ء میں جمہوریت قائم ہونے کے بعد جب قوم نے مصطفےٰ کمال کو صدرِ مملکت منتخب کرلیا تھا تو انھوں نے عصمت انونو ہی کو پہلی کابینہ بنانے کی دعوت دی تھی۔ چناں چہ ایک مختصر سی مدت کے علاوہ جب کہ وہ بہ سبب علالت عارضی طور پر وزارتِ عظمیٰ سے خود ہی الگ ہوگئے تھے، وہ اتاترک کے آخری وقت تک اس فرضِ منصبی کو سنبھالے رہے اور جب اتاترک نے ترک قوم کو داغِ مفارقت دے کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو جمہوری اصولوں کے مطابق عصمت انونو ملک

کے دوسرے صدر منتخب کیے گئے اور ۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۰ء تک وہ برابر صدر رہے۔ اب بھی جب کہ وہ تقریباً پندرہ سال تک وزیر اعظم اور بارہ سال تک صدر رہنے کے باوجود سیاست سے کنارہ کش اور امور مملکت سے قطعی علیحدہ رہے ہیں، عوام میں ان کی مقبولیت تسلیم شدہ ہے۔ اگر آئندہ انتخابات پوری ایمان داری اور بلا جبر و اکراہ عمل میں آئے اور انھیں کسی علاقے سے کھڑا کیا گیا تو ان کی کامرانی لازمی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس ۷۰ سال کی عمر میں ایک بار پھر صدرِ جمہوریۂ ترکیہ بن جائیں۔

ترکی کے پرستاروں نے، جو تاریخی، مذہبی، ثقافتی یا معاشرتی اعتبار سے اس ملک سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اس ملک کے اربابِ حل و عقد کی بڑی بڑی تعریفیں کی ہیں، لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ دشمن ملکوں کے انصاف پسند افراد نے بھی ان کی اعلیٰ دماغی، بلند حوصلگی اور شانِ تدبر کی داد دی ہے۔ چناں چہ سر جارج کلارک نے اپنے ایک بیان میں لکھا ہے کہ ترکی کا مردِ بیمار اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ اس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور یہ شاید اس لیے ہے کہ اس نے ان دو بڑی رکاوٹوں کو جو راہِ ترقی میں حائل تھیں، ہٹا کر دور پھینک دیا ہے۔ ان میں سے ایک سلاطینِ عثمانیہ کا وجود تھا۔ ترکوں نے شخصی حکومت کا جوا اپنے کاندھوں سے ہٹانے کے بعد ہی ترقی کی ہے۔ دوسری بڑی رکاوٹ ان ملاؤں کا اقتدار تھا، جو دین و مذہب کے نام پر اپنی قوم کو قعرِ مذلت میں گرائے ہوئے تھے۔ ان دو بتوں کو مصطفےٰ کمال کے آہنی عزم کی ضرباتِ شدید نے مسمار کیا اور پھر عصمت انونو نے صحیح تدبر سے کام لے کر ان بت خانوں کی جگہ نئی تعمیرات کی بنیاد رکھی اور اس مقصد کے لیے وہ میدان ہموار کیا جس نے ترقی کی سیدھی راہیں کھول دیں۔

پھر آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ اگر اتاترک کو ترکی کا معمارِ اعظم کہا جائے تو عصمت کو ایوانِ قومی میں زینت و شان پیدا کرنے والا فن کار کہنا بجا و درست ہے۔

اسی طرح ایک اور فرانسیسی مصنف موسیو رینی مارشاں نے اپنی کتاب میں مصطفےٰ کمال کو دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں شامل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اتاترک کو اگر ایک خوبصورت انگوٹھی تصور کیا جائے تو عصمت اس انگوٹھی کا نگینہ ہیں۔ بالفاظِ دیگر اگر مصطفےٰ کمال قوم کا دل ہیں تو عصمت انونو اس کا دماغ ہیں۔ مصطفےٰ کمال نے اپنے حسنِ تدبر سے ملک کو آزاد کرایا اور عصمت نے اس کو استحکام بخشا ہے۔ یہ ویسی ہی رائے ہے جو ہمارے ملک میں قائدِ اعظم اور قائدِ ملت کے بارے میں قائم کی گئی ہے۔

دیکھا جائے تو غازی عصمت انونو کے ساتھ ہماری نشست بہت ہی مختصر رہی لیکن اس قلیل مدت میں بھی رائے قائم کی گئی کہ وہ بڑے اوصاف کے حامل ہیں۔ ان سے مل کر بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے اور واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک بڑے آدمی سے ملاقات ہوئی ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں بھی ان کے کمالات اور ان کی بُردباری اور عظمت کے واقعات کو کیسے بھُلایا یا نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناخن تدبیر سے الجھے ہوئے مسائل کی عقدہ کشائی کی ہے اور اپنی بہادری کی داد اپنے اور پرائے سے لی ہے۔ ان کے سیاسی تدبّر کا یورپ قائل ہے۔ ان کے الفاظ کی مار سے یورپ کے جرنیل لرزہ براندام ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کی لپٹوں سے ترکی کو صاف بچالے جانا انھی کے تدبّر اور انھی کی فہم و فراست کا کمال ہے اور معراج ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد ہم نے بادلِ ناخواستہ ان سے رخصت چاہی۔ انھوں نے رخصتی ہاتھ ملایا۔ اس میں بڑی گرم جوشی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ہم سے مل کر واقعی خوش ہوئے ہیں۔ پھر وہ ہمارے ساتھ ہی باہر تک آئے۔ ان کی موٹر موجود نہیں تھی۔ ہم نے اپنی موٹر پیش کی۔ وہ نہ تو اس میں بیٹھے اور نہ قاسم گلگ صاحب کی موٹر استعمال کی۔ بس شکریہ ادا کر کے ایک طرف روانہ ہو گئے۔ ہم سب کھڑے ان کو دیکھتے رہے، یہاں تک کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جتنی دیر وہ دکھائی دیتے رہے، ہم نے دیکھا کہ سڑک پر گزرنے والا ہر شخص اور بالخصوص فوجی لوگ پورے احترام کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کو "سیلوٹ" کرتے اور وہ بڑی متانت سے جواب دے کر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

ترکی موسیقی: ۔ مغرب کے قریب ہم سب واپس اپنی قیام گاہ پر آئے تو بیگم برکات کچھ برہم سی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ظہر آنے کے وقت ہمارے انتظار میں انھوں نے بھی کھانا نہیں کھایا اور اسی امید میں کہ بس اب آتے ہوں گے، اب آتے ہوں گے، انھیں تین بج گئے۔

بھائی جان محترم نے فوراً کہا کہ آپ عشائیہ کے وقت مرغن کھانوں کا ایسا اہتمام کرتی ہیں کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں بہ مشکل ہضم ہوتے ہیں۔ اسی لیے دوپہر کو ہم نے کوئی زیادہ ٹھوس غذا نہیں کھائی، خصوصاً اس لیے بھی اجتناب کیا کہ آج آخری کھانا آپ کے ساتھ ہے، کیوں کہ کل صبح یہاں سے استنبول چلا جانا ہے۔ پھر خدا جانے کب ملنا نصیب ہو اور یہ نعمتیں کب میسّر آئیں۔ اور یہ کہنے کی نہیں، یقین کر لینے کی بات ہے کہ آج آپ نے ضرورت سے زیادہ تکلف کر رکھا ہوگا اور ہم بھی آج بسیار خوری کی آزمائش میں پورے اترنے کے لیے تیار ہیں۔

وہ ہنس پڑیں۔ انھوں نے فرمایا، آج تو میں زیادہ اصرار نہیں کرسکوں گی، کیوں کہ چند نئے مہمان بلائے گئے ہیں اور دو تین ماہرینِ موسیقی کھانے پر مدعو ہیں، جو بعد میں اپنے کمالات دکھائیں گے۔ میں نے سوچا کہ آپ دونوں بھائی کتنے ہی مولوی سہی لیکن آج ترکی موسیقی سے آپ کے کان آشنا کردیے جائیں۔ اگر "سرودِ خانۂ ہمسایہ" جائز ہوسکتا ہو تو "سرودِ ہمسایہ ملک" کے لیے بھی یہی فتویٰ صادر ہوگا۔ ترکی اور پاکستان کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہ سہی لیکن دو سرے تعلقات کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ ملک کہے جاسکتے ہیں۔

یہ نہ صرف ہمارے لیے بلکہ خود برکات صاحب کے لیے بھی ایک "تازہ ترین خبر" تھی، کیوں کہ صبح کے وقت بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہوا یہ کہ ہمارے جانے کے بعد ترکی ریڈیو سے گانوں کا پروگرام نشر ہوا تو انھیں ایک دم خیال آیا اور بیٹھے بیٹھے سارا انتظام ٹیلی فون کے ذریعے کرلیا۔ بیگم صاحبہ کے حُسنِ انتظام اور ذوقِ لطیف کی داد دینی پڑی۔

ہم نے جلدی جلدی غسل کیا۔ نمازِ مغرب ادا کی اور ذرا سستانے کے لیے لیٹ گئے تاکہ تازہ دم ہوکر خوب کھانا کھائیں اور محفلِ سماع میں شریک ہوں۔ موسیقی سے مجھے اور بھائی جان کو بہت زیادہ شغف نہیں ہے لیکن ایسے حالات میں اس سے احتراز بھی نہیں کیا جاسکا۔

ترکی موسیقی پر پچھلے پچیس تیس سال میں بہت زیادہ اثر پڑا ہے، کیوں کہ یہاں کے موسیقاروں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں جا جا کر بہت سی نئی باتیں سیکھی ہیں تاہم تال سُر کے لحاظ سے بنیادی اصول ہنوز برقرار ہیں۔ آلاتِ موسیقی میں بھی بہت کم ردّ و بدل ہوا ہے۔ ویسے ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں جائیں تو تھوڑا بہت فرق کلاسیکی موسیقی تک میں محسوس ہوتا ہے۔

موسیقی کے بعض ساز اپنی وضع قطع اور نام تک کے لحاظ سے ایسے ہیں کہ پاکستان میں بھی رائج ہیں۔ مثلاً طنبورہ اور قانون ہمارے لیے کسی لحاظ سے بھی اجنبی نہیں ہیں۔ دوتارا اور تین تارا بھی مستعمل ہیں لیکن نام مختلف ہیں۔ ان کے علاوہ چھے، آٹھ، نو اور بارہ تار کے ساز بھی ہیں جو علی الترتیب بگلاما، بوزک، عاشق ساز اور میدان ساز کہلاتے ہیں۔ مضراب والے دو ساز جو بالکل سارنگیوں کی طرح ہیں، کیمنس اور کباک کہلاتے ہیں، لیکن بڑے شہروں میں ان کا رواج متروک ہوگیا ہے۔ بانسری سے ملتی جلتی ایک چیز کاول کہلاتی ہے، وہاں بھی اسے زیادہ تر گڈریے بجاتے ہیں۔ ڈھول کو داول اور طبلے کو زرنا کہتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اظہارِ جذبات کے لیے رونا، ہنسنا اور گانا قدرت کی ایسی نعمتیں ہیں، جو



علوی جمال ارکن



احمد عدنان سیگن



جمال رشید رے



حسن فرید النار



نجیل کاظم عاکس

ترکی موسیقی کے مشہور نغمہ ساز

رکسی نہ کسی صورت میں ہر شخص کو میسر آتی ہیں تو کہنا پڑے گا کہ ترک بھی گانے کی نعمت سے محروم نہیں ہیں۔ یہاں کا بچہ بچہ کچھ نہ کچھ الاپتا رہتا ہے۔ خواہ فنی اعتبار سے اس میں سقم ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہر ایک اس طرح بھی اپنے جذبات کا اظہار کرنا جانتا ہے۔

ترکی موسیقی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ خالص کلاسیکی موسیقی میں یونان و روما کی موسیقی کا زبردست آہنگ موجود ہے۔ گیتوں کی زبان میں بھی یونانی طرز شاعری کی جھلک کہیں کہیں محسوس ہو جاتی ہے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی خدوخال ذرا بدلے ہوئے ہیں، کیوں کہ سلجوقیوں کے عہد میں شمالی ایشیا کے لوک گیتوں کے رچاؤ سے قدیم آہنگ کو نیا صوتی انداز دیا گیا تھا۔ پھر عثمانیوں کے دور میں ثقافتی قدروں نے جہاں اور روپ بدلے، موسیقی کی تانوں نے بھی اپنے اندر نئے لوچ پیدا کر لیے۔

اس کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں سے جہاں اور اشیائے تجارت کا لین دین شروع ہوا موسیقی کے انداز بھی بدلے جانے لگے۔ صرف ترکوں ہی نے استفادہ نہیں کیا، دوسرے بھی ان کے رہینِ منت رہے۔ فوجی باجے کا دستور شاید سب سے پہلے ترکی میں شروع ہوا۔ یہاں فوجی بینڈ "مہتر" کہلاتا ہے۔ وہاں سے ویانا پہنچا اور پھر سارے یورپ میں پھیل گیا۔ یورپ کے ایک مشہور موسیقار موزارٹ نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور بیتھوون نے اپنا نواں راگ مرتب کرنے میں ترکی تان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ترکی مہتر سنے بغیر اپنی ایک راگنی کو مکمل نہ کر سکا تھا۔

ترکی کی جدید موسیقی پرانا جادو بڑی حد تک چھوڑ چکی ہے۔ اب نئے جام میں پرانی شراب کا سوال نہیں رہا۔ جام نیا ہے اور شراب بھی نئی ہے۔ لیکن یہ صرف بڑے شہروں کا حال ہے۔ دوسرے علاقوں میں جائیے تو جدید موسیقی کی کوئی لے تک سنائی نہیں دے گی۔

اس وقت ترکی موسیقی کے اُستادوں میں پانچ نام سب سے نمایاں ہیں ——————
نجیل کاظم عاکسس، حسن فرید النار، علوی جمال ارکن، جمال رشید رے اور احمد عدنان سیگن۔ یہ سب کے سب تقریباً ہم عمر اور پچاس سال کے پیٹے میں ہیں۔ ان کے سینکڑوں شاگرد ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق تھیٹریکل کمپنیوں یا اوپرا ہاؤسوں سے رہا ہے اور اب بھی وہ جس نجی محفل میں چلے جائیں، رونقِ محفل بن جاتے ہیں۔ ان کے بے شمار گراموفون ریکارڈ بھرے ہوئے ہیں، جن کا ملک بھر میں چرچا ہے اور ہم نے بھی سنے ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر میں نے ان کو اس لیے پسند نہیں کیا کہ انھوں نے ترکی موسیقی کی اصل روح کو مجروح کر دیا ہے۔ انفرادیت

پامال ہو گئی ہے۔

ان کے برعکس میں نے ان کم مشہور موسیقاروں کو پسند کیا جنھیں بیگم برکات نے جلدی میں ٹیلی فون کر کے بلایا تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی سمجھی جاتی ہے کہ وہ قدیم ترکی راگ کے ماہر ہیں۔

جدید ترکی آرکسٹرا کو پس پردہ رہ کر یا بالفاظ دیگر ریڈیو پر سُنا جائے تو یہ بتانا مشکل ہے کہ کس سرزمین کا نغمہ ہے اور جب یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو تو کسی بھی گیت کو دل کی آواز نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ لحن داؤدی ہی کیوں نہ ہو۔ آرٹ اپنی جگہ کتنے ہی کمالات کا حامل ہو، اگر وہ صداقت اور حقیقت سے دور ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

بزمِ موسیقی کے علاوہ کھانے کی محفل میں بھی چند مشرقی سفارت خانوں کے افسر اور ان کی بیگمات مدعو کی گئی تھیں۔ ان سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ ہم نے ان سب سے ہاتھ ملا ملا کر مغربی انداز اور انگریزی زبان میں کہا کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ یہی الفاظ ان کی طرف سے بھی دہرائے گئے۔ معلوم نہیں، صداقت، کہاں تھی اور بناوٹ کہاں۔ البتہ ایک خاتون سے مل کر ضرور خوشی ہوئی۔ ان کا اور ان کے وطن کا نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کہنے کی بات صرف یہ ہے کہ گانے کی محفل میں خود ان کی رگِ موسیقی پھڑک اٹھی۔ صاف لفظوں میں تو کس طرح کہتیں لیکن اشارے کنائے میں دل کی بات ظاہر ہو گئی۔ پھر کیا تھا۔ سب نے یک زبان ہو کر ایسی فرمائش کی جو خود ان کی آرزو تھی۔ انھوں نے والہانہ انداز میں اپنے وطن کا ایک لوک گیت سُنایا اور حقیقتاً محفل کو گرما دیا۔ ترکی موسیقاروں تک سے داد حاصل کر لی۔

اس طرح یہ شام بلکہ رات کو ساڑھے دس بجے تک کا وقت بہت ہی پُر لطف رہا۔ ہم ان کیفیات کو بھول نہیں سکیں گے اور اس اعتبار سے بیگم برکات اس روز کے لیے بطورِ خاص ہمارے شکریے کی مستحق ہیں۔

آج ہمیں بہت جلد نیند آگئی۔ اس میں اپنے ارادے کو بھی بڑا دخل حاصل تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ روح کی اس آسودگی کے بعد اب جسم کو بھی پورا آرام مل جائے کیوں کہ دوسرے دن کے لیے موٹر کار کے ذریعے استنبول پہنچنے کا پروگرام بنا لیا گیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ جس قدر سویرے روانہ ہوں، اتنا ہی اچھا ہے، تاکہ راستے کے اچھے قابلِ ذکر مقامات دیکھتے بھالتے مناسب وقت پر اس شہر میں جا پہنچیں جو مختلف قوموں اور حکومتوں کا صدر مقام رہا ہے، جس پر اغیار کی ہمیشہ

للچائی ہوئی نظر پڑی ہے اور اس لیے اس پر قبضہ و اقتدار قائم کرنے کے لیے تاریخ میں بارہا معرکے سر ہوئے ہیں، جو کئی بار تباہ و برباد اور پھر نئی شان و شوکت سے آباد ہوا ہے۔ جہاں اب بھی مشرق و مغرب کا تضاد قدم قدم پر دھوپ چھاؤں کے رنگ جماتا نظر آتا ہے۔

---

۲۶ اگست ۱۹۵۶ء — اتوار

انقرہ سے استنبول

جب سے موٹر کاروں کے کاروبار کا زمانہ شروع ہوا ہے، گھوڑے بیچ کر سونے کا محاورہ متروک ہو گیا ہے۔ لہٰذا ترکی میں عربی نسل کے گھوڑے بیچے بغیر ہم ایسے بے خبر ہو کر سوئے کہ گردشِ زمانہ یا گردشِ زمین و آسمان میں سے کسی کا بھی احساس باقی نہ رہا اور صبح کو آنکھ کھلی تو اس وقت جب کہ نمازِ فجر قضا ہو چکی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عثمانی فرمانرواؤں کی راجدھانی میں جانے کے پروگرام پر ان میں سے اکثر کی اس بُری عادت کا اثر پڑ گیا تھا جو صبح سویرے جاگ اٹھنے سے اس لیے معذور تھے کہ رات کی تھکائی کنیزیں خود بھی خوابیدہ ہونے کے باعث ان کے سرہانے کھڑی ہو کر ایسی راگنی نہیں سُنا سکتی تھیں جو انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کر دے۔ تاہم ہم اتنی زیادہ دیر بھی نہیں سوئے کہ ہمارے پروگرام میں کوئی رخنہ پڑ جاتا اور پھر روانگی بھی کاریں تھی اور کار اپنے بس میں تھی۔ جب جی چاہا چلایا اور جب جی چاہا ٹھیرا دیا۔

روانگی کی تیاری: برکات صاحب ہم سے بہت پہلے تیار ہو چکے تھے اور اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھے۔ موسم کی تبدیلی پر جس طرح بعض پرندے نقلِ سکونت کرتے ہیں، ترکی میں سفارتخانوں کے بعض افسران شروع کے پندرہ دن استنبول میں اور باقی پندرہ دن انقرہ میں گزارتے ہیں۔ انقرہ ملک کا صدر مقام سہی لیکن استنبول کے مقابلے میں اس کی وہی حیثیت ہے جو نیویارک کے مقابلے میں واشنگٹن کی ہے اور چوں کہ برکات صاحب پریس اتاشی ہیں، اس لیے بعض پرندوں کی طرح ان کے لیے بھی نقل سکونت کرنا لازمی ہے۔

وہ عموماً بیگم اور بچوں کو انقرہ ہی میں چھوڑ جاتے ہیں کیوں کہ ایک تو بچوں کی تعلیم کا سوال ہے اور دوسرے گھر کا مسئلہ۔ اگر سارا کنبہ ہر پندرھویں دن حرکت میں رہے تو کسی کو بھی سکون

نصیب نہیں ہو سکتا۔

استنبول جاکر برکات صاحب اور دوسرے سفارت خانوں کے نمائندے عموماً ہوٹل ہلٹن میں ٹھیرتے ہیں۔ وہاں ان کے لیے کمرے پہلے سے مخصوص کر دیے جاتے ہیں۔ البتہ اس بار انھوں نے ایک کمرہ ہمارے لیے مخصوص کرالیا، جسے ہوٹل کے منتظمین کی خاص عنایت کہا جاسکتا ہے، ورنہ ہر مہینے کے پہلے دو ہفتوں میں وہاں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ ان دنوں دوسرے سیاح اور ہوٹلوں کو اپنا ٹھکانا بناتے ہیں۔

دوسرے سفارتی نمائندوں کی بیویوں کے دل ٹٹولنے کا موقع تو نہیں ملا، البتہ بیگم برکات کے تاثرات سے یہ اندازہ ضرور لگالیا کہ وہ ان دنوں نہ صرف غمگین و اداس بلکہ برہم بھی رہتی ہوں گی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہوٹل ہلٹن کو عام طور پر آرام پرستوں کا اڈا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ایک تہائی حصہ نائٹ کلب کے طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی اس حصے میں سورج چھپنے کے فوراً بعد ہی صبح ہوتی ہے، اور طلوعِ آفتاب کے ساتھ شام کی سی مُردنی چھا جاتی ہے۔ اصولی طور پر اس حصے میں کام کرنے والا عملہ بھی دن کو سوتا اور رات کو جاگتا ہے۔

بیگم برکات کو مشرقی عورت کی عین فطرت کے مطابق اس ہوٹل میں اپنے شوہر کا عارضی قیام بھی اکھرتا ہے۔ ہر چند کہ انھیں اپنے شوہر پر پورا اعتماد ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کا دل تو مشرقی عورت کا دل ہے، جس کے اِحساسات کی کُل کائنات سمٹ کر شوہر کے وجود سے وابستہ ہو جاتی ہے اور وہ اپنے رفیقِ حیات کے جذبات کی دُنیا میں کسی غیر کا دخل ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ شاید ان پندرہ دنوں میں یہ احساس ہی انھیں پریشان کرتا ہو گا کہ غیر عورتوں کی بُری نظریں ان کے شوہر پر پڑ رہی ہوں گی —— وہ نظریں جن سے بچنے کے لیے امام ضامن یا کوئی اور تعویذ بھی کارگر نہیں ہو سکتا، جن کو محسوس کر کے انسان چیخ اٹھتا ہے ؎

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

اگر ان کا بس چلے تو وہ اپنے شوہر کو بُرقع اڑھا کر استنبول بھیجا کریں لیکن وہاں بُرقع تو عورتوں کے لیے ممنوع ہے۔

برکات صاحب رختِ سفر میں بہت سے سرکاری فائلوں کا پلندہ بھی باندھے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کام کرتے ہیں۔ چلتاؤ کام تو دفتر میں ہو جاتا ہے، لیکن جہاں عمیق غور و فکر

کی ضرورت ہوتی ہو، سلیں گھر پر لائے بغیر بات نہیں بنتی۔

ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد سب نے ناشتہ کیا۔ بیگم برکات کسی قدر فکر مند اور کچھ کھوئی کھوئی سی تھیں۔ میں نے اپنی رائے کا اظہار تو نہیں کیا، لیکن اگر تبادلِ خیالات کی نوبت آتی تو یہ کہنے سے باز نہ آتا کہ وہی عورت اپنے شوہر کی طرف سے مشکوک ہوتی ہو جس کی اپنی محبت کی تپش صحیح درجۂ حرارت کو نہیں پہنچتی۔ اگر اس میں والہانہ سپردگی موجود ہو تو مرد کا دل اس طرح موہ سکتی ہو کہ وہ ہزار عورتوں کے درمیان گھر جانے کے بعد بھی اسی کا ہو کر رہ سکتا ہو۔ یہ میرے ذاتی نتائج افکار ہیں۔ خدا کرے بیگم برکات کو ان کا علم نہ ہو۔

ان الفاظ کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ناشتے کے اہتمام میں آج اور بھی زیادہ تکلف برتا گیا تھا۔ دردِ سر کی ہلکی تکلیف نے ناشتہ سے محروم رکھا، مگر اور سب نے خوب ڈٹ کر کھایا، تاکہ اگر راستے میں کہیں ضرورت سے زیادہ ٹھیرنا پڑ جائے تو کہیں اور منھ جھٹالنے کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک بہت بڑا ناشتے دان "ناشتہ آید بکار" کے مصداق ہمارے ساتھ بھیجا جا رہا ہی۔ بھلا اعتراض کرنے کی ہمت کس میں تھی۔ لہٰذا اسے بھی شاملِ رختِ سفر کر لیا گیا۔ ملازم کو حکم ملا کہ "ایں ہم بر سرِ علم" کہہ کر اسے بھی گاڑی کے پچھلے حصے میں سوٹ کیسوں اور دوسرے سامان کے ساتھ چُن دیا جائے۔

آج رجیس اور سارہ بھی غمگین نظر آ رہی تھیں اور یہ حقیقت ہو کہ ایسے اچھے بچّوں کی جُدائی ہمیں بھی شاق گزر رہی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم ساری عمر کے لیے چھاؤنی چھانے وہاں نہیں گئے تھے۔ آج نہیں تو کل "اے مُسافر تجھے جانا ہی پڑے گا" —— کے مصداق ہماری روانگی لابد تھی۔

ہم نے بیگم برکات کی بے حد مہمان نوازی اور اس خلوص کا جو انھوں نے ہم کو آرام پہنچانے میں روا رکھا تھا، تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ عین اس وقت مجھے بلجیم زبان کی ایک مثل یاد آ گئی جو ان کو بھی سُنا دی گئی۔ کہتے ہیں کہ تین دن بعد مچھلی اور مہمان میں سے بو آنے لگتی ہو۔ میں نے کہا، ہم کو آئے ہوئے چار دن ہو گئے ہیں بلجیم کی مثل ہم پر تو صادق نہیں آتی۔ وہ "لاحول ولا" کہہ کر مسکرا دیں اور اس طرح ان کا موڈ کسی قدر ٹھیک کر کے ہم گھر سے چل ہی پڑے۔

پہلی منزل :- گھر سے جب روانہ ہوئے تو میری طبیعت کسی قدر مضمحل ہونے لگی تھی اور اس کیفیت نے جلدی ہی بڑھ کر شدید دردِ نیم سر کی صورت اختیار کر لی۔ اس لیے میں نے موٹر چلانا گوارا نہ کیا۔

برکات صاحب خود ہی اسٹیئرنگ پر جا بیٹھے۔ میں نے ان کے قریب کی نشست لی تاکہ تازہ ہوا کے شدید جھونکوں کا دباؤ اعصاب سر کے کھنچاؤ کو ڈھیلا کر دے، خون کی روانی تیز ہو جائے اور شاید اس طرح درد سے نجات مل جائے۔ برکات صاحب کے سیکریٹری مسٹر اردغوان جو ہمراہ تھے اور بھائیجان محترم پیچھے کی نشست پر آرام سے دراز ہو گئے۔

گاڑی بہت تیزی سے چل پڑی اور جلدی ہی حدودِ شہر سے باہر نکل گئی۔ تقریباً ویسے ہی مناظر نگاہ کے سامنے آنے لگے جن سے قونیہ جاتے وقت واسطہ پڑا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور کہیں کہیں آبپاشی کے لیے کھودی ہوئی مصنوعی نہریں، جگہ جگہ کھیتوں کے بیچ میں ابھرتی ہوئی جھونپڑیاں اور ان کے قریب کھیلنے والے بچوں کے غول، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور آزاد پرندوں کی پرواز۔

انقرہ اور استنبول کے درمیان بہت ہی عمدہ، صاف، کشادہ اور بڑی حد تک سیدھی سڑک ہے۔ حال ہی میں بنی ہے اور شاید معاہدے کے مطابق اسی طرح بنتی ہوئی ایتھنز تک چلی جائے گی اور ایتھنز کا علاقہ شروع ہونے پر وہاں کی حکومت تعمیر کا کام اپنے ذمے لے لے گی۔ غالباً اس اسکیم میں اقوامِ متحدہ کا ہاتھ ہے۔

میرا اندازہ صحیح رہا۔ ہوا کے تیز جھونکوں کا جادو اثر کر گیا اور خدا جانے کب دردِ سر غائب ہو گیا۔ ہم تیزی سے اڑے چلے جا رہے تھے۔ موٹر چلتے ہوئے کافی دیر بھی ہو گئی تھی اور ہم تقریباً ½ راستہ بھی طے کر چکے تھے کہ اچانک ایک دریا کے پُل پر سے گزرنا ہوا، یہاں احتیاطاً گاڑی کی رفتار ہلکی کر لینی پڑی۔ پل پار ہوتے ہی ہم نے دیکھا کہ دائیں جانب خربوزے کی فالیز ہے اور بیل سے ٹوٹے ہوئے تازہ خربوزوں کے کچھ ڈھیر بھی لگے ہوئے ہیں۔ طبیعت مچل کر ہی رہ گئی۔ کئی سال پہلے کا دِلّی کا زمانہ یاد آ گیا کہ جب بہت سے احباب مل کر دریائے جمنا کے کنارے بہت اہتمام سے فالیز پر جاتے۔ ساری رات اور پورا ایک دن وہیں گزار کر واپس آتے تھے۔ "روے میدے کے پراٹھوں اور دنبے کے چکنے گوشت کے قورے کو ——— کہ یہ دونوں چیزیں بے حد ثقیل اور دیر ہضم ہو جاتی ہیں" ——— جمنا کی ریتی کے خربوزے منٹوں میں ہضم کر دیتے تھے اور مسلسل چڑھا چلا ئے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ نیت بھر کے سب لوگ اس طرح خربوزے کھاتے کہ فصل بھر میں اتنی رغبت کے ساتھ دوبارہ کھانا طبیعت کو گوارا نہ ہوتا تھا اور پھر دلّی کے موتی جھال کے وہ شیریں خربوزے، جن کی مثال رُوئے ارض پر کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ کابل کا سردہ بھی جس کے سامنے ہیچ ہے۔

لہذا "عمر رفتہ" کے اس دور کو آواز دیتے ہوئے میں نے گاڑی رکوالی اور سب اتر کر کھیتوں کی طرف چل پڑے۔ فالیز والوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ایک چھوڑ دو دو ساتھی ترکی زبان جانتے تھے اور اردغوان صاحب کی تو مادری زبان ہی ترکی ہے۔ لہذا مطلب بیان کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں نے "ترکی دانوں" کی معرفت کہلوا دیا کہ ہم جتنے خربوزے کھائیں گے، ان کی قیمت ادا کریں گے، مگر فالیز کے مالک نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ آپ لوگ مہمان ہیں، ہمارے نہیں، سارے ملک کے مہمان ہیں اور مہمان سے کبھی کھانے کی قیمت نہیں لی جاتی۔ چناں چہ ہم نے اتنے خربوزے کھائے کہ چھلکوں اور بیجوں کا ایک ڈھیر لگ گیا اور ہمارے میزبان کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ میں نے چار آدمیوں کو اتنی مقدار میں خربوزے کھاتے نہیں دیکھا ہے۔ اس میں سب سے بڑا حصہ شاید میرا تھا یا یہ کہ برکات صاحب نے اپنے چھلکے میرے ڈھیر میں ملا دیے اور یا خود خربوزوں کو اسٹاپ چ ہی سمجھتے رہے۔ اس تناسب کو یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے اقوامِ متحدہ کے لیے رضا کارانہ چندے جمع کرتے وقت ریاستہائے متحدہ کی حکومت چیلنج کرتی ہے کہ میرے علاوہ باقی ملک مجموعی طور پر جتنی رقم جمع کر لیں، اتنی ہی رقم میری طرف سے ادا کی جائے گی۔ بالکل اسی طرح میں نے تنہا اتنے خربوزے کھائے جتنے بھائی جان، برکات صاحب اور مسٹر اردغوان نے کھائے تھے۔ اُستاد غالب نے آم کی جو تعریف کی ہے، اسی اعتبار سے یہ خربوزے بھی میٹھے تھے اور بہت سارے تھے۔

دوپہر بھی ہو گئی اور آدھا راستہ بھی طے ہو گیا تو تازہ دم ہونے کا یہ اچھا مقام تھا۔ ناشتہ دان بھی کھل گیا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ معدے پر خربوزوں کی اس یورش کے بعد لذیذ سے لذیذ کباب بھی کوئی دل پسند چیز نہ تھی۔

موسم خاصا ٹھنڈا تھا۔ پانی جس سے منہ ہاتھ دھویا، واقعی اتنا سرد تھا کہ بمشکل استعمال ہو سکا۔ صورت شکل سے تھے تو ہم اجنبی مگر جب ہم نے اپنی اچکنیں اتاریں اور اندر سے ململ کے کرتے برآمد ہوئے تو یہ کرتا پاجامہ سب کے لیے وجہ توجہ بن گیا۔ جو آتا اور جو گزرتا گھور گھور کر دیکھتا۔

موٹر کافی خراب ہو گئی تھی۔ میں نے اسے دھو ڈالا۔ صاف کیا اور اب تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہم دوبارہ منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔

ناقابلِ فراموش حادثہ:- اب چوں کہ میری طبیعت سنبھل چکی تھی، بلکہ زیادہ بحال ہو گئی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ برکات صاحب کو چھٹی دی جائے۔ میں نے ان کے بجائے موٹر کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ بھائی جان محترم اگلی سیٹ پر آ گئے اور برکات صاحب اور اردغوان صاحب سے

باتیں کرنے کے لیے پچھلی نشست پر چلے گئے۔

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایسا عجیب واقعہ ظہور میں آیا جسے ایک حادثہ جانکاہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نے تین چار دن کے لیے میرے اعصاب بالکل بے کار کر دیے۔ اس کا محض تصور اب بھی اعضا میں کپکپی پیدا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد سے چند دن تک موٹر چلانے میں تکلف ہوتا رہا، حالانکہ میرا شمار بہت اچھے موٹر چلانے والوں میں رہا ہے۔ میرے پاس بین الاقوامی ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی طبیعت میں جولانی آ گئی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ صاف، چکنی اور سیدھی سڑک پر نئی اور عمدہ قسم کی موٹر ہاتھ کے نیچے آ جانے کے بعد اسے چلانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور اس حقیقت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو موٹر کو شوقیہ چلاتے ہیں۔

شروع میں ایک پہاڑی علاقہ آ گیا اور بڑی پُرپیچ راہوں سے گزرنا پڑا۔ یہاں میں نے ڈرائیونگ کے کمالات دکھانے شروع کر دیے اور اپنے ساتھیوں سے کسی قدر فخریہ انداز میں کہا کہ میں ۱۹۳۵ء سے یعنی تقریباً اکیس سال سے موٹر چلا رہا ہوں اور سوائے ایک بار کے میرے ہاتھوں کسی موٹر پر خراش تک نہیں آئی ہے اور ایک بار بھی جو موٹر خراب ہوئی، تو اس میں قصور میرا نہیں تھا بلکہ اس فوجی ٹرک کا تھا جو لال قلعہ دہلی کے سامنے والی سڑک پر میری موٹر سے آگے تھا اور اچانک رک کر پیچھے آ گیا تھا۔

میں اس دوران میں ساٹھ پینسٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا چلا جا رہا تھا، کبھی سوئی اس سے بھی آگے بڑھ جاتی تھی۔ اس کے باوجود باتوں کا سلسلہ جاری تھا اور میں بے خیالی میں دائیں طرف سے بائیں طرف آ گیا۔

ترکی میں کیپ ٹو دی رائٹ یعنی گاڑی دائیں طرف چلانے کا قاعدہ ہے اور ہمارے پاکستان اور ہندوستان میں کیپ ٹو دی لیفٹ یعنی بائیں طرف چلانے کا قاعدہ ہے اور میں نے اکیس سال تک موٹر اپنے ہی ملک میں چلائی تھی اور اسی کی عادت پڑ گئی تھی۔ ترکی میں سیدھی طرف چلانے کا طریقہ ذہن سے اتر گیا اور اسی رفتار یعنی پینسٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے موٹر الٹی طرف فراٹے بھرنے لگی۔

سڑک کے ایک طرف پہاڑیاں اور ان پر ذرا ظہور سبزہ تھا، مگر بڑا خوبصورت علاقہ تھا۔

دیکھیے تو طبیعت خوش ہو جائے۔ دوسری طرف یعنی بائیں جانب دریائے مرمرہ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ دریا میں کہیں کہیں سفید کشتیاں بھی تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی بادلوں کے نقاب میں سے جھلک دکھا دینے والی سورج کی کرنیں پانی پر پڑتیں تو عجیب چکا چوند پیدا کرتیں۔ آنکھ ذرا نہ ٹھیر سکتی تھی۔ اس حسین ماحول سے سب ہی متاثر تھے اور یہ ناچیز موٹر ڈرائیور بھی لطف اندوز ہو رہا تھا ــــــ اور موٹر اسی رفتار سے چلتی ہوئی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔

اچانک مجھے قریب سے "رائٹ، رائٹ، رائٹ" کی آواز سنائی دی۔ یہ برکات صاحب کے سیکریٹری مسٹر اردغوان کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے سامنے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر سبز رنگ کی ایک بڑی بس دیکھی جو غالباً مرسیڈیز تھی۔ مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ میں غلط طرف موٹر چلا رہا ہوں اور میں ایک دم غیر شعوری طور پر سیدھی طرف آ گیا۔ اسی لمحے بس والا مجھ سے بچنے کے لیے اپنے اُلٹے ہاتھ پر آ چکا تھا۔ گویا ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے مدِّمقابل ہو گئے، اور پھر پلک جھپکتے ہی میں نے دیکھا کہ ہماری موٹریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں، بس اب ٹکرائیں کہ میں نے پھر بغیر سوچے سمجھے اپنی موٹر کو الٹی طرف کر لیا اور بریک استعمال نہیں کیا۔ ایسا کرتے ہی موٹر کا رخ دوبارہ دریائے مرمرہ کی طرف ہو گیا۔ اس سے بچایا اور اس کوشش میں میری گاڑی سڑک پر نہ معلوم کتنے چکر کھا چکی تھی اور پھر موٹر خود ہی استنبول کی طرف ہو کر ایک تیز فراٹے کے ساتھ سیدھی روانہ ہو گئی۔ کوئی کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ سب کیا ہوا۔

تقریباً چار پانچ میل چلنے کے بعد میں اپنے اوسان درست کر سکا اور اس وقت سوچا کہ موٹر روکنی چاہیے۔ چناں چہ موٹر روک لی۔ لیکن اس میں سے باہر نکلنے کی سکت نہیں تھی۔ پہلے پچھلی نشست کے دروازے کھلے اور اردغوان اور برکات صاحب باہر نکل گئے۔ پھر بھائی جان محترم اور آخر میں میں باہر آیا۔ گاڑی کو ہر طرف سے دیکھا، بس ایک بال برابر خراش سی آئی تھی اور میں اب سمجھ گیا کہ کیا ہوا۔ میں نے جب دوبارہ موٹر کو بریک لگائے بغیر بائیں جانب موڑا تو ساٹھ میل کی رفتار پر چلنے والی موٹر کو دریائے مرمرہ میں جا کر تیر جانا چاہیے تھا، مگر اس کے لیے ہم میں سے شاید کوئی بھی تیار نہیں تھا، اس لیے میں نے دریا سے موٹر کو بچانے کی ایک پوری سعی بے اختیار کی۔ سڑک پر حد بندی کے لیے جو سفید چھوٹے ستون گاڑ دیے جاتے ہیں، اس ایک ستون نے دریا میں موٹر کو گرنے سے روکا۔ ایسے وقت پر کہ موٹر زمین سے آدھر ہو، یہ ایک ذرا سا سہارا کام کر گیا۔ پھر دوسری طرف گہرے کھڈ تھے۔ ان سے بچانے کی کوشش میں نہ معلوم میں نے کیا حرکات کی ہوں گی۔ اتنا ضرور

یاد ہے کہ بھائی جان محترم گھبرا کر "بھائی، بھائی، بھائی" کہہ رہے تھے اور موٹر سڑک پر لٹو کی طرح چکر کھا رہی تھی! اور پھر خود ہی منزلِ مقصود کی طرف رخ کر کے چل پڑی۔ بس یہ ہوا۔ البتہ میرے اُلٹے ہاتھ کی انگلیاں اتر چکی تھیں اور ان میں سخت تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

نہ جانے اس دوران میں مسٹر اردغوان نے کیا حرکت کی تھی کہ ان کا اُلٹا ہاتھ پہنچے سے کہنی تک زخمی ہو چکا تھا اور بُری طرح خون بہہ رہا تھا۔ برکات صاحب بقول ان کے یہی سمجھتے رہے کہ میں ڈرائیونگ کا کوئی کمال دکھا رہا تھا۔

یہ عقدہ اب تک حل نہیں ہو سکا کہ اردغوان صاحب نے اپنی کلائی پر چھ سات انچ لمبا زخم کیسے ڈال لیا اور یہ دونوں گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں کیوں نہیں۔ میری موٹر کی رفتار ۶۰-۶۵ میل تھی اور بس کی رفتار بھی ۳۵-۴۰ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ اس طرح مجموعی رفتار تقریباً سو میل فی گھنٹہ ہوئی اور درمیانی فاصلہ صرف دو فرلانگ، جسے طے کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگے ہوں گے اور اس قلیل مدت میں کیا کیا نہ ہو گیا۔

اس حادثے کے بعد (نہ جانے اسے حادثہ کہا جائے یا معمولی واقعہ) میں موٹر چلا ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اپنی لاج رکھنے کے لیے استنبول کی فیری بوٹ تک اسے لے گیا اور پھر جو عصبی توازن خراب ہوا ہے تو بقول شخصے طبیعت درست ہو گئی ہے۔ یہ واقعہ زندگی بھر فراموش نہیں کر سکوں گا۔

منزل کے قریب:- انقرہ سے استنبول تک کا فاصلہ ۴۷۵ کلومیٹر ہے۔ بغیر رکے مناسب رفتار سے چلا جائے تو یہ مسافت آٹھ گھنٹے میں طے ہو سکتی ہے لیکن راستے میں دو ایک جگہ ہمیں ضرورتاً یا تفریحاً رکنا پڑ گیا تھا اور پھر یہ بھی چاہتے تھے کہ شام کے پانچ بجے تک ضرور اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے گاڑی کو کشتی پر سوار کر کے اور آبنائے باسفورس کو عبور کر کے ترکی کے ایشیائی علاقے سے یورپی حصے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہم ریل کے ذریعے آتے تو حیدر پاشا نامی مقام پر جو ریل کا آخری اسٹیشن ہے، اترنا پڑتا اور وہاں سے بھی فیری ہی کے ذریعے دوسرے ساحل پر پہنچ جاتے۔ حیدر پاشا تک پہنچنے کے لیے پختہ سڑک بھی موجود ہے لیکن موٹر کار کے ذریعے انقرہ سے آنے والے سیاح اُس قُودر کے مقام پر جانے کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ وہاں سے فیری کا راستہ بہت مختصر ہوتا ہے، صرف بیس منٹ میں آبنائے پار کر لی جاتی ہے اور مسافروں کی زیادہ بھیڑ بھی نہیں ہوتی۔ آسانی سے جگہ مل جاتی ہے۔ البتہ موٹروں کے لیے جگہ کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مقام تک پہنچنے سے پہلے درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ آتا ہے جسے

ایک قدرتی باغ بھی کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ وہاں پھلوں کے بہت سے درخت ہیں۔ پرانے استنبول اور نئے علاقے کے اکثر باشندے چھٹی والے روز تفریح کے لیے اسی علاقے میں آتے اور سارا سارا دن گزار دیتے ہیں۔ ہم ہوا کے خوشگوار جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے اس علاقے کے قریب سے گزر گئے۔

آگے چل کر کاغذ سازی کا ایک بہت بڑا کارخانہ بھی قائم ہے لیکن اسے دیکھنے کا موقع نہیں تھا، کیوں کہ وہ ہماری منزل سے ذرا ہٹ کر واقع ہوا ہے۔

فیری جلدی ہی مل گئی اور ہم بیس منٹ بعد دوسرے ساحل پر جا اترے۔ اس گھاٹ کو مجلسی مبوسان کہتے ہیں۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر کئی خوش نما ہوٹل ہیں، جن میں سے استنبول ہلٹن، دیوان ہوٹل، پارک ہوٹل اور تقسیم سرائے بہت مشہور ہیں۔ ہوٹل کو ترکی تلفظ کے مطابق اوٹیلی کہتے ہیں۔

ہوٹل میں:۔ برکات صاحب کے فیصلے اور پیشگی انتظام کے مطابق ہمیں ہلٹن جانا تھا چنانچہ اپنی ہی کار میں وہاں پہنچ گئے۔ اسے بعض لوگ ہوٹل استنبول بھی کہتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک شہر میں ایک ہی ہوٹل قابل ذکر ہے۔ یہ تقریباً پچاس ہزار مربع میٹر زمین پر ایک اونچی پہاڑی کی ڈھلان کو ہموار کرنے کے بعد تعمیر کیا گیا ہے۔ صرف زمین کی قیمت ایک کروڑ روپے سے زیادہ تھی، اور اس پر تعمیر کی لاگت تین کروڑ روپے سے بھی بڑھ گئی۔ جدید ضروری آلات اور آرائش کے سامان کی قیمت ان رقموں سے علیحدہ رہی۔

پانچ کروڑ کے اس ہوٹل میں ٹھیرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہاں کے روزانہ خرچ کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم دونوں بھائیوں کے واسطے ایک کمرہ اور برکات صاحب کے واسطہ اٹھارہ بیس دن کے لیے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص کیا گیا تھا۔ ارغوان صاحب کو اپنے لیے الگ انتظام کرنا تھا، اس شہر میں ان کے بہت سے رشتے دار موجود ہیں۔

پتہ چلا کہ فوراً وارد ہونے پر عموماً اس ہوٹل میں کمرے خالی نہیں ملتے اور منتظمین کو روزانہ بہت سے سیاحوں وغیرہ کو مایوس کرنا پڑتا ہے۔ کمروں کی کُل تعداد شروع میں تین سو تھی۔ ان میں ایک سو کمروں کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے۔ ان رہائشی کمروں کے علاوہ قہوہ پینے، شراب پینے، کھانا کھانے کے متعدد ہال آٹھوں منزلوں پر الگ الگ ہیں تاکہ مسافروں کو زیادہ دقت نہ ہو۔ سارے ہوٹل میں آٹھ دس جگہ بجلی کے لفٹ لگے ہوئے ہیں، جن کو چلانے اور دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہوٹل میں بجلی کا اپنا انتظام ہے۔ ۲۲۰ وولٹ کی اے سی کرنٹ والی بجلی تیار ہوتی ہے۔ ورنہ شہر کے

دوسرے بہت سے اور خصوصاً پرانے علاقوں میں ۱۱۰ وولٹ کی بجلی استعمال ہوتی ہے۔ تاہم ٹرانسفورمر کے استعمال سے بجلی کے وولٹیج میں حسبِ ضرورت کمی بیشی کرلی جاتی ہے۔ اے سی کو ڈی سی میں بھی تبدیل کیا جاتا ہے۔

ہوٹل کے ہر کمرے کے ساتھ غسلخانے علیحدہ ہیں لیکن اس ہوٹل کی سب سے بڑی خصوصیت عیش پرستوں کے لیے یہاں کی حیاتِ شبینہ ہے۔ ایسے حصے بالکل الگ ہیں، جہاں رات بھر خوب چہل پہل رہتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم جیسے قدامت پسند لوگوں کے لیے یہ ہوٹل رہنے کے لائق نہیں ہے جہاں ہر قسم کا لہو ولعب جائز سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس سے اجتناب کرنے والوں پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ عیش پرستی ایک قسم کی متعدی بیماری ہوتی ہے اور اس کے جراثیم علیحدہ رہنے کے باوجود دوسروں کو چمٹ جاتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ آنکھیں بند کرکے اس میں قیام کریں گے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کی بُری نظر ہمیں لگ جائے۔ سُنا ہے کہ ایسے جراثیم آنکھوں کی راہ دل میں اترتے ہیں اور پھر تمام اعضائے رئیسہ کو خراب کردیتے ہیں۔

چھتوں پر بنے ہوئے باغیچوں کے علاوہ تیرنے کے لیے بھی کئی تالاب موجود ہیں، جن میں اتر کر نہانا ہمارے نزدیک عیاشی ہی کے مترادف ہے۔ ایک تالاب ایسا بھی ہے جس میں بھرے ہوئے پانی کو حسبِ ضرورت ایک ڈیڑھ گھنٹے میں یخ بستہ کیا جاسکتا ہے تاکہ اس پر شوقین لوگ اسکیٹنگ کرسکیں۔ اس ہوٹل میں ہر قسم کی دکانوں، ہوائی کمپنیوں کے دفتروں، بنک، ڈاک خانے، مختلف زبانوں میں ٹائپ اور ترجمہ کرنے والوں کا انتظام بھی موجود ہے۔ ایک بڑے ہال میں روزانہ ایک فلم شو بھی ہوتا ہے۔ ایک بڑی مرکزی لائبریری کے علاوہ ہر کمرے میں ایک ایک بُک شیلف لگا ہے تاکہ فالتو وقت میں مطالعہ کیا جاسکے۔ غرض یہ ہے کہ ایسی بہت سی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں کہ ہوٹل سے کئی کئی دن تک باہر جائے بغیر گزارہ ہوسکتا ہے۔

ہوٹل پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہم نے سوچا کہ بنک سے ایک ٹریولر چک بُھنا لیا جائے معلوم ہوا کہ آج سارے ملک میں بنکوں کا کاروبار بند ہے حتیٰ کہ وہ بنک بھی بند ہیں جو مسافروں کی آسانی کے لیے تعطیلات کے دنوں میں اور فالتو وقت میں کھلے رہتے ہیں۔ سفری کمپنیوں اور ہوٹل والوں سے بھی اس کا امکان نہیں تھا۔ تعطیل کا سبب یہ ہے کہ ملک کے سب سے بڑے قومی بنک کی آج ۳۲ ویں سالگرہ ہے۔

قومی بنک:- یہ اِش بنک ۲۶ اگست ۱۹۲۴ء کو قائم ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ کمال اتاترک

نے قومی جدوجہد سے فارغ ہونے اور کامیابی کے ساتھ جمہوریت قائم کرنے کے ایک ہی سال بعد بنک قائم کرنے کا منصوبہ تیار کرلیا اور اسے عملی جامہ پہنانا شروع کردیا، حالاں کہ نئی جمہوریت کے پاس رُپیہ برائے نام تھا۔ سلاطین اور خلفا ہمیشہ سرکاری خزانے پر بار بنے رہے تھے، بلکہ اپنی عیاشیوں کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے مقروض رہتے تھے۔ اس بنک کے قیام کے وقت بہت سے بدخواہ ملکوں نے فقرے چُست کیے اور کہا کہ ترکی نہ جانے کس بَل بوتے پر یہ قدم اٹھا رہا ہے ایک لحاظ سے ان کا یہ تمسخر بے جا نہ تھا۔ ملک کی اقتصادی اور مالی حالت ہی کچھ ایسی تھی۔ کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ ایک سرکاری بنک دس لاکھ لیرا یعنی تقریباً سترہ لاکھ روپے کے سرمائے سے قائم کیا گیا ہوگا۔ لیکن یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔

بنک کے پہلے جنرل مینجر محمود جلال بایار تھے جو اس وقت جمہوریہ ترکیہ کے صدر ہیں، ان کی سرگرم کوششوں سے بنک نے جلد ترقی شروع کردی۔ پہلے چار مہینے میں پچیس لاکھ لیرا جمع کردیے۔ دوسرے سال اسّی لاکھ اور جمع ہوگئے اور پھر تو یہ حالت تھی کہ انتظام سنبھالنا دشوار ہوگیا۔ قیام کے دسویں سال میں اس کا سرمایہ تیرہ کروڑ دس لاکھ لیرا تھا اور بیس سال بعد کُل اثاثہ چونسٹھ کروڑ چالیس لاکھ ہوگیا۔ اب ایک ارب سے زیادہ ہے۔

کل صبح سے پہلے کہیں جانے کا پروگرام نہیں تھا اور ہوٹل میں بھی فوراً کوئی رقم صَرف کرنی نہیں تھی، اس لیے اطمینان تھا کہ چلو آج نہیں تو کل چک بھُنالیا جائے گا۔

پہلا نظارہ :۔ ہوٹل میں اپنا سامان قرینے سے رکھ دینے اور نہانے دھونے کے بعد ہم نے مناسب سمجھا کہ ہوٹل کی سب سے آخری منزل کی کھُلی چھت پر پہنچ کر حدِ نظر تک ایک طائرانہ نگاہ سے جائزہ لیا جائے۔

ہوٹل والوں نے قدرتی طور پر اس آخری چھت سے باقاعدہ فائدہ اٹھایا تھا یعنی یہاں بھی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور مشروبات کا دور چل رہا تھا اور مشروبات میں بھی کچھ شامل تھا۔ یہ غنیمت ہے کہ ہوا کے جھونکے تیز تھے اور ہم اس سمت میں جاکر بیٹھے تھے جو ہوا کے آنے کا رخ تھا، اس لیے اس ماحول میں پھیلی ہوئی اچھی یا بُری کوئی سی مہک ہماری قوتِ شامہ پر اثر انداز نہیں ہوسکتی تھی۔

معمولی شربت کے لیے ہماری فرمائش پر بیرے نے ہمیں گہری نظر سے دیکھا۔ اس کی زندگی میں شاید ایسے لمحے کم آتے ہوں گے جبکہ ماحول رومانوی ہو، فضا خوش گوار ہو اور سماں سہانا ہو اور

اس کے خیال کے مطابق ہم جیسا کوئی "بد ذوق" صرف شربت کی فرمائش کر بیٹھے۔ چناں چہ دوسری میزوں پر تو سروس بہت عجلت کے ساتھ ہو رہی تھی لیکن ہمارے لیے شربت گھولنے میں اسے خاصی دیر ہوگئی۔ ہمیں یہ تاخیر گوارا تھی کیوں کہ ہم اس کے بجائے جان بوجھ کر زہر نہیں پی سکتے تھے اور پھر یہ اس شربت ہی کی برکت تھی کہ تومی پھولوں کو لذتِ التشام دینے والی تیتریاں قدرتی طور پر ہم سے دور رہیں۔ اگر وہ اچھلتی کودتی، ناز نخرے دکھاتی ہمارے بھی قریب آدھمکتیں تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ بیروں کی طرح شاید انھیں بھی ہم سے مایوسی ہوئی ہوگی۔

ہم کافی دیر اونچی کھلی فضا میں بیٹھے مختلف زاویوں سے شہر کا نظارہ کرتے رہے۔ کچھ فاصلے پر آبنائے باسفورس کے پانی پر چلنے والی کشتیوں کی روشنی فضا میں جھلملا رہی تھی۔ بعض سلاطینِ عثمانیہ کے عہد میں دستور تھا کہ آبنائے کی ہلکی پرسکون سطح پر بہت سے کچھوے چھوڑ دیے جاتے تھے، اور ان کی سخت پیٹھوں پر موم بتیاں روشن کر دی جاتی تھیں۔ کچھوؤں کی مدھم رفتار کے ساتھ وہ چلتی پھرتی روشنیاں عجیب فریبِ نظر دیتی اور بھلی معلوم ہوتی ہوں گی۔

کھانے کے وقت ہم نیچے اتر کر اپنے کمرے میں آئے۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ کھانا وغیرہ اپنے ہی کمرے میں کھایا کریں گے اور اس ڈائننگ ہال میں نہیں جائیں گے جس کی فضا میں کائنات کا ہر ذرہ شبابی رشعر کی سی کیفیات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عام لوگ ہوٹل ہلٹن کے بارے میں کتنی ہی اچھی رائے قائم کریں، ہم تو بہت جلد اس سے بددل ہوگئے۔ وہ غیر ملکیوں کے سرمائے سے بنا ہے اور زیادہ تر غیر ملکیوں یعنی یورپی ملکوں کے باشندوں کے استعمال میں آتا ہے اور انھی کو زیب دیتا ہے۔ ان کے ذوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ انھی کی تہذیب اپنا رنگ جماتی ہے۔ محض سفارت خانے میں افسرِ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے برکات صاحب کو ہر مہینے اس میں ٹھیرنے کا موقع مل جاتا ہے، ورنہ ان کو بھی یہاں کے منتظمین ٹال ہی دیا کرتے۔

کھانا کھانے کے بعد بھی ہم باہر نہیں نکلے۔ اعضا سب کے تھکے ہوئے تھے اور میرے خاص طور پر شل ہو رہے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ گاڑی کے نامکمل حادثے سے جو کھنچاؤ اعصاب میں پیدا ہوا ہے، وہ شدت اختیار نہ کر جائے۔

برکات صاحب کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ اردغوان صاحب پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ میں سونے کی نیت سے لیٹ گیا۔ لیکن فوراً نیند کہاں؟ حسبِ عادت کچھ وقت مطالعے میں گزرا۔ شیلف میں بیشتر کتابیں سیاحوں کے مطلب کی تھیں۔ اور مناسب بھی یہی تھا۔ بھلا افسانے

اور ناول پڑھنے کے لیے وہاں کون ٹھیرتا ہے۔

بھائی جان محترم کل کے پروگرام پر نظر ثانی کرنے کے لیے میز پر جا بیٹھے اور کچھ دیر جاگتے رہے۔ میں نہ جانے کب سو گیا۔ لیکن نیند پُر سکون نہیں تھی۔ میں اب تک اپنے اعصاب پر قابو نہ پا سکا تھا اور بار بار موٹر کے اس حادثے کا خیال آتا کہ اگر موٹر بس سے ٹکرا جاتی تو کیا ہوتا، دریائے مرمرہ میں جا ڈوبتی تو؟ اور اگر کھڈ میں گر جاتی تو کیا ہوتا۔ بڑی بے چینی تھی!

۲۷ر اگست ۱۹۵۶ء — پیر

استنبول کی عام سیر

رات کو خلافِ عادت ذرا جلد سو جانے کی وجہ سے صبح کو آنکھ سویرے ہی کھل گئی۔ اتفاق ہو کہ بھائی جان محترم بھی اس وقت بیدار نہیں ہوئے تھے اور برکات صاحب اپنے کمرے میں تھے اور یقیناً وہ بھی سو رہے تھے۔

ہوٹل کے باقی کمروں کا کیا پوچھنا' ان میں سے بیشتر کے اندر تو رات شروع ہوئے چند ہی ساعتیں گزری تھیں۔ چناں چہ ان کے لیے صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ میں نے سوچا کہ رات کی کیفیات کا تضاد دیکھنے کے لیے سب سے بالائی منزل کی چھت پر جانا چاہیے۔ چناں چہ اپنے دیسی منجن کی شیشی لے کر لفٹ کے ذریعے سے اوپر چلا گیا۔ اس وقت کہ مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں بھی سو رہی تھیں، لفٹ پر کام کرنے والی لڑکیاں بیدار تھیں۔ اس ہوٹل میں شاید سیڑھیاں ہیں ہی نہیں۔ کم از کم میں نے تو دیکھی نہیں!

کھلی چھت پر پہنچتے ہی میں حیران رہ گیا۔ حسن و شباب کی رنگینیاں لٹ جانے کے باعث ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ نہ وہ نغمے تھے' نہ قہقہے۔ فضا میں نہ شرابِ ناب کی بو پھیلی ہوئی تھی اور نہ اس کے ساتھ کھائے جانے والے دُنر کباب کی چٹپٹی مہک رقصاں تھی۔ چند ٹوٹے ہوئے گلاسوں کی کرچیاں تھیں اور جلے ہوئے سگریٹوں کے بھرے جو اُلٹی ہوئی میزوں کے آس پاس پھیلے پڑے تھے۔ خالی کرسیاں عیش و نشاط کی بے ثباتی پر نوحہ خواں تھیں۔ مجھے ایک دم غالب کا یہ قطعہ یاد آ گیا۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

جیسے کوئی قبرستان میں مزاروں کی بے حرمتی سے بچنے کے لیے پوری احتیاط کے ساتھ پھونک

پھونک کر قدم بڑھاتا ہوا میں سامانِ عیش کی ہر چیز سے دامن بچاتا ہوا کٹہرے کے قریب پہنچ گیا جہاں سے آبنائے باسفورس اور شاخِ زریں کے پار پُرانے استنبول کے دُھندلے سے نقوش نظر آ رہے تھے۔ وہ گنبد و مینار زیادہ واضح تھے جن کا رنگ آس پاس کے ماحول سے ذرا مختلف یا سنگِ مرمر سے تراشے جانے کے باعث بالکل سفید تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے صبح کے ہلکے سے اُجالے نے بہت سی چیزوں کے خدوخال کو روشن کرنا شروع کر دیا۔

اذان کی آواز کسی سمت سے نہیں آئی۔ مسجدیں اس جگہ سے، جہاں زیادہ تر مذہب سے بیگانہ لوگ آباد ہیں، کچھ زیادہ فاصلے پر واقع ہیں، اس لیے نمازِ فجر کے لیے اللہ اکبر کی صدا کون سُنتا۔

نقوش جوں جوں زیادہ روشن ہوتے گئے آج کے پروگرام کا خاکہ بھی اُجاگر ہونے لگا۔ ہمیں مسجدوں کی زیارت کرنی ہے، عجائب گھر دیکھنے ہیں بعض لوگوں سے مِلنا جُلنا ہے اور اگر وقت ملا تو شاید سلاطینِ ترکی کے وہ محلات بھی دیکھ لیں جو اب آثارِ قدیمہ میں شامل ہیں یا ان میں سے بعض جو ماضی قریب کی تعمیر ہیں، سرکاری دفاتر بنے ہوئے ہیں۔

میرا جی چاہا کہ علاؤالدین والے دیو کو بلا کر اس سے کہوں کہ مجھے اپنے قوی بازوؤں پر اٹھا کر فضا میں پرواز کرا اور کسی مسجد کے صحن میں لے جا کر اتار دے تاکہ میں فریضۂ صبح باجماعت ادا کر لوں لیکن نئی روشنی کے اس زمانے میں جب سے بجلی کی رَو قمقموں کو منوّر کرنے لگی ہے، علاؤالدین کا لیمپ، اور اس کا دیو دونوں غائب ہیں۔ دیو کو تو کوئی پری بھگا کر اپنے پرستان لے گئی ہوگی اور لیمپ اللہ ہی جانے کس کونے کھُدرے میں اپنی جوت جگا رہا ہوگا۔

میں اپنے خیالات کی حد تک ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گیا تھا، کیوں کہ نگاہوں کے سامنے اس شہر کے مناظر کروٹیں بدل رہے تھے جس کی تاریخی حیثیت بھی بہت سے افسانوں پر بھاری ہے۔ استنبول کو ہر عہد میں جادو کا شہر کہا گیا ہے۔ اس کے مختلف النّوع مناظر میں اتنی جاذبیت ہے، اس کے پوشیدہ خزانوں میں اتنی کشش ہے کہ ہر طرف سے اس پر للچائی ہوئی نظریں پڑتی رہی ہیں، اس کی تاریخ میں پورے ملک کی تاریخ پنہاں ہے۔

ہوٹل ہلٹن سے جو استنبول کے یورپی حصے میں واقع ہے، میں نے ان سات پہاڑیوں کا ہلکا سا خاکہ دیکھا جن پر روم کی طرح پرانا استنبول آباد ہے لیکن ان پہاڑیوں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے نہیں ہیں۔ جس طرح آسمان پر سات سہیلیوں کا جھمکا ہے، اسی طرح زمین پر یہ سات پہاڑیاں تقریباً ایک دوسرے سے سر جوڑے کسی کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ ان کی وادیوں میں اور ان کی

چوٹیوں پر بہت سے حملہ آور آئے لیکن جس طرح چمن کی بہارِ جانفزا میں طائرانِ خوش نوا اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جاتے ہیں، وہ فاتحین بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ختم ہوتے چلے گئے۔

بحیرۂ مرمرہ کی جانب سے ساحل پر لنگر انداز ہوا جائے تو پہلی پہاڑی سب سے زیادہ بارونق اور تاریخی اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس پر سرا غلیو محل، سنٹ صوفیا اور ہپوڈروم کے آثار ملیں گے۔ دوسری پہاڑی قسطنطین کا مینار اور نوری عثمانیہ کی مسجد سینے پر لیے کھڑی ہے۔ تیسری نے وزارتِ جنگ کے دفاتر اور مسجد سلطان سلیمان کو سنبھال رکھا ہے۔ چوتھی پر سلطان محمد فاتح کی یادگار مسجد ہے۔ پانچویں پر سلطان سلیم کی مسجد اور چھٹی پر تغفور سرائے اور اگری کاپو کا محلہ مشہور ہے۔ ساتویں پر کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے۔

اس علاقے کی تاریخ یوں تو دو ہزار چھ سو سال پرانی ہے یعنی جب پہلے پہل یونان کے ایک میگاری قبیلے کے سردار بیزاس نے یہاں ایک چھوٹی سی بستی ولادتِ مسیحؑ سے ۶۵۷ سال پہلے آباد کی اور اس کے نام کی مناسبت سے وہ بازنطیم کہلانے لگی اور پھر وہاں رہنے والی قوم کا نام بھی بازنطینی ہوگیا، لیکن اس علاقے کو زیادہ اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جبکہ قسطنطینِ اعظم نے اس پرانے شہر کو جو ایک ہزار سال سے بازنطیم کہلاتا تھا، زیادہ وسیع کرکے اپنے نام سے موسوم کرلیا۔ یہ ۱۱ مئی ۳۳۰ء کی یعنی آج سے تقریباً سولہ سو چھتیس سال پہلے کی بات ہے۔ بعض لوگ اس شہر کے سیاسی اقتدار کو ظاہر کرنے کے لیے اسے نیا روم بھی کہتے ہیں لیکن یہ سرکاری نام نہیں تھا، اس لیے سکّۂ رائج الوقت کی طرح کبھی قبول نہ ہوسکا۔ اس کے باوجود یونانی کلیسا کے اسقف اب بھی کسی تحریر پر دستخط کرتے ہیں تو اپنا عہدہ "قسطنطنیہ، نیا روم کا آرچ بشپ" لکھتے ہیں۔ قسطنطین روم کا آخری شہنشاہ تھا اور اس سے چالیس سال پہلے رومی حکمرانوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ سینٹ اور عوام کا اقتدار کم ہو رہا ہے اور معلوم نہیں، کب حکومت کا تختہ الٹ جائے اور اپنی خاص مملکت میں سر چھپانے کی کوئی جگہ باقی نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ فارس کے حملہ آوروں کو مقدس سرزمین سے پرے ہٹ کر روکنے کے لیے نیا شہر قائم کرنا ہی ضروری تھا تاکہ حکومت کا بار دو حصوں میں تقسیم کرکے کچھ ذمہ داریاں نائب السلطنت پر ڈال دی جائیں، لیکن یہ بٹوارہ دو کے بجائے چار حصوں میں کرنا پڑا اور اسی وجہ سے اس کی طاقت تیزی سے کم ہوتی چلی گئی۔

ایرانیوں کے حملے سے نجات ملی تو صلیبی جنگوں کا سامنا ہوا، سلجوقیوں سے واسطہ پڑا اور آخر میں عثمانیوں سے بالکل ہی منہ کی کھانی پڑ گئی۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطین کے کامیاب حملے کے

ٹھیک گیارہ سو تیئیس سال بعد اس علاقے کو فتح کیا اور قسطنطنیہ کا نام استنبول ہو گیا۔ یہ نام اس علاقے کو پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ بلا وجہ بعض لوگ اسے اسلام بول کہتے ہیں۔

استنبول دراصل تین یونانی لفظوں "اس" "تن" "پولن" سے مل کر بنا ہے جن کے لفظی معنیٰ ہیں "اندرون شہر"۔ پولن اور پولس میں قریبی تعلق ہے اور موخرالذکر لفظ یورپ کی کئی زبانوں میں لاحقہ کے طور پر شامل ہو کر شہر کے معنی دیتا ہے، مثلاً میٹروپولس میں۔ غالباً شروع میں مطلب یہ تھا کہ اس حصے کو طے کر کے نئی سرزمین پر پہنچا جا سکتا ہے۔ پھر جس طرح یونانی نہ رہے، رومی نہ رہے، سلجوقی نہ رہے، اسی طرح عثمانی بھی ختم ہو گئے۔ قومی حکومت نے جمہوریت کے روپ میں جنم لیا اور دنیا سے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا۔

سلطنتوں کے اس عروج و زوال کو چشمِ باطن سے دیکھتے ہوئے جو میں نے ظاہری آنکھ سے غور کیا تو پتہ چلا کہ صبح کاذب کیا، صبح صادق کو بھی گزرے کچھ وقت ہو گیا ہے۔ میں گھبرا کر جلدی سے نیچے اتر گیا۔

میرا گمان صحیح تھا۔ بھائی جان محترم بری طرح میرے منتظر تھے اور اس وقت تک یہ معلوم نہیں کر سکے تھے کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ برکات صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے اور دونوں نے نماز پڑھ لی تھی۔ میرے لیے وقت گزر چکا تھا۔ مجھے نماز قضا ادا کرنی پڑی۔

طے پایا کہ ہم برکات صاحب کو ان کے دفتر نہ جانے دیں اور ان کے منشی، احمد کی مدد سے جہاں شدہ استنبول یعنی پرانے شہر کی سیر کے لیے چل پڑیں۔ ناشتہ اپنے ہی کمرے میں کیا جو بالکل یورپی انداز کا تھا۔

طولمہ باغچی:۔ ہوٹل ہلٹن سے بہت قریب استنبول کے یورپی علاقے ہی میں دولما باغچی (جس کا تلفظ طولمہ باغچی ہی) نام کا ایک محل واقع ہے جو آخری عہد میں سلاطین عثمانیہ کی قیام گاہ رہا ہے، اور اب عجائب گھر بن گیا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے صبح دس سے بارہ بجے تک اور پھر شام کو تین سے پانچ تک کے اوقات مقرر ہیں۔ پہلے تو خیال آیا کہ اسے شام کو واپسی پر اطمینان سے دیکھا جائے، لیکن اندیشہ تھا کہ ہمیں دیر نہ ہو جائے اور دوسرے روز دیکھنا ممکن نہیں تھا، کیوں کہ منگل کے دن یہ بند رہتا ہے۔ اسے خاص طور پر اس لیے بھی دیکھنا ضروری تھا کہ قیامِ جمہوریت کے بعد یہی محل اتاترک کی سرکاری قیام گاہ بھی قرار پایا اور وہیں رہ کر انھوں نے اپنے ملک کو استحکام بخشا، اس کے آئین و قوانین وضع کرائے اور عمر کی آخری منزل میں پہنچ کر ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو صبح ۹ بج کر ۵ منٹ پر اس محل کے کمرہ نمبر ۷۱ میں فوت ہو گئے۔ اب یہی محل عجائب خانۂ اتاترک کے نام سے بھی مشہور ہے، کیوں کہ استنبول

طولمہ باغچی محل کا ایک منظر





توپ کاپی سرائے کا ایک حصّہ



حیدر پاشا ——— ریلوے اسٹیشن

میں صدر جمہوریت کی سرکاری قیام گاہ نہیں رہا ہے۔

اس محل کو سلطان عبدالمجید نے ۱۸۵۳ء میں بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ ایک طرف کاریگروں نے اپنی فنی مہارت کا پورا پورا ثبوت دیا ہے اور دوسری طرف ایسے نادر و نایاب اشیا سے زینت دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔

اتاترک نے محل میں اس طرح قیام کیا کہ سب سے معمولی قسم کے چند کمرے اپنے اور اپنے عملے کے لیے مخصوص کیے اور باقی کو اسی طرح چھوڑ دیا جس طرح آخری خلیفۂ ترکی نے اسے خیرباد کہا تھا۔ عمارت کی تعمیر میں سنگِ مرمر، سنگِ دودھیا، سنگِ سرخ اور بلور کے مناسب امتزاج نے عجیب رنگ پیدا کیا ہے اور جہاں یہ کاریگری ممکن نہیں تھی، در و دیوار کو خاص ترکی اندازِ مصوری سے زینت دی گئی ہے۔ چھتوں میں جو جھاڑ فانوس آویزاں تھے، اب تک اسی طرح لٹک رہے ہیں۔ شمع دان اور گل دان بھی رکھے ہیں، حالاں کہ نہ وہ شمعیں روشن ہیں اور نہ پھولوں میں مہک باقی ہے۔ قالین اسی طرح بچھے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ان کی صفائی کی جاتی رہی ہے۔ الماریوں میں جو خود بھی کندہ کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں شیشے چینی اور چاندی کے ظروف بند پڑے ہیں۔ خاص ملبوسات بھی موجود ہیں جیسے کوئی ابھی پوشاک بدل کر چلا گیا ہو۔ مسہریوں کے بستروں پر شکن تک نظر نہیں آتی، جیسے وہ کسی کو آرام پہنچانے کے لیے اس کی آمد کی راہ تک رہے ہوں۔ ان بستروں کے آغوش میں نہ جانے کن کن حسینانِ ترک نے پاؤں پھیلائے ہوں گے اور کن کن کی جوانیاں گرمیٔ جذبات سے پروان چڑھی ہوں گی۔ انھی کمروں کی بعض الماریوں میں قیمتی جواہرات اور طلائی زیورات رکھے ہیں۔ البتہ سنگھار کرنے کے لیے نازک ہاتھوں کی کمی ہے۔ بہت سے کمرے مستقل طور پر بند رہتے ہیں۔ صرف دروازوں کے شیشوں میں سے اشیائے مقتنم کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ جھانک کر دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ مکان تو ہے مکین نہیں رہے۔

شاہی حمام کے قریب ہی ایک کم گہرا حوض بھی ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ نوجوان حسین لڑکیاں لباس اتار کر اور جل پریوں کا روپ دھار کر پانی میں اترتیں، آپس میں چہلیں کرتیں اور حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے سلطانِ وقت پر پانی کے چھینٹے مار کر اس سے اٹھکیلیاں کرتیں اور ان میں سے ہر ایک کی انتہائی کوشش اور دلی آرزو یہ ہوتی تھی کہ تسکینِ جذبات کی خاطر اگر نظرِ انتخاب ہم پر پڑ جائے تو کیا کہنے۔ گویا ان کے نزدیک زندگی کو معراج نصیب ہو جاتی۔ اس زمانے کے اس ماحول کا تصور ہی عہدِ حاضر کے رنگین مزاجوں کو گدگدا دینے کے لیے کافی ہے۔

اب زائرین کی چلت پھرت کے سوا اور کوئی گہما گہمی باقی نہیں رہی ہے۔ نہ حسینوں کے جھرمٹ میں

اور نہ داد عیش دینے والے باقی ہیں۔ سارا تزک و احتشام افسانہ پارینہ بن چکا ہے۔

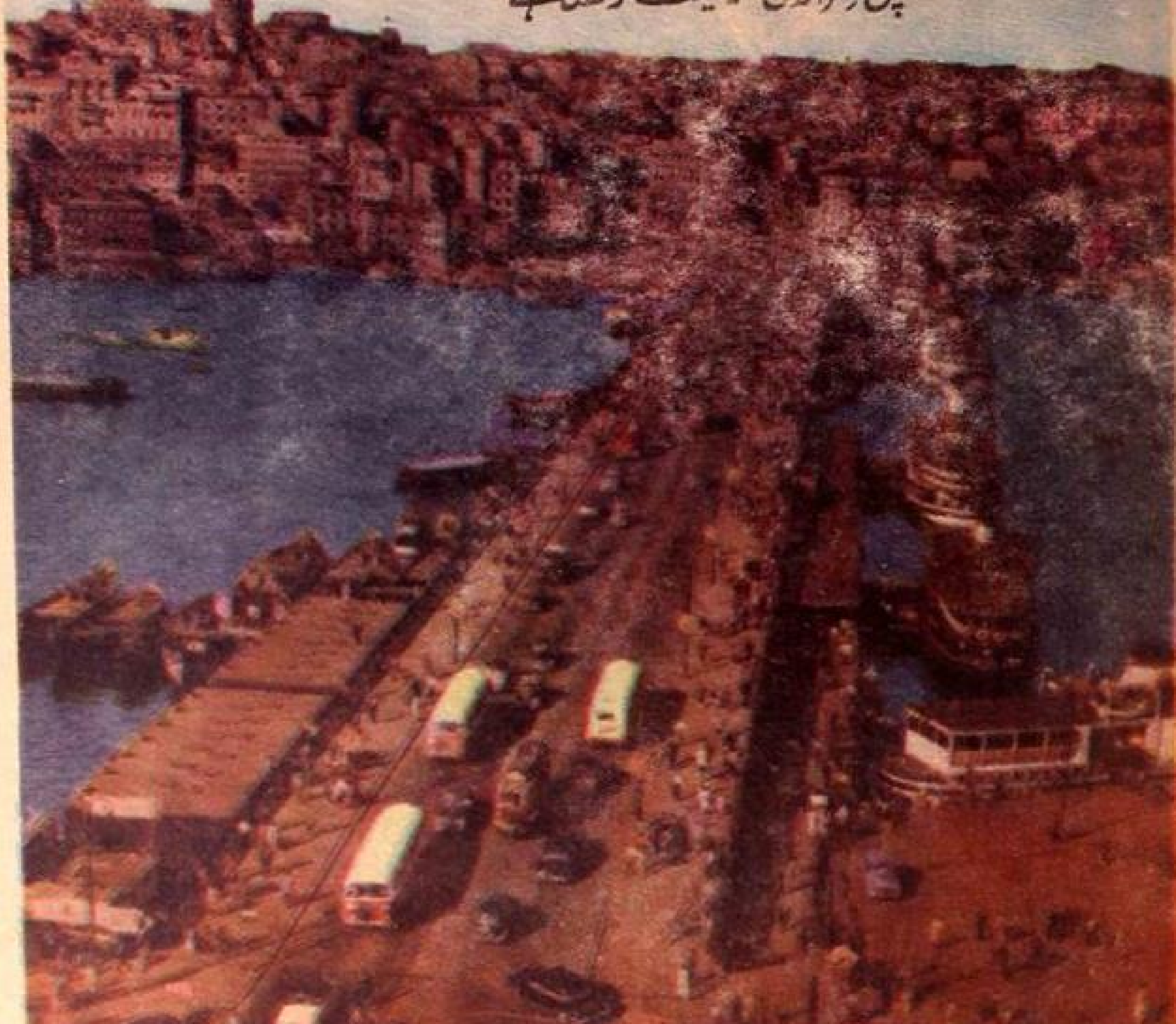
بیلربئی محل:۔ اس محل کے تقریبًا بالمقابل باسفورس کے پار ایک اور محل ہے جو بیلربئی محل کہلاتا ہے۔ اسے بچشم خود دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ اس مقام سے ذرا ہٹ کر جانب شرق واقع ہے، جہاں سے ہم نے فیری پر اپنی گاڑی لاد کر آبنائے کو عبور کیا تھا۔ بیلربئی محل سلطان عبدالعزیز نے ۱۸۶۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اب اس کی تکمیل کے چار سال بعد فرانس کی ملکہ یوجین ترکی آئیں تو وہ سلطان کے ساتھ اسی محل میں قیام پذیر ہوئی تھیں۔ سلطان عبدالحمید ثانی کو جب قوم پرستوں نے معزول کر دیا تو انھوں نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ اسی محل میں گزارا تھا۔ لیکن اس وقت یہ محل، شاہی محل نہیں رہا تھا، بلکہ اس بیوہ کی طرح سوگوار بن چکا تھا جس کا سہاگ عہد جوانی ہی میں لٹ گیا ہو۔

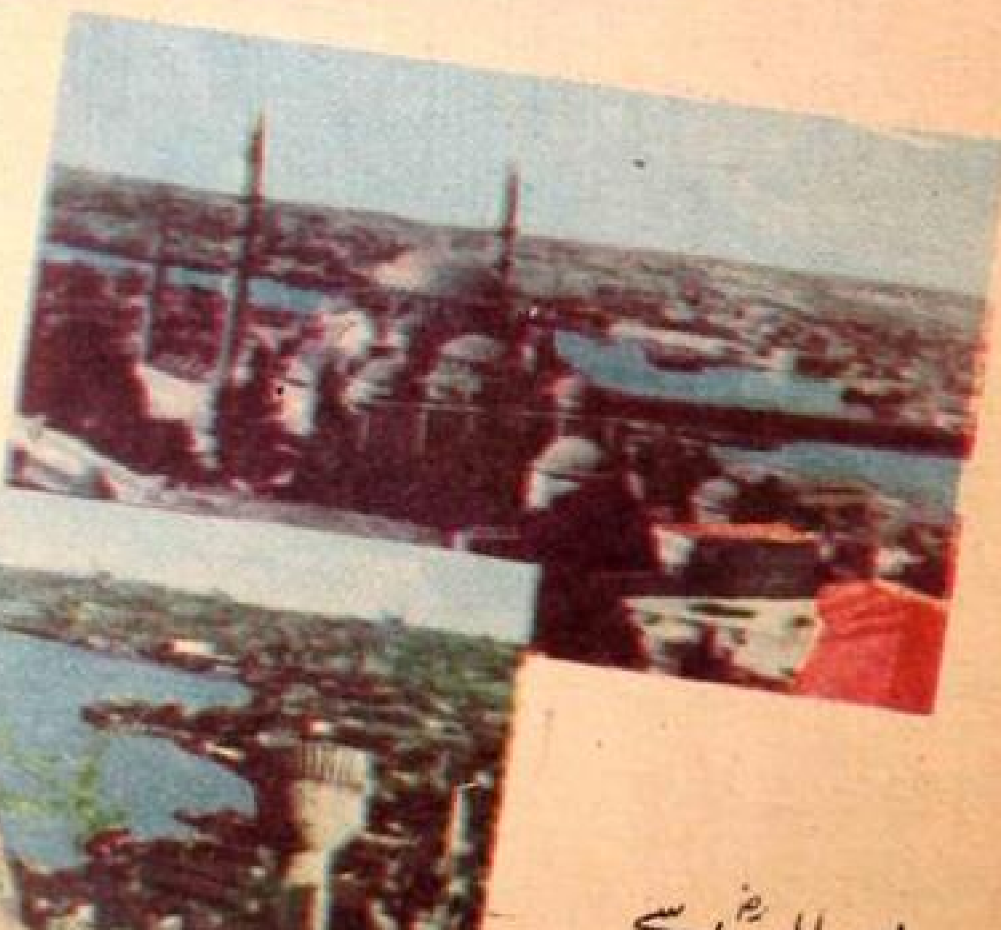
غلطہ کے آس پاس:۔ سرسری طور پر سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد ہم بہت جلد وہاں سے چل پڑے۔ ترکی میں بڑے راستے کو "جادہ سی" کہتے ہیں۔ طولمہ باغچی محل سے روانہ ہو کر ہم مجلسی سن جادہ سی سے گزرے اور چند مسجدوں پر جنھیں کوئی تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہے، موٹر ہی میں سے نظر ڈالتے ہوئے بڑھ گئے۔ اب ہمیں غلطہ برج کو عبور کر کے پرانے استنبول میں پہنچنا تھا۔

یہ پل شاخ زرین (گولڈن ہارن) پر ویسے ہی ایک اور پل "اتاترک برج" کے متوازی بنا ہوا ہے جو وہاں سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پل کو ترکی زبان میں "کوپروسو" کہتے ہیں۔ غلطہ کوپروسو آنے سے پہلے کا علاقہ "کاراکوئی" کہلاتا ہے، جسے کالا پہاڑ کہنا چاہیے۔ اس پہاڑی کے دو حصے ہیں نشیبی حصے کی بستی ہنوز غلطہ کہلاتی ہے اور بالائی حصے کو بیوغلو کہتے ہیں۔ یہ آبادی رہن سہن کے طریقوں کے اعتبار سے جدید معلوم ہوتی ہے لیکن بستی کے لحاظ سے قدیم ہے۔

یہاں نشیبی علاقے میں ایک مینار بنا ہوا ہے جو غلطہ کلیسی کہلاتا ہے۔ (کلیسی مینار کو کہتے ہیں) اس کی بابت مشہور ہے کہ شہنشاہ زینو نے اسے پانچویں صدی عیسوی میں تعمیر کرایا تھا۔ کچھ عرصے بعد جینوآ کے باشندوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام یسوع ناصری کا مینار رکھا۔ اس کے آخری کھنڈر پر کھڑے ہو کر نگہبان چاروں طرف کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ ترکوں نے بھی یہ علاقہ فتح کرنے کے بعد اس مینار کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا اور جب تک برقی مواصلات کے جدید طریقے ایجاد نہ ہوئے تھے، آتش زدگی کی اطلاع دینے کے لیے بھی اس سے کام لیا جانے لگا تھا۔ یہ مینار ۱۸۰ فٹ اونچا ہے۔ غلطہ اور بیوغلو کے علاقے ایک زمین دوز برقی ٹرین کے ذریعے ملے ہوئے ہیں۔ بیوغلو علاقے میں ریل

شاخ زرّیں پر غلطہ برج جو نئے اور پُرانے استنبول کے درمیان
پُل صراط کی حیثیت رکھتا ہے





شاخ زرّیں سے
مسجدِ سُلیمانیہ کا نظارہ



مسجد ایوبؓ سے
شاخ زرّیں کا نظارہ

کی سرنگ جس بڑی سڑک کے سرے سے شروع ہوتی ہے، اسے "استقلال جادہ سی" یعنی شاہراہِ آزادی کہتے ہیں۔ یہ شہر کا بہت ہی شاندار اور بارونق حصہ ہے۔ سڑک کے دوسرے سرے پر تقسیم میدان ہے۔ اس چوک کے وسط میں جنگِ آزادی کی یادگار ۱۹۲۸ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس یادگار کے اس رخ پر جو استقلال جادہ سی کے محاذ میں ہے، اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے مجسمے آزادی کا اعلان کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ دوسری طرف صرف اتاترک کا مجسمہ بحیثیت کمانڈر انچیف اس طرح دکھایا گیا ہے، گویا وہ دشمن پر فوج کشی کا حکم دے رہے ہیں۔

ہماری موٹر غلطہ برج سے گزرنے لگی۔ اگر یہ اور اتاترک پل موجود نہ ہوں تو نہ صرف شاخِ زریں بلکہ اس کے آخری سرے پر گرنے والی ڈونڈیوں کے گرد چکر کھا کر کئی میل کی مسافت طے کر کے پرانے استنبول میں پہنچا جائے اور یہ سفر نہایت ہی دشوار ہو جائے، کیوں کہ اس اونچے نیچے پہاڑی علاقے میں کوئی ایسی سڑک بھی نہیں ہے جس پر کوئی گاڑی چلائی جا سکے۔ دونوں پل بہت چوڑے ہیں۔ دونوں پر ہر قسم کی گاڑیوں کی بے پناہ آمد و رفت رہتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لیے پٹریاں ہیں۔ ہم بہت جلد پل طے کر کے شہر کے پرانے علاقے میں پہنچ گئے، جہاں تاریخی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہمارے سامنے شروع ہو گیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کو ترتیب وار دیکھ لیا جائے کیوں کہ جو چیز رہ گئی، بس رہ ہی جائے گی۔ شاید دوبارہ اس علاقے میں گزر نہ ہو اور اگر آئیں گے تو کسی اور مقصد سے، کسی اور منزل کی طرف جانے کے لیے گزریں گے۔

عام تاثر: استنبول اپنے حسن و جمال کی وجہ سے نہ صرف یورپ میں، بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہے اور اس کی رعنائیاں کوئی عصرِ جدید کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ ان کا چرچا اس وقت سے ہے کہ جب یورپ کا بہت بڑا حصہ عہدِ تاریک سے بھی پرے بالکل گمنامی کے پردوں میں چھپا ہوا تھا، یعنی جب فرانس میں پیرس دریائے سین کے کنارے ایک معمولی گاؤں تھا اور سوئزرلینڈ کی جھیل جنیوا کے ساحل پر صرف گڈریے آباد تھے۔ البتہ یونان و روما کی تہذیبیں اپنے عروج کو پہنچ کر دم توڑ رہی تھیں اور ایک لحاظ سے انھی کی روشن کی ہوئی شمع کا نور استنبول میں اُجالا پھیلا رہا تھا۔ بلکہ استنبول نے تو یونان و روما کو بھی مات دے دی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی لازوال قدرت اور انسان کی فنی مہارت نے مل جل کر شہر کا روپ نکھارا ہے۔ یہاں قدرت کی فیاضی اور انسان کی کاریگری جیسے گریباں کی طرح ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ قدم قدم پر سبزے کی گلکاریاں ایسا رنگ جما رہی ہیں

کہ اس کی مثال بہت کم ملکوں میں ملے گی اور جب یادگار عمارتوں کا جائزہ لیا جائے تب بھی سوچنا پڑتا ہے کہ ایسے شاہکار اور کس جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر پرانے استنبول کا نظارہ کیا جائے تو گمان ہوگا کہ ہم کسی ساحلِ بحر کے قریب چھوٹے بڑے مستول والے بہت سے جہازوں کو یک جا دیکھ رہے ہیں۔ کیوں کہ اس حصۂ شہر میں مسجدوں اور کلیساؤں کے اس قدر مینار نظر آئیں گے کہ دور سے ان پر مستول ہونے کا شبہ ہوگا۔ صرف اتنی بات ہے کہ مستول لپٹے ہوئے بادبانوں کے ساتھ سمجھے جائیں لیکن جب انسان پرانی وضع کے تنگ اور سانپ کی طرح بل کھانے والے بازاروں میں سے حقیقتاً گزرتا ہے تو اس کا خیال بدل جاتا ہے۔ میناروں کی چھتریاں مکانات کے سقف و بام کی اوٹ میں آ جاتی ہیں اور وہ جادو جو دور سے تیر چلاتا نظر آتا ہے یہاں سارا بھانڈا پھوڑ کر بے رنگ ہو جاتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ بازار اور راستے برے ہیں یا دیدہ زیب نہیں ہیں۔ یہاں دوسرا سحر رنگ جمانا شروع کرتا ہے بازاروں کی رونق گزرنے والوں کا دل موہ لیتی ہے۔

لوگوں سے سنا تھا، کتابوں میں پڑھا تھا، اس لیے یہاں کی عمارتوں کو قریب سے دیکھنے کا شوق اس جگہ لے آیا تھا ——— یہ عمارتیں جن میں سے بعض اتنی پرانی ہیں کہ ان کے سامنے وقت بھی بوڑھا ہو گیا ہے۔

حُسنِ اتفاق ہے کہ ہماری آرزو کے عین مطابق ابتدا مسجد سے ہوئی۔ استنبول پانچ سو مسجدوں کا شہر ہونے کے اعتبار سے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ حالاں کہ ان میں سے تاریخی مسجدیں مشکل سے ایک ہاتھ کی پوروں پر گنی جا سکتی ہیں۔ مسجدوں کی طرح یہاں کے شاہی محلات کو بھی شہرت حاصل ہے، شاہی دَور ختم ہو چکا ہے اور خدا کی خدائی ابد تک رہنے والی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں اور ان کا کہنا بجا و درست ہے کہ پچھلے پانچ سو سال میں جتنی مسجدیں استنبول میں بنی ہیں، روما الکبریٰ کے فرمانروا تمام نصرانی عہد میں اتنے گرجا گھر تعمیر نہ کر سکے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ہم اپنے محدود وقت میں تمام خانہ ہائے خدا کو دیکھنے سے قاصر تھے اور صرف چند غیر معمولی مسجدوں کو اس نظر سے دیکھ سکتے تھے کہ ان کے بام و در کے نقوش ہمارے دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ جائیں اور ہم رہتی دنیا اُن کو یاد رکھ سکیں۔

واضح رہے کہ ہم برِ صغیر پاک و ہند کے باشندے سارے شہر یا کسی ایک علاقے کی سب سے بڑی مسجد کو جامع مسجد کہتے ہیں لیکن ترکی میں ہر مسجد جامع کہلاتی ہے، بلکہ یہ لفظ اسی معنی میں

استعمال ہوتا ہے۔

ینی جامع:۔سب سے پہلے ہم نے ینی جامع یعنی نئی مسجد کو دیکھا جسے عرفِ عام میں والدہ جامع یا ملکہ مادر کی مسجد بھی کہتے ہیں۔ غلطہ پُل عبور کرنے کے بعد یہی تاریخی چیز سامنے نظر آتی ہے۔ بڑے جاہ وجلال والی یہ خاتون سترھویں صدی میں حکمراں تھی۔ اس نے بھی روم کے شہنشاہ جسٹی نین کی طرح ایشیائے کوچک کی بہت سی قدیم عمارتوں کو مسمار کرا کے اور وہاں سے مسالۂ تعمیر حاصل کر کے اس مسجد کے بام و در کھڑے کیے تھے۔ اگرچہ سترھویں صدی کو ختم ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے لیکن اور مسجدوں کے مقابلے میں یہ زیادہ نئی سمجھی جاتی ہے۔ طرزِ تعمیر کے اعتبار سے بھی اس میں بعض جدتیں ہیں، مثلاً مینار صرف دو ہیں اور گنبد بے تحاشا اور ایک دوسرے پر اس طرح چُنے گئے ہیں جیسے کوئی بادہ نوش الوہیت خالی جام اوندھا کر اور اوپر تلے رکھ کر بھول گیا ہے۔ صرف درمیانی گنبد صحیح معنوں میں مکمل گنبد ہے اور باقی گنبدوں کے نصف یا چوتھائی ٹکڑے ہیں جو بڑے گنبد کے زیریں کنارے کو سہارا دے کر اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان سب کے زیرِ سایہ قدرتی طور پر آواز کو ایک شورِ بے ہنگام کی صورت میں گونجنا چاہیے لیکن اندرونی سطح پر بے شمار لیکن فنکارانہ نشیب پیدا کر کے ایسی کٹوریاں سی بنائی ہیں کہ آواز کرختگی کے ساتھ گونجنے کے بجائے اہلِ لب ولہجے میں دل پذیر کیفیات پیدا کرتی سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر نمازی مشرقی حصے کے آخری سرے پر کھڑا ہو تب بھی امام کی قرأت اسی طرح محسوس ہوتی ہے جیسے آواز اگلی ہی صف میں سے بلند ہو رہی ہو۔ یہ مسجد پرانے استنبول کی ایک ایسی ڈھلان پر واقع ہے جہاں سے بل کھاتا ہوا ایک راستہ شاہی عہد کے دفترِ خارجہ کو جاتا ہے۔ اب اس عمارت میں صوبائی حکومت کے دفاتر ہیں۔

اس مسجد کو دیکھ لینے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ اب ہم کون سا راستہ اختیار کریں اور پہلے کس چیز کو دیکھیں۔ نقشے پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا تھا کہ جانبِ مشرق توپ کاپی سرائے کے نام سے ایک محل واقع ہے، جانبِ غرب سلیمانیہ جامع نام کی مسجد ہے اور جانبِ جنوب ایک ایسا مسقّف بازار ہے جس کی مثال سارے یورپ و ایشیا میں بلکہ دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ ہم نے سوچا کہ یہ مشہور بازار دیکھنے کے لیے وقت درکار ہے، اس لیے اس کی سیر کل پر اٹھا رکھیں، اور اگر جانبِ غرب گئے تو پھر دوسری چیزوں کو دیکھتے بھالتے، اسی سمت میں آگے بڑھتے چلے جائیں گے اور توپ کاپی سرائے کی طرف لوٹ کر آنا دشوار ہو جائے گا۔ اس لیے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ اپنا رخ جانبِ مشرق رکھیں اور اگلا قدم وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اٹھائیں۔

توپ کاپی سرائے:۔ سلطان عبدالحمید نے ایک محل ۱۸۵۳ء میں تعمیر کرایا تھا، اور وہ طولمہ باغچی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ اس کی تعمیر سے قبل سلاطینِ ترک جس محل میں رہتے تھے، وہ توپ کاپی سرائے کہلاتا ہے۔ بعض لوگ اسے قدیم سراغلیو بھی کہتے ہیں۔ ان دونوں لفظوں یعنی "سرائے" اور "سراغلیو" کے معنی "محل" ہیں۔ اس کی تعمیر کا فخر کسی ایک سلطان کو نہیں ہے کیونکہ یہ مختلف عہدوں میں بتدریج اور حسبِ ضرورت تعمیر ہوا تھا۔ اس لیے اس کے بعض حصے ایک دوسرے سے الگ اور فنی اعتبار سے مختلف النوع معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وسعت بھی عام محلات سے زیادہ ہے۔ کئی ہزار مربع گز کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔

اب اسے دو بڑے حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ دونوں حصے عجائب گھر بنے ہوئے ہیں لیکن ان میں تھوڑا سا فرق ہے۔

اس حصّے میں جو صرف سلاطین کے رہنے کے لیے مخصوص تھا، اب بھی انھی کے نوادر کا مخزن ہے۔ دوسرے حصّے میں زیادہ تر تاریخی اہمیت کی نادر و نایاب اشیاء رکھی گئی ہیں۔ بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ یہاں اسلامی دور میں قصرِ شاہی کی بنیاد پڑنے سے پہلے رومی عہد کی یادگار عمارت موجود تھی، جس کے در و دیوار سے استفادہ کیا گیا ہے۔ چناں چہ ایک ستون ہے جسے شاہ تھیوڈوسیس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ گوتھ قبیلے پر فتح حاصل کرنے کے بعد بطور یادگار تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی طرح کچھ اور حصّے بھی رومی طرزِ تعمیر کے آئینہ دار ہیں۔

اسلامی عہد کے قصرِ شاہی میں داخل ہونے کے لیے چار دروازے ہیں، جن میں سے بابِ سعادت سب سے اچھی حالت میں ہے اور بہت ہی خوش نما ہے۔ اسی سے گزرنے کے بعد سامنے دیوانِ عام دکھائی دیتا ہے جسے سلطان سلیمان اوّل نے بنوایا تھا۔ دیوانِ عام کے قریب ہی ایک کمرہ ہے جس میں شاہی جواہر محفوظ ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک طلائی مرصع تخت ہے جو ۱۵۱۴ء میں ایران کے فرمانروا شاہ اسمٰعیل کو ایک لڑائی میں شکست دینے کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ اس تخت میں ہیرے جواہر جس خوبی سے جڑے گئے ہیں، وہ فنکاروں کی صناعی کا ثبوت دیتے ہیں۔

سونے کی ایک خوبصورت صُراحی کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی اور ساتھ ہی حیرت بھی ہوئی۔ صراحی کے طلائی خول میں دو ہزار ہیرے نہایت عمدہ طریقے سے تراش کر جڑے گئے ہیں، جن کی آب و تاب حیرت انگیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تیار ہوئی ہے۔ اس کے قریب ہی پیتل کا ایک پیالہ ہے جس پر عربی رسم الخط کے مطابق نقرئی حروف میں عبارت کندہ ہے۔ قائدبے کا نام بھی لکھا ہوا ہے جو مصر کا

بادشاہ تھا۔ یہ پیالہ ایک معرکے میں اس ملک سے حاصل کیا گیا تھا۔

ایک اور حصّے میں بعض آلاتِ حرب رکھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶۳۸ء میں بغداد پر حملہ کرتے وقت وہ آلات سلطان مُراد چہارم نے استعمال کیے تھے۔ اس سے آگے ایوانِ تاجپوشی ہے۔ ہر نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت اسی جگہ رسم ادا کی جاتی تھی۔ چناں چہ شاہی تاج و تخت کے علاوہ وہ لباسِ فاخرہ بھی موجود ہے جو اس موقع پر استعمال ہوتا تھا۔ ایک اور کمرہ دیکھا جہاں شاہی خاندان کے بچّوں کی تمام ابتدائی مذہبی اور معاشرتی رسمیں ادا کر کے دل کے ارمان پورے کیے جاتے تھے۔ اس حصّے کی زینت و زیبائش پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کم عمر بچّوں کے لیے مخصوص رہا ہے۔ زینت کے سب لوازم اسی طرح برقرار ہیں۔

ایک کمرہ تبرکات کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے قریب کھڑے ہونے اور آنے جانے کے آداب متعین ہیں اور ان کی پابندی لازمی ہے۔ اسے عرفِ عام میں "خرقہ شریف" کہا جاتا ہے کیوں کہ یہاں حضرت رسولِ کریم صلعم کا وہ مقدس جُبّہ رکھا ہے جو ایک تاریخی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے کعب بن زبیر نامی مشہور شاعرِ عرب کو ایک قصیدۂ اسلام لکھنے پر بطور انعام عطا کیا تھا۔ یہ قصیدہ عربی ادب میں "بردۂ اُولیٰ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نہایت پاکیزہ خط میں اس قصیدے کی ایک نقل بھی تبرکاً رکھی ہوئی ہے۔ کمرے کے در و دیوار پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ خرقہ شریف کی زیارت نہ ہو سکی، کیوں کہ وہ چاندی کے ایک صندوق میں بند رہتا ہے اور خاص اجازت نامہ حاصل ہونے کے بعد اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ ہمیں پہلے سے معلوم نہیں تھا، ورنہ اس کے لیے ضرور کوشش کی جاتی۔

یہاں آنحضرت کا عَلَم شریف، حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ایک مصلّٰی، حضرت عمر فاروقؓ کا صافہ اور ان کے استعمال میں رہنے والے چند آلاتِ حرب اور دیگر نوادرِ مقدسہ بھی رکھے ہیں۔ یہ سب سلطان سلیمان نے متعدد معرکوں میں مختلف بلادِ عربیہ اور مصر سے حاصل کیے تھے۔ اسی جگہ سلطان موصوف کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام پاک کے چند نسخے بھی رکھے ہیں جنھیں مذہبی مغتنمات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

ایک اور حصّے میں ایک تابوت دیکھا جس کی بابت مشہور ہے کہ وہ اسکندرِ اعظم کا تابوت ہے۔

ایک کمرہ ایسا ہے جس میں دنیا بھر کے مختلف عہدوں کے سکّے اور مُہریں جمع کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض سکّوں اور مہروں کو بہت زیادہ تاریخی اہمیت حاصل ہے، فرصت ہوتی تو ذرا تفصیل سے انکا جائزہ لیا جاتا۔

توپ کاپی سرائے کے قریب ہی ایک ریلوے اسٹیشن ہے جو ملک کے شمال مغربی علاقوں سے

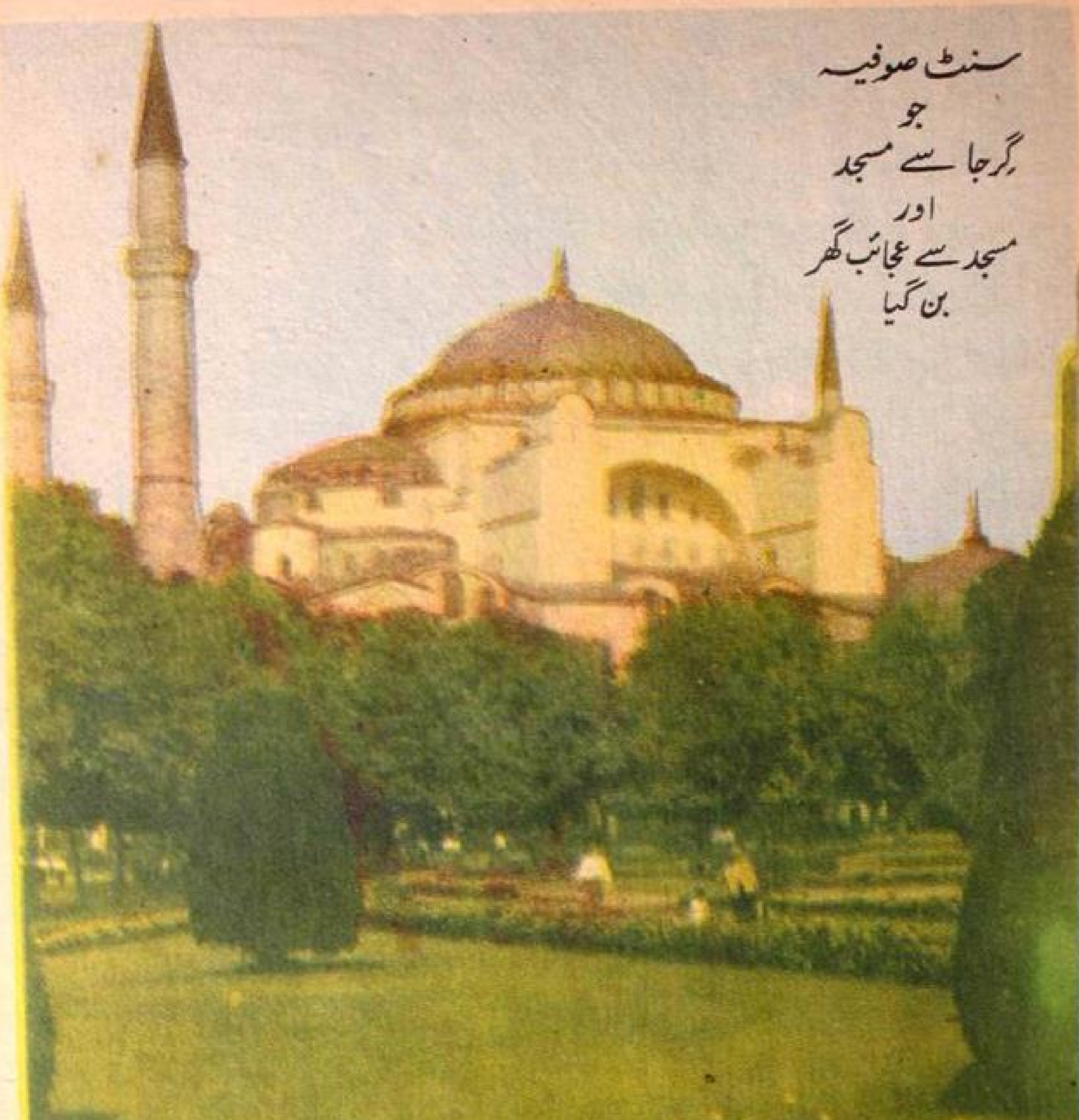
آنے والی ریل کا آخری مستقر ہے۔ اس کے ذریعے ادرنہ اور چنا قلعہ (درۂ دانیال) تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہاں کی ریلوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کیونکہ ملک کے اور مقامات بھی موٹر کار کے ذریعے سفر کر کے دیکھنے کا پروگرام تھا۔ حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ ملک کے طول و عرض میں ریلوے لائنوں کا جال بچھا ہوا ہے اور اس نظام نے جمہوریت بننے کے بعد سے کافی ترقی کی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں ریلوے لائنوں کی کل لمبائی ۲۳۲۰ میل تھی جو اب ۴۹۴ا میل ہے۔ اس ترقی پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ ملحوظ رکھنا بھی پڑتا ہے کہ ملک کا کافی حصہ پہاڑی ہے جہاں ریلوے لائن کا بچھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اسی لیے ریلوے کے ساتھ ساتھ ٹرکوں اور بسوں کا ایک عمدہ وسیع نظام بھی سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی کل تعداد تقریباً ۹۵۰۰ تھی اور اب ۲۵۰۰۰ کے قریب ہے۔ علاوہ ازیں ہوائی سروسوں نے بڑی ترقی کی ہے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پرواز کرنے کے لیے بڑی آسانیاں ہیں۔ ترکی کے بائیس بڑے شہروں میں اسی مقصد کے لیے ہوائی اڈے قائم ہیں۔ استنبول اور انقرہ کے ہوائی مستقر تو بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقریباً تمام بڑی کمپنیوں کے جہاز ان سے ہو کر گزرتے ہیں۔ پھر ساحلی علاقے کے شہروں کو ملانے کے لیے دخانی کشتیوں کا ایک جال قریب کے سمندروں پر پھیلا ہوا ہے اور بہت سے لوگ انھی کے ذریعے سفر کرتے اور سامان لاتے لے جاتے ہیں۔

یہ سب باتیں برسبیل تذکرہ بیان کر دینی پڑی ہیں۔

سنٹ صوفیا:۔ نقشے کے مطابق سنٹ صوفیا گرجا دیکھنا چاہیے جو جمہوریت بننے کے بعد سے عجائب گھر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اسے دیکھنا ضروری تھا کیونکہ اس کی بہت تعریف سنی تھی۔ چونکہ اسے دیکھنے کے لیے کافی وقت درکار تھا، اس لیے آج کے پروگرام میں شامل نہیں تھا لیکن صرف اس کو دیکھنے کے لیے بطور خاص دوبارہ اس طرف آنا ذرا وقت طلب تھا اور یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں ہم ہجوم کار کے باعث اسے نظرانداز نہ کر جائیں۔ آج ہمیں زیادہ تر مساجد کی زیارت کرنی تھی۔ اس لیے ایک لحاظ سے اسے دیکھنا آج کے پروگرام کی ایک عمدہ کڑی بھی بن سکتا تھا۔

ہر چند یہ عمارت اب ایک عجائب گھر میں بدل گئی ہے اور کبھی نصرانی دنیا کی ایک مشہور عبادت گاہ تھی لیکن درمیانی عہد میں عرصہ دراز تک مسجد بھی رہی ہے۔ یہاں اللہ کا نام لوگوں کی زبان پر رہا ہے اور محمدؐ کا کلمہ پڑھا گیا ہے۔ اس کے بام و در اب بھی اس مقدس دور کے حامل اور ترجمان ہیں اور فرش پر جبین ہائے نیاز کے سجدے تڑپ رہے ہیں۔



سنٹ صوفیہ
جو
گرجا سے مسجد
اور
مسجد سے عجائب گھر
بن گیا



سنٹ صوفیہ
کا
قرب و جوار

وہاں مراقبے میں بیٹھنے کی اب اجازت نہیں رہی لیکن اس کے کسی پُرسکون گوشے میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر کوئی فکر و خیال کے گھوڑے دوڑائے تو بھلا کون مہر احتساب لگا سکتا ہے۔

اس عمارت کی تاریخی نوعیت اور جس دورِ انقلاب سے وہ گزری ہے، اس کی حقیقت پر ایک سرسری سی نظر ڈالنی بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

ماہرینِ اثریات کا کہنا ہے کہ سنٹ آیا صوفیا کو دنیا بھر کے گرجا گھروں میں ایک خاص اہمیت دی جا سکتی ہے بلکہ ان عمارتوں میں جہاں رہ کر استغراقِ عبودیت کا امکان ہو سکتا ہے، اسے ایک بلند مقام حاصل ہے۔ روم کے سنٹ پیٹر، لندن کے سنٹ پال اور پیرس کے نوٹرڈیم کے ساتھ ساتھ ترکی کے سنٹ صوفیا کا ذکر کیا جائے تو ترجیحی درجہ اسی کو دیا جائے گا، کیوں کہ تاریخی اعتبار سے اس کی عظمت سب پر بھاری ہے۔

مورخین کا کہنا ہے کہ روم کے اولین عیسائی فرمانروا قسطنطین نے ۳۴۷ء میں یہ کلیسا تعمیر کیا تھا لیکن ستاون سال بعد ۴۰۴ء میں ایک ہولناک آتش زدگی سے وہ بالکل تباہ ہو گیا۔ چند سال بعد روم کے ایک اور بادشاہ تھیوڈوسیس دوم نے سابقہ بنیادوں پر اسے دوبارہ تعمیر کیا لیکن اسے پھر بھی ثبات حاصل نہ ہو سکا۔ ۵۳۲ء میں عیسائیوں کے دو فرقوں کے درمیان زبردست تصادم ہوا اور غالب آنے والوں نے بے حساب قتل و غارت گری کے علاوہ یہ ستم ڈھایا کہ اس گرجا گھر کو بھی تباہ کر دیا۔

تیسری بار شہنشاہ جسٹی نین نے اس کی از سرِ نو تعمیر کا بیڑا اٹھایا اور اپنے دو ماہرینِ فنِ تعمیرات اینتھی میس اور اسیڈور کو اس کام پر لگا دیا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا بنایا ہوا گنبد بھی ۵۵۷ء کے ایک زبردست زلزلے میں گر گیا، جسے نئے سرے سے پھر تعمیر کرانا پڑا۔ اس دفعہ سنبھالا لینے کے بعد اس نے بڑی جانبازی کا ثبوت دیا۔ ایک ہزار سال تک اس نے ضعف کے آثار ظاہر نہ ہونے دیے، یہاں تک کہ جب سلطان محمد فاتح نے اس گرجا گھر کو مسجد بنانے کا فیصلہ کیا تو ترکی کے مشہور معمار آغا سنان کو پشتہ بندی کے ذریعے اس کو استحکام پہنچانا پڑا۔

اس کی مرمت اور نئے سرے سے تزئین کا کام ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ختم ہوا۔ اس روز سلطان نے نمازِ مغرب بڑے ہال میں ادا کی اور اعلان کرا دیا کہ آج سے یہ گرجا نہیں مسجد ہے۔

پھر ۱۹۳۵ء میں اس عمارت نے ساڑھے تین سو سال سے زیادہ مدت تک مسجد رہنے کے بعد ایک نئی جون بدلی اور اتاترک کے ایک فرمان کے بموجب اسے عجائب گھر بنا دیا گیا اور اس مقصد

کے لیے اس میں ضروری تبدیلیاں کردی گئیں۔

اگر مسلمانوں نے ایک مشہور کلیسا کو مسجد بنایا تو ہمارے خیال میں یہ کچھ زیادہ قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ قسطنطین نے جب پہلی بار اس کی بنیاد رکھی تو تمام دنیائے روم کے قدیم بت خانوں اور ان کے علاوہ بعلبک اور افیس کی عبادت گاہوں کو مسمار کر کے اور ان کے سقف و بام و در کے پتھر منگا کر اس نئی عمارت کا ڈھانچ تیار کیا تھا اور جب وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی تو اس نے وفورِ مسرت سے بے تاب ہو کر نعرہ لگایا تھا ـــــ یسوع کی شان دوبالا ہو۔ اے شاہ سلیمان! آج میں نے تجھے مات دے دی ہے!

اگر روم کے شہنشاہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ نشۂ کامرانی کے زیرِ اثر حضرت سلیمانؑ کے معبد کو ڈھا دے، اس حرکت پر فخر کرے اور ان پر فقرہ کسے تو ترکی کے مسلمان بھی مستحق تھے کہ وہ بساطِ سیاست کو اُلٹ دینے کے بعد گرجا گھر کو مسجد بنالیں۔ بقول شاعر ؎

اپنی حد میں کروٹیں لیتی ہے میخانے کی خاک

سنٹ آیا صوفیا کی تعمیر ایک وسیع باسلیق کی صورت میں ہوئی ہے، جس کے عین وسط میں ایک بہت بڑا گنبد سر بلند کیے زمانے کے انقلابات کو منہ چڑا رہا ہے۔ اس گنبد کا قطر ایک سو سات فٹ اور بلندی ایک سو اناسی فٹ ہے اور اپنی وضع قطع کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کے بہت سے معماروں نے اس کے خاکے اتارلیے اور نقلیں تیار کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ اب اس کی مضبوطی اور استحکام کا یہ عالم ہے کہ کئی صدیاں گزرنے کے بعد ایک جگہ معمولی شگاف آجانے کے سوا کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچ سکا ہے۔

میرے لیے گنبد کے صحیح ڈیزائن کو مناسب الفاظ میں بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ بس یوں سمجھنا چاہیے کہ شرقی اور غربی جانب سے چھوٹے چھوٹے گنبدوں کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا ہے کہ ان کے سرے ایک دوسرے پر ٹھہرے ہوئے ہیں اور اس طرح انھی گنبدوں سے ترتیب پانے والی چھت بتدریج اونچی ہوتی چلی گئی ہے۔ درمیان میں بڑا گنبد ہے جو دوسرے چھوٹے گنبدوں پر ٹھیرا ہوا ہے۔ یعنی اگر دور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کثیر المنازل چھتری دار شامیانہ شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔

اس عمارت کی تعمیر چونکہ کلیسا کے خیال سے ہوئی تھی اور اس کا رخ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا تھا، اس لیے مسجد کی ضروریات اور خصوصیات کا لحاظ رکھا جانا ممکن نہیں تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس وقت ظہورِ اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے عمارت کے

جانبِ غرب پانچ بڑے دروازے ہیں جو کسی مسجد میں نہیں رکھے جا سکتے، کیوں کہ اسی طرف تو رخ کر کے سجدہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سمت سے کسی کے داخل ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ان دروازوں سے گزر کر اندر داخل ہونے پر ایک وسیع دالان آتا ہے جس کا طول ڈھائی سو فیٹ اور عرض صرف تیس فیٹ ہے۔ اس کا فرش، دیواریں اور محرابیں تک سنگِ مرمر کی ہیں، جن پر خوشنما گلکاری کی گئی ہے۔ اب اس دالان سے دوسری جانب یعنی سب سے بڑے ہال میں جانے کے لیے نو دروازے ہیں۔ دائیں بائیں چار چار دروازے نسبتاً نیچے اور درمیانی دروازہ سب سے بلند اور بہت ہی بلند ہے۔ اس کو شاہی دروازہ کہتے ہیں۔ غالباً کلیسائی عہد میں اسقفِ اعظم بھی اسی دروازے سے گزرتے ہوں گے۔ عثمانی دورِ حکومت میں عوام کو اس دروازے سے گزرنے کی ممانعت تھی، البتہ اب جبکہ یہ عجائب گھر بن چکا ہے کسی قسم کی پابندی نہیں رہی ہے۔

اس وسیع ہال کا طول بھی دالان کی طرح ڈھائی سو فیٹ لیکن عرض ایک سو دس فیٹ ہے اور اس سارے حصے پر چھوٹے بڑے گنبد ستونوں کا سہارا لیے کھڑے ہیں۔ ہال میں کھڑے ہو کر چھت کی جانب دیکھا جائے تو گنبدوں کی بہت سی محرابیں نظر آئیں گی۔ ان میں سے درمیانی محرابیں اونچی اور اطراف کی ذرا نیچی ہیں۔ نچلی محرابوں کو سنگِ سماق کے چار گول ستونوں نے سنبھال رکھا ہے۔ یہ ایفی سس میں ڈیانا دیوی کے مندر میں لگے ہوئے تھے۔ ان کو بحفاظت تمام وہاں سے منتقل کرنے میں بھی بڑا کمال دکھایا گیا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ دو ہزار سال سے زیادہ قدیم ہونے کے باوجود انھیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ ابھی حال ہی میں تراشے گئے ہیں۔ باقی چار ستون جو چوکور وضع کے ہیں، سرخ رنگ کے ہیں۔ وہ بعلبک کے بڑے مندر کی لوٹ کھسوٹ میں حاصل کیے گئے تھے۔ غلام گردشوں کے ستون سب سے چھوٹے اور سبزی مائل کسی پتھر سے کاٹے گئے ہیں۔ ان کی تاریخی حیثیت کا کچھ پتہ نہیں۔ ان کو شاید یونانی یا رومی معماروں ہی نے تراشا ہو گا۔

عمارت کی تمام دیواروں اور گنبدوں کی اندرونی سطح پر نہایت عمدہ نقش و نگار تھے اور بڑے گنبد کے اندر تو چاروں فرشتوں یعنی جبرئیل، اسرافیل، میکائیل اور عزرائیل کی فرضی تصویریں نقش تھیں، کیونکہ نصرانی عقائد میں بھی ان کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ مسجد بناتے وقت مسلمانوں نے بعض حصوں پر چونے کا پلاستر اس طرح کر دیا تھا کہ نقش و نگار اس کی تہہ میں دب کر رہ گئے تھے اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور بعض حصوں کو اس طرح چھیل دیا تھا کہ اصلیت پہچانی نہیں جاتی تھی۔ پلاستر کے اوپر چرمی پٹیاں پیوست کر کے ان پر آیاتِ قرآنی

لکھدی گئی تھیں اور جہاں سطح صاف ہو گئی تھی ان پر اسلامی انداز کے طغرے کندہ کیے گئے تھے۔ تاہم اتاترک کے فرمان کے بعد بہت بڑے حصے کا چونا اتار کر اصل نقش و نگار برآمد کر لیے گئے ہیں اور ان کو پچھلا روپ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جہاں پتھروں پر طغرے کندہ ہوئے تھے، ان کو ویسے ہی رہنے دیا ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بحالتِ کلیسا اس عمارت میں اسقف کے کھڑے ہونے کی جگہ کسی قدر جانبِ جنوب تھی اور اس طرح بڑے ہال اور دالان کی کوئی بھی سمت کعبہ شریف کے متوازی نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا مسلمانوں کو بوقتِ نماز صف آرا ہونے میں دِقّت پیش آئی، اور مجبوراً انھوں نے مُصلّے ترچھے کر کے اپنی صفوں کا رُخ بدل دیا۔ اب تو اس عجیب قسم کی صف بندی کا محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے کیونکہ قبلہ رُو کھڑے ہونے کا سوال باقی ہی نہیں رہتا۔

ایک غلام گردش میں ہم نے چھوٹا سا پُر اسرار حجرہ بھی دیکھا جس کا دروازہ ہے۔ اس کی اصلیت کوئی نہیں بیان کر سکا کیونکہ ایک قدیم روایت لوگوں کے دل و دماغ پر اس درجہ حاوی ہے کہ وہ اس کے سوا کوئی اور تاویل پیش نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان محمد فاتح کی فوج قتل و غارت کرتی عمارت کے اندر دندانہ گھس آئی تو بڑے پادری صاحب انجیل کی تلاوت میں مصروف تھے۔ وہ خوف زدہ ہو کے بھاگے اور سیدھے حجرے میں گھس گئے اور آج تک باہر نہیں نکلے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ جب یہ ملک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور ہماری حکومت قائم ہو گی، تب پادری صاحب انجیل لیے باہر نکلیں گے اور فوراً درس و ہدایت میں مصروف ہو جائیں گے۔ میں نے اس روایت کو ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ بیان کرنے والے ایسے عام لوگ تھے جن کے ذہنی کرشمے یوں بھی معمولی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے تعجب ضرور رہا کہ اس کوٹھڑی کو بند کیوں رہنے دیا گیا جب کہ یہ عجائب گھر میں بھی بدل گیا ہے۔ اور اگر بعض مسلمانوں کے عقیدے کے مُطابق اس میں یونانی، رومی، تاتاری، سلجوقی اور بعض ترک فرمانرواؤں کے زمانے کے نوادر پوشیدہ ہیں تو ان کو باہر نکال کر منظرِ عام پر اسی عجائب گھر کی زینت کیوں نہیں بنایا گیا۔ اس سے بہتر جگہ اور وقت کون سا ممکن ہے۔

اس عمارت کو باہر سے دیکھ کر کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اندر کا حصّہ حد درجہ خوشنما اور حُسن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہو گا۔ بیرونی دیواریں ایسی نظر آتی ہیں جیسے کوئی عروسِ جمیل ایک دم سُہاگ لُٹ جانے سے مغموم و سوگوار بنی بیٹھی ہو۔ زینت و زیبائش کے اعتبار سے دیواروں کی بیرونی

سطح پر ذرا بھی توجہ نہیں کی گئی ہو۔ میری رائے میں اس کی توجیہہ دو طرح کی جاسکتی ہے۔ اوّل یہ کہ ان کی آراستگی ایسے نقوش سے کی گئی ہو، جن کو اسلامی عقائد کی روشنی میں برداشت نہ کیا جاسکا اور کھرچ کھرچ کر ختم کر دیا جس کے باعث تمام دیواریں ننگی ہو کر رہ گئیں، ورنہ بصورت دیگر یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اولین فنکاروں نے ان دیواروں کو کسی خاص انداز میں آراستہ کرنا چاہا ہوگا، لیکن کسی غیر معمولی واقعہ یا حادثے کے باعث موقع نہ مل سکا اور مناسب وقت کے انتظار ہی انتظار میں ان کا زمانہ گزر گیا۔ بعد کے اربابِ اقتدار ان کے خوابوں کی تعبیر لانے سے قاصر رہے، اور بے جان دیواریں ہر فردِ ذی حیات کی طرح جو ننگا پیدا ہوتا ہے، ہمیشہ کے لیے عُریاں رہ گئیں۔ کوئی بھی ان کو نقش و نگار کے پردوں میں نہ چھپا سکا۔

مسجد سُلطان احمد:۔ ہم نقشہ دیکھ کر کچھ اور جنوب کی جانب بڑھ گئے تاکہ مسجد سلطان احمد کی زیارت کر سکیں۔ یہ مسجد اور مسجدوں کے مقابلے میں ذرا بلند مقام پر تعمیر کی گئی ہے، اس لیے اس کا نظارہ دور اور نزدیک سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ ملک بھر میں صرف یہی ایک مسجد ایسی ہے جس کے چھے مینارے ہیں اور چونکہ خود سر فرمانروا نے مکہ شریف کی جامع مسجد کی ہمسری کے خیال سے، جس کے چھے مینار دنیا میں اپنی مثال آپ تھے، اس مسجد کے مینار اتنی ہی تعداد میں تعمیر کیے تو مسلمانانِ عالم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور جب بادشاہ نے اس خاموش صدائے احتجاج کو محسوس کیا تو سخت نادم ہوا اور اس غلطی کا ازالہ اس طرح کیا کہ اپنے ایک حکم خاص سے خانۂ کعبہ کی مسجد میں ساتویں مینار کا اضافہ کر دینا مناسب سمجھا تاکہ اس کی برتری اور عظمت کا حق محفوظ رہے۔

اس مسجد کی ایک خصوصیت کالے پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جو محراب میں پیوست ہے۔ کہتے ہیں کہ خانۂ کعبہ میں رکھا ہوا حجرِ اسود جب حضرت جبرئیلؑ نے جنت الفردوس سے لا کر حضرت ابراہیمؑ کو پیش کیا تو اس وقت اس کا ایک کونہ ٹھیس لگنے سے جھڑ گیا تھا جو تبرّکاً دست بدست ترکی پہنچ گیا اور ایک عرصے تک عجائباتِ ملک میں شامل رہا۔ حتیٰ کہ اس مسجد کی تعمیر کے وقت بادشاہ کو اس کا خیال آیا اور اس نے محراب کو اس ٹکڑے سے زینت بخش دی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت صحیح ہے یا غلط یا اسی طرح مشکوک ہے جیسے آنحضرتؐ کے ریشِ مبارک کے بال، دانت، ناخن یا پیرہن کے ٹکڑے اسلامی دنیا کے بہت سے شہروں میں محفوظ ہیں اور سال میں ایک بار زیارت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

مطالعۂ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان احمد اوّل نے اپنے خصوصی معمار محمد آغا کو ۱۶۰۹ء میں

یہ مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس نے سات سال کی مسلسل کوششوں سے اسے ۱۶۱۶ء میں پائے تکمیل کو پہنچا دیا۔

اس مسجد کے اندرونی نقش و نگار میں نیلا رنگ مختلف التوع درجات کے ساتھ اس طرح حاوی ہے کہ ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید آسمان پر پرا جمانے والے بادل جبینِ نیاز جھکانے کی خاطر دلانہ مسجد میں گھس آئے اور جوشِ عقیدت میں ہمیشہ کے لیے نقشِ در و دیوار بن کر رہ گئے ہیں۔ عُرفِ عام میں اسی لیے یہ مسجد نیلی مسجد بھی کہلاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس مسجد کے نقش و نگار اپنی رنگین سامانی سے قطع نظر فنی اعتبار سے کچھ زیادہ دیدہ زیب نہیں ہیں۔

نمازِ ظہر کا وقت قریب آچکا تھا۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور فوراً وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گئے۔ امام مسجد ایک عمر رسیدہ بزرگ انسان ہیں۔ انھوں نے اسی مسجد میں رہتے ہوئے کئی دور دیکھے ہیں۔ پہلا دور خلافتِ عثمانیہ کے آخری عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ وہ اس مسجد میں فرائضِ امامت ادا کرنے کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ پھر دوسرا دور آیا جبکہ اذان و نماز اور تلاوتِ کلامِ پاک کو ترکی زبان میں رائج کیا گیا۔ یہ نئی روش پر چلنے سے قاصر تھے، اس لیے الگ کر دیے گئے، لیکن نئے امام کی عنایت سے وہیں پڑے رہے اور پھر تیسرا دور آیا جبکہ مرکز سے ذرا ہٹی ہوئی دنیا دوبارہ اپنے ہی محور کے گرد گھومنے لگی۔ مذہبی پابندیاں اٹھا دی گئیں اور وہ ایک بار پھر مسجد کے امام منتخب ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ مسجد کے ایک حصے میں لاتعداد قرآن شریف رکھے ہیں اور کچھ بچے تلاوتِ قرآن میں مصروف ہیں۔ معلوم نہیں ہو سکا، میرا خیال ہے کہ یہ بچے تعلیم قرآن کے لیے یہاں آئے ہیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک بچہ پانچواں پارہ پڑھ رہا تھا۔ جہاں وہ تھا وہاں سے میں نے بغیر دیکھے آگے پڑھنا شروع کر دیا۔ آخر حافظِ قرآن ہوں! بچہ سب کچھ بھول کر مجھے دیکھنے لگا اور دوسرے سیلانی بھی متعجب ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ نہ معلوم انھیں کیوں یہ یقین نہ آرہا تھا کہ میں بھی قرآنِ پاک پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے ۴-۵ رکوع پڑھ ڈالے۔

قدیم یادگاریں: مسلمانوں کی اس عظیم الشان عبادت گاہ کے عین جانبِ غرب ایک بہت ہی وسیع میدان ہے، جہاں عہدِ عتیق میں یعنی جب یونان در وما کو اس سرزمین پر اپنا پرچمِ حکومت لہرانے کا فخر حاصل تھا، یہاں رتھوں کی وہ ہوش رُبا دوڑ ہوتی تھی جس کا آج محض تصور کرنے سے بعض لوگ حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فوجی محاربات کی کامرانیوں کا جشن منانے کے علاوہ اُمرائے مملکت اور

ارباب اقتدار کی تفریحِ طبع کے لیے یہ ہنگامے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔

عہدِ قدیم میں جس طرح سنٹ آیا صوفیا عبادت اور مذہبی تقریبات کا مرکز تھا اسی طرح یہ میدان جو تیز رفتار گھوڑوں سے چلنے والی رتھوں کی رعایت سے ہیپوڈروم کہلاتا تھا، آج بھی اسی نام سے مشہور ہے (ہیپو کے معنی گھوڑا اور ڈرم بمعنی میدان) یہ بازنطینی عہد میں مدنی زندگی کا مرکز تھا۔ ان لطیف ہنگاموں کے لیے ۲۰۰ء میں اس وقت کے فرمانروا سپٹی مس سیویرس نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ کچھ عرصے بعد قسطنطین نے اس کو زیادہ وسیع کر دیا۔ چنانچہ آج بھی وہ چار سو میٹر طویل اور ایک سو بیس میٹر سے زیادہ عریض ہے۔ اس میں بیک وقت ایک لاکھ تماش بینوں کی نشست کا انتظام تھا۔ یہ لوگ رتھوں کی دوڑ دیکھنا اپنی زندگی کا دلچسپ مشغلہ سمجھتے تھے۔ نشستوں کی تعداد ذہن میں رکھ کر اس زمانے میں اس شہر کی آبادی کا اندازہ لگانا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

تصوّر کی آنکھ سے دیکھا جائے تو آج اس میدان میں وہ خاک بھی اُڑتی ہوئی محسوس ہو سکتی ہے جس کے گہرے غبار میں سینکڑوں رتھ بانوں کی عزیز جانیں تڑپ سسک کر رہ جاتی ہوں گی۔

اس میدان کے وسط میں اس حلقے کے بیچوں بیچ جس کے گرد رتھیں چکر کاٹتی تھیں، پتھر کی ایک مخروطی مینار نصب ہے جسے شہنشاہ تھیوڈوسیس نے مصر سے یہاں لا کر اپنی یادگار قائم کرنے کے لیے لگایا تھا اور جو آج بھی سولہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اسی طرح پائے اِستقامت جمائے باقی دنیا کی بے ثباتی پر خندہ زن ہے۔

اِس میدان میں دو اور بھی نوادر ہیں۔ ایک تو رسّی کی طرح ایک دوسرے کے گرد بل کھانے والے سانپوں کا سنگین ستون جو شاہ قسطنطین اعظم نے کوہ ڈیلفی کی ایک مقدس چٹان سے ترشوا کر یہاں لگانے کے لیے بھیجا تھا تاکہ اس کے قائم کردہ شہر پر دیوتاؤں کا بابرکت سایہ رہے۔ بل کھاتے ہوئے سانپوں کا یہ نشان اس عہد میں صحت و تن درستی کا خاص مظہر سمجھا جاتا تھا اور آج بھی مغربی دنیا میں اس اعتبار سے شفا بخش سمجھا جاتا ہے۔ یہ ستون ۴۷۹ء میں نصب ہوا تھا، جس کے قدرتی رنگ کو زمانے کی انقلاب انگیزیوں نے بدل کر سبز کاہی کر دیا ہے۔

اِسی خاندان کے ایک اور فرمانروا نے دسویں صدی عیسوی میں اہرامِ مصر کی وضع پر ایک چھوٹا سا سنگین ہرم اس میدان میں تعمیر کیا تھا۔ بعض ماہرینِ اثریات کا خیال ہے کہ یہ اسی فرمانروا کا مقبرہ ہے۔ ماضی قریب کی ایک یادگار کے طور پر یہاں ایک مرمریں فوارہ بھی لگا ہوا ہے جو جرمنی کے قیصر ولیم دوم نے اپنے سیاسی جگری دوست سلطان عبدالحمید کو تحفتہً پیش کیا تھا۔

مسجد بایزید:۔ ان یادگاروں کو دیکھ لینے کے بعد پھر سوال پیدا ہوا کہ اب جائیں کدھر کو ہم؟ اگر اور زیادہ جنوبی سمت میں جانے والا راستہ اختیار کرتے تو مسجد سوقولو کی زیارت کر سکتے تھے جس کے آثار مسجد سلطان احمد سے نظر آ رہے تھے۔ لیکن یہ بہت زیادہ تاریخی عمارت معلوم نہیں ہوتی تھی کیونکہ راہنما کتابچے میں کہیں اس کا ذکر نہیں تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس چھوٹی سی مسجد کو دیکھ لینے کے بعد اس راستے پر لوٹنا پڑتا اور اس جانے آنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ہم جانبِ شمال مغرب جائیں اور مسجد بایزید کی زیارت کریں اور اس کے بعد آگے ہی کی طرف بڑھیں اور الٹے قدموں نہ لوٹیں۔

مسجد بایزید سنٹ آیا صوفیا کے عین جانبِ غرب واقع ہے لیکن ہم مثلث کے دو ضلعے چھوڑ کر وتر پر چلتے ہوئے سیدھے مسجد بایزید پہنچ گئے۔ جو ایک بڑی عمارت کے پھاٹک سے گزرنے کے بعد آتی ہے۔ سلاطین عثمانیہ کے عہد میں یہ عمارت وزارتِ جنگ کے دفاتر کے لیے مخصوص تھی لیکن اب اس میں دوسرے کم اہم سرکاری دفتر واقع ہیں۔

یہ مسجد سلطان بایزید نے جو ۱۴۹۷ء سے ۱۵۰۵ء تک سلطان ترکی تھا، خاص اہتمام سے تعمیر کرائی تھی اور غالباً اس مقصد کے لیے کچھ نئے معمار متعین کیے ہوں گے کیونکہ اس کا طرزِ تعمیر اور مسجدوں سے بالکل جداگانہ عربی انداز کا ہے اور اس میں کہیں کہیں جو عبارت کندہ کی گئی ہے، وہ خطِ نسخ میں ہے۔ معمار کا نام خیرالدین تھا۔ ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ صحن مسجد میں وضو کے لیے جو حوض تعمیر کیا گیا ہے اس کے چاروں کونوں پر چار ستون مختلف رنگ کے پتھروں سے تراشے گئے ہیں ایک سفید سنگِ مرمر کا ہے، دوسرا سنگِ موسیٰ کا، تیسرا سبزی مائل ہے اور چوتھا بالکل سرخ۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان میں کہیں جوڑ نہیں ہے، جیسے وہ ایک ہی ایک ٹکڑے میں سے بنائے گئے ہوں۔ عام طور پر اس مسجد کا ایک یہ معجزہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں کبھی چوری نہیں ہوئی۔ اگر کوئی شخص اپنی بیش قیمت چیز بھی یہاں بھول جائے اور یاد آنے پر ڈھونڈھنے آئے تو اس کو کسی نہ کسی جگہ پڑی وہ چیز پڑی ملے گی، لیکن ہمیں یقین نہیں آیا اور آزمائش کا وقت بھی نہیں تھا۔ شاید اسی عقیدے کے مطابق اس مسجد کے حجروں میں سب سے زیادہ مسافر آ کر ٹھیرتے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ اپنا سامان اللہ کے بھروسے پر چھوڑ جاتے ہیں یا کسی سے چوکسی کراتے ہیں۔ مسجد کے اطراف میں پرانے زمانے کے سرو و شمشاد کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اس مسجد کو بعض لوگ کبوتروں کی مسجد بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں ہر وقت صحن میں اور دیواروں پر کبوتروں کا جمگھٹ رہتا ہے اور وہ نمازیوں کے چلنے پھرنے

پر ذرا نہیں اڑتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب پالتو ہیں اور ہر شخص کو پہچانتے ہیں۔ روایت ہے کہ کسی زمانے میں ایک بوڑھی عورت نے اچھی نسل کے کبوتر کا ایک جوڑا یہاں لا کر چھوڑ دیا تھا۔ اسی کے انڈوں بچوں سے یہ جھلڑ تیار ہوا ہے۔ لوگ ایصالِ ثواب کے لیے دانہ لا کر ان کے سامنے ڈالتے ہیں بحیثیتِ مجموعی یہ مسجد بہت زیادہ شاندار اور وسیع نہیں ہے۔

مسجدِ سلیمانیہ:۔ مسجد بایزید کے جانب شمال وہ شہرۂ آفاق بازار ہے جو کپالی چارشی کہلاتا ہے اور جانب غرب یونیورسٹی کی عمارت ہے۔ بازار کے متعلق پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ وہ پھر ذرا فرصت سے دیکھا جائے گا اور یونیورسٹی اس وقت بند تھی۔ لہٰذا ہم بینی مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے مسجد سلیمانیہ پہنچ گئے۔

سلطان سلیمان کی مسجد سلیمانیہ اپنے بنانے والے کا نام روشن کر رہی ہے، کیوں کہ اتنی بڑی اور شاندار مسجد سارے ملک میں کہیں اور موجود نہیں ہے۔ ادرنہ کی مسجد سلیمیہ کی طرح اسے بھی ترکی کے مشہور معمار خواجہ سنان نے تعمیر کیا تھا۔ یہ ۱۵۵۰ء سے ۱۵۵۷ء تک سات سال کی مدت میں مکمل ہو سکی تھی۔

شاہ سلیمان ترکی کا وہ فرمانروا تھا جس نے ملک کو پہلی بار قومی قانون سے سرفراز اور سلطنت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ یہ سلاطین عثمانیہ میں دسواں فرمانروا تھا اور اسی رعایت سے سنان نے چاروں میناروں کے دس کھنڈ اس طرح رکھے کہ دو کے تین تین اور باقی دو کے صرف دو دو کھنڈ تھے اور اس طرح ان کا مجموعہ دس تھا۔ سلطان نے مسجد کی تکمیل کے بعد اس کا افتتاح کرتے ہوئے حیرت سے اس کا سبب دریافت کیا تو سنان نے مذکورہ بالا وضاحت کی جس پر بادشاہ بہت خوش ہوا اور اسے انعامات دے کر مالا مال کر دیا۔

خواجہ سنان نے اس موقع پر بڑے فخر کے ساتھ کہا کہ جب تک اس مسجد کی بنیاد نہیں پڑی تھی، میری حیثیت ایک مبتدی کی سی تھی لیکن اب اسے مکمل کرنے کے بعد میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تحصیل فن میں کمال حاصل کر لیا ہے اور اب صحیح معنوں میں مجھے ایک اعلیٰ معمار کہا جا سکتا ہے۔ خواجہ سنان کو بعض مورخین نے سنان آغا بھی لکھا ہے لیکن اس کی شخصیت محمد آغا سے یقیناً مختلف ہے۔ اکثر لوگوں کو ان کے بارے میں مغالطہ ہوا ہے۔

ایک پہاڑی کی چوٹی پر بنی ہوئی یہ مسجد اپنی اندرونی آرائش کے اعتبار سے ویسے ہی کیا کم عظیم الشان ہے کہ اس کے چاروں کونوں پر چار بلند میناروں نے جو اس کی عظمت کے نگہبان ہیں

اور چاروں طرف لگے ہوئے سَرو کے درختوں نے اس کی خوبیوں کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ سَرو کے درخت خود رو نہیں ہیں، بلکہ پہاڑی کی ڈھلانوں پر بہت سلیقے سے لگائے گئے ہیں۔ ان کے بیچ میں ابھرتی ہوئی مسجد کو دور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ زمردیں تخت پر کوئی بادشاہ اپنا تاجِ زرّیں چھوڑ کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ اس مسجد کے چاروں میناروں سے شاخِ زرّیں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ پانی کے اس وسیع قطعہ کو قدرت کی رعنائی خیال کا ایک عکسِ جمیل کہنا چاہیے۔ یہ آبنائے باسفورس کا وہ عجیب و غریب حصہ ہے جو گھوڑے کے نعل کی شکل میں نظر آتا ہے۔ سمندر کا یہی حصہ ہے جو ترکی کے ایشیائی اور یورپی حصے کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اس طرح جغرافیائی اور تاریخی لحاظ کے علاوہ سیاسی اعتبار سے بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ باسفورس بحیرۂ اسود اور بحیرۂ مرمرہ کے درمیان ایک ایسی قدرتی کنجی ہے جو قوموں کی تقدیر کے ترقیاتی قفل کھولنے کے لیے بارہا استعمال ہوتی رہی ہے۔ یہ آبنائے کبھی کبھی اس علاقے کے لیے پریشانی کا باعث بھی ہوئی ہے اور شاید اسی لیے اس کا ایک اور نام بوغز، کوئی یعنی گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی بھی ہے۔ اس کے دونوں ساحلوں پر بڑی اہم تاریخی بستیاں اور عمارتیں موجود ہیں۔ بلکہ ایک قلعے کے آثار تو دونوں ساحلوں پر اس طرح واقع ہیں گویا آبنائے نے ان کو بیچ میں سے چیر کر اپنا راستہ بنا لیا ہے۔ اس آبنائے نے نہ جانے کتنی قوموں کے عروج و زوال کے معرکے اپنی پُرنم آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ زمانے کی بے حسی نے اسے بہت ہی پُرسکون بنا دیا ہے۔ دو سمندروں کا درمیانی حصہ ہونے کے باوجود اس میں سمندر کا سا تلاطم کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ساحل کبھی ضرورت سے زیادہ زیرِ آب نہیں ہوتے۔ اس کے قریب بسی ہوئی بستیاں اس کی وجہ سے کبھی نہیں اُجڑتیں۔ صدیوں پہلے کی بنی ہوئی عمارتیں بھی اسی طرح مستحکم ہیں، جیسے ابھی ان کی بنیاد پڑی ہو۔ وہ ہر صبح اس کے پُرسکون آبی آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مطمئن ہو جاتی ہیں کہ زمانے کی دست بُرد سے ان کا سہاگ ابھی تک بچا ہوا ہے۔ گو وہ مکین نہیں رہے جن کی اولوالعزمی ان کی تعمیر کا باعث ہوئی تھی۔ وہ چہل پہل اور ہنگامے بھی ختم ہو گئے جو اُن مکینوں کی جولانیِ طبع اور ذوقِ سلیم سے وابستہ تھے۔ تاہم آثار بتاتے ہیں کہ عمارتیں عظیم تھیں۔

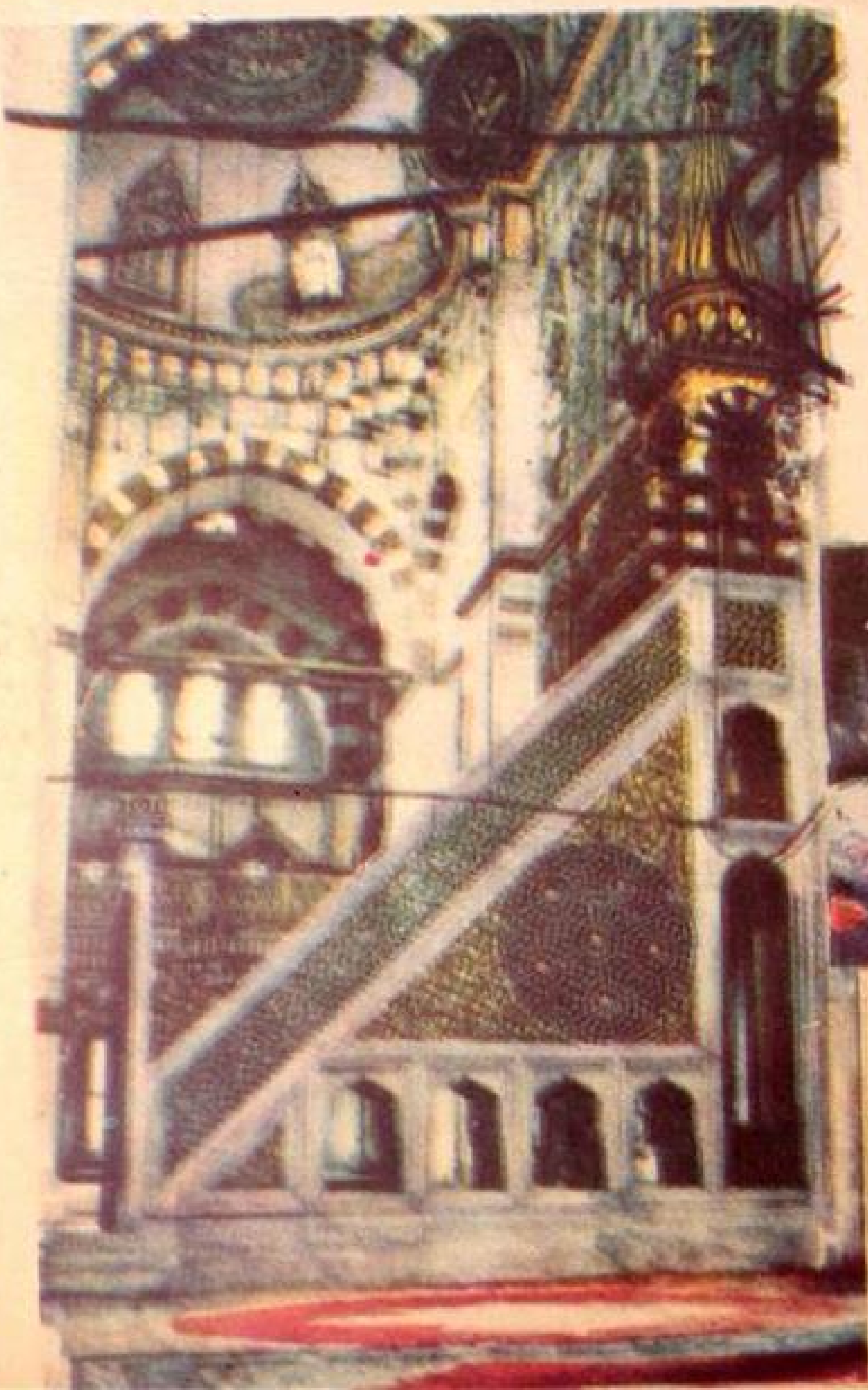
میں ایک مینار کی چوٹی پر کھڑا، شاخِ زرّیں کا نظارہ کرتے ہوئے ان خیالات میں محو تھا اور بھائی جان محترم اور برکات صاحب مسجد کے امام صاحب سے باتوں میں مصروف تھے۔ مسجد کے مؤذن جو معمولی انگریزی جانتے تھے، مترجم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ امام صاحب



مسجد سلیمانیہ



مسجد کے بام و در



مسجد مہر و ماہ کے محراب و منبر

نے مسجد کے بارے میں بہت سی باتیں بھائی جان محترم کو بتائیں جو انھوں نے بعد میں میرے گوش گزار کر دیں۔

اس مسجد کا طول سوا تین سو فیٹ اور عرض دو سو پانچ فیٹ ہے اور کھلے صحن کا طول ایک سو نوے فیٹ اور عرض ڈیڑھ سو فیٹ ہے۔ چاروں طرف جو برآمدے ہیں، ان میں داخل ہونے کے دروازوں کی محرابیں پچیکاری کے اعتبار سے بہت خوبصورت ہیں اور ان پر آیاتِ قرآن کندہ ہیں۔ ہر محراب کے اوپر ایک ایک چھوٹا گنبد ہے لیکن مغربی سمت والے دالان کے وسط میں جو بڑا گنبد ہے، وہ بہت وسیع اور شاندار ہے۔ فرش سے اس کی بلندی ایک سو چھپن فیٹ ہے اور کنارے پر اس کا دور چھیاسی فیٹ ہے۔ اس کے نیچے کھڑے ہو کر بات کی جائے تو آواز نہیں گونجتی۔ برآمدوں اور بڑے دالان کے ستون سفید اور سرخ پتھر کے ہیں۔ ان میں سے بعض سادے ہیں اور بعض پر نقاشی کی گئی ہے جو ایرانی وضع کی ہے۔ دیواروں پر بڑی کاریگری کے ساتھ رنگین شیشے بھی لگائے ہیں، جن سے ان کا حسن بہت بڑھ گیا ہے۔

مسجد کے صحن میں سلطان سلیمان اور اس کی ملکہ روکسالین کے مقبرے ہیں اور یہ مقبرے بھی بادشاہ کے جاہ و جلال کے ترجمان ہیں۔ روکسالین روسی نژاد تھی اور ایک معرکے میں حاصل کی گئی تھی۔ وہ کنیز کی حیثیت سے دربار میں آئی لیکن اپنے بے پناہ حسن و جمال کی جادوگری سے اس نے سلطان کا دل موہ لیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس کا اصل نام روشنک تھا، لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد اسے خورم سلطان کا خطاب دے کر سلطان نے اس سے نکاح کر لیا۔ بہت جلد وہ بادشاہ کے دل و دماغ پر حاوی ہو کر حکومت کے ہر معاملے میں دخل دینے لگی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے سوتیلے بیٹے مصطفےٰ کو جو وارثِ تاج و تخت تھا، چند الزامات لگا کر خود سلطان کے حکم سے تہ تیغ کرا دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا ولی عہد قرار پائے۔

سلطان سلیمان نے اپنی زندگی میں ہمیشہ ہی کامرانی کا منھ نہیں دیکھا۔ بعض معرکوں میں اس کو شکستِ فاش بھی ہوئی ہے۔ اس نے سینٹ جون کے جن بانکے نوجوانوں کو جزیرۂ رھوڈوس سے مار بھگایا تھا، انھی سے مالٹا میں پسپا ہو گیا۔ ۱۵۲۹ء میں اس نے ڈیانا کا محاصرہ کیا تو اس کے چالیس ہزار جوان کام آگئے اور عزم و ارادے کے اس دھنی نے ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تقریباً سارا یورپ اس کے نام سے تھراتا تھا۔ صلیبی جنگوں میں اس کی ہیبت کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھ گیا تھا۔

مسجد فاتح:۔ اتاترک بلواری یعنی خیابانِ اتاترک سے گزر کر ہم دونوں بھائی مسجد فاتح میں جا پہنچے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک گرجا گھر تعمیر کیا گیا تھا جو زمانے کی تباہ کاریوں اور بعض

قبیلوں کے حملوں کے باعث بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ ترکی کے فاتح اعظم سلطان محمد ثانی نے اسی مقام پر مسجد تعمیر کرنی پسند کی۔ اس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تھا اور سب سے پہلا بڑا کام یہی تھا کہ مسجد کی تعمیر شروع کرا دی۔ اس نے سب سے بڑے معمار کو، جو عیسائی تھا، ہدایت کی کہ روپیہ خرچ کرنے میں ہرگز دریغ نہ کیا جائے لیکن مسجد اتنی شاندار ہو کہ روئے زمین پر اس کی نظیر نہ مل سکے۔ اب یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ بادشاہ کی اس ہدایت پر کس حد تک عمل ہوا کیوں کہ ۱۷۶۸ء کے ایک شدید زلزلے میں یہ مسجد اس بری طرح منہدم ہوئی کہ بنیادوں کے سوا اس کے در و دیوار اور سقف و بام کا کوئی حصہ باقی نہ بچا۔ لہٰذا اس کی ساخت اور زیبائش کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ تاہم پانچ سال بعد ۱۷۷۱ء میں اسے نئے انداز میں مکرر تعمیر کر لیا گیا۔ تاہم خیالات بدل گئے تھے اور معمار بھی دوسرے تھے۔ پہلے یونانی طرزِ تعمیر اختیار کیا گیا اور پھر اطالوی اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ شروع میں اس کی وضع قطع کیسی تھی۔ اگرچہ تین صدی بعد ایک بالکل ہی نئی چیز بن گئی تھی مگر اپنے سابقہ نام سے مشہور ہوئی اور اب تک اسی نام سے یاد کی جاتی ہے کیونکہ ابتدائی صورت میں اس کو بنانے والا اسی کے ایک حصے میں ابد تک کے لیے محوِ خواب ہے اور اس کی ملکہ گل بہار خاتون بھی اس کے پہلو میں دفن ہے۔

یہ مسجد زیادہ بڑی نہیں ہے اور اس کے دو مینار ہیں۔ صرف تاریخی اہمیت کے اعتبار سے اس کی قدر کی جاتی ہے، ورنہ فنِ تعمیر کے اعتبار سے اس میں مجھے کوئی بڑی خوبی نظر نہیں آئی۔ البتہ ایک بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے بہت سے حجرے اس کو تین طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور ان سب کے چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں۔ اگر ان کو کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سمندر کی پُرسکون سطح پر بہت سے بلبلے اُبھرے ہوئے ہیں۔ ان حجروں میں جن میں سے بیشتر کے دروازے باہر کے رُخ ہیں، اسپتال، مدرسے، طلبا کی قیام گاہیں، مسافر خانے اور حمام وغیرہ شامل ہیں۔

اس مسجد کے شمال مغرب میں بادشاہ ویلن کے بنائے ہوئے ذخیرۂ آب کے کھنڈر ہیں۔ ان کی تعمیر چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی تھی۔ اب اس کا بیشتر حصہ مسمار ہو گیا ہے، بلکہ خیابانِ اتاترک اس کے عین بیچ میں سے ہو کر گزرتی ہے۔

چونکہ نمازِ عصر کا وقت ہو گیا تھا، اس لیے ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور کچھ دیر وہیں رک کے نماز باجماعت پڑھ لی۔ یہاں کوئی ایسا مترجم نہ مل سکا جس کی وساطت سے ہم کسی سے دوچار

باتیں کرلیتے۔

مسجد قاریہ: مسجد فاتح سے ذرا آگے قدم بڑھائیے تو قاریہ مسجد دعوتِ نظارہ دیتی سامنے آتی ہے۔ یہ بازنطینی عہد کی ایک عبادت گاہ تھی جسے نصرانیوں نے اپنے عہد حکومت میں گرجا بنایا اور مسلمانوں نے تاج و تخت سنبھالنے کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کرلیا۔ یہ مسجد اپنے پاکیزہ نقش ونگار کے باعث مشہور ہے جو مسلمانوں کے ذوقِ لطیف کے آئینہ دار ہیں۔ عمارت کی ساخت اور اس کی مضبوطی بازنطینی دور کی یاد تازہ کرتی ہے۔

مسجد مہرو ماہ:- اب ذرا جانب جنوب آئیے تو مسجد مہرو ماہ اپنی سابقہ تابناکیوں کے بغیر نظر آئے گی۔ اسے شہزادی مہرو ماہ نے جو سلطان سلیمان اور ملکہ روکسا لین (خورم سلطان) کی بیٹی تھی۔ مذکورہ بالا مشہور معمار سنان آغا سے تعمیر کرایا تھا۔ زمانے کے حادثات نے خصوصاً زلزلوں نے اسے زیادہ تباہ کیا لیکن جب بھی اس کی مرمت ہوئی پرانے طرزِ تعمیر اور اسلوبِ آرائش کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔ چناں چہ اس میں کافی دل کشی ہنوز باقی ہے۔

دراصل یہاں کی مسجدوں پر کس مپرسی کا عالم اس درمیانی دور میں زیادہ شدت کے ساتھ طاری ہوا جبکہ ترکی کے عام مسلمانوں نے مسجدوں سے کنارہ کش ہوکر اپنے گھروں میں عبادت کرنا زیادہ مناسب اس لیے سمجھ لیا تھا کہ سرکاری حکم کے مطابق تلاوتِ کلام پاک عربی زبان کے بجائے ترکی زبان میں کی جانے لگی۔ نئے اربابِ حل وعقد نے جب سے اس حکم کو منسوخ کیا ہے اور تلاوت کے لیے عام اجازت دے دی ہے کہ عربی میں ہو یا ترکی میں، مسجدوں میں نئے سرے سے نمازیوں کا جمِ غفیر نظر آنے لگا ہے۔ ہم نے مسجد سلطان احمد میں ظہر کی نماز ادا کرتے وقت اندازہ لگایا تھا اور ہمارا یہ کہنا ہرگز غلط انداز نہیں ہے کہ ترکی میں اسلام زندہ ہے اور شاید بعض دوسرے اسلامی ملکوں سے زیادہ تقدیس و تطہیر کے ساتھ زندہ ہے۔

شہر پناہ: مسجدوں کی زیارت سے اگرچہ دل و دماغ کو بے حد فرحت و تازگی اور ایک قسم کی طمانیت محسوس ہوتی تھی لیکن پاؤں تھک تھکا کر وزنی ہوگئے تھے اور قدم مشکل سے اٹھتے تھے۔ بڑے راستے کاروں میں طے کرنے کے علاوہ کچھ منزلیں بہرحال پیدل چلنے کے بعد ہی آتی تھیں۔ اور پھر اتنی مسجدوں اور دوسری عمارتوں میں گھومنا بعض زینوں پر چڑھنا اترنا کیا کم تھا۔ لہٰذا ہم نے سوچا کہ کچھ دیر کسی جگہ چل کر ذرا سستا لیا جائے تاکہ یہ تھکن دور ہو جائے اور ہم ایک بار پھر تر و تازہ ہوکر چند مزید تاریخی مقامات کو دیکھ سکیں۔

راہنما کتابچے اور اس میں دیے ہوئے نقشے کی مدد سے ہمیں معلوم ہوا کہ مسجد مہرو ماہ سے کچھ فاصلے پر فصیل شہر اور اس کا ایک بڑا دروازہ بھی اس شاہراہ پر ذرا آگے چل کر واقع ہے جسے فوزی پاشا جادہ سی کہتے ہیں، جسے طے کر کے ہم مسجد مہرو ماہ تک پہنچے تھے اور جو پہاڑیوں والے اس حصّہ شہر سے باہر لے جا کر مسجد ایوب تک پہنچاتی ہے اور اس مسجد سے کچھ دُور آگے بڑھ کر پیئر لوتی کے نام سے منسوب وہ سیدھا سادا ہوٹل ہے، جہاں فرانس کے اس مشہور مصنف نے کچھ عرصے قیام کر کے اپنے دو ناول مرتب کیے تھے، لہٰذا پروگرام کا باقی حصہ یوں مرتب ہوا کہ پہلے فصیل کو دیکھا جائے، اس پر چڑھ کر شہر کے مضافات کا نظارہ کیا جائے۔ کچھ دیر بعد آگے بڑھ کر مسجد ایوب کی زیارت کی جائے اور پھر ہوٹل میں بیٹھ کر کچھ مشروبات و فواکہات سے لذتِ کام و دہن حاصل کرتے ہوئے دورِ ماضی کی یاد تازہ کی جائے۔

پرانے استنبول کے چوں کہ تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہے، اس لیے شہر پناہ صرف اسی سمت میں تعمیر کرنے کی ضرورت پڑی تھی جس سمت سے حملہ آوروں کے آنے کا زیادہ امکان تھا۔ گویا ذرا سے خم کے ساتھ یہ دیوار شمالاً جنوباً تعمیر کی گئی تھی۔

شہر پناہ کی تعمیر کا تاریخی پہلو بہت ہی متنازعہ فیہ ہے۔ مورخین کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ مغالطہ غالباً ایک بنیادی حقیقت کو نہ سمجھنے کے باعث پیدا ہوا ہے اور وہ یہ کہ فصیل ایک بار نہیں، کئی بار اور ایک زمانے میں نہیں، مختلف زمانوں میں تعمیر ہوئی ہے، اور موجودہ فصیل کی بنیاد بھی وہ نہیں ہے جو سب سے پہلے فصیل کے لیے رکھی گئی تھی۔

اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ جب قسطنطین اعظم نے روم کی بنیاد رکھی تو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کی کل آبادی کتنی ہوگی۔ اس نے اپنی دانست میں ضرورت سے زیادہ رقبے کو محصور کیا تاکہ اندر آباد ہونے والوں کو کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو، لیکن اسّی سال کی مدت میں آبادی اتنی بڑھ گئی کہ اطمینان کے ساتھ گزارا مشکل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ستم بھی ہُوا کہ وحشی قبائل نے اور باقاعدہ منظم فوجوں نے آئے دن سخت حملے کر کر کے فصیل کو جگہ جگہ سے مسمار کر دیا۔ اگرچہ اس زمانے میں شکست و ریخت کے آلات بہت زیادہ تباہ کُن نہیں تھے لیکن دیوار کا آثار اتنا کم تھا کہ اس میں ان حملوں کی سہار بھی مشکل تھی۔

چناں چہ ۴۱۳ء میں جبکہ روم کا بادشاہ تھیوڈوسیس دوم اور استنبول کا حاکم یا مشرقی ممالکِ محروسہ کے لیے نائب السلطنت اینتھیمیس تھا، بہت بڑے علاقے کو گھیرے میں لے کر

فصیل کی تعمیر دوبارہ بالکل ہی نئی بنیاد پر ہوئی، جس کے کچھ آثار اب تک موجود ہیں۔

اس دیوار کی موٹائی ۱۹۰ سے ۲۰۷ فیٹ تک اور اونچائی کم و بیش سو فیٹ تھی۔ اسے تہ بہ تہ متعدد پشتوں کی صورت میں تعمیر کیا گیا تھا تاکہ اسے توڑنا یا زینے کے بغیر اس پر چڑھنا ممکن نہ ہوسکے۔ ساری فصیل پر ہمیشہ پہرہ دینے والوں کے لیے ۹۶ گنبد تھے، جہاں سے دشمنوں پر زہر آلود تیر پھینکنے یا آتش یونان سے ان کے حملوں کا جواب دینے کا ہر وقت مناسب انتظام رہتا تھا۔ (بارود کی ایجاد یونانیوں سے منسوب کی جاتی ہے، اس لیے بارودی گولوں کو جن سے دشمن کے کیمپوں میں آگ لگ جاتی تھی، آتشِ یونان کہا جاتا تھا)۔

اس فصیل پر فالتو پتھروں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ رہتا تھا تاکہ منجنیق کے ذریعے دشمن کی فوجوں پر سنگ باری کی جاسکے۔

۶۱۷ء میں ہیریکلیس نے سلسلۂ فصیل میں مزید اضافہ کیا کیونکہ آبادی برابر بڑھتی جارہی تھی اس طرح قریب کی چھٹی پہاڑی کے گرد بھی گھیرا ڈال دیا گیا۔ ۸۱۳ء میں آرمینیا کے بادشاہ لیو پنجم نے اور اس کے بعد میونئل کومینس (۱۱۴۳ء تا ۱۱۸۰ء) نے اور طول دے کر ساتویں پہاڑی گھیر لی۔ اب بھی یہ سات پہاڑیوں کا شہر کہلاتا ہے۔

اگر ہم شہر میں رہنے والوں کی مختلف جماعتوں کے درمیان جو خانہ جنگیاں ہوئیں اور ان موقعوں پر انھوں نے فصیل کو پشت پناہ بناکر جو نقصان دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اسے پہنچادیا، اسے نظرانداز بھی کردیں تو غیر قوموں کے حملے کسی طرح فراموش نہیں کیے جاسکتے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ۶۲۷ء میں آوار نے ۶۷۳ء سے ۶۷۷ء تک اور پھر ۷۱۸ء میں عربوں نے، ۸۱۳ء اور ۹۱۳ء میں بلغاریوں نے، چوتھی صلیبی جنگ کے دوران ۱۲۰۳ء اور ۱۲۰۴ء میں مخالف دستوں نے اور ۱۴۲۲ء اور ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے ایسے تباہ کن حملے کیے کہ یہ لمبی لمبی چوڑی موٹی اور اونچی دیوار شدید نقصانات اٹھائے بغیر انھیں نہ جھیل سکی۔

انجام کار ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کا حملہ شدید ترین تھا، جبکہ عثمانیوں نے اس شہر پر قبضہ جمانے کی خاطر فصیل کو جگہ جگہ سے توڑ کر اندر گھسنے کے لیے کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔

یہ دیوار بری طرح تباہ ہوچکی ہے لیکن بعض قابلِ ذکر حصّوں کے شکستہ آثار ابھی باقی ہیں۔ مثلاً زرین دروازہ، جو اس مقام پر تعمیر کیا گیا جسے روند کر میکسی مس کو شکست دینے والی تھیوڈوسیس اوّل کی فوجیں شہر میں داخل ہوئی تھیں۔ تھیوڈوسیس دوم کے عہد میں

دیوار تعمیر کرتے وقت اس واقعہ کی یادگار قائم کرنے کا خیال رکھا گیا۔ یہ دروازہ تین محرابوں کی صورت میں تھا۔ سنٹ رومانس کے نام کا دروازہ بھی جواب ٹوپ کاپوسی کہلاتا ہے، قابلِ ذکر ہے۔ ۱۴۵۳ء میں اسی دروازے کو توڑ کر سلطان محمد استنبول میں داخل ہوا تھا۔

دیوار پر چڑھنے کے لیے زینے ضرور ہوں گے لیکن ان کو تلاش کرنا چنداں ضروری نہیں تھا۔ ہم ٹوٹے ہوئے پتھروں کی سیڑھیاں بنا کر آسانی سے اوپر چڑھ گئے۔ دروازے کی بلندی عام فصیل سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کا ایک پایہ اب بھی خاصا پختہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے سب سے اوپر چڑھ کر جانبِ غرب نظر دوڑائی۔ بہت دور تک کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے تھے۔

راہنما کی مدد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر پناہ کے باہر اسی سمت میں استنبول کا ہوائی اڈا ہے۔ ہوائی اڈے کی عمارت تو ہمیں اتنی دور سے کیا نظر آتی، لیکن عین اس وقت ایک جہاز کو نیچے اترتا دیکھ کر ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اس مقام پر ہوگا۔

ہوائی مستقر کے قریب گھوڑ دوڑ کا میدان بھی ہے اور ان لوگوں کی آبادی ہے جو ریس کورس سے تعلق رکھتے ہیں۔ گھوڑ دوڑ سے ہمیں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، اس لیے اس طرف توجہ دینا یا اس کا خیال کرنا غیر ضروری تھا۔ البتہ ہوائی اڈے کے عین محاذ میں اور کافی فاصلے پر ہمیں ایک اور بڑے دروازے کے دھندلے سے نقوش نظر آئے۔

مسجد ایوب:۔ "سورج نے" ارضِ ترکیہ پر اپنی آخری کرنیں بکھیر چکنے کے بعد "طشتِ افق سے "لالے کے پھول" لے کر "شامِ سیاہ قبا" کو مالنے شروع کر دیے تھے، اس لیے ہم بھی اس تاریخی دیوار کو خیرباد کہہ کر نیچے اتر آئے اور موٹر میں بیٹھ کر مسجد ایوب کی طرف چل پڑے۔

مسجد ایوب حضرت ایوب انصاریؓ کی یاد میں سلطان فتح محمد نے استنبول فتح کرنے کے پانچ سال بعد ۱۴۵۸ء میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ بزرگ حضرت رسول اکرمؐ کے رشتے کے بھائی اور خاص مقربین میں شامل تھے اور اکثر لڑائیوں میں شریک رہ کر فروغِ اسلام کے لیے جہاد کرتے رہے تھے۔ ان کا آخری معرکہ ایشیائے کوچک کی طرف یلغار کرتے ہوئے استنبول کی تسخیر کے وقت عمل میں آیا جو کامیاب نہ ہو سکا اور ۶۷۰ء میں ایک مجاہد کی طرح شہید ہو گئے۔ ان کے ساتھیوں نے اسی مقام پر ان کو دفن کر دیا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ ۵۲ھ مطابق ۶۷۰ء میں مسلمانانِ عرب نے پہلی بار اس علاقے پر حملہ اپنے خلیفۂ وقت معاویہ بن ابوسفیان کے ایما اور اشارے پر کیا تھا اور اس کی وجہ وہ حدیث

کہی جا سکتی ہو جو بخاری، مسلم اور امام احمد بن حنبل نے یکساں طور پر بیان کی ہو۔ روایت ہو کہ رسول اللہ صلعم نے ایک بار فرمایا تھا کہ میری امت کی اس اوّلین فوج کے جو لوگ شہر قیصر پر چڑھائی کریں، مغفرت پائیں گے۔ (اوّلُ جَیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم)

اسی طرح ایک اور روایت بھی بیان کی جاتی ہو کہ رسول اللہ صلعم نے کسی اور موقع پر فرمایا کہ قسطنطنیہ ضرور فتح ہوگا، اس لیے بہت عمدہ ہو وہ سردار جس کے سر اس فتح کا سہرا ہو، اور بہت عمدہ ہو وہ فوج جو بڑھ کر یہ فتح حاصل کرے (لتفتحن القسطنطنیہ والنعم الامیر والنعم الجیش جیشھا)

استنبول فتح کرنے کے بعد سلطان فتح محمد کے دل میں یہ چٹیک رہی کہ کسی طرح حضرت ایوبؓ کی قبر کا صحیح پتہ لگ جائے۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ ایک رات اسے بشارت ہوئی اور صبح ہوتے ہی اس نے محققین کو جستجو کے لیے مامور کر دیا۔ تھوڑی سی کھدائی کے بعد قبر کے آثار مل گئے اور بادشاہ نے فوراً اس جگہ مقبرہ تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔ مقبرے کے بالکل قریب ان کی یاد میں مسجد بھی بنوائی جو ۱۸۰۰ء میں کسی قدر بوسیدہ ہو گئی تھی۔ اس لیے سلطانِ وقت نے اس کی مرمت کرائی اور بعض حصے نئے سرے سے تعمیر کروا دیے۔

اس مسجد کا احترام تمام سلاطین عثمانیہ نے کیا ہو، بلکہ یہ رسم تھی کہ ہر نئے بادشاہ کی رسمِ تخت نشینی خواہ محلات کی چار دیواری میں انجام پا جائے مگر صحیح رسم کی ادائگی کے لیے اُسے پیدل چل کر مسجد ایوب تک جانا پڑتا تھا اور وہاں مسجد کے پیشِ امام اس کے سر پر تاج شاہی رکھ کر ایک تلوار پیش کرتے تھے۔ اسی وقت بادشاہ کو ساری مسجد میں پھر گھوم کر یہ بھی معلوم کرنا ہوتا تھا کہ اس کا کوئی حصہ مرمت طلب تو نہیں ہو۔ اگر کسی قسم کا نقص نظر آتا تو فوراً اسے دور کرنے کے احکامات صادر ہو جاتے تھے۔

اس مسجد کا صحن اور صدر دروازے سے نیچے اترنے کی سیڑھیاں ہر وقت کبوتروں سے پٹی رہتی ہیں کیوں کہ لوگ جوش عقیدت میں انھیں خوب دانہ کھلاتے ہیں۔ بالکل مسجد بایزید کی طرح اس مسجد کے بارے میں بھی مشہور ہو کہ کسی نے کبوتروں کا ایک جوڑا اس مسجد کے صحن میں لا کر چھوڑ دیا تھا، اسی کے انڈوں بچوں سے جھلڑ تیار رہوا ہو۔ معلوم نہیں کون سی روایت صحیح ہو۔ تاہم دونوں جگہ کبوتروں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔

موقع کو غنیمت جان کر اور دلی آرزو پوری کرنے کے خیال سے ہم نے نمازِ مغرب وہیں ادا کی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نماز میں کتنا لطف آیا۔ ہماری جسمانی کوفت یکسر دور ہو گئی بلکہ ایک قسم کی طمانیت محسوس ہونے لگی۔

ہم نے مزارِ مبارک کی بھی زیارت کی جہاں چند معتقدین سر جھکائے بیٹھے یادِ الٰہی میں محو تھے۔ معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ وہاں باقاعدہ تلاوتِ کلامِ پاک کے لیے روزانہ آتے ہیں اور تقریباً دو قرآن صبح و شام ختم ہو جاتے ہیں۔

محض تبرک کے طور پر ہم نے ایک مجاور سے دو تسبیحاں خریدیں اور کچھ دیر بعد ہوٹل کی جانب چل دیے، حالاں کہ اب دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ روح کی تازگی وہاں نماز پڑھنے اور زیارت کرنے سے حاصل ہو چکی تھی، تاہم پیئر لوتی کی رعایت سے ہم نے ہوٹل میں جانا مناسب سمجھا۔

پیئر لوتی ہوٹل:۔ فرانس کا زندہ جاوید مصنف پیئر لوتی، جو فوج کا ایک افسرِ اعلیٰ بھی تھا، جب یورپ کے بہت سے ملکوں کی سیاحت کرتا ترکی میں استنبول پہنچا تو شہر پناہ کے باہر پُرسکون سی جگہ تلاش کر کے ایک سرائے میں ٹھیر گیا، جو پہاڑی کے ایسے سرے پر واقع تھی، جہاں سے شاخِ زریں کا اچھا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ خصوصاً سورج کے طلوع و غروب کے وقت پانی کی لہریں عجیب سماں پیش کرتی تھیں۔ یہ منچلا فوجی اس منظر پر ایسا فریفتہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لیے وہیں کا ہو رہا۔ وہ رات کو سرائے میں سوتا اور سارا دن پہاڑی کی چوٹی پر سرو شمشاد کے زیرِ سایہ گزار دیتا۔ اس عالم میں اس نے دو کتابیں بھی لکھ ڈالیں، جو کہنے کو تو ناول ہیں لیکن بیانیہ اسلوب کے باعث مشکل سے ناول کہی جا سکتی ہیں۔ ان دونوں کتابوں "ازیے یادے" اور "فانتوم دا اوریئنت" میں فاضل مصنف نے استنبول میں اپنے دورانِ قیام کے تاثرات بڑے رومانوی انداز میں درج کیے ہیں۔ اردو کے سوا دنیا کی شاید ہی کوئی مہذب زبان ایسی ہو گی جس میں ان کتابوں کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔

زمانے کی ترقیوں کے ساتھ وہ معمولی سرائے اب ایک چھوٹے سے، مگر عمدہ ہوٹل اور کیفے میں بدل گئی ہے اور مالک نے جو علم دوست اور ادب نواز معلوم ہوتا ہے، اس کا نام "پیئر لوتی ہوٹل" رکھا ہے، وہاں روزانہ شام کو اصحابِ ذوق کا بڑا مجمع رہتا ہے۔

اس پہاڑی پر موٹر لے جانا آسان نہ تھا اور برکات صاحب کا یہ امتحان تھا۔ راستے

کی نیچے سے اوپر تک جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ آسمان کی طرف چڑھائی کرنی ہے اور وہ بھی موٹر میں! برکات صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ کہتے تھے کہ اگر موٹر رک گئی تو پھر نیچے ہی آئے گی، اوپر نہیں جا سکے گی۔ میں ذرا موڈ میں تھا، بڑی خوشامدیں کرائیں اور پھر موٹر میں نے چلائی اور آخر کار جب ہم دونوں بھائی اور برکات صاحب وہاں پہنچے تو ایک شاعر صاحب بڑے والہانہ انداز میں اپنے اشعار حاضرین کو سنا رہے تھے۔ چونکہ "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمیدانم" والی بات تھی، اس لیے ہم نے ایک طرف کو بیٹھ جانا چاہا لیکن شاعر صاحب کی نگاہ ہم پر پڑ گئی اور شاید وہ ہمارے لباس کی وضع قطع پر جو پہلی بار ان کو نظر آیا ہوگا، کسی قدر متعجب تھے۔ وہ ہم سے ملنے کے لیے قریب آنا چاہتے تھے کہ ہم نے ان کے ارادے کو سمجھ کر خود ہی پیش قدمی کی اور ان کے نزدیک پہنچ گئے۔

مختصر تعارف کے بعد انھوں نے مصافحہ کیا، بغل گیر ہوئے اور کچھ سوال کیا جو ہم سمجھ نہ سکے۔ پھر انھوں نے خود ہی انگریزی بولنی شروع کر دی اور اس طرح بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ ہم ہندستان سے آئے ہیں یا پاکستان سے۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا کہ دونوں ملکوں سے اور پھر خود ہی وضاحت کر دی کہ میں پاکستانی ہوں اور میرے بھائی ہندستانی ہیں اور برکات صاحب نہ معلوم کیا ہیں!

قدرے استعجاب کے بعد سعد اوغلو صاحب نے ایک دل چسپ سوال کیا کہ ہمارے والدین میں سے کون ہم دونوں کے لیے مشترک ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ ممکن العمل نہیں تھا کہ دو حقیقی بھائیوں کی قومیتیں مختلف ہوں۔ میں نے تقسیم برصغیر سے پہلے اور بعد کے حالات کا تجزیہ کر کے ان کو سمجھایا کہ ہم دونوں کے ماں باپ ایک ہی تھے۔ صرف سیاسی حالات نے ہم کو قومی اعتبار سے الگ کر دیا ہے ورنہ خون کا رشتہ مشترک ہونے کے اعتبار سے ہم ابھی تک ایک ہی ہیں اور ہماری اولادیں بھی کسی معاشرتی فرق و امتیاز کے بغیر یکساں رہیں گی ——— بالکل اسی طرح جیسے ترک قوم کے افراد ملک کے ایشیائی حصے میں رہیں یا یورپی علاقے میں، آبنائے باسفورس کی آبی حد ان میں کوئی افتراق پیدا نہیں کر سکتی۔ دل و دماغ کے اتصال کی تقسیم ناممکن ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ میرے اور آپ کے نام میں صرف حرف ی کا فرق ہے اور اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو ہم دونوں ایک ہی ہیں اور مفہوم تو یوں بھی یکساں ہی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو ہمیشہ ترکوں سے ہمدردی رہی ہے اور ترکوں نے بھی اپنے ہندی بھائیوں کے ساتھ محبت کا اظہار کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اگر دونوں ملکوں میں سے کسی ایک جگہ

طوفان یا سیلاب آیا یا کوئی اور مصیبت بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوئی تو دوسری جگہ کے رہنے والے تڑپ اٹھے اور دامے، درمے، قدمے، دست تعاون بڑھانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ جیسے یہ دونوں آپس میں توام ہوں کہ ایک کی تکلیف دوسرے کے لیے اذیت کا باعث بن جاتی ہے۔ انھوں نے اٹھ کر دوبارہ مجھے سینے سے لگا لیا۔

میری استدعا پر انھوں نے نمونتہً اپنے چند اشعار سنائے جن کے صوتی تاثر سے ہم محظوظ ہوئے اور پھر ان کا ترجمہ بھی سنا۔ سب تو نہیں لیکن ایک شعر کا مفہوم مجھے یاد رہ گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک عقلمند انسان دوستوں کو ہر وقت اور ایک بیوقوف محض ضرورت کے وقت یاد کرتا ہے۔

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور ہمیں اندیشہ تھا کہ ہم پرانے استنبول کے ٹیڑھے سیدھے راستوں سے ہو کر شاید آسانی سے اپنے ہوٹل نہیں پہنچ سکیں گے۔ اس لیے بادلِ ناخواستہ ہم نے سب سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ سعد زاغلو نے راہنمائی کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ اب انھی راستوں سے واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے، جن پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے، بلکہ ہمیں چاہیے کہ ایوان سرائے جادہ سی پر گاڑی چلا کر اتاترک کوپرو سو یعنی اتاترک برج کو طے کر کے دوسرے حصے میں پہنچیں اور پھر رفیق جادہ سی سے ہو کر تقسیم چوک چلے جائیں جہاں سے ہوٹل ہلٹن بہت ہی قریب ہے۔

ان کا یہ ہدایت نامہ واقعی بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ ہم بہت جلد پُل پر پہنچ گئے۔ شاخ زرین کو عبور کرنے کے لیے یہ دوسرا پُل ہے، جو پہلے تاریخی پُل یعنی غلطہ برج کے متوازی لیکن کافی فاصلے پر واقع ہے۔ اس وقت پُل کے نیچے دور دور تک شاخ زرین کے نظارے بہت ہی دل فریب تھے۔ چھوٹی چھوٹی بہت سی کشتیاں جن میں مشکل سے چار پانچ آدمی بیک وقت بیٹھتے ہیں، سطح آب پر آہستہ آہستہ رواں تھیں۔ ان میں تیل کے چراغ روشن تھے اور صرف انہی روشنی سے ان کے وجود کا پتہ چلتا تھا، ورنہ باقی حصے پر تاریکی چھا چکی تھی، چناں چہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پانی پر بہت سے ستارے مختلف سمتوں میں کسی نامعلوم منزل کی طرف سرگرم سفر ہیں۔

ہم اس منظر کو دیکھنے کے لیے کچھ دیر رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔

سونے سے کچھ دیر قبل میں نے حسبِ معمول مطالعہ شروع کیا اور بھائی جان دوسرے روز کا پروگرام بنانے بیٹھ گئے۔ بہت سے ادارے دیکھنے اور لوگوں سے ملاقات کرنے کے اوقات معین ہو چکے تھے۔ ان سب کو یکجا مرتب کرنے کی ضرورت تھی۔

۲۸ اگست ۱۹۵۶ء ـــــــ منگل

آدالار ـــ اور ـــ کاپالی چارشی

نسبتاً ذرا جلد سو جانے کی وجہ سے صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ یوں بھی ہم زیادہ دیر تک سونے کے عادی نہیں ہیں، خواہ اپنے وطن میں ہوں یا غیر سرزمین پر سفر کر رہے ہوں۔ جب یہ تہیہ کر لیا جائے کہ صبح کو فلاں وقت بیدار ہونا ہے تو مجال نہیں کہ ہمارے پروگرام میں اس اعتبار سے کوئی رخنہ پڑ جائے۔ آنکھ ایک دم وقتِ مقررہ پر اس طرح کھل جاتی ہے جیسے واقعی کسی نے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہو۔ بھائی جان مجھ سے بھی چند منٹ پہلے اٹھے تھے۔ برکات صاحب برابر کے کمرے میں تھے اور شاید کوئی بھیانک خواب دیکھ کر چونک پڑے تھے، ورنہ وہ اس قدر جلد بیدار ہونے والوں میں نہیں ہیں۔

آج کے پروگرام کے مطابق ہم نے شروع کا آدھا دن بحیرۂ مرمرہ میں مجمع الجزائر کے لیے مخصوص کیا تھا جسے ترک آدالار اور انگریز پرنسس آئی لینڈز یعنی جزائر شہزادگان کہتے ہیں اور باقی آدھا دن پرانے استنبول کے اس طویل بازار کے لیے وقف کر دیا تھا جس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھت پڑی ہوئی ہے اور اس اعتبار سے وہ دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ترک اسے اپنی زبان میں کاپالی چارشی کہتے ہیں۔

برکات صاحب کو بھی اس مہم میں ہمارا ساتھ دینا تھا۔ وہ ان جزیروں میں پہلے کبھی نہیں گئے تھے اور ان کی تعریف سن چکے تھے۔ ٹیلی فون کے ذریعے انھوں نے ایک جزیرے پر قائم شدہ صحت گاہ کے منتظمِ اعلیٰ سے بات چیت کر کے وقت مقرر کیا تھا اور ہمارا مختصر تعارف کرا دیا تھا۔ برکات صاحب ان سے کسی اور موقع پر مل چکے تھے اور ایک دوسرے سے واقف تھے۔

ہم نمازِ فجر سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہوٹل کے دو ملازم عام دستور کے خلاف اور ہماری ہدایت کے مطابق ناشتے کا سامان مقررہ وقت سے بھی چند لمحے پیشتر تیار کر کے لے آئے۔ "یہ چھوٹی حاضری" سے بھی پہلے کا وقت تھا۔ اس وقت معدہ تو ضرور خالی ہوتا ہے لیکن بھوک کسی کو نہیں لگتی۔ ہم مجبور تھے۔

پھر نہ کچھ کھانا لازمی تھا۔ جزیرہ جیبلی کے سینٹ ٹوریم میں ہم سب کو لنچ کی دعوت دی گئی تھی لیکن بغیر کھائے ایک بجے تک کا وقت گزارنا بڑا مشکل تھا۔ راستے میں نہ کچھ کھانے کا امکان تھا اور نہ ہمیں گوارا تھا۔

اس ہوٹل میں ناشتے کے وقت فرمائش کرنے پر عمدہ شہد مل جاتا ہے اور ترکی کا شہد جو یقیناً خالص ہوتا ہے، دور دور مشہور ہے۔ اسے چھوڑنا کفرانِ نعمت ہے جبکہ اس کا ذکر کلام پاک میں موجود ہے، حضرت رسول مقبول صلعم نے اسے استعمال کرنے کی تلقین کی ہے اور طبی اعتبار سے اس کی افادیت کے ہم قائل ہیں۔ لہٰذا توسوں کے ساتھ خوب کھایا اور شاید اس سے بھوک کھل گئی کہ ہم تلے ہوئے اور اُبلے ہوئے کئی انڈے کھا گیا اور مٹھاس بھی کھائی، جسے ترکی نشاط کہتے ہیں۔

چائے پینے کی اچھی چیز نہیں ہے لیکن اس وقت بھائی جان محترم کو پینی پڑی، البتہ اپنے خاص قاعدے کے مطابق۔ عام دستور تو یہ ہے کہ پیالی میں چائے کا پانی اُنڈیلا اور بقدرِ اشکِ بلبل تھوڑا سا دودھ ڈال لیا، کبھی اس سے بھی احتراز کیا۔ ایسی چائے پینے والوں کے نزدیک شاید چینی تلخ ہوتی ہے اس لیے کہ اس سے بھی پرہیز کرتے ہیں، اور اگر گوارا کیا تو گویا اس کے دانے گِن گِن کر کہ اگر تعداد میں ذرا بھی زیادہ ہوئے تو ایٹی کیٹ کے خلاف سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس ہمارا دستور یہ ہے کہ پیالی میں سب سے پہلے دودھ الٹا، کئی چمچے چینی کے آمیز کیے اور پھر تبرکاً تھوڑا سا پانی چائے کا ملا لیا تاکہ قریب بیٹھنے والوں کو اعتراض نہ ہو۔ میں نے کبھی چائے نہ پی ہے اور نہ کبھی پینے کا ارادہ ہے۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہم نے لباس تبدیل کیا۔ بعض لوگ ناشتے سے پہلے لباس تبدیل کرتے ہیں، ہم اس کے قائل نہیں ہیں۔ برکات صاحب نے آج علی الصباح احمد کو بلا لیا تھا تاکہ وہ ہم سب کو ساحل سمندر پر اس گھاٹ تک پہنچا دے جہاں ہم انقرہ سے آتے وقت آبنائے باسفورس کو فیری کے ذریعے عبور کر کے اُترے تھے۔

آدالار کی جانب: استنبول کے یورپی حصے سے جزائر شہزادگان کو جانے والے اسی گھاٹ سے فیری پر سوار ہوتے ہیں۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود برکات صاحب نے آگے بڑھ کر تین ٹکٹ کشتی پر سوار ہونے کے لیے خرید لیے۔ بے چارے ہمیں کچھ خرچ کرنے نہیں دیتے۔

بہت سویرے وہاں پہنچنے میں بہت سے لوگ ہم سے بھی بازی لے گئے تھے، کیونکہ نصف سے زیادہ فیری بھر چکی تھی اور اس کی روانگی میں تقریباً دس منٹ باقی تھے۔ لوگ برابر چلے آ رہے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے۔ ترک کم اور غیر ملکی زیادہ، کیونکہ ملکی باشندے زیادہ تر ایک اور گھاٹ سے، جو غلطہ پل کے نزدیک ہے، فیری پر سوار ہوتے ہیں۔

ہمارے ساتھ جانے والے غیر ملکیوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو سمندر کے ایسے پُرسکون ساحلوں کی تلاش میں ہوتے ہیں، جہاں پرندے کی آنکھ بھی ان کی بعض حرکتوں کو نہ دیکھ سکے۔ البتہ ان کے ہم مشرب اگر بھولے چوکے نظر ڈال لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ گھڑیالوں، مگرمچھوں اور دریائی گھوڑوں کی طرح ساحل کی گیلی ریت پر اوندھے، سیدھے، آڑھے ترچھے انداز میں دو دو چار چار گھنٹے تک اپنے قدرتی لباس میں، جس کا اُلٹا سیدھا نہیں ہوتا، مسلسل پڑے رہنا اور دھوپ میں سنکے جانا، مغربی طب کے اصولوں کے مطابق حصولِ صحت کا وہ انوکھا مشغلہ ہے جس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

بعض کاروباری لوگ بھی اس گروہ میں شامل تھے، جن کے چہروں کے اتار چڑھاؤ صاف بتا رہے تھے کہ انھیں اپنی تجارت میں نفع ہو رہا ہے یا نقصان۔ پہلے دو جزیرے جن کے ساحل کسی وجہ سے انسان کو حیوان بنانے کے لائق نہیں ہیں، مختلف قسم کی پیداوار اور چھوٹی دست کاریوں کے مرکز ہیں، یا جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، وہاں ماہی گیروں کی بستیاں ہیں۔ ان لوگوں کی منزلِ مقصود یہی جزیرے تھے۔

کراچی میں حمل و نقل کی کافی سہولتیں نہ ہونے کے باعث عام طور پر سننے میں آیا ہے کہ بسوں وغیرہ میں خوب اوور لوڈنگ ہوتی ہے اور اس کے باوجود اکثر گاڑیاں بس اسٹاپ پر اس لیے ضرورت سے زیادہ رکی رہتی ہیں کہ شاید کچھ اور سواریاں آجائیں تو ان کو بھی بٹھا لیا جائے۔ بالکل یہی صورت یہاں ہوئی کہ فیری میں تل دھرنے کی گنجائش نہیں رہی لیکن وہ روانہ ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ لوگ آرہے تھے، ٹکٹ بک رہے تھے اور ان کو کشتی میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ وقتِ مقررہ سے آدھ گھنٹے بعد روانہ ہوئی۔ دوسری کشتی کو اس وقت کے دو گھنٹے بعد چلنا تھا۔

بحیرۂ مرمرہ میں:- کشتی کا لنگر اٹھایا گیا اور وہ پُرسکون پانی میں عارضی تلاطم پیدا کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ بحیرۂ مرمرہ ترکی کے ایشیائی اور یورپی حصّوں کے درمیان پانی کا ایک بہت بڑا قدرتی قطع ہے اور بہت زیادہ محصور ہونے کے باوجود آزاد بھی ہے یعنی ایک طرف آبنائے باسفورس کے ذریعے اس کے ڈانڈے بحیرۂ اسود سے ملتے ہیں تو دوسری طرف درۂ دانیال کے ذریعے بحیرۂ ایجین سے اس کا ناتا جُڑتا ہے۔

یونان کے عہدِ قدیم میں کہ جب یونانی اس علاقے پر بھی قابض تھے، اس بحیرے کو پروپون تس کہا جاتا تھا۔ ترکوں نے اس کا نام بدل دیا اور اسے مرمرہ دینی زی کہنے لگے۔ اس کے دو سبب بیان کیے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ سمندر کی تہ بہت زیادہ پتھریلی ہونے کے باعث اس کا پانی ہمیشہ

صاف و شفاف رہتا اور سنگِ مرمر کی طرح سفید نظر آتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سمندر کے مغربی حصے میں ایک بہت بڑا جزیرہ ہے جو اب اسی نام سے مشہور ہے یعنی ترک اسے جزیرہ مرمرہ کہتے ہیں، کیونکہ اس پر قدرت کی دوسری نعمتوں کے علاوہ سنگِ مرمر کی ایسی وسیع کانیں ہیں جو ایک ہزار سال سے برابر کھدائی ہونے کے باوجود ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ استنبول اور انقرہ وغیرہ کی بیشتر تاریخی عمارتیں اسی لیے سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئی ہیں۔ غالباً یونانیوں کو ان کانوں کا علم نہیں تھا، اسی لیے ان کی تعمیرات میں سنگِ مرمر کے بجائے سنگ سرخ زیادہ استعمال ہوا ہے، جو دوسرے پہاڑوں سے کاٹ کر لایا جاتا تھا۔ یونانی اس جزیرے کو پروکونی سس کہتے تھے۔

اس سمندر میں جزیرہ مرمرہ کے علاوہ اور بھی جزیرے ہیں، جو نسبتاً ذرا چھوٹے ہیں۔ جنوب مشرقی ساحل کے قریب جزائر شہزادگان ہیں، جو آج کی سیاحت میں ہماری پہلی منزل ہیں۔

بحیرہ مرمرہ کوئی بہت بڑا سمندر نہیں ہے۔ شرقاً غرباً اس کا طول تقریباً ایک سو ستر میل اور شمالاً جنوباً اس کا عرض زیادہ سے زیادہ پچاس میل ہے۔ کُل رقبہ ساڑھے چار ہزار میل محسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی گہرائی زیادہ سے زیادہ چار ہزار دو سو فیٹ ہے۔ سب سے زیادہ عمیق حصے شمالی ساحل یعنی ترکی کے یورپی علاقے سے نزدیک تر ہیں۔

اس سمندر میں بہت سی عمدہ قسم کی مچھلیاں، جھینگے، کیکڑے وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے چاروں طرف ساحلوں کے ساتھ ساتھ ماہی گیروں کی بستیاں ہیں اور مچھلیوں کو محفوظ کرنے اور ڈبوں میں بند کرنے کے کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں، کیوں کہ قومی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد بڑی مقدار میں مچھلیاں دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ یہاں کی مچھلیوں میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ پانی نسبتاً میٹھا ہونے کے باعث وہ اچھے ذائقے کی ہوتی ہیں۔ یونان تک میں، جو ساحل سمندر پر واقع ہے، بحیرہ مرمرہ کی مچھلیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

محصور ہونے کے باعث سمندر کے پانی میں زیادہ تلاطم اور جوش نہیں ہوتا۔ جوار بھاٹے کی کیفیات تو شاذ و نادر ہی محسوس ہوتی ہیں۔ اس لیے یہاں کے ساحل شوقین مزاج لوگوں کی تفریح کے لیے بہت ہی اچھے سمجھے جاتے ہیں۔

جزائر شہزادگان کے ساحل بہترین ہیں۔ اس مجمع الجزائر میں چار بڑے جزیرے کنالی آدا، برگاز آداسی، حبیلی آدا اور بیوک آدا ہیں۔ ان سب کے ماحول جداگانہ ہیں۔ اول دو جزیروں پر زیادہ تر ماہی گیروں کی بستیاں ہیں۔ تیسرا صحت و تن درستی کے اعتبار سے بہت ہی زیادہ قابلِ ذکر

ہے۔ اور آخری یعنی بیوک آدا کو صرف عیش پرستوں کا مستقر کہنا چاہیے۔

عہدِ متوسط میں کہ جب ان جزیروں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوا تھا، ان کو ایسے مجرمین کی بستی بنا دیا گیا تھا جن کو حکومت شہری آبادی سے دور رکھنا چاہتی تھی، کیونکہ سلجوق فرمانروا اور سلاطین عثمانیہ بھی بہت سی شادیاں کرتے اور حرم میں سینکڑوں کنیزیں داخل کر لیتے تھے اس لیے ان سب کی اولاد سے ہمیشہ خطرہ لاحق ہوتا تھا کہ وہ سازش کرکے حکومت کا تختہ نہ اُلٹ دیں۔ اس لیے ان پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی، جہاں کسی پر ذرا بھی شبہ ہوا، شاہی منصف کے سپرد اس کا معاملہ کیا اور حسبِ مرضی فیصلہ حاصل کر لیا۔ شاہی عدالت سے ایسے ملزمین کو بغاوت کے جرم میں عموماً عمر قید کی سزا ہوتی تھی۔ فیصلہ صادر ہوتے ہی ایسے شہزادوں کو فوراً ان جزیروں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ انھیں ہدایت ہوتی تھی کہ باقی زندگی گزارنے کے لیے خود ہی کوئی مناسب شغل یا پیشہ اختیار کر لو۔ چنانچہ اس زمانے کے قید خانوں کی بہت سی کوٹھڑیاں اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں بھیجے جانے والے مجرمین میں زیادہ تر شہزادے شامل ہوتے تھے، اس لیے عرفِ عام میں یہ جزائر شہزادگان کہلانے لگے۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں ان کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ کوئی سرکاری نام نہیں ہے۔

ان جزیروں پر رہنے والے مجرمین چونکہ عمدہ آب و ہوا کے باعث زیادہ تن درست اور قوی ہوتے تھے، اس لیے ان کی اہمیت کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ خواہ مخواہ الزام پانے والے شہزادوں کو من مانی سزا دلوانا آسان کام نہیں رہا اور ان کو عمر بھر کے لیے وہاں قید رکھنا ممکن نہیں رہا، اس لیے زمانے کا رنگ بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ رواج متروک ہو گیا۔ قید خانے بند ہو کر رہ گئے اور عوام کو وہاں جانے اور سیر و تفریح کرنے کی اجازت مل گئی۔ پھر رفتہ رفتہ بستیاں بھی قائم ہو گئیں۔

جمہوریۂ ترکیہ قائم ہونے کے بعد حکومت نے تیزی سے جہاں اور سمتوں میں قدم اٹھائے، انسانی تن درستی کے مسائل پر بھی خاص توجہ کی اور فیصلہ کیا کہ ایسے تمام مقامات پر جن کی فضا روح افزا اور حیات آفریں ہے، جلد صحت گاہیں کھولی جائیں۔ منجملہ اور مقامات کے حیبلی آدا کو بھی پسند کیا گیا اور ۱۹۲۴ء میں وہاں ایک سینے ٹوریم کی بنیاد رکھ دی گئی۔

حیبلی آدا میں :- ساحل استنبول سے جزیرہ حیبلی تک کا راستہ کم و بیش ایک گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ لیکن شروع کے دو جزیروں پر اترنے والوں نے کشتی کے مالکوں سے کسی بات پر

جھگڑا کر کے غیر معمولی تاخیر کرا دی، اس لیے ہماری فیری ڈیڑھ گھنٹے بعد جبیلی کے گھاٹ پر پہنچی۔ ساحل آنے سے پہلے ہی سینے ٹوریم کی عمارتیں ہمیں نظر آنے لگی تھیں۔ اس لیے ہمیں اطمینان تھا کہ زیادہ دور پیدل نہیں چلنا پڑے گا۔

ہم تینوں مسافروں کے علاوہ سات اور مسافر وہاں اترے۔ ان میں سے تین کا تعلق اسی صحت گاہ سے تھا، جسے دیکھنے ہم جا رہے تھے۔ برکات صاحب نے فوراً ترکی زبان میں ان سے بات چیت شروع کر دی۔ وہ انگریزی سے ناواقف تھے، اس لیے ہم دونوں بھائی چپ سوانگ کے کردار بنے ان کے سامنے کھڑے رہے۔

شفا خانے کی عمارتیں پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہیں۔ ان کی بلندی کا صحیح اندازہ فیری میں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ہم سڑک سڑک جاتے تو شاید بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا، لیکن اپنے نئے واقف کاروں کے ہمراہ ایسی پگڈنڈیوں کے ذریعے جو پہاڑی علاقوں میں عام لیکن انجانوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتی ہیں، کوئی بیس منٹ میں اصل منزل تک پہنچ گئے۔ ہمارے ان ہمراہیوں میں سے ایک صاحب ڈاکٹر اور صحت گاہ کے عملے کے رکن تھے۔ انھوں نے خود ہی دفتر میں جا کر معالج اعلیٰ کو ہماری آمد کی اطلاع دی۔ وہ گویا منتظر ہی بیٹھے تھے، فوراً باہر نکل آئے اور بڑے خلوص کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اور اندر لے گئے۔

وہ انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف تھے، یہ معلوم کر کے ہمیں بڑی خوشی ہوئی، ورنہ ہمیشہ اندیشہ تھا کہ ہر بات مترجم کے وسیلے سے کہنی اور سننی پڑے گی۔ میں نے فاتحانہ انداز میں برکات صاحب کی طرف دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب حضور کے محتاج نہیں رہے۔ براہِ راست باتیں کریں گے۔

دفتر میں چند لمحے بیٹھنے کے بعد ہم صحت گاہ کے مختلف حصے دیکھنے کے لیے چل پڑے۔

اس شفا خانے کا نام جبیلی آدا سینے ٹوریومو ہے اور صحت و اجتماعی معاونت وکالتی کے ماتحت قائم ہے، جو وزارتِ صحت کا ایک شعبہ ہے۔ ڈاکٹر احمد ادبلگر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ۱۹۲۴ء میں جب یہ صحت گاہ قائم ہوئی تو مختصر عمارت میں صرف سولہ سو مریضوں کو رکھنے کی گنجائش تھی۔ عمارت صرف ایک منزل کی تھی۔ جب زیادہ مریض آنے لگے تو دوسری منزل تعمیر کر لی۔ اس کے بعد ان بنیادوں پر زیادہ بوجھ ڈالنا ممکن نہیں تھا، اس لیے برابر میں تین منزل کی نئی عمارت زیادہ طویل و عریض بنوانی پڑی۔ اب اس میں بیک وقت ساڑھے چھے سو مریض علاج کرانے

کے لیے رہ سکتے ہیں۔

پھیپھڑے کی تمام بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو وہاں داخل کیا جاتا ہے۔ دق کے صرف وہ مریض قبول کیے جاتے ہیں جن کی بیماری تشویش ناک حد تک نہ بڑھی ہو۔ انھوں نے بتایا کہ شروع سے اس وقت تک اڑتیس ہزار چھے سو کے قریب مریض وہاں داخل ہو چکے ہیں، ان میں سے ۵۸ فیصدی بالکل تن درست ہو کر واپس گئے۔ ۲۰۲ فی صدی مریضوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا اور مایوس ہو کر انھیں چھٹی لینی پڑی۔ ۷ء۳ فی صدی اپنے مہلک امراض سے جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مذکورہ بالا اڑتیس ہزار چھے سو مریضوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہو جن پر جدید نام نہاد جادو اثر ادویات استعمال نہیں کی گئیں۔ ڈاکٹر موصوف نے ہمیں بتایا کہ اس صحت گاہ میں مغربی ملکوں کے ایجاد کردہ انجکشن حتی الامکان کم سے کم استعمال کیے جاتے ہیں، جن کا مضرِ صحت ردِ عمل پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہو۔ وہ ذاتی طور پر ان تمام ادویات کے استعمال کے خلاف ہیں جن سے وہ مرض تو دور ہو جاتا ہو جس کے استیصال کے لیے وہ تجویز کی گئی ہوں لیکن انسان کے دوسرے اعضا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اعصاب پر ان کا بُرا اثر پڑتا ہے، اور زندگی سے قریبی تعلق رکھنے والے رگ و ریشے اتنے کمزور ہو جاتے ہیں کہ پھر انھیں سنبھالنا اور تقویت دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان ایک مرض سے بچتا اور کئی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر ان دواؤں اور انجکشنوں کا ردِ عمل یہی ہو تو ان سے دور رہنا ہی عقل مندی ہے۔

ڈاکٹر احمد ار بلگر صاحب نے بتایا کہ سینے کے بعض امراض کا علاج عموماً قدرتی ذرائع سے کرتے ہیں اور اس میں خاطر خواہ کامیابی رہتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس جگہ کا انتخاب ہی قابلِ تعریف ہے، پھر سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہواؤں کو اونچی پہاڑی نے اس طرح روک دیا ہے کہ ان کا دف تو مر جاتا ہے لیکن صحت بخش کیفیات ساری فضا میں پھیل کر اپنا اثر دکھانے لگتی ہیں۔ گویا پہاڑی کا وجود ایک قسم کا ٹرانسفورمر ہے جس سے بجلی کا وولٹ ایج کم یا زیادہ کر لیا جاتا ہے لیکن رَو برقرار رہتی ہے۔ اس پہاڑی کے باعث ٹھنڈی ہوا کے جھونکے زیادہ سرد نہیں رہتے۔ چناں چہ جزیرے کے دوسرے حصوں کی نسبت یہاں کی حرارت دو درجہ کم ہوتی ہے۔ پھر شاہ بلوط اور شمشاد کے درختوں کے جھنڈ، جن سے آس پاس کی پہاڑیاں پٹی پڑی ہیں روح پرور کیفیات بکھیرتے ہیں، جو شفاخانے میں داخل ہونے والوں کے لیے نعمت ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ بعض امراضِ صدر کے سلسلے میں عمل جراحی بھی ہوتا ہے اور اس طرح ہر سال تقریباً چارسو بڑے آپریشن ہوجاتے ہیں۔ شروع سے اب تک تقریباً چار ہزار تین سو آپریشن ہوچکے ہیں۔

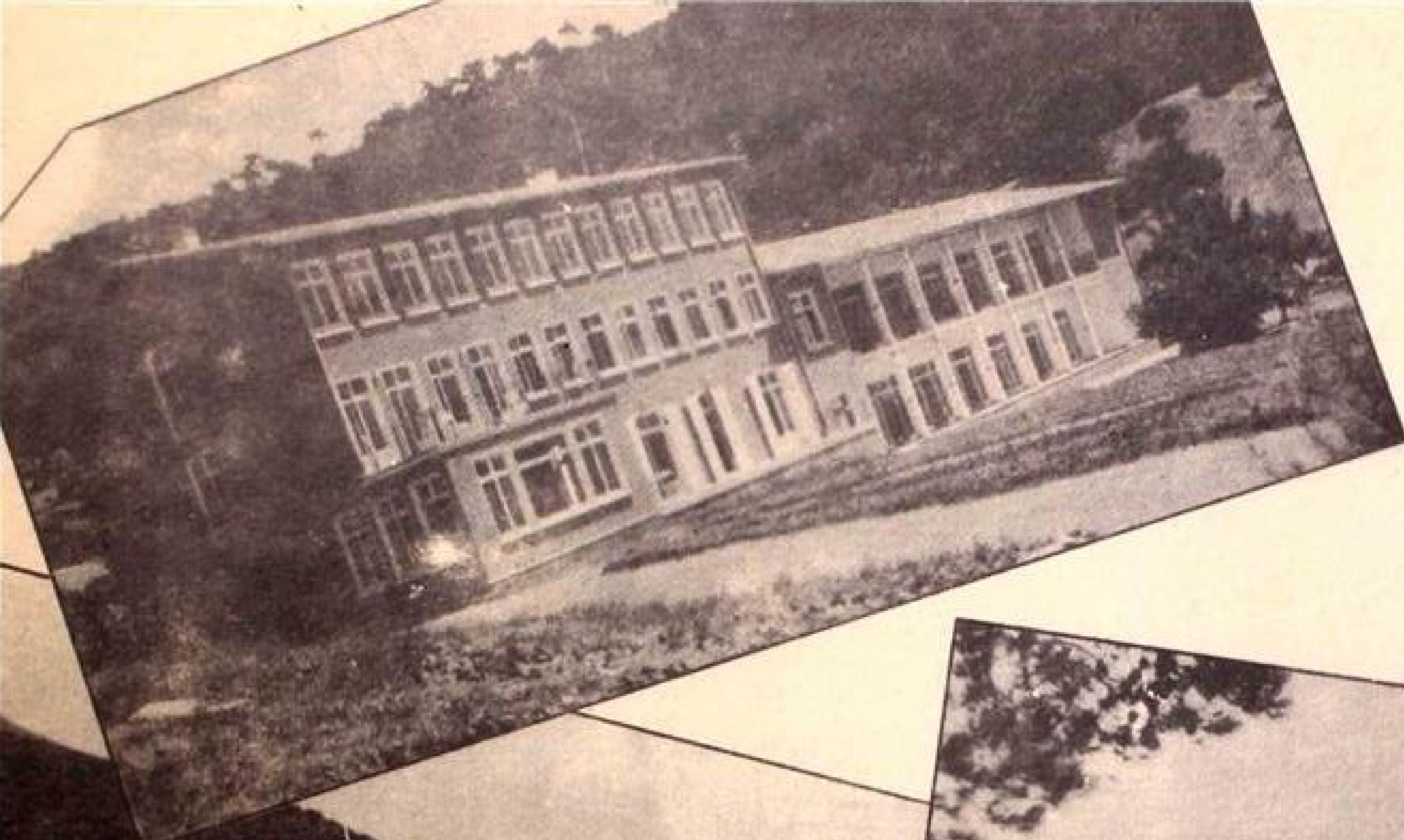
ہمیں بتایا گیا کہ کمزور مریضوں کو خون کی فاضل مقدار دینے کا طریقہ بھی رائج ہے اور اس مقصد کے لیے وہاں ہر نمونے (گروپ) کا خون کافی مقدار میں ہر وقت رہتا ہے۔ جب سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ایک سو پونڈ خون مختلف مریضوں کو دیا جاچکا ہے۔

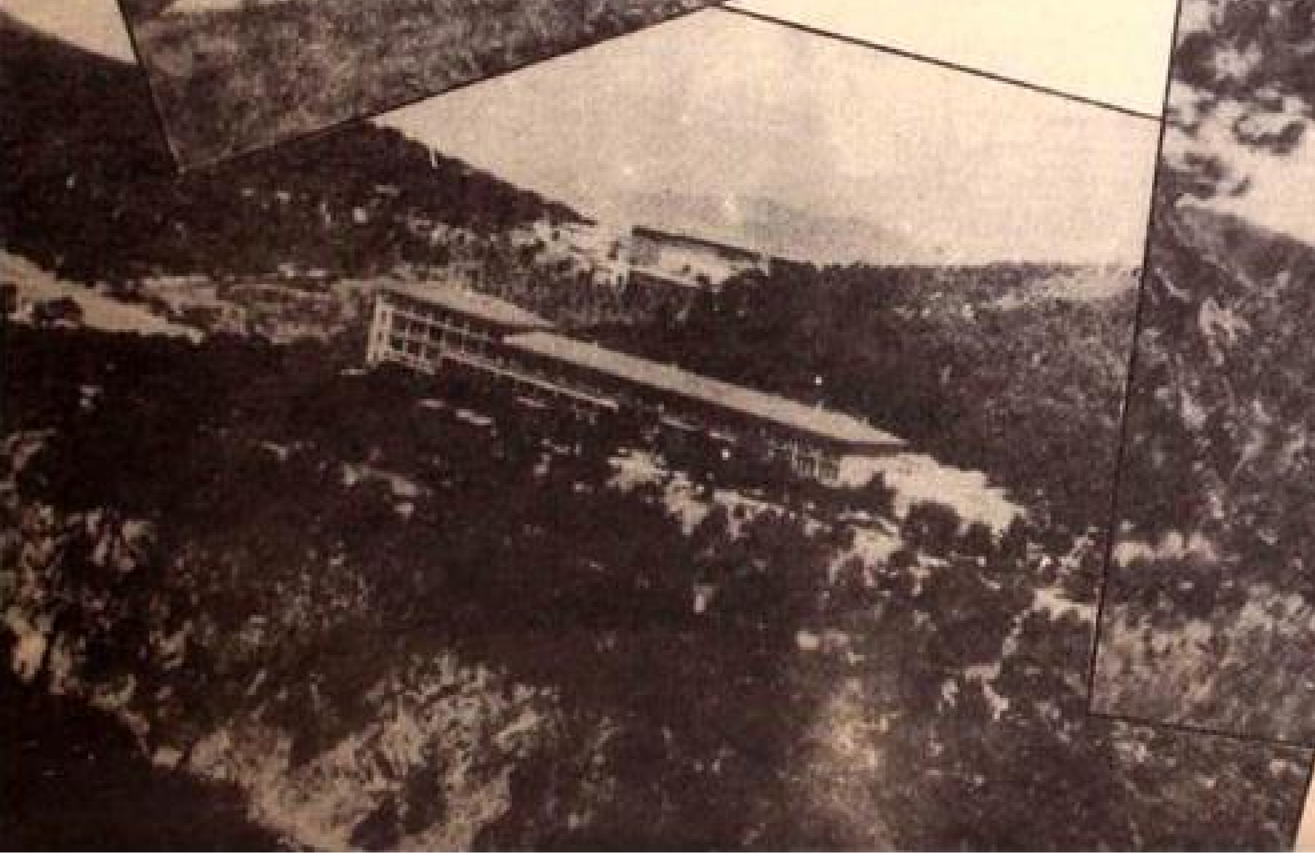
دو سال سے صحت گاہ کے قریب ہی نرسوں کی تربیت کا ایک مرکز بھی قائم کرلیا گیا ہے جہاں امراضِ صدر کی بطورِ خاص تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ ہر سال تقریباً پچاس لڑکیاں اس مقصد سے داخل ہوتی ہیں۔ ستانوے نرسیں فارغ التحصیل ہوکر ملک کے دوسرے شفاخانوں میں چلی گئی ہیں، کیونکہ خود صحت گاہ میں نرسوں کی تعداد موجودہ ضرورت کے لحاظ سے کافی ہے۔

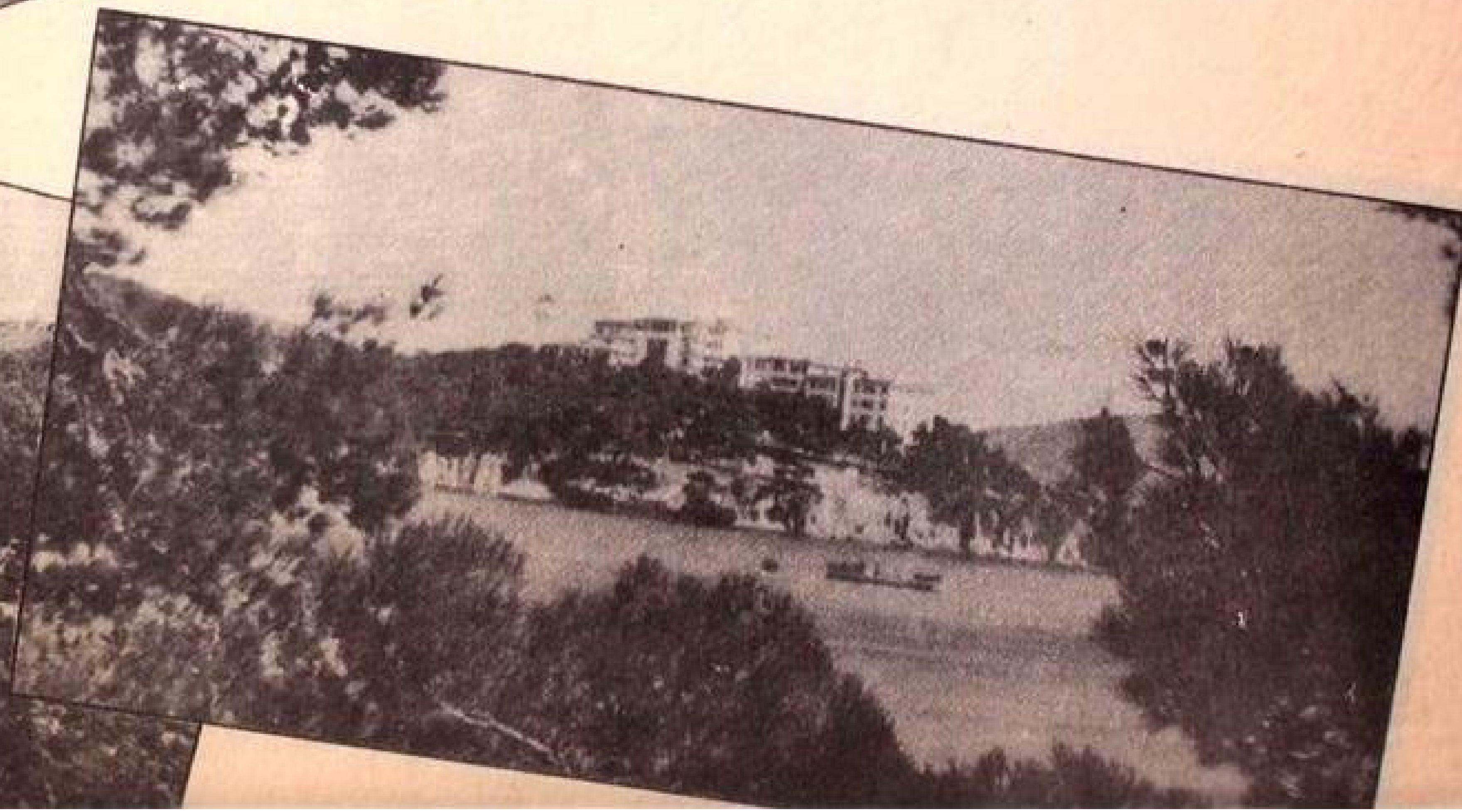
صحت گاہ میں خصوصی معالجین کی تعداد بائیس ہے۔ وہ سب کے سب نوجوان ہیں۔ کسی کی بھی عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ ہر سال داخل ہونے والے مریضوں کی تعداد دو اور تین ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔ شفاخانے کو مزید وسعت دینے کا خیال نہیں ہے کیونکہ اب ایسے مریضوں کی بہت سی صحت گاہیں ملک کے کئی اور شہروں میں کھل گئی ہیں اور اس طرح مریض دُور دراز سفر کرنے سے بچ گئے ہیں۔

ہم پروفیسر صاحب کے ساتھ تمام کمروں میں گئے اور مریضوں کی حالت کا بغور معائنہ کیا۔ ایک بات خاص طور پر ہم نے محسوس کی کہ وہاں کوئی مریض اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھ رہا تھا بلکہ اسے گھر کی سی بعض سہولتیں میسر تھیں۔ مثلاً ایک صاحب عمیق مطالعے میں مصروف تھے، تو دوسرے خود ہی داڑھی صاف کر رہے تھے۔ ایک "مریضِ عشق" اپنی محبوبہ کو یاد کرکے کوئی ترکی گیت الاپ رہے تھے۔ زنانہ وارڈ میں ہم نے کئی عورتوں کو بچوں کے اُونی سوئٹر، موزے اور ٹوپیاں بُنتے ہوئے دیکھا جو سرخی پوڈر لگائے اور عمدہ لباس پہنے اس طرح بیٹھی تھیں کہ جیسے خرید و فروخت کی غرض سے بازار جانے کے لیے تیار ہوں۔

چونکہ یہ صحت گاہ عام بستی سے بالکل الگ تھلگ ہے، بلکہ دوسرے شہروں سے بھی، جہاں سے مریض وہاں آکر داخل ہوتے ہیں، بہت دور ہے، اس لیے مریضوں سے ملنے جلنے والے عزیز واقارب اور دوست احباب کا جمگھٹ صبح و شام بالکل نہیں ہوتا۔ ایک ہمارے ملک کا نرالا دستور ہے کہ شام ہوئی اور خواہ مخواہ کی ہمدردی جتانے والے رشتے دار اور واقف کار،







جبلی آدا میں
صحت گاہ کے چند مناظر

جوق در جوق اس طرح آنے شروع ہو گئے جیسے کسی نمائش یا حقیقی میلے میں شرکت کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

مریضوں کے کمروں کے علاوہ ہم نے تجزیہ گاہوں کا معائنہ بھی کیا، جہاں مریضوں کے خون، بلغم اور پیشاب پاخانے وغیرہ کی جانچ پڑتال ہوتی اور احتیاط کے ساتھ رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔ مریضوں کے نہلانے دھونے اور شعاعی غسل لینے کے کمرے دیکھے۔ ایک شیش محل کا بھی جائزہ لیا جس کی دو طرف کی دیواروں میں قد آدم رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ سورج کی شعاعیں ان شیشوں میں سے چھن کر اور ذرا ملین ہو کر اندر آتی ہیں جو بعض ایسے مریضوں کے لیے مفید سمجھی جاتی ہیں، جن کا سورج کی براہِ راست شعاعوں میں رہنا مناسب نہیں ہوتا۔

یہاں مریضوں کو ایسی پرہیزی غذائیں نہیں دی جاتیں کہ وہ انھیں بھی دوا سمجھنے لگیں البتہ کیکڑوں کی یخنی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ طبِ یونانی میں سرطان کا عرق امراض صدر کے لیے ہمیشہ مفید سمجھا گیا ہے، لیکن مغربی طب نے علاج معالجے کے جہاں اور بڑے غرق کیے ہیں، اس ضمن میں بھی ہمیں قدرت کی ایک بڑی نعمت سے محروم کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کیکڑوں کی یخنی اگر تن درست انسان بھی استعمال کریں تو سینے کا کوئی مرض انھیں لاحق نہ ہو۔ معالجوں، نرسوں اور عملے کے دوسرے لوگوں کی قیام گاہیں بھی قریب ہی ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہیں۔ یہ سب ماحول اتنا جاذبِ توجہ تھا کہ مجھے مریضوں کی زندگی پر رشک آنے لگا۔ کاش ہمارے ملک کے مریض بھی ایسی سہولتوں سے بہرہ یاب ہونے لگیں۔

جب ہم ایک بڑے ہال میں پہنچے، جہاں صحت گاہ کے معالجین مل بیٹھ کر کسی خاص مسئلے پر تبادلِ خیالات کرتے ہیں تو دیواروں پر آویزاں چند تصاویر پر ہماری نظریں پڑیں۔ ان میں ایک صورت جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ قریب ہو کر نام پڑھا تو لکھا تھا —— ڈاکٹر ایچ العطاس۔ حافظے نے فوراً کام کیا اور اٹھارہ سال پہلے کی یاد ذہن میں تازہ ہو گئی۔ میں نے بھائی جان کی توجہ مبذول کرائی۔ ان پر بھی ایک دم وہ کیفیت نمودار ہو گئی جو عرصے سے بچھڑے ہوئے کسی دوست کو اچانک دیکھ لینے پر طاری ہو جاتی ہے۔

اٹھارہ سال پہلے یعنی برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے بھی نو سال قبل جولائی ۱۹۳۸ء میں بھائی جان محترم نے "ہمدرد صحت" "گاؤ دق و سل" نمبر نکالا تھا۔ اس کی ترتیب کے سلسلے میں دنیا بھر کے ان معالجوں کو جو ان امراض کے ماہر خصوصی تھے، یا ان امراض کی صحت گاہوں سے

تعلق رکھتے تھے، دعوت نامے بھیجے گئے تھے کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات اور اپنے ملک کے حالات لکھ کر بھیجیں۔ ڈاکٹر العطاس ان دنوں محکمۂ صحت و اجتماعی معاونت کے معتمد اور جیبلی آدا کی صحت گاہ کے معالج اعلیٰ تھے۔ انھی کا جواب ترکی سے اُردو میں ترجمہ ہو کر ہمدرد صحت میں ان کی نیم تنہ شبیہ اور صحت گاہوں کی تصاویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

میں نے ڈاکٹر احمد اربلگر سے اشارتاً ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے بتایا کہ واقعی اس صحت گاہ کو ترقی دینے میں ڈاکٹر العطاس کی خدمات قابلِ تحسین رہی ہیں۔ وہ شفاخانے کے حق میں اچھے منتظم ہی نہیں، اعلیٰ معالج بھی تھے۔ اور درحقیقت جس طریقِ کار کو انھوں نے رواج دیا تھا، اس پر اب بھی عمل ہو رہا ہے۔

مجھے یاد آیا، ان کا مضمون زیادہ طویل تو نہیں تھا اور نہ تاخیر سے وصول ہوا تھا لیکن دہلی میں ترکی زبان جاننے والوں کے فقدان کے باعث اس کا ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے متبحر عالم ڈاکٹر حمید اللہ سے اُردو میں کرانا پڑا تھا۔ اس کام میں ضرورت سے زیادہ وقت لگ گیا اور بھائی جان نے مجبوراً ان کی شبیہ اور شفاخانے کی تصاویر تو دق وسل نمبر میں شائع کردی تھیں لیکن مضمون اگلے شمارے میں شریکِ اوراق ہوسکا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے نہ صرف جیبلی آدا کے شفاخانے کا تفصیلی ذکر کیا تھا، بلکہ ملک بھر میں دق وسل کے علاج کے لیے جہاں جہاں صحت گاہیں قائم ہیں، ان کا سرسری حوالہ دیا تھا۔ خاص طور پر انقرہ، استنبول، برصہ اور طرابزون کے شفاخانوں کا ذکر معلومات افزا تھا۔ اس وقت ملک میں ایسے شفاخانوں کی بہت کمی اور مریضوں کی زیادتی تھی، اس لیے معالج نرسوں کو ساتھ لے کر مریضوں کے گھروں پر جاتے اور علاج معالجے میں مشورے دیتے تھے۔ ان کو ابتدائی اطلاعات محکمۂ حفظانِ صحت کے ذریعے مل جاتی تھیں۔ ملکی قوانین کے مطابق دق وسل ان امراض کی فہرست میں ہمیشہ شامل رہے ہیں جن میں مبتلا ہونے والوں کا اور ان کے عزیز و اقارب کا فرض ہوتا ہے کہ بیماری کا احساس ہوتے ہی سرکاری محکمے کو مطلع کریں تاکہ مناسب تدابیر اختیار کی جاسکیں۔

اب شفاخانے کی بڑی عمارت میں منزلِ زیریں کا ایک عقبی حصہ دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر احمد اربلگر نے اس طرف رخ کر کے ہمیں اپنے ہمراہ لے جاتے ہوئے بتایا کہ صحت گاہ سے اس حصے کا براہِ راست کوئی خاص تعلق نہیں ہے لیکن مریضوں کے مستقبل کا جہاں تک تعلق ہے، اس کی زبردست افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے بتایا کہ بعض لوگ اپنے غلط یا مذموم پیشوں کی وجہ سے سینے کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ صحت یاب ہوتے پر انھیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ اپنا

پرانا پیشہ اختیار نہ کریں۔ تب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کیا کریں۔ بعض ایسے بھی نوجوان ہوتے ہیں جن کا اس وقت تک کوئی شغل نہیں ہوتا۔ انھیں مناسب مشورہ دیا جاتا ہے کہ کون سا پیشہ ان کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

لہٰذا اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ صحت گاہ سے رخصت کرنے سے قبل ان کو نئے قسم کے مشاغل اختیار کرنے کی تربیت دے دی جائے۔ اس مقصد کے لیے نیچے کی منزل میں دست کاری کا شعبہ قائم ہے، جہاں تن درست ہو جانے والے مردوں اور عورتوں کو صرف ایسے کام سکھائے جاتے ہیں، جن کی شدت یا بار ان کے سینوں یا پھیپھڑوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ وہ نئے ماحول میں پہنچ کر نیا طرزِ زندگی اختیار کر سکیں اور ہمیشہ تن درست بھی رہیں یا کم سے کم ان بیماریوں سے بچے رہیں جن میں وہ اب تک مبتلا رہے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے ہر ایک کا الگ الگ معائنہ ہوتا ہے اور صحت کو قائم رکھنے والے تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈال لی جاتی ہے۔

ہم نے اس شعبے میں داخل ہو کر ایک بڑے شوکیس میں بہت سے گڈے اور گڑیاں مختلف قدو قامت اور وضع قطع کی دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ پلاسٹک، سلولائڈ، مٹی یا لکڑی سے گڈے گڑیوں کے چہرے اور ہاتھ پاؤں مردوں نے تیار کیے ہیں اور باقی کام عورتوں نے کیا ہے۔ مختلف طبقوں اور درجوں سے تعلق رکھنے والے ترک مردوں اور عورتوں کے روایتی لباس ان گڈے گڑیوں کو پہنا کر خاص انفرادیت پیدا کی گئی ہے۔ اس لیے یہ گڑیاں یورپ بھر کے عمدہ بازاروں میں اچھے داموں فروخت ہوتی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

ہم نے چند قد آدم گڑیاں بھی دیکھیں جو اس قدر مطابق اصل معلوم ہوتی تھیں کہ شاید ہم سے بات کرنے کے لیے ابھی بول پڑیں گی۔ بعض گڑیوں کو سیدھا سادا دیہاتی لباس پہنایا گیا تھا اور بعض عثمانی فرمانرواؤں کی اعلیٰ بیگمات کی طرح زرق برق لباس اور زیورات سے آراستہ تھیں۔ گڈوں میں سلجوقی اور عثمانی عہد کے فوجیوں سے لے کر کاشتکاروں تک ہر قسم کے لوگ دکھائے گئے تھے۔

اسی شعبے کے ایک حصے میں مصوری کی کلاس تھی جہاں تن درست ہو جانے والے مریضوں کو مصوری اور نقاشی کی تربیت مل رہی تھی۔ ترکی مناظر کے بعض نمونے واقعی حیرت انگیز تھے۔ رنگوں کا امتزاج دل پذیر تھا۔ ایک صاحب مسلسل تین سال تک صاحبِ فراش رہنے کے بعد بالکل تن درست ہوئے تو انھوں نے ہمیشہ خوش و خرم رہنے کا یہ طریقہ سوچا کہ کارٹون بنانے کا فن سیکھا جائے تاکہ اپنی تخلیقات پر خود ہنسیں اور دوسروں کو ہنسائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے خواجہ نصرالدین

ساری عمر دوسروں پر ہنستا اور آج تک سب کو ہنساتا رہا ہے۔ انھوں نے نصرالدین کی بعض کہانیوں کو بھی کارٹونوں کے رنگ میں مصوّر کرنا شروع کیا ہے۔ ان بزرگ نے کوئی پانچ منٹ میں میرا کارٹون بنا کر رکھ دیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں اس پر اپنے دستخط کر کے واپس کر دوں۔ ان سے مل کر مجھے اپنے وطن کے شہرۂ آفاق کارٹونسٹ مسٹر عزیز یاد آگئے جو پیچیدہ سے پیچیدہ خدوخال رکھنے والے انسان کا چوکٹا صرف دو منٹ میں کاغذ پر کھینچ دینے کی مہارت رکھتے ہیں۔ اگر وہ اس سفر میں میرے ساتھ ہوتے تو میں ان ترکی "کارٹون کش" صاحب سے درخواست کرتا کہ دنیا بھر کے لوگوں کا مضحکہ اُڑانے والے اس پاکستانی دوست کا مضحکہ آپ اُڑائیے اور اپنے دستخط کر کے وہ شاہکار میرے حوالے کر دیجیے تاکہ وہ خاکہ بطورِ سند میرے پاس رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

خیاطی والے حصّے میں ریڈی میڈ قسم کے ملبوسات تیار ہو رہے تھے۔ اس کام میں بھی مرد اور عورتیں یکساں تربیت پا رہی تھیں۔ یہاں کی اکثر چیزوں کی طرح یہ بھی برآمد ہونے کے لیے تھے۔

قاعدہ یہ ہے کہ دورانِ تربیت میں جو اچھی چیزیں تیار ہو جاتی ہیں، انھیں ادارہ خرید لیتا ہے اور بنانے والے یا بنانے والی کے نام میں قیمت درج کر دی جاتی ہے۔ کام اچھی طرح سیکھ ساکھ لینے کے بعد جب بالکل رخصت ہونے کا وقت آتا ہے تو کل رقم اس کے حوالے کر دی جاتی ہے تاکہ اس سے وہ اپنا مشغلہ جاری رکھ سکے۔

اس شعبے میں ہر مریض بالکل رضاکارانہ طور پر داخل ہوتا ہے یعنی یہ لازمی نہیں ہے کہ صحت گاہ سے فراغت پانے کے بعد یہاں ضرور کام سیکھا جائے۔ چناں چہ بہت سے مریض تن درست ہو کر اس طرف کا رُخ کیے بغیر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

میں نے اپنی بیٹی سعدیہ کے لیے ایک گڑیا خرید لی اور ترکی کرنسی میں تقریباً دو سو روپے ادا کر دیے۔ دراصل وہاں چیزیں فروخت کرنے کا دستور نہیں تھا اور نہ کسی چیز کی قیمت طے کی گئی تھی لیکن میں سوغات کے طور پر کچھ لینا اور ایک لحاظ سے ادارے کو کچھ چندہ دینا چاہتا تھا جو بصورتِ دیگر ممکن نہیں تھا۔

اسی اثنا میں کسی مقصد یا ارادے کے بغیر میری نظر کلائی پر بندھی ہوئی اپنی گھڑی پر پڑ گئی۔ ڈاکٹر اربلگر مسکرا کر کہنے لگے، گھبرائیے نہیں، بس اب ڈائننگ روم ہی میں چل رہے ہیں۔ میں اس مزاحیہ جملے پر ذرا جھینپ سا گیا۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ مجھے اس وقت بھوک کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ اپنے وطن میں رہتے ہوئے مطب، دواخانے اور دفتر وغیرہ میں میری مصروفیات کا یہ

عالم رہتا ہے کہ مجھے صبح کے ناشتے کے بعد دوپہر کا کھانا کبھی نصیب ہی نہیں ہوتا۔ بیگم کو ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ آپ نے دن کے اُجالے میں کبھی میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔ میں نے ایسی صورت میں صرف ایک ہی وقت کھانا کھانے کا اصول بنا لیا ہے۔ صرف جمعہ کے روز نظام اوقات میں ذرا سی لچک پیدا ہو جاتی ہے تو لکھنے کی میز پر ہی بیٹھے بیٹھے یا کتب خانے میں ورق گردانی کرتے ہوئے معمولی طور پر کچھ منہ جھٹال لیتا ہوں۔ ورنہ عام طور پر اس روز بھی کوئی خاص رغبت نہیں ہوتی، کیونکہ زیادہ وقت ہفتہ بھر کے اہم مسائل پر غور کرنے اور کوئی معقول حل نکالنے میں صرف ہوتا ہے اور یہ کیفیت خالی پیٹ رہ کر ہی زیادہ اچھی طرح ممکن ہوتی ہے۔

بڑی بے تکلفی کے ساتھ ڈاکٹر موصوف میرا ہاتھ پکڑ کر اس طرح اپنے ساتھ لے گئے جیسے واقعی میں بہت بھوکا تھا اور انھیں اس کا احساس ہو گیا تھا۔ انھوں نے صحت گاہ میں لنچ کی دعوت دے رکھی تھی اور ہم ان کی اس فرمائش کو کسی طرح ٹال نہیں سکے تھے۔

اس موقع پر چند اور ڈاکٹروں، ڈاکٹرنیوں اور نرسوں سے تعارف ہوا۔ اس لیے کھانے کی میز پر خاصی دل چسپ گفتگو ہوتی رہی۔ برکات صاحب جیسے ثقہ شخص نے بھی اس وقت ایک مذاق کچھ ایسی سنجیدگی کے ساتھ کیا کہ کسی بھی عورت کو یہ محسوس نہ ہو سکا کہ انھوں نے واقعی چھیڑنے اور رنگ رخ دیکھنے کے لیے کیا ہے، بلکہ سب نے اسے ان کی لاعلمی پر محمول کیا۔

ہوا یہ کہ کھانے کے آخری دور میں ایک ڈش مٹھاس کی آئی، جسے خرماتتلیسی کہتے ہیں۔ اسے کھاتے وقت برکات صاحب بڑا سو کھا سا منہ بنا کر کہنے لگے — ہم نے اس ملک کی ایک اور میٹھی چیز بھی کھائی ہے جو بہت پسند ہے اور شاید آپ لوگ اسے کادن گوبیغی کہتے ہیں۔ کھلانے والے نے ہی نام ہمیں بتایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عورتوں کی نگاہیں پہلے تو نیچے جھکیں اور پھر وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ سب خاموش رہے۔

کادن گوبیغی دراصل ایک مٹھائی ہے، لیکن جیسا کہ میں انقرہ کی سیاحت کے روزنامچے میں لکھ چکا ہوں، اس کا لفظی ترجمہ نافِ معشوق ہے اور عموماً عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کی غرض سے اسے بھری محفل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ برکات صاحب اس وقت ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بنے رہے اور ان کی اس "دانستہ لاعلمی" پر پردہ پڑا رہا۔

اس بہت دل چسپ اور نہایت معلومات افزا سیر و تفریح، مشاہدات اور ملاقات کے بعد ہم نے ڈاکٹر ادبلگر اور ان کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے رخصت چاہی۔ ان کا اصرار تھا

کہ ہم کم سے کم شام کی چائے کے وقت تک ضرور ٹھیریں۔ لیکن ہم نے اپنے نپے تُلے پُروگرام کی تفصیل سے مطلع کرکے اجازت چاہی اور اجازت حاصل کرلی اور کشتی تک ایک گھوڑا گاڑی میں بیٹھکر پہنچ گئے۔

واپس امواج بحر پر، گھاٹ پر بہت سی کشتیاں مسافروں کو لیے کھڑی تھیں۔ انھیں انتظار تھا کہ دو چار مسافر اور آ جائیں تو اچھا ہے۔ یہ کشتیاں بیوک آدا سے روانہ ہوکر یہاں ٹھیری تھیں اور ذرا دم لے کر انھیں آگے جانا تھا۔ ان سب کی منزلیں الگ الگ تھیں۔ ہم دریافت کرکے اس فیری میں بیٹھے جو ہمیں پرانے استنبول میں داخل ہونے کے لیے غلطہ پُل کے قریب ایک گھاٹ پر اتار سکتی تھی۔ یہ اس لیے کہ وہاں سے کاپالی چارشی پہنچنا زیادہ آسان تھا اور وقت بھی بچ سکتا تھا۔ اور پھر ہم اپنی موٹر کو وہاں پارک کر گئے تھے۔

فیری پر سوار ہوتے ہی برکات صاحب نے ایک حرکت یہ کی کہ چائے کا آرڈر دے دیا کیونکہ وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اس وقت چائے نہ پییں، تو کھانا ہضم نہیں ہو سکتا۔ ہم ترکی میں سیاحت کے لیے آئے تھے، ان کی غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے نہیں، کہ ہر بات ضرور ان کو سمجھائی جاتی اور اگر وہ سمجھنے کی کوشش نہ کرتے تو ان پر اسی طرح ظلم کیا جاتا جیسے ہمارے مدرسوں میں اُستاد بچوں کو خوب مار مار کر حساب کے قاعدے سکھاتے ہیں، اور وہ اکثر بھول جاتے ہیں۔

یہ غنیمت ہے کہ انھوں نے ہماری عادت کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے ہم سے چائے پینے کے لیے اصرار نہیں کیا۔

انھوں نے چائے کی پیالی تیار کرکے ایک چُسکی لی اور میرے ذہن نے کام کیا کہ اگر اس وقت ان کو چائے نوشی سے باز رکھا جائے تو بڑی بات ہو۔ لطف آجائے۔ فوراً ایک خیال آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی برکات! اگر آپ اس بھری پیالی کو ابھی موجوں پر پھینک دیں تو دو لیرے انعام دوں۔

میں حیران رہ گیا۔ میری بات پوری طرح ختم ہونے بھی نہ پائی تھی کہ انھوں نے پیالی اور پرچ کو ہوا میں اُچھال دیا اور پھر پانی کی موجیں نہ معلوم ان کو کہاں سے کہاں لے گئیں۔ کشتی کے اور لوگ ان کی اس عجیب و غریب حرکت کا سبب معلوم کرنے کے لیے حیران تھے۔

میں نے اپنی کامیابی پر قہقہہ لگایا۔ برکات صاحب نے دو لیرے مانگے۔ میں نے جواب دیا۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ ضرور دوں گا۔ لیکن شرط دو لیرے کی تھی اور اس وقت میری جیب میں ترکی لیرے نہیں ہیں۔ چند پاکستانی روپے میرے سامان کے ساتھ ہیں۔ اطمینان سے ہوٹل چل کر

ادا کر دوں گا۔

چائے والا برتن لینے آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چائے دانی وغیرہ موجود ہیں اور پرچ پیالی غائب۔ اسے چائے کی اجرت کے علاوہ پرچ پیالی کی قیمت بھی ادا کر دی گئی اور وہ کچھ کہے سُنے بغیر چلا گیا۔

افسوس اس بات کا تھا کہ بیگم برکات اور بچے" انقرہ میں تھے اور پروگرام کے مطابق اُن سے ملنے کا اب کوئی اِمکان نہیں تھا۔ ورنہ یہ لطیفہ ان کو سُناتا اور کہتا کہ چار بچّوں کے ابّا ابھی تک خود بھی بچے ہیں۔

واپسی کے وقت ہم نے محسوس کیا کہ سمندر میں صبح کی پُرسکون کیفیت کے برعکس اب لہروں میں کسی قدر تلاطم ہے۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے تھے۔ یا تو سورج کی شعاعوں کا رخ بدلنے کے باعث یہ فرق پیدا ہوا تھا، یا اس لیے کہ اب کشتیوں کی آمدورفت کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ دُخانی کشتیوں کے علاوہ ماہی گیروں کی بادبانی کشتیاں اور چھوٹے بڑے بہت سے ڈونگے دُور و نزدیک لہروں کی سینہ کوبی کر رہے تھے۔

دور بہت دور جانب جنوب وہ پہاڑ نظر آ رہا تھا جو عثمانی دَور کے سب سے پہلے صدر مقام کو اپنے دامن میں لیے کھڑا ہے۔ کوہ اُلو داغ کی برف پوش چوٹیاں استنبول تک کے ہر بلند مقام سے نظر آتی ہیں۔ اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم جبیلی آدا سے آگے بڑھ کر بیوک آدا کے ساحل کا دُور سے نظارہ کرتے ہوئے یالووا چلے جاتے، جو اناطولیہ کے شمالی ساحل پر ایک اچھی بندرگاہ ہے اور وہاں سے کسی تیز رفتار ٹیکسی کے ذریعے ۶۰ میل کا فاصلہ سوا یا ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر کے ہم بُرسہ پہنچ جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس شہر کو نہ دیکھنے کا ہمیں افسوس رہے گا۔

بُرسہ:۔ یہ ترکی کے بعض اُن شہروں میں سے ایک ہے جن کی ابتدائی تاریخ کسی حد تک ماضی کے دُھندلکے میں چھپی ہوئی ہے بعض مورخین کا خیال ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ بی تھی نیا کے بادشاہ پُرُوسی اس کے نام پر اس بستی کا نام رکھا گیا تھا۔ یہ چھ سو قبل مسیحؑ کی بات ہے۔ یونان کے ایک مشہور مورخ پلی نی اس کا کہنا ہے کہ اس کی داغ بیل ۱۸۶ قبل مسیحؑ میں رکھی گئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرطاجنہ کے جنرل ھنی بال نے پُروسی اَس دوم کو یہ بات سُجھائی کہ اس مقام پر ایک شہر آباد کیا جائے۔

بنیاد رکھے جانے کے بارے میں حقیقت کچھ بھی ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ بازنطینی دَورِ حکومت میں اس بستی نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس شہرت کا ایک بڑا سبب گرم پانی کے وہ چشمے ہیں جو صدیاں

گزر جانے کے باوجود اب تک سرد نہیں پڑے ہیں اور نہ جانے کب تک اپنی حرارت سے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہیں گے۔

معدنی اثرات والے ان چشموں کی جو قدر و قیمت آج ہو رہی ہے، اس کا تو کیا کہنا، عہدِ قدیم میں رومی شہنشاہ تک ان کی صحت بخشی کے قائل تھے اور اسی لیے میلوں کی مسافت طے کر کے اس جگہ پہنچتے اور قدرت کی بے پایاں نعمت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ عربوں نے بھی اپنے حملوں کے دوران میں ان کی افادیت کا اعتراف کیا لیکن اس وقت اس سرزمین پر اپنے قدم جما نہ سکنے کے باعث خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔

گیارھویں صدی عیسوی میں یہ سارا علاقہ سلجوقی ترکوں کے زیرِ کمان آ گیا، لیکن اس عہد کی مدت تھوڑی تھی، بہت جلد بازنطینی پھر غالب آ گئے۔ یہاں تک کہ چودھویں صدی میں عثمانی فرمانرواؤں نے اپنا دائرۂ عملداری وسیع کرنا شروع کیا تو ۱۳۲۶ء میں سلطان اورخان نے اس علاقے کو بھی فتح کر لیا اور ایسی ایسی یادگار عمارتیں تعمیر کیں جو اب تک اس خاندان کے افراد کی نام لیوا ہیں۔ اس وقت سے یہ آبادی اناطولیہ کے خوش حال شہروں میں شمار ہونے لگی ہے۔

اس کے بعد اگرچہ صدر مقام کی حیثیت سے اس کی اہمیت کم ہو گئی لیکن سلاطین کی توجہ کا مرکز پھر بھی رہا۔ وہ اپنے مشاغل حیات میں سے کچھ نہ کچھ لمحاتِ فرصت نکال کر برابر وہاں جاتے رہے۔ چناں چہ صحتی حیثیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔

سردی کا موسم شروع ہوتے ہی دنیا بھر کے سیّاحوں کا یہاں گشت شروع ہو جاتا ہے۔ شہر کے عقب میں سات ہزار دو سو فیٹ بلند کوہِ اُلو داغ کی چوٹیاں برف سے ڈھک جاتی ہیں۔ وادیاں سفید نظر آتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر اسکیٹنگ اور شی اِنگ جیسے کھیل کھیلنے والوں کے لیے گوشۂ جنت بن جاتی ہیں۔

اس یخ بستگی کے باوجود پہاڑ کے اعماقِ قلب میں جو آگ ہزاروں سال پہلے کسی دوزخی فرشتے نے چھپا کر رکھ دی تھی، آج بھی اپنی تپشِ نہاں سے چشموں کے پانی کو کھولاتی رہتی ہے۔ اس پر برف کی سرد مہری کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پہاڑ کے سینے سے بہہ نکلنے والے چشموں کی کل تعداد دو سو کے قریب ہے۔ پھر جس طرح ایک ہی شکمِ مادر سے پیدا ہونے والے دو بچوں میں سے ایک نیک فطرت ہوتا ہے اور دوسرا بد طینت، اسی طرح بعض چشمے بے حد سرد ہیں اور بعض بے حد گرم۔ اور بعض مقامات پر وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ پانی سمونے کے لیے زیادہ دور جانا نہیں پڑتا۔

انسان، جو قدرت کی بے بہا نعمتوں پر اکثر بے جا دستِ تصرف دراز کرتا رہا ہے، یہاں بھی اپنی غاصبانہ حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ اس نے بیشتر چشموں کے منہ پر بند لگا کر پانی کی روانی پر قابو پایا اور بے شمار حمام تعمیر کرکے اپنی روزی کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ بعض چشموں کے دھالے ہوٹلوں تک میں پہنچا دیے گئے ہیں، جہاں رہنے والے مسافر روزانہ ان کے گرم پانی سے غسل کرتے ہیں لیکن اپنی رائے تو یہ ہے کہ جس طرح نبیذ پینے کا مزا یہ ہے کہ سورج کی پہلی کرن نکلنے سے قبل اس کا پیالہ منہ کو لگا لیا جائے، اسی طرح معدنی چشموں سے صحیح فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے پانی پر بیرونی فضا کا زیادہ دیر اثر پڑنے سے پہلے جسم اس میں بھگو لیا جائے، تاکہ کیمیائی ذرات کسی آمیزش کے بغیر اپنا کرشمہ دکھا سکیں۔ معدنی چشموں کا گرم پانی بھی بیرونی فضا کے زیر اثر آکر اپنی ماہیت تھوڑی بہت بدل دیتا ہے۔

سلاطینِ عثمانیہ نے اس شہر میں جہاں بہت سی مسجدیں، خانقاہیں اور خدمتِ خلق کی مختلف عمارتیں تعمیر کیں، بے شمار حمام بھی بنوائے اور ساری قوم کے لیے وقف کر دیے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ عوام نے ان کو ہتھیا لیا اور خود مالک بن بیٹھے اور نسلاً بعد نسلٍ اپنا اقتدار قائم کیے ہوئے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایک چشمے پر سب سے پہلا حمام روم کی ایک ملکہ تھیوڈورا نے تعمیر کرایا تھا، جو بازنطینی عہد میں اپنی چار ہزار کنیزوں کو ساتھ لے کر ان چشموں کی وادی میں آئی تھی کیوں کہ خود گٹھیا کے مرض میں عرصۂ دراز سے مبتلا تھی۔ تن درست ہو جانے پر اس نے خوش ہو کر اس مقام پر ایک عمدہ حمام تعمیر کرا دیا، جس کے آثار امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں بالکل مٹ چکے ہیں بلکہ تھیوڈورا کے علاوہ اور بھی شاہی خاندانوں کے افراد حصولِ صحت کے لیے یہاں آتے رہے ہیں۔ فہرست میں بعض ادیبوں اور شاعروں کے نام بھی ملتے ہیں۔ مثلاً فرانس کا مشہور مصنف پیئر لوتی بغرضِ علاج ہی اس شہر میں آیا اور پھر صحت یاب ہو جانے کے بعد کچھ عرصے تک استنبول کے ایک علاقے میں مقیم رہا تھا۔

اس پہاڑ کے اعماقِ قلب سے گرم اور سرد پانی کے چشمے ہی نہیں نکلتے بلکہ اس کی بیرونی سطح پر جو بے حد زرخیز ہے، مزے دار پھلوں کے علاوہ صدہا قسم کے دوائی پودے بھی اُگتے ہیں، جن میں سے بعض کا تجزیہ کرکے ان کے جوہر معلوم کیے گئے ہیں، لیکن بہت سے اب بھی محققین کی عدیم الفرصتی کے بہانوں کا شکار ہیں۔

جس طرح برصغیر پاک و ہند میں میرٹھ کی قینچیاں دور دور مشہور ہیں، اسی طرح بُرسہ کے چاقو اور چھریاں اتنی ہی شہرت رکھتی ہیں۔ اس شہر کی یہ صنعت اتنے عروج کو پہنچ چکی ہے کہ کسی اور مقام کی یہ

مصنوعات ملک کے کسی بھی حصّے میں درجۂ قبول حاصل نہیں کرتیں۔ سوئزرلینڈ کی گھڑیوں کی طرح جس چاقو یا چھری پر بُرسہ کا ٹھپّہ لگ گیا، وہ معیاری بن گئی۔ گاہک آنکھ بند کرکے اسے ضرور لے لے گا، خواہ اس کی دھار اتنی خراب ہو کہ نکھٹّی کی ناک بھی اس سے نہ کٹ سکے۔

مچھلی مارکیٹ میں:۔ استنبول کے جنوبی ایشیائی ساحل پر غلطہ کو پر دسو (گلاٹا برج) کے قریب فیری ایک عمدہ گھاٹ پر ٹھیر گئی اور مسافر بھی تیزی سے اُترنے لگے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس مقام پر سمندر کے پانی کی بُو، نئے آدمی کا، جو پہلے سے عادی نہ ہو، دماغ خراب کر دیتی ہے، لیکن ہم تو جزائر شہزادگان والی ماہی گیروں کی بستیوں کے قریب سے گزر کر آئے تھے اور پھر سمندر کے سینے پر آدھ گھنٹے تک مُونگ دلتے رہے تھے، اس لیے پانی کی بو ناک میں بس گئی تھی، ہمیں کشتی سے اترتے وقت کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ البتّہ گھاٹ سے کچھ فاصلے پر جب مچھلی مارکیٹ میں پہنچے تو واقعی عطر میں بسا ہوا رومال بار بار ناک پر رکھ لینے کے باوجود وہاں کی سڑاند دماغ کے پردوں تک پہنچ گئی اور طبیعت جھک ہو گئی۔

سُورج ڈھلنے کے بعد سے مچھلی کا کاروبار سرد پڑ چکا تھا۔ اصل گہما گہمی صبح کے وقت نظر آتی ہے، پھر بھی بہت سے تھڑے والے موجود تھے اور کچھ ایسے گاہک آئے ہوئے تھے جو صبح کے شور و شغب سے گھبراتے ہیں اور کسی قدر سکون کے ساتھ خریداری کرتے ہیں۔

برکات صاحب نے بتایا کہ اگر ہم صبح کے وقت یہاں آتے تو مچھلی بیچنے والوں سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم مچھلی خریدے بغیر رہ جاتے۔ کوئی نہ کوئی ذاتِ شریف مچھلی کو زبردستی ہمارے سر چپیک کر اس کی قیمت وصول کر لیتا اور ہمارا غیر ملکی ہونا اس کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ وہ منھ مانگی قیمت لے لیتا اور ہمیں اصل بھاؤ کا پتہ بھی نہ چلتا۔ صبح کے وقت تو بعض ملکی باشندے بھی ان لوگوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ کسی کو قریب آتا دیکھا اور یہ کوئی بڑی سی ثابت مچھلی اٹھا کر اس پر اس طرح پل پڑے کہ اگر وہ بچاؤ کے مناسب طریقے اختیار نہ کرے تو بس اس کے منھ میں گھسیٹر دیں، ورنہ کم سے کم کینوس کے تھیلے میں جو باہر نکلنے والے ہر شخص کے ہاتھ میں عموماً نظر آتا ہے، ایک نہ ایک دانہ ضرور ڈال دیں۔

ایک دم ایک دکان دار نے میرا بازو پکڑا اور یہاں کی ایک مچھلی گیلن چک جس کا لفظی ترجمہ "ننھی دُلھن" کیا جا سکتا ہے، دکھاتے ہوئے کہا "ماشاء اللہ! کیسی فربہ چیز ہے۔ ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ صبح کے ناشتے کے وقت یہ سمندر کی تہہ میں تھی، اور اب آپ کے سامنے ہے۔"

قریب کے دوسرے دکان دار نے کلکان (بیئن جیسی) مچھلی دکھاتے ہوئے کہا، سمندری پھولوں میں بسا کر نکالی ہے۔ بڑی سلونی مچھلی ہے۔ لے لیجیے، تازہ مال ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے دم توڑا ہے۔ نمازِ ظہر کے وقت دوپہر کا کھانا سمندر میں کھا رہی تھی کہ حلق میں کانٹا لگ گیا اور پانی سے ابھر کر ہم تک پہنچ گئی۔"

ہم نے مجبوراً دونوں دکان داروں سے ایک ایک مچھلی خرید لی۔ برکات صاحب کو نہ جانے کتنی قیمت ادا کرنی پڑ گئی۔ دراصل ان موذیوں سے دامن بچانے کی یہ اچھی ترکیب تھی۔ جس طرح معاشرتی رفاہِ عامہ کے موقعوں پر ادا کیے ہوئے چندے کا ٹکٹ کوٹ کے کالر میں لگا کر باقی رضا کاروں پر ثابت کر دیا جاتا ہے کہ ہم اس منزل میں پہلے ہی نیک قدم اٹھا چکے ہیں، اب ذرا دور رہیے، اسی طرح مچھلی کا ہاتھ میں ہونا ظاہر کرتا تھا کہ اب ہماری طرف کوئی نہ بڑھے، اور واقعی کوئی اور دکان دار ہماری طرف نہیں بڑھا۔ یہاں مچھلی کو ہاتھ میں اٹھا کر لے جانے کی ترکیب یہ ہے کہ دکان دار ایک ڈوری کے سرے پر کانٹا باندھ دیتے اور اس کانٹے کو مچھلی کے حلق میں پھنسا دیتے ہیں۔ اب آپ اطمینان سے ڈوری پکڑ کر لے جائیے۔ اگر آپ کے پاس کوئی تھیلا یا ٹوکری ہے تو دوسری بات ہے۔

ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں صبح کے وقت کوئی ایک گھنٹے میں کئی سو من مچھلی فروخت ہو جاتی ہے۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ معدودے چند ماہی گیر خام مچھلی فروخت کرنے میں مصروف تھے، ورنہ بیشتر نے اپنا فاضل مال تل کر فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔ سادی اور بیسن لگا کر تلی جانے والی مچھلی کے علاوہ اس کے میٹھے کباب بھی فروخت ہو رہے تھے۔ یہ کباب ہم نے بھی ایک اور موقع پر کھائے ہیں۔ ان کی ترکیب یہ ہے کہ بغیر کانٹے والی مچھلی کو دودھ میں خوب پکا کر اور چینی ملا کر کھیر کی طرح جما لیا اور پھر ٹکیاں بنا کر تیل میں تل لیا۔ چیز واقعی لذیذ ہوتی ہے لیکن اس مقصد کے لیے مچھلی کی دو تین ہی قسمیں مخصوص ہیں، جن کے جسم پر بہت ہی باریک گول چھلکے ہوتے ہیں باقی اقسام کی مچھلیاں اس طرح استعمال کی جائیں تو خون کو اور اس کے بعد جلد کو نقصان پہنچتا ہے۔ کوڑھ جیسے سفید دھبے پڑ جاتے ہیں اور پھر وہ مرض تقریباً لا علاج ہو تا ہے۔ دکان دار اس ضمن میں بڑی دیانت داری سے کام لیتے ہیں اور کبھی مضر چیز استعمال نہیں کرتے۔

اگر ہم بُری طرح شکم سیر نہ ہوتے تو بیسن اور روغنِ زیتون میں تلی ہوئی مچھلی ضرور کھاتے۔ اس وقت بد پرہیزی کرنا بالکل گوارا نہیں تھا، کیوں کہ دوسرے شہر کا سفر ابھی سے سر پر سوار تھا۔

اور اس لیے طبیعت کو بحال رکھنا ضروری تھا۔

کچھ آگے بڑھے تو دوسرے دُکان داروں نے آگھیرا، جو اُبلے ہُوئے انڈے، پاپڑ، پھل اور پنیر کی ٹکیاں وغیرہ بیچ رہے تھے۔ میں نے ایک دُکان دار کو مچھلی تھما کر اس کے ہاتھ سے پنیر کی ایک ٹکیہ لے لی۔ وہ بہت ہنسا اور پھر خاموش ہو گیا۔ تبادلۂ اجناس کی بنیاد پر یہ سودا اس کے لیے مہنگا نہیں تھا۔ ہم نے بھی سوچا کہ چلو ایک بلا سر سے اتر گئی۔ ہم اسے کب اپنے ساتھ ہوٹل ہلٹن تک لے جانے والے تھے۔

دور کھڑی ایک عورت کپڑوں پر لگانے کے بیل، فیتے فروخت کر رہی تھی۔ اس نے ہمارے ڈرامے کا یہ سین دیکھا۔ لپک کر قریب آئی اور پنیر کی ٹکیا ہم سے لے کر چند گز لمبا ایک خوب صورت فیتہ ہمیں دے گئی۔ اس دفعہ ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ برکات صاحب بولے۔ اب مہربانی کر کے اس فیتے کو جیب میں رکھ لیجیے، ورنہ آخر میں نہ جانے کیا چیز بدلے میں آجائے۔

لندن اور پیرس، میڈرڈ اور برلن، ویانا اور برسلز، روم اور ایتھنز کی طرح استنبول اور انقرہ میں بھی عورتیں، مردوں کے دوش بدوش گلیوں اور بازاروں میں چلتی پھرتی، بسوں اور ریلوں میں ایک ساتھ سوار ہوتیں، دکانوں میں خرید و فروخت کرتی، کھیل کے میدانوں میں اچھلتی کودتی، مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم و تربیت پاتی اور زندگی کے ان تمام ہنگاموں میں تقریباً ایک جیسا لباس پہنتی ہیں۔ مگر ترک عورت میں جو وقار پایا جاتا ہے، وہ یورپ کے کسی اور مقام پر ممکن نہیں۔ یہاں چھچھور پن نام کو نظر نہیں آتا۔ ترک عورت کسی مرد سے آنکھیں چار نہیں کرتی مرد کے کھوے سے کھوا نہیں چھیلتی، مرد کا مقابلہ یا اس کی بے عزتی نہیں کرتی اور سب سے زیادہ یہ کہ بازاروں اور گلیوں کے کونوں پر کھڑے ہو کر مرد کو تلاش نہیں کرتی اور اس سے بغل گیر ہو کر کھلم کھلا دادِ عیش نہیں دیتی۔ میں نے کسی ترک عورت کو زرق برق اور بھڑکیلے لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ عموماً سفید رنگ پسند کرتی ہے۔ صرف خاص تہواروں یا تقریبوں پر اس یک رنگی سے انحراف کیا جاتا ہے۔ پھر بھی اگر کسی ریستوران میں کوئی عورت آپ کو گھورنے لگے تو آپ اپنی نظریں نیچی کر لیں، یا دیکھی اَن دیکھی کر جائیں، وہ دور سے آپ کی طبیعت کا اندازہ لگا کر کنارہ کش رہے گی۔ اور محض رقص میں عورتوں کو مردوں سے خلط ملط دیکھیں تو انھیں مستثنیات میں شمار کریں۔ ترک عورت جرمن عورت سے کم جفاکش نہیں ہے، بلکہ وہ جرمن عورت سے زیادہ مضبوط ہے۔ بھاگتے گھوڑوں کی رکابیں اگر کھینچ لے تو گھوڑا چوکڑی بھول جائے۔ وہ زمین کے سینے کو گودتی

اور ہری بھری فصل کو بھی جنم دیتی ہے، جیسا کہ اور ملکوں میں بھی دستور ہے۔ وہ پکی فصل کاٹ کر غذا فراہم کرتی ہے۔

مسالہ مارکیٹ میں :- مچھلی مارکیٹ سے پرے جانے کے بہت سے راستے ہیں لیکن برکات صاحب ہم کو ایک سکڑی سی گلی سے نکال کر کھلے چوک میں اور پھر بڑے گنبد والی ایک عمارت میں لے گئے۔ یہ بھی ایک مارکیٹ ہے ——— مسالہ مارکیٹ ——— اور کئی صدی پرانی ہے۔ یہاں داخل ہوتے ہی مجھے زور سے چھینک آئی اور کچھ دم گھٹنے لگا۔ فضا میں مرچوں کی دھانس پھیلی ہوئی تھی۔ پیٹھ پر ٹاٹ باندھ کر بوریاں اٹھانے والے مزدور تیزی سے سامان ڈھو رہے تھے۔ بیشمار خریداروں کی آہر جاہر کے باعث کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اسی بازار میں آکر مزدوروں سے سابقہ پڑا۔ بڑے بہادر اور جفاکش ہوتے ہیں یہ مزدور۔ پوری بھری ہوئی بوری کسی کی مدد کے بغیر اس طرح اٹھا کر اپنی کمر پہ لاد لیتے ہیں، جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو بغل میں دبا لے اور اس کے وزن کو ذرا محسوس نہ کرے۔

ایک دم دہلی کا بازار کھاری باؤلی، لاہور کی اکبری منڈی اور کراچی کی جونا مارکیٹ میری نگاہوں کے سامنے آگئی۔ بس فرق اتنا تھا کہ برصغیر پاک وہند کے ان تینوں بازاروں میں کھڑے ہو کر ہم ذرا کوشش کریں تو آسمان کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور یہاں یہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ مارکیٹ کے سب اندرونی راستے پٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے روز روشن کے باوجود دکان داروں نے بجلی کے بلب روشن کر رکھے تھے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دوپہر کے وقت صبح صادق یا شام کے جھٹپٹے کا سماں نظر آنے لگے۔

یہاں کھانے میں ڈالنے کے سب مسالے بڑی مقدار میں جمع کیے جاتے اور تھوک نرخ پر فروخت ہوتے ہیں۔ لیکن مقدار کی کوئی قید بھی نہیں ہے۔ آپ من کا بھاؤ کیجیے اور سیر بھر وزن لیجیے۔ تاہم زیادہ دکانیں آڑھتیوں کی ہیں اور ان کے ساتھ زیادہ تر دوسرے علاقوں کے چھوٹے دکان دار بھاؤ تاؤ کرتے اور مال اٹھوا کر لے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ لوگ اتنے منہمک ہوتے ہیں کہ خود کسی گاہک کی پروا نہیں کرتے۔ ان کی دکان کے سامنے سے دس آدمی گزر جائیں تو وہ کسی ایک سے بھی یہ نہیں پوچھتے کہ تم خریداری کے لیے آئے ہو یا محض تفریح کرنے۔ چناں چہ مچھلی مارکیٹ کے برعکس یہاں کوئی چیز خریدنے کے لیے ہمیں مجبور نہیں کیا گیا۔

یہاں ہم نے دیکھا کہ چھوٹی بڑی الائچیوں، سیاہ اور سرخ مرچوں، زیرہ اور لونگ، دارچینی

اور سونف، دھنیا ہلدی وغیرہ کی بوریاں زمین سے چھت تک لگی ہوئی ہیں اور ان سب پر یہ ظاہر کرنے والے لیبل لگے ہوئے ہیں کہ ان میں کیا ہے۔ ان میں سے بعض مسالوں کے لیے الگ الگ دکاندار مخصوص ہیں یعنی کسی کے پاس صرف لونگیں ہیں تو کسی کے پاس صرف الائچیاں۔ سارا بازار ان اشیاء سے بھرا پڑا ہے۔

دوسری طرف جائیے تو تیل کے پیپے، "کپّے"، کنستر اور چھوٹے بڑے ڈبے نظر آئیں گے۔ ان میں مختلف قسم کے تیل ہیں۔ ان میں کھانے کے علاوہ سر میں ڈالنے، جسم پر مالش کرنے اور ارنڈی جیسے دوائی تیل بھی شامل ہیں۔ زیتون کا تیل ان سب پر حاوی ہے۔ نہایت کثیر مقدار میں ہر وقت جمع رہتا ہے، کیونکہ گھی یا چربی کے بجائے اس تیل میں ہر قسم کا کھانا پکتا ہے اور امیر غریب سب اس کے عادی ہیں، کیونکہ زیتون پھل اس ملک میں اتنی مقدار میں پیدا ہوتا ہے کہ اس کا صحیح اندازہ لگانا محال ہے۔ "کچے" اور "پکے" پھلوں کے علاوہ ان کا تیل یہاں کی بڑی برآمدی اشیائے تجارت میں شامل ہے۔ صرف اسی ایک پیداوار سے حکومت کو لاکھوں کا غیر ملکی زرِ مبادلہ مل جاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی زیتون کا تیل مشرقِ وسطیٰ کے علاقے سے درآمد ہوتا اور اتنی قلیل مقدار میں نہایت گراں نرخ پر میسر آتا ہے کہ ایک ایک قطرے کی قدر کی جاتی ہے۔ شاید گاندھی جی اس تیل کے سب سے بڑے قدردان تھے۔ کھانے کے علاوہ اپنے جسم پر اس کی مالش کراتے تھے۔ اسی لیے نحیف الجثہ نظر آنے کے باوجود قوی دل، پختہ دماغ اور مضبوط اعضا رکھتے تھے۔ ان کی تن درستی اور چستی و چالاکی کا راز اس تیل کے قطروں میں بھی پوشیدہ تھا۔

مجھے بھی ترکی میں اس تیل کے تاجروں کی تلاش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان سے ابتدائی گفتگو طے کرنے کے بعد اپنی حکومت سے درآمدی لائسنس کے بارے میں بات چیت کروں، اور براہِ راست ترکی سے یہ تیل منگاؤں جو ہماری بہت سی ادویہ کا جز بنتا ہے اور بہت سے نسخے اس کی کمیابی کے باعث تیار نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر مجھے موقع ملے تو میں گھی، تیل اور مکھن وغیرہ چھوڑ کر روزمرہ زندگی میں روغنِ زیتون کھانے لگوں اور سب گھر والوں کو کھلا کر خوب موٹا کر دوں اور جو پہلے سے موٹے ہیں، ان کو مزید موٹا کر دوں، خواہ ان کے لیے دروازوں کی چوکھٹیں کیوں نہ بدلوانی پڑیں!

چناں چہ احمد کی وساطت سے زیتون کے چند آڑھتیوں سے تبادلِ خیالات کیا، مگر

افسوس ہے کہ مطلب کی بات طے نہ ہو سکی۔ میں نے ترکی کی طرح اسپین میں بھی، اپنے ایک سابقہ دورے کے وقت زیتون کا تیل حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسپین اور ترکی کے بڑے گاہک امریکن ہیں۔ یہ اپنا مال امریکا کو برآمد کرتے ہیں یا پھر فرانس اور اٹلی ان کے لگے بندھے گاہک ہیں۔ ان کو کسی نئے خریدار کی پروا نہیں ہے۔ لہٰذا اپنا سا منھ لے کر اس بازار سے آجانا پڑا۔ تاہم اب ارادہ یہ ہے کہ آئندہ ذرا اونچی سطح پر سلسلہ جنبانی کی جائے۔ اگر براہِ راست حکومتِ ترکی کو لکھنے سے کام بن سکتا ہو تو یہ وسیلہ کیوں چھوڑا جائے۔ کراچی پہنچنے پر دیکھا جائے گا۔

مسالوں اور تیلوں کے علاوہ کچھ عجیب و غریب چیزیں بھی اس مارکٹ میں فروخت ہوتی ہیں مثلاً شیشے کے مرتبانوں میں ایک قسم کا خشک پھل دیکھا، جسے ترک اپنی زبان میں کیچی بوئے نوزو یعنی بکری کا سینگ کہتے ہیں اور یہ اس لیے کہ وہ واقعی بل کھایا، مخروطی وضع کا، بالکل بکری کے سینگ سے مشابہ اور بہت سخت ہوتا ہے لیکن جب چینی کے شربت میں ڈال کر اسے خوب پکایا جائے تو گھل کر اس مشروب کا جزو بن جاتا ہے اور ذائقے میں بہت لذیذ اور تازگی بخش ہوتا ہے۔ عموماً بوڑھی عورتیں اسے زیادہ پسند کرتی ہیں۔ عام خیال ہے کہ اس سے خون صاف ہوتا ہے اور اعصاب قوی ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ہمدرد لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کر کے صحیح ماہیت و خاصیت معلوم کی جائے اور اگر دوائی اعتبار سے کسی طرح مفید ثابت ہو سکتا ہو تو روغنِ زیتون کے علاوہ اسے بھی درآمد کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاید اس سے کسی بیماری کے لیے کوئی مجرب دوا تیار ہو سکے۔

چند اور مرتبانوں میں کسی پودے کی جڑیں دیکھیں جن کی بابت معلوم ہوا کہ پیٹ کے بہت سے امراض کے لیے مفید ہوتی ہیں۔ ان کو بھی قابلِ غور کہا جا سکتا ہے۔

مہندی کا سفوف دیکھ کر مجھے تعجب ہوا اور جب یہ سُنا کہ یہاں بھی بعض قدامت پسند گھرانوں کی عورتیں اپنے ہاتھ پاؤں مہندی لگا کر سرخ کرتی ہیں تو کسی قدر افسوس ہوا کہ مغربی تقلید کرنے کے شوق میں اپنا ملک بھی اس اچھے رواج کو ترک کر رہا ہے۔

محمود پاشا:۔ مسالہ منڈی سے نکل کر ہم ایک ڈھلوان پہاڑی کے سرے پر پہنچے، جسے طے کر کے مسقّف بازار یعنی کاپالی چارشی میں داخل ہوا جاتا ہے۔ پہاڑی کے دامن کا علاقہ محمود پاشا کہلاتا ہے۔ یہاں چینی، تانبے اور لوہے کے برتن بھانڈے اور باورچی خانے کی ضروری اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ اس بازار کی دکانیں چھوٹی چھوٹی ہیں، اس لیے اوپر تک سامان سے بھری رہتی ہیں اور دکان دار کو نیچے کھڑے ہو کر آواز لگانی پڑتی ہے، وہ بھی گاہک کا اندازہ لگا کر اس پر پل پڑنا

چاہتا ہو کسی کے ہاتھ میں چینی کی پیالی ہو تو کسی کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس۔ کوئی تانبے کی دیگچی اٹھائے ہوئے ہو تو کوئی لوہے کا دست پناہ۔

یہاں کا ایک دل چسپ مشاہدہ قابلِ ذکر ہے۔ ایک عورت لیمپ شیڈ خریدنے کے لیے بے قرار تھی۔ کئی دکان داروں نے انکار کر دیا۔ لیکن ایک صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور دکان کے اندر سے تام چینی کا ناشتے دان اٹھا لایا، اور اس کی وہ تعریف کی کہ خاتون بلا ضرورت اسے خریدنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ لیمپ شیڈ اور ناشتے دان میں کوئی ایسا قریبی تعلق بھی تو نہیں ہے کہ چلو اس کے بجائے یہ استعمال کر لیا جائے۔ اس بازار میں عموماً ایسا ہوتا ہے۔ ہم نے احتیاط برتی۔ راستے کے تقریباً وسط میں چلے۔ کسی دکان پر ذرا بھی نہیں ٹھیرے، اور کسی دکاندار نے توجہ مبذول کرانی چاہی تو ہم نے فوراً اس طرح منھ پھیر لیا جیسے اس کے قرض دار ہیں یا اس سے شرما رہے ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ اس بازار میں سے کسی قسم کی گاڑی گزر ہی نہیں سکتی، ورنہ پیدل چلنے بلکہ پیدل چڑھنے والوں کا دم ناک میں آ جاتا۔

کاپالی چارشی:- اس ڈھلوان پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے ہمارا سانس پھول گیا تب ہم کاپالی چارشی یعنی مسقف بازار کے قریب پہنچے۔ ہم نے پنجوں کے بل ذرا اچک کر، کیوں کہ اندر بہت ہی بھیڑ بھاڑ تھی، نظر دوڑائی تو ایسا محسوس ہوا کہ ہم عہدِ قدیم کی کسی ایسی بھول بھلیوں میں داخل ہونے والے ہیں جس کا ذکر اساطیرالاولین میں آتا ہے، جس میں منچلے نوجوان، شہزادے اپنی محبوبہ کو یا اس کی فرمائش پر کسی نادر و نایاب شے کو تلاش کرتے ہوئے عموماً راستہ بھول جاتے اور پھر کسی دیو یا پری کی کوششوں سے نجات پاتے تھے۔

ہم میں سے کوئی بھی نہ تو عہدِ عتیق کا شہزادہ تھا اور نہ کسی محبوبہ کی زلف گرہ گیر میں گرفتار تھا جس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے کسی قسم کی مہم سر کی جاتی۔ پھر بھی اس بازار کو اچھی طرح دیکھنے کی آرزو تھی، جس کے اندر کوئی نیا شخص بھی گم تو نہیں ہوتا، البتہ کسی قدر ششدر و حیران ضرور رہ جاتا ہے۔

میرے نزدیک اسے بازار، منڈی، یا مارکٹ کہنا غیر مناسب ہے۔ اسے شہر استنبول کے اندر ایک اور شہر کہنا چاہیے۔ بڑے بازاروں کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے بازار، ان بازاروں میں دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گلیاں اور پھر ان گلیوں میں دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھپلے انسان کو چکر میں ڈال دینے کے لیے کافی ہیں۔ دکانوں کی کل تعداد پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ ان میں سے بعض اتنی مختصر ہیں کہ کھڑے کھڑے بالشت سے ناپ کر

ان کا طول و عرض بتا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمدہ ہوٹل کے کمروں سے لا کر بہت سے وارڈروب کھڑے کر دیے گئے ہیں اور بعض اتنی وسیع ہیں کہ ان کا خالی پلاٹ کہیں اور اٹھا کر رکھ دیا جائے تو اس پر آٹھ کمروں کا عمدہ مکان تعمیر ہو جائے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس "شہر اندر شہر" میں ہر وقت اندھیرا رہتا ہوگا۔ اگر کسی سے کہا نہ جائے اور وہ اتفاقاً نظر اٹھا کر چھت کی طرف نہ دیکھے تو اسے محسوس ہی نہ ہوگا کہ میں کسی بند جگہ پر ہوں یا کھلے مقام پر۔ کیونکہ مصنوعی روشنی ہی نہیں، دن کا اُجالا بھی وہاں اپنا رنگ جماتا ہے اور گرمی کے موسم میں بجلی کے پنکھوں کی ہوا کے علاوہ قدرتی ہوا کے جھونکے بھی کاکل و گیسو کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ البتہ چھت سے یہ فائدہ ضرور ہے کہ شدید موسم گرما میں چلچلاتی دھوپ سے، موسم خزاں میں اڑتی ہوئی خاک دھول سے، موسم برسات میں غیر متوقع بارش سے اور موسم سرما میں بے وقت کی ژالہ باری سے بچا جا سکتا ہے۔

مسالہ مارکٹ کی طرح یہاں کا دستور بھی یہی ہے کہ گلی بازار اور دکانیں الگ الگ چیزوں کے لیے مخصوص ہیں۔ لیکن ان اشیاء کو چھوڑ کر، ترکی میں، جن کی درآمد ممنوع ہے، دنیا کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہوگی جو یہاں کی پانچ ہزار دکانوں میں سے کسی پر نہ مل سکے۔ بہت سوچ سمجھ کر بھی شرط لگائی جائے تو شرط لگانے والے کو ہار جانا ہی پڑے گا۔

محض پیرایۂ بیان کے اعتبار سے نہیں، حقیقتاً ایک لاکھ روپے کے جڑاؤ زیورات اور دس دس ہزار روپے کے عمدہ قالین سے لے کر دو دو آنے کی جھاڑو اور چھ پیسے سیر کے بینگن یہاں خریدے جا سکتے ہیں۔ جوہریوں کے بازار میں جائیے تو ایک ہی دکان میں اتنی مالیت کا سامان ہوگا کہ اس سے کسی ماتحت ریاست کا خراج ادا کر دیا جائے یا کسی شہزادی کا جہیز تیار کر لیا جائے۔ بعض دکانیں محض نوادر سے بھری پڑی ہیں، جن کو خریدنے والے قدردان کبھی کبھی آ ٹپکتے ہیں، جن کے انتظار میں دکان دار اللہ پر بھروسہ کیے بیٹھے رہتے ہیں۔

اگرچہ بادشاہت کا دور کسی حد تک ختم ہو چکا ہے، تاہم بہت سے بادشاہوں، ان کی ملکاؤں، شہزادوں اور شہزادیوں کے استعمال کی خاص چیزیں اصل ٹھپّوں کے ساتھ اس جگہ مل جاتی ہیں۔ ایسے دکان دار ہر چیز کی اچھی پرکھ رکھتے ہیں، لیکن کبھی کبھی دھوکا بھی کھا جاتے ہیں۔ وہ جو کوڑیوں کا مال لاکھوں میں بیچ ڈالنے کے عادی ہیں، کبھی لاکھوں کا مال نادانستہ طور پر کوڑیوں میں بھی بیچ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کے دکان داروں سے کم قیمت پر خریدی ہوئی بعض چیزیں زیادہ قیمت پا کر

عجائب گھروں کی زینت بن گئی ہیں۔

چند سال ہوئے ایک فرانسیسی سیّاح گھومتا گھامتا اِدھر آنکلا۔ ایک دکان میں اسے ایک منقّش ہیرا نظر آیا جسے دکان دار غلطی سے معمولی بلور کا ٹکڑا سمجھ بیٹھا تھا۔ سودے بازی ہوئی اور تھوڑی سی کھینچ تان کے بعد تقریباً پچاس لیرے میں بک گیا۔ سیّاح کا اندازہ صحیح نکلا۔ اس ٹکڑے کو صاف کیا گیا تو ملکہ کیتھرین اعظم کی تصویر اس پر نقش تھی اور وہ ہیرا اس ہار میں منسلک رہتا تھا جسے وہ ہر وقت پہنے رہتی تھی، اسے بہت ہی عزیز تھا۔ انقلاب کے بعد جب محلات لٹے تو بہت سی قیمتی چیزیں غلط ہاتھوں میں پہنچ گئیں۔ پھر اور ہنگامے ہوئے اور کچھ لوگوں کو ترکِ وطن کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ سفید روس کا ایک مہاجر دکاندار کے ہاتھ وہ قیمتی ٹکڑا محض چند ٹکوں میں بیچ گیا کیونکہ وہ بھوکا ننگا تھا اور بھوکا ننگا یہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ فرانسیسی سیّاح نے اس نقش کو بہت احتیاط سے صاف کرایا اور وطن جاکر بھاری قیمت پر فروخت کر دیا۔ اب وہ لوور کے عجائب گھر کی زینت ہے۔

اسی طرح برطانیہ کے عجائب گھر میں ایک قیمتی تصویر پہنچی ہے۔ ایک انگریز نے ایک دکان میں تصویر دیکھی جو شاہی لباس میں کسی فرمانروا کی معلوم ہوتی تھی۔ دکاندار کو بھی اس کی اصلیت و نوعیت کا کوئی علم نہیں تھا، لیکن انگریز متاثر ہوا اور ساٹھ لیرے میں سودا کر لیا۔ لندن میں مصنوعات کے ایک ماہر نے اسے جانچا، پرکھا اور صاف کیا تو مصوّر کا نام واضح طور پر نظر آیا اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ استنبول کے فاتح محمدؒ کی تصویر ہے اور اٹلی کے شہرۂ آفاق مصوّر بلینی کے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔ برٹش میوزیم میں جو چند بے حد قیمتی اور اعلیٰ نوادر موجود ہیں، یہ تصویر ان میں سے ایک ہے۔

اس عظیم الشّان بازار کی تنگ گلیوں میں اشیائے مغتنم کی خریداری کے لیے بعض شہرۂ آفاق ہستیوں نے بھی قدم رکھا ہے۔ ان میں نپولین سوم کی شریکِ حیات ملکہ یوجین، دولتِ برطانیہ کے شاہ ایڈورڈ ہشتم، قیصر ولہیم دوم، ریاست ہائے متحدہ امریکا کے دو صدر یعنی ڈوائٹ آئزن ہاور (جب کہ وہ امریکی فوجوں کے جنرل تھے) اور ان سے پہلے یولی سس ایس گرانٹ (اپنے منصب سے سُبک دوش ہونے کے بعد) شامل ہیں۔ ترکوں کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کا یہ بازار اتنا مشہور اور شاندار ہے کہ اس نے دنیا کی نامور ہستیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔

اس قدیم بازار کی اہمیت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اب سے کچھ عرصے پہلے جب اس میں اچانک آگ لگ گئی اور اس حادثے کی خبر ٹیلی فون کے ذریعے استنبول سے انقرہ پہنچی تو ترکی کے صدر اور وزیر اعظم فوراً اپنے خاص ہوائی جہاز میں بیٹھ کر چل پڑے تاکہ موقع پر موجود رہ کر آگ پر

قابو پانے کی رفتار کو تیز تر بنائیں اور نقصان کا جائزہ لے کر اس کا صحیح اندازہ بھی لگائیں۔ اس حادثے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر پارلیمان کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا، جس نے نقصانات کی تلافی کرنے اور جلی ہوئی دکانوں کو دوبارہ بنوانے کا فیصلہ کیا اور اخراجات کے لیے مناسب رقم منظور کر دی۔

اس سرکاری کارروائی کے علاوہ دنیا بھر کے بڑے شہروں میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ایک طرف فنونِ لطیفہ کے قدر دان دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر رہ گئے کہ نہ جانے کیسے کیسے نوادر نذرِ آتش ہوئے ہوں گے اور دوسری طرف تجارتی منڈیوں کے دلال پریشان ہو گئے کہ نہ جانے ترکی سے تعلق رکھنے والی اشیائے درآمد و برآمد کے نرخوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

قریب سے دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ آگ کی لپٹوں نے بہت بڑے حصے میں پھیل کر اسے ایک گوشۂ دوزخ بنا دیا تھا۔ شعلے کئی کئی میل تک نظر آ رہے تھے۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ بالکل وسطی حصہ جہاں سب سے زیادہ قیمتی اشیا اور نوادر کی دکانیں ہیں اور جو عام طور پر "بیدستن" کہلاتا ہے، بالکل محفوظ تھا۔

اس بازار کی تاریخ اتنی قدیم ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی تاسیس کے ساتھ اس کا سرا ملتا ہے۔ یعنی اسے پورے پانچ سو سال پرانا کہا جا سکتا ہے۔ ۱۴۵۳ء میں جب محمد فاتح دوم نے استنبول کو فتح کر لیا تو اس کا سب سے پہلا تعمیری کام یہی تھا کہ اس نے اس بازار کی داغ بیل رکھی تاکہ عوام کو روزمرّہ ضرورت کی چیزیں خریدنے میں سہولت ہو اور اُجڑے ہوئے دکاندار نئے سرے سے بس بھی جائیں۔ اگرچہ اس زمانے میں یہ بازار اتنا وسیع نہیں تھا لیکن اس وقت کا پودا پروان چڑھ کر اتنا تناور درخت بن گیا ہے اور اس وقت سے آج تک بڑے پیمانے کی تجارت کا مرکز ہے۔

ہمیں بھی یہاں کی بہت سی چیزیں پسند آئیں لیکن صرف خریداری کی حسرت ساتھ لائے، کیونکہ پروگرام کے مطابق کئی اور ملکوں کا دورہ کرنا تھا اور نہ تو رختِ سفر کے طور پر کسی چیز کو ساتھ لیجا سکتے تھے اور نہ پیک کرا کے پاکستان یا ہندوستان بھیج سکتے تھے۔

ہم اس چھتے ہوئے طویل و عریض بازار سے جب باہر نکلے تو سورج کی آخری شعاعیں اُونچی پہاڑیوں کی پیشانیاں چوم رہی تھیں۔ دن بھر آوارہ گردی کرنے والے پرند اپنے بال بچّوں کے ساتھ بسیرا کرنے کے لیے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ بھی جلدی جلدی قدم بڑھاتے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گھروں سے نکل کر کسی ضروری کام سے جا رہے ہوں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص ذرا عجلت میں تھا یعنی دن کے

مصروف ہنگاموں میں وہ بات نہیں تھی جو اب محسوس کی جا سکتی تھی۔

کشتی کا مظاہرہ: میں اور بھائی جان اس بازار کی عظمت و شان سے اس درجہ متاثر تھے کہ باہر نکلے تو صحیح سمت کا تعین کیے بغیر چل پڑے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ہمارے قدم اصل منزل کی طرف اٹھ رہے ہیں یا نہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ایک بڑا مجمع دکھائی دیا اور ہم ذرا ٹھٹک کر رہ گئے۔

معاً خیال آیا کہ ہمارے ملک کی طرح مختلف کھیل دکھانے والے مداری یا چلتا دوائیں بیچنے والے کسی عطائی کا مجمع نہ ہو۔ اس جم غفیر کے لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ چیخ چلا بھی رہے تھے۔ اشتیاق پیدا ہوا کہ اس کی نوعیت معلوم کی جائے۔ ذرا آگے بڑھ کر جو دیکھا تو چھوٹے سے اکھاڑے میں پہلوانوں کی ایک جوڑ چھوٹی ہوئی تھی اور دونوں میں جم کر مقابلہ ہو رہا تھا۔

ترکی زبان میں بھی جسمانی ورزش کرنے اور کشتی لڑنے والے کو پہلوان ہی کہتے ہیں۔ ممکن ہو اسی زبان سے یہ لفظ ہماری زبان میں رائج ہوا ہو۔

ہر ملک و دہر میں کشتی لڑنے کا انداز بھی ہر ملک میں جداگانہ ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں پہلوان اپنے جسم پر اچھی طرح مٹی مل کر اور خوب کسے ہوئے لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اترتے اور ایک دوسرے سے گتھ کر زور آزمائی کرتے ہیں۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ داؤں پیچ سے کام لیکر اور موقع ملتے ہی اپنے مخالف کو اس طرح پٹکیں کہ اس کی پیٹھ زمین سے لگ جائے۔ اسی پر کامیابی کا انحصار ہے۔ یورپ اور امریکا کے بعض ملکوں میں کشتی کا سب سے عام طریقہ، جو فری اسٹائل کہلاتا ہے، مکے بازی اور مار پیٹ کا دوسرا نام ہے۔ یہ دھینگا مشتی جاری رہتی ہے، تاوقتیکہ ایک فریق مار کھاتے کھاتے اکھاڑے سے بھاگ نہ نکلے یا ایک شخص دوسرے کو اٹھا کر زمین پر اس طرح نہ پٹک دے کہ وہ مجبور ہو کر چیں بول دے۔ یہی اعتراف شکست ہے۔ ترکی میں "روغنی کشتی" لڑنے کا دستور ہے یعنی دونوں پہلوان اپنے جسموں پر روغنِ زیتون کی خوب مالش کراتے بلکہ جسم پر تیل بہاتے ہیں، تاکہ دوسرے کا ہاتھ رکھتے ہی پھسل جائے۔ اس لیے آپس میں گتھنے کے بجائے ایک دوسرے کو دھکیلنے اور بری طرح رگیدنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کشمکش میں اگر کسی کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ زمین پر آ رہا تو دوسرا اس کی چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے۔ بس یہی اس کی جیت ہے۔

ترکی کے پہلوان تنگ لنگوٹ کسنے کے بجائے چمڑے کا جانگیہ پہنتے ہیں۔ وہ بھی بہت چکنا اور ہاتھ کو رپٹا دینے والا ہوتا ہے۔ کشتی کا یہ نظارہ ہمارے لیے بہت پرلطف تھا۔ اگر وقت ہوتا تو ہم دو چار جوڑوں کے کمالات دیکھتے۔

کشتی لڑنا ترکی میں بہت ہی مقبول ہے اور قومی کھیلوں میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یوں تو ہر شہر میں چھوٹے بڑے اکھاڑے ہیں اور ہر ہفتے میں ایک بار ضرور جسمانی مقابلے ہوتے ہیں لیکن اس لحاظ سے ادرنہ (ایڈریانوپل)، جو چودھویں صدی عیسوی میں سلاطین عثمانیہ کا پائے تخت تھا، اب بھی بڑی شہرت رکھتا ہے۔

روایت ہے کہ ۱۳۶۰ء میں عثمانی شہنشاہ مُراد اوّل اپنے محل کے شہ نشین سے تیر اندازی کے ایک مقابلے سے لطف اٹھا رہا تھا۔ ملک کے مشہور تیر انداز فصیلِ محل کے نیچے جمع ہو کر اپنے کمالات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مراد اوّل ایک کہنہ مشق تیر انداز کی فنّی مہارت سے بہت ہی متاثر ہوا۔ چناں چہ اسے بُلا کر پوچھا کہ تم نے یہ ہنر کیسے سیکھا۔ تیر انداز نے جواب دیا "عالی جاہ! جب میں جوان تھا تو کشتی لڑنے کا شوقین تھا۔ جسمانی ورزش کی وجہ سے مجھ میں زبردست چستی و چالاکی اور پھرتی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ خصوصیات فنِ تیر اندازی کے اکتساب کے لیے ضروری ہیں"۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اس نے فرمان جاری کیا کہ ہماری مملکت کو تیر اندازی میں فروغ دینے کے لیے لازمی ہے کہ لوگ پہلوانی بھی شروع کریں اور ہر سال موسمِ بہار میں ہمارے محل کے سامنے، اس باغیچے میں، جو کرک پنار کہلاتا ہے، کشتی کا مقابلہ ہوا کرے۔ اس میں نہ صرف پائے تخت کے بلکہ دوسرے شہروں کے پہلوان بھی حصہ لیا کریں۔ ہر سال سب سے زیادہ کامیاب پہلوان کو رُستم ترکی کا خطاب ملا کرے گا، جس کی مدت ایک سال ہوا کرے گی۔

ترکی کا یہ پرانا صدر مقام بدل گیا، بلکہ سلطنتِ عثمانیہ کا عروج بھی زوال پذیر ہو گیا، بہت سے انقلابات رُونما ہوئے اور حالات بدلتے رہے، لیکن کرک پنار میں کُشتی کی رسم اب بھی جاری ہے، جو ہر سال سنٹ جارج ڈے کے موقع پر ۱۰ مئی کے قریب منائی جاتی ہے۔ تاہم اس تاریخ کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی۔ گمان ہوتا ہے کہ شاید ترکوں سے پہلے رُومیوں اور بازنطینیوں کے عہد میں بھی ایسے مظاہرے ہوتے ہوں گے اور انھوں نے موسم وغیرہ کے اعتبار سے ان تاریخوں کو پسند کیا ہوگا۔

ادرنہ ترکی کے اہم شہروں میں اب بھی شمار ہوتا ہے۔ وہاں چودھویں صدی کی بہت سی تاریخی عمارتیں، جن میں مساجد اور محلات یکساں شامل ہیں، ابھی تک برقرار ہیں اور سیاحوں کو دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کے باعث اس دعوت کو بھی قبول نہ کر سکے۔

پروفیسر انور سے ملاقات:۔ قریب کی ایک چھوٹی سی مسجد سے صدائے اللہ اکبر

بلند ہوئی اور ہم بارگاہِ عبودیت میں جھکنے کے لیے اس میں داخل ہو گئے۔ مسجدیں اس علاقے میں بہت ہیں، لیکن خاص طور پر مغرب اور عشا کی نمازوں کے وقت سبھی میں اتنے نمازی جمع ہو جاتے ہیں کہ بعض اوقات مشکل سے اندر جگہ ملتی ہے۔

نمازِ مغرب کے فوراً بعد پروفیسر ڈاکٹر سہیل انور سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ انکی قیام گاہ استنبول یونیورسٹی کے علاقے میں تھی اور وہ علاقہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا، جہاں ہم نے نماز ادا کی تھی۔

بازار کے بہت سے نظارے میرے لیے جاذبِ نگاہ تھے، لیکن بھائی جان محترم نے مجھے کہیں ٹھٹک کر ایک نظر دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔

پروفیسر سہیل انور سے ہماری ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہم بہ مشکل پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچے تھے وہاں کوئی دوسرے بزرگ تھے۔ میں نے چند رسمی باتیں کرنے کے بعد فوراً اجازت چاہی کہ مجھے ذرا لائبریری دیکھ لینے دیجیے۔ ان بزرگ نے مسکرا کر سر سے اشارا کر دیا۔ گویا میں شوق سے کتابیں دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن مجھے بہت جلد ان کی مسکراہٹ کا راز معلوم ہو گیا۔ تمام الماریوں میں انگریزی زبان کی گنتی کی چند کتابوں کے علاوہ باقی کتابیں ترکی اور یونانی زبان کی تھیں۔ اور انگریزی کی کتابیں بھی جدید مغربی طریقۂ علاج سے تعلق رکھتی تھیں یعنی ترکی طب پر ایسی کوئی کتاب نہیں تھی جسے میں شوق سے دیکھ سکتا۔

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی لیکن یہ سن کر خوشی ہوئی کہ پروفیسر سہیل انور صاحب ترکی طب کی تاریخ کے ماخذوں پر ایک جامع کتاب مرتب کر رہے ہیں، جو انگریزی زبان میں ہوگی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ کتاب چھپتے ہی اس کی ایک جلد مجھے پاکستان کے پتے پر بھیج دیں گے۔

پروفیسر سہیل انور استنبول یونیورسٹی میں ادارۂ تاریخ طب کے ڈائرکٹر ہیں اور بہت عرصے سے اس عہدے پر فائز ہیں۔ انھوں نے بارہا محسوس کیا تھا کہ ترکی طب کی تاریخ پر ایک کتاب انگریزی زبان میں شائع کی جائے تاکہ مغرب کے ان نقادوں کے سامنے اسے بطور حوالہ پیش کیا جا سکے، جو کہتے ہیں کہ ترکی جمہوری انقلاب سے قبل بہت ہی پس ماندہ ملکوں میں شمار ہوتا تھا اور اسی وجہ سے اس کے ثقافتی ورثوں میں طب و جراحت کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا ہم نے کوشش کی ہے کہ ایک طرف اس الزام کا مسکت جواب دوں اور دوسری طرف عرب و ایران کے عالموں اور محققوں کو بتا دوں کہ طبِ مشرقی کی ترقی میں ترکی

نے بھی زبردست حصّہ لیا ہے۔

ترکی طِب کی تاریخ پر ایک نظر

ترکی میں طب کے رواج کی تاریخ بہت پرانی سمجھی جاتی ہے اور کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہاں اس کا چرچا پانچ ہزار سال سے ہے۔ یہ دعویٰ اس لحاظ سے حقیقت ہوسکتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی بیماریاں بھی ظہور میں آئی ہیں اور بیماریوں سے بچنے اور نجات پانے کے لیے ہر مقام پر ہر زمانے میں وہ مناسب تدابیر پر عمل کرتا رہا ہے لیکن جہاں تک اصول و قواعد کا تعلق ہے، یہ علم ترکی میں اتنا ہی پرانا سمجھا جاسکتا ہے، جتنا کہ وہ اس کے پڑوسی ملک یونان میں تھا کیونکہ موجودہ ترکی کے بعض حصّے عہدِ قدیم میں یونان کی قلمرو میں شامل تھے، بلکہ بابائے طب حکیم بقراط کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اس نے ازمیر میں جس کا پرانا نام سمرنا تھا، باقاعدہ مطب قائم کرکے لوگوں کا علاج معالجہ کیا ہے۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ترکی میں طب کا آغاز یونانی طب کے ساتھ ساتھ ہوا لیکن جب یونان میں سیاسی انحطاط کے ساتھ اس کے علوم و فنون کو زوال نصیب ہوا اور طب جیسے ضروری پیشے کو بھی نقصان پہنچ گیا تو ترکی اس سیلاب کی زد میں آئے بغیر کیونکر رہ سکتا تھا۔ وہاں بھی علم تلیامیٹ ہوا اور توہم پرستی نے ایک بار پھر اپنا رنگ جمایا۔ عوام بھی ٹٹکلوں پر تکیہ کرنے لگے۔ اس کے سوا چارہ کار بھی کیا تھا۔

فروغ اسلام کے ساتھ ساتھ جب مسلمانانِ عرب و عراق و ایران نے علمِ طب کی پُرزور سرپرستی کی تو اس نے ترکی میں بھی سنبھالا لیا اور آہستہ آہستہ پنپنا شروع کردیا اور زیادہ ترقی اس وقت ہوئی جب وہاں کے عوام نے دین اسلام قبول کرلیا۔

ترکی میں سلجوقیوں کے اقتدار نے طب کو مزید ترقی دی اور یہاں بھی وہ سب کچھ ہونے لگا جو دمشق کے خلفائے عباسیہ کے زیر سایہ ہو رہا تھا۔ چونکہ اس وقت ان تمام علاقوں کی علمی و ادبی زبان عربی یا فارسی تھی، اس لیے ترکی میں اپنی مقامی زبان کے باوجود جتنی کتابیں علمِ طب پر تصنیف و تالیف یا ترجمہ ہوئیں، عربی یا فارسی ہی میں قلمبند کی گئیں اور ترکی زبان میں ان کے ترجمے بہت بعد میں ہوئے۔

ترکی میں یونانیوں اور بازنطینیوں نے فنِ طِب سکھانے اور بیماروں کا علاج معالجہ کرنے کے جو مرکز قائم کیے تھے اور جن طریقوں کو رواج دیا تھا، سلجوقیوں نے ان کو اپنایا اور جدید انداز میں ترقی دینا شروع کردیا کیونکہ بہت سے نئے اسلوب شاپور اور دمشق کے دبستانوں سے بھی سیکھے جانے لگے تھے۔

اس زمانے کے دستور، ضرورت اور وسائل کے اعتبار سے چونکہ مدرسے، اسپتالوں سے الگ نہیں رکھے جاتے تھے، اس لیے ترکی کے شہر قیصری میں سب سے پہلا طبّی مدرسہ اور شفاخانہ ۱۲۰۶ء میں قائم ہوا۔ غیاث الدین کیخسرو کے نام سے طبّی مدرسے کی اور اس کی بہن گوہر نصیب سلطان کے نام سے شفاخانے کی بنیادیں رکھی گئیں۔ اس وقت سے اب تک ساڑھے سات سو سال میں زمانے کی تخریب پسندیوں نے اگرچہ ان عمارتوں کے در و دیوار کا حلیہ بہت کچھ بدل دیا ہے تاہم پرانے آثار ہنوز ان کی عظمت کا پتہ دے رہے ہیں۔ یہاں کے عوام ان قومی یادگاروں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ترکی پہنچنے سے چند ماہ پیشتر ان کی سات سو پچاسویں سال گرہ بہت اہتمام و شان کے ساتھ منائی گئی تھی۔

قیصری میں یہ شفاخانہ اور مدرسہ قائم ہونے کے گیارہ سال بعد کیخسرو اوّل ہی نے سیواس میں ایک شفاخانہ اور ایک طبّی مدرسہ ۱۲۱۷ء میں قائم کیا۔ یہ دونوں ادارے اب بھی پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ پھر دوسرے فرمانرواؤں نے تقلید کی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ چناں چہ ۱۲۱۹ء سے ۱۲۳۳ء تک قونیہ میں کئی شفاخانے کھولے گئے۔

ڈیورک میں توران ملک کا شفاخانہ ۱۲۲۸ء میں، چنکیری میں عطابیگ فرخ کا شفاخانہ ۱۲۳۵ء میں، قسطامونی میں علی پروانہ بیگ کا شفاخانہ ۱۲۷۲ء میں اور توقاط میں اسی فرماں روا کا ایک اور شفاخانہ ۱۲۷۵ء میں قائم ہوا۔

خلفائے عباسیہ کے وزیروں کی طرح ترکی کے بعض سلاطین کے وزرا بھی علم دوست تھے، چنانچہ ایک وزیر صاحبِ عطا نے ۱۲۶۰ء میں ایک شفاخانہ عاک شہر میں قائم کر کے بڑا نام پیدا کیا۔

تیرھویں صدی میں چند اور شفاخانے عاک سرائے، ارض روم، ارزنجان، سیواس اور عماسیہ میں کھولے گئے۔ سیواس کا شفاخانہ، جو راحت اوغولاری نے ۱۲۸۸ء میں قائم کیا تھا، اسی کے نام پر دارالراحت کہلاتا تھا۔ عماسیہ کا شفاخانہ عنبر بن عبداللہ نے ۱۳۰۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔

چودھویں صدی کا ایک اور شفاخانہ قابلِ ذکر ہے، جس کی بنیاد ذوالقدر نے تبریزی میں صرف جذام کے مریضوں کے لیے رکھی تھی۔ اس مقام سے کچھ فاصلے پر گرم پانی کا ایک چشمہ تھا، جس کے پانی میں گندھک کی آمیزش تھی اور اس لیے وہ پانی بہت سے جلدی امراض کے لیے مفید ثابت ہوتا تھا۔

مذکورہ بالا میں سے بعض شفاخانے اب بھی قائم ہیں اور باقی امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ختم ہو چکے ہیں۔ قائم رہ جانے والوں میں سے ایک کی عمارت، جو توقاط میں ہے، دو منزلہ ہے، جو اپنی پائیداری

اور استحکام کا خود ثبوت ہے۔

۱۲۰۶ء اور ۱۲۱۷ء کے درمیان قیصری اور سیواس میں تعمیر ہونے والے شفاخانوں کے ساتھ جو مدرسے قائم کیے گئے تھے، وہ اب بھی موجود ہیں اور ان میں سلسلۂ تدریس جاری ہے۔

ہر شفاخانہ اور مدرسہ پائے تکمیل تک پہنچنے کے فوراً بعد قوم کے نام وقف کر دیا جاتا تھا تاکہ عوام اس سے بلا امتیاز فائدہ اٹھا سکیں۔ صرف سیواس کے شفاخانے کا وقف نامہ جس پر ۱۲۱۷ء کی تاریخ افتتاح درج ہے، باقی رہ گیا ہے۔ باقی لاپتہ ہیں اور ان کی تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ سیواس والے وقف نامے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے اداروں کے نظم و نسق کے بارے میں مکمل ہدایات وقف ناموں میں درج کی جاتی تھیں۔ اس وقف نامے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شفاخانے کے عملے میں بعض امراض کے خصوصی ماہرین، جراح، دواساز اور مختلف معائنوں کی تفصیلات مرتب کرنے والے الگ الگ مقرر ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض مشہور ہستیوں کی سوانح حیات بھی دستیاب ہو گئی ہیں۔

ان اسپتالوں میں ہر قسم کے مریض داخل کر لیے جاتے تھے، البتہ دماغی امراض میں مبتلا لوگوں کو کچھ عرصے الگ رکھا جاتا تھا، کیونکہ ذہنی الجھنوں کا صحیح علاج نفسیاتی اعتبار سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کو سب سے پہلے خانقاہوں میں بھیج دیا جاتا اور ان پر یہ ظاہر نہ کیا جاتا کہ وہ کس مقصد سے وہاں لائے گئے ہیں۔ ایسی بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں کراجا احمد کی خانقاہ سب سے زیادہ مشہور تھی۔

قدیم یونانیوں کے ایسکیولیپ مندروں کی طرح سلجوقی فرمانرواؤں کے ان شفاخانوں میں بھی جو قیصری، چنکیری اور قسطامونی میں قائم تھے، پتھر پر کھدے ہوئے سانپ کی علامتی تصویر تن درستی کا مظہر سمجھی جاتی تھی۔ قیصری کے اسپتال میں سانپ ابھرا ہوا گول، اور چار بل کھاتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ بعد کے ترکوں نے اس مظہر خاص میں ذرا سی ترمیم کی اور مسرت و شادمانی کی ترجمانی کے لیے، جو عمدہ صحت و تن درستی کے بغیر ممکن نہیں، دو سانپوں کو ایک دوسرے میں لپٹا ہوا دکھایا جانے لگا۔ ترکی کا یہ نشان اس وقت بھی ساری دنیا میں مقبول اور رائج ہے۔ قسطامونی کے شفاخانے میں سانپ کے جسم میں تین بل دکھائے گئے ہیں، لیکن یونانیوں کی طرح سلجوقیوں نے ان سانپوں کی کبھی پرستش نہیں کی۔ البتہ کسی تحریر سے یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ انھوں نے یہ علامتی نشان کیوں اختیار کیا کیونکہ ان کی اپنی ثقافت میں سانپ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔

رومیوں اور بازنطینیوں کی طرح سلجوقیوں نے بھی اناطولیہ کے پہاڑوں میں بہنے والے گرم پانی کے چشموں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ انھوں نے ہر چشمے کے قریب چار دیواری میں محصور

حوض بنوائے جن میں سے بعض پر چھتیں بھی ڈلوا دیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ علاج معالجے کے لیے جو پانی استعمال ہو وہ بیرونی آلودگیوں سے بچا رہے اور اس میں کوئی آمیزش نہ ہو سکے جو بجائے خود مضر صحت ہو۔ چنانچہ الگن، قراقرت، ترزلہ، یونس ملی، حفظہ، سیدی شہر، حسن قلعہ جیسے مقامات پر تعمیر ہونے والی عمارتیں بہت مشہور تھیں۔ ان چشموں کے پانی سے لوگوں کے صحت یاب ہو جانے کے بارے میں بعض عجیب و غریب روایات کا اتنا چرچا رہا کہ وہ زمانۂ حال تک زیب داستان رہی ہیں۔

عہدِ وسطیٰ میں طب کے علم و فن نے جو ترقی حاصل کی ہے، اگر اس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ترکی کے مسلمانوں کو خراجِ تحسین ادا کیا جائے گا۔ فرماں روایانِ سلجوق نے اور ان کے بعد سلاطینِ عثمانیہ نے اس بات کا بیڑا اٹھا رکھا تھا کہ عربی اور فارسی زبان میں طب کی کتابیں جہاں کہیں سے بھی دستیاب ہو سکتی ہوں، حاصل کر لی جائیں اور ان پر تحقیقات کی جائے اور مروجہ طریقوں کے ساتھ ان میں درج شدہ اصولوں کو منطبق کر کے نئے نتائج برآمد کیے جائیں۔

یہ کام کتب خانوں اور شفا خانوں میں یکساں ذوق و شوق کے ساتھ ہوتا رہا۔ چناں چہ استنبول اور ترکی کے دوسرے شہروں میں جتنے بھی سرکاری اور غیر سرکاری کتب خانے موجود ہیں، ان میں طبی مطبوعات اور قلمی مسودات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یونان و روما کی بعض لائبریریوں کے نوشتے بھی جو زمانے کی دست برد سے اتفاقاً بچ رہے ہیں، توپ کاپی محل اور سنٹ صوفیا کی لائبریریوں میں رکھے ہیں اور حافظ ابرو کی تصنیف زبدۃ التواریخ میں ان کا ذکر ہے۔

اس کتاب میں ایک دل چسپ تصویر شامل اوراق ہے جس میں شہنشاہ ملک شاہ کے پوتے مسعود شاہ کو بستر علالت پر اس طرح دکھایا گیا ہے کہ ایک طبیب اس کی نبض پر انگلیاں رکھے حرکاتِ قلب اور دیگر اعضائے رئیسہ کی کیفیات کا جائزہ لے رہا ہے اور دوسرا اس کی پیشانی کو چھو کر، کچھ اندازہ لگا رہا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سلجوق ہی پہلے فرماں روا ہیں، جنھوں نے فوج کے لیے طبی نظام قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا اور ایسے منصوبوں کو باقاعدہ عمل میں لائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک شاہ کی فوج میں جو سفری شفا خانہ تھا، اس کا کل سامان چالیس اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔

سلجوقی اطبا میں سے موصل کے رہنے والے شمس الدین ابن حبل، جراح فاضل، موافق الدین بغداد کے عبد اللطیف، صدر الدین ابو بکر بن زکی اور کمال الدین وغیرہ نے بڑا نام پیدا کیا اور رہتی دنیا ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔

نظامی عروضی کے چہار مقالہ کے آخری حصے میں ایسی کتابوں کی فہرست درج ہے جو سلجوقی عہد کے

اطبا ہمیشہ اپنے مطالعے میں رکھا کرتے تھے۔

سلجوقیوں کے نقوشِ قدم پر عثمانی برابر چلتے رہے۔ رفاہِ عامہ سے تعلق رکھنے والے کام جس منزل پر بھی پہنچ چکے تھے، وہاں ختم نہیں کیے گئے، بلکہ ان کو برابر آگے بڑھایا گیا۔ چنانچہ انھوں نے ترکی کے بہت سے ایسے شہروں میں جو سلجوقیوں کے اثر و اقتدار سے باہر تھے اور ان کے زیرِ نگیں ہو گئے تھے، شفاخانوں کی تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا، مثلاً ۱۳۹۹ء میں یلدرم سلطان بایزید نے برُسہ میں، ۱۴۸۶ء میں بایزید دوم نے ادرنہ میں، ۱۵۳۹ء میں سلطان سلیمان کی والدہ حفصہ سلطانہ نے منیسا میں، اسی سال اسی فرمانروا کی شریکِ حیات خرم سلطان نے استنبول میں، ۱۵۸۳ء میں سلطان مراد دوم کی والدہ نور بانو سلطان نے استنبول میں اور ۱۶۱۶ء میں سلطان احمد اول نے استنبول میں عام بیماریوں کے شفاخانے تعمیر کرائے۔ ۱۵۴۱ء میں سلطان مراد دوم نے ادرنہ میں اور ۱۵۱۴ء میں سُلطان سلیم نے استنبول میں جذامیوں کے لیے خاص شفاخانے بنوائے۔ ۱۴۷۰ء میں سُلطان محمد فاتح نے استنبول میں شفاخانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی بھی قائم کرائی اسی طرح سلطان سُلیمان نے بھی ۱۵۱۵ء میں استنبول کے شفاخانے کے ساتھ ایک یونیورسٹی قائم کرائی تھی۔

اس وقت صرف استنبول میں ستر شفاخانے ایسے ہیں جو انیسویں صدی عیسوی میں عثمانی فرمانرواؤں نے تعمیر کرائے تھے۔ سُلطان مراد کا جذامیوں کا اسپتال اٹھارھویں صدی کے آخر تک اور سلطان سلیم کا ۱۹۲۳ء تک برقرار رہا۔ اس وقت کے بہت سے اسپتالوں کی عمارتیں مرمت اور تعمیرِ نو کے بعد اب بھی پرانی بنیادوں پر کھڑی ہیں۔ صرف ایک شفاخانے کی عمارت ایسی ہے جسے اس وقت تو جی شفاخانے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں استنبول کے بہت سے شفاخانوں کی تعمیر کا کام خواجہ سنان کے سپرد کیا گیا، جس نے شفاخانوں اور محلوں سمیت کُل ۳۹۶ عمارتیں تعمیر کی تھیں۔

مذکورہ بالا تمام اسپتالوں میں خدمات انجام دینے والوں کی تربیت ترکی ہی میں ہوئی تھی، یا بصورتِ دیگر، دوسرے اسلامی ملکوں میں جا کر انھوں نے فنِ طب حاصل کیا تھا۔ اسپتالوں کے عملے میں بعض غیر ملکی یہودی اور عیسائی طبیب بھی شامل کر لیے گئے تھے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں حکیم حاجی پاشا قونیہ سے مصر گئے اور طب کے تمام شعبوں میں خاص مہارت حاصل کی۔ واپس آ کر وہ کلادوں کے اسپتال میں صدر المعالجین مقرر ہو گئے۔ کیوں کہ ایدین اوغلو عمر بے نے ان کو وہاں کام کرنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے طب اور دوسرے سائنسی

علوم پر متعدد کتابیں بھی لکھیں اور انھیں اناطولیہ کے بو علی سینا کی طرح عالمگیر شہرت حاصل ہوگئی۔

انھی کی طرح امیر چلبی کی تعلیم مصر میں ہوئی۔ وہ بھی واپس آکر صدر المعالجین ہوگئے، اور کئی کتابیں تصنیف کر دیں۔ چونکہ چودھویں صدی عیسوی تک طب کی زبان صرف عربی یا فارسی تھی، اس لیے ترکوں نے بھی بہت سی کتابیں انھی زبانوں میں لکھیں اور بعد میں ان کے ترجمے ترکی میں ہوئے۔

ایک مشہور طبیب بدیع شہسوار اوغلو نے طبّی کتابوں کی ایک فہرست شائع کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اطبا نے اپنی کتابوں کا انتساب ہی بعض فرمانرواؤں کے نام سے نہیں کیا، بلکہ خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کا مصنف ان ہی کو قرار دیا، حالانکہ وہ فرمانروا طب و حکمت سے قطعی بیگانہ تھے اور نہ تصنیف و تالیف میں حصّہ لے سکتے تھے۔ بعد کے محققین نے اصل مصنفین کا پتہ چلا لیا۔ ان میں سے بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

مفردات الادویہ سی، خواص الادویہ، اختلاج نامہ، ترویح الارواح، طبِ نبوی، کتاب المنتخب، ذخیرہ مرادیہ، مفتاح النّور، خزائن السّعادت، مجرّب نامہ، جراحیِ عصری اور خلاصۃ الطب وغیرہ۔

فہرست میں قونیہ کے حکیم حاجی پاشا کی صرف چار کتابیں درج ہیں کیونکہ باقی لاپتہ ہوگئی ہیں۔ امیر چلبی کی ایک بھی تصنیف نہیں ہے، انھیں صرف مترجم کی حیثیت سے شامل فہرست کیا گیا ہے۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فہرست خاصی طویل ہونے کے باوجود بڑی حد تک نامکمل ہے۔

حاجی پاشا، اسحاق بن مراد، مومن بن مقبل اور ابن شریف کی ذاتی تحقیقات اور تشخیص کے طریقوں نے ترکی طب پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ سب چودھویں صدی کے اطبا میں شامل ہیں۔

پندرھویں صدی کے اطبا نے بہت زیادہ طبّی کتابیں لکھیں اور اس علم و فن کو بڑی ترقی بھی دی۔ ۱۴۳۷ء میں ایک کتاب "کمال نامہ" تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کی تیسری جلد میں صرف جواہر کا ذکر ہے، یعنی ان قیمتی پتھروں کو دوا کے طور پر کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض طبّی رسائل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے اطبّا بھی وبائی بیماریوں خصوصاً طاعون وغیرہ کو قہرِ خداوندی سمجھتے تھے اور ان سے محفوظ رہنے یا ان کا استیصال کرنے کے لیے دعاؤں کا سہارا لیتے تھے، لیکن ان کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جراثیم اور وائرس وغیرہ کے وجود سے واقف نہ ہونے کے باوجود ان کے مجرّبات میں بعض ایسے نسخے موجود ہیں جو اب بھی عمل میں آرہے ہیں۔

سلطان فاتح نے ۱۴۷۰ء میں جب استنبول کے شفاخانے کے ساتھ یونیورسٹی بھی قائم کی تو اس کے سولہ شعبے تھے۔ شعبۂ طب میں جب پہلا درس شروع ہوا تو خود سلطان ایک مبصر کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ اس نے اس شعبے کے عملے کے لیے یہ شرط رکھی کہ ہر شخص بلا امتیازِ مذہب و ملت اس شعبے میں اُستادِ طب مقرر کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ایک مستند طبیب ہو۔ اس قسم کی شرط دوسرے شعبوں کے لیے نہیں تھی۔ سلطان کا منشا یہ تھا کہ طب کے بہترین ماہرین کسی طرح جمع ہو جائیں اور یقیناً وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

اس صدی کے ایک مشہور ماہرِ طب و جراحت شرف الدین صابنجو اوغلو نے چودہ سال کی لگاتار محنت اور شفاخانہ عماسیہ میں خدمات انجام دینے کے بعد ۱۴۶۵ء میں ابوالقاسم زہراوی کی کتاب "التصریف" کا ترجمہ تین جلدوں میں عربی سے ترکی میں کیا اور ضمیمے کے طور پر کچھ حصّہ اپنی طرف سے قلمبند کیا۔ جراحی کے آلات کی ان تصاویر کے علاوہ جو زہراوی نے اپنی کتاب میں دی تھی انھوں نے بھی کچھ شکلیں بنائیں، جو ان کی ایجاد تھیں۔ وہ ان آلات کو اپنے آپریشنوں میں استعمال کر چکے تھے۔ ان کی کتاب کا ایک قلمی نسخہ استنبول کے ادارۂ تاریخ طب میں اور دوسرا پیرس کی ایک لائبریری میں موجود ہے۔ انھوں نے ۱۴۷۷ء میں اپنے مجربات کا مجموعہ بھی مرتب کیا جو دنیائے طب میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔

علی احمد چلبی نے جو ادرنہ کے اسپتال میں معالج تھے، مثانے کی پتھری پر دس ابواب میں ایک کتاب لکھی جو اس موضوع پر آج بھی حرفِ آخر سمجھی جاتی ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں ایک اور جامعہ طبیّہ استنبول میں قائم ہوئی، جس کے ساتھ حسبِ دستور ایک شفاخانہ بھی تعمیر کیا گیا۔ شفاخانے کا ایک حصّہ دماغی امراض میں مبتلا لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس شفاخانے کے وقف ناموں سے اور اس کے معالجین کے روزنامچوں سے اس کے نظم و نسق اور طریق کار کا پتہ چلتا ہے۔ منجملہ اور باتوں کے یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے کہ پاگلوں کے علاج میں موسیقی کو خاص اہمیت دی جاتی تھی جب کہ مغربی دنیا کے جدید معالجین اس نفسیاتی طریقۂ علاج کی تحقیق کو اپنے سے منسوب کرتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں دماغی امراض والوں کا حصّہ شفاخانے سے الگ کر دیا گیا۔

سولھویں صدی کے ترکی اطبا نے حفظِ صحت کے کاموں اور دوسرے معاشرتی امور پر بھی بہت زور دیا۔ ان کا فیصلہ تھا کہ بیماری اور اس کے علاج کی نوبت آنے سے پہلے انسدادی

تدابیر پر عمل کر لیا جائے تو بہت سے روگ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں۔ چناں چہ انھوں نے آبِ نجس اور دوسری غلاظتوں کی نکاسی اور صفائی کے اصول منضبط کر کے حکومت سے نافذ کرائے، عوام کے نہانے کے لیے حمام بنوائے، جگہ جگہ فوارے لگوائے اور سڑکوں پر چھڑکاؤ شروع کرایا تاکہ بہت سی بیماریوں کا دفعیہ ہو سکے۔ تھوک اور بلغم کو بعض بیماریوں کی جڑ بتا کر ان کے سلسلے میں احتیاطی تدابیر جاری کرائیں۔ انھوں نے حکومت کی منظوری سے اطبا کا علیحدہ لباس مخصوص کرایا تاکہ وہ ایک نظر میں پہچانے جا سکیں۔ وہ لباس پرانی روایات کے حامل اس زمانے کے طبیبوں میں آج بھی رائج ہے۔

سترھویں صدی شروع ہوتے ہی مسجد سلطان احمد کے قریب استنبول میں ایک نیا اسپتال کھولا گیا۔ اسی کے ایک معالج امیر جلبی نے، جن کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے، ۱۶۲۴ء میں ایک کتاب "المعجز الطب" لکھی، جسے چند سابقہ طبی کتابوں کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔ البتہ انھوں نے اخلاقیاتِ طب پر جو رسالہ لکھا، وہ اتنا مقبول ہوا کہ آج تک قابلِ ذکر سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے علمِ اخلاق کے نقطۂ نظر سے جو طبی اصول منضبط کیے، وہ ہمیشہ لائقِ تقلید رہیں گے۔

اسی عہد کے ایک نامور شخص شمس الدین عراقی نے، جو بذاتِ خود طبیب نہیں تھے، طب اور تشریح الاعضا پر ایک عمدہ کتاب لکھی جو مستند سمجھی جاتی ہے۔

احمد ثانی بن حسن نے "تحفۃ المومنین" کا ترجمہ عربی سے ترکی میں کیا۔ ہزارفن حسین آفندی نے جو استنبول کوئی کے رہنے والے تھے، ایک جامع طبی انسائیکلو پیڈیا لکھ دیا۔ اسی زمانے میں عنایت البیان، نظام الادویہ، دائرۃ الامراض اور مفرداتِ طب کے نام سے چند مفید کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے کئی کئی قلمی نسخے ملک کی مختلف لائبریریوں میں مل سکتے ہیں۔

سترھویں صدی میں ترکی اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے مابین طبی اور سائنسی رابطہ شروع ہوا۔ طبیب اور سائنسداں مختلف وفود کی صورت میں ایک ملک سے دوسرے ملک آنے جانے لگے۔ طبی مطبوعات اور ادویات کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔ اکتسابِ علم و فن کے باب میں یہ رابطہ سب کے لیے مفید ثابت ہوا۔ کچھ نئی نئی باتیں ہر ایک نے سیکھ لیں۔ ترکی طبیبوں نے خاص طور پر مغرب کی بعض ایجادوں میں دل چسپی لی۔ اس کے برعکس دماغی امراض میں مبتلا ہونے والوں کے لیے جو طریقے مشرق میں رائج تھے، وہ مغربی طبیبوں کے لیے بھی نئے اور اہم ثابت ہوئے اور ان کی اہمیت اب بھی برقرار ہے۔

اس طرح ان چیزوں سے بھی ترکی استفادہ کرنے لگا جو امریکا کی تحقیق کے بعد بعض طبی اشیا اس نئے براعظم سے یورپ پہنچی تھیں، جن میں کونین اور اپیکاک بھی شامل ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں باہمی ربط وضبط کا سلسلہ زیادہ تیزی پکڑ گیا۔ خاص طور پر ترجمے کا دور شروع ہوا۔ حکمائے یونان کی بہت سی کتابیں جو عربی کے وسیلے سے یا براہِ راست ترکی زبان میں محفوظ ہو گئی تھیں، یورپ کی زبانوں میں منتقل ہو گئیں اور وہاں کے جدید خیالات نے ادھر اپنا رنگ جمالیا۔ اس عہد کے ایک مشہور ترکی طبیب کاتب زادہ رفیع آفندی کے رسالے جو امراضِ صدر، وجع المفاصل اور امراض گردہ و مثانہ سے تعلق رکھتے تھے اور جن میں دافع زہر ادویہ کا ذکر تھا، یورپ کے ملکوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ ایک اور اعلیٰ طبیب گرت لی نوح آفندی کی کتاب اقربادینِ ترکی، جس میں کئی سو مرکبات کے نسخے درج تھے اور اس لحاظ سے دنیا کا پہلا بہترین مجموعہ تھا، یورپ میں ایک عمدہ سند سمجھا جانے لگا۔

ایک اور ترکی طبیب حکیم عباس آفندی نے، جن کا انتقال ۱۷۰۱ء میں ہوا تھا، دستور الوہیم کے نام سے ایک مفید کتاب لکھی، جس میں قدیم و جدید طریقہ ہائے طب کا موازنہ کر کے ثابت کیا گیا کہ نئے اصول کس حد تک قدیم اصولوں کے رہینِ منت ہیں۔ اس تصنیف کے آخر میں بقراط کے خیالات وضاحت کے ساتھ شامل اوراق کیے گئے تھے۔ عباس آفندی کے اُستاد اور نامور طبیب علی منشی آفندی نے جو برسہ کے باشندے تھے، طب و جراحت پر دو کتابیں لکھیں اور یورپ کی زبانوں سے ترجمہ کر کے ایک نیا اقرباذین مرتب کیا۔

اس زمانے میں یورپ کی طبی تحقیقات نظری اعتبار سے تو ضرور ترکی میں منتقل ہوئیں لیکن طریقۂ علاج اور دوا سازی کے اصول پھر بھی مشرقی انداز میں مقبول و رائج رہے۔ شعبان شفائی آفندی نے جو مدرسہ طبیہ سلیمانیہ میں اُستاد بھی تھے، سیڈنہم کی ایک کتاب پر کڑی تنقید کی، جو افیون کے زہر اور اس کے اثرات زائل کرنے کے بارے میں لکھی گئی تھی اور ثابت کیا کہ وہ "زہر خوارزم شاہی" کے ایک باب سے اخذ و ترجمہ کی گئی ہے۔ انھوں نے امراض اطفال اور بچوں کی نگہداشت کے موضوع پر بھی ایک عمدہ رسالہ تصنیف کیا۔ اپنی کتاب "شفائیہ" میں انھوں نے بتایا کہ جواہر کے کشتوں اور دیگر مرکبات سے بعض امراض اور خصوصاً دماغی امراض کا علاج کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

حاجی مصطفےٰ آفندی نے جو توقاط کے رہنے والے تھے، سلطان مصطفےٰ سوم کی فرمائش پر بوعلی سینا کی کتاب "قانون" کا عربی سے ترکی میں پہلی بار ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں گورگ زادہ،

حافظ حسن آفندی، جو شاہی طبیب اور فوجوں کے طبّی نظام کے سربراہ بھی تھے، یورپ کی طب کے زبردست حامیوں میں شامل تھے۔ انھوں نے مغربی خیالات سے استفادہ کرکے بہت سی کتابیں لکھیں، جو ان کی سابقہ تحریروں کے مقابلے میں زیادہ مقبول نہ ہو سکیں۔ وہ امراضِ چشم، جوڑوں کے درد اور بچّوں کی بیماریوں کے ضمن میں بہت ہی مستند حکیم سمجھے جاتے تھے، وہ اور اس زمانے کے بہت سے ترکی طبیب لاطینی، اطالوی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے ماہر ہو گئے تھے۔

اس اٹھارھویں صدی کا ایک تاریخی واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ چیچک کے ٹیکے کا رواج دراصل ترکی سے شروع ہوا تھا۔ ترکی میں برطانوی سفیر کی شریکِ حیات لیڈی مونٹیگو نے ۱۷۱۷ء میں ادرنہ سے کئی خطوط لندن میں اپنے دوستوں کے نام لکھے، جن میں تفصیل سے چیچک کا ٹیکہ لگانے کا طریقہ بیان کیا اور بتایا کہ یہاں ۱۶۷۹ء سے اس کا رواج ہے۔ انھوں نے انگریز طبیب کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ہدایت کی کہ یہ طریقہ اختیار کیا جائے اور اپنے ملک میں دوا بھی تیار کی جائے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کے بھی یہ ٹیکہ لگوایا تاکہ چیچک کا حملہ اس پر کبھی نہ ہو سکے۔ یہ ٹیکہ بازو میں لگتا تھا۔ صرف چند دن تکلیف رہتی تھی۔ یہ ٹیکے عموماً موسم خزاں میں لگائے جاتے تھے اور سرکاری طور پر انتظام ہوتا تھا۔ اس رواج کے بہت بعد میں یعنی انیسویں صدی میں ڈاکٹر جنر کا ٹیکہ دریافت ہوا، جس کی ویکسین تیار کرنے کے لیے غریب بچھڑے کو "قربانی کا بکرا" بنایا جاتا ہے۔

مغربی طب سے کافی استفادہ کرنے کے باوجود اٹھارھویں صدی کے آخر تک ترکی میں مشرقی طب کا بول بالا رہا، لیکن انیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی حالات نے پلٹا کھایا اور مغربی طریقۂ علاج نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔ ۱۸۲۷ء میں سلطان محمود نے استنبول میں جدید وضع کے دو مدرسے فوجی ڈاکٹروں اور سرجنوں کی تربیت کے لیے کھولے اور کچھ عرصے بعد ان دونوں کو ملا کر ایک ادارہ "مکتبہ طبیہ عدلیہ شاہانہ" کے نام سے قائم کر دیا جس کی تاسیس میں ڈاکٹر برنارڈ، ڈاکٹر نیو نراد ان کے ساتھیوں کا ہاتھ تھا۔ یہ ویانا سے آئے تھے اور جدید خیالات اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہاں یورپی طب فرانسیسی زبان میں پڑھائی جانے لگی۔ کہتے ہیں کہ خود سلطان عبدالمجید دو بار طبی امتحانات میں شامل ہوئے۔ ۱۸۴۶ء میں ترکی طلبا کو پہلی بار ویانا کے میڈیکل اسکول سے باقاعدہ سندیں ملیں۔ پھر بہت سے ترکی طلبا یورپ کے مختلف ملکوں میں بھی تحصیل علم و فن کے لیے بھیجے گئے۔ انھوں نے لوئی پاسچر، کلاڈ برنارڈ، اس کے شاگرد فورنیر شارکوٹ اور بوڈین جیسے ماہرین فن

ے اکتساب علم کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انیسویں صدی کے سلاطین عثمانیہ اپنی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کے باعث یورپی اقتدار کے پھندے میں پھنسنے شروع ہو گئے اور اپنے اقتصادی حالات کو متوازن رکھنے کے لیے مجبور تھے کہ وہاں کے ارباب حل و عقد کے سامنے سر جھکائیں اور ان کی ہر اچھی بُری بات مان لیں۔ اس طرح ملکی سیاست میں بیرونی اثرات جڑ پکڑنے لگے اور قومی روایات کا چہرہ مسخ ہوتا چلا گیا۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مغربی طب کے ترقی پسندانہ خیالات کو قبول نہ کیا جاتا، بلکہ ایسی صورت پیدا کی جاتی کہ اپنی روایات کا دامن کسی طرح ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔ بھائی جان محترم نے اور میں نے علی الترتیب بھارت اور پاکستان کے ہمدرد دواخانوں میں اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے کہ تحصیلات کا دروازہ کسی سمت میں بھی بند نہ کیا جائے لیکن ہر چیز کو اپنے سانچوں میں ڈھال کر استعمال کیا جائے تاکہ طبیعت اسے قبول کرنے سے انحراف نہ کرے، فائدہ خاطر خواہ ہو اور کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس مقصد کے لیے ہم دونوں بھائی مرض کی تشخیص میں مشرقی اور مغربی اصول و قواعد کو مدِ نظر رکھتے ہیں لیکن علاج معالجہ صرف مشرقی انداز میں ہوتا ہے۔

یونیورسٹی ایشیا سے ہم تینوں جب واپس ہلٹن پہنچے تو بری طرح تھکے ہوئے تھے، حسب معمول غسل کیا تاکہ فوراً تازگی آ جائے، ہلکی سی غذا کھائی اور بھائی جان محترم دوسرے دن کا پروگرام بنانے بیٹھ گئے۔ اگر یہ ذمہ داری میرے سپرد ہوتی تو شاید کوئی لائحۂ عمل مرتب نہ ہو سکتا کیوں کہ میں طبیعت میں تازگی کی کسی قدر کمی محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم سب سو گئے، تاکہ صبح کو تازہ دم ہو کر اٹھیں اور نئی منزل کی طرف سرگرم سفر ہو جائیں۔

---

۲۹ اگست ۱۹۵۶ء ——— بُدھ

ایفی سس ——— ازمیر

اکبر الٰہ آبادی مرحوم کو منزلِ محبوب تک پہنچنے کی سیدھی راہ جب حضرت خضرؑ کی زبانی معلوم ہو گئی تو دوسری چنتا یہ تھی کہ وہاں جانے کے لیے اونٹ کا کرایہ کون ادا کرے گا۔ ہم نے ازمیر اور اس کے مضافات کی سیر و سیاحت کا پروگرام بنایا تو کرائے کی رقم ہمارے پاس تھی۔ البتہ یہ مسئلہ قابلِ غور تھا کہ سفر کے لیے کس ذریعۂ مواصلات کو اختیار کیا جائے۔ ہر صورت میں کچھ جاذبیتیں تھیں اور کچھ قباحتیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سیر کرتے اور راستے کے ہر مقام خصوصاً درّہ دانیال کو، جسے اب ترک چنا قلعہ کہتے ہیں، دیکھتے بھالتے ازمیر پہنچیں، لیکن سب سے بڑا سوال وقت کا تھا۔ فیری صبح گیارہ بجے استنبول سے چل کر رات کے بارہ بجے چنا قلعہ پہنچتی اور دو گھنٹے بعد روانہ ہو کر دوسرے دن بعد دوپہر ازمیر پہنچتی۔ ریل میں جاتے تو گاڑی استنبول سے صبح کے دس بجکر دس منٹ پر چلتی۔ رات کے آٹھ بجکر چالیس منٹ پر عسکی شہر اور دوسرے دن شام کو چھے بجکر اٹھائیس منٹ پر ازمیر پہنچتی۔ موٹر کار میں جانے کی ہمت نہیں تھی۔ انقرہ سے استنبول جانے کا تجربہ تلخ ہی نہیں، اتنا ہولناک ہو گیا تھا کہ اب ایسے سفر سے، خصوصاً اسی ملک میں جہاں "دائیں طرف چلو" کا قاعدہ رائج ہو، دور رہنا ہی بہتر تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان بسیں بھی چلتی ہیں، لیکن لمبے سفر میں وہ کسی نظام اوقات کی پابند نہیں ہوتیں۔ کنڈکٹر کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا ہے۔

لہٰذا کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ ہوائی جہاز سے چلا جائے تاکہ کم سے کم وقت لگے اور اسی روز واپسی ہو جائے۔ بس اتنی بات تھی کہ جہاز میں راستے کی ہر چیز کو طائرانہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے جلدی گزر جانا پڑتا ہے۔ نگاہِ بازگشت ڈالنے کا بھی موقع نہیں ملتا اور اگر جہاز زیادہ بلندی پر پرواز کر رہا ہو، جو عموماً طویل فاصلوں اور پہاڑی علاقوں میں ضروری ہے، تو نیم نگاہی کا موقع

بھی نہیں ملتا۔

روانگی سے پہلے:۔ برکات صاحب اپنے فرائض منصبی کی تعمیل میں ہمیشہ اتنے منہمک رہتے ہیں کہ انھیں انقرہ سے استنبول اور استنبول سے انقرہ جانے کے علاوہ ترکی کے دیگر مقامات دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ازمیر کا حال انھوں نے کتابوں میں پڑھا تھا یا لوگوں سے سُنا تھا بچشمِ خود دیکھنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ ہم نے سوچا کہ انھیں بھی ساتھ لے لیں۔ ان کی ہم جلیسی بجائے خود ایک نعمت اور باعثِ مسرت ہے۔ ان کی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے۔ ان کا ساتھ ہو تو سفر بالکل سفر معلوم نہیں ہوتا۔ پھر ان کی ترکی زباں دانی ان سب خوبیوں پر مستزاد ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ ہمارے ہمراہ چلنے کے لیے کسی عنوان آمادہ نہ ہو سکے۔ عُذر اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ بہت ہی ضروری کام فوراً انجام دینے ہیں اور پھر انقرہ میں اپنے سفارت خانے کو مطلع کیے بغیر شہر سے باہر جانا یوں بھی ممکن نہیں ہے۔

یُوں تو ہر مقام پر سیاحوں کے لیے گائڈ مل جاتے ہیں اور وہ بہت سی باتیں بتا دیتے ہیں، لیکن ان میں زیادہ نہیں تو اسّی فیصد حصّہ "ایجادِ بندہ" ضرور ہوتا ہے، اس لیے میں ان پر کبھی بھروسہ نہیں کرتا، بلکہ لاعلم رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے گائڈ اور وہ عطائی جو خود ساختہ ڈاکٹر بن کر سرِ بازار دوائیں بیچتے اور اس سے پہلے امراض کی کیفیات، تشخیص اور علاج معالجے پر ایک لچھے دار تقریر جھاڑتے ہیں، ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں میں من گھڑت باتیں بیان کرنے کا مادّہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

ٹرکش ایرلائنز کا نام "تھائی" ہے اور یہ "ترک ہوائیولاری" کا مخفف ہے۔ اس نے ملک بھر میں فضائی پرواز کا ایک جال سا بچھا رکھا ہے۔ اس کے بعض جہاز سرحد پار جانے کے باعث بین الاقوامی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ خصوصاً ترکی سے قبرص، ایتھنز اور بیروت جانے کے لیے اسی کمپنی کے جہاز پسند کیے جاتے ہیں۔ ملک بھر میں اس کے بیس مستقر موسم گرما میں کھلے رہتے ہیں۔ البتہ سردی شروع ہونے کے بعد ان میں سے چھے احتیاطاً بند کر دیے جاتے ہیں، تاکہ ناخوش گوار حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

استنبول اور ازمیر کے درمیان ہر لحاظ سے بے حد آمد و رفت رہتی ہے۔ روزانہ زیادہ نشستوں والے چھے جہاز جاتے اور اتنے ہی واپس آتے ہیں۔ ان دنوں ازمیر کے صنعتی میلے کی وجہ سے بکنگ بہت مشکل تھی لیکن غیر ملکی سفارت خانے کی طرف سے فرمائش اور پھر برصغیر پاک و ہند کے سیاحوں کی خاطر، یہ مشکل کام حیرت انگیز صورت میں آسان ہو گیا۔ خدا جانے جہاز کمپنی والوں نے کیوں کر

گنجائش نکالی ہمیں واپسی کے ٹکٹ مل گئے اور یہ سب کچھ اس شخص کی عنایت سے ہوا جو ہوٹل میں کمپنی کی شاخ کا انچارج تھا۔ ہمیں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی۔ سنا ہے کہ ایسے موقعوں پر عموماً کمپنی والے بعض مقامی باشندوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی بکنگ کسی اور دن کے لیے کرالیں اور یہ درخواست اکثر مان لی جاتی ہو۔ اگر خیر سگالی کا یہ جذبہ ہر ملک میں پیدا ہو جائے تو بہت سے کام بگڑنے سے پہلے سنبھل جایا کریں۔

جب یہ نیک فال نکلی تو صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ ایک جہاز چھ بجکر دس منٹ پر روانہ ہو چکا تھا، دوسرا نو بجے جانے والا تھا۔ اسی میں ہمارے لیے نشستیں مخصوص ہوئی تھیں، کیوں کہ ہم نے یہ شرط لگادی تھی کہ ہماری واپسی اسی روز ممکن ہو جائے اور وہ بھی اس طرح کہ ہم کئی گھنٹے اس نئے شہر اور اس کے مضافات میں گزار لیں اور صنعتی میلہ بھی دیکھ لیں۔ کمپنی نے ہماری واپسی کا انتظام آخری جہاز میں کیا تھا، جسے ازمیر سے سوا دس بجے چلنا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم ازمیر کے علاوہ افی سس کے تاریخی مقامات بھی دیکھ سکتے تھے، جو شہر سے پچاس میل دور ہیں اور واپس آکر دو گھنٹے صنعتی میلے میں گزار سکتے تھے، جو یقیناً کافی تھے۔ ہمیں اس پروگرام سے اطمینان ہوا کہ اس طرح ایک حسرت پامال ہونے سے بچ گئی۔

روانگی: ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور جہاز کمپنی کی بس میں جو روزانہ ہوٹل ہلٹن سے ہوائی مستقر تک کئی پھیرے کرتی ہو، چند اور مسافروں کے ساتھ سوار ہو کر چل پڑے۔

تھائی کمپنی کا جہاز جب استنبول سے روانہ ہوا تو مطلع بہت ہی صاف تھا۔ ہم کھڑکی کے شیشے میں سے دور تک سیر کر سکتے تھے۔ نیچے بحیرۂ مرمرہ تھا اور اوپر آسمان۔ گویا ہم دو نیلے طبقوں کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ بہت جلد ہمیں استنبول کے پہاڑ اور پہاڑیاں معمولی ٹیلے معلوم ہونے لگیں اور عمارتوں کے نشانات اس طرح نظر آرہے تھے، جیسے کسی کے چہرے پر چیچک کے داغ ہوں۔ ممکن ہو اس کرۂ ارض سے بہت دور بیرونی خلا میں نکل جانے کے بعد یہ سیارہ بھی چاند کی طرح روشن نظر آنے لگے لیکن محض چند ہزار فیٹ کی بلندی پر پرواز کرنے سے تو اس کی تاریکی میں اضافہ ہی محسوس ہوتا ہو۔

جہاز کا رخ چنا قلعہ کی طرف تھا۔ عام محاورے کے مطابق جہاز کوّے کی اڑان کی طرح بالکل سیدھے نہیں جاتے، بلکہ بحیرۂ مرمرہ کے مغربی ساحل پر پرانے زمانے کے درۂ دانیال سے ہو کر انھیں گزرنا پڑتا ہو، جہاں ایک دو مسافر اترتے اور ایک دو سوار ہوتے ہیں۔ اس لیے قیام کا

وقفہ زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ ان دونوں مقامات کے درمیان مسافر زیادہ تر بسوں اور فیری کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔

چنا قلعہ:۔ یہ ترکی تاریخ میں ذرا نیا نام ہے کیوں کہ قیام جمہوریت کے بعد جب ناموں کو تبدیل کرنے کا رجحان عام ہوا تو یہ مقام بھی اس زد میں آئے بغیر نہ رہ سکا۔ مشرق و مغرب کے سیاح، مورخ اور محققین جب یہ نام سنتے ہیں تو کچھ دیر سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے اور کہاں واقع ہے؟ — اور جب ان سے کہا جائے کہ یہ ڈارڈینلز یا درۂ دانیال کا نیا نام ہے تو پردۂ سیمیں پر تیزی سے گزرنے والی تصویروں کی طرح پانچ ہزار سال کے واقعات اپنی اپنی جھلک دکھا کر روپوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ درۂ دانیال بھی مسلمانوں کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ یہ غلط ہے کہ اسے حضرت دانیال یا اسی نام کی کسی اور تاریخی شخصیت سے کوئی واسطہ ہے۔

دراصل یہ ڈارڈینلز ہی کا معرب ہے اور یونانی زبان کے اعتبار سے یہ ڈارڈے نس سے مشتق ہے جو یونان کی دیو مالائی کہانیوں کے مطابق زیوس دیوتا کا بیٹا اور ددان قبیلے کا جدِ امجد تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ اپنے حقیقی بھائی کو قتل کرنے کے بعد باپ سے ڈر کر فرار ہوا تو سمندر پار کر کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا، جہاں کے حکمراں ٹیوسر نے اس کا خیر مقدم کیا اور اپنی بیٹی باٹیا کی شادی اس سے کر دی۔ اسی شاہی جوڑے نے شہر ٹرائے آباد کیا، جہاں کی حسین ترین شہزادی ہیلن کی عشقیہ داستان کو منظوم کر کے ہومر نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ عہدِ عتیق میں اس علاقے کی دو بڑی سلطنتوں کے حکمرانوں متھری ڈیٹ اور سلانے ۸۴ قبل مسیح میں ایک معاہدے پر دستخط کیے اور آبنائے کا نام ڈارڈے نس رکھا۔ یونانیوں نے اسے ڈارڈینلز میں بدلا اور ترک مسلمانوں نے اسے درۂ دانیال کر دیا۔ یونانی زبان کے اعتبار سے ڈارڈینلز کے لفظی معنی بحرِ سفید ہوئے۔ چناں چہ بعض تاریخوں میں اسے بحرِ سفید بھی لکھا گیا ہے۔

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ چنا قلعہ دو لفظوں چنک اور کالی سے مل کر بنا ہے۔ چنک مٹی کی ہنڈیا کو کہتے ہیں اور چوں کہ یہ علاقہ ہمیشہ سے مٹی کے ظروف کی صنعت و تجارت کے اعتبار سے مشہور رہا ہے اس لیے شہر کا نام اسی رعایتِ لفظی سے چنک قلعہ ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں کا قلعہ اپنی ابتدائی صورت میں صرف مٹی سے تیار کیا گیا ہو، اسی لیے اسے چنک قلعہ یعنی مٹی کا قلعہ کہنے لگے ہوں۔

دور یا نزدیک سے اور کسی موسم میں اس آبنائے پر نظر ڈالی جائے تو اس کا پانی کنکریلی تہ کے باعث حقیقتاً برف کی مانند سفید دکھائی دیتا ہے اور جب بہت بلندی پر اڑتے ہوئے جہاز

سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر کوندنے والی بجلی کی ایک لہر اپنی چمک دمک دکھانے کے لیے زمین پر اُتر آئی ہے۔ آبنائے کے قریب کی بستی مختلف زبانوں میں اسی کے مُروجہ ناموں سے موسوم ہوتی رہی ہے۔

یہ آبنائے چوں کہ دو سمندروں کو ملاتی اور اس طرح سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے بعض نوشتوں میں اسے "کلیدِ بحر" بھی کہا گیا ہے، لیکن اس کی توجیہہ استعارے کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

یہ آبنائے اس لحاظ سے بھی بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے کہ سنہ ۴۸۰ قبل مسیح میں یکخسرو نے اور سنہ ۳۳۴ قبل مسیح میں اسکندرِ اعظم نے اسے عبور کیا تاکہ اپنی شاندار فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھایا جا سکے۔ یہ پرانے قصے ہیں۔ عہدِ جدید کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۰۷ء میں برطانوی امیر البحر ڈک ورتھ کی قیادت میں برطانیہ کا ایک بحری بیڑا زبردستی اس آبنائے کو عبور کر کے بحیرۂ مرمرہ میں گھس گیا تاکہ استنبول پر قبضہ کر لے۔ ترکوں نے اس علاقے کی حفاظت کا معقول انتظام کر رکھا تھا، اس لیے ڈک ورتھ اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چوں کہ آئندہ بھی اس طرح دراندازی گھس آنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس لیے حکومتِ ترکیہ نے غیر ملکی جنگی جہازوں کا داخلہ قطعی ممنوع قرار دے دیا۔ اس سلسلے کے فرمان ۱۸۴۱ء سے ۱۸۷۶ء تک ہر سال اطلاعِ عام کے لیے جاری ہوتے رہے لیکن ماہ فروری ۱۸۷۸ء میں ایک برطانوی بحری بیڑے کو ضرورتاً داخل ہونے کی اجازت مل گئی تاکہ استنبول کو روسیوں سے بچایا جا سکے، جن کی فوجیں بہت قریب آ چکی تھیں۔

۱۸۹۱ء میں روس اور ترکی کی حکومتوں کے مابین معاہدہ ہوا جس کی رُو سے روس کے تجارتی جہاز اس راستے سے گزر سکتے تھے اور جب پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو ترکی کو خاص حفاظتی اقدامات سے کام لینا پڑا۔ اس نے تمام بحیرۂ مرمرہ میں بارودی سُرنگیں بچھا دیں تاکہ کوئی غیر ملکی جہاز کسی وقت بھی وہاں تک نہ آ سکے، لیکن لفٹننٹ کمانڈر اسٹوکر کے زیرِ کمان ایک تحت البحر کشتی چپکے سے اندر چلی آئی اور سُرنگوں سے بچتی بچاتی اس جگہ پہنچ گئی جہاں ترکوں کا ایک بہت بڑا جنگی جہاز شلح زریں (گولڈن ہارن) میں لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ کشتی نے اسے نشانہ بنا کر ڈبو دیا۔ یہ اتنا بڑا حادثہ تھا کہ ترک انگریزوں سے سخت ناراض ہو گئے۔

داستانِ عشق: تاہم ان تاریخی اور سیاسی پہلوؤں سے قطع نظر علمی اور ادبی اعتبار سے بھی

اس علاقے کی ایک اہمیت ہے۔ یہاں کے کئی اچھے شاعر اور داستان نگار اب بھی مشہور ہیں۔ ہومر کا اس علاقے سے تعلق رہا ہے۔

منجملہ اور چیزوں کے یہاں کی ایک روایتی عشقیہ داستان ہے، جسے عہدِ عتیق سے آج تک مشہور شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے طرز اور رنگ میں قلم بند کیا ہے۔ اس پر طبع آزمائی کرنے والوں میں سے اووِد، موسیس، ورجل، مارلو، چیپ مین اور بائرن کے نام زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ بائرن تو اس داستان سے اس درجے متاثر ہوا کہ اسے منظوم کرنے سے قبل درۂ دانیال پہنچا اور خود تیر کر آبنائے کو عبور کیا تاکہ افسانے کے ہیرو کے جذبات کا کچھ اندازہ خود لگا سکے۔

مختصر الفاظ میں یہ داستان یوں بیان کی جاتی ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جبکہ اس علاقے میں انسانوں کے بجائے دیوتا حکومت کرتے تھے۔ آبنائے کے دونوں ساحلوں پر دو عظیم الشان بستیاں آباد تھیں، جن میں باہمی چشمک کے باعث کوئی میل جول نہیں تھا، بلکہ ایک لحاظ سے دشمنی تھی۔ ایشیائی ساحل کی جانب بستی کا نام عبیدوس اور دوسری جانب سیستوس تھا۔ اول الذکر بستی میں رہنے والا ایک منچلا نوجوان لیاندر، دوسری بستی کی ایک دوشیزہ ہیرو کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وہ جنسی عیش و نشاط کی دیوی افرودائتی کے مندر میں دیوداسی تھی۔ لیاندر نے اسے ایک مذہبی میلے کے موقع پر اچانک دیکھ لیا تھا۔ ایک یہی تقریب ایسی تھی، جبکہ دونوں بستیوں کے باشندے دیویوں اور دیوتاؤں کے نام پر یک جا جمع ہو کر کچھ دینی فرائض ادا کر لیا کرتے تھے۔ اس موقع کو مبارک جان کر بہت سے لوگ اپنے رشتے طے کر لیتے اور اگر فوراً شادی عمل میں نہ آ سکتی تو کم سے کم منگنی کی رسم ضرور ادا کر لی جاتی تھی لیکن ایک علاقے کی لڑکی دوسرے علاقے میں منسوب نہیں ہو سکتی تھی —— اور پھر ہیرو تو مندر کی دیوداسی تھی۔ اس کی شادی کا سوال کیسا۔ وہ کھلم کھلا دنیاوی زندگی میں کیسے قدم رکھ سکتی تھی۔ چوری چھپے وہ داد عیش دے دے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ نہ دیوی کو اعتراض ہوتا اور نہ مندر کا پروہت کوئی رخنہ ڈالتا۔ سب جانتے ہیں کہ زندگی گزارنے کے ڈھنگ مختلف ہوتے ہیں اور زندگی ہر رنگ میں بسر ہوتی ہی رہتی ہے اور پھر وہ ممانعت ہی کیا جس میں تھوڑی بہت اجازت کی گنجائش نہ ہو۔

لہٰذا باقاعدہ رشتہ قائم ہونے کا جب کوئی امکان نظر نہ آیا تو دیوتائے عشق کی بارگاہ میں سر جھکانے والی دونوں ہستیوں میں یہ طے ہو گیا کہ ہر روز لیاندر رات کی تاریکی چھا جانے کے بعد اپنی بستی کے ساحل سے چلے اور آبنائے کو عبور کر کے دوسرے ساحل پر آ جائے، جس سے

تھوڑے ہی فاصلے پر افرودائتی کا مندر تھا ــــ عین اس وقت ہیرو مندر کے بلند مینار سے ایک مشعل دکھایا کرتی تاکہ اس کا محبوب لہروں کے زور اور ماحول کی تاریکی میں گم ہو کر کسی اور طرف نہ بھٹک جائے۔

لیاندر کی بستی مٹی کے ظروف بنانے والوں کی وجہ سے مشہور تھی اور خود اس کے خاندان کا یہی مشغلہ تھا، اس لیے وہ روزانہ ایک عمدہ مٹکا سا تھ لاتا اور راستے میں مچھلیاں پکڑ کر اسے بھر لیتا تھا۔ دوسرے ساحل پر پہنچنے کے بعد وہ آگ جلاتا اور ہیرو مچھلیاں بھونتی۔ پھر وہ دونوں نمک مرچ لگا کر مزے سے کھاتے اور رات بھر عیش کرتے۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ لیکن بُرا ہو، فلکِ کج رفتار کا، ان کے لطف و نشاط کی یہ راتیں اسے اکھرنے لگیں۔ سچ کسی نے کہا ہے ؎

کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں   یہ دو دل کو یک جا بٹھاتا نہیں

ہوا یہ کہ سنگین مورت کے روپ میں جلوہ گر ہونے کے باوجود افرودائتی کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی کہ اس کے مندر کی ایک دیوداسی پوجا پاٹ سے منھ موڑ کر کسی مرد کے عشق میں بُری طرح گرفتار ہو گئی ہے اور ہر رات اپنے جسم کا لوچ اس پر بھینٹ چڑھا رہی ہے۔ سنگین اور بے حس ہونے کے باوجود دیوی کو جلال آ گیا۔ اس نے سمندری تباہی کے دیوتا کو اپنا کرشمہ دکھانے کی تاکید کی اور تُند ہواؤں کی دیوی کو حکم دیا کہ تو اپنی جوانی کا چُلبلاپن دکھانے کے لیے طوفانِ باد بن کر نکل آ۔ چناں چہ اسی رات مختصر سی آبنائے میں، جس کا طول پینتالیس میل، لیکن پاٹ تین چار میل اور ایک جگہ صرف سوا میل ہے، اتنا زبردست طوفان آیا کہ بڑے بڑے سمندر اس سے پناہ مانگنے لگے۔ نتیجہ ظاہر ہے، لیاندر تیز و تند موجوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بہت جلد اس کے اعضا شل ہو گئے اور وہ بے جان ہو کر لہروں کے رحم و کرم پر رہ گیا۔ ادھر ہیرو پر یہ بپتا پڑی کہ ہوا کے شدید جھونکوں سے اس کی مشعل بار بار بجھ گئی اور وہ اسے جلاتے جلاتے تھک گئی۔ اس کے مضطرب دل نے گواہی دی کہ آج محبت کی دنیا موجوں کے تھپیڑوں سے تباہ ہو گئی ہے۔

صبح کا اُجالا نمودار ہوا تو اس نے ساحل کے قریب محبوب کی نعش کو تیرتے دیکھا۔ وہ دوڑ کر گئی اور اپنے کپکپاتے بازوؤں میں اسے اٹھا لائی۔ مینار کے قریب لا کر زمین پر رکھا اور خود مینار پر چڑھ گئی۔ بجھی ہوئی شمع کو ہاتھ میں لے کر وہاں سے نیچے چھلانگ ماری۔ اپنے عاشق کے قریب تڑپ تڑپ کر جان دے دی، اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اس کے آغوش میں سو گئی۔

یہ داستان بڑی دردانگیز ہے اور دل و دماغ پر اثر کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ سرزمین پنجاب کی عشقیہ داستان "ہیر رانجھا" لکھنے والوں نے کہیں اپنے قصے کا پلاٹ یونانی ادبیات سے تو اخذ نہیں کیا۔ مقام اور وقت کی تبدیلی سے قصے کا تار و پود نئی زبان میں اکثر بدل جاتا ہے، صرف نفسِ مضمون باقی رہتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ زندہ دلانِ پنجاب نے ہیرو کو ہیر بنایا اور لیانڈر کا روپ رانجھا کو بخش دیا۔ دونوں قصوں کے بہت سے پہلو ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محض ادبی توارد کا کرشمہ ہو۔

ٹرائے: میں ان خیالات میں محو تھا اور ہمارا جہاز چنا قلعہ اور کلید بحر پر اپنا سایہ ڈالتا جنوب مغرب کی جانب کوئی بیس میل آگے نکل چکا تھا۔ نیچے ٹرائے کے کھنڈر تھے، جن پر پڑے ہوئے پردوں کو ماہرین اثریات نے انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں الگ ہٹا کر بہت سے رموز کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے تک اس سرزمین پر، جسے جغرافیہ و تاریخ کے صفحات میں ٹرائے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، دہلی کی طرح وقت اور مقام کے تغیر اور فرق کے ساتھ نو بار مختلف قوموں کے شہر آباد ہوئے ہیں۔

سب سے پہلی بستی ۳۰۰۰ سے ۲۶۰۰ قبل مسیح تک قائم رہی۔ گویا اس کی عمر چار سو سال تھی۔ اس کے بعد نئی بستیاں یکے بعد دیگرے تین سو، ایک سو، دو بار ڈیڑھ ڈیڑھ سو، چھے سو، چار سو، ساڑھے پانچ سو اور ساڑھے سات سو سال سے قائم ہیں اور اس طرح یہ سارا کھیل سنہ ۴۰۰ عیسوی میں ختم ہو گیا۔ ان میں سے ہر ایک دور کے ثقافتی نقوش لوحِ زمین پر کسی نہ کسی صورت میں محفوظ ہیں۔ بظاہر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن ماہرینِ اثریات کے نزدیک ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان انکشافات نے تاریخ کے بہت سے مسلّمہ حقائق کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ کاش! ان کھنڈروں کے درمیان دو چار دن گزارنے اور راتیں بسر کرنے کا موقع مل جاتا۔ موجودہ آبادی ان تمام شکستہ آثار سے تھوڑی دور ہے۔

ایفی سس کی جانب: دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ جہاز ازمیر کے ہوائی اڈے پر اترا۔ پانچ منٹ بعد ہم عمارت سے باہر تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ ہم فوراً ٹیکسی لے کر ایفی سس روانہ ہو جائیں۔ ڈھائی تین گھنٹے میں وہاں کی سیر کر کے واپس آئیں، کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں اور اسی ٹیکسی کے ذریعے ازمیر کے تمام مقامات اور شہر کے اہم علاقے دیکھ کر سورج چھپنے کے قریب صنعتی میلے میں جائیں۔ ڈھائی تین گھنٹے وہاں صرف کر کے ہوائی اڈے پر واپس آئیں اور جہاز

میں بیٹھ کر اطمینان سے استنبول پہنچ جائیں۔

اپنے تجربے کی بنا پر ہم نے سوچا کہ اگر ہوائی اڈے کے قریب ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لی یا ڈرائیور پر یہ ظاہر کر دیا کہ ہم پہلی دفعہ اس علاقے میں آئے ہیں تو وہ میٹر کے حساب سے چلنے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور زیادہ کرایہ مانگے گا۔ یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور زیادہ تر یونانی النسل ہیں اور ان میں مُروت نام کو نہیں ہے، لہٰذا ان کے ساتھ سیاست برتی جائے۔

کوئی رختِ سفر ہمارے پاس نہیں تھا، اس لیے بازار میں ہمیں دیکھ کر یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم اس علاقے کی سیاحت کے لیے ابھی آئے ہیں، لہٰذا پیدل چل پڑے اور جب دو ہی منٹ بعد ایک خالی ٹیکسی سامنے سے گزری، اشارے سے اسے روک لیا اور انگریزی زبان میں بات چیت شروع کر دی، جسے وہ اچھی طرح نہیں تو ضرورت کے مطابق سمجھ سکتا تھا۔

بہرحال ہم ٹیکسی میں سوار ہوئے اور افی سس کی طرف چل پڑے جو جنوبی سمت میں شہر سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

راستہ نہایت ہی پُرفضا اور خوشگوار تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی سرسبز و شاداب اونچی۔نیچی پہاڑیوں کے بیچ بیچ میں تارکول کی پکی کالی سڑک اس طرح بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی جیسے کوئی سیاہ ناگ ہری گھاس کے قطعہ کو اپنی گزرگاہ بنا کر چل رہا ہو۔ کہیں کہیں دو دو تین تین فرلانگ تک سڑک بالکل سیدھی اور صاف آجاتی اور قریب کی پہاڑیاں اپنا دامن کشادہ کر کے ذرا پرے ہٹ جاتیں۔ دونوں طرف کھیت تھے اور کھیتوں میں بسنے والے قدیم تہذیب کے حامل ہونے کے باوجود بعض نئے انداز بھی اختیار کیے ہوئے تھے۔

کھیتوں میں کیا چیز اُگ رہی تھی؟ بھاگتی ہوئی گاڑی میں سے یہ تو ہم نہ دیکھ سکے۔ زیادہ تر گیہوں کے کھیت معلوم ہوتے تھے۔ کہیں کہیں انجیر اور زیتون کے درختوں کے جھنڈ بھی نظر آئے اور اس کثرت سے کہ جب سلسلہ شروع ہوتا تو ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔ یہ دونوں چیزیں اس علاقے کی بہت بڑی پیداوار ہیں اور ملک کی بہت بڑی غذائی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ غیر ملکی زرِ مبادلہ کمانے کے لیے نعمت ہیں۔

بے لیوی میں: بہت دور چلنے کے بعد یعنی جبکہ منزلِ مقصود کوئی سات آٹھ میل پرے رہ گئی تھی، ڈرائیور نے گاڑی روک لی اور بھائی جان محترم کو بتایا کہ یہاں بھی دو ایک چیزیں قابلِ دید ہیں۔ کہنے کو کہہ لیجیے، ورنہ کچھ ایسی زیادہ قابلِ دید بھی نہیں تھیں، کیوں کہ ان کا صحیح

اتہ پتہ وہاں رہنے والوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ہر ایک بیان مختلف، بلکہ متضاد تھا۔

قدیم زمانے کا ایک مینار دیکھا، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں سے لٹیروں پر نگاہ رکھی جاتی تھی۔ ممکن ہے کہ مطلب حملہ آوروں سے ہو، جیسا کہ جغرافیائی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ سمندر آٹھ دس بلکہ پندرہ میل پرے ہٹ گیا اور پانی کی جگہ خشکی نے لے لی ہے یا اس کے برعکس خشکی کا کچھ حصہ زیرِ آب ہوگیا۔ جہاں انسان رہتے تھے، اب مچھلیاں تیرتی ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو بحری حملے سے چوکنا رہنے کے لیے اس مینار سے چوکسی ہوتی ہوگی۔

مینار کے قریب ایک مقبرہ بھی ہے، لیکن اس میں کون دفن ہے، روزِ قیامت کو پتہ لگے تو لگے، اس سے پہلے ممکن نہیں۔ در و دیوار کے نقش و نگار سے کچھ کچھ یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ وہ سلجوقی عہد کا ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس ایک مقبرے کے علاوہ کوئی اور عمارت اس کے آس پاس کیوں نہیں ہے۔ جو مر کر دفن ہوا ہے، وہ کسی عمارت میں رہتا بھی ہوگا۔ اگر صحیح و سالم نہیں تو کھنڈر کی صورت میں اسے موجود ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مینار کی چوٹی سے لٹیروں، یا حملہ آوروں پر نگاہ رکھنے والا اس مقبرے میں دفن ہے، کیوں کہ ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ اہتمام ممکن نہیں تھا۔

یہ دونوں یادگار عمارتیں بیلیوی نام کے ایک گاؤں میں ہیں جو کوزبینار ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک دریا ——— کوچک مینڈریز ——— بہتا ہے، جسے کسی زمانے میں دریائے کیسٹر کہتے تھے۔

اس مقام پر کچھ دیر ٹھیرنے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ٹانگیں، جو گھنٹہ بھر تک ایک ہی پوزیشن میں رہی تھیں، ذرا چلنے پھرنے سے کھل گئیں اور ہم تازہ دم محسوس کرنے لگے۔

سلجوق میں:- گاڑی چلی اور کوئی پانچ منٹ بعد ہم سلجوق پہنچ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ سلجوقی قبیلے ہی کے ایک شاہی خاندان نے اسے آباد کیا تھا۔ لیکن چوں کہ بازنطینی عہد کی بہت سی عمارتیں بھی وہاں موجود ہیں، اس لیے یہ کہنا آسان ہے کہ یہ بستی نئی نہیں، بہت قدیم ہے۔ ایفی سس کے کھنڈر وہاں سے صرف ڈو میل دور ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ کسی زمانے میں ایک ہی ہوں گے۔

سلجوقی عہد کی کئی مسجدیں یہاں اب تک برقرار ہیں۔ ان میں سے عیسےٰ بے کی مسجد خاص طور پر عمدہ ہے۔ اگرچہ اس کا طول ۱۸۰ فیٹ اور عرض ۱۶۷ فیٹ ہے۔ لیکن فنِ تعمیر کے اعتبار سے اس میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس جیسی عمارتیں قونیہ، انقرہ یا استنبول میں بھی نظر نہیں آئیں۔

یہ مسجد سنہ ۱۳۷۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں کا ایک قبیلہ ایدن اوغلاری اس علاقے میں برسرِ اقتدار تھا اور عیسے بے اس قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔ مسجد کے صحن میں لگا ہوا فوارہ کبھی اپنی بہار دکھاتا ہوگا۔ اب تو سر بُریدہ ہو جانے کے باعث بالکل خاموش ہے۔ بازنطینی عہد کی شہر پناہ کے کھنڈر بھی موجود ہیں جو اس کی مضبوطی اور وسعت کا پتہ دیتے ہیں۔

ان سب سے قطع نظر ایک قدیم عمارت کے کھنڈرات تاریخی اعتبار سے بہت زیادہ جاذبِ توجہ ہیں کیونکہ ڈیانا دیوی کا مندر عہدِ عتیق کے ہفت عجائباتِ عالم میں شمار کیا گیا ہے۔ یونان کی یہی وہ دیوی ہے جسے ایشیائے کوچک والے اپنی زبان میں سائیبل کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسی کو آرٹمس کا نام بھی دیا گیا۔ یہ مندر اپنے بنانے والوں کے عہدِ عروج میں اپنی نظیر آپ تھا۔

زمانے کی فراموش کاریوں نے اس پر تہہ بہ تہہ خاک ڈال کر بالکل دفن کر دیا اور اس طرح ایک وقت آیا کہ وہ دُنیا والوں کی نگاہ سے بالکل اوجھل ہو گیا، لیکن اس کی حقیقت افسانوی رنگ بن کر لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو گئی اور اس کے قصّے زبان زدِ خلائق ہو گئے۔ محققینِ اثریات نے کچھ تو یہ روایات سُنیں اور کچھ اس کا حال قدیم نوشتوں میں پڑھا اور کمرِ ہمت باندھ کر جنگل بیابان کا کونہ کونہ چھاننے لگے۔ ان لوگوں کے نزدیک صحرا کے ذرّے ذرّے پر ذکرِ کائنات درج ہوتا ہے۔ بہت کچھ چھان بین کے بعد ایک مقام پر انھوں نے کیلی گاڑ دی کہ ڈیانا کا مندر اگر دنیا میں کبھی موجود تھا تو اسی جگہ ہوگا۔ ۱۸۶۳ء میں کھُدائی شروع ہوئی۔ ۱۸۷۱ء میں وافر ثبوت مل گیا کہ گوہرِ مقصود یہیں ۲۰ فیٹ کی گہرائی میں دفن ہے۔ یہ کام ایک برطانوی انجینئر جے۔ ٹی۔ وُڈ نے شروع کیا تھا، مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر خود تحت الثریٰ میں ڈیانا کے قریب پہنچ گیا۔ خاک کی جو تہیں بڑی محنت سے ہٹائی گئی تھیں، دوبارہ جمنے لگیں۔ پھر برٹش میوزیم کے منتظمین کو خیال آیا اور انھوں نے ڈی سی ہوگارتھ کو متعین کر کے از سرِ نو یہ کام شروع کیا اور ہر چیز برآمد کر لی گئی۔ عمارت کے در و دیوار اور سقف و بام کے علاوہ بہت سے نوادر بھی برآمد ہوئے جن سے اس زمانے کی ثقافتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ کچھ نوادر برطانوی عجائب گھر میں چلے گئے، اور کچھ استنبول پہنچا دیے گئے۔ آس پاس کی سطح اونچی ہو جانے کے باعث اب یہ مندر ایک بہت لمبے چوڑے گڑھے کے اندر دھنسا ہوا نظر آتا ہے۔ مقامی باشندے عام طور پر اسے "انگلیز چوکورو" یعنی "انگریز کا گڑھا" کہتے ہیں۔

ماہرینِ اثریات کی رائے ہے کہ اسے سب سے پہلے ایمیزون نامی قوم کے افراد نے تعمیر کیا تھا۔

مشہور مورخ پلینی کہتا ہے کہ یہ عبادت گاہ سات بار تباہ و برباد ہوئی۔ اور جب پرانی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر ہوئی تو اس کی شان ہمیشہ دوبالا ہوگئی۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں جب سمیریوں نے اسے بالکل منہدم کر دیا تو کافی زمانہ گزرنے کے بعد لائیڈیا کے فرمانروا قارون بادشاہ کی مدد سے اسے مکرر تعمیر کیا گیا۔ اس وقت کثیر دولت کے مالک نے زر و جواہر سے اس کے بام و در کی جس طرح تزئین کی وہ یقیناً حیران کر دینے والی تھی۔ پھر ۳۵۶ قبل مسیح میں اسکندرِ اعظم کی عین پیدائش کے دن اس میں آگ لگ گئی جو ایک فاترالعقل انسان ہیروسٹراطس نے لگائی تھی۔ چونکہ ان دنوں آگ بجھانے کی سہولتیں تقریباً ناپید تھیں اور اس کا سامانِ آرائش آتشیں شعلوں سے جلد بھڑک جانے والا تھا، اس لیے آگ پر قابو پانا غیر ممکن ہو گیا، حتیٰ کہ ہر چیز جل جلا کر خاک ہو گئی۔

ایک اور طویل مدت گزرنے کے بعد پھر اس کی تعمیر عمل میں آئی، لیکن زمانے کی دست بُرد نے اسے بھی سلامت نہ رکھا۔ تعجب یہ ہے کہ ہر بنانے والے نے پرانی بنیادوں ہی سے کام لیا، تاکہ نقشہ بڑی حد تک یکساں ہے۔ اس عمارت کا طول ۳۷۰ فیٹ ۶ انچ، عرض ۱۷۳ فیٹ اور بلندی ۲۷ فیٹ تھی۔ اس کے چاروں طرف آئیونیا کے طرزِ تعمیر کے مطابق بلند ستون کھڑے کیے گئے تھے۔

آخری بار تعمیر ہونے کے پانچ سو سال بعد ۲۶۲ء میں گوتھ قبیلے کے تخریب پسند لوگوں نے اسے اس طرح برباد کیا کہ پھر کسی نے تعمیر کرنے کی ہمت نہ کی۔ دنیا بھر کے بت پرست ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اس دیوی کے مندر میں یاترا کے لیے آئے تھے کیوں کہ اس دیوی کی حیثیت کچھ بین الاقوامی ہو گئی تھی۔

افی سس کے آثارِ قدیمہ کا عجائب گھر سلجوق میں ہے، جو ۱۹۲۹ء میں قائم ہوا تھا۔ جب ہم پہنچے تو بند تھا، چوں کہ سیاح اس علاقے میں کم آتے ہیں، اس لیے منتظم صاحب مزے کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کی رہائش زیادہ دور نہیں ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے، کسی شخص کو بھیج کر بلا لیا جاتا ہے۔ چونکہ ہمیں زیادہ فرصت نہیں تھی اور افی سس اور ازمیر کی تاریخی عمارتیں دیکھنے میں بھی کافی وقت گزر جانے کا احتمال تھا، اس لیے منتظم صاحب کو زحمت نہیں دی گئی۔

افی سس کے کھنڈروں میں: ٹیکسی پھر چلی اور ہم بہت جلد افی سس کے کھنڈروں میں پہنچ گئے۔ یہ کھنڈر بھی پہلی جنگِ عظیم سے قبل اور اس کے بعد طویل کھدائیوں کے نتیجے میں برآمد ہوئے ہیں اور آسٹریا کے ماہرینِ اثریات کے سر ان کی نقاب کشائی کا سہرا ہے۔

عہدِ قدیم کے جغرافیے کا جائزہ لینے والوں کا کہنا ہے کہ افی سس ایشیائے کوچک کے بارہ آیونی شہروں میں سے ایک تھا اور اس وسیع علاقے میں واقع تھا، جسے لائیڈیا کہتے تھے۔ اس کے نام کی وجہ تسمیہ کا کسی کو پتہ نہیں اور اس سے پہلے کا حال بھی کسی کو معلوم نہیں۔ حالاں کہ گیارہ سو سال قبل مسیح میں جب اہلِ آیونیا نے اس سرزمین پر قدم رکھا، تب بھی یہاں لوگ آباد تھے اور ان کی بستیوں کے نشانات اب بھی ان کی مدنی زندگی کا پتہ دیتے ہیں۔

اہلِ آیونیا نے ان مقامی باشندوں سے ذرا ہٹ کر پانا یرداغی نامی پہاڑی کے دامن میں (جو یونانی زبانوں میں پیون کہلاتی ہے) اپنے ڈیرے ڈالے اور وہیں کے ہو کر رہنے لگے۔ اس شہر میں پرستش کی جانے والی دیوی کا نام آرٹمس تھا، جو نو واردوں کے دیوتاؤں کی ماں کے ہم پلہ تھی۔ اس لیے عقائد کے اعتبار سے چنداں فرق محسوس نہیں ہوا۔ انھوں نے علیحدہ نظامِ حکومت قائم کر کے اپنی انفرادیت کا سکہ جمالیا۔

چھٹی صدی عیسوی میں افی سس کے لوگوں نے لائیڈیا کے فرمانروا قارون کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ کچھ عرصے بعد ایران کے بادشاہ خسرو نے اس طرف رخ کیا اور چند دن کے محاصرے کے بعد اسے فتح کرلیا۔ کوئی سو سال بعد اس غیر حکومت کے خلاف بغاوت بھی ہوئی لیکن اصل باشندے اخلاقی اعتبار سے اتنے پست ہو گئے تھے کہ وہ جہادِ آزادی میں اُبھر نہ سکے۔ ایرانی پرچم بدستور لہراتا رہا۔

۳۳۴ قبل مسیح میں مقدونیہ کے اسکندرِ اعظم کا لشکرِ جرار، جو ساری دنیا کو فتح کرنے کی نیت سے چل کھڑا ہوا تھا، اس مقام پر پہنچا اور شخصی جمہوریت کا نظام قائم کر کے اور اپنا نائب السلطنت مقرر کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس کی وفات کے بعد لائی سی ماخس خود فرمانروا بن بیٹھا۔ اس نے ایک اور نیا شہر پانا یرداغی اور بلبل داغی نام کی دو پہاڑیوں کے درمیان وادی میں آباد کیا کیوں کہ پرانا شہر ایک ایسے سست رفتار دریا کے کنارے واقع تھا جس کا طاس دلدلی حالت پیدا کرنے کے باعث اکثر بہت سی بیماریوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔

زمانے نے ایک اور کروٹ لی اور شام کا بادشاہ ذرا قدم بڑھا کر اس علاقے پر قابض ہو گیا۔ لیکن جب اس کے خاندان کا ایک نام لیوا انطاکِ اعظم سریر آرائے سلطنت تھا، رومیوں نے یلغار کی اور بادشاہ کو مار بھگایا لیکن چوں کہ اتنے دور دراز علاقے پر نظم و نسق قائم رکھنے کی سکت ان میں نہیں تھی، اس لیے یہ محروسہ علاقہ نزدیک کے ایک اور فرمانروا پرگامم کے بادشاہ یومے نیز کو

بخش دیا کہ تم اپنی قلمرو کی حدیں اس حد تک وسیع کر لو اور وقت پڑے تو ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ تاہم اس دامن کشی کے باوصف عام طور پر اسے روما کا ایشیائی صوبہ کہا جانے لگا۔

اس زمانے میں ایفی سس ایک بڑا تجارتی مرکز بن چکا تھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ایفی سس، سمرنا اور پرگامم میں سے کس کو ایشیائے کوچک کا بہترین شہر کہا جائے، کیوں کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی خاطر برابر آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور یہی ان کے زیادہ عروج کا راز تھا۔

نصرانی مذہب کا ابتدائی دور تھا کہ سنٹ پال ایفی سس آئے اور تین سال مقیم رہے۔ اسی مقام پر انھوں نے سب سے پہلی عیسائی جماعت کی تشکیل کی اور اپنے عقائد کو فروغ دینا شروع کیا۔ عیسائیوں کے ایک اور ولی سنٹ جون بھی اس شہر میں آئے اور کچھ فاصلے پر سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے اپنا صحیفہ وہیں رہ کر لکھا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت مریم ان کے ساتھ تھیں اور ان کے چلے جانے کے بعد وہیں مقیم رہیں۔ حتیٰ کہ فوت ہو کر اسی سرزمین میں دفن ہو گئیں۔ عقیدت مندوں نے ان کی تربت پر ایک مقبرہ تعمیر کر دیا جو ڈیانا کے مندر کی طرح اِمتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مٹی میں دب گیا تھا۔ حال ہی میں اسے بھی برآمد کیا گیا ہے۔

نصرانیت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ایفی سس کے پجاریوں اور دوسرے پیشہ وروں میں بے چینی کی ایک لہر سی پھیل گئی اور انھوں نے جم کر اس کے مقابلے کا تہیّہ کر لیا۔ یہ مخالفت صرف مذہبی اعتبار سے نہیں تھی، بلکہ اپنی اقتصادی اور معاشی تباہی کا بھی انھیں احساس تھا۔ انھیں ڈیانا کے مندر کی زیارت کرنے والوں سے جو زبردست آمدنی ہوتی تھی، وہ آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس جہاد میں وہ بت ساز بھی شامل تھے، جو ڈیانا کی طلائی، نقرئی، چوبی اور سنگین مورتیاں اور چڑھاوے کی دوسری اشیا تیار کرتے اور اچھے داموں بیچتے تھے۔

سنہ ۲۶۲ عیسوی میں ایفی سس خصوصاً آرٹمس کے مندر کو گوتھ قبیلے کے جنگجو لوگوں نے اس طرح تباہ و برباد کر دیا کہ پہلی سی شان پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ آرٹمس کے مندر کی تباہی کے ساتھ ساتھ بت پرستی کا رنگ بھی پھیکا پڑنے لگا اور نصرانیت کو فروغ پانے کا موقع مل گیا۔

عیسائیوں نے اپنی عبادت اور مذہب کی تبلیغ کے لیے جو کلیسا دوسری صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا، اس مسلک کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ چناں چہ جب حضرت مریم کے نام پر بنے ہوئے عظیم الشان کلیسا میں تیسری جنرل کونسل کا اجلاس ۴۳۱ عیسوی میں منعقد ہوا تو دو سو

پادری اس میں شریک ہوئے جو دور دراز علاقوں سے چل کر آئے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر تین اہم فیصلے کیے، جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کنواری مریم کو خدا کے بیٹے کی ماں تسلیم کیا جائے، ورنہ اس سے پہلے یہ مسئلہ متنازعہ فیہ تھا۔ بہت سے عیسائی حضرت مریم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اس فیصلے کے باوجود جب کئی صدیاں گزر گئیں اور حضرت مریم کا مقبرہ زمین میں دب دبا کر اپنے نشانات کھو بیٹھا تو بہت سے لوگ اس کے وجود ہی سے مُنکر ہو گئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ حضرت مریم کا انتقال یروشلم میں ہوا تھا اور وہیں دفن کی گئی تھیں۔ لیکن ماہرینِ اثریات اس دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آخر جب ان کی لگاتار کوششوں سے اس مقبرے کا سُراغ مل گیا اور کھدائی کے بعد برآمد ہو گیا تو پاپائے اعظم کو بھی اس کے حق میں فیصلہ کرنا پڑا۔ ان کی مہرِ توثیق لگتے ہی یہ جگہ ایک بار پھر عیسائیوں کا کعبہ بن گئی ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے زائرین آنے لگے ہیں۔ سب سے بڑی تقریب ہر سال ۱۵ اگست کو ہوتی ہے یعنی ہمارے وہاں پہنچنے سے نصف ماہ پہلے یہ تہوار ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے خود بھی حضرتِ مریم کا مقبرہ دیکھا جو بہت ہی سیدھی سادی وضع کا ہے سطحِ سمندر سے ۱۳۷۷ فیٹ بلند ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ مزار کے علاوہ خود ان کا ایک نہایت قدیم قدِ آدم مجسّمہ بھی نصب ہے جس میں انھیں انتہائی استغراق و محویت کے عالم میں کھڑا ہوا دکھایا گیا ہے۔ چہرے پر حد درجہ معصومیت کی جھلک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ طلسمِ خاموشی کو توڑ کر ابھی بول پڑیں گی۔

اس مقبرے کے قریب ہی پہاڑ کی ایک کھوہ ہے، جسے سات سونے والوں کا غار کہا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ ۲۵۰ عیسوی میں جب کہ ڈے سی اَس اس علاقے کا فرمانروا تھا اور جو نصرانیت کا سخت دشمن تھا، سات نوجوان عیسائی اس سے ڈر کر بھاگے اور اپنے ایک کتّے سمیت اس غار میں آکر چھپ گئے۔ خدا کی قدرت نے یہ کرشمہ دکھایا کہ غار کو خود بخود تیغہ سا لگ گیا اور یہ لوگ دو سو سال تک اس کے اندر پڑے سوتے رہے۔ جب بیدار ہو کر باہر آئے تو زمانے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ اس وقت تھیوڈوسیس دوم کی عملداری تھی اور عیسائیوں پر کسی قسم کا جبر و تشدد نہ ہوتا تھا، بلکہ وہی سرکاری مذہب تھا۔ ان لوگوں نے بازار میں اپنے پرانے سکّے دے کر کچھ اشیائے خورونوش خریدنی چاہیں تو لوگ حیران رہ گئے۔ وہ سکّے انھوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ کوئی دفینہ ان لوگوں کو مل گیا ہے۔ انھیں گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا لیکن اس نے تمام ماجرا سُن کر انھیں

معاف کر دیا اور جب حُسنِ اتفاق سے وہ ساتوں ایک ہی دن میں فوت ہوئے تو ان کو اسی غار میں دفن کرا کے وہاں ایک مقبرہ تعمیر کروا دیا۔ غار کے آس پاس کسی عمارت کے نشانات تو موجود نہیں ہیں البتہ غار کے اندر قبروں کی علامات پائی جاتی ہیں اور مقبرۂ مریم کی زیارت کرنے والے ایک نگاہ یہاں بھی ضرور ڈال لیتے ہیں۔

اس علاقے میں قدیم زمانے کے کھنڈروں اور عہدِ سلجوقی کی نئی عمارتوں کو گنا جائے تو ان سب کی تعداد تین درجن کے لگ بھگ ہوگی۔ ان میں سے بعض کا اتہ پتہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو بھی نہیں ہے۔ صرف قیاسات کی بنیاد پر تھوڑا بہت ذکر خیر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ان میں سے محض چند عمارتوں کے نقوش ہمارے ذہن میں باقی رہ گئے اور باقی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ "کھنڈرات بتا رہے ہیں، عمارت عظیم تھی" —— یہ بات شہنشاہ کلاڈیس کے بنائے ہوئے ناٹک گھر پر صادق آتی ہے۔ بالکل تباہ حال ہونے کے باوجود اس کی عظمت دیکھنے والوں پر اثر کرتی ہے۔ اس شہنشاہ کا عہد ۴۱ عیسوی یا ۵۴ عیسوی بیان کیا جاتا ہے۔ ناٹک گھر کی تکمیل اس کی زندگی میں نہ ہو سکی۔ یہ فرض شہنشاہ ٹراجان نے پورا کیا، جو ۹۸ عیسوی سے ۱۱۷ عیسوی تک عنانِ حکومت سنبھالے رہا۔ ناٹک گھر کا اسٹیج سہ منزلہ تھا۔ دوسری منزل پہلی سے ذرا پرے ہٹا کر اور تیسری دوسری سے ذرا اور پرے ہٹا کر بنائی گئی تھی۔ اس اسٹیج کے آگے تماش بینوں کی نشست کا ہال اتنا وسیع تھا کہ اس میں بیک وقت ساڑھے چوبیس ہزار انسان اطمینان سے بیٹھ سکتے تھے۔ زینے کی مانند اوپر چڑھتی ہوئی سیڑھیوں کی طرح تین جانب گولائی میں ۶۶ قطاریں بنتی تھیں جن کو بیچ میں سے کاٹتے ہوئے دو راستے تھے تاکہ آنے جانے والوں کے لیے دقت نہ ہو۔ اسٹیج سے ۹۸ فیٹ کی بلندی پر دائیں بائیں اور سامنے گیلری تھی جو غالباً اونچے درجے کے شرفا کے لیے مخصوص ہوگی۔ اسٹیج اور ہال کی دیواروں میں خاص ترتیب کے ساتھ چھوٹے چھوٹے نشیب پیدا کیے گئے تھے جو مکبر الصوت کا کام دیتے ہوں گے۔ جیسا کہ یونان و روما کی بعض عمارتوں میں بھی اس بات کا التزام رکھا جاتا تھا کہ اس طرح مقرر کی آواز گونجے اور ہزاروں کے مجمع میں صاف سُنائی دے سکے۔ عہدِ عتیق کے خطیبِ اعظم سولون کی آواز سننے کے لیے دس ہزار تک کا مجمع لگ جاتا تھا۔

ناٹک گھر سے کچھ فاصلے پر ایک اسٹیڈیم کے آثار بھی پائے جاتے ہیں جو روم کے شہنشاہ نیروئے اعظم نے اپنے دورانِ حکومت میں (۵۴ تا ۶۸ عیسوی) تعمیر کرایا تھا۔ اس میں کھیلوں

کے مقابلے، رتھوں اور گھوڑوں کی دوڑ اور خونخوار جانوروں سے انسانوں کی کشتی ہوتی تھی۔ معتوب لوگوں کو سزا دینے کے لیے انھیں بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیا جاتا اور بقائے حیات کی اُمیدِ موہوم میں سعی و کاوش کرنے والوں کی پریشانی سے لطف اندوز ہوا جاتا تھا۔ اس کا طول ۷۵۲ فیٹ اور عرض ۹۸ فیٹ تھا۔ تماش بینوں کی نشست گاہ بالکل ایک جانب تھی اور باقی حصّہ میدان کی صورت میں تھا، جسے اونچی دیواروں سے محصور کر رکھا تھا۔ نشست گاہ کے بالکل مقابل شیروں، جنگلی بھینسوں اور دوسرے جانوروں کی کوٹھڑیاں تھیں۔

اس کھیل کود اور ناچ رنگ کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی چرچا بھی رہتا تھا۔ چناں چہ سیلسس کے کتب خانے کی عمارت ابھی تک موجود ہے۔ اسے جولیس ایکوئیلا نے ۱۳۵ء میں اپنے باپ جولیس سیلسس کے اعزاز میں تعمیر کرایا تھا، جو روم کے ایشیائی صوبے کا حاکم (گورنر) تھا۔ کتابوں کے لیے الماریاں دیواروں میں خلا پیدا کر کے بنائی گئی تھیں۔ ان الماریوں کی وسعت اور تعداد سے کتابوں کی تعداد کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ اتنے قدیم زمانے کا وہ کتب خانہ حقیقتاً ایک نعمتِ بے بہا ہوگا اور نہ جانے کن کن اعلیٰ ہستیوں نے وہاں بیٹھ کر اکتسابِ علم کیا ہوگا۔ کتب خانے کے صدر دروازے کی دونوں دیواروں پر لاطینی اور یونانی زبانوں میں سیلسس کی علم دوستی اور خود اس کی علمی اور ادبی استعداد کا حال کندہ ہے۔ لائبریری کے قریب ہی ایک وسیع ہال ہے جس میں علما و فضلا جمع ہوتے اور علمی موضوعات پر تبادلِ خیالات اور مباحثہ کرتے ہوں گے۔ کتب خانے کی پشت پر سیلسس کا مقبرہ ہے جس میں سنگِ مرمر کا تابوت اب بھی موجود ہے۔ عمارت کی رد کار سے جو ابھی تک قائم ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ عمارت کی چھت ساڑھے باون فیٹ بلند ہوگی۔

اس حصّہ زمین کے اور شہروں کی طرح قدیم ایفی سس کے گرد بھی دس فیٹ موٹی اور تقریباً چار میل لمبی فصیل بنی ہوئی تھی، جسے یونانی عہد کے ایک فرماں روا لائی سی ماخس کو، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، تعمیر کرنے کا فخر حاصل تھا۔ اس شہر پناہ کے ہر دو دو فرلانگ پر ایک بڑا گنبد بنایا گیا تھا، تاکہ شہر کی نگہبانی کرنے والے اسے اپنی قیام گاہ بنا کر رہیں۔ انھی میں سے ایک گنبد کو جو مغربی سرے پر واقع تھا، سنٹ پال کے لیے بطورِ قید خانہ استعمال کیا گیا۔ فصیل کا کچھ حصّہ بازنطینی عہد میں بھی تعمیر اور مکرّر تعمیر ہوا تھا۔ اب تو کہیں کہیں اس کے شکستہ آثار نظر آتے ہیں۔

کسی زمانے میں یہاں گرم پانی کے چشموں کی افراط تھی، اس لیے جگہ جگہ سرکاری حمام تعمیر کیے گئے تھے، تاکہ عوام اپنے گھروں کے بجائے ان میں نہایا کریں، جہاں صحت و تن درستی قائم رکھنے کی اور بھی

آسانیاں فراہم کی گئی تھیں۔ زمانے کی سرد مہری نے ان گرم چشموں کو ٹھنڈا کر دیا اور ان کو استعمال کرنے والے نہ رہے تو حماموں کے در و دیوار بھی ٹوٹ کر بنیادوں سے نیچے گر پڑے۔ اب تو ان کے بجائے پتھروں کے انبار نظر آتے ہیں، جن میں آئے دن کمی ہوتی رہتی ہے، کیوں کہ آس پاس کے مکان انھی ٹکڑوں سے تعمیر ہو رہے ہیں۔

اور بھی بہت سی تاریخی عمارتوں خصوصاً عبادت گاہوں کے کھنڈر سطح ارض پر موجود ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض خاک اور مٹی سے اَٹ کر دیانا کے مندر اور حضرت مریم کے مقبرے کی طرح زمین میں پوشیدہ ہو گئے ہوں اور ماہرین اثریات کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ ہوں۔

بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ اس لیے مناسب سمجھا کہ اب اِزمیر لوٹ جانا چاہیے، تاکہ باقی پروگرام پر کوئی اثر نہ پڑے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ذمہ لیا تھا کہ وہ ایک گھنٹے سے بھی کچھ کم مدت میں ہمیں واپس لے جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ واقعی ہم اس کی تیز رفتاری کے قائل ہو گئے۔

اِزمیر میں:- ڈرائیور نے ہمارے اندازے سے بہت کم صرف پینتیس روپے کے مساوی رقم مانگی ہمارا خیال تھا کہ آنے جانے کا خرچ ساٹھ روپے سے کسی طرح کم نہیں ہوگا۔ اب اسی گاڑی میں شہر کے دوسرے تاریخی مقامات کی سیر کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

انگور، انجیر اور زیتون کے باغوں کی سرزمین کو، جالینوس جیسے شہرۂ آفاق طبیب کے مولد و مسکن کو اور ہومر جیسے بے مثل شاعر کے وطنِ مالوف کو آج تیس چالیس سال پہلے کے نوشتوں میں سمرنا کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ معرکہ سمرنا بھی تاریخ میں مشہور ہے۔ قیام جمہوریت کے بعد سے اربابِ حل و عقد نے اسی شہر کا نام بدل کر ازمیر کر دیا ہے۔ ازمیر کے لفظی معنے "میر کی چوکھٹ" ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ بستی بہت ہی پرانے زمانے میں ایک "مردمار عورت" کی وجہ سے مشہور تھی، جس کا نام سمرنا تھا۔ وہ ایک عرصے تک اس علاقے میں مختارِ کُل اور مُطلق العنان رہی تھی۔ اس کی ایک بہن مرنیا تھی، جس کے نام سے ضلع ایفی سس کی ایک بستی منسوب کی جاتی تھی۔ تاریخ میں جو مقام "تاج سمرنا" کہلاتا ہے، وہ بھی اسی بستی کا پہاڑی حصہ تھا۔ پہاڑی کے چاروں طرف قطاروں کی صورت میں عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں اور بالکل چوٹی پر ایک مندر بنا ہوا تھا۔ چناں چہ دُور سے دیکھنے پر یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی دیو ہیکل فرمانروا نے اپنا تاج اُتار کر زمین پر رکھ دیا ہے۔ مکانات کی قطاریں تاج کی آرائش کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔

آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے یعنی تین ہزار قبل مسیح میں اس شہر کی داغ بیل بیلاگی کے

قریب تے پے کیوں کے علاقے میں ڈالی گئی تھی۔ اس وقت یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ قلیل تعداد میں مکانوں کا شمار دونوں ہاتھوں کی پوروں پر چار دفعہ میں کیا جاسکتا تھا۔ آبادی مشکل سے پانچ چھ سو افراد پر مشتمل ہوگی، لیکن اس کے باوجود اس مختصر آبادی کو شہر پناہ سے محصور کیا گیا تھا، گویا اس وقت بھی حملہ آوروں کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔

مغربی اناطولیہ میں سمرنا اور ٹرائے عہد قدیم کے دو بڑے ثقافتی مرکز تھے۔ دُور دُور کے لوگ یہاں آتے، اکتسابِ علم کرتے اور وطن لوٹ جاتے تھے۔ چند سال ہوئے جامعہ انقرہ کے ماہرین آثارِ قدیمہ نے بہت سی پہاڑیوں کو کھود کر اس زمانے کے مکانات اور کچھ نوادر برآمد کیے ہیں جن سے اس زمانے کی تہذیب پر روشنی پڑتی ہے۔

دو ہزار سے ایک ہزار دو سو قبل مسیحؑ تک یہ علاقہ حِتّی قوم کے زیرِ اثر رہا، جس کے افراد وسطی اناطولیہ میں راج کرتے تھے۔ گیارھویں صدی قبل مسیحؑ کے آخر میں ایولیا کے باشندوں نے پُرانی بستی کے قریب نیا شہر آباد کیا، جس پر نویں صدی قبل مسیحؑ میں آئیونیا کے حکمرانوں نے قبضہ کر لیا۔ اسی عہد میں مشہور شاعر ہومر گزرا ہے، جس کی بابت تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ سمرنا کا باشندہ تھا۔ سمرنا کے علاوہ چھے اور شہر (رھوڈس، کولوفون، سلامس، چیوس، آرگوس اور ایتھنز) بھی دعویدار ہیں کہ ہومر وہاں پیدا ہوا تھا، لیکن مورخین کی اکثریت سمرنا ہی کو ہومر کا وطنِ مالوف بتاتی ہے۔ ایک مکتبہ خیال یہ بھی ہے کہ ہومر کوئی فرد نہیں تھا، بلکہ قدیم زمانے میں غنائیہ نظمیں لکھنے والے شاعر کو ہومر کہتے تھے۔ اسی لیے اس خیال کے حامیوں کا عقیدہ ہے کہ ہومر کے نام سے چھپنے والی دو مشہور داستانیں ——— ایلیڈ اور اوڈیسی ——— ایک طویل مدت میں مختلف شاعروں نے منظوم کی ہیں اور کسی ایک نے ان کو مرتب کر دیا ہے۔ لیکن طرزِ بیان پر تبصرہ کرنے والے اس رائے کی تردید کرتے ہیں اور میرے خیال میں ان کا دعویٰ درست ہے۔ کہنے والے تو شاہنامے کے مصنف فردوسی کے وجود سے بھی انکار کرتے ہیں اور خود یہودی اور نصرانی فلسفیوں نے حضرتِ موسیٰؑ کی ہستی سے انکار کیا ہے۔ جب خدا کا وجود معرضِ بحث میں آسکتا ہے تو فانی انسان کس زمرے میں ہے۔

ہومر کی رزمیہ مذکورہ بالا داستانیں آج بھی مشہور ہیں اور مہذب دُنیا کی زبانوں میں مکمل یا ملخص صورت میں منتقل ہو چکی ہیں۔ اس کے عوامی گیت اب بھی گائے جاتے ہیں۔ اس کی کہانیوں پر بہت سے فلم تیار ہو چکے ہیں۔ اس کی بعض نظمیں دیوتاؤں اور دیویوں کی شان میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ اپولو کے ساتھ عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہومر کا وجود ماننے والے اس کے سنِ پیدائش کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ بارہ سو قبلِ مسیح تک کی درمیانی مدت کا کوئی حصّہ اس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ البتہ عہدِ قدیم کے مشہور مورخ و سیاح ہیرودوتس نے بڑے وثوق کے ساتھ اس کا زمانہ ۸۵۰ تا ۷۷۵ قبل مسیحؑ مقرر کیا ہے، جو مان لینے کے لائق ہے۔

اس شہر کے بے مثل عروج کو چھ سو قبل مسیحؑ کے لگ بھگ لائیڈیا کے ایک فرمانروا شاہ الیاٹس کے تباہ کن حملوں نے ختم کر دیا اور ایسا ملیا میٹ کیا کہ اس کی ہلکی جھلک تک باقی نہ رہی، صرف تصوّر کی آنکھ سے اس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پانچ سو قبل مسیحؑ کے مورخ تھیوگ نس کا کہنا ہے کہ سمرنا کو اس کے باشندوں کے غرور و نخوت نے تباہ کر دیا۔ مم نرمس نے زوالِ سمرنا پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے وہاں کے لوگوں کی بد اخلاقی کو تباہی کا ذمّے دار ٹھیرایا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اور بہت سی تہذیبیں بھی ایسے ہی اسباب کی بنا پر تباہ ہوئی ہیں۔

گمنامی کے دو ڈھائی سو سال گزرنے کے بعد مقدونیہ کے اسکندرِ اعظم نے جب تسخیرِ عالم کے ارادے سے مشرقی دُنیا کی طرف اپنی فوجیں بڑھائیں تو اہلِ فارس کے خلاف معرکوں میں سمرنا کے بچے کھچے جانبازوں نے اس کا بڑا ساتھ دیا اور اس نے اپنی کامیابی پر خوش ہو کر اپنے دو سپہ سالاروں، لائی سی ماخس اور اینٹی گون کو حکم دیا کہ سمرنا کے قریب کوہِ پاگس کے دامن میں گھنے جنگل کو صاف کر کے نیا شہر آباد کیا جائے اور سمرنا کے قدیم باشندوں کو وہاں نئی شان سے آباد کر دیا جائے۔ چناں چہ اس حکم کی تعمیل کر دی گئی اور ایک بار پھر اس شہر نے ایسی ترقی کی کہ تیسری اور دُوسری صدی قبل مسیحؑ میں اس کی حدود کو وسیع کرنا پڑ گیا، اور اس نے نئے سرے سے عروس البلاد ہونے کی سَند حاصل کر لی۔

۲۷ قبل مسیحؑ سے ۶۳۲۴ تک سمرنا رومیوں کے زیرِ نگیں رہا۔ اس زمانے میں بھی، خصوصاً دوسری صدی عیسوی میں قابلِ ذکر ترقیاں رُونما ہوئیں۔ اسی دوران میں یعنی ۱۷۸ء میں ایک شدید زلزلہ بھی آیا، جس نے شہر کو بُری طرح تباہ کر دیا، لیکن شہنشاہِ وقت مارکس اوریلی اس نے فوراً دوبارہ تعمیر کرا دیا اور اس کے نقش و نگار کو ماند پڑنے سے بچا لیا۔

چوتھی صدی عیسوی میں سمرنا سلطنتِ بازنطین کا ایک صوبہ بن گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی جدوجہد اور باہمی مناقشات کا اکھاڑا بن گیا۔ اسی زمانے میں نصرانیت نے اس علاقے سے فروغ پانا اور ساری دنیا میں پھیلنا شروع کر دیا۔ عیسائی مذہب کے مبلّغین

نے اس کو اپنا مرکز بنا کر پرچار کے منصوبے بنائے اور ان کو عمل میں لانے کی تدابیر نکالیں۔ اس وقت کے ایک بہت بڑے کلیسا کے آثار اب تک موجود ہیں۔

عرب کے مسلمانوں نے چھٹی صدی عیسوی میں اس علاقے پر ناکام حملہ کیا لیکن گیارھویں صدی میں سلجوقیوں نے اسے فتح کر لیا، لیکن صدی ختم ہونے سے قبل ۱۰۹۷ء میں پہلی صلیبی جنگ اسی علاقے میں ہوئی اور سمرنا بازنطینیوں نے واپس لے لیا اور تیرھویں صدی کے نصف اول تک انھی کے پاس رہا۔ ۱۳۲۰ء میں سلجوق ترکوں کو نئے سرے سے جوش آیا اور ایدن اوغلولاری خاندان کے شہزادوں نے اسے واپس چھین لیا۔ غازی عمر بے نے اسے اپنی فوج کا بحری اڈا بنا لیا۔

پاپائے روم کے اُکسانے پر ۱۳۴۴ء میں صلیبی جنگ بازوں نے ایک بار پھر اس شہر کو فتح کرنے کے لیے ایک بہت بڑا بحری بیڑا تیار کیا۔ شدید خونریزی اور کشمکش کے بعد حملہ آوروں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ غازی عمر بے میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا۔ پھر تیمور لنگ کی باری آئی اور ۱۴۰۲ء میں اس نے شہر فتح کر لیا لیکن جب اناطولیہ سے مراجعت شروع کی تو سارا علاقہ ایدن اوغولاری کو واپس دے دیا۔ بارہ سال بعد یعنی ۱۴۱۵ء میں عثمانی فرمانروا چلبی محمد اوّل نے اسے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

اس علاقے کا محلِ وقوع سیاسی اور تجارتی اعتبار سے اور قدرتی وسائل کے لحاظ سے بھی اتنا جاذبِ توجہ رہا ہے کہ ہمیشہ آس پاس کے ملکوں کی للچائی ہوئی نظریں اس پر پڑتی رہی ہیں۔ بارہا فوجی حملے ہوئے اور ناکام بنا دیے گئے۔ عثمانی حکومت کا پرچم اس طرح لہرایا کہ وہ پھر کسی سے سرنگوں نہ ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کی محض دھاندلی کے باعث یونانی فوجیں ایک قلیل مدت کے لیے اس علاقے اور اناطولیہ کے کچھ حصے پر قابض ہو گئیں لیکن قوم پرست ترکی فوجوں نے جوں ہی یلغار کی، دشمنوں کے جمے جمائے قدم اکھڑ گئے۔ کمال اتاترک ان فوجوں کے کمانڈر تھے۔ اپنے زیرِ نگیں کر لینے کے بعد انھوں نے سمرنا کا نام بدل کر ازمیر کر دیا۔ ساری قوم نے اسے پسند کیا۔

صوبۂ ازمیر بحیرۂ ایجین کے ساحل کے ساتھ ساتھ اناطولیہ کے وسطی علاقے کا ایک حصّہ ہے۔ جس خلیج نے اسے محصور کر رکھا ہے، وہ خود بھی سمندر کے تیز و تند تھپیڑوں سے اچھی طرح محفوظ ہے۔ اسی لیے بندرگاہ کا سکون وہاں تانتا لگانے والے جہازوں کے لیے ایک نعمت ہے۔ ایک طرف ساحل سمندر سے اور باقی اطراف میں تین پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ شہر اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کی زرخیزی

اور دلفریبی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ زمین کا سینہ اپنے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو چھپائے رکھنے پر قادر نہیں رہتا اور سب کچھ اگل کر ایک بہارِ جاوداں کی کیفیت پیش کرتا رہتا ہے۔ دریاؤں اور ان سے نکالی ہوئی لہروں کے علاوہ کئی چشمے بھی اس کے آبی وسائل میں اضافہ کرتے ہیں اور پھر ایک وسیع جھیل ان سب پر مستزاد ہے۔ چناں چہ گرمی کا موسم کچھ ایسا زیادہ گرم نہیں ہوتا، البتہ موسمِ سرما کی ہوائیں جو شمال اور شمال مشرق سے برفانی چوٹیوں کا منھ چوم کر آتی ہیں، عموماً مقامی باشندوں کے جسم میں بھی تھرتھری اور کپکپی پیدا کر دیتی ہیں اور وہ ہر قسم کے گرم گوشے تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اوسط درجۂ حرارت ۲۷ سنٹی گریڈ رہتا ہے۔

پانی کی فراوانی، ہوا کی تازگی، زمین کی قدرتی صلاحیت اور محنتی انسان کی استعداد و قابلیت نے مل جل کر اس علاقے کو عمدہ چراگاہوں، کھیتوں اور باغوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ سب قسم کے اناجوں کے علاوہ یہاں کے انگور، انجیر، زیتون، کیلے اور رنگترے، نہ صرف ملک بھر میں مشہور ہیں، بلکہ دوسرے علاقوں میں مثالی سمجھے جاتے ہیں اور غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل کرنے کے کام آتے ہیں۔ پھر ان پھلوں سے متعلق صنعتوں نے بھی خوب فروغ پا لیا ہے۔ تمباکو، روئی اور چائے بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی شہر کے مضافات میں چقندر کی کاشت نہایت وسیع پیمانے پر ہوتی ہے، جو اس قدر میٹھا اور رسیلا ہوتا ہے کہ شکر بنانے کے کام آتا ہے۔ چناں چہ تمام ترکی میں صرف چقندر کی شکر استعمال ہوتی ہے۔ گنّا اس علاقے میں پیدا نہیں ہوتا، یا اس قدر برائے نام ہوتا ہے کہ لوگ اس سے کوئی بڑا فائدہ نہیں اٹھاتے۔

صوبے کا کُل رقبہ بارہ ہزار آٹھ سو چھبیس مُربع کلو میٹر ہے اور دو سال پہلے کی مردم شماری کے مطابق آبادی نو لاکھ کے قریب ہے۔ صرف شہر میں تقریباً دو لاکھ سینتالیس ہزار نفوس بستے ہیں۔

چراگاہوں کی افراط کے باعث یہاں کے مویشی اور دوسرے پالتو چوپائے بھی ملک کے لیے نعمت ہیں۔ ترک تازی گھوڑوں کا وجود اسی علاقے سے وابستہ ہے، جن کی جولانگاہ یہاں کے وسیع سرسبز میدان ہیں۔ دودھ دینے والے جانور بھی مقامی باشندوں کے علاوہ دوسروں کا پوت پورا کرتے رہتے ہیں۔ ساحل کے قریب اور دریاؤں سے جو مچھلیاں نکلتی ہیں، انھیں بھی یہاں کی قدرتی نعمتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ترکی کے بڑے شہروں میں سے استنبول کے بعد ازمیر دوسرے نمبر پر ہے، لیکن بعض لحاظ سے وہ استنبول کو بھی پرے بٹھاتا ہے۔

ازمیر میں تاریخی اہمیت کے سب سے زیادہ کھنڈر اگورا کے ہیں، جو ضلع نماز گاہ کا ایک حصہ ہے۔

یہ دوسری صدی کے رومی عہد کی یادگار ہیں۔ دو منزل کی ایک عمارت سب سے زیادہ عمدہ حالت میں ہے۔ یہ شاہی محل ہے جس کا طول ۱۶۰ میٹر ہے۔ عرض کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ عقبی حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ سامنے کی محرابیں خاصی محفوظ ہیں جن کو دیکھ کر طرزِ تعمیر اور آرائش و زیبائش کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے اور اس زمانے کے لوگوں کے عقائد کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ اگورا کی ایک عمارت میں دو بت اب بھی صحیح سالم ہیں۔ ان میں سے ایک پوسیڈون کا ہے اور دوسرا ڈیمیٹر کا۔ پوسیڈون سمندر کا دیوتا اور ڈیمیٹر دھرتی کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ اگورا کے وسط میں دیوتاؤں کا جو سنگھاسن ہے، اسی پر یہ بت نصب ہیں۔ ایک سرسری نظر ڈالنے ہی پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کم تر درجے کے دیوتاؤں کے مزید بت ان کے جلو میں ضرور ہوں گے۔ وہ خود موجود نہیں ہیں لیکن جو چبوترے وہ خالی کر گئے ہیں، ہنوز برقرار ہیں۔ دراصل ان کھنڈرات کے بیشتر نوادر جن کے تلف ہو جانے کا اندیشہ تھا، ازمیر کے عجائب گھر میں منتقل کر دیے گئے ہیں جو کلچر پارک میں واقع ہے۔ آج کل اسی پارک میں بین الاقوامی میلہ ہو رہا ہے۔ عجائب گھر اول تو اس وقت بند تھا اور پھر ہمارے پاس اتنا وقت بھی کہاں تھا کہ اسے سرسری نظر ہی سے دیکھ لیتے۔ لہٰذا اس میں رکھے ہوئے نوادر کا دیدار کرنے کی حسرت دل میں رہی۔

پرانی یادگاروں میں سے فصیلِ شہر کے شکستہ حال حصے بھی قابل ذکر ہیں، جو اوّلاً اسکندر اعظم کے عہدِ حکومت میں، اس کے بعد سپہ سالار اور نائب السلطنت نے تعمیر کرائی تھی۔ یونانی، رومی، بازنطینی اور عثمانی عہدوں میں بھی اس دیوار کی تعمیر یا مرمت ہوتی رہی ہے۔ شہر پناہ کے آخری سرے سے جب ہم اس پہاڑ پر چڑھے، جو قاضی کا قلعہ کہلاتا ہے تو خلیج ازمیر کا ایک ہوش رُبا نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا اور ہم نے وقت سے ذرا پہلے دور رس نگاہوں سے اس کلچر پارک کو بھی دیکھ لیا، جس میں میلہ ہو رہا تھا۔

ہم نے تے پے چک کے علاقے میں وہ مقام بھی دیکھا، جہاں کسی زمانے میں بہ نکلنے والے گرم چشموں کی وجہ سے سرکاری حمام بنے ہوئے تھے اور شہر کے سب لوگ صحت و صفائی کے خیال سے وہاں آ کر نہاتے تھے۔ ان چشموں کی سوتیں خشک ہو گئی ہیں لیکن تصور کی آنکھ سے انھیں اب بھی رواں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ حمام ڈیانا (آرٹمس) دیوی کے نام پر تعمیر کیے گئے تھے۔

قزل چولو کے مقام پر، جو دریائے قمر کے ساحل کے قریب ہے، اس حوضِ خاص کے آثار پائے جاتے ہیں، جو بازنطینی عہد میں تعمیر ہوا تھا اور عثمانی دور تک برقرار رہا۔ یہ ذخیرۂ آب سارے

شہر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اب نئے طریقے پر آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے اور اس شکستہ حال پرانے حوض کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔

عہد قدیم کی ان تاریخی یادگاروں کے آس پاس دورِ جدید کے کچھ نمونے بھی قابلِ دید ہیں۔ ان میں مسجدوں کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کا مقابلہ استنبول کی تاریخی مسجدوں سے تو کسی عنوان ممکن نہیں ہے، البتہ سولھویں اور سترھویں صدی میں تعمیر ہونے کے اعتبار سے بھی ان کو مثالی کہا جا سکتا ہے۔ ہم جلدی میں صرف دو مسجدیں دیکھ سکے۔ ایک مسجدِ حصار، جو ۱۵۷۹ء میں تعمیر ہوئی تھی اور دوسری مسجدِ حاجی عثمان، جو ۱۶۵۱ء میں بنی تھی۔ یہ واقعی عثمانی عہد کی آئینہ دار ہیں۔

ہمارے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے صلاح دی کہ ہم ازمیر کا میلہ دیکھنے کے بعد اس رات کسی ہوٹل میں قیام کریں اور دوسرے روز پرگامم ضرور چلیں، جو اس علاقے میں سیاحوں کی توجہ کا ایک اور مرکز ہے لیکن اس بچارے کو ہمارے نپے تلے پروگرام کا اندازہ نہیں تھا، جس میں ذرا سا جھول پڑنے سے بڑی دقتوں کا سامنا ہو سکتا تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے سفر کی فہرست میں پرگامم کو شامل کرنا ضروری تھا، کیونکہ طب کی کچھ روایات اس علاقے سے وابستہ ہیں۔ بحالتِ موجودہ اسے دیکھنے کی آرزو کو کسی دوسرے دورے تک کے لیے ملتوی رکھنا ہی پڑا۔

پرگامم: پرگامم سے طبی روایات کی وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ جالینوس، جس نے بابائے طب بقراط کے خیالات اور تحقیقات کو حیاتِ نو بخشی اور اپنے اضافوں کے ساتھ وہ نظریات پیش کیے جو تشخیصِ امراض و تدوینِ ادویہ میں آج تک مشرق و مغرب میں سند سمجھے جاتے ہیں، اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا، یہیں طبی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے عہد کی توہم پرستی اور عطائیت کو مٹانے کی خاطر خالص علمی انداز میں دنیا کا سب سے پہلا مطب یہیں قائم کیا تھا۔ اس کا سنِ ولادت ۱۳۰ عیسوی اور سنِ وفات ۲۰۰ یا ۲۰۱ عیسوی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا باپ نکون، مہندس اور ماہرِ تعمیرات تھا لیکن بیٹے کے رجحانات باپ سے مختلف تھے۔ اس نے ابتدائی تعلیم پانے کے بعد سولہ سال کی عمر سے طب کا مطالعہ شروع کیا اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ دور دور اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس نے سمرنا، کورنتھ اور اسکندریہ کا دورہ کیا۔ وہ ۱۵۸ء میں پرگامم واپس آیا تو اس کی شہرت کو دیکھتے ہوئے حکومتِ وقت نے اسے سرکاری پہلوانوں کا طبیب مقرر کر دیا۔ چھے سال بعد اسے روم جانا پڑا،

تاکہ وہاں کے طبیبوں سے تبادلِ خیالات کر سکے لیکن زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ شاہ مارکس اوریلی اَس نے اسے واپس بلا بھیجا تاکہ تسخیر المانیہ کی مہم میں وہ اس کے ساتھ رہے لیکن جالینوس کو خود شہنشاہ کے بیٹے کموڈیس کی خاطر، جو علیل تھا، روم میں رہنا ضروری تھا۔ اس کی معذرت قابلِ قبول تھی۔

اس فرض کی ادائیگی کے بعد وہ پرگامم آیا اور مطب شروع کرنے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ اس نے طب و جراحت، منطق، صرف و نحو، اخلاقیات اور ادب پر تقریباً پانچ سو رسالے مرتب کیے۔ اس نے افلاطون اور ارسطو کے کارناموں کی شرح بھی لکھی جو بہت مقبول ہوئی اور آج تک مشہور ہے۔ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ رازی اور بو علی سینا طبِ یونانی کو نئی زندگی نہ بخشتے تو شاید وہ مفید فن ہمیشہ کے لیے نابید ہو جاتا یا لائقِ تقلید نہ رہتا، اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر جالینوس بقراط کی تحریروں کی وضاحت نہ کرتا تو اس وقت بابائے طب کے خیالات کو سمجھنے والا کوئی نہ ملتا۔ مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج کل مغرب کے نام نہاد ماہرین اس کوشش میں ہیں کہ مشرقی طب، جس کے وہ خود خوشہ چیں ہیں، کسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور اگر اس کی کوئی جھلک باقی بھی رہے تو دنیا صرف بقراط کو یاد کرے، جالینوس کو بھول جائے۔ جالینوس کا یہ قصور ان کے نزدیک شاید مستوجبِ سزا ہے کہ وہ اتفاق سے ایشیائی نژاد تھا۔

پرگامم جسے بازنطینی عہد میں برگاما کہا جانے لگا تھا، ازمیر سے ۴۰ میل جانبِ شمال واقع ہے۔ اس کی موجودہ آبادی بیس ہزار ہے، لیکن کسی زمانے میں سولہ لاکھ بھی رہ چکی ہے۔ اس کے چشمے روایت و عقیدے کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے دھارے زیادہ تیز نہیں ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ ان میں غسل کرنے والا نئے سرے سے حسن و شباب حاصل کر لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ معدنی اثرات کے باعث صحت بخش ضرور ہوں گے۔

تاریخی اعتبار سے بھی اس علاقے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہم لوگوں کے لیے یہ واقعہ بطورِ خاص اہم ہے کہ ۱۳۳ قبل مسیح میں جب پرگامم کے آخری فرمانروا اطالوس سوم نے اپنی سلطنت حکومتِ روم کے سپرد کر دی تو اس کے اربابِ اقتدار نے اسے اپنی مملکت کا ایک علیحدہ صوبہ بنا کر اس کا نام "ایشیا" رکھا جو بتدریج اپنا دائرہ وسیع کر کے ایک بہت بڑے برِ اعظم کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ولادتِ مسیح سے کچھ عرصے پہلے اس علاقے میں فسق و فجور اور ریاکاری کا بازار گرم ہو گیا تھا۔

شاید اسی لیے انجیل مقدس میں اس کو "تختِ شیطان" کا خطاب دیا گیا ہے۔ لیکن جب نصرانیت نے فروغ پانا شروع کیا تو ایفی سس کے بعد یہی شہر اس کے پرچار کا دوسرا بڑا مرکز تھا۔

اس شہر کے ایک حصے میں صحت یابی کے دیوتا ایسکلے پی اس کا مندر اور شفاخانہ تھا جس کی روایات سات سو سال تک زندہ رہیں۔ اس شفاخانے کی عمارت بالکل گول دو منزلہ تھی، اور بنیاد کے قریب اس کا قطر ۵ے فیٹ تھا۔ یونان و روما کے اور شفاخانوں کی طرح یہاں بھی ایسکلے پیون کے صدر دروازے کی پیشانی پر یہ حکم کندہ تھا:

"دیوتاؤں کے نام پر موت کا داخلہ ممنوع ہے"

لیکن موت کا فرشتہ اس حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے اپنے اصول پر کاربند رہتا تھا۔

حال میں کھدائی کے بعد جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں اندھے اور بہروں کے علاوہ امراضِ معدہ و قلب و جگر میں مبتلا لوگوں اور پھیپھڑے کے مریضوں کا بھی علاج معالجہ ہوتا تھا اور وہ عموماً پوری طرح تن درست ہو کر اپنے گھر جاتے تھے۔ شہنشاہ مارکس اوریلی اس کے پھیپھڑوں میں جو نقص تھا، اسے بھی یہاں داخل کر کے دور کیا گیا تھا۔ ایسکلے پیون میں جڑی بوٹیوں اور معدنی چیزوں سے تیار ہونے والی دواؤں سے علاج معالجے کے علاوہ چشموں کے پانی میں نہانا، دھوپ میں سنکنا، تعویذ گنڈے باندھنا، دیوتاؤں کے نام پر منتیں ماننا اور خیالات کے نفسیاتی اثر سے کام نکالنا بھی شامل تھا۔

عمارت کے باہر تین مقدس تالاب تھے، جن کو ایک مقدس چشمے کے پانی سے ہر وقت لبریز رکھا جاتا تھا۔ مریض ان میں اتر کر نہاتے اور باہر نکل کر جسم پر مٹی مل کر دھوپ میں سنکتے تھے۔ چشمے کا پانی تالابوں میں پہنچنے سے پہلے ایک اور جگہ جمع ہوتا تھا تاکہ امراضِ شکم کے مریض اسے پی کر صحت پا سکیں۔ جلدی شکایات بھی اس کے اثر سے دور ہو جاتی تھیں۔ مشہور شاعر ہوریس نے ایسکلے پیون کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"مقدس چشمے پر شہد کی مکھیوں کی طرح لوگوں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ اس کے قریب بیٹھنے والوں کو موسمِ گرما کی چلچلاتی دھوپ بھی کوئی نقصان نہیں پہنچاتی تھی۔"

اس علاقے میں کھدائی کے بعد جو معلومات فراہم ہوئی ہیں، ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ شفاخانے کے قریب ہی ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں طبی موضوعات کے علاوہ عام ذوق کے نوشتے بھی شامل تھے۔ مریضوں اور معالجوں کے علاوہ باہر کے لوگ بھی ان سے استفادہ کر سکتے تھے۔

اس عمارت کے قریب ہی ایک ناٹک گھر تھا جس میں ساڑھے چار ہزار تماشبین بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ مریضوں کی تفریحِ طبع کے لیے کھیل دکھانے کا شروع سے رواج تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اب وہاں جا کر مریضوں یا معالجوں سے ملنا جلنا یا علاج معالجے کے پرانے طریقوں کا جائزہ لینا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا لیکن رابطۂ قلب و نظر کے زیرِ اثر یہ احساس باعثِ اطمینان بن سکتا تھا کہ وہ مقام کھنڈر ہی کی صورت میں سہی صفحۂ ہستی پر موجود ہے، جہاں مشرقی طب کی بنیاد پڑی تھی اور اس کے مطابق علاج معالجہ ہوتا تھا۔

کاش! وقت کی طنابیں کھنچنے کے بجائے ذرا ڈھیلی پڑتیں اور ہم فرصت کے چند لمحے نکال کر اسے دیکھ لیتے۔ اب پروگرام کے مطابق ہمیں ازمیر کے میلے کی سیر کرنی تھی۔ چنانچہ ڈرائیور کو ہدایت کی گئی اور وہ ہمیں فوراً کلچر پارک کی جانب لے گیا، جس میں یہ زبردست میلہ لگتا ہے۔

میلے میں: اس بین الاقوامی میلے کی وسعت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر اسے بجائے خود ایک شہر کہا جائے تو بجا اور درست ہوگا، کیوں کہ وہ پہاڑ کے دامن سے شروع ہو کر سمندر کے ساحل تک چار لاکھ پچاس ہزار مربع میٹر کے رقبے میں پھیلتا ہے۔ اس کی حدود میں کلچر پارک کے علاوہ ایک قدرتی جھیل بھی شامل کی جاتی ہے، جس کا رقبہ دس ہزار مربع میٹر کے قریب ہے۔ اتنے بڑے علاقے کو احاطہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس لیے ہمارے ملک کے صنعتی یا نمائشی میلوں کی طرح اس کے گرد کسی قسم کی دیوار بنانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور اسی لیے داخلے کا کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا، البتہ ازمیر شہر اور مضافات کی آبادی چونکہ سب طرف پھیلی ہوئی ہے، اس لیے میلے میں لے جانے والی سڑکوں کے سروں پر پانچ خوشنما عارضی دروازے تعمیر کیے جاتے ہیں اور ان کو ایلول، موہٹریو، لوزان، ۲۶ اگست اور جمہوریت کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس میلے کی ابتدا ۱۹۲۳ء میں ہوئی تھی لیکن اس وقت اس کی نوعیت صرف مقامی تھی۔ اس سال ڈیڑھ سو فرموں نے اس میں حصہ لیا اور کوئی اڑھائی دو لاکھ اشخاص اسے دیکھنے آئے۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے اس کی حیثیت بین الاقوامی ہو گئی ہے۔ اُس سال دو سو تین مقامی اور اڑتیس غیر ملکی فرموں نے حصہ لیا۔ تین ملک سرکاری طور پر شامل ہوئے اور سوا تین لاکھ دیکھنے والے آئے۔ اس کی مقبولیت اور افادیت میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا۔ البتہ دوسری جنگِ عظیم کے باعث ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء میں اس پر بُرا اثر پڑا۔ غیر ملکی فرموں اور حکومتوں نے بالکل شرکت نہیں کی۔ حکومتیں ۱۹۴۶ء میں بھی شامل نہیں ہوئیں۔ البتہ ۳۳ فرموں نے اپنے اسٹال لگائے

لیکن اگلے سال چار سو فرموں اور آٹھ ملکوں نے حصہ لیا۔ ۱۹۵۴ء میں یہ اعداد و شمار حیرت انگیز حد تک بڑھ گئے۔ ایک ہزار دو سو نو مقامی اور دو ہزار چار سو پچاس غیر ملکی فرموں اور سترہ حکومتوں نے اس میں حصہ لیا۔ زائرین کی تعداد سترہ لاکھ اکتیس ہزار سے زیادہ تھی۔ اس سال ڈیڑھ ہزار مقامی اور ڈھائی ہزار غیر ملکی فرمیں اور بیس حکومتیں شامل ہیں۔

انتظامی اعتبار سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تمام فرموں اور ملکوں کے اسٹال جو پکّے پختہ اور نہایت وسیع ہوتے ہیں، رسمِ افتتاح کے وقت ہر لحاظ سے مکمل اور آراستہ کر دیے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ عام نمائشوں اور میلوں کی طرح وہ اس وقت نامکمل اور سامان سے خالی ہوں، اور پھر آہستہ آہستہ دس بارہ دن میں پوری طرح لیس کیے جائیں۔ آندھی آئے یا طوفان، ازمیر کا میلہ ہر سال ۲۰ اگست سے شروع ہوتا اور ہر حالت میں ۲۰ ستمبر کو ختم ہو جاتا ہے اور پہلے ہی روز سے اس کی رونق اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ اس سال بھی صدرِ ترکی جلال بایار میلے کا افتتاح کرنے انقرہ سے ازمیر آئے تھے۔ وزیرِ اعظم ان کے ساتھ تھے۔ دوسرے ہی روز علی الصباح وہ دونوں واپس چلے گئے، کیوں کہ ملک کے بعض سیاسی حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ملک کے صدر مقام سے دور نہ رہیں۔ ان کے انقرہ پہنچنے کے دوسرے دن، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، وزیرِ مالیات ندیم اوکمن نے اپنے عہدے سے استعفےٰ دے دیا۔

بین الاقوامی میلے اکثر ملکوں میں ہوتے رہتے ہیں، لیکن عموماً ہر جگہ ان کی رونق روزانہ سورج چھپنے کے بعد شروع ہوتی، برقی قمقموں کی روشنی میں پھیلتی اور آدھی رات کے بعد تک اپنا رنگ جمائے رہتی ہے۔ ان کے برعکس ترکی میں ازمیر کا میلہ رات دن کا ایک مسلسل مشغلہ ہوتا ہے۔ دن کے اُجالے میں دکانوں پر خرید و فروخت کا رنگ ضرور پھیکا پڑ جاتا ہے، کیوں کہ ان کی آرائش رات ہی کو اپنا سکہ چلاتی ہے، لیکن دوسرے دل چسپ مشغلے زائرین کی تفریح کا باعث بنتے ہیں، مثلاً جھیل میں تیراکی اور کشتی رانی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ صبح سے شام تک مختلف کھیلوں کے میچ ہوتے ہیں۔ کرکٹ اور ٹینس ترکی میں بھی مقبول کھیل ہیں۔ سہ پہر کو اکھاڑے میں پہلوانوں کی کشتیاں ہوتی ہیں۔ تیر انداز اپنے فنی کمالات دکھاتے ہیں۔ نٹ، مداری اور جادو کے کھیل دکھانے والے اپنے کرتبوں سے پیسے کماتے ہیں۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بڑی بھیڑ رہتی ہے، کیوں کہ جو لوگ چوبیس گھنٹے کا پروگرام بنا کر آتے ہیں، وہ دونوں وقت کا کھانا وہیں کھاتے ہیں۔ اس قدر وسیع علاقے میں جگہ جگہ لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے مائکروفون اسٹیشن کا خاص رنگا رنگ

پروگرام رات دن نشر ہوتا رہتا ہے جو محض وقتی اعتبار سے دلچسپ ہی نہیں ہوتا، بلکہ اطلاعاتی لحاظ سے مفید بھی ہوتا ہے۔

اس میلے میں خود ترکی نے اپنی صنعتی اور دوسری ترقیوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے اتنے اسٹال لگا رکھے ہیں کہ صرف انھی کو ایک نظر دیکھ لینا ہمارے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس وقت یہاں کسی اور ملک کے کسی بھی اسٹال میں داخل نہیں ہوا جائے گا۔

ترکی نے ہر شعبے کی مادی ترقیوں کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اعداد و شمار کے نقشوں اور جدولوں سے واضح کیا تھا کہ پچھلے سال میں اور اس سال ترقی کی رفتار کتنی رہی ہے۔ اکثر چیزوں میں زمانۂ حال کا مقابلہ ۱۹۲۳ء سے کیا گیا تھا تاکہ ایک نظر میں معلوم ہو سکے کہ جمہوریۂ ترکیہ کے قیام کے وقت ملک کی حالت کیا تھی۔ ہم نے سب چیزوں کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد اعداد و شمار کے نقشوں کا جائزہ لیا اور بہت سی باتیں نوٹ بک میں درج کر لیں۔

ملک میں سیاسی انقلاب آنے سے پہلے ایک زبردست صنعتی انقلاب رونما ہوا تھا۔ جگہ جگہ ہڑتالوں اور ہنگاموں نے سارا نظم و نسق مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جمہوریت قائم ہوئی تو اسے بہت سے کام بالکل نئے سرے سے کرنے پڑ گئے۔ صنعت کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اوّلین اور سب سے مناسب قدم یہ تھا کہ نئی حکومت نے بہت سے ٹیکس معاف کر دیے یا ان کی شرح گھٹا کر بہت ہی کم کر دی۔ کسٹم ڈیوٹی کی وصولی میں بے حد مراعات دیں۔ درآمد و برآمد کے لائسنسوں میں بہت زیادہ لچک پیدا کر دی۔ نئے کارخانوں کے قیام کے لیے زمین کے وسیع قطعات بلا قیمت اور بعض عمارتیں کچھ عرصے کے لیے بلا کرایہ دے دی گئیں۔ ملک میں غیر ملکی سرمائے کی درآمد کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں اور چوں کہ صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ معدنیات اور قدرتی وسائل کو پہلے ترقی دے دی جائے۔ اس لیے حکومت نے بنیادی قسم کے کام اپنی تحویل میں لے لیے۔ اس کے بغیر چارۂ کار نہیں تھا۔ کانوں کی کھدائی اور اس سے متعلق صنعتوں کی ترقی کے لیے اس نے ۱۹۳۳ء میں تقریباً تیس کروڑ روپے کے سرکاری سرمائے سے ایک بنک قائم کیا جس میں عوام کو شریک کرنے کے لیے اتنی ہی مالیت کے حصص فروخت کیے گئے۔ اس بنک نے لوہے، فولاد، کاغذ، شیشے اور ریان کی صنعت کو سب سے پہلے سنبھال لیا۔

۱۹۳۸ء میں ۲۸۹۸۰۷ ٹن خام لوہا نکالا گیا۔ یہ مقدار اس سال ۹۳۰۴۸۰ ٹن پہنچ گئی ہے۔ کوئلہ جو صنعتی کارخانوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے، ۱۹۳۸ء میں ۲۵۸۸۹۵۷ ٹن نکالا گیا اور اس

سال اب تک ۵۸۸۸۳۰۸ ٹن نکالا جا چکا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں فولاد بنانے کا کوئی کارخانہ نہیں تھا۔ ۱۹۳۸ء تک نئی حکومت بھی کوئی قدم اس منزل میں نہ اٹھا سکی۔ ۱۹۴۰ء میں پہلی بار ۳۷،۴۰۸ ٹن فولاد تیار ہوا جس سے زیادہ تر ریل کی پٹریاں تیار کی جانے لگیں۔ اس سال فولاد کی مقدار ۱۹۲۵۱۱ ٹن تک پہنچ گئی ہے۔ خام کروم کو کام میں لانے کے کارخانے ابھی تک ملک میں قائم نہیں ہو سکے ہیں، اس لیے جتنی بھی مقدار کانوں سے نکلتی ہے، غیر ملکوں کو بھیج دی جاتی ہے۔ بعض اور معدنی اشیا بھی دے کر بھاری مشینیں درآمد کی جاتی ہیں۔ پچھلے سال ترکی نے برآمدی تجارت سے جو زرِ مبادلہ حاصل کیا اس میں معدنی اشیا کا حصہ ۱۰٫۴ فی صدی تھا۔

۱۹۲۳ء میں شکر کی پیداوار برائے نام تھی۔ ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بڑی مقدار میں اسے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ۴۲۵۲۶ ٹن شکر تیار ہوئی اور اس سال اس کی مقدار ۲۷۶۶۱۱ ٹن ہو گئی ہے۔ اب ترکی چقندر کی شکر کا کچھ حصہ برآمد بھی کرنے لگا ہے کیونکہ بعض ملکوں میں گنے کی شکر کے مقابلے میں اسے ترجیح دی جاتی ہے۔

عمارتی کاموں کے لیے سیمنٹ ایک ضروری شے ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اس کی پیداوار ناقابلِ ذکر تھی۔ ۱۹۳۸ء میں ۲۸۴۲۶۶ ٹن سیمنٹ تیار ہوا اور اس سال اس کی مقدار ۹۷۴۸۶۴ ٹن ہو گئی ہے۔ کچھ عرصے بعد اسے سیمنٹ کی ایک بوری بھی کسی ملک سے لینی نہیں پڑے گی۔

۱۹۲۳ء تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ علمی و ادبی مشغلے برائے نام تھے۔ قلیل تعداد میں اخبارات شائع ہوتے تھے۔ اس لیے کاغذ کی مانگ زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت ملک میں کسی قسم کا کاغذ تیار نہیں ہوتا تھا۔ تعلیم اور نشر و اشاعت کی ترقی کے ساتھ کاغذ کی ضرورت پیدا ہوئی، تو حکومت نے اس میدان میں بھی گھوڑے دوڑائے۔ ۱۹۳۸ء میں پہلی بار ۹۱۰۰ ٹن کاغذ تیار ہوا۔ اس سال اس کی مقدار ۴۵۲۳۷ ٹن تھی۔ قومی ضرورت کو اب بھی غیر ملکوں سے درآمد کر کے پورا کرنا پڑتا ہے۔ اس صنعت کے لیے قدرتی وسائل کو ترقی دینے کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے۔

ملک میں سوتی اور اونی کپڑے کے کارخانے دو قسم کے ہیں۔ کچھ سرکاری ہیں اور کچھ نجی۔ حکومت نے ان صنعتوں کے کچھ حصے دو سبب سے اپنی تحویل میں لیے ہیں۔ اوّل اس لیے کہ جملہ سرکاری ضروریات خود پوری کی جا سکیں اور دوسرے اس لیے کہ کم نرخ کے ایسے کپڑے تیار کیے جائیں جو غریب طبقے میں آسانی سے خریدے جا سکیں۔ نجی کارخانے بہت ہی اعلیٰ معیاری نمونے تیار کرتے ہیں جن کے نرخ زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسے نجی کارخانوں کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہو سکے۔ سرکاری طور پر ۱۹۵۰ء

میں اُونی کپڑا ۶۴۸۸۳۰۰۰ گز اور سوتی ۱۴۲۶۲۳۰۰۰ گز اور اس سال اُونی ۴۴۶۲۰۰۰ گز اور سُوتی ۱۶۷۵۳۲۰۰۰ گز تیار ہوا۔

صنعتی کارخانوں کو چلانے کے لیے قوتِ برقی کی بھی سخت ضرورت پڑتی ہے اور یہ قوت دوسرے کاموں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ ترکی جمہوریت نے اس صنعت کو بھی ترقی دینے میں لاپرواہی نہیں برتی ۱۹۲۳ء میں برقی قوت بنانے کے دس چھوٹے کارخانے ملک میں قائم تھے، جن میں تیار ہونے والی بجلی کی مقدار کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا، کیوں کہ وہ زیادہ تر سلاطین کے محلوں اور اُمرا کے کاشانوں کو روشن کرنے اور ان کی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے مخصوص تھی۔ باقی ملک میں تیل کے چراغ جلا کر گزارا کیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں کارخانوں کی تعداد ۱۵۷ ہو گئی اور ان میں ۲۱۲۸۹۱۰۰۰ کلوواٹ بجلی تیار ہونے لگی اب ان کی تعداد ساڑھے پانچ سو اور بجلی کی مقدار ۱۷۹۸۴۳۲۰۰۰ کلوواٹ ہے۔ بجلی سے صنعتی کارخانوں کے علاوہ زراعتی فارموں میں بھی کام لیا جاتا ہے کھیتوں میں پُرانے ہلوں کے بجائے قوت سے چلنے والے ٹریکٹر استعمال ہوتے ہیں۔ مشینوں سے فصل کٹتی ہے اور باقی سب کام بھی بجلی سے کیے جاتے ہیں۔ برقی قوت کی رفتارِ پیداوار ۱۹۵۰ء سے تیز ہو گئی ہے۔ اس سال حکومت نے بجلی کے کارخانے تیار کرنے پر ۳۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر کے مساوی رقم صرف کی تھی۔ پھر بجلی پہنچانے والی لائنوں پر اسے ساڑھے چار کروڑ ڈالر کے برابر رقم خرچ کرنی پڑی۔ معلوم ہوا ہے کہ اگلے دو سال میں برقی قوت کی پیداوار تین ارب کلوواٹ تک پہنچ جائے گی۔

صنعتی فروغ کے ضمن میں ضروری ہے کہ حمل و نقل اور مواصلات کے ذرائع کو بھی ترقی دی جائے اور ملک بھر میں سڑکوں اور ریلوں کا جال بچھا دیا جائے تاکہ کسی بھی علاقے سے سامان لانے یا وہاں پہنچانے میں دِقت نہ ہو۔ سلجوقیوں کا تو ذکر ہی کیا، سلاطین عثمانیہ کے عہد میں بھی ان کاموں پر پوری توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں پختہ اور نیم پختہ سڑکوں کی کُل لمبائی ۱۳۹۲۳ میل تھی جو اس سال ۳۴۹۹۵ میل یعنی تین گنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ حکومت نے ۱۹۵۰ء میں ایک کروڑ نوے لاکھ ڈالر کی رقم صرف سڑکوں پر خرچ کی تھی۔ اس سال کا خرچ ۱۱۱۷۸۵۰۰۰ ڈالر کے مساوی رہا۔ سڑکوں کے ساتھ ساتھ ریلوں کے نظام کو بھی ترقی ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں چند مشہور شہروں کے درمیان ریل کی پٹریاں تھیں جن کی کُل لمبائی ۲۳۲۰ میل تھی۔ ریلیں باقاعدہ نہیں چلتی تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں پٹریوں کی لمبائی ساڑھے تین ہزار میل ہوئی اور اب چار ہزار نو سو اکتالیس کے قریب ہے۔ پچھلے سال ۵ کروڑ ۷۳ لاکھ مسافروں نے ریلوں سے سفر کیا اور ۶۵۸۵۳۵۶ ٹن

سامان منتقل ہوا۔ ریلوں کا سارا نظام حکومت کے سپرد ہے۔

اس نظام کے علاوہ ملک بھر میں بار برداری کے ٹرکوں، بسوں اور کرائے کی گاڑیوں کی تعداد ۷۱۲۳۷ ہے۔ ترکی فضائیہ نے ملک کے بائیس بڑے شہروں کے درمیان اور کچھ دوسرے ملکوں کے مابین رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ استنبول اور انقرہ کے ہوائی اڈے بین الاقوامی نوعیت کے ہیں۔ یہ نظام ۱۹۳۸ء سے باقاعدہ شروع ہوا ہے۔ اس سال ۲۶۴ بار جہازوں نے پرواز کی اور صرف ۳۹۶ مسافروں نے سفر کیا۔ اس سال پرواز کی تعداد ۱۴۹۴۰ اور مسافروں کی تعداد ۲۲۳۱۰۴ ہے۔

پانی کے جہازوں کا وزن ۱۹۳۸ء میں ۲۱۶۵۰۴ ٹن تھا اور اس سال ۷۹۰۰۳۵ ٹن ہے۔ ان میں سے آدھے وزن کے جہاز سرکاری اور باقی غیر سرکاری ہیں۔ ترکی کے بعض جہاز دنیا کے ہر حصے میں پہنچتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں ٹیلی فونوں کی تعداد ملک بھر میں ۲۰۳۰۳ تھی اور اب ۱۷۳۷۳۰ ہے۔ اسی دوران میں ریڈیو سیٹوں کی تعداد ۴۶۲۳۰ سے بڑھ کر ۱۰۳۷۲۲۳ ہو گئی ہے۔ نشریات کے لیے غیر ملکی زبانوں میں اُردو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کے اور ملکوں کی طرح یہ دونوں محکمے یہاں بھی سرکاری ہیں۔

اس سال کے میزانیہ پر نظر ڈالی گئی تو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ آمدنی اور اخراجات میں ایک پائی کا بھی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ گویا مالیات کے ماہروں نے اس طرح تخمینے تیار کیے ہیں کہ چادر کی صحیح وسعت کے مطابق پاؤں پھیلانے کی نوبت آئی ہے۔ اس سال کا بجٹ ۱۸۷۴۹۰۷۶۸ ڈالر کے مساوی ہے۔ دنیا کے اور ملکوں کی طرح یہاں بھی دفاع پر سب سے زیادہ رقم صرف کی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر تعلیم اور تیسرے پر صحت اور معاشرتی فلاح و بہبود کے کام ہیں۔ سب سے زیادہ آمدنی سرکاری اجارہ داریوں سے ہوتی ہے۔ انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔

صنعت و حرفت اور تجارت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر ملک کو کچھ خام مال اور مصنوعات ایک ملک سے لینی اور اپنا کچھ خام مال اور مصنوعات دوسروں کو دینی پڑتی ہیں، تب ہی نظام معاشرت میں ایک استحکام قائم ہوتا ہے۔ ترکی نے صنعتی فروغ کے بین بین تجارت کو بھی ترقی دی اور اس میدان میں درآمد و برآمد کے دونوں پہلوؤں کو برابر مدِ نظر رکھا گیا۔ ترکی سب سے زیادہ مال ریاست ہائے متحدہ کو فراہم کرتا اور اسی سے اپنی ضرورت کا سب سے زیادہ مال لیتا ہے۔ اس کے بعد مغربی جرمنی، اٹلی، انگلستان، فرانس اور بلجیم کے نمبر ہیں۔ درآمد و برآمد کی دونوں

صورتوں میں یہی ترتیب قائم ہے۔ ۱۹۵۰ء سے پہلے وہ کم رقم کا مال درآمد کرتا اور زیادہ رقم کا مال برآمد کرتا تھا اور اس طرح کئی لاکھ کا زرِ مبادلہ بچ جاتا تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سے حالات کچھ بدل گئے ہیں۔ وہ زیادہ قیمت کا مال درآمد کرتا اور کم قیمت کا برآمد کر رہا ہے۔ اس طرح اس کے محفوظ سرمائے میں سے ہر سال کثیر رقم نکل جاتی ہے لیکن یہ سب کچھ ایک دوررس پالیسی کے ماتحت ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ملک کے مزید صنعتی فروغ کے لیے بھاری مشینیں درآمد کرتا رہا ہے، تاکہ پیداوار بہت بڑھ جائے اور وہ بعض مصنوعات کے ضمن میں عالمی منڈی کے اندر سب ملکوں کا مقابلہ کر سکے اور ان پر غالب آجائے۔ اس طرح زرِ مبادلہ کے عدم توازن سے جو خسارہ ہو رہا ہے، وہ بہت جلد نہ صرف پورا ہو جائے گا، بلکہ اس کی حیثیت ہمیشہ کے لیے مستحکم اور استوار ہو جائے گی۔ ۱۹۵۰ء سے قبل اس کی برآمدی تجارت زیادہ تر خام مال کی صورت میں تھی اور اب مصنوعات نے اس کی جگہ لے لی ہے اور یہ قومی ترقی کی ضمانت ہے۔

درآمدی مال میں بڑا حصہ، مشینری، پٹرول، ادویہ اور پارچہ جات کا ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں کا سلسلہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ ضرورت کے مطابق کارخانے ملک میں قائم ہو چکے ہیں اور بڑی مشینری منگانے کی آئندہ احتیاج نہیں ہوگی۔ مقامی طور پر ان کو بنانے کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ پٹرول کی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ کئی جگہ کامیابی ہو گئی ہے۔ آئندہ کے امکانات خوشگوار ہیں۔ شاید بہت جلد اس کی درآمد کی مقدار بھی گھٹ جائے گی۔

ملک میں طبِ مشرقی کے فروغ کا مستقبل روشن ہو گیا ہے۔ ملک میں ایسی صدہا جڑی بوٹیوں اور دوائی پودوں کی تحقیقات مکمل کر لی گئی ہے، جن کو کام میں لا کر دوا سازی کے مقامی کارخانے خوب ترقی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں بھی اس کی درآمدی تجارت کم ہو جانے کا امکان ہے۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ ملک سے اُون اور کپاس کی برآمد گھٹ جائے اور قومی کارخانوں میں ان کی کھپت بڑھ جائے۔ اس کامیابی کے بعد پارچہ جات کی درآمد خود بخود کم ہو جائے گی۔ ترکی کی برآمدی تجارت میں تمباکو اور پھلوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ چوں کہ زراعت کو بھی ترقی نصیب ہو رہی ہے، اس لیے تمباکو اور پھلوں کی برآمدی مقدار برابر بڑھتی رہے گی اور اس طرح زیادہ سے زیادہ زرِ مبادلہ حاصل ہوتا رہے گا۔ اب تک ہر سال تقریباً چودہ کروڑ ڈالر کا تمباکو اور سات کروڑ ڈالر کے پھل باہر بھیجے جاتے ہیں۔

زرعی ترقی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نظامِ لگان داری کو اچھی طرح شعار لیا گیا ہے اور

بہت سے بنجر علاقے زرخیز بنا لیے گئے ہیں۔ زراعت کی ہر منزل میں فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔

ترقی کی راہ پر فروغ تعلیم کے لیے بھی بہت سے سنگِ میل نصب ہو گئے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں مدرسوں کی تعداد ۵۰۶۲، طلبا کی ۳۵۸۵۴۸ اور اُستادوں کی ۱۲۴۵۸ تھی۔ اب مدرسوں کی تعداد ۲۰۱۵۴، طلبا کی ۲۴۸۵۱۲۵ اور اُستادوں کی ۵۹۶۵۷ ہے۔ لیکن اس تصویر کا سب سے زیادہ روشن رخ یہ ہے کہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ توجّہ دی جا رہی ہے۔ باشندوں کو محض زباں داں ہی نہیں، ہنرمند بنایا جا رہا ہے۔ چوں کہ ملک کے تقریباً ۸۰ فیصدی باشندے کاشت کاری، ماہی گیری اور جنگلات کے کاموں میں مصروف ہیں، اس لیے دیہی علاقوں میں تربیتی مرکزوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہاں کی آبادی اپنے اپنے کام کو بالکل سائنسی انداز میں انجام دے تاکہ زیادہ سے زیادہ بازیافت ممکن ہو، جو خود ان کے اور ساری قوم کے فائدے کی صورت ہو۔

ملک کی آبادی دورانِ جنگ کے علاوہ ہر سال تیزی سے بڑھتی رہی ہے لیکن اربابِ حل و عقد کے لیے یہ اضافہ تشویش ناک نہیں ہے۔ کسی نے آج تک مالتھس کے نظریے پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ قدرت نے اس ملک کو ایسے وسائل و ذرائع سے مالا مال کیا ہے کہ اگر ان سے پوری طرح استفادہ کیا جائے تو بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کبھی بھی پریشان کن نہیں ہوگا، بلکہ صنعتی کارخانوں میں جو مزدوروں کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی ہے، دور ہو جائے گی اور ان کا وجود صنعتی فروغ کے لیے نعمت ثابت ہوگا۔

ترکی کے سب اسٹالوں میں سجائی ہوئی چیزوں کو دیکھ لینے اور ان کے ترقی کے اعداد و شمار پڑھ لینے کے بعد اس ملک کی عظمت کا گہرا نقش ہمارے دل و دماغ پر بیٹھ گیا۔ ہم نے آرزو کی، کاش! ہمارا ملک بھی اسی تیزی کے ساتھ ترقی کر کے اعلیٰ منزل پر پہنچ جائے۔ اسے ایک طرف کسی غیر ملک کا دست نگر نہ ہونا پڑے اور دوسری طرف کوئی ہمسایہ ملک اسے آنکھیں نہ دکھا سکے۔ اندرونِ ملک خوش حالی رہے اور باہر اس کی برتری کا لوہا مانا جائے۔

جی تو چاہتا تھا کہ ہم دوسرے ملکوں کے اسٹالوں میں بھی جا کر ان کی ترقیوں کے نشانات اور آثار دیکھیں لیکن وقت کی کمی کے اعتبار سے یہ ممکن نہیں تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ ہم وہ اسٹال اپنے ہی ملک میں صنعتی نمائش کے موقع پر دیکھ لیں گے، جو تقریباً ہر سال ہوتی ہے۔

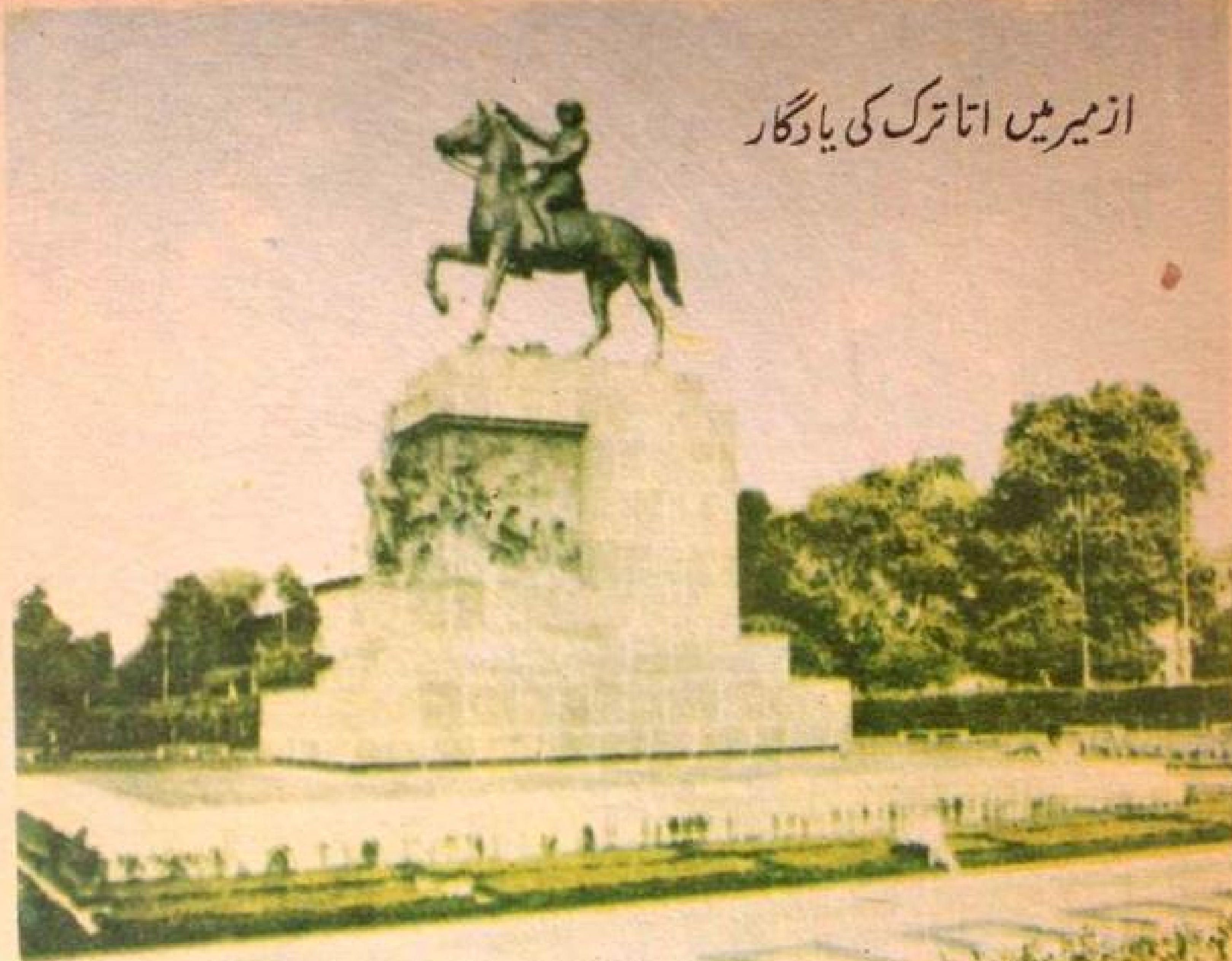
جہاں تک مجھے یاد ہے، ترکی نے ہمارے ملک کی کسی بین الاقوامی صنعتی نمائش میں حصّہ نہیں لیا۔ اس کے برعکس ہمارا جی چاہا کہ آئندہ کسی سال ہمدرد لیبارٹریز کا ایک عمدہ اسٹال ازمیر کے میلے میں لگایا جائے اور ہر چہار طرف سے یہاں آنے والوں کو بتایا جائے کہ پاکستان میں مشرقی طب کے نام لیوا موجود ہیں اور اس فن مفید نے یہاں کتنی ترقی کی ہے۔

ہم نے میلے کے دفتر استقبالیہ سے یہاں جگہ مخصوص کرانے اور اسٹال تعمیر کرنے کے بارے میں جملہ معلومات حاصل کریں۔ میلے کے منتظم اعلیٰ نے ہمیں یقین دلایا کہ اگر ہم اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہو جائیں تو مطبوعہ شرائط میں بھی بہت کچھ لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔ میلے کا بنیادی مقصد غیر ملکوں سے رُپیہ کمانا نہیں ہے بلکہ اصل منشا یہ ہے کہ اس میں شریک ہونے والے ملک آپس میں اقتصادی، تجارتی اور ثقافتی رابطہ قائم کریں اور ساتھ ہی اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

ازمیر کا میلہ ملک کی وزارتِ اقتصادیات و تجارت، ازمیر کی مجلسِ بلدیہ اور محکمہ سیر و سیاحت کی نظامت عامہ کے مشترک اہتمام سے عمل میں آتا ہے۔ اس میلے کی مجلسِ بین الاقوامی میلوں کی انجمن کی رکن ہے اور ازمیر کے میلے میں کسی بھی لحاظ سے شریک ہونے والوں کی جملہ ضروریات اور سہولتوں کا خیال رکھتی ہے اور اگر سیّاح یا دکان دار ازمیر کے علاوہ مضافات یا دوسرے شہروں میں جانا چاہیں تو مناسب انتظام کرتی ہے۔

کلچر پارک میں یہاں یہ بین الاقوامی صنعتی میلہ لگتا ہے، غیر ملکی سامان کی نمائش کے لیے دو قسم کے اِسٹال ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جنھیں خود انجمن نے مختلف سائز میں تعمیر کر لیا ہے اور انھیں پیمائش کے لحاظ سے مقررہ کرائے پر ایک ماہ کے لیے لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ جو غیر ملکی حکومتیں یا ادارے اپنی مرضی اور ضرورت کے مُطابق اپنے سرمائے سے، لیکن نقشوں کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد تعمیر کرتے ہیں۔ انجمن کے اپنے اسٹال تو بہت ہی زیادہ پائیدار اور مستقل نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن دوسرے ملک یا ادارے، جو صرف ایک سال کے لیے حصّہ لینا چاہتے ہیں، بالکل چلتاؤ کام کرتے ہیں۔ پھر بھی ایک ماہ کی نمائش کے لیے تقریباً دو ماہ میں معمولی اسٹال تعمیر ہوتا ہے اور بعد ازاں اسے منہدم کرنے اور ملبے کو ٹھکانے لگانے میں پندرہ دن لگ جاتے ہیں، تاہم غیر ملکی سرمائے کے وہ اِسٹال بھی عمدہ اور مضبُوط ہوتے ہیں جنھیں آٹھ سال برقرار رکھنا منظور ہوتا ہے۔

میلہ ہر سال ۲۰ اگست سے شروع ہوتا ہے لیکن اس میں شریک ہونے والوں کے لیے یکم مارچ سے ۳۰ جون تک جگہ محفوظ کرنے کی درخواست ایک فارم پر دینی پڑتی ہے۔ اس کے بعد انتظام ذرا مشکل



ازمیر میں اتاترک کی یادگار



ازمیر میں "ساعت گلیسی"



ازمیر کے میلے کی چند مصنوعات

ہوجاتا ہے۔ درخواست میں واضح طور پر لکھنا پڑتا ہے کہ کس قسم کے سامان کا مظاہرہ ہوگا اور یہ کہ وہ صرف نمائش کے لیے ہوگا یا فروخت بھی کیا جاسکے گا کیونکہ دوسری صورت میں کسٹم ڈیوٹی بھی لگائی جاتی ہے۔ کرائے کا تعین رقبے اور محلِ وقوع پر منحصر ہوتا ہے۔ سامان کے لانے لے جانے میں خاص سہولتیں اور رعایتیں دی جاتی ہیں۔

ان سب باتوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ وطن جاکر کسی آئندہ سال اس میلے میں شریک ہونے کا منصوبہ ضرور بنایا جائے گا تاکہ ترکی میں ہمدرد کی مصنوعات کا تعارف ہوسکے۔ ہماری کوشش یہی ہوگی کہ مستقل اسٹال بنالیا جائے ورنہ کچھ عرصے عارضی انتظام پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

ازمیر سے واپسی:۔ ساڑھے نو بجے کے قریب ہم کو میلے کی حدود سے چلے جانے کا فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ ہوائی اڈّے پر جانے کے لیے بہت جلد ٹیکسی مل گئی۔

واپسی میں ہم دو تاریخی مقامات کے قریب سے گزرے۔ ایک اتاترک اینتی کہلاتا ہے۔ ایک عمدہ سرسبز و شاداب باغ میں ایک اونچے سنگین پائے پر اتاترک کا مجسمہ ایک گھوڑے پر سواری کرنے کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ نیچے پائے پر سنگین نقوش کی صورت میں بہت سے ترک اپنے ملک کی ترقی کے لیے کشمکش میں مبتلا دکھلائے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ہمارا خیال ہو، حقیقت کچھ اور ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہمیں اس کا مطلب سمجھا نہیں سکا۔

دوسری قابلِ دید اور تاریخی چیز ایک عمدہ گھنٹہ گھر ہے جسے ترک "ساعت کلیسی" کہتے ہیں۔ یہ گھنٹہ گھر تقریباً دو صدی پرانا ہے۔ اسے کئی منزلوں میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس پر چڑھنے کا اندرونی چکردار زینہ بھی ہے۔ طرزِ تعمیر ان عمارتوں سے بالکل مختلف ہے جو ہم استنبول میں دیکھ آئے تھے۔

ہم وقت سے کچھ دیر پہلے ہی ہوائی اڈّے پر پہنچ گئے۔ اس وقت استنبول جانے والے مسافروں کی تعداد بہت ہی کم تھی لیکن ہمیں معلوم ہوا اور پھر تجربہ بھی ہوگیا کہ تھائی جہاز وقت کے بہت پابند ہوتے ہیں اگر ایک دو مسافر بھی موجود ہوں تو وہ انھی کو لے کر پرواز کرجاتے ہیں۔

نصف شب گزرنے کے کچھ دیر بعد ہم ہوٹل ہلٹن پہنچے۔ وہاں حسبِ معمول خوب گہما گہمی تھی رات کو دن کا سماں بندھ رہا تھا۔

اپنے کمرے میں برکات صاحب ہمارے انتظار میں جاگ رہے تھے اور اپنے آپ کو بیدار رکھنے کے لیے دفتر کے ضروری فائلوں میں غرق تھے۔

انھوں نے ہماری خیریت معلوم کی، سفر کا مختصر حال سُنا اور پوچھا کہ کیا ترکی کو خیرباد کہنا کل

ہی ضروری ہے۔ ان کے اس سوال میں ایک عجیب حسرت تھی جس کا ہم پر بھی اثر ہوا۔ انکا دل چاہتا تھا کہ ہم چند دن اور ٹھیریں لیکن یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور باندھ چھوڑ کر رکھ دیا تاکہ صبح کو روانگی کے وقت دقت نہ ہو۔ دوسرے شہر نہیں دوسرے ملک جانا تھا، اس لیے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ جیسی ضروری دستاویزات کو بھی دیکھ بھال کر رکھ لیا۔

سونے سے قبل میں نے چند لمحے کے لیے سوچا کہ ترکی میں حقیقتاً بہت سے مقامات کی زیارت سے محروم رہ کر واپس جانا پڑ رہا ہے۔ پہاڑوں میں سے کم از کم کوہ ارارات کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنے کی حسرت دل میں کروٹیں لیتی رہ گئی۔ اس چوٹی کو دیکھنا تھا جہاں طوفانِ آب ختم ہونے کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی لنگر انداز ہوئی تھی اور جہاں اس کشتی میں سے چوپایوں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے علاوہ ان آٹھ مردوں اور عورتوں نے قدم رکھا تھا جن کی اولاد اور اولاد کی اولاد نے خوب پھیل پھیل کر آج دنیا کی آبادی ڈھائی ارب سے زیادہ کر دی ہے اور جس کی بے تحاشا افراط سب کے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہے۔

طوفانِ نوحؑ کی روایت پر اظہارِ تعجب کی ضرورت نہیں۔ وہ تو انسان کی عبرت کے لیے ایک اچھا سبق ہے لیکن تعجب اس وقت ضرور ہوتا ہے جب یہ خبر آتی ہے کہ اب کوہ پیماؤں کی فلاں جماعت نے کوہ ارارات کی ایک چوٹی پر کشتیٔ نوحؑ کے ایک شکستہ حصے کا کھوج لگا لیا ہے اور شاید باقی کشتی بھی انھیں جلد مل جائے گی۔ اسی خبر میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کشتی کا وہ حصہ فی الحال برف کی اٹھارہ یا بیس فیٹ موٹی تہ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ برف توڑ کر یا پگھلا کر اسے برآمد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پھر اس کوشش میں ناکامی کی خبر آتی ہے، یا لکڑی کا کوئی گلا سڑا تختہ دکھا کر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ کشتی میں فلاں مقام پر جڑا ہوا تھا۔ دوسری جماعت اس دعوے کی تکذیب کرتی ہے اور ایک ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے۔ جنت الحمقاء میں بسنے والے جب تک موجود ہیں ایسے دعوے ہوتے ہی رہیں گے۔

یہ پہاڑ ترکی کے بالکل مشرقی سرے پر روسی سرحد کے قریب واقع ہے۔ انقرہ اور استنبول جیسے شہروں سے اس کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اور پھر وہاں تک پہنچنے کے لیے جدید قسم کی سہولتیں میسر نہیں آ سکتیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اپنے قلیل وقت کے پروگرام میں اس کے لیے گنجائش نکالنا ممکن نہیں تھا۔ یہ حسرت کسی اور وقت پوری کرنے کے لیے دل میں جاگزیں رکھ کر میں سو گیا اور صبح تک بے خبر سوتا رہا۔

یوگوسلاویہ

(بلغراد)

۳۰ر اگست ۱۹۵۶ء ——— جمعرات

استنبول کی راتیں تو واقعی خاصی ٹھنڈی گزری ہیں۔ سات دن کی تھکن نے شاید سردی کا زیادہ احساس پیدا کر دیا تھا۔ صبح جلد اٹھے کہ ۸ بجے ہوائی جہاز کی اُڑان ہے، ۷ بجے ہوائی میدان پر پہنچنا ہے۔ برکات احمد صاحب تو ۵ بجے سے بیدار ہیں اور جب ہم اٹھے تو وہ تیار تھے اور تلاوت قرآن پاک میں محو۔ ہماری طرح ان کو بھی یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جدائی قریب ہے۔ ہر چند کہ سفر یورپ میں وہ ہمارے ساتھ ہیں، مگر چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے وہ اب ہم سے بون (جرمنی) میں آملیں گے۔ چند دنوں کی تو بات ہے، مگر پھر بھی دل پر بوجھ تو ہے۔

ناشتہ ہم نے کمرے ہی میں منگوا لیا جو ہلٹن کی روایتی شان کے ساتھ آیا۔ اس گراں ناشتے سے میں ہمیشہ سرگراں ہو جاتا ہوں۔ یہ ٹھاٹھ باٹھ مجھے ناپسند ہیں کہ زندگی کے سکون میں یہ حائل ہو جاتے ہیں۔ اتنے دن ہلٹن میں رہا، لوگ یہاں ٹھیرنے کی تمنائیں ساتھ لے کر آتے ہیں اور میں اتنے دنوں اس کا انتظار کرتا رہا کہ کب ۳۰ر اگست آئے اور اس ہوٹل سے نجات ملے۔ جہاں قدم قدم پر عیش و نشاط ہے، ایک مصنوعی سی زندگی ہے جس میں "جان" نہیں۔ آزادی ہے مگر آزادی نہیں سہولتیں اور آرام اتنا وافر کہ بے آرامی اور عدم سکون کی تعریف میں آگیا ہے۔

سامان نیچے آیا۔ برکات صاحب نے صبح ہی موٹر صاف کر دینے کی ہدایت کر دی تھی جس کا معاوضہ تین لیرا (پانچ روپے) ادا کیا گیا تھا۔ سامان موٹر میں رکھا گیا۔ برکات احمد صاحب نے موٹر خود چلائی۔ احمد ساتھ ہے۔ ہوائی میدان پہنچے۔ کسٹم میں سامان چلا گیا اور ہم ٹکٹ وغیرہ درست کرانے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ پاکستانی ہونے کی وجہ سے میرے ساتھ امتیازی سلوک ہوا اور بغیر کسی تکلیف کے ہم یہاں کی "فارمیلٹیز" سے فارغ ہو گئے۔ برکات احمد صاحب کہتے تھے کہ ترکی میں پاکستانیوں کو وہ مراعات حاصل ہیں کہ جو ڈپلومیٹس تک کو میسر نہیں۔

یوگوسلاوین ائر ٹرانسپورٹ (یاٹ — JAT) کا طیارہ سامنے کھڑا ہے جو ہمیں بلغراد لے جائے گا۔ اسی ہوائی سروس کا یہ پہلا تجربہ ہوگا۔ دیکھیے کیا رہتا ہے۔ استنبول کے ہوائی میدان کی عمارت بڑی اچھی ہے، اس لیے ہم اندر بیٹھ جانے کے بجائے باہر آگئے اور ٹہلتے رہے۔ برکات

صاحب پر زور دیتے رہے کہ وہ مقررہ تاریخ کو بون پہنچ جائیں اور وہ وعدے کرتے رہے۔ دراصل برکات بڑے دل چسپ آدمی ہیں۔ ایسے سفر میں کہ جو مقصدی ہو، تفریحی نہ ہو، ان کا ساتھ ہونا بڑی کمیوں کی تلافی کر دیتا ہے۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ جہاز تیار ہے، مسافر جہاز میں آجائیں۔ ہم ایک دوسرے سے ملے۔ میں خاص طور پر احمد سے ملا اور اسے مناسب انعام بھی دیا کہ اس نے استنبول کے دوران قیام میں میرا بڑا ساتھ دیا۔ اس کی معیت میں ایسے ایسے مقامات دیکھ لیے جہاں تنہا جانا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم جہاز کے اندر جا بیٹھے، مگر نگاہیں باہر تھیں اور حاجی برکات احمد صاحب پر تھیں، جو بڑے الرٹ کھڑے تھے۔ جہاز نے جنبش کی، ہم نے ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کیا، برکات صاحب نے رومال ہلا کر ہمیں رخصت کیا۔ چند ہی منٹوں میں جہاز ہوا کے دوش پر سوار ہو گیا۔ اس وقت ۸ بجکر ۸ منٹ ہوئے تھے۔ اب ہماری آگے کی منزل بلغراد (یوگوسلاویہ کا صدر مقام) ہے۔ یوگوسلاوین ائر ٹرانسپورٹ کا یہ جہاز جس پر ہم سوار ہوئے، اچھا خاصا ہے۔ اٹھائیس سواریوں کے لیے عمدہ نشستیں موجود ہیں لیکن مسافر صرف سات ہیں۔ معلوم ہوا کہ زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی۔

ترکی میں سات دن بڑی بھاگ دوڑ میں گزر گئے اور نیند ایک دن بھی پوری نہیں ہوئی۔ اس لیے طبیعت ہم دونوں بھائیوں کی صاف نہیں ہے۔ جس طرح بعض لوگ سُولی پر بھی نیند کے قدرتی حملے سے محفوظ نہیں رہ سکتے، مجھے ہوائی جہاز میں اکثر نیند آجاتی ہے۔ چناں چہ اس جہاز میں بھی نیند کا غلبہ رہا۔ نیند کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں ہے۔ نوزائیدہ بچے روزانہ بائیس گھنٹے تک سوتے ہیں اور دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی گزرے ہیں، جن کو چوبیس گھنٹوں میں سے ایک لمحے کے لیے بھی نیند نہیں آتی تھی۔ صحت برقرار رکھنے کے لیے عموماً چھے سات گھنٹے سونے کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں، حالاں کہ نپولین بونا پارٹ صرف چار گھنٹے روزانہ سونے کا عادی تھا۔ دراصل موسم و ماحول کے اختلافات کے علاوہ ہر شخص کی جسمانی قوت، اس کے کام کاج اور مشاغل کی نوعیت، اس کے خورد و نوش کے انداز، خواب گاہ اور اس کے لوازمات اور سب سے زیادہ ذہنی رجحانات کو نیند کے معاملے میں بڑا دخل حاصل ہے۔ مثلاً حضرت غالب کے نزدیک ایک طرف نیند کا لطف صرف اس عاشق بامراد کو میسر آسکتا ہے جس کے شانوں پر محبوب کی زلفیں پریشان ہو رہی ہوں اور دوسری طرف مرنے کا خوف جبکہ موت کا دن معین ہونا بھی ایک تسلیم شدہ امر ہے، شاعر کو رات بھر نیند سے محروم رکھتا ہے۔ مجھ پر کسی کی زلفوں کی مہک کے بغیر ہی نیند کا غلبہ تھا مگر زیادہ مسلسل نیند اس لیے نہیں آئی کہ جہاز کے پہنچنے کا صحیح

وقت یاد نہیں رہا۔ جہاز میں انگریزی زبان سے کوئی واقف نہیں۔ ایئر ہوسٹس کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ "یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا دیتی، جیسے ہماری اس سے کوئی دیرینہ واقفیت ہو، مگر مسکرانے کی تعلیم ہر ایئر ہوسٹس کو دی جاتی ہے۔

مسکراہٹ ایک ایسی بین الاقوامی زبان ہے جس کے الفاظ کی تشکیل حروف تہجی کے بغیر اور جس کے جملوں کی ساخت صرف و نحو کے اصولوں سے قطع نظر عمل میں آتی ہے اور صوتی بندشیں نہ ہونے کے باوجود اس میں وہ کلامِ بلیغ پنہاں ہوتا ہے، جسے صرف دل کے کانوں سے سن کر روح کی گہرائیوں میں پیوست کر لیا جاتا ہے۔ تاہم ایئر ہوسٹس کی اس مسکراہٹ سے ہمارا مسئلہ تو حل نہیں ہوا۔ ہم تو یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ جہاز بلغراد کس وقت پہنچے گا۔ ہمارے پروگرام میں جو وقت لکھا ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں۔

اسی حال میں کوئی پونے گیارہ بجے ہمارے جہاز نے کسی مقام پر اترنا شروع کر دیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جہاز جب زمین سے آسمان کی جانب بلند ہو رہا ہو، یا فضا میں پرواز کر رہا ہو تو اندر بیٹھنے والوں کو اس کی نقل و حرکت کا ذرا علم نہیں ہوتا، البتہ جب وہ زمین پر اترنے لگتا ہے تو یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم آسمان کی لامتناہی وسعتوں سے سمٹ کر اپنے کرۂ خاکی کی محدود سرزمین پر پہنچنے والے ہیں۔ ذہن میں تین گھنٹے کا سفر تھا۔ سمجھ لیا گیا کہ بس یہی بلغراد ہے۔ اترنے کی پوری تیاریاں کر لیں اور جب جہاز ٹھیرا تو بھائی جان محترم نے کھڑکی کے باہر نظر ڈال کر فرمایا کہ یہ بلغراد معلوم نہیں ہوتا، کوئی دوسرا مقام ہے۔ چناں چہ یہی ہوا۔ ایئر ہوسٹس نے کٹ پتلی کی طرح، یا چپ سوانگ میں کام کرنے والے اداکاروں کی طرح اشاروں میں بتایا کہ ہم سامان جہاز میں چھوڑ دیں، صرف اپنے ہینڈ بیگ ساتھ رکھ لیں۔

"یہ اسکوپیے" ہوائی میدان نکلا۔ لفظ "اسکوپیے" لاطینی حروف کے اعتبار سے ایس، کے، آر، پی، جے، ای پر مشتمل ہے۔ جے کی آواز ی سے نکلتی ہے اور بعض لوگ پی سے پہلے حرف ایل بھی لکھتے ہیں، جو بے صدا رہتا ہے۔ اس ملک کے ایک اور صوبے کے صدر مقام کا نام اتنا ٹیڑھا ہے کہ اس کا صحیح تلفظ ادا کرنے کے لیے کسی قدر مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے، کیوں کہ وہ نام لیتے وقت زبان تین بار بل کھاتی ہے، ہونٹ دو بار ایک دوسرے سے وصل ہوتے ہیں، جبڑے کی ہڈیاں کئی بار کھلتی اور بند ہوتی ہیں اور پھر بھی وہ تلفظ یقینی نہیں جو اہل زبان سے ممکن ہے۔ میں جان بوجھ کر اسے لکھنا نہیں چاہتا، کیونکہ جہاز زمین پر اتر رہا ہے، اس کو خدا اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

ہوائی میدان عجیب ہے جس پر کوئی "رن وے" نہیں ہے، بلکہ جہاز معمولی زمین پر اترا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ بارش کے دنوں میں اس زمین پر جہاز کیسے اتارا جا سکتا ہے۔ بہرحال ہم جہاز سے اُترے اور ایک ہال میں لے جائے گئے۔ جہاں ہم سے پاسپورٹ لے لیے گئے اور بھرنے کے لیے فارم دیے گئے جو یوگوسلاویائی زبان میں تھے۔ دو زبانوں کی طرح اس ملک میں دو مختلف رسم الخط بھی رائج ہیں ان میں سے ایک جو بالکل لاطینی حروف میں ہوتا ہے ہم پڑھ سکتے لیکن سمجھ نہیں سکتے تھے۔ دوسرے رسم الخط میں کچھ حروف لاطینی کے لیکن جُداگانہ تلفظ کے ساتھ، اور کچھ حروف نئی ساخت کے ہوتے ہیں، اس لیے اس کو تو پڑھنا بھی محال تھا۔ غنیمت ہے کہ فارم پر تیسری زبان فرانسیسی تھی۔ ہم نے اسی کی مدد سے اپنا فارم بھرا۔ مگر ہم حیران تھے کہ اسکوپیئے پر ہمارے پاسپورٹ چیک کرنے اور فارم بھروانے کا کیا موقع ہے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ کسی سے یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ آخر یہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ ہمارا سامان کسٹم چیکنگ کے لیے جہاز سے اتار لیا گیا اور یقین آ گیا، یہ بلغراد نہیں ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ کیا یہاں سے ہمیں موٹروں میں بلغراد پہنچایا جائے گا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہاز میں ہماری نشستوں پر سامان کیوں رکھنے کا مشورہ دیا گیا؟ کیا ایئر ہوسٹس کی بات سمجھنے میں ہم نے غلطی کھائی ہے؟ اسی کشمکش میں تھے کہ سامان کھول دینے کے اشارے ہوئے۔ سامان ہمیں ہی اٹھا کر لانا اور کسٹم کی میز پر رکھنا پڑا اور پھر وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانا پڑا۔ بعض ایسے لوگ بھی تھے جن کو یہ ورزش کرنی نہیں پڑی۔

ہمارے ساتھ کچھ ہلکے پھلکے تحائف تھے، جو کہیں کہیں لوگوں کو دینے تھے۔ دانے دانے پر مُہر ہوتی ہے لیکن یوگوسلاویہ میں رہنے والے کسی شخص کے نام کی مُہر ان میں سے کسی چیز پر لگی ہوئی نہیں تھی۔ ہم نے ایسا سامان ایک جگہ کر لیا تھا تاکہ کسٹم پر ہر جگہ دکھانے اور بتانے میں سہولت ہو۔ کسٹم افسر صاحب نے اس کو دیکھ کر آنکھیں پھاڑیں اور غور سے ہمیں دیکھا، جیسے ہم نے کوئی جرم کیا ہو لیکن ہم نے ہمدرد کی معجون مقوی قلب کھا رکھی تھی، اس لیے ذرا گھبراہٹ نہ ہوئی اور یوں بھی نیت صاف تھی، اس لیے منزل آسان نظر آ رہی تھی۔ افسر صاحب نے اشاروں کی زبان میں ہم سے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ اب بتائیے کہ ہم اشاروں سے کس طرح سمجھائیں کہ یہ کوئی تجارتی سامان نہیں ہے، بلکہ دوستوں کو دینے کے لیے چند تحائف ہیں۔ ان کی یہ بے قیمت ہے۔ لاکھ کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا اور آخر کار اس نے ہمارے بیگ کو مُہر بند کر دیا اور اتنا وہ ہمیں بتا سکا

کہ بلغراد پر اس سامان کی کسٹم ڈیوٹی ہمیں ادا کرنی ہوگی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ چلو بلغراد پر وضاحت کردی جائے گی۔ اس طرح اس چیکنگ سے نجات حاصل ہوئی۔

اسکوپئے کے ہوائی میدان پر یوگوسلاویوں سے زندگی میں پہلا سابقہ پڑا کسٹم افسر اکثر و بیشتر سخت ہوا کرتے ہیں اور انھیں ہونا بھی چاہیے لیکن بدمزاج نہیں ہوتے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ ایئرپورٹ کے عملے کا رُوکھا پن ایک خاص تعصب کی بنا پر تھا۔ اس نکتے پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

اسکوپئے صوبہ مقدونیہ کا صدر مقام ہے اور یہ مقدونیہ وہی ہے جسے یونان کے زمانۂ عروج اور اسکندرِ اعظم کے عہد میں ایک خاص مقام اور شہرت حاصل تھی۔ مقدونیہ کے باشندے زیادہ تر یونانی نسل اور نصرانی مذہب کے حامل ہیں۔ اس علاقے میں مسلمان خال خال نظر آتے ہیں۔ ترکوں کے فاتحانہ دور میں ان کا اثر و اقتدار اس علاقے پر ذرا کم رہا لیکن عام لوگوں کے خیال کے مطابق وہاں کی ثقافت کو ضرور نقصان پہنچا۔ اسی لیے وہ عام طور پر ترکوں سے نفرت کرتے ہیں۔ پھر جس طرح پاکستان کے سابق صُوبہ سندھ کے اندرونی حصے میں آپ کہیں چلے جائیں، عموماً سندھی لوگ ہر غیر سندھی پاکستانی کو خواہ وہ پنجابی ہو یا پاکستان کے کسی اور علاقے سے تعلق رکھتا ہو، یا غیر منقسم برصغیر کے کسی اور صوبے سے ہجرت کرکے آیا ہو، پنجابی ہی سمجھتے ہیں، اسی طرح مقدونیہ کے باشندے دنیا کے ہر مسلمان کو، خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو، تُرک گردانتے ہیں، اور اس لیے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمارے ناموں سے، نیز لباس اور وضع قطع سے انھوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ مسلمان ہیں، اس لیے ان کے قیاس کے مطابق ہم ترک تھے اور بے التفاتی کے سزاوار تھے۔

کسٹم افسر جس سے ہمیں سابقہ پڑا، بدمزاج تھا اور شاید بدخو بھی تھا۔ بار بار اپنے نیکر کو اپنی توند پر اس انداز سے چڑھاتا تھا کہ جیسے اب کُشتی لڑنے والا ہے۔ میں نے اس کے کان بغور دیکھے مگر وہ ٹوٹے ہوئے نہ تھے۔ ورنہ میں سمجھ لیتا کہ یہ ضرور کشتی باز ہے، یا کسی اکھاڑے میں ریاضت کرتا ہے۔ بولتے وقت اس کے منہ سے تھوک کے فوارے چھوٹتے تھے، اس کے دانت بڑے ہی گندے اور میلے تھے۔ جس میز پر ہمارا سامان چیک ہو رہا تھا، بالکل اسی کے ساتھ ایک دکان تھی، جو مسافروں کو تر و تازہ کرنے کے لیے پینے کی چیزیں فراہم کرتی ہے۔ اس دکان کی الماریوں پر میں نے ایک گہری نظر ڈالی۔ مجھے شراب کی مختلف النوع بوتلوں کے سوا کچھ اور نظر نہ آیا۔ حالاں کہ ان

لوگوں کے مشروبات میں اور بھی بہت سی عجیب چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً مچھلی، کیکڑے، جھینگے، گھونگے اور اوکٹوپس تک کا شوربہ گرم اور ٹھنڈا بہت ہی مرغوب شے ہے، مجھے جس کے تصور ہی سے پھریری آتی ہے۔ اس دکان پر ایک عورت کھڑی تھی، جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور شاید اس نے صبح سے منھ بھی نہیں دھویا تھا، کیوں کہ آنکھوں میں چیپڑ تھے۔ ہمیں پیاس خاصی لگ رہی تھی، مگر یہاں سے پانی پینے کو دل نہیں چاہا۔ شبہ تھا کہ اس میں کسی ناجائز یا مکروہ چیز کی آمیزش نہ ہو۔

کسٹم سے فارغ ہو کر ہم جن کرسیوں پر بٹھائے گئے، وہاں دو اور آدمی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک بوتل دو گلاس غالباً شراب سے بھرے رکھے تھے۔ ان کی شکل وصورت اور لباس ایسا تھا جیسے یہ کسی فیکٹری کے کارکن ہوں۔ یہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے مگر خاموش تھے اور زندگی سے بیزار معلوم ہوتے تھے۔ اسی ہال میں مارشل ٹیٹو کی ایک تصویر آویزاں تھی مگر ان کی پیشانی پر بھی کئی بل پڑ رہے تھے۔

ہم نے یہاں اپنی گھڑیاں ٹھیک کیں۔ ترکی کے وقت سے یوگوسلادیہ کا وقت ایک گھنٹے پیچھے ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر جہاز پر سوار ہوئے۔ یہاں سے سات آٹھ سواریاں مزید ساتھ ہو گئیں۔ اب جہاز میں کسی کی جگہ کوئی بیٹھ گیا۔ بھائی جان کی نشست پر کوئی اور صاحب تشریف فرما ہو گئے انھوں نے اتنا بھی نہیں دیکھا کہ وہاں کسی دوسرے کا سامان رکھا ہے۔ ایسے موقعوں پر عموماً ہوائی جہاز میں یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ اولاً وہی لوگ بٹھائے جاتے ہیں، جو پہلے سے سفر کر رہے ہوں۔ نئے آنے والے بعد میں ہوائی جہاز میں داخل ہونے کے مجاز ہوتے ہیں، مگر یہاں شاید اسے تکلف کہا جاتا ہے۔ اور کسی کے سامان پر جا بیٹھنا بے تکلفی کی تعریف میں آتا ہے۔

بارہ بجے ہمارا جہاز دوبارہ اترا۔ یہ یقیناً بلغراد تھا۔ ہوائی جہاز چلانے والے بلاشک بہت ہوشیار تھے۔ کچی زمین پر اس خوبی سے جہاز اُڑایا اور اُتارا کہ ہمیں محسوس تک نہ ہوا۔ بلغراد کے میدان پر سیمنٹ کی ایک پٹری ضرور ہے۔ مگر اس کے ختم ہونے کے بعد جہاز کو کچے میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

انگریزوں کی غاصبانہ اُفتادِ طبیعت کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ وہ غیروں کی ہر شے کو توڑ مروڑ کر فرنگی ہاون دستے میں کوٹ کر اور انگریزی چھلنی میں چھان کر اپنی چیز بنا لینے کے عادی ہیں۔ ان کی یہ دھاندلی لوگوں اور شہروں کے ساتھ بھی عموماً چلتی ہے۔ چناں چہ شیخ الرئیس بو علی سینا کو "ایوے سینا" علامہ رازی کو "راسس" یا ابن رشد کو "ایوے روز" بنا لینا یا کالی کٹ کو "کیل کٹا" اور دہلی کو "ڈیل ہی" کہنا اس ضمن کی چند مثالیں ہیں۔ خود مغربی دنیا میں بھی ان کا ہاتھ اسی طرح صاف ہوا ہے۔

منجملہ اور مثالوں کے ایک قابلِ ذکر نام بلگراڈ ہے۔ یہ دراصل "بیوگورود" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ سامی نسل کے اکثر چونکہ حرف گ کا تلفظ ادا کرنے سے فطرتاً قاصر ہیں، اس لیے انھوں نے بلگراڈ کو بلغراد کہنا شروع کیا۔ پاکستان و ہند کے باشندے اگرچہ تمام حروف کے تلفظ آسانی سے ادا کر سکتے ہیں لیکن صوتی نزاکت کے اعتبار سے انھوں نے بھی بلغراد ہی کو اپنا لینا مناسب سمجھا۔ سلافی زبان میں "بیو" سفید کو اور "گورود" شہر کو کہتے ہیں۔ گویا یوگوسلاویہ کے موجودہ صدر مقام کے لفظی معنے "سفید شہر" ہوئے۔ اور یہ اس لیے کہ اس پہاڑی علاقے میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح سفید چونے کے ٹیلوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہے، جن کی اوسط بلندی دریائے ڈینیوب کی سطح سے ۱۴۰ فیٹ ہے۔ بہت دور سے کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ کر یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اس مقام کا نظارہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے گویا پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہ پہاڑیاں شہر کے لیے ایک قدرتی روک ہونے کے علاوہ معدنی اعتبار سے بھی مفید ہیں۔

ہم کسٹم ہال میں آئے تو یہاں سائن بورڈوں پر انگریزی الفاظ بھی نظر آئے۔ بارے اطمینان ہوا کہ یہاں کوئی تکلیف پیش نہیں آئے گی۔ ہم کھڑے اپنے سامان کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک مونچھوں والے موٹے سے آدمی نے دونوں ہاتھ ہلا کر ہم سے کہا کہ فنش (FINNISH) منشا یہ تھا کہ سامان چیک دیک نہیں ہوگا۔ "فنش"۔ اب جائیے۔ ہم کو اس انتظام پر تعجب ہوا کہ جب اسکوپئے پر ہمارے بیگ پر حکومت کی مہر تک لگ گئی تھی تو اس کا فیصلہ بلغراد پر ہونا چاہیے تھا۔ ہم باہر آئے تو واقعی ہمارا سامان ایک نفیس قسم کی نیلی بس پر رکھا جا چکا تھا۔ ہم بس میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ ہمارا سامان نیز تین بکس اور کسی کے اس بس سے نکالے گئے اور ایک ٹھیلے پر رکھوا دیے گئے ہیں۔

اسکوپئے پر ہم نے دیکھا تھا کہ اس پہلوان افسر نے ہمارے سامان کے بارے میں ایک فارم تیار کیا ہے۔ یہی فارم ہاتھ میں لیے ہوئے ایک بزرگ لمبے قد کے خاصے معمر مگر یقیناً اعلیٰ افسر ایک خاص انداز و شان سے اس ٹھیلے پر آئے جس پر ہمارا سامان رکھا تھا۔ "اکیم سائت"۔ ہم نے ان کی زبان سے ضرور سنا اور سمجھ لیا کہ یہ حکیم سعید کا تلفظ بگاڑا گیا ہے۔ فارم پر نمبر لکھا ہوا تھا، جو میرے بیگ پر تھا مگر وہ تمام بکسوں کو الٹ پلٹ کر بھی میرا بیگ نہ نکال سکے، حالانکہ اسی پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے، اور لطف یہ کہ انھوں نے میرے بیگ کی مہر کو بھی نہیں دیکھا، حالانکہ یہ بڑی معمولی بات تھی، اور ان کو ایک نظر میں دیکھ لینا چاہیے تھا۔ ہم تماشائے اہلِ کرم دیکھتے رہے۔ اس اثنا میں یہ ٹھیلہ رواں ہوا اور دور ایک شیڈ میں چلا گیا۔ ہم یہ دیکھتے اور سوچتے رہ گئے کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے!

ہم دوبارہ کسٹم ہال میں گئے تو اتفاقاً یہ انکشاف ہوا کہ یوگوسلاویہ ایئرلائن۔ کے ایک افسر انگریزی سے واقف ہیں۔ ان سے میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ تمام بات تو سمجھ نہ سکے البتہ اُن کی رہنمائی سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایک خاتون نے سمجھانے کے انداز میں یہ انکشاف کیا کہ چوں کہ ہمارے ساتھ کسٹم کی کچھ چیزیں تھیں اس لیے وہ بیگ اسکوپیے پر روک لیا گیا ہے۔

"آپ کا پتہ کیا ہے؟" اس خاتون نے دوسرے سانس میں سوال کیا۔ اگر میں اپنے سامان کو بچشمِ خود نہ دیکھ لیتا تو یقیناً میرے حواس خطا ہو جاتے کہ یکم ستمبر کو تو دیا نا جانا ہے اور میرا سامان اسکوپیے پر پڑا رہ گیا! میں نے ان خاتون سے سوال کیا کہ اچھا باقی سامان کہاں ہے؟ اس سوال پر وہ ذرا مسکرائیں اور ایک طرف چلی گئیں۔ ہم پھر ششش و پنج میں کھڑے رہ گئے۔

چند منٹ بعد وہ خاتون پھر ہمارے سامنے سے گزریں۔ میں ان کی طرف لپکنے کے انداز میں بڑھا، وہ "وَن منٹ" کہہ کر ایک کمرے میں گھس گئیں۔ اور جب باہر آئیں تو پھر اظہارِ افسوس کیا کہ آپ کا سامان اسکوپیے میں رہ گیا ہے۔ عجیب! میں نے ان کو اپنے ساتھ لیا۔ زبان سے تو زیادہ نہ سمجھا سکا، صرف گھیر گھار کر ان کو اپنے ساتھ باہر لے گیا اور اشاروں سے سارا حال بتایا کہ دراصل سامان اُتار کر سامنے شیڈ میں لے جایا گیا ہے۔ اس انکشاف کا ان خاتون پر بڑا اثر ہوا اور وہ آنکھیں پھاڑ کر بھاگیں، اور ایک کمرے میں جا گھسیں۔ ہم پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے ساتھ ایک مزدور کنجی لیے ہوئے آیا۔ میں ان دونوں کے ساتھ سامنے والے شیڈ میں گیا اور اپنا سامان لدوا کر کسٹم ہال میں لے آیا۔ سامان کی جانچ پڑتال کے بعد اب سوال یہ تھا کہ مُہر کون توڑے۔ میرے اس بیگ پر پورے پانچ کسٹم افسران سر جوڑے مشورے کر رہے تھے اور مہر کوئی نہ توڑتا تھا اور ہم پریشان کھڑے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک پتلی دُبلی سی خاتون اور آئیں جو عملے سے متعلق تھیں۔ یہ انگریزی خاصی سمجھ لیتی تھیں۔ میں نے ان کو صورتِ حال بتائی اور انھوں نے بات سمجھ لی۔ لیکن ادھر کسٹم افسر کا اصرار رہا کہ سارا بیگ ہوائی میدان پر چھوڑ دیا جائے اور واپسی پر لے لیا جائے۔ چوں کہ میرے کپڑے اسی بیگ میں تھے، اس لیے اس کو چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے یہ تجویز منظور ہوئی کہ صرف تحائف کا چھوٹا بیگ بڑے بیگ میں سے نکال کر چھوڑ دیا جائے۔ اس فیصلے پر اس افسر نے اس انداز سے مہر توڑ دی کہ دیکھا جائے گا، کیا ہونا ہے۔ اور میں نے وہ بکس نکال کر ان کے حوالے کیا۔ وہی خاتون میرے ساتھ گئیں۔ بکس پر دوبارہ مہر لگوائی اور میں نے رسید حاصل کی۔ تب کہیں خدا خدا کر کے ہم بس میں سوار ہوئے۔

ہماری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ ہمارے سامان کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ کیا واقعی وہی جذبہ کارفرما تھا، جس کا میں ذکر کرچکا ہوں؟

اس ملک میں ہوٹلوں کی چار قسمیں ہیں۔ قسم اوّل کے ہوٹل، جو صرف بڑے شہروں میں ممکن ہیں، ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرنے کے علاوہ عیش و نشاط کی ایسی محفلوں کا بھی انتظام کرتے ہیں کہ تھکے ہارے سیاح یا بصورتِ دیگر منچلے نوجوان اس عشرت کدے میں گم ہو جاتے ہیں اور صرف بمجبوری اس سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ عموماً ایسے ہوٹل دریاؤں، جھیلوں یا سمندر کے کنارے واقع ہیں، جہاں ساحل پر تیرنے، نہانے اور دھوپ کھانے کی آسائشیں میسّر آسکتی ہیں۔ قسم دوم کے ہوٹل وہ ہیں، جہاں عموماً زیادہ مدت گزارنے کے لیے لوگ مقیم ہونا چاہتے ہیں، لیکن یہ کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ ان کے اخراجات نسبتاً ذرا کم ہوتے ہیں۔ قسم سوم میں وہ ہوٹل شامل ہیں، جہاں لوگ عموماً قیام کرتے ہیں اور کھانے کا اہتمام اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق کرتے ہیں۔ یہاں صرف کمرے کا کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔ اگر کبھی کھانا بھی کھا لیا جائے تو اس کی اُجرت الگ وصول کی جاتی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسے کاروباری لوگ ٹھیرتے ہیں، جو دن بھر شہر میں مصروف رہتے اور رات کو آکر سو جاتے ہیں۔ انھیں یقین نہیں ہوتا کہ کھانے کے وقت وہ کس جگہ ہوں گے۔ قسم چہارم کے ہوٹل زیادہ تر پہاڑوں کی وادیوں، گرم چشموں کے قریب یا دوسرے صحت افزا مقامات پر ہیں۔ ان میں عموماً بیمار لوگ آکر زیادہ مدت کے لیے مقیم ہوتے ہیں۔ اسی لیے علاج معالجے کا خاص اہتمام ہوٹل کی طرف سے بھی کیا جاتا ہے، جس کا معاوضہ الگ دیا جاتا ہے۔ ہوٹلوں کے علاوہ دیہاتی علاقوں میں سرائیں ہوتی ہیں۔ ان کی بھی حسبِ حیثیت تین قسمیں ہیں۔ آخری قسم ایسی ہوتی ہے کہ سرائے کا مالک صرف رات بسر کرنے کے لیے ایک چارپائی اور بستر فراہم کرتا ہے۔ باقی کسی آرام و سہولت سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔ مسافر نے رات بھر قیام کیا اور صبح کو اٹھ کر چل دیا۔

ہم نے ہوٹل میجسٹک میں اپنے قیام کا انتظام کرایا تھا، مگر امریکن ایکسپریس نے استنبول ہی میں بذریعے تار ہمیں مطلع کر دیا تھا کہ ہمارا انتظام اب ہوٹل ایکسلسیئر میں ہے۔ بس نے ہوائی کمپنی کے دفتر میں لے جاکر ہمیں چھوڑ دیا۔ اب یہاں سے ایکسلسیئر ہوٹل جانا تھا۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور اس ٹیکسی نے صرف دو منٹ چلنے پر ہمیں اِس ہوٹل کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ہمیں اپنے نئے پن کا پورا احساس ہوا اور اس موقع پر اگر ٹیکسی والا فائدہ نہ اٹھاتا تو کون اٹھاتا!

ہوائی میدان سے ہوٹل پہنچنے تک یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ یہ شہر ترقی پذیر ہے عظیم الشان

عمارتیں، وسیع سڑکیں، ہر قسم کے سامان سے سجی ہوئی بارونق دکانیں، تیزی سے دوڑتی ہوئی کاریں، اور پیدل چلتے ہوئے لوگوں کی تیز رفتاری ——— یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ شہر کے عوام خوش حال ہیں اور ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے تاکہ جو چیزیں دیکھنی ہیں اور جن لوگوں سے ملنا ہے، ان کا پروگرام کم سے کم آج بن جائے۔

سفارت خانہ ہند: بھائی جان محترم کے پاس وزیر خارجہ ہند ڈاکٹر سید محمود صاحب کی طرف سے ایک تعارفی خط سفیر ہند متعینہ یوگوسلادیہ مسٹر دیال کے نام موجود تھا۔ طے پایا کہ سفیر صاحب سے ملاقات کر لی جائے اور ان کی اعانت سے پروگرام مرتب کیا جائے۔ کوشش کی گئی کہ پاکستان کے دفتر کا بھی پتہ کسی طرح مل جائے لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ پتہ ہوٹل میجسٹک کا تھا، لیکن ٹیلی فون پر معلوم ہو گیا کہ بھارتی سفارت خانہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو گیا ہے۔ تاہم کافی پوچھ گچھ کے بعد نئی جگہ کا پتہ چلایا گیا اور ہم پیدل روانہ ہو گئے۔ آدھ گھنٹے کی تگ و دو کے بعد سفارتخانہ مل گیا۔ گھنٹی بجائی، پھر بجائی اور پھر بجائی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ ظاہر تھا کہ دفتر بند ہے۔ لہٰذا نئے سرے سے کوشش شروع کی گئی کہ سفیر صاحب کا مکان ہی مل جائے۔ اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ ہوٹل میجسٹک جا کر مزید چھان بین کی جائے۔ چنانچہ ہوٹل کی تلاش میں پیدل ہی چل پڑے۔ توقع تھی کہ یہ مشہور و معروف ہوٹل ہے، بہت جلد اور آسانی سے مل جائے گا۔

اس طرح بڑے بڑے بازاروں اور چوکوں کی سیر تو خوب ہو گئی مگر ہوٹل نہ مل سکا۔ میں نے متعدد لوگوں سے دریافت کیا اور ہر ایک نے بس اشارے سے بتا دیا کہ اس طرف چلے جاؤ لیکن ہوٹل کسی طرح نہ ملا۔ غالباً اسی طرح دو گھنٹے پھرتے رہنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ایک ٹیکسی کر لی جائے تاکہ وہ جلد ہوٹل میجسٹک پہنچا دے۔ چناں چہ میٹر والی ٹیکسی لی تاکہ وہ ہم کو نو وارد جان کر زیادہ کرایہ وصول نہ کرے۔ لیکن اس دفعہ بھی ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ٹیکسی والے نے مشکل سے پانچ منٹ میں ہمیں ہوٹل کے سامنے پہنچا دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم اس سڑک پر ہوٹل تلاش کر کے جا چکے تھے۔ ہمارے ذہن میں اس کا تصور یہ تھا کہ وہ عام عمارتوں سے الگ تھلگ بڑے پارکوں سے گھری ہوئی کوئی وسیع شاندار عمارت ہوگی۔ اسی لیے ہماری نگاہ عالی شان عمارتوں پر پڑی، اور ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ وہ ہوٹل بہت ہی مختصر اور اس قدر کونے میں واقع ہوگا کہ وہاں جانے سے دم گھٹنے لگے گا۔

ہر ہوٹل کا قاعدہ ہے کہ اس کا استقبالیہ دفتر سب سے پہلے اور صدر دروازے کے قریب ہوتا ہے تاکہ باہر سے آنے والے ہر قسم کی معلومات فوراً حاصل کر لیں۔ مگر ہوٹل میجسٹک کا استقبالیہ عمارت کے اندر تھا اور ہمیں کھانے کے کمرے کو طے کرکے وہاں تک پہنچنا پڑا۔ منیجر صاحب بڑے تن و توش کے انسان تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے لیکن لب و لہجے میں کرختگی اور انداز میں تحکم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈانٹ کر کہہ رہے ہیں کہ ہندستانی سفارت خانہ یہاں سے اٹھ گیا ہے۔ اب کیوں آئے ہو —— اور سفیر صاحب کا پتہ انھیں بالکل معلوم نہیں تھا۔

تین گھنٹہ کی اس بھاگ دوڑ نے خاصا تھکا دیا اور ہم سات بجے شام اپنے ہوٹل آ گئے۔ اس دوران میں ایک حادثہ بھی پیش آیا اور وہ یہ کہ میں نے یوگوسلاویہ ہوائی کمپنی کے دفتر میں امریکن ایکسپریس کا چیک بھنانے کے لیے پیش کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس پر یوگوسلاویہ "اینڈورس" نہیں ہے۔ دیکھا تو واقعی ملک کا نام اس پر لکھا ہوا نہیں تھا۔ امریکن ایکسپریس پر بڑا غصہ آیا اگر بھائی جان محترم ساتھ نہ ہوتے تو نہ جانے مجھے کس قسم کی پریشانی لاحق ہوتی۔ بھائی جان محترم نے اپنا چیک بھنایا۔

سات بجے واپس آکر ٹیکسی والے کا بل ادا کیا جو ۳۷۰ دینار تھا۔ میرے پاس ایک ہزار دینار کا نوٹ تھا۔ ہمارے ہوٹل کے منیجر نے یہ نوٹ بھنانے سے انکار کر دیا کہ ریزگاری نہیں ہے لیکن اسی لمحے اس نے ایک انگریز یا شاید امریکن سیاح کا نوٹ اسی مالیت کا بھنا دیا۔

آخر نوٹ بھنانے کے لیے میں باہر گیا۔ سامنے ہی ایک میوہ فروش کی دکان نظر آ گئی۔ میں نے اس سے نصف کلو ناشپاتی ۳۰ دینار میں خریدی اور اس طرح یہ نوٹ بھنا کر ٹیکسی کا بل ادا کیا۔

ترکی میں سات دن مسلسل بے آرامی اور آج کی کوفت نے خستہ کر دیا تھا۔ لہٰذا کھانا کھا کر بہت جلد سو جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تو پونے نو بجے ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے بھائی جان محترم نے کب روشنی بجھائی اور کب سوئے۔

---

۳۱ اگست ۱۹۵۶ء —— جمعہ

میں آٹھ گھنٹے مسلسل سونے کے بعد اٹھا تو بھائی جان محترم کو نماز سے فارغ ہو کر مطالعے میں مصروف پایا۔ وہ مختلف کتابوں سے آج کا پروگرام مرتب کرنے کی فکر میں تھے۔ نماز کا وقت ابھی باقی تھا، لہٰذا میں نے جلدی سے وضو کیا اور فریضۂ صبح ادا کر دیا۔ بھائی جان نے بتایا کہ کوئی آدھ گھنٹے پہلے اذان کی آواز آئی تھی۔ ضرور کوئی مسجد قرب وجوار میں موجود ہے۔ اگر میں ذرا اور پہلے بیدار ہو جاتا تو ہم دونوں وہیں جا کر نماز باجماعت ادا کرتے۔ یورپ اور پھر ایک اشتراکی ملک میں اس طرح سر بسجود ہو کر یقیناً دوگنا لطف آتا اور اطمینان ہوتا کہ خدائے واحد کے نام لیوا یہاں بھی موجود ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود بلغراد اور دوسرے شہروں میں ترکوں کے عہدِ حکومت میں بہت سی مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں خصوصاً بوسینا ہرسی گووینیا کا صدر مقام سرایوو عرفِ عام میں سو مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے اور ان سب میں نماز ہوتی ہے۔ مسجدوں کی مرمت اور دیکھ بھال صوبائی حکومت کے سپرد ہے۔ اماموں اور موذنوں کو عوام چندہ دیتے ہیں۔ اسی شہر میں ایک عجائب گھر ہے، جس میں اسلامی دور کے نوادر کا ایک علیحدہ شعبہ ہے۔ سنا ہے کہ اس میں قرآنِ پاک کی ایک نایاب قلمی جلد موجود ہے، جس کی زیارت غیر مسلم بھی بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ اسی صوبے کے ایک اور شہر موسطر میں دو اونچے پہاڑوں کے دامن میں ایک وسیع و عریض سنگین جامع مسجد اب تک موجود ہے لیکن عبادت کرنے والوں کی کمی ہے، اس لیے عموماً ویران سی نظر آتی ہے۔ اس مسجد کے قریب ہی گندک ملے ہوئے گرم پانی کا ایک چشمہ بہتا ہے جس سے استفادہ کے لیے صوبائی حکومت نے ایک شفاخانہ قائم کر رکھا ہے۔ اس میں جلدی امراض، گٹھیا، عرق النسا اور فالج کے مریضوں کا خاص علاج ہوتا ہے۔ شفاخانہ اقامتی ہے۔ امراضِ نسواں کے سلسلے میں بہت سی عورتیں بھی اس جگہ آ کر اپنا علاج کراتی ہیں۔ اس شفاخانے میں داخل ہونے والے اکثر مریض خواہ وہ کسی عقیدے کے حامل ہوں، خیر و برکت کے لیے مسجد میں چڑھاوا چڑھاتے اور منت مانتے ہیں اور شفایاب ہو جانے پر امام کو نذر پیش کرتے ہیں۔

ہم ۸½ بجے ناشتے کے لیے نیچے آئے تو منیجر نے گویا ڈانٹ کر ہمیں بتایا کہ ناشتے کا کمرہ دوسری منزل پر دائیں جانب ہے۔ یہ لوگ بات کہتے ہی اس طرح ہیں جیسے کسی پر حکم چلا رہے ہوں۔ ہم دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ ناشتہ لطیف تھا۔ میں نے اشتراکی مرغیوں کے تلے ہوئے دو انڈے بھی کھائے۔ بھائی جان محترم

نے توس، جام اور دلیے پر اکتفا کیا۔ اشیائے خورد نوش تو اور بھی منگائی جا سکتی تھیں لیکن ہم نے ہلکے ناشتے کو ترجیح دی تاکہ آرام طلبی کی طرف طبیعت راغب نہ ہونے پائے۔ بہت سی جگہ جانا اور بہت کچھ گھومنا تھا۔

سوا نو بجے ہم پھر سفارت خانۂ ہند جا پہنچے۔ ایک ٹائپسٹ انگریزی حروف میں خطوط ٹائپ کر رہا تھا۔ یہ مدراسی نوجوان ہمارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکا کہ ہمیں پڑھنے کے لیے دو دن پرانا اخبار دیدے۔ سفیر صاحب کی بابت معلوم ہوا کہ دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ فرسٹ سکریٹری صاحب تشریف نہیں لائے ہیں۔ پونے دس بجے تک فرسٹ سکریٹری کا انتظار کیا، مگر وہ نہیں آئے۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ البتہ اس اثنا میں ایک اور کارکن جو بظاہر جنوبی ہند کے معلوم ہوتے تھے، تشریف لائے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ شاید فرسٹ سکریٹری صاحب بالکل نہ آسکیں۔ طبیعت خدا ناسازہے۔ آج آرام کریں گے۔ ہم نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارے مقاصدِ سفر کی روشنی میں وہ کوئی مشورہ دیں یا کم سے کم ترجمانی کے لیے سفارت خانے سے کوئی آدمی ساتھ کر دیں، مگر بتایا گیا کہ وہ خاص آدمی جو یہ خدمت اچھی طرح انجام دے سکتا ہے، اتفاق سے آج غیر حاضر ہے۔ اس کے بعد ان صاحبزادے نے بڑی دل شکن باتیں کیں کہ اس شہر میں رکھا کیا ہے۔ اگر آپ خود بھی دو گھنٹے گھوم لیں تو بس سب کچھ دیکھ لیجیے۔ آپ خواہ مخواہ بلغراد میں وقت خراب نہ کریں۔ یہ تو بہت ہی "بیک ورڈ" جگہ ہے۔ غالباً ان کو محبت کے معاملے میں مایوسی ہوئی ہوگی، وہ اس مقام سے اتنے بیزار معلوم ہوتے تھے۔ یا پھر وطن کی یاد ان کو ستا رہی ہوگی۔

پُت نِک کے دفتر میں : بڑا غنیمت ہوا کہ ہم ان کی باتوں میں نہیں آئے اور ہم نے یوگوسلاویہ کی ایک مشہور ٹورسٹ ایجنسی پُت نِک (PUTNIK) سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ سیاحوں کے لیے بلغراد کی، بلکہ تمام یوگوسلاویہ کی سیر کا انتظام کرتی ہے۔ چناں چہ ہم اس کے دفتر پہنچے اور اپنا منشا بتایا کہ ہم دوا سازی کے ادارے، ہسپتال اور صحت گاہیں وغیرہ دیکھنی چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر وقت بچ جائے تو ہم بلغراد کے آثارِ قدیمہ بھی دیکھیں گے، تاکہ اس ملک کی پرانی تاریخ کی ایک جھلک نظر آجائے۔

منیجر نے فوراً ہمارے لیے ایک انگریزی داں یوگوسلاویائی گائڈ کا انتظام کر دیا اور اسے اچھی طرح ہدایات دے دیں۔ ساتھ ہی اپنی موٹر کا انتظام کر دیا۔

طبی آلات بنانے کے کارخانے میں : ہمارے گائڈ نے فوراً ہی ٹیلی فون کر کے ایسا ادارہ

دکھانے کا فیصلہ کر لیا جو طبی آلات بناتی ہے۔ یہ یوگوسلاویہ کی مشہور کمپنی "ست لیسکا" ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ چوں کہ ان دنوں فیکٹریوں میں تعطیلات ہیں اور رنگ و روغن بھی ہو رہا ہے، اس لیے فیکٹری پوری رفتار پر کام نہیں کر رہی ہے، تاہم وہ اپنا کام ہمیں دکھا کر بہت خوش ہوں گے اور وہ حقیقتاً بہت خوش ہوئے۔ آلاتِ جراحی، اسٹیریلائزر، معائنہ کی میزیں، انجکشن کی ریکورڈ سرنجز (REKORD SYRINGES)، بے ہوشی سنگھانے اور ہوش میں لانے کے آلات، لیبارٹری کا خاص سامان، مختلف قسم کی گیسوں اور شعاعوں کے ذریعے علاج کرنے کے آلات، دندان سازی سے متعلق کرسیاں اور متعلقہ آلات وغیرہ ایسے لوہے سے تیار کرتی ہیں، جس پر موسم کے تغیرات اثر انداز نہیں ہوتے۔ ہم نے ہر شعبے میں جا کر آلات و سامان کے ہر حصّے کو بنتے، ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے، اس پر پالش، نکل یا اینمل ہوتے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کمرے میں جو پیکنگ کے لیے تھا، سب سامان جمع ہوتے اور بکسوں میں بند ہوتے دیکھا۔ سب لوگ نہایت خاموشی اور سرعت کے ساتھ کام کر رہے تھے اور اپنے اپنے فن میں ماہر معلوم ہوتے تھے۔ یہ فیکٹری دوسری جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ بہت جلد اس نے ترقی کی اور اب ملکی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد برآمد کے لیے بھی کافی مقدار میں سامان تیار کر لیتی ہے۔ اس میں ہر شفٹ کے وقت کئی ہزار انسان کام کرتے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ کم عمر بچے بالکل نظر نہیں آئے۔ غالباً قانوناً کوئی پابندی عائد ہے۔ ہماری آمد پر بعض کاریگروں نے نظر اٹھا کر یا محض کنکھیوں سے ہمیں دیکھا اور کام میں مشغول ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں وقت کی قدر و قیمت کا بڑا لحاظ ہے۔ چلتے وقت فیکٹری کے انچارج نے ہمیں تحفتہً دو ریکورڈ سرنجیں دیں اور کچھ لٹریچر بھی دیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر ہم پاکستان پہنچنے کے بعد ان کے ہاں تیار ہونے والا کچھ سامان منگائیں تو بطورِ خاص اس کا اہتمام کریں گے اور ہر چیز مرضی کے مطابق تیار کر کے بھیجیں گے۔ انھوں نے ہمیں ہماری خواہش کے بموجب چائے کافی کے بجائے سادہ پانی پلایا مگر اس خاطر سے وہ مطمئن معلوم نہیں ہوتے تھے۔ شاید کافی پلا کر وہ زیادہ مسرت محسوس کرتے۔ فیکٹری کے یہ انچارج ہمارے ہوٹل کے منیجر سے بالکل مختلف مزاج کے آدمی تھے۔ ہمارے استفسار پر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بلغراد میں اور اس شہر کے علاوہ زغرب، توذی سعد اور زلزنیکی میں اسی قسم کا سامان بنانے والی فیکٹریاں قائم ہیں۔ یہ معلومات بہم پہنچانے میں انھوں نے ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا۔

میڈیکل یونیورسٹی: یہ فیکٹری دیکھتے ہی ہم میڈیکل یونیورسٹی پہنچ گئے اور فیکلٹی آف میڈیسن کے

ڈین کے دفتر میں جا پہنچے۔ اتفاق سے وہ کسی خاص میٹنگ میں مصروف تھے۔ تاہم ان کے معاون نے ہمارا استقبال کیا اور جب ہم نے بتایا کہ ہم اسپتال اور اس کے مختلف شعبے دیکھنے چاہتے ہیں، تو انھوں نے ٹیلی فون کر کے فوراً ہمیں شعبۂ متعلقہ میں بھیج دیا۔ یہاں ہماری ملاقات ڈاکٹر زاگا بیردوی سے ہوئی۔ یہ لمبے قد اور صاف رنگ کی خاتون ہیں اور صحت عامہ کے مرکز کی انچارج نیز ڈین آف فیکلٹی آف مڈیسن کی اہلیہ ہیں۔ ان سے ملاقات کا کمرہ بہت صاف ستھرا تھا۔ ہلکا نفیس قسم کا فرنیچر، جو یوگوسلاویہ ہی میں تیار ہوتا ہے، آسمانی رنگ کے پردے، پورے فرش کا اعلیٰ قالین، عمدہ قسم کے بڑے بڑے صوفے، شیشے کی سطح والی میزیں کمرے میں آراستہ تھیں۔ مارشل ٹیٹو کی ایک تصویر بھی اس کمرے میں آویزاں تھی اور دوسری تصویر انھی لیڈی ڈاکٹر کی تھی، جس میں وہ مسز اندرا گاندھی کے ساتھ نظر آرہی تھیں۔

ان سے تھوڑی دیر باتیں ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے شہر میں تمام اسپتالوں کے لیے ایک علاقہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ شہر میں تین چار بڑے اسپتال اور شفا خانے موجود ہیں اور ان کو قائم رکھا جائے گا، لیکن آئندہ اس مخصوص علاقے کے علاوہ کہیں اور کوئی اسپتال تعمیر نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ اس مرکز میں روزانہ ڈھائی ہزار مریض آتے ہیں۔

اتنے میں مڈیکل سسٹر ناڈلا میلو یوروی آگئیں جنھیں پورے سنٹر کی سیر کرانے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ یہ خاتون زیادہ "اسمارٹ" ثابت ہوئیں۔ بہت تیز یوگوسلاویائی زبان بولتی ہیں اور ایک سانس میں جملے کے جملے بول جاتی ہیں۔ ہمارا ترجمان بمشکل ترجمہ کر سکتا تھا۔ اس دُبلی پتلی خاتون نے تقریباً ایک گھنٹے میں ہمیں ہر شعبے کی سیر کرائی اور بعض اقامتی مریضوں سے ملایا، جو وارڈوں میں اس طرح رہتے ہیں، جیسے وہ اِنھی کے گھر کے ڈرائنگ روم ہیں!

آخر میں ہم واپس لیڈی ڈاکٹر انچارج کے کمرے میں آئے، مگر عین اس وقت ان کو ضروری کام سے کسی اور کمرے میں بلا لیا گیا اور وہ ہم سے معذرت چاہتی ہوئی چلی گئیں۔ حالاں کہ شروع میں انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے محسوسات سننے کے لیے ہماری منتظر رہیں گی۔

ہم نے رجسٹر پر اپنی رائے اردو زبان میں لکھی اور مڈیکل سسٹر کی خواہش پر میں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا۔ انھوں نے اس کا خلاصہ اپنی زبان میں رائے کے نیچے قلمبند کر دیا، تاکہ یادگار رہے۔ یقیناً اردو زبان میں یہ پہلی رائے یہاں لکھی گئی ہے۔

ہم اس اسپتال سے بہت ہی متاثر ہوئے۔ ہمیں گمان بھی نہیں تھا کہ یوگوسلاویہ جن حالات سے

گزرا ہے ان کے بعد اس قدر جلد وہ ایسا بڑا اور نفیس اسپتال قائم کرے گا۔ اس اسپتال میں مختلف بیماریوں کے علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں۔ متعدی امراض کا کوئی مریض وہاں نہیں رکھا جاتا۔ وہاں کا انتظام یہ ہے کہ سب سے پہلے متعدد ڈاکٹر باہر سے آنے والے مریضوں کا خیر مقدم ایک کمرے میں کرتے اور مختصر ترین الفاظ میں ان کی بیماریوں کی نوعیت معلوم کر کے ان کو متعلقہ شعبے میں بھیج دیتے ہیں۔ ہر شعبہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ (۱) استقبالیہ جسے انتظامیہ کہا جاتا ہے۔ مریض یہاں آکر اپنے نام کا کارڈ تیار کراتا ہے (۲) کمرۂ انتظار، جہاں مریض اپنی باری آنے کے لیے بیٹھتا ہے۔ اس کمرۂ انتظار میں عمدہ قسم کے صوفے، نازک اور حسین گول میزیں اور پڑھنے کے لیے تازہ رسائل و اخبارات رکھے ہوتے ہیں (۳) ڈاکٹر کا کمرہ۔ یہ بھی نہایت صاف ستھرا ہے۔ اس میں ربڑ کا فرش ہے، تاکہ چلنے کی بھی آواز نہ ہو۔ چاروں طرف سفید رنگ شیشے کی کھڑکیاں ہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جانے اور پھر باہر نکلنے کے راستے الگ الگ ہیں۔ دوا لگوانے، مرہم پٹی کرانے یا دوا لینے کے شعبے الگ الگ ہیں۔ نمبر کا لحاظ ہر جگہ رکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے ساتھی سے آگے بڑھنے یا سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ میں نے ہمدرد مطب سے مقابلہ کیا تو بہت سی باتیں یکساں پائیں۔ کچھ نئی باتیں سیکھیں اور تہیہ کیا کہ وطن پہنچ کر ان کو ضرور رائج کیا جائے گا۔

اس عمارت کی کئی منزلیں ہیں اور کئی کئی لفٹ کام کر رہے ہیں۔ ایک منزل پر بچوں کا حصہ بڑا دلچسپ ہے، جہاں ماؤں کو بچے پالنے، انھیں غذا دینے، ان کے لیے غذا تیار کرنے، حفظِ صحت کے نقطۂ نظر سے ان کو صاف ستھرا رکھنے اور بیمار ہو جانے پر تیمارداری کرنے کا عملی سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک ایسا اسپتال ہے کہ اس کی نظیر کم سے کم پاکستان میں نہیں ہے اور میں نے ہندستان کے بڑے اسپتالوں میں بھی یہ باتیں کہیں نہیں پائیں۔ سب سے زیادہ قابلِ تعریف مریضوں کے ساتھ عملے کا برتاؤ کہا جا سکتا ہے۔ صفائی ستھرائی کا یہ عالم ہے کہ کسی ایک جگہ بھی خاک، مٹی، کوڑا کرکٹ، کاغذ کا ٹکڑا یا سگریٹ کا ٹوٹا بالکل نہیں پایا گیا۔ اور یہ اس اسپتال کا حال ہے، جہاں روزانہ ڈھائی ہزار مریض آتے ہیں اور اقامتی مریضوں کی تعداد الگ ہے۔ خود اسپتال کا عملہ صفائی اور رکھ رکھاؤ میں بے حد حساس ہے۔ مثال کے طور پر مڈیکل سسٹر ہمیں معائنے کے ایک کمرے میں لے جانے لگیں تو قریب ہی کھڑکی کی دیوار کا ایک کونہ ذرا سا جھڑا ہوا تھا۔ مڈیکل سسٹر نے نہایت سُرعت اور ہاتھ کی صفائی کے ساتھ وہاں ٹنگے ہوئے پردے سے اُسے چھپا دیا۔ تاہم میں نے یہ حرکت دیکھ لی اور دل ہی دل میں تعریف کی کہ یہ لوگ ذرا سی خرابی کو بھی عیب سمجھتے ہیں، اور عیب پوش ہیں!

ڈاکٹروں اور نرسوں کو ہم نے گاؤن کے بغیر نہیں دیکھا۔ نہایت صاف ستھرے گاؤن پہنے یہ سب

کے سب اپنے کام میں مصروف تھے۔ ہر ڈاکٹر کے گاؤن کی جیب پر اس کا نام کڑھا ہوا تھا۔

نماز کا وقت ہو گیا تھا اور کھانا بھی کھانا تھا، اس لیے ہم نے ہوٹل واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے گائڈ سے کہہ دیا کہ وہ ساڑھے تین بجے ہمارے ہوٹل آجائے تاکہ شام کے وقت چند اور مقامات دیکھ لیے جائیں اور پھر آرام کیا جائے کیوں کہ کل ویانا (آسٹریا) جانا ہے۔

کھانا کھانے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑا۔ گائڈ وقتِ مقررہ پر آگیا۔

میڈی سنسکی فاکلتیت یونیورزتیت: اس وقت یوگوسلاویہ میں طبی تعلیم کے چھ مدرسے ہیں۔ ان میں سے ایک بلغراد میں ہے جو میڈی سنسکی فاکلتیت یونیورزتیت یو بیوگراڈو کہلاتا ہے، چوں کہ وہاں تعطیلات تھیں، اس لیے ہم اس میں طریقۂ تعلیم و تربیت کا بذاتِ خود جائزہ نہ لے سکتے تھے پھر بھی ہم نے جانا ضروری سمجھا تاکہ بنیادی باتیں معلوم کر لیں۔

دفتر کھلا ہوا تھا اور انتظامی عملے کے افراد کام کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے ادارے کے پراسپکٹس مانگے، جو معمولی سوال و جواب کے بعد ہمیں مل گئے۔ انھیں شبہ ہوا تھا کہ شاید ہم اسکول میں داخلہ چاہتے ہیں۔ پراسپکٹس کے مطالعہ سے ہم نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ وہاں تعلیمی نصاب کی مدت چھ سال ہے۔ مدتِ تعلیم ختم ہونے اور آخری امتحان میں کامیابی کے بعد جو سند ملتی ہے، اسے سربو کروایٹ زبان میں "لیکار" اور سلووینیا زبان میں "زدراونگ" کہا جاتا ہے۔ ملک کی اور طبی درس گاہوں کی طرح یہ اسکول بھی سرکاری ہے۔ طلبا سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی، بلکہ بعض نادار طلبا کو دوسری سہولتیں بھی دی جاتی ہیں۔ اس وقت ۷۰۸ ۳ طلبا اور ۱۶۵۹ طالبات صرف اس مدرسے میں زیرِ تعلیم ہیں۔ مدرسہ بند ہونے سے چند ہی دن پہلے کنووکیشن ہوا تھا جس میں ساڑھے تین سو کامیاب امیدواروں کو سندیں دی گئی ہیں۔ ہر سال تقریباً اتنے ہی طلبا کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ملک بھر میں ۶۶۰۰ کے قریب رجسٹرڈ معالج موجود ہیں۔ اور اب حکومت نے طبی تعلیم کے انتظام میں جو توسیع کی ہے، اس کی بدولت ہر سال تمام مدرسوں سے کامیاب ہونے والے طلبا کی تعداد ایک ہزار ہوا کرے گی۔ یہ صورتِ حالات امید افزا اور لائقِ تحسین کہی جاسکتی ہے۔ اس ترقی اور فروغ کا واحد سبب یہ ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک ہر قسم کی تعلیم —— ابتدائی، ثانوی، فنی اور عملی —— سب حکومت کی زیرِ نگرانی ہے اور مفت دی جاتی ہے۔ ۷ سے ۱۵ سال تک کے بچوں کی تعلیم لازمی ہے۔ اس کے بعد ہر ایک کے رُجحان کے مطابق اسے اگلی منزل کی طرف چلایا جاتا ہے؛

طبی تعلیم کے چھے سالہ نصاب میں طب و جراحی کے سبھی موضوعات شامل ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی مڈوائفری کی تعلیم ضرور دی جاتی ہے۔ ویسے اسپتالوں میں زچگی کا کام زیادہ تر عورتوں کے سپرد ہوتا ہے۔ چھے سال کا نصاب ختم ہونے کے بعد اگر کوئی اُمیدوار کسی ایک مضمون میں خصوصی لیاقت حاصل کرنا چاہے تو اسے مزید ایک سال گزارنا ہوتا ہے۔ بلغراد کے مدرسے میں اساتذہ کی تعداد ۹۰۷ ہے، جو پورے وقت کام کرتے ہیں۔ دُوسرے شہروں میں بعض اساتذہ جزوی اوقات میں تعلیم دیتے اور باقی وقت میں خود علاج معالجہ کرتے ہیں۔

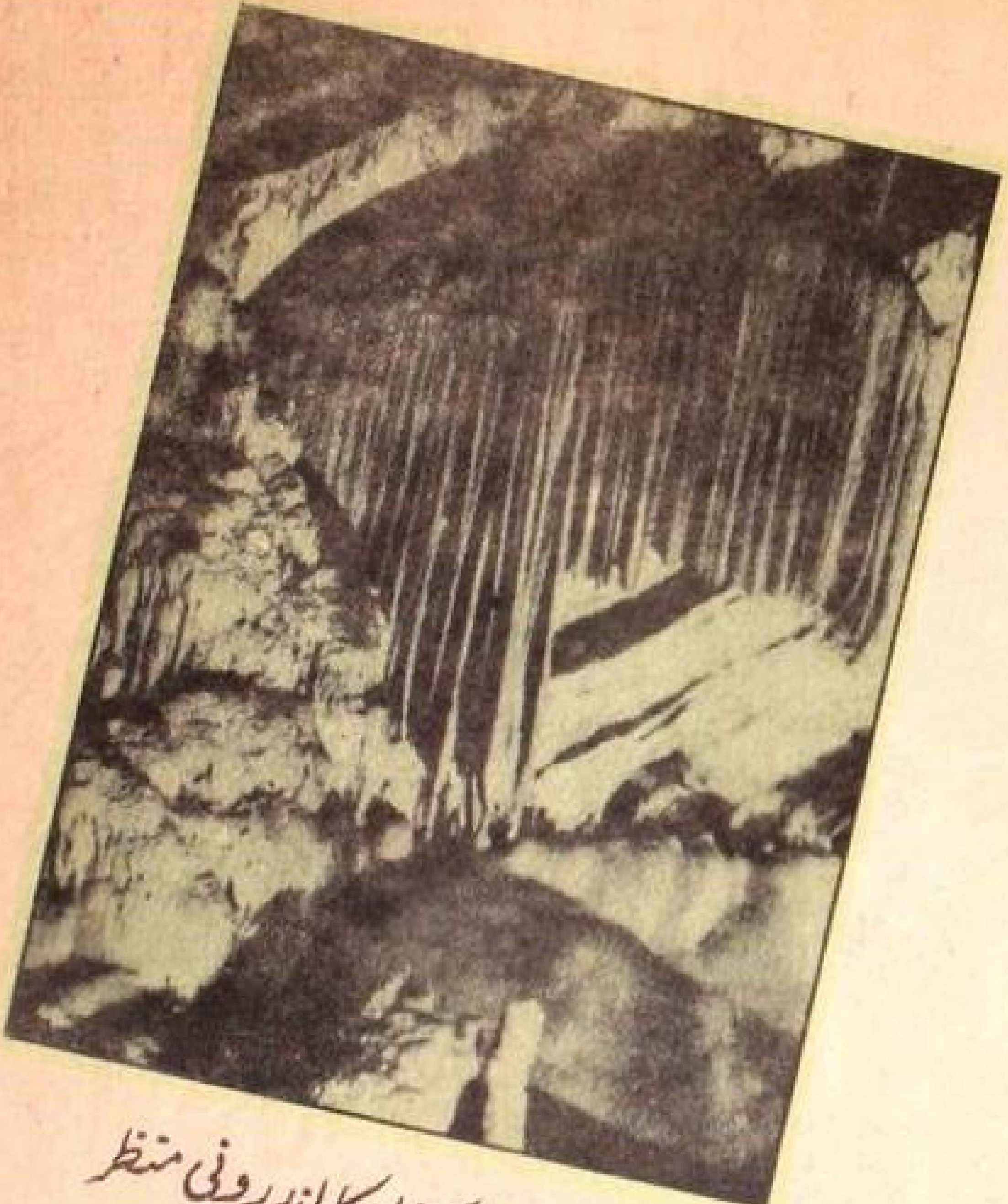
یوگوسلاویہ میں فنِ دوا سازی: طبی تعلیم میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس ملک میں دواسازی کے فن کو بھی بڑی اہمیت دی جارہی ہے۔ یوگوسلاویہ کے تقریباً تمام پہاڑی علاقوں اور بعض میدانوں میں ایسی خودرو جھاڑیوں اور پودوں کی کثرت ہے، جن کو پہلی جنگِ عظیم کے بعد تک کسی لائق نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ چرواہے اپنے مویشی وہاں لاکر چھوڑ دیں اور جانور گھاس پھونس کے ساتھ تمام جھاڑیوں اور پودوں کو بھی چٹ کر جائیں۔ دوسری جنگِ عظیم سے کچھ عرصے قبل تحقیقاتی کام شروع ہوا اور طبِ مشرقی کی قدر کرنے والوں نے اندازہ لگایا کہ جنگلات کی ان جڑی بوٹیوں میں قدرت کے قیمتی خزانے محفوظ ہیں اور اگر صحیح طریقے پر ان سے استفادہ کیا جائے تو صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے علاوہ انسانی صحت و تن درستی کو برقرار اور بحال رکھنے کے لیے بہت سی ادویہ تیار کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ بہت سے نجی اداروں نے جنگلات ٹھیکے پر لیے اور جھاڑیوں وغیرہ کی حفاظت اور نشوونما کا لحاظ اس طرح کیا جانے لگا، جیسے باغوں میں پھل والے درختوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ اب وہی خودرو پودے جو کبھی مویشیوں کی غذا بنتے تھے، انسان کی دوائی ضروریات پوری کرنے لگے ہیں۔

ہمارا گائڈ ہمیں ایک ایسے مقام پر لے گیا، جہاں مکو، سونف، خطمی، جمال گوٹہ، گل بنفشہ اور ملیٹھی وغیرہ کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ ۱۹۴۵ء سے بلغراد کے فارمیسی اسکول فارماکوگنوسی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، جہاں تمام جڑی بوٹیوں، پودوں اور جھاڑیوں کی تحقیقات اور ان سے فائدہ اٹھانے کی تدابیر پر غور کیا جاتا ہے۔ شہر میں متعدد کارخانے ان جڑی بوٹیوں سے عرق، شربت، سفوف اور مفرد یا مرکب صورت میں ادویہ تیار کرتے ہیں۔ بالکل طبِ مشرقی کے انداز پر جڑ سے لے کر ننھی کونپلوں تک ہر حصے کو کام میں لایا جاتا ہے۔ چھالیں تک ضائع نہیں کی جاتیں۔ اب بہت سی پیداوار دوسرے ملکوں کے لیے برآمد کی جانے لگی ہے، جس سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور بہت سی اشیا باہر سے منگانے میں جو زرِ مبادلہ خرچ ہوتا ہے، اس میں زبردست کمی ہوگئی ہے۔

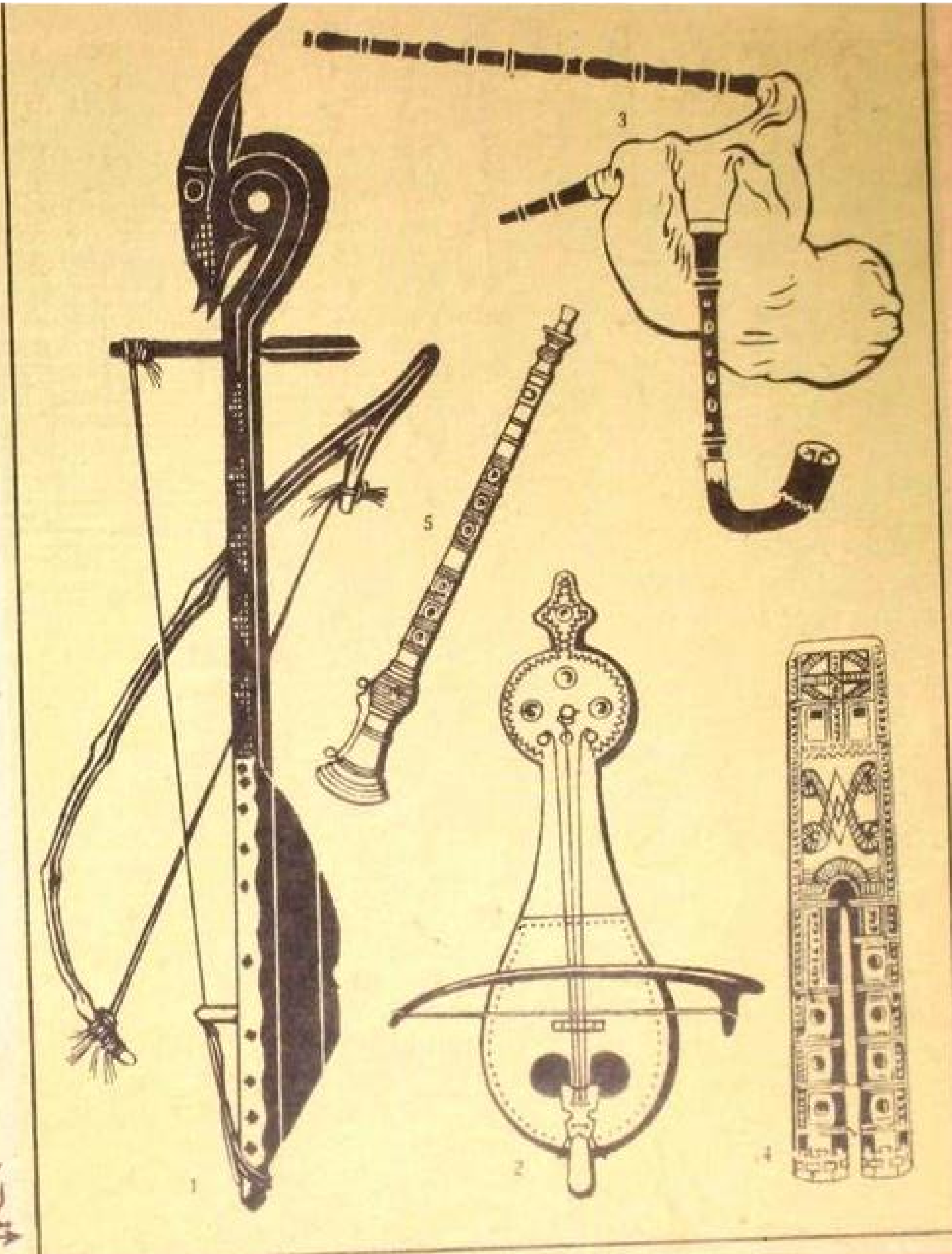
بیشتر دوائیں ان چیزوں کے جوہر نکال کر تیار کی جاتی ہیں تاکہ مقدار کم لے اور فائدہ زیادہ ہو۔ اس مقصد کے لیے نئی کلیں ایجاد کی گئی ہیں۔ عرق نکالنے کے بھبکے اور شکنجے بھی استعمال ہوتے ہیں، جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی سے قبل اسپین کے سوا یورپ میں کہیں نظر نہ آتے تھے اور اسپین کو بھی عرب فاتحین سے ورثے میں ملے تھے۔ موجودہ حکومت نے اس قومی صنعت کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ ہماری رائے میں یہ سعی و کاوش لائق تحسین ہے۔

پوسٹو ٹینا کے غار: ہمارے گائڈ نے اعتراف کیا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار آج مشرقی دنیا اور خصوصاً پاکستان و ہند کے دو سیاحوں کی راہنمائی کی ہے۔ اس سے قبل ہمیشہ امریکنوں یا انگریزوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اس لیے وہ ہمارے ساتھ چل کر خاصی دل چسپی کا اظہار کرنے لگا۔ اس کا اصرار تھا کہ ہم آسٹریا جانے کا پروگرام ذرا ملتوی کر دیں تاکہ ملک کے دوسرے مقامات کی سیر بھی کی جا سکے۔ اس نے خاص طور پر پوسٹو ٹینا کے غار دیکھنے کا اشتیاق دلایا۔ لیکن ہم اپنے پروگرام میں تبدیلی کے لیے آمادہ نہ ہو سکے۔ اس میں شک نہیں کہ اس پہاڑی علاقے کا ایک غار خاص طور پر عجوبۂ قدرت ہے۔ یورپ اور خصوصاً بلجیم کا مشہور غار "ہان" بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا دوسری جنگِ عظیم میں جب نازیوں نے اس ملک پر قبضہ کیا تو غار کو پٹرول کا ذخیرہ جمع رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ محبانِ وطن نے موقع پا کر اس میں آگ لگا دی، جس سے وہ جل کر تباہ ہو گیا۔ آتشیں شعلوں کے نشان غار کے اندرونی اطراف میں اب تک نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ غار کا ابتدائی سرا تھا۔ اندرونی حصوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اس غار کی پوری لمبائی اور بعض جگہ گہرائی کا صحیح اندازہ آج تک نہیں ہو سکا۔ کیونکہ آخر تک پہنچنے کی ہمت بڑے سے بڑے سیاح میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ صرف تین میل تک لوگ ایک بہت ہی چھوٹی ریل کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ اس حصے میں کوئی قابلِ دید چیز نہیں ہے۔ اس کے بعد پیدل چلنا پڑتا ہے۔ غار میں بہت دور تک بجلی کی روشنی کا معقول انتظام ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھانے پینے کے ریستوراں کھلے ہوئے ہیں۔ چھت بہت اونچی ہے، جس کی اندرونی تہوں میں یقیناً چونے اور کھار جیسی چیزوں کا ذخیرہ پوشیدہ ہے جو غیر محسوس صورت میں چھت کے روزنوں سے رِستا رہتا ہے، لیکن اس کی مقدار اتنی قلیل ہوتی ہے کہ وہ زمین پر ٹپکنے کے بجائے بالائی سطح پر آتے ہی خشک ہو کر جم جاتا ہے اور اس طرح تقریباً ایک سو سال میں اس کی سطح صرف ایک انچ بڑھ جاتی ہے۔ اس بڑھی ہوئی سطح سے قدرتی طور پر بعض ایسے نقش و نگار پیدا ہو گئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر



پوسٹوینا کے غار کا اندرونی منظر



یوگوسلاویہ کے آلاتِ موسیقی

عقلِ انسان دنگ رہ جاتی ہے اور نقاشِ فطرت کو بے تحاشا داد دینی پڑتی ہے۔ اسی رستے ہوئے چونے نے بعض جگہ آویزاں ستونوں کی صورت اختیار کرلی ہے، جو چھت سے ملے ہوئے اور زمین سے ادھر نظر آتے ہیں۔ ان ہی ستونوں کے درمیان ایک جگہ بڑا ہال بن گیا ہے جس میں منچلے نوجوان کبھی کبھی موسیقی کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ اس جگہ آواز گونجتی نہیں، بلکہ دیواروں سے ٹکرا کر ایسا ترنم پیدا کر دیتی ہے جو موسیقار کے فن میں ایک اضافے کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ اس ہال کو "سفید کمرہ" کہتے ہیں، کیوں کہ چونے کے قدرتی ستونوں نے اس حصے کو سفیدی میں رنگ دیا ہے۔

صرف یہ ہال کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس کی بنیاد پر اس غار کو "عجوبۂ روزگار" کہا جا سکے۔ دراصل جو چیز قابلِ ذکر ہے، وہ اس میں نہایت تیزی اور شور و غل کے ساتھ بہنے والا ایک دریا ہے، جو ایک حصے میں گرنے والے متعدد چشموں سے مل کر بنتا ہے اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کا دہانہ کسی کو معلوم نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ اندر ہی اندر زمین میں جذب ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس دریا کے پانی میں جو کہیں کہیں علیحدہ جمع ہو کر تالاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ایک عجیب و غریب قسم کی مچھلی پائی جاتی ہے، جو دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اسے عرفِ عام میں "آدم ماہی" کہتے ہیں، کیوں کہ اس کا منھ انسان کے چہرے سے مشابہ ہوتا ہے۔ علمائے حیاتیات کی رائے ہے کہ اس کا وجود زمانۂ تاریخ سے بہت پہلے کے دور سے تعلق رکھتا ہے اور اسے رینگنے والے جانوروں میں قدیم ترین کہا جا سکتا ہے۔ یہ مچھلی جس کے پاؤں بھی ہوتے ہیں، خشکی پر نکل کر گرگٹ کی طرح چلتی ہے۔ اس کا قد ۸ سے ۱۰ انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ اس کی کھال بھی انسان کی کھال سے بالکل ملتی ہے، جس پر بال ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس کی آنکھیں نہیں ہوتیں، کیوں کہ اس حصے میں شدید قسم کا اندھیرا ہوتا ہے۔ سیاح اس جگہ ٹورچ کی روشنی استعمال کرتے ہیں۔ اس مصنوعی روشنی کو مچھلی کا جسم محسوس کرتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کچھ تکلیف ہوتی ہے، کیوں کہ روشنی پڑتے ہی اس میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے۔ انجام کار بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یا بصورتِ دیگر فوراً پانی میں ڈبکی لگا کر غائب ہو جاتی ہے۔ اس فضا سے باہر یہ مچھلی زندہ نہیں رہتی۔ ابھی تک اسے کھانے کا تجربہ کسی نے نہیں کیا۔ عام طور پر اسے زہریلا سمجھا جاتا ہے۔ اس مچھلی کو قدرت نے گلپھڑے اور پھیپھڑے دونوں عطا کیے ہیں۔ اسی لیے وہ پانی کے اندر اور اس سے باہر اطمینان کے ساتھ رہ سکتی ہے۔

لیکن اس کے وجود کا عجیب ترین پہلو اس کے طریقۂ افزائشِ نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ غار کا عام درجۂ حرارت ہمیشہ ۷ سے ۸ رہتا ہے، مگر پانی کا درجۂ حرارت جس میں یہ مچھلی رہتی ہے، اگر بڑھتا رہتا

ہے۔ اگر درجہ حرارت ۵۹ سے کم ہو تو مادہ مچھلی انڈے دیتی ہے اور نر ان کی حفاظت کرتا ہے جن میں سے بچے دس بارہ دن بعد نکل آتے ہیں۔ اور اگر درجہ حرارت ۵۹ سے زیادہ ہو جائے تو مادہ انڈوں کے بجائے بچے پیدا کرتی ہے۔ گویا انڈے سینے کا عمل پیٹ ہی میں پائے تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایسی عجیب بات ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سائنسداں اس رمز کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ غار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر الفریڈ برکو کی رائے ہے کہ یہ مچھلی عہد عتیق کے ایک مینڈک کی نسل ہے، جس کے آباؤ اجداد فنا ہو گئے ہیں اور صرف یہ قسم باقی رہ گئی ہے لیکن وضع قطع کے لحاظ سے اس کو مینڈک کسی عنوان نہیں کہا جا سکتا۔

بلغراد کی عام سیر: باقی وقت میں ہم نے چاہا کہ بلغراد کی ایک عام سیر کر لی جائے۔ وہ کوئی ایسا بڑا شہر نہیں ہے کہ اسے دیکھنے میں زیادہ دیر لگے۔ گائڈ نے اندازاً بتایا کہ اس کے لیے دو گھنٹے کافی ہوں گے۔ چنانچہ ہم نے شہر کی مختلف عمارتیں، وزارتوں کے دفتر، پارلیمنٹ ہاؤس اور بعض گرجا گھر دیکھے۔ عمارتیں واقعی بہت اچھی اور بھاری بھرکم قسم کی ہیں۔ اب ہوائی میدان کے راستے میں دریائے ڈینیوب کے کنارے نیا پارلیمنٹ ہاؤس تعمیر ہو رہا ہے، بلکہ تیاری کے قریب ہے۔ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلغراد میں یہ اپنی قسم کی واحد عمارت ہوگی۔ نیا طرز ہے اور خوب طویل و عریض ہے۔

گائڈ نے مختلف مقامات پر نصب شدہ مجسموں کی تعریف کی۔ سارے نام ذہن میں محفوظ نہیں رکھے جا سکے۔ ہر سڑک کسی نہ کسی لیڈر کے نام پر ہے اور ساتھ ہی وہاں اس کا مجسمہ یا نیم تنہ موجود ہے گائڈ ہمارے مذہب سے واقف تھا۔ اس لیے کئی بار اس نے ترکوں اور جرمنوں کے ناروا سلوک کا بالخصوص ذکر کیا۔ ہم ایک گلی پر جا کر رکے۔ یہاں ایک بچے کی نعش کا مجسمہ ہے، جس کے ہاتھ میں پانی کی صراحی ہے اور جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ عبارت لکھی ہے کہ یہ یوگوسلاویائی بچہ پانی بھرنے یہاں نل پر آیا تھا ایک ترک فوجی نے اسے اس طرح مارا کہ وہ یہیں مر گیا۔

ایک باغ میں جو پرانے قلعے میں بنایا گیا ہے، ترک دور کے آثار میں سے ایک دروازہ باقی ہے۔ گائڈ نے بتایا کہ ترکوں نے دروازے کے دونوں طرف جیلخانہ تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ جالیوں میں سے جھنکا کر ہمیں وہ کوٹھریاں دکھائیں۔ اہل ملک ترکوں سے سخت ناراض ہیں۔

ایک پرانی مسجد: ہم نے گائڈ سے پوچھا کہ کیا ترکی عہد کی کوئی مسجد باقی ہے۔ اس نے قریب ہی ایک عمارت کے کھنڈر دکھائے اور کہا کہ اس علاقے میں یہی باقی ہے۔ اب حکومت نے اسے آثارِ قدیمہ میں لے لیا ہے لیکن مقامی مسلمان اس میں نماز پڑھنا گوارا نہیں کرتے کیونکہ وہ ترکوں نے بنائی تھی۔ اس کا ایک منارا باقی رہ گیا ہے۔ چھت تقریباً گر چکی ہے۔ دیواریں بھی خستہ حال ہیں۔ حکومت کے علاوہ

ذکی اور اس کی دیکھ بھال کر بھی نہیں سکتا۔ ہم نے پورے بلغراد میں صرف یہی ایک کھنڈر دیکھا۔

پُرانے قلعہ میں: جرمنوں سے بھی بالعموم نفرت پائی جاتی ہے۔ ہر بری چیز کو جرمنوں کے سر تھوپ دینے کا یہاں عام رُجحان ہو گیا ہے۔ گو جرمنوں نے چار سال ان پر حکومت کی ہے، مگر پرانے قلعے میں جو فوجی عجائب گھر بنا دیا گیا ہے، ٹوٹے ہوئے ہوائی جہاز، توپیں اور ٹینک پڑے ہوئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ جرمنوں سے چھینے گئے ہیں۔ اسی پرانے قلعے میں وہ جگہ محفوظ کی گئی ہے جہاں مارشل ٹیٹو زخمی ہوئے تھے۔ یہاں ان کے کپڑے اور جوتے وغیرہ جو زخمی ہونے کے وقت جسم پر تھے، محفوظ کیے گئے ہیں۔

مارشل ٹیٹو: مارشل ٹیٹو سارے ملک میں عام طور پر مقبول ہیں۔ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور ہر مدرسۂ فکر میں ان کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہر عمارت ہوٹل، ریستوران اور دکانوں وغیرہ میں اُن کے فوٹو اور مجسّمے لگائے گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اب ملک بھر میں ان کی مخالف کوئی جماعت نہیں ہے، اور وہ پوری قوت اور اختیار کے ساتھ مجاز و مختارِ کل ہیں۔ ہم نے ان کا سرکاری محل بھی دور سے دیکھا۔ اسے پہلے رائل پیلیس کہا جاتا تھا۔ اب اس کا نام وہائٹ پیلیس ہے۔ سرکاری تقاریب وہیں ہوتی ہیں اور سرکاری مہمانوں کا استقبال بھی وہیں کیا جاتا ہے، حالاں کہ اپنی روزمرہ زندگی وہ ایک معمولی مکان میں گزارتے ہیں اور وہاں تکلفات کو بالکل پسند نہیں کرتے ہیں۔

جون ۱۹۴۸ء میں اس راز کا انکشاف دنیا بھر کے لیے حیرت انگیز تھا کہ یوگوسلاویہ کے اشتراکی صدر کا نام کریملن میں مرتب ہونے والی اس فہرست میں سب سے اوپر درج ہے جس میں اشتراکیت کے سخت مخالف عوامی دشمنوں کے نام شامل ہیں۔ سب نے اندازہ لگایا کہ مارشل ٹیٹو سے ضرور کوئی ایسا جرم سرزد ہوا ہے، جو روس والوں کے نزدیک ناقابلِ معافی ہے۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ ٹیٹو نے مارشل اسٹالن سے کئی معاملات میں اختلافِ رائے رکھنے کی جرأت کی تھی اور ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ یوگوسلاویہ اپنی خارجہ پالیسی خود معین کرے گا اور اس سلسلے میں کسی سے کوئی رائے یا مشورہ نہیں لے گا۔ اس طرح روس والوں کی نگاہ میں معتوب سہی لیکن وہ اپنے ملک میں ہر دل عزیز ہو گئے اور قوم ان کو نجات دہندہ سمجھنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے عام انتخابات میں جب وہ دوبارہ کھڑے ہوئے تو ان کا مخالف کوئی نہ تھا۔ وہ بلا مقابلہ کامیاب رہے۔

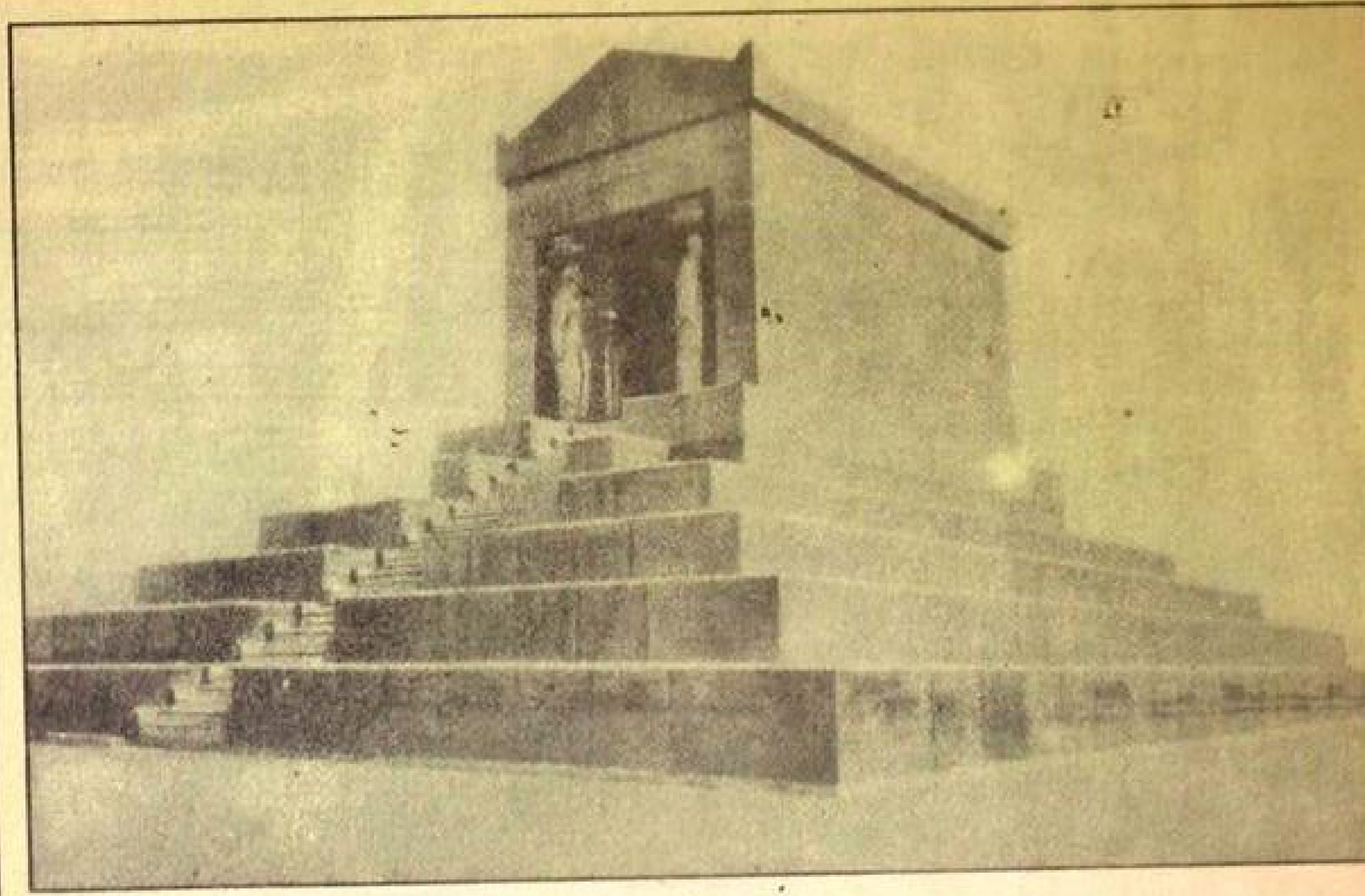
مارشل ٹیٹو کے عروج و شہرت کے اسباب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یوگوسلاویہ میں شہنشاہیت کے زوال کی داستان پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔ ۱۹۳۴ء میں فرانس کے وزیر خارجہ لوئی بارتھو تھے،

جن کو فرانس کی سیاست میں بڑا مدبر مانا گیا ہے، انھوں نے چاہا کہ فرانس اور اس کے مشرقی اتحادیوں، خصوصاً یوگوسلاویہ اور اٹلی کے مابین تعلقات زیادہ خوش گوار اور استوار ہو جائیں۔ انھوں نے یوگوسلاویہ کے بادشاہ الیگزنڈر کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی، جو قبول کر لی گئی۔ شاہ الیگزنڈر ۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو مارسیلز کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے، جہاں موسیو بارتھو نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ لیکن مسرت و شادمانی کے وہ لمحات زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئے۔ فرانسیسی بندرگاہ کی سڑکوں پر سے گزرتا ہوا ان کا جلوس سرکاری قیام گاہ کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ان پر حملہ ہوا اور وہ دونوں ہلاک کر دیے گئے۔ نہ صرف فرانس اور یوگوسلاویہ بلکہ ساری دنیا میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ قاتل تو پکڑ لیا گیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ وہ خود یوگوسلاویہ کے اشتراکیت پسند انقلابی ادارے "استاشی" کی طرف سے نامزد کر کے بھیجا گیا تھا اور کروایشیا کے دو لیڈر اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ ان دونوں کو ان کی غیر موجودگی میں فرانس کی عدالتِ عالیہ نے پھانسی کی سزا دی، حالاں کہ وہ اطمینان سے اٹلی میں چھپے بیٹھے تھے۔

الیگزنڈر کی ناگہانی موت کے بعد اس کے کم سن بیٹے پیٹر ثانی کو تخت پر بٹھا کر ایک ریجنسی مقرر کر دی گئی، لیکن اشتراکیت پسندوں کے سینے میں جو آگ سلگ رہی تھی، وہ آہستہ آہستہ لو دیتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء میں ہٹلر کی فوجوں نے ملک پر حملہ کر کے وہاں کے عوام میں غم و غصے کی نئی لہر پیدا کر دی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ شاہ پیٹر تاج و تخت چھوڑ کر لندن بھاگ گیا اور وہاں برطانوی دوستوں کی شہ پر ایک جلاوطن حکومت قائم کر لی۔ ظاہر ہے کہ اپنے ملک پر اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

بادشاہ کی غیر موجودگی میں جنرل ڈرایا میخائیلووچ نے "چٹنک" کے نام سے ایک فوجی جماعت بنائی جس کا دعویٰ تھا کہ دو لاکھ پچاس ہزار افراد اس میں شریک ہیں۔ اس جماعت نے بادشاہ سے وفاداری کا اعلان کیا۔ اس کے برعکس ٹیٹو نے زیادہ تر کروایشیا کے اشتراکیوں کے بل بوتے پر دوسری جماعت بنائی اور چوں کہ اس کے اصول کار عوام کے لیے زیادہ جاذبِ توجہ تھے، اس لیے وہ خاصی مقبول ہو گئی۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد، ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو ٹیٹو نے عوام سے اپیل کی کہ وہ ملک میں جمہوری نظام قائم کرنے میں ان کا ساتھ دیں۔ چناں چہ ۱۱ نومبر کو مجلسِ دستور ساز کے لیے جو عام انتخابات ہوئے اس میں ٹیٹو کو ۷۰ لاکھ اور ان کے ایک مخالف کو صرف سات لاکھ ووٹ ملے۔ ۲۹ نومبر کو جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو نیا دستور العمل بھی نافذ ہو گیا۔



کوہ آوالا پر "اَن نون سولجرز" کی یادگار۔



مارشل ٹیٹو (جوزف بروز)
←

لڑائی کے بعد کی خارجہ پالیسی میں ٹیٹو کی حکومت برطانیہ کے خلاف اور روس کے موافق سمجھی جاتی تھی ٹریسٹ کے تنازعے نے اس پالیسی کو زیادہ استوار اور واضح کر دیا۔ برطانیہ نے پروپیگنڈا کیا کہ ٹیٹو اپنے ملک کے معاملے میں آزاد خیال نہیں ہیں۔ انھیں ہر ہدایت کریملن سے ملتی ہے اور وہ اس پر عمل کرتے ہیں لیکن یہ جادو کارگر نہ ہوا۔

ٹیٹو نے اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے مخالفین پر کڑی نظر رکھی اور میخائیلووچ پر تو قوم فروشی کا الزام لگا کر باقاعدہ مقدمہ چلا دیا، اس کے خلاف فیصلہ کیا اور ۱۷ جولائی کو گولی مار کر اسے ختم کر دیا۔ جب راہ میں کوئی باقی نہ رہا تو ٹیٹو کی مطلق العنانی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ بہت سے لوگ انھیں خود سر آمر کہتے ہیں لیکن جہاں تک ملکی مفاد کا تعلق ہے، اہلِ وطن کے نزدیک ان کا وجود ایک نعمت ہے۔

بر سبیل تذکرہ مارشل ٹیٹو کی زندگی کے بعض ابتدائی حالات بھی ذہن نشین کر لیے جائیں تو مناسب ہے۔ ان کا اصل نام جوسپ بروز تھا۔ وہ کروایشیا کے ایک گاؤں کلان ٹس میں ۲۵ مئی ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پانی شروع کی۔ لیکن مدرسے میں ان کا دل نہ لگا۔ وہ بہت جلد اس سے اکتا کر اپنے باپ کے ساتھ لوہار کا کام کرنے لگے۔ پھر بلغراد آکر دھات کی ڈھلائی کے ایک کارخانے میں ملازمت کر لی۔ وہیں رہتے ہوئے اشتراکی خیالات کا ان پر اثر ہوا اور اس جماعت والوں سے ان کا میل جول بڑھتا گیا۔ ۲۲ سال کی عمر تھی کہ وہ آسٹریا ہنگری کی فوج میں داخل ہو گئے۔ بہت جلد جب کہ مشرقی محاذ پر ان کا پہرہ تھا، روسی فوجوں نے ان کو گرفتار کر لیا۔ وہ اسیرانِ جنگ کے کیمپ میں ڈال دیے گئے۔ لیکن خود روس میں شہنشاہیت کے خلاف انقلاب برپا ہو گیا۔ انھوں نے موقع پا کر بالشویک فوج میں اپنا نام لکھوا لیا۔ پھر انھیں خیال آیا کہ جس طرح روس میں اشتراکی انقلاب کامیاب رہا ہے، اپنے ملک میں بھی ایک نئی تحریک چلائی جائے۔ چناں چہ وہ وطن واپس گئے۔

اس وقت انھوں نے اپنا نام بدل کر ٹیٹو رکھ لیا (یہ ٹی ٹس کا بدلا ہوا یوگوسلاویائی تلفظ ہے۔ ٹی ٹس روم کا زبردست شہنشاہ تھا) ۱۹۲۴ء میں وہ یوگوسلاویہ کی غیر قانونی اشتراکی جماعت کے سربراہ ہو گئے۔ شاہ الیگزنڈر کو ان سے بڑا خوف تھا، لیکن ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈر لگتا تھا، کیونکہ وہ عوام میں بہت ہی مقبول تھے۔ آخر کب تک ڈھیلی ڈوری چھوڑی جاتی۔ ۱۹۲۸ء میں ان کو گرفتار کر کے حکومت نے سخت احتسابی کارروائی شروع کی تاکہ کوئی مخالف سر نہ اٹھا سکے۔ ٹیٹو کو پانچ سال کی سزا ہوئی اور اتنی مدت تک انھیں جیل خانے میں رہنا ہی پڑ گیا۔ دنیا کے اکثر راہنماؤں نے جیل کی تاریک کوٹھڑیوں میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ پانچ سال کی یہ قید ٹیٹو کے لیے بھی

مفید ثابت ہوئی۔ ان کا افقِ نظر زیادہ وسیع ہو گیا۔

قید سے رہا ہونے کے بعد وہ چند سال بالکل خاموش رہ کر کوائفِ عالم کا مطالعہ کرتے رہے اور کچھ عرصے بعد نہایت خفیہ طور پر اپنی پرانی تحریک کو زندہ کر دیا۔ بہت جلد ان کو ہزاروں پیرو مل گئے۔

کوہ آوالا کی چوٹی پر: ہمارا گائڈ موٹر ڈرائیور ہمیں کوہ آوالا کی چوٹی پر لے گیا جو زیادہ بلند نہیں ہے۔ وہ شُماد یا سلسلۂ کوہ کی ایک شاخ ہے۔ اس کی مخروطی شکل کی چوٹی، جو گھنے جنگل سے ڈھکی ہوئی ہے، ملک کے صدر مقام کی نگہبان ہے۔ بہت سے حملہ آور اسی چوٹی کی راہ اتر کر بلغراد کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چناں چہ ترک بھی ادھر ہی سے آئے اور انھوں نے بلغراد فتح کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کوہ آوالا پر ایک قلعہ تعمیر کر دیا تاکہ پولیس کی چوکی وہاں سے دشمنوں پر نظر رکھ سکے۔ ترکی تسلط ختم ہو جانے کے بعد بھی قلعہ بدستور قائم رہا لیکن ۱۹۳۴ء میں اسے مسمار کر کے اس کی جگہ "اَن نون سولجرز" کی ایک یادگار قائم کر دی۔ نامعلوم سپاہیوں کی یادگار کا نقشہ ملک کے مشہور سنگ تراش ایوان میسٹروِس نے تیار کیا اور بذاتِ خود تعمیر کی نگرانی کی۔ ساری عمارت کالے پتھر سے بنائی گئی ہے۔ اس میں آٹھ عورتوں کے مجسمے چھت کو سہارا دیے کھڑے ہیں۔ یہ عورتیں گویا ملک کی چھے ریاستوں اور دو خود مختار علاقوں کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ جب ہم اس جگہ پہنچے تو فرضی قبر پر شام، جاپان، چین، بلجیم، سوئزرلینڈ وغیرہ ممالک کے مندوبین کی طرف سے پیش کیے ہوئے پھول موجود تھے۔ ہم یہاں کافی دیر رہے۔ برابر کے ریستوران سے لیمونادا (لیمونیڈ) کی دو بوتلیں منگوا کر پیں۔ گائڈ نے چائے پسند کی۔

واپسی پر ہم نے دیکھا کہ ہر گلی کوچے اور بازار میں فوجیوں کی چلت پھرت عام ہے۔ لال تارا اور درانتی کا نشان ہر فوجی کی وردی یا ٹوپی پر موجود ہے۔ بازار میں بیشتر کاروبار حکومت کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ ہر دکان سرکاری ہے۔ حکومت صرف خوانچے والوں سے کوئی تعرض نہیں کرتی، باقی ہر کام پر اس کا اقتدار ہے۔

ہم نے بعض دکانوں میں گھس کر مقامی دستکاریوں کے اعلیٰ نمونے دیکھے۔ جی چاہا ان میں سے کچھ خرید لیا جائے لیکن کسٹم کی مشکلات مانع آئیں اور ہم صرف دیکھ بھال کر اور تعریف کر کے چلے آئے۔ دکانوں میں سودا بیچنے کے لیے عورتیں برابر کام کرتی ہیں۔ بازاروں میں بھی ہر قدم پر عورتیں مردوں کے ساتھ ایک دوسرے کا کھوا چھیلتی نظر آتی ہیں، بلکہ وہ ان سے دو قدم آگے ہو کر چلتی ہیں۔

یکم ستمبر ۱۹۵۶ء — ہفتہ

دوسرے کاروباروں کی طرح ہوٹلوں کا نظم ونسق بھی حکومت کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ ہمارے اس ہوٹل کے استقبالیہ میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، وہ فوجی لباس میں ہیں اور ان کی گفتگو میں وہی ''کرنیلیت'' ہے جو ایک فوجی میں ہونی چاہیے۔ اس اکڑ کے ساتھ اگر عقل نہ ہو تو یہ اکڑ بُری معلوم ہوتی ہے۔ ہوٹل میں جب میں قدم رکھتا ہوں تو بقول شخصے طبیعت بدحِھل ہو جاتی ہے۔ صفائی بھی نہیں ہے، گھنٹی بجانے پر کوئی ملتا نہیں ہے۔ پانی پینے کے لیے بھی غسل خانے کا نل استعمال کرنا ہوتا ہے۔

ہم دونوں بھائی نرم بستروں اور اسپرنگ والے پلنگوں پر سونے کے بالکل عادی نہیں ہیں، اور پھر ایسے پلنگ جن کی پسلیاں ہر کروٹ پر چیخ جائیں، بڑی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ایک تو بستروں کی نرمی اور پلنگ کی لچک نے سونے نہ دیا اور جب ذرا آنکھ جھپک جاتی تو کسی پلنگ کا اسپرنگ بول جاتا اور آنکھ کھل جاتی۔ ہم دونوں بھائی سوتے تو ہیں مگر ہوشیار، ذرا کھٹکا ہوا، آنکھ کھل جاتی۔ غرض رات بھر پلنگوں کا ساز پا آواز سنتے رہے اور صبح جب کہیں سے اذان کی آواز آئی تو ہم اللہ کا نام لے کر اور محمد کا کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھے۔

بلغراد کا ڈیڑھ دن خاصا دلچسپ رہا اور بڑی معلومات حاصل ہوئیں۔ واقعی یہ محسوس ہوا کہ یہاں کے لیے دن ذرا زیادہ رکھنے کی ضرورت تھی اور زغرب وغیرہ جانا چاہیے تھا۔ نماز فجر کے بعد بھائی جان محترم سے تبادلۂ خیال ہوا۔ وقت اتنا کم تھا کہ آج ہم کوئی ایسا پروگرام نہیں بنا سکتے تھے کہ جسے ''سائٹ سی اِنگ'' ہی کا نام دیا جا سکے، کہ گیارہ بج کر پچیس منٹ پر ہمیں ہوائی جہاز کے دفتر پہنچنا ہے۔ اس موقع کو غنیمت جانا اور ڈیڑھ دن میں جو بھی معلومات اور ذاتی تجربہ مجھے ہوا ہے میں نے سوچا کہ اسے قلمبند کر لوں۔ چنانچہ میں اپنے بستر کے دونوں تکیے دیوار کے سہارے لگا، کمبل اپنے پر ڈال، کاغذ قلم لے لکھنے بیٹھ گیا:

یوگوسلاویہ: پاکستان کی طرح یوگوسلاویہ بھی ایک نیا ملک ہے۔ جس طرح ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل پاکستان دنیا کے کسی نقشے میں نظر نہیں آسکتا، اسی طرح ۴ دسمبر ۱۹۱۸ء سے قبل اس ملک کا نام و نشان بھی کسی تاریخ یا جغرافیہ میں ڈھونڈے نہیں ملے گا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر

دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، جو پاکستان اور بھارت کہلانے لگے۔ اس کے برعکس پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۴ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو بلقان کی چند ریاستیں سربیا، کروایشیا اور سلووینیا وغیرہ کو متحد کر کے ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ چوں کہ ان تمام ریاستوں کے باشندے ایک ہی قوم و نسل (سلاف) سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ علاقہ تمام قومِ سلاف کے وطن کا جنوبی حصّہ ہے، اس لیے نئی حکومت کا نام جنوبی سلاف (یوگو سلاویہ) رکھا گیا۔ پھر جس طرح پاکستان کے دونوں بازوؤں میں خصوصاً مغربی حصّے میں رہنے والے ـــــ پنجابی، سندھی، کشمیری، سرحدی، قبائلی، بلوچی اور مکرانی وغیرہ مختلف ثقافتوں کے حامل ہیں، اسی طرح یوگو سلاویہ کے چھے صُوبوں اور دو مختار علاقوں میں سے ہر حصّے کے رہنے والے ثقافتی اعتبار سے مختلف ہیں، لیکن جس طرح مغربی پاکستان کا ایک یونٹ ایک مستحکم مرکزی حکومت کے ماتحت ہے، اسی طرح یوگو سلاویہ کے سب صوبے ایک حد تک آزاد ہونے کے باوجود ایک مضبُوط قومی حکومت کے زیرنگیں ہیں اور آپس میں ان کا کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوتا، حالانکہ پاکستان کے مسلمانوں، ہندوؤں، نصرانیوں، پارسیوں اور اچھوتوں کی طرح جو آپس میں مِل جُل کر امن و عافیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، وہاں بھی عیسائیوں کے مختلف فرقے، یہودی اور بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، جو دین و مذہب کی بنیاد پر کبھی ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوتے۔ پاکستان اور یوگو سلاویہ میں اور بھی بہت سی باتیں خاصی مماثلت رکھتی ہیں۔ مثلاً پاکستان کے دونوں بازو متعدد حکومتوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں، اسی طرح یوگو سلاویہ بھی، جس کے جنوب مغرب میں بحیرۂ ایڈریاٹک کا ایک ہزار میل ساحل ہے، باقی اطراف میں سات ملکوں ـــــ البانیہ، یونان، بلغاریہ، رومانیہ، ہنگری، آسٹریا اور اٹلی سے ملا ہوا ہے اور اس لیے پاکستان کی طرح اسے بھی سرحدی حملوں سے بچانے کے لیے سخت حفاظتی انتظام کرنے پڑتے ہیں۔ جس طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں پاکستان کی سرزمین پر مختلف حکومتیں حملہ آور رہی ہیں، اسی طرح یہ ملک بھی آئے دن اپنے پڑوسیوں کی ہوس ملک گیری کا نشانہ بنا رہا ہے۔ تاریخ کے دورِ جدید میں سب سے زیادہ طویل مدّت تک یہاں ترکی کے مسلمانوں کا تسلّط رہا ہے۔ اسی لیے نصرانیت کے علاوہ، جو اب بھی یورپ کے بہت بڑے حصّے کا سرکاری مذہب ہے، یہاں اسلامی تہذیب و تمدّن اور ثقافت کے گہرے نقوش چپّے چپّے پر نظر آتے ہیں۔ قدرتی طور پر ہمیں یوگو سلاویہ سے خاص دل چسپی ہو گئی اور ہم نے تہیّہ کیا کہ اپنے اصل مقصدِ سفر کی تکمیل کے علاوہ یہاں کے باشندوں کے ذہنی رُجحانات کا اچھا مطالعہ کیا جائے گا۔



یوگوسلاویہ کے مختلف حصّوں میں
قومی لباس کے نمونے



قمیص پر کشیدہ کاری

رقبہ اور چھ ریاستیں: وفاقی جمہوریت یوگوسلاویہ کا رقبہ تقریباً ۲ لاکھ ۵۶ ہزار کلو میٹر (پچیانوے ہزار پانچ سو اٹھاون مربع میل) اور آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ جن میں ۲۰ لاکھ کے قریب مسلمان ہیں۔ سارا ملک اِن چھ جمہوری ریاستوں میں منقسم ہے: (۱) سربیا (صدر مقام بلغراد) (۲) کروایٹیا (صدر مقام زغرب) اس میں استریا اور دلماطیہ نام کے دو خود مختار علاقے بھی شامل ہیں۔ (۳) سلووینیا (صدر مقام لائی باش (LJUBLYANA) (۴) بوسینیا اور ہرسی گووینیا (صدر مقام سرایہ وو) (۵) مونٹی نیگرو (صدر مقام ٹیٹوگراڈ، جو پہلی جنگِ عظیم سے قبل پوڈگورٹسا کہلاتا تھا) (۶) مقدونیہ (صدر مقام اسکوپیے)

سرحدیں: اس ملک کی سرحدوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے کہ جانبِ جنوب البانیہ اس ملک میں اس طرح گھسا ہوا ہے کہ سمندر اور مقدونیہ کے درمیان اس کے وجود کو ایک قبضۂ غاصبانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جانبِ جنوب مقدونیہ کی سرحد یونان سے ملی ہوئی ہے جو ۱۵۲ میل لمبی ہے۔ اسی صوبے کے جانبِ غرب البانیہ کی سرحد ۲۷۰ میل ہے۔ اب مشرقی جانب سے شمال کی طرف بڑھیں تو بلغاریہ کے ساتھ اس کی سرحد ۲۸۳ میل، رومانیہ کے ساتھ ۳۴۰ میل، ہنگری کے ساتھ ۳۵۳ میل آسٹریا کے ساتھ ۱۶۰ میل اور پھر جانبِ غرب اٹلی کے ساتھ ۱۳۲ میل ہے۔ اگر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سفر کیا جائے تو بحیرۂ ایڈریاٹک کی جانب اس کی سرحد صرف ۳۹۰ میل ہے، لیکن ساحل اس قدر کٹا پھٹا ہے کہ اگر کشتی میں بیٹھ کر کنارے کنارے چلا جائے تو ایک ہزار دو سو ستر میل کی مسافت طے کرنی پڑے گی۔ علاوہ ازیں ساحل کے قریب ایک ہزار پچاس کے قریب چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ اگر ان کے ساحلوں کو بھی ملایا جائے تو کل لمبائی چار ہزار میل سے بڑھ جائے گی۔ ملک کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے۔ جانبِ شرق سلسلہ کوہ ایلپس کی ایک چوٹی کراوانکن کے علاوہ، جو چھ ہزار فیٹ بلند ہے، ایک اور پہاڑ ماؤنٹ ٹریگلاف کہلاتا ہے، جو نو ہزار فیٹ اونچا ہے۔ اس پر خوب برف جمی رہتی ہے۔ سال کے بیشتر حصے میں اسکیٹنگ اور شی اِنگ کے شوقین اس کی وادیوں اور گھاٹیوں میں تفریحی سیاحت کرتے ہیں۔ یہ امر بھی خالی از استعجاب نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملک میں، جو سیاسی اور معاشرتی اصول و عقائد کے لحاظ سے بالکل کمیونسٹ ہے، ۸۰ فیصد امریکی سیّاح سیر و سیاحت کے لیے آتے اور کئی لاکھ ڈالر کا زرِ مُبادلہ صرف کر کے لطف و نشاط حاصل کرتے ہیں۔

معاشرتی زندگی: ان لوگوں کی معاشرتی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اکثریت اب

بھی ناخواندہ اور حفظِ صحت کے جدید اصولوں سے ناواقف ہے۔ کیوں کہ ان پہلوؤں پر توجہ دینے کا کام حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ جمہوریت کی تشکیل سے قبل جو حکومت قائم تھی، اسے اپنے مفاد سے سروکار تھا۔ اس نے رعایا کی کبھی پروا نہ کی۔ بڑی اکثریت کاشت کاروں کی ہے، جن کو ہمیشہ اس طرح تابع فرمان رکھا گیا کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے خواب تک نہ دیکھ سکے۔ دستکاروں کی تعداد بھی زیادہ ہے، جو پرانی لکیر کے فقیر بنے اپنی روایتی صنعتوں پر تکیہ کیے رہے اور یہ خیال تک دل میں نہ لائے کہ زمانہ ترقی کی کن منزلوں سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔

ترکی فتوحات:۔ یہاں کے حالات نے ایک کروٹ پندرھویں صدی میں اس وقت لی تھی جبکہ ترکوں نے بلقانی ریاستوں کو زیرنگیں کرنے کے لیے اس علاقے کا رخ کیا اور ۱۴۵۹ء میں سربیا، ۱۴۶۳ء میں بوسینا، ۱۴۸۳ء میں ہرسی گووینیا اور ۱۴۹۹ء میں مونٹی نیگرو فتح کر لیے۔ ان علاقوں پر عثمانی ترکوں کا قبضہ بھی تاریخ کا ایک اہم دور ہے، کیوں کہ اسی زمانے میں دینِ اسلام یورپ کے اس حصے میں پھیلا۔ تاہم مورخینِ عالم اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبرداروں کی طرح ترکوں نے اپنے عقائد کو فروغ دینے میں ذرا بھی جبر و استبداد سے کام نہیں لیا۔ صرف ان نوجوانوں کو جو "جانثاروں" اور سپاہی دستوں میں بہ رضا و رغبت شامل ہو گئے تھے، مصلحتاً دعوتِ قبول اسلام پیش کی گئی۔ تاریخ اس امر کی بھی شاہد ہے کہ اس سرزمین پہ اپنے پرچم بلند کر دینے اور باقاعدہ عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے باوجود ترکوں نے وہاں کے نصرانیوں پر، جن کی اکثریت تھی، کبھی ناجائز دباؤ نہیں ڈالا۔ شرفا نے نیا مذہب خود ہی اس لیے اختیار کر لیا کہ دائرۂ حکومت میں ان کا اثر و رسوخ اور اقتدار بدستور قائم رہے اور ان کی دولت و ثروت یا معاشرتی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے۔ ایک لحاظ سے سوچا جائے تو اس علاقے میں اسلامی عقائد کا ہلکا سا رنگ ترکوں کی آمد سے پہلے ہی اپنی جھلک دکھا چکا تھا، جبکہ البانیہ کے مسلمان وہاں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے تھے۔ چنانچہ پانچ صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی سارے ملک میں اور خصوصاً بوسینا ہرسی گووینیا کے علاقے میں مسلمانوں کی کافی تعداد موجود ہے۔

عثمانی ترکوں کے عہد میں تو ملک کی سیاست و معاشرت میں ان کا برسرِ اقتدار ہونا ایک قدرتی امر کہا جا سکتا ہے، لیکن آج بھی وہ ترقی کی دوڑ میں کسی اور سے پیچھے نہیں ہیں۔ زندگی کے کسی شعبے میں اور ثقافت کے کسی میدان میں نظر دوڑائی جائے تو مسلمان ہر منزل میں ضرور نظر آئیں گے۔

عثمانی عہدِ حکومت میں بہت سے مقامی باشندوں نے، جو مسلمان ہو گئے تھے، اعلیٰ سرکاری عہدے

پائے۔ مثلاً محمد پاشا سوکولوفس، رستم پاشا، پرتیف پاشا، علی پاشا سمیز اور حسن پاشا پریدووس قابلِ ذکر ہیں۔ ہرسی گووینیا کے مشہور مورخ ڈاکٹر صفوت بیگ بشاغس نے ایسے سات سو نام گنوائے ہیں، جن کو عثمانی حکومت نے اپنے ابتدائی دور میں نوازا تھا۔ تاہم ان لوگوں نے اپنی قومیت کے احساس اور نسلی امتیاز کے جذبات کو کبھی جاہ و ثروت پر قربان نہ ہونے دیا، بلکہ محمد حسن آفندی اسکوپیائی نے، جو سترھویں صدی میں مشہور مصنف گزرا ہے، بہت فخر و انبساط کے ساتھ ہمیشہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم سلافی النسل ہیں۔ اسی طرح محمد پاشا سوکولوفس، جو وزیر اعظم کے مرتبے پر فائز رہا، فخریہ کہتا تھا کہ میں سربیا کے خانوادۂ گوراز دے سے تعلق رکھتا ہوں۔

مسلمان شعراء و ادیب:۔ ایسے مسلمانوں میں بہت سے ادیب اور شعرا بھی گزرے ہیں، خصوصاً محمد خیوائی تزلق (تغلق)، کو سترھویں صدی کے ابتدائی دور میں بڑا مرتبہ دیا گیا۔ اس کے عشقیہ کلام کے علاوہ قومی نظمیں آج بھی ہر پڑھے لکھے یوگوسلاویائی کی نوکِ زبان پر ہیں۔ اسی طرح مستاج بیگ اور ہرنیسا خلیل کی رزمیہ نظمیں بہت مشہور ہیں۔ مسلمان شاعروں نے امرا کی شان میں قصیدے لکھ کر انعامات پانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ انھوں نے عموماً غربا کی زندگی پر روشنی ڈالنا اور غربت و افلاس کا سبب بیان کرنا اپنا فرض سمجھا۔ چنانچہ یوگوسلاویائی زبان میں "فکرا" (فقرا) غریب کے معنوں میں اب بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس ضمن میں مراد بیگوفس کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری میں خلوت کے اندر گائے جانے والے گیتوں کا رنگ نمایاں ہے۔ اس نے تاثراتِ حسن اور جذباتِ عشق کی ترجمانی بہت ہی منفرد انداز میں کی ہے۔ حزنیہ شاعری کو مقامی زبان میں "سیودلنکا" کہتے ہیں۔ یہ لفظ ترکی ترکیب "سوید دلی" سے بنا ہے۔

یوگوسلاویہ کے مسلمان مصنفوں نے نہ صرف سربو کروایشیا زبان میں اپنا کلام چھوڑا ہے، بلکہ انھوں نے ترکی، عربی اور فارسی کو بھی فکر و خیال کی جولانگاہ بنایا ہے۔ اسی طرح انھوں نے لاطینی رسم الخط کے علاوہ عربی طرزِ تحریر بھی اختیار کیا ہے۔ بعض شاعروں کے کلام میں شاید اسی لیے کچھ مذہبی رنگ جھلکتا ہے۔ اس صف میں محمد خواری، قائمیہ، ملا مصطفیٰ بازسکینہ سید وہاب الٰہی، شیخ عبدالرحمن اور عمر خومو نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ترک نژاد، یوگوسلاویائی ادیبوں میں سے حسن جافی آفندی نے سب سے زیادہ نام پیدا کیا۔ عربی زبان میں اس کی تصنیف "عقل کی بنیادیں" کافی مشہور ہے۔ سلطان محمد ثالث کے حکم سے اس کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا گیا۔ ان

سب کے علاوہ اس ملک کے اتنے مسلمان ادیبوں اور شاعروں کے نام تاریخ میں ملتے ہیں کہ اگر ان کا سرسری ذکر بھی کیا جائے تو روزنامچے کے سیکڑوں صفحات اسی سے بھر جائیں۔

یوگوسلاویائی زبان پر اسلامی اثرات:۔ ڈیڑھ روزہ قیام اور کلام نے مجھ پر یہاں اس کا پہلی بار انکشاف کیا کہ یوگوسلاویائی زبان پر خاصے اسلامی اثرات ہیں۔ میں اپنے گائڈ کی زبان بڑے غور سے سنتا اور جب مجھے کوئی لفظ عربی فارسی کا ملتا، میں اس سے اس کے بارے میں تحقیق کرتا، اور اس میں بڑا لطف آتا۔ میں نے متعدد الفاظ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے اور یہاں یہ تحریر کرنا ضرور باعثِ دل چسپی ہوگا کہ ترکی ثقافت اور اسلامی عقائد کے زیرِ اثر اس علاقے کی زبان پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ چناں چہ ترکی، عربی اور فارسی کے ہزاروں الفاظ جو اردو زبان میں بھی رائج ہیں، خفیف تغیرِ ہیئت یا صوتی فرق کے ساتھ یوگوسلاویہ کی زبان میں شامل ہیں اور اس قدر رچ گئے ہیں کہ ایک دم ان کے اصل مادے کا پتہ چلانا دشوار ہو جاتا ہے، وہاں ٹھیٹھ اردو کے بعض ایسے الفاظ بھی عام بول چال میں مستعمل ہیں جن کو سن کر اہلِ زبان دنگ رہ جاتے ہیں۔ نام نہاد ہند یورپی مادوں سے بنے ہوئے "پی" "دے" "اوگ" (آگ)، اور "زم" (زمین) جیسے پرانے الفاظ کے علاوہ جو سلافی اور پاکستانی زبان میں یکساں طور پر رائج ہیں، بہت سے نئے اور مستعار الفاظ یقین دلاتے ہیں کہ حال ہی میں سلافی زبان کا مشرقی زبانوں سے کتنا قریبی تعلق رہا ہے۔ نئے نظام زر میں "دینا" کا سکہ چل رہا ہے اور بٹوے کے لیے "کیسہ" اور جیب کے لیے "دجیب" استعمال ہوتا ہے۔ (ایسے الفاظ میں "د" کی آواز اتنی خفیف ہوتی ہے کہ اس کی ادائیگی غیر ملکیوں سے مشکل ہے محض سمجھنے کے لیے اس طرح تحریر کیا جا سکتا ہے)، بازار یا منڈی کے لیے "پازار" رائج ہونے کے علاوہ خریدنے اور سوداگری کے معنوں میں "پازاریتی" بطور فعل مستعمل ہے۔ اسی طرح "دکان" بھی رائج ہے۔ کھانے پینے کی بہت سی چیزوں کے علاوہ نباتات، معدنیات اور حیوانات کے بعض نام بھی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ افیون، بادام، قطران، شوربہ، دھواں (بمعنی تمباکو)، حلوا، کائے گن (خاگینہ) ہیون، نسادر (نوسادر)، شپ (شب بمعنی پھٹکری)، نعنار، نار (انار)، پاتک (بطخ)، پلاؤ، پرینچ (برنج)، ساپن (صابن)، صدف، ژمبل (سنبل)، شمشر (شمشاد)، قرنفل وغیرہ مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

یوگوسلاویہ میں مغربی طریقۂ علاج کے ساتھ ساتھ مشرقی طب کو بھی فروغ حاصل ہے۔ حکیم کی زبان پر حسبِ ذیل اصطلاحات عام ہیں:

معجون، علاج، ممراجے (سورنجان)، ملم (مرہم)، مُردہ (مُردہ سنگ)، سرمہ اور حنا۔ خود حکیم کو (ح) الکیم کہا جاتا ہے۔

یوگوسلاویہ کے بہت بڑے حصے کی ادبی اور روزمرہ کی زبان ایسی ہے جو روسی کے بہت زیادہ قریب ہے۔ اس میں قدیم سلافی فرہنگ اور علم نحو کو بجنسہٖ قائم رکھتے ہوئے نئے اشتقاقات سے خصوصاً ان الفاظ سے جو ترکی سے مستعار لیے گئے ہیں، زبان میں بیش قیمت اضافہ کیا گیا ہے۔ غیر ملکی الفاظ سلافی قاعدۂ گردان اور تشکیل الفاظ کے مطابق جلدی سے نئے سانچوں میں ڈھل جاتے اور انھی جیسے ہو جاتے ہیں۔ (ح) امالین (حمال سے) صیغہ واحد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ "توپ" کی جمع حسبِ قاعدہ "توپودی" بنائی جاتی ہے۔ (ح) اِپس (جس) سے ایک نیا مصدر (ح) اِپسیتی یعنی قید کرنا بنایا گیا ہے۔ "نیما فائدے" (کوئی فائدہ نہیں) میں لفظ فائدے صیغۂ تانیث کے ساتھ ساتھ منفی بھی ہے یعنی اس کے معنے "بے فائدہ" لیے جاتے ہیں۔ "پاپس آ" (پاپوش) جوتے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک محاورہ "پود پاپس ایم" بنایا ہے یعنی جوتے خور اور مجازاً زن مرید۔ "پس مُرن" پژمردہ سے بنا ہے۔ قافیے کے لحاظ سے عام سلافی اسمائے صفت بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں۔ "کری یا" (کرایہ) سے اسم فاعل "کرائے دجِ اجا" یعنی کرایہ دینے والا بنا لیا۔ "امانت" کا مصدر "امانت اتی" ہو گیا، لیکن اس کے کئی معنی ہیں۔ مثلاً صدق دل سے کہنا، خدا کا واسطہ دینا، یا حلف اٹھوانا۔ اسی ترکیب سے "تا کومی امانت" کے معنے ہوئے "مجھے خدا کی قسم" یا "مجھے مقدس چیز کی قسم"۔ لفظ "آسَ اک" (عاشق) سے جذبۂ محبت کو ظاہر کرنے والے بہت سے لفظ بنائے گئے ہیں، مثلاً "آسَ اِکوواتی" "آسَ اکودہ" "آسَ اِکلیا" اور "آسَ اِکووانیے"۔ بعض الفاظ جوں کے توں قائم رہتے ہیں، خصوصاً وہ جن کو ظرفی یا صفتی طور پر بدلا گیا ہے۔ مثلاً "تازے" (تازہ)، "ناسَ تے" (ناشتہ) اور "ناسَ تے سرتسے" بمعنی خالی معدہ۔ اسی طرح حلال "حلال تی دن" یا "حلال تی ویرا" میں حق "حق دن" میں۔ مفتے (مفت)، عنات (عناد)، زاعنات میں ـ (دشمنی کے طور پر یا کسی کو ناراض کرنے کے لیے)، "تمان" (تمام) بمعنی بالکل، ٹھیک یا کل۔ "بار" یا "بارم" (بارے) بمعنی کم سے کم، تاہم یا پھر بھی۔ "قس الیف"، کیف کے ہم معنی ہے۔ بعض الفاظ کو اپنانے میں یوگوسلاویائی طرز کے عام رجحانات کا لحاظ رکھتے ہوئے لب و لہجے، زور یا زیر و بم کے اعتبار سے صوتی تبدیلیاں عمل میں لائی گئی ہیں۔ مثلاً دووال یا دوریاں (دھواں)، م الہ (محلہ)، بریکت (برکت)، کورر ڈ دکور بمعنی یک چشم، کاذر (قفس)، چیسما (چشمہ ـ پانی کا)، بارووت (بارود) قلوجاتا

دفنجان)، کدر (قادر)، دوشک (توشک)، کولا (قلعہ)، باشتا (بوستان)، تور با (توبڑا)، مش تے (مژدہ) ساحت (ساعت)، دیردن (گردن بمعنی گلوبند)، پارچے (پارچہ) (اس کی جمع پارچیتا ہے)، مال، مرشٰ (دھیمے) ہے وان (حیوان)، ماروا (ملبہ)۔ کبھی کبھی حیئے وان کے معنی مویشی بھی لیے جاتے ہیں۔

اگرچہ اس طرح مستعار لیے ہوئے الفاظ کے صحیح اعداد و شمار کا پتہ نہیں لگایا گیا ہے۔ تاہم یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ عربی فارسی مادّے کے الفاظ ترکی مادّے کے الفاظ سے کہیں زیادہ ہیں۔ بہت سے الفاظ اس زمانے میں رائج ہوئے ہیں جبکہ ایرانی اور سلافی میں ایک قریبی تعلق قائم تھا۔ ایسے الفاظ تمام سلافی زبانوں میں موجود ہیں۔ چوں کہ پرانی اصطلاحات میں صوتی اعتبار سے ذرا کم تغیر ہوا ہے، اس لیے ان میں امتیاز کرنا کسی قدر مشکل ہے، بہ نسبت ان نئے الفاظ کے جو حال ہی میں ترکی کے واسطے سے یوگوسلاویہ کی زبان میں شامل ہوئے ہیں۔ مثلاً قوبان (چوپان)، غالباً پرانا لفظ ہے۔ موژاگ (موغزا کا مضاعف بمعنی مغز) بھی یقیناً اسی قسم کا ہے۔ (ح) الفہ (حلقہ) یقیناً حال کا لفظ ہے۔ بعض لفظ ایسے ہیں جن میں بظاہر ایک تعلق موجود ہے لیکن ان کے تاریخی پہلو پر نظر ڈالنا مشکل ہے۔ مثلاً لیش (لاش)، چیچا یا چیکا (چچا)، ژیٹ (جیٹھ ـــــ یہ سالے بہنوی، جیٹھ دیور اور داماد سب کے لیے استعمال ہوتا ہے) لفظ "دیور" علیحدہ بھی رائج ہے، اور دولھا کے چھوٹے بھائی یا شہ بالا کے لیے پیار کے طور پر بولا جاتا ہے۔ بعض اصطلاحات سے پتہ چلتا ہے کہ مذہبی فرق و امتیاز کے باوجود لوگوں میں عام رسم و رواج اور عقائد کس درجہ مشترک ہیں۔ ایک لفظ "امانت" کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ایک اور لفظ (ح) امائے لیہ (حمائل)، ہے جو تعویذ وغیرہ کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ یہ مسلم آبادی کے موجودہ علاقوں سے بہت پرے بھی رائج ہے۔ "دجانم" (جانم)، معمولی طور پر ایک آدھ صوبے میں بولا جاتا ہے لیکن جہاں تک شاعرانہ حسن بیان اور اظہار جذبات کا تعلق ہے، اس کا استعمال لامحدود ہے۔ "میراژ" (میراث) بھی وہاں کی زبان میں شامل ہوا لیکن اس کے معنے "جہیز" لیے جاتے ہیں۔ شہری زندگی یا تجارتی امور سے متعلق بہت سی اصطلاحات عوام میں خوب رائج ہیں۔ مثلاً آلات (بمعنی اوزار)، اسپاپ (اسباب)، شیگرت (شاگرد)، صندک (صندوق)، مے (ح) آنہ (مے خانہ)، کاساپن (قصاب)، کالب (قالب)، حنجر (خنجر)، تفتر (دفتر بمعنی بہی کھاتہ)، مائدن (معدن)، فتلیے (فتیلہ)، دگمے (تکمہ)، ژنت (صنعت)، مُسٓ تریئے (مشتری)، ترازیے (ترازو)، کلائے اساتی (قلعی کرنا)، بعض لفظ بالکل ہم معنی ہیں اور ان کا تلفظ بھی نہیں بدلا ہے۔ شلاً دشمن یا نشان جو روایتی شاعری اور ادبی زبان میں مقبولِ عوام ہیں۔ ان کے علاوہ دلبر، زلم (ظلم)، حتاب (حب)، بیلن (ابلق)، صبائلے (صبح) بھی مشہور ہیں۔

میرے روزنامچے کے صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اور جو کچھ معلوم ہوا ہے یہاں لکھوں۔ ترکی کے حالات ہی بڑھتے بڑھتے اتنے ہو گئے کہ ان کا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ ادھر اب بھائی جان محترم نے اپنے خاص انداز میں ارشاد فرمایا "بھائی بس لکھنا بند کرو نا!" لہٰذا میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ دس بج کر چودہ منٹ ہو گئے تھے۔ ناشتہ میں نے تو روزنامچے کی وجہ سے چھوڑ دیا اور بھائی جان محترم نے شاید ناشتے کے لیے تنہا جانا پسند نہیں فرمایا۔ غرض اب ہم نے روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سامان باندھ لیا اور ٹھیک کر کے ۱۱ بجے نیچے استقبالیہ میں بھجوا دیا اور اطلاع دیدی کہ بل جلد تیار کریں۔ ویسے بھی کل شام میں نے کرنل صاحب سے کہہ دیا تھا۔

سامان نیچے بھیج کر ہم دونوں بھائی اپنے پورٹ فولیو ہاتھوں میں لیے نیچے آنے کے لیے لفٹ پر سوار ہوئے تو ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا، جس نے ذرا سی دیر کے لیے تو پریشان کر دیا۔ ہوا یہ کہ لفٹ جب نیچے آ کر زمین سے لگا تو بجائے ٹھیرنے کے یہ پھر چل پڑا اور ہم ایک بار پھر اوپر کی منزل میں پہنچ گئے! اور وہاں جب نکلنے کا قصد کیا تو لفٹ پھر چل پڑا اور ہم پھر نیچے آ گئے اور نیچے آ کر پھر لفٹ اوپر چل پڑا! اندازہ ہوا کہ کوئی خرابی ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ بارے بھائی جان محترم نے نیچے اترتے وقت ایک تدبیر یہ اختیار کی کہ بڑی تیزی کے ساتھ تمام سوئچوں پر انگلیاں مارنی شروع کر دیں اور اس طرح لفٹ نیچے اس بار رک گیا!

باہر نکل کر استقبالیہ میں آئے تو بل تیار نہیں تھا۔ کرنل صاحب حساب داں کیسے ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے الٹا سیدھا بل بنایا جو ہماری رائے میں غلط تھا۔ ہم سے کم پیسے لیے جا رہے تھے۔ ہم نے توجہ دلائی مگر وہ اکڑ گئے اور ہم جو انھوں نے مانگا، دے کر ان سے پیچھا چھڑا کر یاٹ، کے دفتر پہنچ گئے۔

ہم احتیاطاً سوا گیارہ بجے ہوائی کمپنی کے دفتر پہنچ گئے اور ہماری یہ احتیاط کام آئی۔ اس لیے کہ کمپنی سے موٹر ساڑھے گیارہ بجے ہوائی میدان کے لیے روانہ ہو گئی۔ حالاں کہ انھوں نے ہمیں پانچ منٹ بعد کا وقت دیا تھا۔ یہاں زبان نہ سمجھنے کا سوال نہیں تھا، بلکہ خالصتاً غفلت ہے۔ بارے ہم کسی نہ کسی طرح ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ اب ایک بار پھر مجھے تشویش ہوئی کہ وہ ڈبہ جو ہم یہاں چھوڑ گئے تھے، واپس لینے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ وہ خاتون جو انگریزی جانتی ہیں، ان کی مدد سے یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ ہمارا سامان چیک نہیں ہوا اور یہ بکس بیگ میں رکھ لینے کا موقع مل گیا۔

اس کے بعد ہم سے کہا گیا کہ "فنش" یعنی سب معاملہ ختم۔ اب ہم ہوائی جہاز پر چلے جائیں۔ ہمارا

سامان ایک طرف رکھ دیا گیا۔ ہم کچھ دیر کے لیے ریستوران میں جا بیٹھے۔ کیونکہ اور لوگ بھی وہیں موجود تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جہاز ٹھیک کس وقت روانہ ہوگا۔ نہ کوئی اعلان ہوا اور نہ کوئی اطلاع ملی پریشانی یہ تھی کہ اگر ان نا سمجھوں نے ہمیں بٹھائے رکھا اور جہاز دوڑا دیا تو ہم ان کا کیا کرلیں گے میں بار بار اطمینان کرنے جاتا اور آتا۔ شاید لوگ میری پریشانی محسوس کر رہے تھے لیکن منہ سے نہیں بولتے تھے۔ مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ اپنا سامان دوسرے بہت سے سامان کے ساتھ رکھا ہے۔ دو اور آدمیوں سے معلوم ہوا کہ وہ ویانا جارہے ہیں۔ ان پر بھی نظر رکھی بلکہ ان کے ساتھ اپنی قسمت کچھ وابستہ کردیا۔

بارے پونے تین بجے ہمارا جہاز ویانا روانہ ہوگیا۔ سوا تین بجے دوپہر کا کھانا جہاز میں دیا گیا جو میں نے نہیں کھایا۔ صرف انگور کھائے جو واقعی اتنے ہی اچھے اور نفیس تھے جتنے ناسمجھ اور کرخت مغز ہوائی میدان کے لوگ ہیں۔

ہمارا جہاز بڑے سرسبز و شاداب علاقے سے اُڑ رہا ہے۔ کبھی بہتا ہوا پانی بھی نظر آجاتا ہے۔ اکثر علاقہ پہاڑی ہے۔ مگر دیکھتے دیکھتے کچھ عمارتوں نے بھی جھلک دکھانی شروع کردی۔ کمر کسنے کا اعلان سرخ بتی نے کیا اور اب ہم ۴ بجے ویانا کے ہوائی میدان پر اُترنے لگے۔

آسٹریا

یکم ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء ——— ہفتہ

ہمارا جہاز نہایت تیزی کے ساتھ فضا کے وسیع و بسیط پردے چاک کرتا، یوگوسلادیہ کی جانب سے آسٹریا کی سمت پرواز کرتا چلا جارہا تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت جان کر مناسب سمجھا کہ نئے ملک کے کچھ تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی حالات کا مطالعہ کرلیا جائے۔ چناں چہ ہینڈ بیگ سے کتاب نکالی اور پڑھنا شروع کردیا۔

تاریخ و سیاست: روم کے شہنشاہ مارکس اوریلی اَس نے مرنے سے چند لمحے پہلے اپنے روزنامچے میں یہ مقولہ درج کیا تھا:

"ایک چٹان کی مانند رہو، جو لہروں کا سر توڑ دیتی ہے۔ خود ساکت رہتی اور سمندر کو پیچ و تاب میں رکھتی ہے۔"

یہ شہنشاہ ۱۸۰ سن عیسوی میں وِنڈوبونا کے فوجی کیمپ میں فوت ہوا۔ یہ منزل اس کی سلطنت کی آخری حد تھی اور اسی جگہ آسٹریا کا موجودہ صدر مقام ویانا آباد ہے۔

سلطنت روم کے دو صوبے نوریکم اور پنونیا کئی صدیاں گزرنے کے بعد ایک ریاست متحدہ بن کر اوسٹ مارک یعنی نشانِ مشرق کہلائے اور یہی لفظ اوسٹ مارک اپنی ہیئت بدل کر آسٹریا بن گیا۔ ۹۶۶ء کی ایک دستاویز پہلی محفوظ شدہ تحریر ہے جس میں آسٹریا کا نام اوسٹارچی درج ہے۔ اس سلطنت کی داغ بیل شہنشاہ شارلیمین کے ہاتھوں آٹھویں صدی عیسوی میں رکھی گئی تھی۔ یہی مقام کئی سو سال تک آوار، ہن اور ترک جیسے بہت سے مشرقی قبائل کے حملوں کو روکنے کے لیے ایک مضبوط قلعہ بنا رہا لیکن تابہ کے۔ بہت سے فوجی محاربات کامیاب بھی رہے اور اس طرح بہت سی قومیں اسے اپنا مستقر بناتی اور یہاں کے لوگوں کے لیے اپنے نسلی اور ثقافتی ورثے چھوڑتی رہیں۔ چناں چہ زمانۂ حال کی بات ہے۔ جنگِ عظیم اول شروع ہونے سے کچھ ہی عرصے قبل ملک کے وزیر اعظم نے آسٹریا کی پارلیمان میں کہا تھا:

"اس ملک کا محلِ وقوع بے مثال ہے اور اسی لیے یہاں آٹھ قومیں آباد ہیں۔ بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ ملک کے سترہ صوبے ہیں، جن کی بیس مجالس قائم ہیں۔

ستائیس سیاسی جماعتیں قومی معاملات میں حصہ لیتی ہیں اور فکر و خیال کے دو متضاد نظریے لوگوں کے دل و دماغ پر حاوی ہیں۔"

شارلیمین کے بعد روم کے ایک شہنشاہ اوٹو نے ۹۷۶ء میں فرانس کے ایک خانوادہ بابن برگ کو آسٹریا پر حکومت کے اختیارات تفویض کر دیے اور انتظامی اعتبار سے اس کا جزوی الحاق بویریا کے ساتھ قائم رکھا۔ تاہم کچھ ہی عرصے بعد اسی خاندان کے ایک فرمانروا ہنریک دوم نے کافی استحکام حاصل کرنے کے بعد بویریا سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس وقت تک آسٹریا نصرانی ثقافت کا مرکز بن چکا تھا۔ یورپ کے مختلف علاقوں سے سمٹ کر مفکر، شعرا اور ادیب اس علاقے میں بود و باش اختیار کرنے لگے۔

اسی زمانے میں مشہور سیاست داں ووگل ویڈ جنوبی ٹائرول سے آیا اور دربارِ ویانا میں اسے رسائی حاصل ہو گئی۔ اسی زمانے میں آسٹریا کی مشہور رزمیہ نظم نبیلنگز کو ایک شاعر نے دریائے ڈینیوب کے کنارے لکھنا شروع کیا۔ پھر صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والی فوجیں اس علاقے سے گزرنے لگیں۔ انگلستان کا نام نہاد شیر دل بادشاہ رچرڈ واشاؤ کے علاقے میں قید کر دیا گیا اور جب ۱۲۴۶ء میں بابن برگ خاندان میں کوئی وارثِ تخت باقی نہ رہا تو آس پاس کی ریاستیں اپنا حق جتانے اور زور آزمائی کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ بوہیمیا کا فرمانروا اوٹوکر حصولِ اقتدار کی اس لڑائی میں کامراں رہا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ سلافی قوم کی ایک زبردست سلطنت قائم کی جائے لیکن وہ اس مقصد میں ناکام رہا۔ ۱۲۷۸ء میں وہ ویانا کے مضافات میں جرمنی کے بادشاہ رڈولف ہیبس برگ سے لڑتے لڑتے فوت ہو گیا۔ جرمنی کا یہ بادشاہ ایک سوئستانی خاندان سے تھا۔

شاہ رڈولف نے بابن برگ کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنے دو بیٹوں البرٹ اور رڈولف دوم کے سپرد کر دی۔ اس طرح ہیبس برگ خاندان آسٹریا پر قابض ہو گیا۔ اور سلطنت روم کے ساتھ بھی اسے اپنی حیثیت استوار رکھنے میں کامیابی ہو گئی۔ رڈولف چہارم نے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ۱۳۶۵ء میں ویانا یونیورسٹی قائم کی تھی، ۱۳۵۰ء میں کوشش کی کہ سوئٹزرلینڈ کے اس علاقے کا کچھ حصہ جو ہیبس برگ خاندان کی ملکیت میں تھا، آسٹریا میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ ٹائرول کا علاقہ لے لیا گیا۔ اس سے قبل آسٹریا کی سرحد کارنتھیا اور کارنیولا تک پھیلی ہوئی تھی جو کوہ الپس کے جانبِ جنوب واقع ہیں۔ کچھ عرصے بعد بحیرۂ ایڈریاٹک کی بندرگاہ ٹریسٹ بھی آسٹریا میں شامل کر لی گئی اور اس طرح ملک کی حد کو براہِ راست بحیرۂ روم سے مل جانے کا موقع مل گیا۔

آسٹریا میں اقتدار کی ایک نئی جنگ اس وقت شروع ہوئی جبکہ ہیبس برگ کے سلسلے کے البرٹ خاندان میں کوئی وارثِ تخت باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہنگری کے بادشاہ ماتھیاس کورومینس نے آسٹریا پر حملہ کرکے ویانا پر قبضہ جما لیا لیکن وہ بھی ہنگری کی عظیم تر سلطنت قائم کرنے میں ناکام رہا۔

ہیبس برگ خاندان کے ایک اور رکن میکسی ملین اوّل نے پر پرزے سنبھالے اور فریڈرک سوم کے اس قول کا نعرہ لگا کر کہ آسٹریا ایرٹ ان اوربِ الیتما، (آسٹریا ہمیشہ قائم رہے گا) کچھ اقتدار حاصل کر لیا۔ اس نے ہنگری کے فرمانرواؤں سے کھلم کھلا لڑائی مول نہیں لی، بلکہ معاہدوں اور شادیوں کے ذریعے اپنا اقتدار جما لیا۔ خود میکسی ملین نے ۱۴۷۷ء میں برگنڈی کے آخری نواب چارلس بہادر کی بیٹی ماریا سے ناتہ جوڑ لیا۔ اس وقت برگنڈی کا علاقہ اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے بہت مشہور تھا۔

میکسی ملین کے بیٹے فلپ (خوبصورت) نے ہسپانوی شہزادی جوآن سے شادی کی اور اس طرح اسپین میں اس خاندان کا اثر ورسوخ بڑھ گیا۔ چنانچہ جب چارلس پنجم نے آسٹریا میں عنانِ حکومت سنبھالی اور ۱۵۱۹ء سے ۱۵۵۶ء تک قابض رہا تو عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اس کی سلطنت میں سورج کبھی نہیں چھپتا (بہت بعد میں اسی جملے کو برطانیہ نے اپنے لیے طرۂ امتیاز بنا لیا) آسٹریا کے فرمانروا کے لیے یہ بات کسی قدر صحیح بھی تھی۔ یورپ میں ہیبس برگ خاندان کے مقبوضات کے علاوہ سمندر پار امریکی سرزمین پر بھی اس نے کچھ علاقے حاصل کر لیے تھے۔

ہنگری کا ایک بادشاہ لڈوگ دوم ۱۵۲۶ء کی ایک لڑائی میں کام آ چکا تھا اور اس طرح بوہیمیا اور ہنگری بھی آسٹریا کے زیرنگیں ہو گئے تھے اور یہ الحاق عرصہ دراز تک قائم رہا۔ آسٹریا والے خوش ہو کر کہتے تھے "دوسروں کو جنگ کرنے دو، آسٹریا خوشیاں مناتا رہے گا۔"

لیکن یہ قول ایک لحاظ سے صحیح نہیں تھا۔ آسٹریا کو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے کئی بار لڑنا پڑا۔ ۱۵۲۹ء میں اور پھر ۱۶۸۳ء میں ترکوں نے بڑی فوج کے ساتھ آسٹریا پر حملے کیے۔ اگر وہ اپنے محاسبات میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے تو مورخین کا کہنا ہے کہ آج نہ صرف آسٹریا بلکہ تمام یورپ کا نقشہ بدلا ہوا نظر آتا۔ یورپ سے عیسائیت اور نصرانی ثقافت کا نام ونشان تک مٹ جاتا۔ ۱۲ ستمبر ۱۶۸۳ء کو ترکی کی فوجیں ناکام ہو کر واپس چلی گئیں۔

ترکوں سے اس مقابلے کے بعد آسٹریا کی دھاک بندھ گئی اور اس نے زیادہ دم خم دکھانا شروع کر دیا، بلکہ اس کے مشہور جنرل اور سیاست داں شہزادہ یوجینو نے ترکی پر حملے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر آسٹریا اور فرانس کے درمیان چل گئی۔ فرانس کا اندیشہ تھا کہ اگر ترکی نے دوبارہ زیادہ مستحکم

کے ساتھ لڑائی کا رخ بدلا تو خود فرانس کی بھی خیر نہیں رہے گی۔ ادھر اسپین میں ہیبس برگ خاندان کے فرمانروا کمزور ہو گئے تھے۔ فرانس نے اپنا وار کیا اور حصولِ اقتدار کے لیے لڑائی شروع کر دی، جو چودہ سال تک جاری رہی۔ فرانس کو انجام کار شکست ہو گئی اور آسٹریا کی فوجوں نے بلغراد فتح کر لیا جو ان دنوں فرانس کا مقبوضہ علاقہ تھا۔

آسٹریا کے قانون کے مطابق وراثت صرف اولادِ نرینہ کے لیے مخصوص تھی۔ چناں چہ ایک وقت آیا جبکہ شہنشاہ چارلس ششم نے، جس کی صرف دو بیٹیاں تھیں، پہلے سے یہ محسوس کر کے کہ شاہی خاندان کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے، ۱۷۱۳ء میں قانون میں تبدیلی کرانی چاہی اور اس میں اسے کامیابی بھی ہو گئی۔ چنانچہ چارلس ششم کی بیٹی ماریا تھریسا کو جب بادشاہ ۱۷۴۰ء میں فوت ہوا تو وارثِ تخت تسلیم کر لیا گیا۔ تاہم پڑوسی ملکوں نے کوشش کی کہ جواں سال شہزادی کے غیر مستحکم اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ علاقے ہتھیا لیے جائیں۔ پروشیا کا فرمانروا شاہ فریڈرک دوم سلیشیا میں داخل ہو گیا۔ بویریا کے چارلس البرٹ نے لنز اور پراگ پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے اپنے مطالبات پیش کیے، نیز بلجیم، اسپین اور سیکسونیا مشترکہ طور پر ماریا تھریسا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ حصولِ اقتدار کی یہ جنگ پچیس سال تک جاری رہی، لیکن شہزادی نے اس دوران میں اپنی حکومت کو اس قدر مضبوط کر لیا کہ دشمنوں کی ہمت پست ہو گئی۔

ماریا تھریسا کا بیٹا شہزادہ جوزف دوم ایک مصلحِ قوم کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے انسدادِ غلامی کے لیے قدم اٹھایا اور اسے اپنے ملک میں غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے آسٹریا کے بسنے والے مختلف عقائد کے لوگوں کو مساوی حقوق دلوائے اور ان میں سے بعض پر جو پابندیاں عائد تھیں، رفتہ رفتہ دور کرا دیں۔ اس نے نظامِ حکومت میں بھی چند تبدیلیوں کی کوشش کی اور چوں کہ اس ضمن میں کسی قدر عجلت سے کام لیا گیا تھا، اس لیے متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے انتقال کے بعد تو بہت سے منصوبے دھرے رہ گئے۔

اسی زمانے میں آسٹریا کی قومی موسیقی اپنے عروج پر پہنچی اور ملک نے گلک، ہیڈن، موزارٹ اور بیتھوون جیسی باکمال ہستیاں پیدا کیں۔

اور جب ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس کے بعد نپولین نے ہمسایہ علاقوں پر چھا جانے کی کوشش کی تو آسٹریا ان ملکوں میں شامل تھا جنھوں نے کورسیکا کے رہنے والے فاتحِ اعظم کی مخالفت کی اور خصوصاً ٹائرول کے دیہاتی فوج میں بھرتی ہو کر مقابلے کے لیے ڈٹ گئے۔ انھوں نے فرانسیسی

فوجوں کا مقابلہ خوب کیا۔

ان محاربات سے قطع نظر اس وقت کی یورپی سیاست پر آسٹریا کا چانسلر پرنس میٹرنک بُری طرح چھایا ہوا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ نپولین سے شہزادی میری لوئی کی شادی کر دی جائے۔ اس حکمتِ عملی کے سامنے بادشاہ فرانسس اوّل کو بھی سر جھکا دینا پڑا۔ میٹرنک کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ اس کا ملک فرانسیسی حملوں سے محفوظ رہے، بلکہ نپولین اگر اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو جائے تو مالِ غنیمت کا کچھ حصّہ آسٹریا کو بھی مل جائے۔ چنانچہ نو سال کی کشمکش کے بعد عالمگیر قیامِ امن کی خاطر ویانا میں ایک بین الاقوامی اجتماع ہوا جس میں یورپ کے سب ملک شریک ہوئے اور منجملہ دیگر فیصلوں کے یہ بھی طے پایا کہ آسٹریا کو اس کا تمام چھینا ہوا علاقہ واپس کر دیا جائے۔

میٹرنک ہی کی کوششوں سے ۱۵-۱۸۱۴ء میں آسٹریا کا یورپ کے دوسرے ملکوں سے سی سالہ قیامِ امن کے لیے معاہدہ ہوا جسے آسٹریا کی کانگریس نے فوراً منظور کر لیا۔ اس کے علاوہ مذہب کے نام پر عیسائیت کو برقرار رکھنے کی خاطر آسٹریا کی تجویز پر سب یورپی ملکوں میں ایک اور مُعاہدہ ہوا جس میں برطانیہ بھی شامل ہو گیا۔ ان معاہدے کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہر ملک پولیس کے سخت نظام کے ذریعے جمہوریت پسندی کی تحریکات پر حتی الامکان قابو پا لے اور کسی کو سر اٹھانے کا موقع نہ دے تاکہ شہنشاہیت کسی طرح ختم نہ ہونے پائے۔ اس مقصد میں دائمی کامیابی ممکن نہ ہو سکی، بہت سے ملکوں میں انقلابات رونما ہوئے۔ آسٹریا میں بھی صورتِ حالات ایسی بدلی کہ خود میٹرنک کا بیڑا غرق ہو گیا۔

۱۸۴۸ء میں اس کی تباہی کے ساتھ ساتھ شہنشاہ فرڈیننڈ کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور اس کا جواں سال بھتیجا فرانسس جوزف اوّل جس کی عمر صرف ۱۸ سال تھی، عوام کی مرضی کے مطابق تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اگرچہ اس نے ۶۸ سال حکومت کی لیکن وہ حکومت برائے نام تھی۔ اسے دستوری اور قومی مطالبات کے سامنے ہمیشہ سر جھکانا پڑا۔

۱۸۶۶ء میں وفاقِ جرمنی سے آسٹریا کی علیحدگی ہو گئی اور اٹلی کا شمالی حصّہ اس کے قبضے سے نکل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بسمارک نہ صرف جرمنی کے افق سیاست پر بلکہ یورپ پر چھا جانے کی کوشش میں تھا اور چونکہ وہ عوام کے رجحانات کو اچھی طرح سمجھتا تھا، اس لیے اسے غیر معمولی کامیابی ہوتی رہی۔ یہ ناممکن تھا کہ آسٹریا کے باشندے اس کے اثرات سے مرعوب نہ ہوتے۔ جرمنی نے اس ملک میں اپنے قدم جمانے شروع کیے، جس سے آسٹریا کی ثقافتی زندگی پر نیا رنگ چڑھنے لگا، جو

اتنا پختہ ثابت ہوا کہ آج بھی سارے ملک میں وہ اثرات پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ ملک کی قومی زبان جرمنی ہی۔ قدیم زبان کہیں کہیں معمولی بول چال کے لیے رہ گئی ہو۔

موجودہ صدی شروع ہوئی تو یورپ کے بیشتر ملکوں میں اضطراب و بے چینی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اندرونی اور بیرونی اعتبار سے ہنگامے برپا ہو رہے تھے۔ سب سے بڑا روس کا انقلاب تھا جس نے صدیوں پرانی شہنشاہیت کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا۔ اسی قسم کی تحریکات تھیں جنھوں نے ابھرتے ابھرتے آسٹریا میں بھی عام بغاوت کی صورت اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو باغیوں نے اور خاص طور پر سربیا کے جاسوسوں نے شہنشاہ فرڈیننڈ اور اس کی ملکہ کو قتل کرادیا۔ یہ حادثہ بہت ہی نازک تھا۔ کہا جاتا ہو کہ ۱۹۱۴ء میں شروع ہونے والی عالمگیر لڑائی میں اس ملک کی شمولیت اسی بنا پر ہوئی کیونکہ اس قسم کی تحریکات کے باوجود برسر اقتدار طبقہ پھر بھی شہنشاہیت پسند تھا۔

۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم ختم ہوئی تو وہ شہنشاہیت جو آسٹریا اور ہنگری پر بیک وقت اپنا سکہ جمائے ہوئے تھی، ختم کردی گئی۔ چنانچہ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جبکہ تمام یورپ اور دنیا کے بعض دوسرے حصوں میں بھی امن و صلح کے شادیانے بج رہے تھے، آسٹریا کا آخری شہنشاہ چارلس اول تاج و تخت سے مجبوراً دست بردار ہو رہا تھا۔ اس کی علیحدگی کے دوسرے ہی دن عبوری دور کے لیے ایک عارضی قومی اسمبلی برائے نام قائم کردی گئی۔ حالانکہ خدائی فوجدار بن کر عنانِ حکومت تو چار اتحادی ملکوں نے سنبھال لی اور وہ لوٹ کھسوٹ شروع کی کہ اقتصادی اعتبار سے اس ملک کا بیڑا غرق ہو کر رہ گیا۔ اقتصادی بدحالی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ملک کے قدرتی ذرائع کا بیشتر حصہ دوسروں کے قبضے میں چلا گیا تھا اور تجارتی منڈیوں پر بھی غیروں کا تسلط تھا۔ چونکہ ہنگری، یوگوسلاویہ اور چیکوسلواکیہ سے تعلقات میں سخت کشیدگی تھی اور ان سرحدوں پر شدید احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں، اس لیے ملک میں اشیائے خوراک کی کمی، نایابی کی حد تک پہنچ گئی اور سینکڑوں انسان بھوکے مرنے لگے۔ آسٹریا کے کارخانوں کی صنعتی پیداوار بھی سرحدوں کے پار نہیں جاسکتی تھی، اس لیے تبادلے کا سوال ہی باقی نہیں رہا تھا۔

تین چار سال کی مسلسل پریشانیوں کے بعد حکومتِ آسٹریا مجلسِ اقوام سے کچھ امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی کیوں کہ بڑی طاقتوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں اگر نئے سرے سے ہنگامے شروع ہوگئے تو دامن سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ دنیا بھر کے سیاسی حالات بگڑ جائیں گے۔ اگرچہ بڑی طاقتوں کے مابین بھی کوئی یک جہتی نہیں تھی، لیکن اس اعتبار سے وہ

متفق الخیال تھیں۔ انھوں نے اور چیکوسلوواکیہ نے جو آسٹریا کا پڑوسی ملک ہے، اسے اقتصادی امداد دینی شروع کردی۔ تاہم یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس اقتصادی امداد کے پردے میں ملک اور کس کس لحاظ سے تباہ کیا جانے لگا تھا۔

۱۹۲۴ء میں تو ذخیرہ زر کو روکنے کی خاطر پرانے سکّوں کا رواج ختم کر کے شلنگ کو زرِ مبادلہ بنایا گیا جو آج تک رائج ہے لیکن دھات کے ٹکڑوں پر نیا ٹھپہ لگنے سے اقتصادی حالت صحیح معنوں میں پنپ نہیں سکتی اور نہ بیرونی امداد سے بحیثیتِ مجموعی ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا ملک کے ہر حصے میں ہنگامے اور بلوے رونما ہوتے رہے حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں ایک قسم کی تادیبی حکومت قائم کی گئی جس کا اصول یہ تھا کہ ہر اس شخص یا جماعت کو جو ذرا بھی "فتنہ پرداز" یا "شر انگیز" نظر آئے، موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

ایسی انتہا پسندانہ طرزِ حکومت کا نتیجہ ہمیشہ مذموم رہتا ہے چنانچہ ملک کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ آخر ۵ جولائی ۱۹۳۲ء کو مجلسِ اقوام نے جو اتحادیوں کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ادارہ بنا ہوا تھا، آسٹریا کو ۳۰ کروڑ شلنگ قرض دینے منظور کیے، لیکن یہ شرط لگائی کہ وہ سیاسی یا اقتصادی اعتبار سے جرمنی کے ساتھ کوئی تعلق ۱۹۵۲ء سے قبل نہ کرے۔ باشندگانِ ملک نے حکومت کے اس سمجھوتے پر سخت احتجاج کیا لیکن معاہدے پر مہر توثیق ثبت ہو گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ عوام کا رجحان جرمنی کی طرف بڑھتا گیا اور حکومت کے لیے نئی پریشانیاں پیدا ہو گئیں۔

۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو جرمنی میں ایڈولف ہٹلر نے، جو یوں بھی ملک کا ناخدا بنا ہوا تھا، چانسلر کے عہدے کا حلف اٹھایا اور ایک دم سختی برتنی شروع کردی۔ یہ نازی انقلاب نہ صرف جرمنی بلکہ سارے یورپ کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ اس کے جاسوس دوسرے ملکوں میں پہنچ کر سازشیں کرنے لگے۔ انھی سازشوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۴ء میں آسٹریا کے حالات زیادہ بگڑ گئے۔ خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر چند اتحادی یہی کہتے رہے کہ ملک کو مکمل آزادی دے دی جائے گی لیکن یہ بلند آہنگ اعلانات بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد نہ کر سکے۔ اٹلی نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے چند فوجی دستے آسٹریا کی سرحد پر بھیج دیے۔ اب معاملہ زیادہ سنگین ہو گیا۔ چنانچہ ایک نازی ہنگامے کے دوران میں دفعتاً آسٹریا کے چانسلر ڈاکٹر ڈولفس کو قتل کرا دیا گیا۔

۲۵ جولائی ۱۹۳۴ء کو نازی فوجیں کھلم کھلا آسٹریا کے صدر مقام ویانا میں گھس گئیں۔ انھوں نے ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر کے عملے سے زبردستی اپنی موافقت میں بیان نشر کرانے شروع کر دیے۔ یہ اعلان بھی کرا دیا کہ ڈاکٹر ڈولفس نے اپنے عہدے سے استعفےٰ دے دیا ہے اور وہ سیاست سے بالکل

کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ جب اس قسم کے اعلانات سے نہ صرف مایوسی اور خوف کی فضا پیدا ہوئی اور برہمی کا مظاہرہ نہ کیا گیا تو اہلِ جرمنی کے حوصلے بڑھ گئے۔ انھوں نے ملک میں ایک نئی کٹھ پُتلی حکومت قائم کر کے اپنا اقتدار نئے سرے سے جمانا شروع کر دیا۔ ملک میں جس نے ذرا بھی سرتابی کی کوشش کی اسے شطرنج کے پٹے ہوئے مہرے کی طرح بساطِ سیاست سے ہٹا دیا۔ اس زمرے میں بعض اراکینِ کابینہ تک آ گئے۔ لیکن ایک بات تھی، اقتصادی اعتبار سے لوگ مطمئن تھے، بلکہ عوام میں بظاہر خوشحالی بڑھنے لگی تھی۔ قدرتی بات ہے کہ بھوکے کو پیٹ بھرنے کے لیے دو روٹیاں اور ننگے کو تن ڈھانکنے کے لیے چند گز کپڑا درکار ہوتا ہے۔

یہ بھی جرمن حکام ہی کی سازش تھی کہ آسٹریا میں آئے دن وزارتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ اس طرح ملک کے نظم و نسق کو زبردست نقصان پہنچا اور بیشتر آبادی یہ آرزو کرنے لگی کہ جرمنی سے ملک کا الحاق کر دیا جائے تاکہ اقتصادی حالت سدھاری جا سکے۔ اس مقصد کے لیے ۱۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو استصوابِ رائے ہوا تو ۹۹۔۷۵ فی صد باشندوں نے الحاق کے حق میں ووٹ دیے اور صرف ۲۵۔ فی صد نے مخالفت کی۔ اس طرح آسٹریا باقاعدہ جرمنی کے زیرِ اقتدار ہو گیا۔ جمہوریت کے دور میں یہ عجیب و غریب سانحہ تھا کہ لوگوں نے آزادانہ رائے دے کر خود ہی اپنی آزادی کا گلا گھونٹ دیا۔ تاریخ میں ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ سب کچھ اقتصادی ابتری کے باعث ظہور میں آیا۔ پھر دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی اور یورپ کے ہر ملک کی تاریخ میں ایک نیا باب مرتب ہونے لگا۔

جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو نقشے پر آسٹریا کا علیحدہ کوئی وجود نہیں تھا۔ تقریباً ساڑھے چھے سال کی ہولناک اور خونریز لڑائی میں جرمنی نے جس جس نئے علاقے پر حملہ کیا، آسٹریا کے مجبور و بےکس سپاہی اس کے ساتھ صفِ اول میں لڑتے اور تختۂ مشق بنتے رہے اور جب بساطِ سیاست پر پانسہ پلٹا اور خود جرمنی ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح اٹھا کر پھینک دیا گیا تو آسٹریا والوں کا پُرسانِ حال کون تھا۔

جرمنی کا اقتدار مٹنے، وہاں لوٹ مار اور قتل و غارت ہونے اور اس کے حصے بخرے کیے جانے کے ساتھ یہ ملک بھی چار بڑی طاقتوں کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ قومی پرچم کے بجائے اس پر روس، امریکا، برطانیہ اور فرانس کے جھنڈے لہرانے لگے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ یہ تصور ہی کتنا روح فرسا ہے۔ مہینے کی آخری تاریخ کو رات کے وقت سوئے تو امریکی حکام برسرِ اقتدار تھے، صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ شہر پر روسیوں کا تسلط ہے۔ اگلے مہینے میں برطانیہ کے ہاتھ میں عنانِ حکومت ہو گی اور پھر فرانسیسی نظم و

نسق سنبھالنے کے لیے آئیں گے۔

تاریخ کا یہ واقعہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ جرمنی کے اس طرح چار ٹکڑے کیے گئے تھے جیسے کسی کی سالگرہ پر کیک کاٹنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ لہٰذا ملک کا صدر مقام مشرقی علاقے میں رہا، جس پر سوویت کا تسلط ہوا۔ اس کے برعکس آسٹریا کے چار حصے کرنے کے علاوہ طے پایا کہ اس کا صدر مقام ویانا غیر منقسم رہے اور چاروں طاقتیں باری باری ہر مہینے اس پر حکومت کریں۔ بالکل اسی طرح جیسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں صدارت کے فرائض اس کے تیرہ ممبروں میں سے کسی ایک کو اس کی باری کے اعتبار سے تفویض کیے جاتے ہیں۔ ویانا کے باشندوں کے جذبات و احساسات کا صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے جن کا حکمراں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بدلتا ہو۔

تقریباً دس سال کی طویل مدت میں اس کی کیفیت ست خصمی عورت کی حالت سے بھی زیادہ مذموم ہو گئی۔ جرمنی کی شکست کے بعد نام نہاد اتحادی امن کی پرتیچ فاختہ اپنے ہاتھوں میں لیے اس ملک میں داخل ہوئے تھے۔ مارچ ۱۹۴۵ء کے آخر میں روسی دستے آسٹریا میں گھس گئے۔ اس وقت ملک کے صدر مقام ویانا کا بہت بڑا حصہ آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ جرمن بمباروں نے دریائے ڈینیوب پر بنے ہوئے بہت سے پل اڑا دیے تھے۔ سڑکیں اور ریلوں کی پٹریاں برباد ہو چکی تھیں۔ آمد و رفت کا سلسلہ تقریباً منقطع تھا۔ اس لیے قحط کا دور شروع ہو گیا۔ امریکی دستے مغربی سمت سے اور برطانوی دستے جنوبی سمت سے ملک میں داخل ہوئے۔ وہاں حالات نسبتاً کسی قدر پُرسکون تھے۔

۲۷ اپریل ۱۹۴۵ء کو چار بڑی طاقتوں کے سربراہوں نے ڈاکٹر کارل رینر سے جو جمہوریت جرمنی کے سابق چانسلر تھے، درخواست کی کہ انتخابات ہونے تک آپ عبوری کابینہ بنائیں۔ ملک کے مفاد کو مدّ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے یہ درخواست قبول کر لی اور عوام سے استدعا کی کہ وہ قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ ختم کر کے حکومت کا ساتھ دیں تاکہ حالات خوش گوار بنانے میں آسانی ہو۔

۵؍ نومبر ۱۹۴۵ء کو چاروں بڑی طاقتوں کے زیر سایہ ملک میں عام انتخابات ہوئے اور ڈاکٹر کارل رینر ہی کو ملک کی پہلی پارلیمان کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس نام نہاد قومی حکومت کے اختیارات کی نوعیت کیا تھی، اس کا اندازہ صرف اس طرح ہوتا ہے کہ اتحادیوں کی کونسل کو پارلیمان کے ہر فیصلے پر حقِ تنسیخ حاصل تھا۔ گویا وہ قومی حکومت کی ہر تجویز کو، اگر وہ ان کے مفاد کے خلاف ہو، رَد کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر کارل رینر نے عوامی جماعت کے سربراہ کو پہلا چانسلر نامزد کیا۔ انھوں نے سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنائی جسے چاروں طاقتوں نے منظور کر لیا لیکن یہ فیصلہ ماننے پر اختلاف رائے ہو گیا کہ ملک میں ۱۹۲۰ء کا منظور شدہ دستور العمل دوبارہ رائج کیا جائے۔ اس اختلاف کو بنیاد بنا کر چاروں طاقتوں نے طے کیا کہ ملک چار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور صرف شہر ویانا کو بین الاقوامی حیثیت دی جائے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ان کا یہ فیصلہ تھا کہ حکومت آسٹریا چاروں طاقتوں کو اخراجاتِ تسلط ادا کرے اور وہ اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ اقتصادی اعتبار سے بدحال، ایک ملک کے لیے ان کا بار اٹھانا دشوار تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے تو ادائیگی ہوئی، لیکن جب صورتِ حالات نے اسے ناممکن بنا دیا تو چاروں طاقتوں نے یکے بعد دیگرے یہ اخراجات معاف کر دیے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا کہ آسٹریا میں جرمن تاجروں اور صنعت کاروں کا جو اثاثہ رہ گیا ہے، وہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تیل کے تقریباً تمام کارخانے، تین سو سے زیادہ دوسرے صنعتی کارخانے اور ڈھائی لاکھ ایکڑ کے قریب مزروعہ زمین باشندگانِ ملک کے قبضے سے نکل گئی۔ نیز سب سے بڑی جہاز راں کمپنی پر بھی ان کا تسلط ختم ہو گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تمام خام مال، جو ملک میں پیدا ہوتا یا درآمد کیا جاتا، چاروں طاقتیں ہتھیا لیتیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ سرکاری اور قومی کارخانے رفتہ رفتہ بند ہوتے چلے گئے اور ملک کی اقتصادی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ملک کے اشتراکیت پسندوں نے سر اٹھایا اور بڑے پیمانے پر بغاوت شروع کر دی۔ انھیں روسی علاقے میں زیادہ کامیابی ہوئی لیکن باقی علاقوں میں ان کا سر کچل دیا گیا۔ تاہم ملک بھر میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی جس نے مزید پریشانیاں پیدا کر دیں۔ اسی سال کے آخر میں صدر ڈاکٹر رینر کی اسی ویں سال گرہ منائی گئی لیکن عمر نے زیادہ ساتھ نہ دیا اور وہ ۳۱ دسمبر کو فوت ہو گئے۔ یہ ملک کے استحکام کو ایک اور دھکا تھا۔ عام انتخابات کے ذریعے دوسرے صدر کی حیثیت سے سوشلسٹ پارٹی کے ایک زبردست رکن جنرل تھیوڈور کورنر کو پسند کیا گیا۔ عوامی جماعت کے صدر جولیس راب نے چانسلر کی حیثیت سے دوسری وزارت بنائی۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق باشندگانِ ملک نے تنگ آ کر ہنگامے شروع کیے اور غیر ملکی اقتدار کا جُوا اپنے کندھوں سے اتار کر پھینک دینا چاہا۔ چنانچہ چاروں ملکوں کے وزرائے خارجہ کے تقریباً تین سو اجلاس لندن، ماسکو، نیویارک اور پیرس میں منعقد ہوئے۔ روس نے کئی معاملات کو بنیاد

بنا کر، جن کا براہِ راست آسٹریا سے کوئی تعلق نہیں تھا، اَڑنگے لگانے چاہے لیکن تنہا اس کی رائے چل نہ سکی اور مجبوراً اسے بھی سر جھکا لینا پڑا۔

۱۵ مئی ۱۹۵۰ء کو اتوار کے دن روس، برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ نے ایک فریق کی حیثیت سے اور آسٹریا کے اس وقت کے برائے نام وزیر خارجہ نے فریق ثانی کی حیثیت سے معاہدے پر دستخط کیے اور کوہ ایلپس کے زیر سایہ گنگناتے چشموں اور دریاؤں کی وادیوں میں پھیلے ہوئے اس ملک کو سترہ سال بعد ایک بار پھر آزاد جمہوریت کی فضا میں سانس لینے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ جب ہم دونوں بھائی وہاں پہنچے تو اس کی آزادی کو ایک سال سے کچھ زیادہ مدت گزری تھی لیکن غیر ملکی تسلط واقتدار کا کوئی نقش نظر نہ آتا تھا۔ گویا اہلِ ملک تیزی کے ساتھ اپنا چولا بدل کر اپنے روپ میں نظر آنے لگے تھے۔

معاہدۂ تسلط کی تنسیخ کے بعد ۲۷ جولائی کو اس کا نفاذ شروع ہوا اور ۲۵ اکتوبر تک تمام غیر ملکی سپاہی اس سرزمین کو خالی کر کے چلے گئے تھے۔ دوسرے دن آسٹریا کی پارلیمان نے خارجہ پالیسی بیان کرتے ہوئے اپنی یکسر غیر جانب داری کا اعلان کر دیا۔ ۱۵ دسمبر کو جنرل اسمبلی کے ایک متفقہ فیصلے کے بموجب اس ملک کو اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا۔

۱۳ مئی ۱۹۵۶ء کو ملک میں نئے انتخابات ہوئے اور وہی سابقہ جماعتیں برسر اقتدار آ گئیں۔ البتہ بعض اراکین تبدیل ہو گئے۔ جون میں نئی کابینہ کا پہلا اجلاس ہوا اور ملک کے استحکام کے لیے بہت سے نئے قانون منظور کیے گئے۔

جغرافیائی حالات: آسٹریا وسطی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن اسے مختصر ترین نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا رقبہ ۳۲ ہزار ۳ سو ۷۶ مربع میل اور آبادی ۶۹ لاکھ ۳۳ ہزار ۹ سو پانچ ہے اور اس لحاظ سے یورپ کے چھتیس ۳۶ ملکوں میں اس کا درجہ انیسواں ۱۹ ہے۔ بلجیم اور نیدرلینڈز بھی اس کے بعد شامل فہرست ہوتے ہیں۔ یہ ملک ۴۶ اور ۴۹ درجہ عرض بلد کے درمیان اور ۹ اور ۱۷ درجہ طولِ بلد کے درمیان واقع ہے۔ اس وجہ سے یورپ کے خاص صحت بخش مقامات میں شمار ہوتا ہے۔

یہ ملک ہر طرف سے ساحل سمندر سے دُور ہے۔ گویا دانتوں کے بیچ میں رکھی ہوئی زبان کی طرح چاروں اطراف سے گھرا ہوا ہے۔ اس کی سرحدوں کا مجموعی طول ایک ہزار ۶ سو ۳۸ میل ہے۔ اس کے پڑوسی ملک یہ ہیں: شمال میں جرمنی اور چیکوسلوواکیہ، جنوب میں اٹلی اور یوگوسلاویہ، مشرق میں ہنگری اور مغرب میں سوئٹزرلینڈ اور لیخ ٹن اسٹین۔ اوپر پیش کیے ہوئے تاریخی جائزے سے یہ

اندازہ لگانا آسان ہو گیا ہے کہ ان میں سے بیشتر ملکوں نے بلکہ ان سے بھی پرے کے ملکوں نے اس کو ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اکثر اسے اپنی جولانگاہ بنایا ہے۔

اس کے بہت سے شہر خصوصاً ویانا جو یورپ کا سمرقند کہلاتا ہے، شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً آنے جانے والے تجارتی قافلوں کے لیے ہمیشہ مستقر رہے ہیں اور اب بھی مواصلات کے نئے طریقے رائج ہو جانے کے بعد کم سے کم ویانا کو وہی قدیم اہمیت حاصل ہے۔ وسطی یورپ میں شمال سے جنوب کو اور مشرق سے مغرب کو ملانے والی اور سب سے اہم شاہراہیں اس ملک سے ہو کر گزرتی ہیں۔ دنیا کی بہت سی مشہور ہوائی کمپنیوں کے جہاز اس جگہ دم لے کر آگے بڑھتے ہیں۔

اس ملک کی دو تہائی سطح یورپ کے مشہور پہاڑ ایلپس نے گھیر رکھی ہے جس کی سب سے اونچی چوٹی گروس گلوکنر ——— ۱۲ ہزار ۴ سو ۵۷ فیٹ بلند لیکن قابلِ عبور ہے۔ کوہ ہمالیہ کی طرح نہیں ہے جو برصغیر پاک و ہند کی شمالی سرحد پر ان ملکوں کا نگہبان اور حملہ آوروں کے لیے ایک قدرتی رکاوٹ ہے۔

پہاڑیوں کے بیچ بیچ میں پُرفضا وادیاں، چشمے، جھیلیں اور تیزی سے بہتے ہوئے دریاؤں کے دھارے جن کے آبشاریں بھی عجیب سماں پیش کرتے ہوں گے، یقیناً سیاحوں کے لیے بے حد جاذبِ نظر ہوں گے۔ شمالی سمت میں سب سے بڑا دریا ڈینیوب ہے جس کا دو سو سترہ میل لمبا حصہ اس ملک میں رواں رہتا ہے۔ باقی دوسرے ملکوں کی سرزمین پر واقع ہے۔ مشرق اور مغرب میں دو بڑی جھیلیں تقریباً ایک ہی جغرافیائی عرض بلد میں واقع ہیں۔ مشرق کے ہموار علاقے میں جھیل نیوسیڈلر ہے، جس کا رقبہ ایک سو چوبیس مربع میل ہے۔ مغرب کی جھیل بوڈنسی کا رقبہ تو اگرچہ دو سو اڑتالیس مربع میل ہے لیکن صرف ۲۳۰۹ مربع میل حصہ آسٹریا کی حدود میں ہے۔ ان کے علاوہ ۸۸ اور بے شمار چھوٹی چھوٹی جھیلیں ہیں۔

پہاڑوں کا بہت بڑا حصہ ہمیشہ برف پوش ہے جو برفانی کھیلوں کے اعتبار سے نوجوانوں کے لیے ایک نعمت ہے۔ مسلسل پگھلی ہوئی برف کے باعث بہت سے دریا مثلاً اینز، ڈراؤ، ان اور مُور مختلف چوٹیوں سے نکلتے اور زرعی علاقوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ان کی تیز روانی بے قیاس برقی قوت پیدا کرنے کے کام آتی ہے، جس کے باعث اس ملک کو یورپ میں خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ دوسرے ملکوں کو بھی بجلی فراہم کرتا ہے۔ مختلف مقامات پر بند لگا کر لاکھوں کلوواٹ بجلی روزانہ پیدا کی جاتی ہے۔

اسی ملک میں یورپ کی سب سے پہلی کوہستانی ریلوے لائن ۱۸۵۰ء میں تعمیر کی گئی جو درہ سیمرنگ سے ہو کر زیرین آسٹریا اور اسٹائریا کو ملاتی ہے۔ اس کے بعد آرلبرگ لائن ڈالی گئی جو مشرقی اور مغربی حصے کے درمیان مواصلات کا ذریعہ ہے۔ بہت سی بین الممالک ریلوے لائنیں بھی اس ملک کے میدانوں

پہاڑی علاقوں اور دروں سے گزرتی ہیں۔ تاروں پر چلنے والی ریلوں، کرسیوں اور لفٹ کو بھی اس ملک کے عمدہ مواصلاتی ذرائع میں شمار کیا جا سکتا ہے جو سیاحوں کی سیر و تفریح کے لیے بھی بہت مفید ہیں۔ خصوصاً اسکی اِنگ کے شوقین ہر سال لاکھوں کی تعداد میں اس ملک کا دورہ کرتے ہیں۔

یہاں کے صرف قدرتی مناظر ہی سیاحوں کے لیے موجب کشش نہیں ہیں بلکہ بہت سی مشہور صحت گاہیں بھی واقع ہیں جو دور دراز علاقوں سے لوگوں کو حصولِ تن درستی کے لیے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ خاص طور پر صوبہ سالسبرگ میں بدگاستین اور بدہوف گاستین بہت مقبول ہیں، کیوں کہ ان کے قریب ریڈیائی اثرات رکھنے والے گرم چشمے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ویانا کے قریب بیڈن کے مقام پر گندھک کے چشمے جلدی امراض والے لوگوں کے لیے نعمت ہیں۔

مردم شماری: ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق آسٹریا کی آبادی ۶۹ لاکھ ۳۲ ہزار ۹ سو پانچ کہی جا سکتی ہے۔ ان میں سے تقریباً ۱۵ لاکھ کھیتوں اور جنگلات میں اور ۲۹ لاکھ صنعت و حرفت کے کارخانوں اور تجارتی اداروں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۹۰ ہزار ۴ سو ۹۱ غیر ملکی بالا وطن ہیں جنھوں نے وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے۔

دین و مذہب کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو ملک کی اس آبادی میں سے ۶۱ لاکھ، ۷ ہزار ۸۴۴ ۸۹ فی صدی، رومن کیتھولک، ۴ لاکھ ۲۹ ہزار ۴ سو ۹۳ (۶.۲ فی صدی) پروٹسٹنٹ، اعشاریہ پانچ فی صدی یونانی کیتھولک، اعشاریہ پانچ فی صدی دوسرے مسالک کے ماننے والے اور ۸.۳ فی صدی لامذہب ہیں۔

ہنگری کے انقلاب سے قبل اس ملک میں ۵ لاکھ تارکانِ وطن عارضی طور پر آباد تھے جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد برابر کے ملکوں سے آکر یہاں ڈیرے ڈال بیٹھے تھے۔ اب ایسے خانماں برباد لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔

آسٹریا کے نو صوبے

اس وقت وفاقی جمہوریت آسٹریا نو صوبوں میں منقسم ہے: برگن لینڈ، کارنتھیا، زیریں آسٹریا، بالائی آسٹریا، سالسبرگ، اسٹائریا، ٹائرول، ووراربرگ اور ویانا۔ آخر الذکر صوبہ کراچی کی طرح دراصل ایک عظیم الشان شہر کی صورت میں ہے جو سارے ملک کا صدر مقام بھی ہے۔ خود باشندگانِ ملک اس کو "وین" کہتے ہیں، لیکن انگریزوں اور دوسری مغربی اقوام نے، جو عموماً دوسرے ناموں

کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی، سہولت اور مصلحت کے مطابق بدل دینے کے عادی ہیں، اس نام پر بھی ہاتھ صاف کیا اور یہ ویین سے ویانا کہلانے لگا۔ بلکہ اب تو بعض آسٹریائی بھی مجبوراً اسے اسی نام سے یاد کر لیتے ہیں۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان نو صوبوں کا حال بھی یہاں لکھ دوں:

برگن لینڈ: ملک کے بالکل مشرقی سرے پر زیرین آسٹریا سے ملا ہوا برگن لینڈ سب سے چھوٹا صوبہ ہے، جس کا رقبہ ایک ہزار ۵ سو ۳۰ مربع میل اور آبادی دو لاکھ ۷۶ ہزار ایک سو ۳۶ ہے۔ پہلی عالمگیر لڑائی کے خاتمے تک اس پر ہنگری کا قبضہ رہا۔ ۱۹۱۹ء کے معاہدۂ امن کے مطابق یہ دوبارہ آسٹریا کا جزو بن گیا۔ مشرقی سمت سے عموماً غیر قومیں اس علاقے پر حملہ کیا کرتی تھیں۔ ان کے حملوں کو روکنے کے لیے یہاں مضبوط قلعوں اور فوجی چوکیوں کا انتظام کرنا پڑا۔ اسی اعتبار سے یہ علاقہ برگن لینڈ یعنی قلعوں کی سرزمین کہلانے لگا۔ اس صوبے کے صدر مقام آئزن اسٹاڈ کی آبادی صرف پانچ ہزار ہے لیکن اس کی ایک جھیل نیوسیڈلر قدرتی مناظر کے اعتبار سے سیاحوں کی جنت ہے، جس کے چاروں طرف نرسل کے گھنے جھنڈ سیر و تفریح کے مواقع فراہم کرتے ہیں اور ان جھنڈوں میں رہنے والے مختلف اقسام کے پرندے اور چھوٹے جانور بھی شکاریوں کو دعوت دیتے ہیں۔ پھلوں اور سبز ترکاریوں کی وجہ سے بھی یہ علاقہ مشہور ہے۔ انگور کی کثیر پیداوار کے باعث شراب کشید کرنے کے بہت سے کارخانے بھی قائم ہیں۔ اسی مقام پر آسٹریا کا مشہور گیت نگار جوزف ہیڈن دفن ہے۔ دیہات میں زیادہ تر کرواٹی اور مگیاری قبائل کے افراد آباد ہیں جن کی قومی روایات اور رسم و رواج عام باشندوں سے مختلف ہیں۔ ان کی بول چال میں بھی فرق ہے۔

کارنتھیا: ملک کے بالکل جنوبی سرے پر صوبہ کارنتھیا واقع ہے، جس کی پشت اٹلی سے ملی ہوئی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳ ہزار ۶ سو ۸۰ مربع میل اور آبادی ۴ لاکھ ۷۴ ہزار ۷ سو ۶۴ ہے۔ صوبے کے صدر مقام کلاگن فرٹ میں ۶۳ ہزار افراد بستے ہیں۔ یہ علاقہ بالکل پہاڑی ہے، جس کی زیادہ اونچی چوٹیاں ہر وقت برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ متعدد جھیلیں بھی سامانِ تفریح پیدا کرتی ہیں۔ جنگلات کا کام لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ ہے۔ اس کے علاوہ لوہے، سیسے، زنک اور میگنیز کی کانیں ہیں، جن میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ ایک اور بڑا شہر ولاش جس کی آبادی تیس ہزار ہے، صنعت و حرفت اور تجارت کا مرکز ہے۔ یہاں ہر سال موسم گرما میں ایک صنعتی میلہ لگتا ہے، جسے دیکھنے کے لیے وسطی یورپ کے اکثر لوگ ذوق و شوق سے آتے ہیں۔ اس میلے میں لکڑی کی صنعتوں کا سب سے زیادہ مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

زیرین آسٹریا: دریائے ڈینیوب کے بالکل ساحل ساحل اس صوبے کا جس کا رقبہ ۷ ہزار ۴ سو دو

مربع میل اور آبادی ۱۴ لاکھ ۴ سو ۱۷ ہے، تقریباً نصف حصّہ ہر وقت مختلف کھیتوں، باغوں اور تاکستانوں سے پٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اسے عام طور پر اناج کی کھان کہتے ہیں۔ باقی حصّہ جو زرخیز نہیں ہے، تیل کے کنوؤں کے لیے مشہور ہے۔ ہر سال اس علاقے سے اتنا تیل نکالا جاتا ہے کہ ملکی ضروریات پوری کرنے کے بعد کثیر مقدار برآمد کر دی جاتی ہے۔ کچھ حصّہ پہاڑی ہے لیکن اس کے مناظر زیادہ قابلِ ذکر نہیں کہے جا سکتے۔

بالائی آسٹریا: آب و ہوا کے لحاظ سے کسی قدر سرد مقام ہونے کے باعث بالائی آسٹریا جس کا رقبہ ۴ ہزار ۶ سو ۲۶ مربع میل اور آبادی ۱۱ لاکھ ۸ ہزار ۷ سو ۲۰ ہے، ایک صحت بخش علاقہ سمجھا جاتا ہے، اسی لیے مشہور و معروف "وھائٹ ہاؤس اِن" میں جو سنٹ وولف گانگ نامی ضلع میں واقع ہے، تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ دور دراز علاقوں سے یہاں آ کر لوگ عارضی قیام کرتے اور صحت و تن درستی جیسی نعمت ساتھ لے جاتے ہیں۔ صوبے کا ایک علاقہ اسٹیئر فوجی اسلحہ بنانے کے لیے مشہور ہے۔ خاص طور پر وہاں کی بنی ہوئی بندوقیں ہر جگہ پسند کی جاتی ہیں۔ دریائے ڈینیوب کے کنارے صوبے کا صدر مقام متز جس کی آبادی ایک لاکھ ۸ ہزار ہے، دریائی بندرگاہ ہونے کے علاوہ اپنے صنعتی کارخانوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے جن میں زیادہ تر لوہے اور المونیم کی چیزیں ڈھلتی ہیں۔ مصنوعات میں موٹر کاروں اور ٹریکٹروں سے لے کر عام ضروریات کی چیزیں شامل ہیں۔

سالسبرگ: ٹائرول کے جانب شمال صوبہ سالسبرگ جس کا رقبہ دو ہزار ۷ سو ۶۲ مربع میل اور آبادی ۳ لاکھ ۷۲ ہزار دو سو ۳۲ ہے، اپنی خوش نما عمارتوں، محلوں اور گرجا گھروں کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور اسی لیے اس کو "شمال کا روم" کہتے ہیں، کیونکہ کسی زمانے میں یہ ملک کے حکمرانوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ عمارتی رعنائیوں کے علاوہ قدرتی مناظر بھی اس جگہ کے بے نظیر ہیں۔ دور فاصلے پر برف پوش چوٹیاں سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے پس منظر میں عجیب سماں پیدا کرتی ہیں۔ بل کھاتی ہوئی سڑکیں اور ریلوے لائنیں تنگ وادیوں سے گزر کر اوپر کھلی چوٹیوں پر پہنچتی ہیں جہاں ہزاروں انسان مستقل رہائش رکھتے ہیں۔ ملک کا مشہور مغنّی موزارٹ جس شہر میں رہتا تھا، آج وہ اسی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ موزارٹ اور بیتھوون کے نغمے اکثر ناٹک گھروں میں گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے میٹیول ہاؤس سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان سامعہ نواز دل چسپیوں کے تضاد میں کچھ کرخت آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں، کیوں کہ یورپ کا سب سے بڑا بجلی گھر کاپرن بند کے قریب اسی علاقے میں واقع ہے۔ برقِ آبی کے اس کارخانے کو قائم کرنے میں ماہرین نے اپنی بے پناہ عقل مندی کا ثبوت دیا ہے کیونکہ سنگلاخ پہاڑیوں کو توڑ کر اور دریا کے قدرتی بہاؤ کو موڑ کر اس جگہ پانی کا دھارا تیز تر

کرلیا گیا ہے کہ بجلی زیادہ سرعت کے ساتھ کافی مقدار میں پیدا ہو سکے۔ اس دریا کے پانی میں اس کے سوا کوئی اور خصوصیت نہیں ہے کہ وہ خوب تیز بہتا ہے۔ البتہ چند اور مقامات کے پانی تاثیر کے لحاظ سے حیرت انگیز ہیں، مثلاً وادی گاسٹین کے چشموں کا پانی تابکاری کے اثرات کا حامل اور اس لیے انتہائی صحت بخش ہوتا ہے۔ زائرین کی کثرت اور گنجائش کی کمی کے باعث یہاں کے اکثر ہوٹل نیویارک کے اسکائی اسکیپروں کی طرح کثیر المنازل ہیں۔ اکثر وجع المفاصل، جذام اور دوسرے جلدی امراض میں مبتلا لوگ یہاں آتے اور صحت یاب ہو کر جاتے ہیں۔ اس علاقے میں نمک کی کئی کانیں بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ صوبہ "سالسبرگ" کہلاتا ہے۔

اسٹائریا: اسٹائریا جس کا رقبہ ۶ ہزار ۳ سو چوبیس مربع میل اور آبادی ۱۱ لاکھ ۹ ہزار ۳ سو ۳۵ ہے، عرفِ عام میں "سبز نشان" کہلاتا ہے، کیوں کہ اس کا نصف حصہ شاداب جنگلوں سے اور ایک چوتھائی سرسبز چراگاہوں اور مرغزاروں سے گھرا ہوا ہے اور پھر سبزے کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ کسی موسم میں خشک یا پژمردہ نظر نہیں آتا۔ گویا ہر وقت بہار کا موسم مسلط رہتا ہے۔ اسی لیے یہاں کی اقتصادیات میں عمارتی لکڑی اور مویشیوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ یہاں کے قوی ہیکل گھوڑے بھی بہت مشہور ہیں جو کھیتوں میں ہل چلانے اور ٹریکٹر کھینچنے کے کام آتے ہیں۔ یہاں کے پرندے، خصوصاً مرغ، تیتر اور بٹیر لذتِ کام و دہن کے لیے کھانے کی اکثر میزوں پر پہنچتے ہیں۔ صوبے کے شمالی حصے میں لوہے کی کانیں ہیں اور اسی رعایت سے اسے "ارزبرگ" کہتے ہیں۔ لوہے کو صاف کرنے، ڈھالنے اور مختلف چیزیں بنانے کے بہت سے کارخانے قائم ہیں۔ کیونکہ لوہے کے قریب ہی قدرت نے کوئلے کی کانیں بھی محفوظ کر رکھی ہیں صوبے کا صدر مقام گراز جس کی آبادی دو لاکھ ۶۶ ہزار ہے، سارے ملک میں دوسرے درجے کا بڑا شہر ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کے اخراجاتِ زندگی اس قدر قلیل تھے کہ اکثر پنشن پانے والے لوگ باقی ماندہ زندگی پورے سکون کے ساتھ گزارنے کے لیے یہاں آتے اور یہیں کے ہو رہتے تھے لیکن اب جدید وضع پر ترقی کرنے کے بعد معیار بلند ہو گیا ہے۔ ایک یونیورسٹی اور فنی تحقیقات کے لیے کئی اعلیٰ درس گاہیں بھی قائم ہیں۔ یہاں کے مردوں کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ سبز پٹیوں والے رنگین پاجامے پہنتے ہیں۔

وورالبرگ: اس صوبے کے عام باشندے بالکل اطالوی لب و لہجے کے ساتھ جرمن زبان خوب بولتے ہیں، جبکہ اور علاقوں میں جرمن سرکاری زبان سہی لیکن عام بول چال میں کم استعمال ہوتی ہے۔ یہ صوبہ جس کا رقبہ ایک ہزار ۲۲ مربع میل اور آبادی ایک لاکھ ۹۳ ہزار ۶ سو ۷۵ ہے، پارچہ بافی کی صنعت کے لیے خاص طور پر مشہور ہے اور اس طرح ملک کی قومی اقتصادیات میں اسے بڑا دخل حاصل ہے۔

کیونکہ کثیر مقدار میں کپڑا باہر بھیجا جاتا ہے۔ کپڑے کے علاوہ یہاں کی لیس اور بیل فیتے بھی مشہور ہیں، چنانچہ ڈورن برن نامی شہر میں پارچہ جات کی جو یورپین نمائش ہوتی ہے، اس میں وورالبرگ کے نمونے سب سے زیادہ درجۂ قبول حاصل کرتے ہیں، تاہم صنعت و حرفت کی اس ترقی کے باوجود اکثر باشندوں نے زمین سے اپنی قدرتی محبت کا رشتہ منقطع نہیں کیا ہے۔ بہت سے افراد کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے پاس صرف اتنی زمین ہے کہ اس کی پیداوار صرف انھی کے کنبے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ صوبے کا صدر مقام بریگنز جس کی آبادی ۲۰ ہزار ہے، جھیل بوڈینسی کے کنارے واقع ہے اور وہاں سے دُور افق کے پار سوئزرلینڈ اور بویریا کی سرحدیں نظر آتی ہیں۔ یورپ میں شرقاً غرباً جانے والی بین الملکتی ریلوے لائن اسی جگہ سے گزرتی ہے۔

ٹائرول، پہاڑوں میں گھرے ہوئے اس صوبے میں آسانی سے پہنچنے کے لیے وورالبرگ کے راستے ایک چھے میل سے زیادہ لمبی سُرنگ سے گزرنا پڑتا ہے۔ باقی تمام راستے تنگ، مسدود یا مشکل سے عبور کیے جانے کے لائق ہے۔ اس صوبے میں جس کا رقبہ ۴ ہزار ۸ سو ۸۲ مربع میل اور آبادی ۴ لاکھ ۲۷ ہزار ۴ سو ۶۵ ہے، آرلبرگ کا اسکول اسکی انگ کا فن سکھانے کے لیے بے حد مقبول ہے۔ دنیا کے بہت سے جن اولمپک کھلاڑیوں نے اس فن میں نام پیدا کیا ہے، وہ اسی تربیت گاہ سے نکلے تھے۔ برفانی میدان ہونے کے لحاظ سے کزبوہل کا علاقہ سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اسکی انگ کھیلنے والوں کے لیے وہاں تار کی بے شمار ریلیں، کرسیاں اور لفٹ لگے ہوئے ہیں؛ سال کے تقریباً نو مہینوں میں برابر چلتے رہتے ہیں۔ اس کا صدر مقام انس بروک ہے جس کی آبادی ۹۵ ہزار ہے، تمام یورپ میں ایک اہم تجارتی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ دوسری عالمگیر لڑائی کے بعد سے خاص طور پر یہاں کی صنعت نے بڑی ترقی کی ہے۔ اب اسے محض دست کاروں اور کسانوں کی زمین نہیں کہا جا سکتا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس کا کچھ حصہ اٹلی کے سپرد ہو گیا تھا لیکن ۱۹۴۶ء کے ایک معاہدے نے تاریخ کا ورق پلٹ کر سابقہ دور شروع کر دیا ہے اس دوران میں تہذیب و ثقافت پر جو اثر پڑا، اس کے نقوش ابھی تک برقرار ہیں۔ اس صوبے کے لوگوں کا لباس بڑا عجیب ہے اور اس سے زیادہ عجیب ان کا فنِ تعمیر ہے۔ ہوا کے سرد تھپیڑوں کو روکنے کے لیے وہ قدرتی بیلوں اور جھاڑیوں سے کام لیتے ہیں اور تعمیری اعتبار سے انھیں اپنے گھر کا ایک ایسا جزو بناتے ہیں کہ ان کے بغیر عمارت کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

ویانا میں: چار بجے ہمارا جہاز ویانا کے ہوائی میدان پر اترا اور ہم چند ہی منٹ میں کسٹم ہال میں پہنچ گئے۔ پچھلے سال تک کہ جب ویانا پر چار حکومتوں کا تسلط تھا اور انھوں نے قومی ہوائی کمپنیوں کو پرواز کی اجازت نہیں دی تھی، صرف غیر ملکی کمپنیوں کے ہوائی جہاز وہاں آ جا سکتے تھے۔ جب ملک آزاد اور ہر لحاظ

سے خود مختار ہوگیا تو اس کی ہوائی کمپنیاں بھی کام کرنے لگیں۔ تاہم زیادہ زور پھر بھی غیر ملکیوں ہی کا رہا۔ چناں چہ ۱۹۵۰ء میں ایسی سولہ کمپنیوں کے ہوائی جہاز وہاں آتے جاتے تھے۔ اس سال ویانا کے ہوائی مستقر پر ایک لاکھ ۲۹ ہزار ۵۰۷ مسافر اترے اور ۱۳ لاکھ ۸۹ ہزار ۱۱۹ کلو گرام سامان اتارا گیا۔ گویا ۱۹۵۴ء کے مقابلے میں مسافروں کی آمد و رفت میں ۴۲ فی صدی اور سامان کی نقل و حرکت میں ۴۹۰۵ فی صدی کا اضافہ ہوا۔

ابھی جہاز سے ہمارا سامان بھی اتر کر نہیں آیا تھا کہ پاسپورٹ کے اندراجات مکمل ہو گئے اور اس میں بمشکل دو منٹ صرف ہوئے۔ کام کی یہ رفتار بڑی تعجب خیز رہی اور مجھے آج تک اس قدر جلد اندراجات سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ وقت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ رکھتے ہیں۔ اب ہمارا سامان آگیا۔ سامان دیکھنے والے نے سامان پر پاس کا نشان لگانے کے بعد ہم سے دریافت کیا کہ کیا ہمارے پاس ایسی کوئی چیز موجود ہے جو کسٹم کی تعریف میں آتی ہو۔

کسٹم کے قوانین کے مطابق ہوائی جہاز کے ذریعے ویانا پہنچنے والا ہر مسافر اپنے ساتھ دو سو سگریٹ یا چالیس سگار یا دو سو گرام تمباکو اور ایک بوتل شراب بلا محصول لے جا سکتا ہے۔ ان منشیات کے علاوہ ذاتی استعمال کی کسی چیز پر محصول عائد نہیں ہوتا۔ باقی اشیا پر کڑی نگرانی اور دیکھ بھال ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس ملک میں محصولِ راہداری کی وصولی قومی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر سیاح اور مسافر اپنے ساتھ غیر محدود تعداد میں ڈالر لے جا سکتا ہے۔ اس سکّے پر زرِ مبادلہ کی کوئی پابندی نہیں ہے لیکن اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس کا اظہار ضرور کرنا پڑتا ہے تاکہ واپس جاتے وقت اس سے زیادہ مقدار میں کوئی سکہ ساتھ نہ لے جا سکے۔ ڈالر کے علاوہ باقی زرہائے مبادلہ پر کچھ پابندیاں ہیں اور انھیں بھنانے کی صورت میں کمیشن ادا کرنی پڑتی ہے۔

ہم نے ان کو بتایا کہ ہمارے پاس سگریٹ یا کوئی اور نشہ آور چیز نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ دوستوں کو دینے کے لیے تحائف ہیں اور وہ الگ ڈبے میں ہیں۔ ساتھ ہی اس کی مرتبہ فہرست ہم نے ان کو دکھا دی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ جو سامان ہم آسٹریلیا میں دینا چاہتے ہیں، وہ نکال لیں اور باقی ہوائی میدان پر چھوڑ دیں۔ ہم نے اس سے اتفاق کیا اور سامان چھوڑ کر رسید حاصل کر لی۔

پانچ منٹ میں اس مرحلے سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنے پونڈ بھنانے کا فیصلہ کیا اور ۳-۴ منٹ میں یہ کام بھی ہوگیا۔ میں نے فی الوقت ۵ پونڈ کا چیک کیش کرایا۔ اس کے تین سو ۷۵ آسٹرین شلنگ اور ۳۰ قرش ملے۔ عرصۂ دراز سے اس ملک میں شلنگ کا رواج ہے۔ ویسے بڑے بڑے دکان دار ڈالر، مارک

اور روبل بھی قبول کر لیتے ہیں۔ آسٹریا کا ایک شلنگ تقریباً ۴ سنٹ کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ ایک ڈالر کی سرکاری شرحِ مبادلہ ۵۶۔۲۵ شلنگ مقرر ہے لیکن عموماً اس پر عمل نہیں ہوتا خصوصاً سیاحوں کے تیور دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ شلنگ بذاتِ خود بہت چھوٹا سکہ ہے لیکن اسے بھی ایک سو گروشن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عام طور پر ۵۰۔ ۲۰۔ ۱۰ اور ۵ گروشن کے سکے اور ۱۔ ۲۔ ۵ اور ۲۵ شلنگ کے نوٹ بھی بازار میں چلتے ہیں۔ بڑے کاروبار کے لیے ملک کے قومی بنک نے ۵۰۔ ۱۰۰۔ ۵۰۰ اور ہزار شلنگ کے نوٹ بھی جاری کر رکھے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں یعنی دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے قبل آسٹریا کا شلنگ الپائن ڈالر کہلاتا تھا کیونکہ وہ پہاڑ کی طرح استوار اور قابلِ اعتماد تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ملک پر ہٹلر کا قبضہ ہوا تو قومی بنک دیوالیہ ہو گیا اور اس کا تمام اثاثہ جس میں محفوظ سونا بھی شامل تھا' برلن بھیج دیا گیا۔ ملک میں شلنگ کے بجائے جرمن مارک چلنے لگے۔ لیکن یہ دور زیادہ طویل نہ رہا۔ اتحادی تسلط کے بعد پرانا سکہ دوبارہ چلنے لگا۔ اس وقت (۱۹۵۶ء) سرکاری شرح مبادلہ حسبِ ذیل ہے:-

ایک پاکستانی روپیہ	۵۔۰۰	شلنگ
ایک امریکی ڈالر	۲۵۔۵۶	"
ایک کنیڈی ڈالر	۲۵۔۹۴	"
ایک برطانوی پونڈ	۶۴۔۰۰	"
سو سوئس فرانک	۵۸۷۔۰۵	"
سو بلجین بلگا	۴۹۔۸۴	"
سو فرانسیسی فرانک	۶۔۰۵	"
سو ولندیزی گلڈر	۶۴۴۔۴۶	"
سو جرمنی مارک	۵۹۴۔۵۶	"
سو اطالوی لیرا	۴۔۱۰	"
سو ڈنمارک کے کراؤن	۳۴۵۔۱۳	"
سو نارویجی کراؤن	۳۲۱۔۵۳	"
سو سویڈنی کراؤن	۴۶۹۔۰۳	"

ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر آ کر معلوم ہوا کہ بس ہمارا انتظار کر کے شہر جا چکی ہے۔ کام کی رفتار

اب تک تو ہمارے موافق تھی لیکن یہ برق رفتاری بھی خوب رہی کہ ہمیں ٹیکسی میں شہر آنا پڑا اور ٹیکسی والے نے ۱۵۰ آسٹریوی شلنگ وصول کر لیے۔

دوسری جنگِ عظیم میں آمد و رفت کے تمام ذرائع کو بری طرح نقصان پہنچا تھا لیکن لڑائی ختم ہوتے ہی سارے نظام درست کر لیے گئے۔ اس وقت سے پچھلے سال کا مقابلہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں ملک بھر میں ٹیکسیوں کی تعداد ۳۲ ہزار ۳ سو ۷۳ اور بسوں کی تعداد ۲ ہزار ۳ سو ۹۲ تھی۔ پچھلے سال ٹیکسیوں کی تعداد ایک لاکھ ۴۳ ہزار ننانوے اور بسوں کی تعداد ۴ ہزار دو سو ۶۳ ہو گئی۔

ہوٹل میں: ہوٹل ڈی فرانس میں ہمارے لیے ایک کمرہ پہلے سے محفوظ تھا۔ اس ہوٹل میں پہنچنے پر خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا گیا اور بذریعہ لفٹ منٹوں کی منٹوں میں ہم اپنے کمرہ نمبر ۱۰۸ میں پہنچا دیے گئے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یورپ میں سامان کے ساتھ دِقتیں پیش آتی ہیں اور اٹھانے کے لیے آدمی نہیں ملتے۔ مگر اس وسطی یورپ میں ہوٹل کے قلی تو بہت تیز ہیں۔ بلغراد میں جس سامان کو بڑے تکلف سے اٹھایا گیا تھا، یہاں کسی تکلف کے بغیر اٹھا کر کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ ہوٹل تقریباً پچاس سال پرانا ہے۔ وہی تین قد برابر دروازے اور پرانی وضع کے بڑے بڑے کمرے۔ مگر مجھے یہ چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ دل ٹھہرا رہتا ہے۔ آج کل کے جدید وضع کے بند اور گھٹے ہوئے کمروں سے مجھ وحشت ہوتی ہے۔

آسٹریا میں غیر ملکی سیاحوں کی ہمیشہ ریل پیل رہی ہے لیکن دوسری جنگِ عظیم سے قبل وہاں آنے جانے والے زائرین میں سے ۴۱ فی صدی صرف مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ سے آتے تھے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد ایک دم تغیر رُونما ہوا۔ ان علاقوں سے آنے والے سیاحوں کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا۔ اس کے برعکس مغربی یورپ اور دنیا کے دوسرے حصوں کے لوگ زیادہ تعداد میں آنے لگے۔ لڑائی میں جو ہوٹل اور مسافر خانے تباہ ہو گئے تھے، ان کو بہت جلد درست کر لیا گیا۔ ۱۹۵۱ء - ۵۲ میں سیاحوں کی تعداد اتنی ہو گئی جتنی کہ ۱۹۳۶ء - ۳۷ میں تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ۳ لاکھ ۹۴ ہزار ۸ سو ۷۱ مسافر مختلف ہوٹلوں میں قیام کر سکتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں تعداد کم ہو کر ایک لاکھ ۶۱ ہزار ۲۱۰ رہ گئی اور پھر بڑھنی شروع ہوئی۔ سیاحوں کی تعداد کا ایک سرسری سا مقابلہ اس طرح ہو سکتا ہے:۔

	۱۹۴۸ء میں	۱۹۵۵ء میں
ہوٹلوں، مسافر خانوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں	۱۰۲۵۱۰	۱۹۱۹۶۰
صحت گاہوں میں	۱۱۹۶۱	۲۷۹۵۱

	۱۹۴۸ء میں	۱۹۵۵ء میں
کوہ ایلپس کے ہوٹلوں میں	۱۱۸۳۵	۱۵۴۱۳
نجی قیام گاہوں میں	۳۴۷۳۸	۱۵۷۴۴۷
نوجوانوں کے ہوسٹلوں میں	—	۵۲۲۴

یہ ان ہوٹلوں وغیرہ کا ذکر ہے جو جدید وضع پر آراستہ ہیں اور جہاں نئے زمانے کی سہولتیں میسر ہیں۔ ورنہ ان کے علاوہ تقریباً ہر گاؤں میں اور ہر قصبے میں قدیم وضع کی سرائیں موجود ہیں، لیکن وہ بھی صاف ستھری ہوتی ہیں۔ صرف وہ لوگ جو بڑے شہروں کے ہنگاموں سے دور رہنا اور قدرت کی صحیح فیاضیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، ان سراؤں کو نوازتے ہیں۔ یا بصورتِ دیگر جن کے پاس خرچ کرنے کے لیے سرمایہ کم ہوتا ہے۔ ملک کے بڑے شہروں مثلاً ویانا میں عموماً ہوٹلوں کا کرایہ پانچ ڈالر یومیہ فی کس ہوتا ہے۔ اس رقم میں دو وقت کا کھانا اور ایک وقت کا ناشتہ شامل ہوتا ہے۔ ویانا میں امپیریل اور گرینڈ ہوٹل واقعی شاہانہ اور عظیم الشان کہے جاسکتے ہیں لیکن ان میں زیادہ تر طویل مدت تک قیام کرنے والے سیاحوں کا انتظام ہوتا ہے۔ ہماری طرح دو چار دن کے مہمانوں کو وہاں گنجائش ہی نہیں ملتی اور ہوٹل والے بھی زیادہ التفات نہیں برتتے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب غیروں کا اس ملک پر تسلط رہا تو یہ دونوں ہوٹل روسیوں نے سنبھال لیے تھے اور کسی مقامی باشندے کو نہ صرف قیام کے لیے بلکہ کھانے پینے کے لیے بھی گھسنے کی اجازت نہیں تھی۔ روسی حکام نے اپنے ذوق اور سہولت کے مطابق ان میں کچھ تبدیلیاں کر دیں، گویا وہ سمجھتے تھے کہ ہمیشہ اس ملک پر اسی طرح ان کا قبضہ رہے گا۔

شہر کے دو اور ہوٹل جن کے نام ساشر اور کرانز ایمباسیڈر ہیں، بہت ہی مہنگے ہیں۔ وہاں صرف قیام کے چھ ڈالر وصول کیے جاتے ہیں۔ ہوٹل ڈی فرانس بھی، جس پر لڑائی کے بعد فرانسیسی حکام کا قبضہ ہو گیا تھا، ایسٹوریا، الزبتھ اور ریگینا کی طرح عمدہ ہوٹلوں میں شمار ہوتا ہو لیکن ان میں زیادہ تر "چھلاوہ سیاح" قیام پذیر ہوتے ہیں، یعنی مرغانِ خوش نوا کی طرح کہ اپنی اپنی بولیاں بولیں اور آگے بڑھ گئے۔ ہوٹلوں کا انتخاب ہم نے دہلی میں بیٹھ کر کیا تھا اور ویانا کے اس ڈی فرانس کا انتخاب تو میں نے ہی کیا تھا۔ اچھا ہوا کہ یہاں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی، ورنہ بھائی جان محترم ضرور کچھ فرماتے۔

شہر کے بازار: ہم نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ایک منٹ ضائع نہیں کیا۔ فوراً نہا دھو کر اور تیار ہو کر بازار روانہ ہو گئے۔ آج ہفتہ ہے اور ۲ بجے کے بعد سے تمام بازار بند ہیں اور خرید و فروخت بالکل نہیں

ہو رہی ہو، مگر تمام دکانیں ایسی ہیں جیسے کھلی ہوں۔ ان کے بڑے بڑے اور خوبصورت شوکیسوں میں سامان بڑے قرینے اور خاص طرز کے ساتھ سجا ہوا ہو اور شوکیس روشنی سے جگ مگ کر رہے ہیں۔ ان شوکیسوں سے بہت سی دکانوں کا اندرونی حصہ بھی دیکھا جا سکتا ہو۔

ان پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ روزمرہ کے استعمال کی بیشتر چیزیں اسی ملک میں تیار ہوتی ہیں۔ کم و بیش ہر چیز پر جرمن زبان میں "ساختہ آسٹریا" لکھا ہوا نظر آیا۔ یہ اہتمام خاص طور پر شاید اس لیے کیا جاتا ہو کہ لڑائی کے بعد والے غیر ملکی دورِ تسلط میں بہت سی بیرونی مصنوعات درآمد کی گئی تھیں اور لوگوں کو ان کے استعمال کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ اسی لیے مقامی بیرونی صنعتیں دم توڑ رہی تھیں اور کاریگروں اور صنعت کاروں نے اقتصادی بدحالی سے تنگ آکر دوسرے پیشے اختیار کر لیے تھے۔ تاہم دورِ اقتدار ختم ہوتے ہی قومی جذبات ایک دم ابھر آئے۔ عوام کے احساسات کے ساتھ ساتھ حکومت کی سرپرستی نے بھی کام کیا اور مقامی گھریلو دستکاریاں اور بڑی صنعتیں دوبارہ پنپنے لگیں۔ لہٰذا لوگوں کی عادت چھڑانے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ ہر چیز پر نمایاں طور پر "ساختہ آسٹریا" لکھا جائے تاکہ قوم پرستی کے جذبے کے ماتحت ان چیزوں کی خریداری کو ترجیح دی جائے۔ بہت سی اشیا ہمیں پسند آئیں لیکن خریدنے کا سوال دل میں پیدا ہی نہیں ہوا، کیوں کہ ہر ملک میں درآمد و برآمد پر پابندیاں عائد ہیں، وہ برابر مانع رہیں۔ یہاں کی مصنوعات میں ایک بات سب سے زیادہ نمایاں ہو اور وہ یہ کہ ہر چیز میں بہت زیادہ گہرے اور شوخ رنگ لگائے جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ملک کا بیشتر حصّہ سال میں کئی مہینے تک برف سے ڈھکا رہتا ہو۔ لہٰذا برف کی سفیدی سے حسنِ تضاد پیدا کرنے کے لیے شوخ رنگوں کو ترجیح دی جانے لگی ہو۔

ہم نے بزار (بازار) میں ایک آدھ دکان کھلی ہوئی دیکھی، مگر خرید و فروخت شاید یہاں بھی نہیں تھی۔ البتہ ریستورانوں میں بازار گرم ہو۔ موڑ موڑ پر حسین و جمیل ریستوراں اور ملک بار ہیں اور مرد و عورت کا جمگھٹا ہو۔ کوئی شربت پی رہا ہو، کوئی چائے۔ کہیں انگوری شراب کا دور ہو۔ کوئی بیر کے جھاگ بھرے مگ اپنے معدے میں انڈیل رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ رنج و غم کو کوئی جانتا ہی نہیں۔ چہروں کی چمک دمک اور اس پر مسکراہٹ اور قہقہے ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔

اپنے ملک کی طرح یہاں کے چائے خانوں اور ملک باروں میں بھی ریڈیو بلکہ ٹیلی ویژن سیٹ تک لگے ہوئے ہیں تاکہ گاہکوں کی توجہ مبذول کی جا سکے لیکن زیادہ تر گاہک ریڈیو کے گانے اور ٹیلی ویژن پروگرام کی تصویریں "سمردِ خانۂ ہمسایہ اور حسن راہ گزر رہے" کے مصداق سنتے اور دیکھتے ہیں اور یہ

نہیں ہوکہ وہ "ہمہ تن گوش" ہوں اور ان کا "ہر مُو چشمِ بینا" بن جائے۔ آزادی کے بعد سے ریڈیو اور ٹیلی وژن نے اس ملک میں بڑی ترقی کی ہے۔ علاقہ جاتی اسٹیشن تو ہر جگہ موجود ہیں جن کے لیے اوقاتِ نشریات مقرر ہیں۔ البتہ صدر مقام سے چوبیس گھنٹے نشریات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ریڈیو کے روزانہ تین پروگرام ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو میڈیم اور شارٹ ویو پر مقامی اور بیرونی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ ایک پروگرام شام کے چار بجے سے رات کے گیارہ بجے تک الٹرا شارٹ ویو پر نشر ہوتا ہے۔ ملک بھر میں مقامی نشریات کے لیے ۸۳ اور غیر ملکی نشریات کے لیے ۸ ٹرانسمیٹر لگے ہوئے ہیں۔ یہ سارا انتظام سرکاری ہے۔ البتہ حال ہی میں ایک نجی کمپنی کو ٹھیکہ دینے کا منصوبہ عمل میں آیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ پروگرام میں بڑا تنوع ہوتا ہے اور موسیقی تمام موضوعات پر چھائی رہتی ہے۔ اور یہ کیوں نہ ہو، پرانی روایات کو نبھانا جو ٹھیرا، جبکہ ویانا تو اب بھی دنیا کے موسیقی کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ نشریات میں مصنوعات و مطبوعات کے اشتہارات بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ان کو اس طرح دل چسپ بنایا جاتا ہے کہ سننے والوں کے لیے اُکتا دینے والے نہیں ہوتے۔ تعلیمی اداروں کے لیے نشریات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار مدرسوں میں ریڈیو سیٹ لگے ہوئے ہیں، تاکہ طلباء اچھی طرح مستفید ہوسکیں۔ لڑائی کے زمانے میں اور کچھ اس کے بعد جہاں اور صنعتوں کو نقصان پہنچا، ریڈیو سیٹوں کی ساخت کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ البتہ پچھلے سال دو لاکھ پچیس ہزار دو سو سیٹ بنائے گئے، جن سے بمشکل مقامی ضروریات پوری ہوسکیں۔ ۳۰ جون ۱۹۵۶ء تک کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷ لاکھ ۲۷ ہزار ۹ سو ۷۳ اشخاص کے پاس ریڈیو کے لائسنس موجود ہیں۔ حکومت ہر لائسنس پر فیس وصول کرتی ہے۔

ٹیلی وژن کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے شروع ہوا ہے اور بالکل تجرباتی دور میں ہے۔ ایک ہفتے میں صرف بارہ گھنٹے کا پروگرام ہوتا ہے۔ پھر بھی لوگوں کے ذوق و شوق کا یہ عالم ہے کہ صرف ویانا میں یکم اگست ۱۹۵۶ء تک ایک ہزار ۹ سو ۹۳ لوگوں نے لائسنس لے رکھے تھے۔ نشریات کے لیے صرف چار ٹرانسمٹر ہیں۔

ہم نے ایک سڑک کو اختیار کرلیا اور فیصلہ کیا کہ سیدھے اسی پر جائیں گے اور سیدھے اسی سے آئیں گے۔ مگر یہ سڑک کیا ہے۔ دو میل تک ہم گئے اور پھر لوٹ آئے۔ لوٹتے وقت ایک سینما میں گھس گئے خیال ہوا کہ ایک آدھ گھنٹے کوئی جرمن فلم دیکھ لیں، مگر یہاں ہماری زبان کسی نے نہیں سمجھی۔ البتہ تیل کمپنی کا ایک آدمی کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگا۔ اس کو ہم سے اس لیے دل چسپی ہوگئی کہ وہ کچھ دن

ہندستان میں رہ آیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر کی چند باتیں کیں اور اسی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ ہندستان نے مصر کو بطور امداد دو لاکھ روپے کے قریب رقم دی ہے۔ دنیا کے اِس حصے میں انگریزی کا کوئی اخبار نہیں ملتا اور مقامی زبان سے ہم ناواقف ہیں، لہٰذا معلوم ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

کھانے کی میز پر: پونے نو بجے ہم خیریت سے اپنے ہوٹل میں آگئے اور کھانا کھانے کے لیے بڑے کمرے میں چلے گئے۔ یہاں کھانے میں زیادہ تر اُبلی ہوئی یا بُھنی ہوئی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ سرخ مرچ کا تو ذکر ہی کیا، شاید کالی مرچ بھی اس ملک میں بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ البتہ ایک دو قسم کے بیج پیس کر چھڑک دینے سے غذا میں چٹپٹا پن پیدا ہو جاتا ہے اور ہم جیسے "مرچ خور" لوگوں کو بھی آسودگی کام و دہن نصیب ہو جاتی ہے۔ ان کے کھانوں کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ ہم نے خاص طور پر بُھنے ہوئے چوزے خوب مزے لے کر کھائے اور تلی ہوئی مچھلی بھی بُری نہیں تھی۔ عام طور پر بام مچھلی کے قتلے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ کھانے کے بعد کافی بھی پیش کی جاتی ہے۔

بھائی جان محترم نے مجھ سے سوال کیا کہ اس کی حقیقت کیا ہو گی کہ دنیا کا سب سے پہلا عوامی قہوہ گھر اس ملک میں کھلا۔ اتنے میں بڑی نفیس کافی آگئی۔ میں کافی اب ترکی سے شروع کر چکا ہوں۔ اس لیے خوش بُو سے نفاست کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ حالاں کہ میری اس "مہارت" میں بھائی جان محترم کو سخت شبہ ہے۔ کافی تیار کر کے میں نے اسے پینے کے بجائے "چوسنا" شروع کر دیا، اور بھائی جان محترم سے مخاطب ہو کر ان کے سوال کا جواب دینا شروع کر دیا۔ میں نے ان کو بتایا کہ اہلِ آسٹریا کا دعویٰ ہے کہ دُنیا کا سب سے پہلا عوامی قہوہ خانہ ویانا میں کھولا گیا تھا۔ کافی ہی سے لفظ کیفے بنا ہے۔ آج سے کئی سو سال پہلے ترکی نے آسٹریا پر حملہ کیا لیکن اس کی فوجیں مقابلے کی تاب نہ لا کر سراسیمگی کے عالم میں لوٹ گئیں اور جاتے ہوئے اپنا کچھ سامان بھی چھوڑ گئیں۔ سامان میں منجملہ اور چیزوں کے چند بوریوں میں بھورے رنگ کے عجیب و غریب بیج بھی تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ آسٹریا کی فوج کے ایک باورچی نے جو پولینڈ کا باشندہ تھا، ان بوریوں کو اپنے قبضے میں لے لیا اور مختلف طریقے سے تجربہ کرتا رہا۔ آخر اس نے وہ ترکیب معلوم کر لی جو قہوے کے استعمال کے لیے عام طور پر رائج ہے۔ اس نے انھی چند بوریوں کے برتے پر ایک قہوہ خانہ کھول دیا اور بعد میں جب ترکی سے صلح ہو گئی تو کافی کے بیج وہاں سے منگانے لگا۔ اِس طرح اس کا کاروبار خوب چمکا اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی میدان میں اتر آئے۔ آسٹریا والوں کا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے خود ترکی میں بھی بازاروں میں قہوہ خانوں کا رواج نہیں تھا۔ گویا کافی کے لیے دُنیا کا پہلا کیفے ویانا میں قائم ہوا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے کمرے میں آ گئے اور فیصلہ کیا کہ کل کا پروگرام ابھی بنا لیا جائے۔ کل چوں کہ اتوار ہو اور یہ دن "سائٹ سی انگ" کے لیے غنیمت ہو، اس لیے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ پیر سے ہم اسپتالوں اور طبی تعلیمی اداروں کو دیکھنے میں لگ جائیں گے اور شاید ویانا میں دلچسپ مقامات کو دیکھنے کا موقع نہ مل سکے۔

پروگرام مرتب کرنے کا کام بھائی جان محترم کے سپرد ہوتا ہو، چناں چہ وہ سارا سامان، کتابیں، تراشے اور گائڈ وغیرہ لے کر بیٹھ گئے۔ وہ مطالعہ کرتے رہے اور میں دن بھر کا سفر نامہ لکھنے کے بعد سو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ بھائی جان محترم خود ہی کوئی فیصلہ کریں گے، جو میرے لیے بھی قابلِ قبول ہوگا۔

۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء ـــ اتوار

مجھے یقین تھا کہ سیاحوں کے لیے ویانا میں بھی اٹلی جیسا کوئی انتظام ضرور ہوگا تاکہ سیر و تفریح کرنے اور مقامات دیکھنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔ چنانچہ یہاں آٹو بس کے نام سے ایک کمپنی ہے جو ویانا اور قرب و جوار کے مقامات کی سیر مختلف قسطوں میں کراتی ہے۔ بھائی جان محترم نے صبح ہی اس کا خاکہ مجھے بتایا اور ہم نے یہ طے کیا کہ اتوار کے تمام دن سے فائدہ اٹھا کر سارا وقت اس پروگرام میں صرف کر دینا چاہیے۔ یہ کمپنی خاص طور سے ہر اتوار کو الپائن پہاڑی سلسلے کی سیر کراتی ہے۔ ویانا شہر سے سیمارنگ نامی مقام تک بس کے ذریعے ڈھائی گھنٹے کا راستہ ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی جگہ ہے اور صحت بخش مقام ہے۔ یہ خود اس پر بھی حاوی ہے۔

قدرت سے ہم آہنگی: یورپ میں سوئٹزرلینڈ کے بعد آسٹریا کو قدرتی مناظر کے لحاظ سے خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ میدانوں میں سبزہ زاروں نے، پہاڑی مقامات پر شفاف پانی کے تیز دھاروں، آبشاروں اور جھیلوں نے اور زیادہ بلندی پر برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں نے مل جل کر وہ کیفیات پیدا کی ہیں کہ بارہ مہینے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ خصوصاً موسم سرما میں جب بلند چوٹیوں کے علاوہ ہر پہاڑی مقام برف سے ڈھک جاتا ہے تو سکیٹنگ اور اسکی اِنگ کھیلنے والے مردوں اور عورتوں کے لیے گویا ایک نعمت آسمان سے اُتر آتی ہے۔ سیاحوں کے علاوہ مقامی باشندوں کی زندگی بھی ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شوقین منچلا سیاح دامنِ کوہ سے بلند چوٹیوں تک بل کھاتے ہوئے راستوں پر پیدل چلنا شروع کر دے تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی فضا خاموش محسوس نہیں ہوگی۔ قدم قدم پر اس کو دیہاتی گانوں کی تانیں سنائی دیں گی اور ایک ساتھ ناچتے ہوئے نوجوانوں کو بھی دیکھا جا سکے گا۔ کبھی کبھی خود سیاح بھی ان دیہاتیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنے گلے کا لوچ اور اعضا کی تھرک دکھانے لگتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی بستی قریب نہ ہو تو فضا کے سکوت کو توڑنے کے لیے ندی نالوں اور آبشاروں کے زمزمے اور نغمی پھدکنے والی چڑیوں کے چہچہے کمی کو پورا کر دیتے ہیں۔ آج کل برف کا زمانہ اپنے شباب پر نہیں ہے، اس لیے اسکیٹنگ اور اسکی اِنگ کے حیرت انگیز نظارے دل بہلانے کے لیے موجود نہیں ہیں۔ تاہم زیادہ اونچے مقامات پر یہ سامانِ تفریح ہو تو ہمیں علم نہیں۔ مثلاً سیمارنگ سے آگے ایک مقام ہرش وانگ کہلاتا ہے جہاں سے تار کی ریل

اوپر پہاڑ تک جاتی ہے۔ "یہ معلق ریل" ہے۔ ڈبے میں تقریباً چالیس آدمی سماتے ہیں۔ تقریباً دس منٹ میں یہ اوپر تک پہنچا دیتی ہے۔ باقاعدہ پلیٹ فارم ہیں اور ٹکٹ جس اعتبار سے فروخت ہوتے ہیں اسی اعتبار سے قطار لگانی ہوتی ہے اور پھر نمبر وار ہی اس ریل میں سوار ہوا جاتا ہے۔ ہم بھی اس میں سوار ہوئے اور اس سے لطف اندوز ہوئے۔ ایک صاحبہ شاید امریکن تھیں، بہت ڈر رہی تھیں، یا ممکن ہے کہ اس لیے ڈر رہی ہوں کہ ان کا ساتھی زیادہ متوجہ ہو جائے! تمام پہاڑی مقامات پر ایسی دو سو سے زیادہ ریلیں خاص موسم پر ہر وقت اور باقی دنوں میں مقررہ اوقات میں چلتی رہتی ہیں۔ انھیں زیادہ تر اسکیٹنگ اور اسکی اِنگ کے شوقین ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنا خاص سامان ساتھ لے کر تار کے ان ڈبوں کے ذریعے اوپر پہنچ جاتے ہیں اور پھر وہاں سے نیچے وادیوں کی طرف پھسلنا شروع کرتے ہیں۔ نئے لوگوں کے لیے اسکی اِنگ کا نظارہ نہ صرف ہوشربا کہا جا سکتا ہے بلکہ کچھ دیر کے لیے سکتے کا عالم طاری کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہر لمحے محسوس ہوتا ہے کہ اب اس منچلے نوجوان کی جان گئی۔ وہ برف کی سطح پر اس طرح اترتا چڑھتا اور لمبی چھلانگیں لگاتا ہے گویا زمین سے بلند بسیط فضا میں تیر رہا ہے اور کشش ثقل کچھ دیر کے لیے سلب ہو گئی ہے۔ مقابلوں میں حصہ لینے والوں کے اکثر چوٹیں لگتی ہیں اور بعض مر بھی جاتے ہیں لیکن شوق کے دیوانے یہ خطرہ مول لینے سے باز نہیں آتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکی اِنگ کھیلنے والا کسی دشوار گزار گھاٹی میں جا گرا اور انتہائی تلاش کے باوجود اس کی لاش تک نہ ملی۔ اگر مرزا غالب کو اس حصۂ ارض اور اس کے کھیلوں کا پتہ چل جاتا تو وہ ضرور وہاں پہنچ جاتے اور مرنے کے بعد رسوائی سے بچنے کے لیے غرقِ دریا ہونے کے بجائے اسکی اِنگ کی مشق کرتے تاکہ جنازہ اٹھنے اور مزار بننے کی نوبت نہ آتی۔

ہم نے آج کے ٹور میں پوری طرح حصہ لیا۔ ہماری عمدہ اور بڑی ہی آرام دہ بس میں بہتّر مسافر تھے اور ایک گائڈ۔ یہ گائڈ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے سارے مقامات کی تفصیل بتاتی جاتی تھی ہمارے ساتھی انگریز، امریکی، فرانسیسی، جرمن، آسٹریائی، مصری سبھی تھے اور ہم دونوں بھائی پاکستان اور ہندستان کی گویا نمائندگی کر رہے تھے۔ گائڈ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بولتی تھی اور یہ اکثر لوگ سمجھ رہے تھے۔

منزلِ مقصود پر پہنچ کر سب لوگ سیر و تفریح اور خورد و نوش کے لیے اتر گئے۔ اس جگہ بہت سے ہوٹل اور ریستوراں بنے ہوئے ہیں۔ جب کوئی بس وہاں پہنچتی ہے تو ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی برات خانۂ عروس پر پہنچ گئی ہے اور لوگ دولھا کے استقبال کے لیے حاضر ہیں



پہاڑ کے دامن میں



جنیوا





پہاڑ کی چوٹی پر

لیکن اس بس کا ہر مسافر برات کا دولہا معلوم ہوتا اور بس کے خیر مقدم کے لیے ہوٹل کے ملازمین بڑھتے اور اپنی طرف کھینچ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ملک کے ریلوے اسٹیشنوں پر ہوتا ہے، مسافروں کے لیے باقاعدہ چھینا جھپٹی ہوتی ہے۔ پابندی سے جانے والوں کے لیے تو ہوٹل لگے بندھے ہیں لیکن پہلی بار برات کا دولہا بننے والے ہم جیسوں کے لیے بڑی کش مکش ہوتی ہے کہ سو بمبر کی رسم ادا ہوئے بغیر کس "خانۂ عروس" میں داخل ہوا جائے۔

اس پہاڑی مقام کا بڑا شہرہ ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان اور ہندستان کے لیے یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ ہمارے ملکوں میں نہ معلوم کتنے ایسے پہاڑ اور برف پوش مقامات ہیں۔ خود ہمالیہ برف کا گھر دعوتِ نظارہ دینے کے لیے کافی ہے۔

قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ ہم دونوں بھائیوں کی نظریں خودرو سبزے کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ قدرت کی ان نعمتوں میں ایسی بہت سی جڑی بوٹیاں ہوں گی جو انسانی صحت کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہوں۔ اسی لیے اس ملک میں جڑی بوٹیوں کے بہت سے مرکز اور دوا خانے موجود ہیں اور بہت سے باشندے اس دیسی علاج کے قائل ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ ہمدرد دواخانے کی طرف سے وہاں ایک تجربہ گاہ قائم کر کے طبِ مشرقی کے انداز میں کچھ چھان بین شروع کر دی جائے، لیکن ان امکانات کا دامن تنگ پا کر خاموش رہ جانا پڑا۔

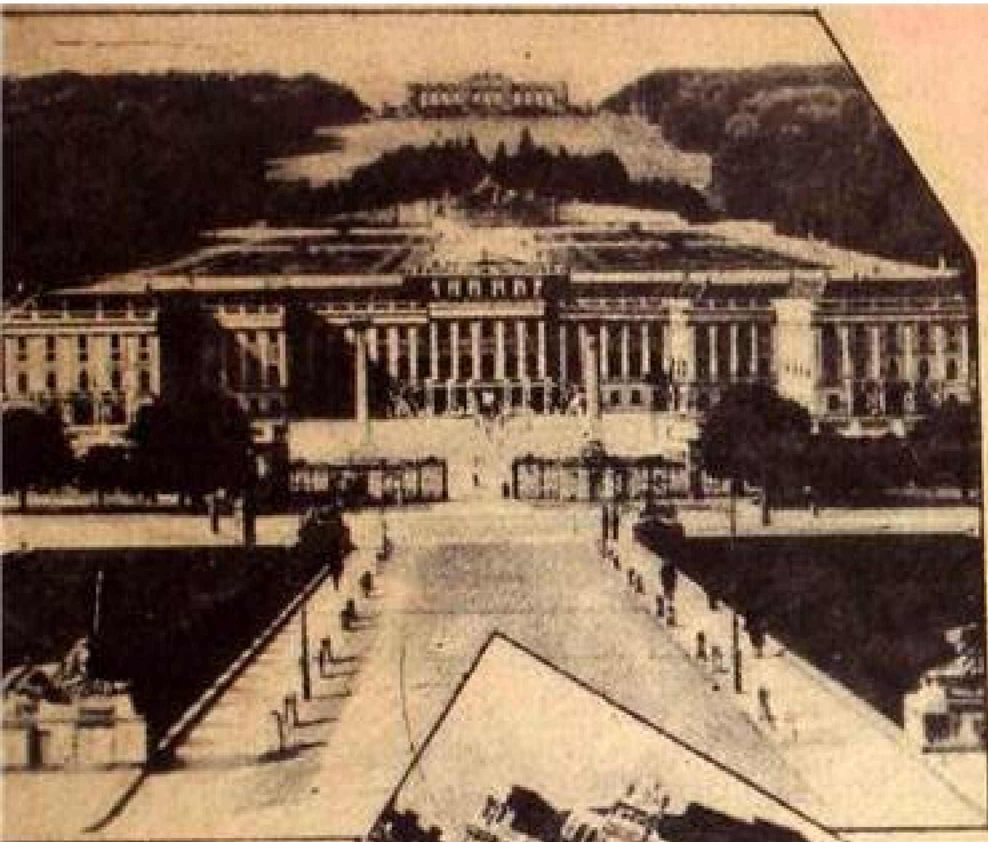
خورونوش سے فارغ ہوئے تو نماز کا وقت قریب آ گیا تھا۔ دو چار غیر ملکی مسلمان بھی اس قافلے میں موجود تھے۔ لہٰذا نماز باجماعت کے لیے سبزہ زار ہی پر صف آرائی شروع کر دی۔ قرعۂ فال بھائی جان محترم کے نام نکلا اور خوش قسمتی سے انھیں امامت کے فرائض انجام دینے پڑے۔ اس سرزمین پر اس سے پہلے شاید ہی نماز باجماعت ہوئی ہو۔ دوسرے سیاحوں نے اس موقع پر بہت سی تصویریں کھینچ ڈالیں اور پھر چند نئے لوگوں سے تعارف بھی ہو گیا جن سے واپسی میں راستے بھر باتیں ہوتی رہیں۔

ہم نے محسوس کیا کہ پاکستان اور ہندستان سے یورپ کے عام لوگوں کو بڑی دل چسپی ہے۔ وہ دونوں ملکوں کے باہمی تنازعات سے بھی واقف ہیں۔ اس لیے یہ معلوم کر کے انھیں حیرت ہوئی کہ ہم میں سے ایک پاکستانی ہے اور ایک ہندستانی، اور جب وہ سنتے کہ ہم دونوں سگے بھائی ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہتی۔ وہ کہتے کہ اسی طرح سب لوگ بھائی بھائی بن کر کیوں نہیں رہتے۔ آخر پہلے بھی تو ایک ساتھ رہا جاتا تھا۔

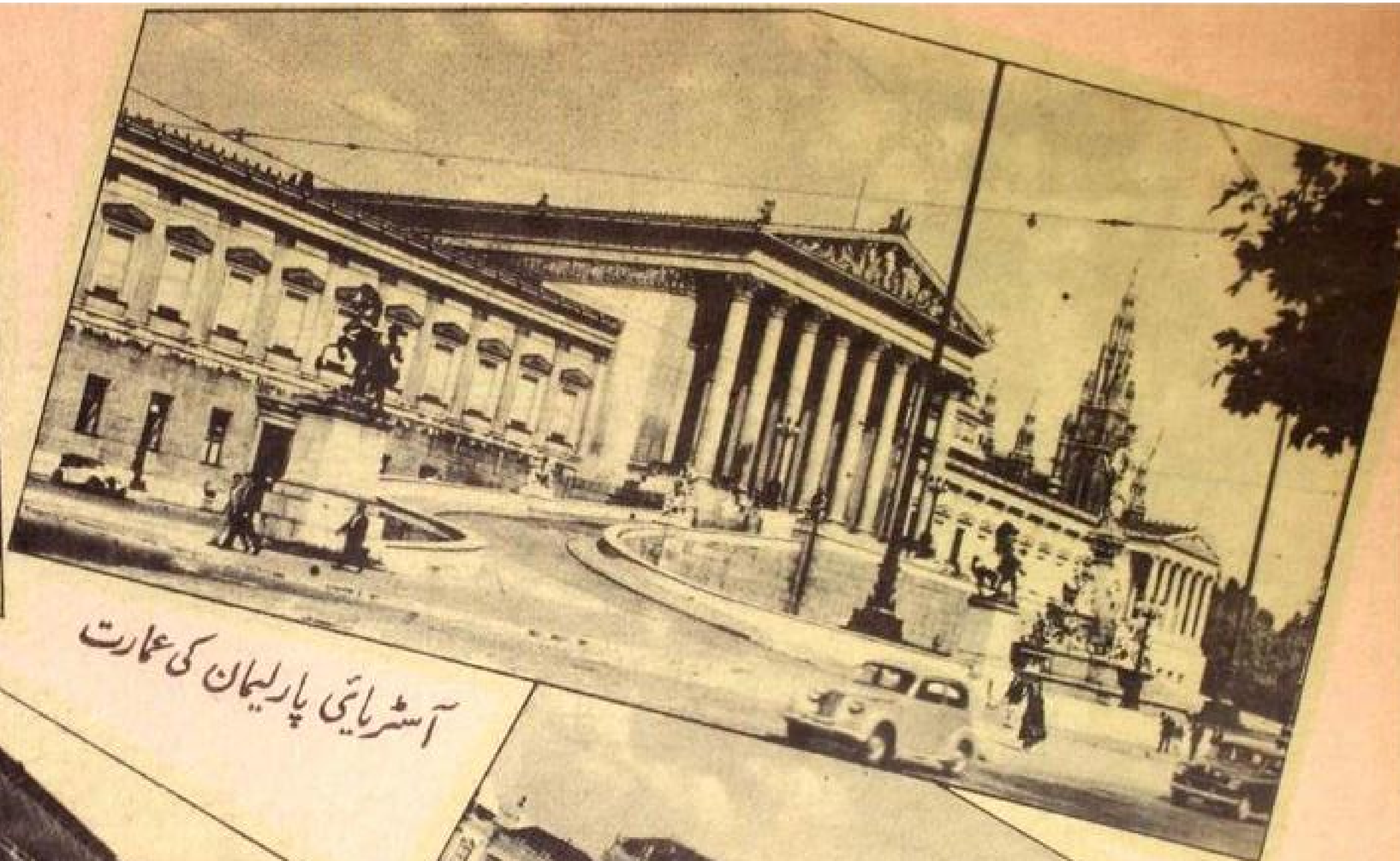
غرض یہ کہ یہ سیر و تفریح بہت ہی دلچسپ، پُرلطف اور معلومات افزا رہی۔

واپسی پر بس خراب ہوگئی اور پھر اتوار کی وجہ سے سڑک پر اتنی موٹریں وغیرہ تھیں کہ آگے پیچھے حدِ نظر تک بس موٹروں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ غنیمت ہے کہ یہاں پاکستان میں چلنے والی گدھا گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں یا ہندوستان کی بیل گاڑیوں جیسی کوئی چیز نہیں ہے، ورنہ قیامت برپا ہوجاتی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے فاصلوں کے لیے بھی بار برداری کی خاطر تیز رفتار ٹرک چلتے ہیں۔ گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے واپسی بجائے ۷ بجے کے ½۸ بجے شب ہوئی۔

صوبہ ویانا: میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اسے ایک صوبہ سمجھا جائے، یا محض ایک شہر، کیونکہ اس کا رقبہ صرف ایک سو ساٹھ مربع میل ہے اور اس کے برعکس آبادی ۱۶ لاکھ ۱۶ ہزار ایک سو ۲۵ ہے! شہر پناہ کے اندر دو پہاڑیاں —— کہلن برگ اور لیوپولڈ برگ —— بھی واقع ہیں، جن سے کافی زمین گھر گئی ہے، لیکن یہ پہاڑیاں مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتی ہیں اور جب ستمبر ۱۶۸۳ء میں ترکوں نے اس ملک پر حملہ کیا تھا تو انھی پہاڑیوں سے آسٹریا کی فوج نے جوابی حملے کیے تھے۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں انگور کی بیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں اور ان تاکستانوں کے مالک بھی وہیں ڈیرے ڈالے رہتے ہیں۔ آج کے دورے میں ویانا کی اس عجیب بات کا اندازہ ہوا ہے کہ قدیم اور جدید طرزِ تعمیر کے نمونے یکجا ملتے ہیں۔ مثلاً شہر کے بالکل وسط میں ایک گرجا گھر ہے جو بالکل نئی وضع کا ہے اور اسی کے پہلو میں چند شاہی محلات ہیں جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی یاد دلاتے ہیں جبکہ یہ محلات انسانوں سے آباد تھے اور عجائب گھر نہیں بنے تھے، یا جب بہت سے سرکاری دفاتر ان میں قائم نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ان کی تاریخی اہمیت کو پھر بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ مثلاً جس عمارت میں وزارتِ تعلیمات کے دفاتر ہیں، اس کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا ہے کہ یہاں خانوادۂ موڈنیا کے فرمانروا رہتے تھے۔ یا ایک محل کا وہ حصہ جہاں وفاقی حکومت کے صدر غیر ملکی نمائندوں سے اسنادِ سفارت قبول کرتے ہیں، کبھی ملکہ ماریا تھریسا کی خواب گاہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بمباری کے باعث ویانا کو سخت نقصان پہنچا تھا، لیکن آج اس کے آثار ذرا بھی نظر نہیں آتے۔ باشندگانِ ملک نے اپنی سعی و کاوش سے قومی زخموں کو جلد مندمل کر دیا ہے۔ شاہی اوپیرا —— برگ تھیٹر —— جو بالکل منہدم ہوگیا تھا، قدیم شان و شوکت کے ساتھ دوبارہ تعمیر ہوگیا ہے۔ پارلیمان کے دونوں ایوان ایک یونانی عبادت گاہ کے طرز پر نئے سرے سے آراستہ کیے گئے ہیں۔ بے خانماں لوگوں کی آبادکاری کے لیے نئی وضع کے سینکڑوں مکان بن گئے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ سارے شہر میں زندگی تھکی ماندی نظر آنے کے بجائے ناچتی، گاتی، گنگناتی دکھائی دیتی ہے۔



شوئن برن



آسٹریائی پارلیمان کی عمارت



ویانا کا اوپیرا ہاؤس



بلوے دیر محل - ویانا

دنیائے موسیقی کے صدر مقام کی حیثیت سے دیانا یورپی ثقافت کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اس شہر کی قدیم شکستہ حال فصیل تصویر حیرت بنی کھڑی ہے۔ وہ انسان کے عروج و زوال، اس کی کامرانیوں اور ناکامیوں، فتح و شکست، زندگی کی مسرتوں اور صعوبتوں کو بہت قریب سے دیکھتی رہی ہے۔ اس نے قوموں کو بنتے بگڑتے اور پھر بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ اس نے شہرۂ آفاق ہستیوں کا آغاز اور انجام دیکھا ہے۔

یہی وہ مقام ہے، جہاں سے ہونہار موزارٹ دنیائے موسیقی کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا، اور جب نصرت و کامرانی کی دیوی کو ہمرکاب لے کر واپس آیا تو عزیزانِ وطن نے جوشِ مسرت میں اسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور اس سے نغمے سنتے اور خود بھی گاتے رہے ——— اور پھر اسے بھول گئے اور جب عالمِ شباب ہی میں وہ غربت و افلاس اور بھوک پیاس کی شدت سے تنگ آکر فوت ہوا تو کسی لاوارث کی قبر میں اس کا لاشہ ڈال دیا گیا، جس کا اب نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں موزارٹ سے بھی زیادہ صاحبِ کمال مغنی بیتھوون بون دریا سے چلتا چلاتا آنکلا۔ وہ دیوتائے موسیقی کو فتح کرنے کی نیت سے آیا تھا اور خود یہاں کے دل کش مناظر سے مفتوح ہو گیا۔ یہیں رہ کر اس نے اپنا چھٹا راگ مرتب کیا جو صدیاں گزرنے کے بعد دلدادگانِ موسیقی کے نزدیک آج بھی الہامی سمجھا جاتا ہے اور جب اس نے نواں غیر فانی راگ چھیڑا تو ساری دنیا جھوم گئی اور وہ حسرت و یاس سے سب کی طرف نظریں اٹھائے تکتا رہا۔ کیوں کہ وہ خود کوئی تان اپنے نغمے کی سن نہیں سکتا تھا۔ قدرت نے پہلے ہی اس کو سماعت سے محروم کر دیا تھا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں جوزف ہیڈن، قوم کا حجام خالقِ نغمات کہلایا اور جب اسے اپنی دکان میں گاہکوں کو خوش کرنے کے بہت عرصے بعد شاہی دربار میں باریابی کا موقع ملا تو جاہ و ثروت کے دروازے اس پر کھل گئے اور وہ سر مونڈنے کے بجائے کیفیتِ سُکرِ نغمات سے سب کو سرشار کرنے لگا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں شوبرٹ جیسا باکمال شاعر صدائے قلب کو مبہم الفاظ کا جامہ پہناتا رہا۔ اور واضح طور پر اپنے مصائب و آلام کی شکایت کبھی زبان پر نہ لایا اور جب مرا تو اَنمٹ حروف کی طرح اس کے لافانی کلام کا تاثر لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے جاگزیں ہو چکا تھا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے اوپیرا کے فن نے جنم لیا اور المانوی ٹھپہ لگنے کے بعد تمام یورپ اور پھر سارے جہان میں مقبول و معروف ہو گیا۔ ہر چند کہ ان دنوں اوپیرا ہو رہا تھا اور اس کے قدم آدم

پوسٹر شہر بھر میں لگے ہوئے تھے مگر ہم اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، اس لیے اس کو ہم نہ دیکھ سکے۔ ڈنمارک کے مشہور ستارہ شناس کیپلر نے اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنایا اور اپنا راستہ بھول کر سیارگان فلک کی گزرگاہوں کا پتہ لگاتا رہا۔ جرمنی کا عظیم ترین مصور ڈوور مستقل طور پر یہیں آباد ہو کر دل کش رنگوں اور خطوں کی صورت میں اپنے عمیق تصورات کو سطحِ قرطاس پر نقش کرتا رہا۔ اس کی فنی تخلیقات کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی جگہ کے نوادر میں شامل ہے۔

اور فلورنس کے زوال کے بعد جب یورپ کی مسندِ علوم و فنون خالی رہ گئی تو ویانا نے اپنے خصوصی ماہرین پیش کر کے اس خلا کو پر کیا۔ علم طب کو جو ترقی و عروج اس شہر میں نصیب ہوا، اس کی نظیر یورپ میں کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ بہت سی بیماریوں کے جراثیم کا کھوج لگانے والا حکیم سیل ویز یہیں پیدا ہوا اور انھی جراثیم سے فوت ہوا جن کا پتہ خود اس نے چلایا تھا۔ بہت سے اور ماہرین نے علاج معالجے کے نئے طریقے اور اسلوب معلوم کیے اور خصوصاً کائناتی شعاعوں کے صحیح استعمال کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ عظیم مفکر فرائڈ جس نے فلسفہ و نفسیات کی دنیا میں حقیقتوں کا انکشاف ایک نئے انداز میں کیا، آسٹریائی نژاد اور ویانا کا باشندہ تھا۔ اس نے ذہنِ انسانی کی کیفیتِ تحت الشعور (لاشعور) کو بے نقاب کیا اور ضمیر کی آواز کو دل کی گہرائیوں سے باہر کھینچ نکالا۔ یہ اور ان جیسی بہت سی ذی وقار ہستیاں ویانا کی خاک میں آسودۂ خواب ہیں۔

---

۳ ستمبر ۱۹۵۶ء — پیر

ویانا آنے کا بنیادی مقصد ہمارا یہ ہے کہ ہم طبّی تعلیم اور معالجے کے نئے رجحانات اور ترقیات کا گہرا مطالعہ کریں۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں دواسازی کے متعدد اور بے مثال ادارے دیکھنے میں آئیں گے اور ہم یہاں کے بعد جرمنی اور انگلینڈ جانے والے ہیں۔ پھر سوئزرلینڈ میں سیبا کمپنی دواسازی کے میدان میں نامور ہے اسے دیکھنے کا پروگرام بن ہی چکا ہے لیکن تعلیمِ طب کا جو نظام ویانا میں ہے یقیناً دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اس لیے چار دن جو ہمارے پاس باقی ہیں، انھیں اس مطالعے میں صرف کر دینا چاہتے ہیں۔

آج صبح ہی سے ہم انتخاب میں مصروف رہے۔ انتخاب کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ یہ تو کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم سارے کالج اور تمام اسپتال اور شفاخانے دیکھ ڈالیں، بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہاں کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ کریں۔ لہٰذا انتخاب کرنا پڑا کہ کون کون سے ادارے ہمارے لیے مناسب ہیں اور بس ان کے نام نوٹ کر لیے گئے۔

طب اور دواسازی: یوں تو آسٹریا میں تعلیمِ طب و دواسازی کا سلسلہ عرصۂ دراز سے قائم ہے لیکن جب ۱۹۴۰ء میں مرضیات کے اعتبار سے تشریحِ اعضا اور طبیعاتی تشخیص کو جدید طب کی بنیاد قرار دیا گیا تو اس ملک کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی اور اسی وقت سے غیر ملکی طلبا بھی وہاں آکر تعلیمِ طب حاصل کرنے لگے۔ وہاں تعلیمی نصاب کی مدت پانچ سال ہے جس کے بعد ڈاکٹر آف میڈیسن کی سند دی جاتی ہے۔ اس سے قبل ابتدائی اور ثانوی مدارس کی تعلیم سے فارغ ہونا ضروری ہے، جس میں ہر طالبِ علم کے کم سے کم تیرہ سال صرف ہوتے ہیں اور اگر وہ باقاعدہ ہر سال کامیاب ہوتا رہے تو عموماً اس کی عمر ۱۸-۱۹ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ طلبا کے شوق کو ابھارنے اور استعداد پیدا کرنے کے لیے ثانوی مدارس ہی میں اس موضوع کی تعلیم شروع کر دی جاتی ہے جسے طالبِ علم آگے چل کر بطورِ خاص اختیار کرتا ہے۔

میڈیکل کالج میں داخل ہونے سے پہلے میٹریکولیشن کی سند کے علاوہ ہر طالبِ علم کے لیے لازمی ہے کہ وہ لاطینی زبان بھی اچھی طرح سیکھ لے کیونکہ بعض کتبِ نصاب اسی زبان میں پڑھائی جاتی ہیں۔ مطالعۂ طب کے لیے لڑکوں اور لڑکیوں کو بلا امتیازِ جنس داخل کیا جاتا ہے، تاہم ایک تناسب قائم رکھنے

کے لیے ان کی تعداد مقرر ہو۔ پانچ سال کی مدتِ تعلیم کو دس میقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر سال موسمِ سرما میں اکتوبر کے آخر سے فروری کے شروع تک اور موسمِ گرما میں مارچ کے آخر سے جولائی کے شروع تک تعلیم ہوتی ہے۔ باقی عرصے تعطیل رہتی ہے۔ ہفتے میں کم و بیش بیس لیکچر ہوتے ہیں۔ عملی نصاب کے دنوں میں طلبا کو ہر لیکچر میں شریک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ درسی نصاب میں یہ پابندی زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ اسی اعتبار سے حاضریوں کا شمار ہوتا ہے۔ اگر عملی نصاب میں حاضری کم ہو تو آخری امتحان میں شریک ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔ پانچ میقات یعنی تقریباً ڈھائی سال ختم ہونے کے بعد یونیورسٹی کا پہلا امتحان لیا جاتا ہے جو زیادہ تر تحریری ہوتا ہے، البتہ تکمیل نصاب پر امتحان کا بڑا حصہ عملی ہوتا ہے۔ ہر طالبِ علم کو کئی کئی دن تک ایک ممتحن کے سامنے اس کے سوالات کے جواب دینے پڑتے ہیں۔ بیماروں کو دیکھ کر تشخیص امراض کرنی پڑتی ہے اور ان کے لیے مناسب دوا تجویز کرنی ہوتی ہے۔ انھیں ضروری ہدایات دینا اور جراحی کے کمرے میں اپنی استعداد کا ثبوت دینا بھی لازمی ہے۔

نصابِ تعلیم میں طب سے متعلق تقریباً سبھی موضوعات شامل ہیں مثلاً: عضویات و تشریح اعضا، مرضیات و تشریح امراض، علم الاعصاب، علم ترکیبِ جلد، علاج بذریعۂ عمل، علم العین، علم دنداں، علم خوناب یا کیلوس، وبائیات، جماعی امراض، نسوانی امراض، جراثیمیات، قانونِ طب، اصولِ دوا سازی وغیرہ۔ مدتِ تعلیم ختم ہونے اور امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد ہر طالبِ علم کو کم سے کم چار سال کسی اسپتال میں اعلیٰ اطبا کے ساتھ مل کر خدمات انجام دینی پڑتی ہیں، جن کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی خاص موضوع میں خصوصیت چاہتا ہو تو خدمات کی مدت چھے سال ہوتی ہے۔ اس کے بعد سرکاری طور پر اسے اجازت ملتی ہے کہ وہ اپنا مطب قائم کر کے علاج معالجہ شروع کر دے۔

نسوانی امراض بلکہ زچگی تک کی تعلیم مردوں کو بھی دی جاتی ہے کیونکہ بہت سے مشرقی ممالک کے رواج کے برعکس یورپ کے تقریباً تمام ملکوں کی طرح وضعِ حمل کے وقت یا نسوانی امراض بیان کرتے ہوئے عورتوں کا ڈاکٹروں سے رجوع کرنا وہاں بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

طبی تعلیم کے لیے ملک بھر میں تین یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک ویانا میں، ایک انس بروک میں اور ایک گراز میں۔ اول الذکر ۱۳۶۵ء میں، دوم ۱۶۶۹ء میں اور سوم ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ ان میں سے ویانا یونیورسٹی سے ہر سال تقریباً ایک ہزار اور باقی دو سے پانچ پانچ سو طلبا کامیاب ہو جاتے ہیں۔ سب سے کم فیس ویانا میں ہے یعنی صرف آٹھ سو شلنگ سالانہ وصول کیے جاتے ہیں۔ گراز میں نو سو اور انس بروک میں دو ہزار دینے پڑتے ہیں۔ ویانا یونیورسٹی میں اس وقت پورے اوقات کے ۴۹ اور جزوی

اوقات کے ۹۱ پروفیسر مقرر ہیں۔ انس بروک میں ان کی تعداد صرف ۳۰ اور ۱۰ہر گراز میں پورے اوقات کے ۵۰ پروفیسر ہیں۔ وزیر تعلیمات کے مشورے پر صدر جمہوریہ پروفیسروں اور لیکچراروں کو متعین کرتا ہے۔

ان سرکاری یونیورسٹیوں میں زیادہ تر ایلوپیتھی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہومیوپیتھی، بایوکیمک، طب یونانی اور قدرتی علاج کے طریقے بھی رائج ہیں اور وہ بھی خاصے مقبول ہیں۔ طب یونانی کے فروغ کے باعث بہت سے نباتاتی ادارے صرف جڑی بوٹیوں کی تجارت کرتے ہیں اور بعض مفردات غیر ملکوں سے منگا کر فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی طرح وہاں بھی غریب طبقے میں طب یونانی ہی کو ترجیح دی جاتی ہے اور غریب طبقے کے افراد کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

۱۹۵۵ء تک کے اعداد و شمار پر جب میں نے نظر ڈالی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس ملک کی کل آبادی ۶۹ لاکھ ۶۹ ہزار تھی اور سند یافتہ نیز سرکاری طور پر رجسٹر شدہ اطبا کی تعداد گیارہ ہزار ۹۲ تھی گویا بلحاظ تناسب ہر چھے سو ۲۸ باشندوں کے لیے ایک معالج موجود تھا۔

علاج حیوانات کے لیے بھی ویانا میں ایک کالج قائم ہے جو یورپ میں سب سے زیادہ قدیم اور بہترین تسلیم کیا جاتا ہے۔ مدتِ تعلیم ساڑھے چار سال ہے۔

حفظِ صحت کی تعلیم کے لیے بھی ایک علیحدہ کالج ہے جہاں دودھ، گوشت، سبزی اور پھل اور دیگر اشیائے خوراک کی دیکھ بھال اور معائنے کے قاعدے اور اصول سکھائے جاتے ہیں۔ سڑکوں، محلوں، اور نالیوں وغیرہ کی صفائی کے لیے تعلیم دی جاتی ہے۔ مدتِ تعلیم و تربیت صرف دو سال ہے۔

نوبل پرائز جیتنے والے آسٹریا کی طبی اور سائنسی ترقی کے اعلیٰ معیار کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دنیا کے اور علاقوں کے مقابلے میں یہی ایک ملک ایسا ہے جس کے باشندوں نے طبیعات، کیمیا، طب اور دواسازی کے میدانِ عمل میں اعلیٰ قابلیت و استعداد کا مظاہرہ کر کے سب سے زیادہ نوبل انعامات حاصل کیے ہیں۔

آسٹریا کا ماہر طبیعات لیسی میٹنر، جو زیادہ تر وطن سے باہر رہا، جدید ایٹمی تحقیقات کے میدان میں اپنی حیرت انگیز تحقیقات کے باعث شہرۂ آفاق ہو گیا ہے۔ ہنگری کے جارج فان ہولیسی نے، جسے تابکاری کی کیفیات معلوم کرنے کے نئے طریقے دریافت کرنے پر نوبل انعام ملا تھا، ویانا میں رہ کر اپنی تحقیقات شروع کی تھیں۔ امن کے دو انعامات کے علاوہ جو آسٹریا کے دو باشندوں برٹا فان سٹنر (۱۸۴۳ تا ۱۹۱۴) اور الفریڈ فرائڈ (۱۸۶۴ تا ۱۹۲۱ء) کو ملے تھے، اس ملک کے بارہ اور سائنسدانوں کو نوبل انعامات دیے گئے جن کی تفصیل یہ ہے:-

علاج معالجے کے ضمن میں: ۱۹۱۴ء میں رابرٹ بارانی کو (۱۸۷۶ء تا ۱۹۳۶ء) انھوں نے دماغی پردوں اور جھلیوں کے بارے میں نئے انکشافات کیے۔

۱۹۲۶ء میں ژولی ویگنر جورگ کو (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۰ء) انھوں نے فالج کے علاج کا ایک نیا طریقہ معلوم کیا۔

۱۹۳۰ء کارل لینڈ اسٹینر کو (۱۸۶۸ء ۱۹۴۳ء) انھوں نے خون کے مختلف ذرات کے بارے میں تحقیقات کیں۔

۱۹۳۶ء میں اوٹو لوایوی کو (پیدائش ۱۸۷۳) انھوں نے بتایا کہ انسان کی رگوں اور پٹھوں پر کیمیادی اشیا کا کیا اثر پڑتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں دو انعامات کارل ایف اور گرٹی کوری کو (دونوں کی پیدائش ۱۸۹۶ء) انھوں نے انزائم (خمیر) کے بارے میں اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کیے۔

طبیعات کے ضمن میں: ۱۹۳۰ء میں اروِن شرو ڈنگر کو (پیدائش ۱۸۸۷ء) انھوں نے چیزوں کی مقدار معلوم کرنے سے متعلق نظریہ پیش کرنے میں حصّہ لیا۔

۱۹۳۶ء میں وکٹر ھیس کو (پیدائش ۱۸۶۳ء) انھوں نے کائناتی شعاعوں کے انعکاسات کا حال معلوم کیا۔

علم الکیمیا کے ضمن میں: ۱۹۲۳ء میں فرٹز پریگل کو (۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۰ء) انھوں نے مائکرو کیمیکل تجزیات کو ترقی دی۔

۱۹۲۵ء میں رچرڈ زگمونڈی کو (۱۸۶۵ء تا ۱۹۲۹ء) انھوں نے ناپ تول کے نئے طریقے معلوم کرکے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

۱۹۳۸ء میں رچرڈ کہن کو (پیدائش ۱۹۰۰ء) انھوں نے حیاتین کے بارے میں نئی تحقیقات اور نظریے پیش کیے۔

۱۹۴۵ء میں وولف گانگ پاؤلی کو (پیدائش ۱۹۰۰ء) انھوں نے بھی چیزوں کی مقدار معلوم کرنے کے بارے میں بالکل ہی نیا نظریہ پیش کیا، جو "اصولِ پاؤلی" کے نام سے مشہور ہوگیا ہے۔

سفارت خانۂ ہند میں: بھائی جان محترم کے پاس بھارت کے وزیر خارجہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کی طرف سے سفیرِ ہند متعینہ آسٹریا کے نام ایک تعارفی خط موجود تھا۔ لہٰذا ہم نے طے کیا کہ ان سفیر صاحب سے ملا جائے اور ان کی مدد سے خاص خاص ادارے دیکھے جائیں۔ چناں چہ

امریکن ایکسپرس کے ذریعے زیورخ پہنچنے کے لیے نشستیں بُک کرانے کے بعد ہم سفارت خانۂ ہند پہنچے۔ سفیر صاحب کا صدر مقام برن (سوئزرلینڈ) ہے۔ یہاں شارج ڈی آفیئر مسٹر رگھون کام کر رہے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ مدراسی علاقے کے معلوم ہوتے ہیں۔ لمبے تڑنگے آئی سی ایس قسم کے آدمی ہیں۔ بات کا انداز ایسا ہی ہے جیسے انگریزوں کے زمانے میں پرانے آئی سی ایس کیا کرتے تھے۔ ہم نے اُردو میں بات چیت شروع کی، مگر انھوں نے اوّل تا آخر انگریزی میں خطاب کرنا پسند کیا۔ ایسے موقعوں پر میرے انگریز اتالیق کی تعلیم کام آجاتی ہے اور میں اپنے لہجے اور زبان کو موڑ کر انگریزی لب و لہجہ اختیار کرنے کی کامیاب کوشش کر لیتا ہوں اور کم از کم سامنے والا میری زباں دانی کا قائل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ میں نے یہاں بھی یہی کیا۔ مجھے یہ مشق اس لیے ہے کہ میں برسوں انگریز اُستادوں سے بولنے کی مشق کرتا رہا ہوں۔ مگر بولنے کی مشق کے ساتھ ساتھ میں اپنا مطالعہ وسیع کرنے کے لیے خاطر خواہ وقت نہ نکال سکا۔ اس لیے لہجہ تو صحیح ہو گیا لیکن زباں دانی کا کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

خیر تو رگھون صاحب نے واقعی بڑی مدد کی اور انھوں نے دو کمپنیوں سے آج کا ڈھائی اور پانچ بجے کا وقت مقرر کرا دیا اور طے کیا کہ اسپتال اور یونیورسٹی دیکھنے کا پروگرام کل سے شروع ہو۔ ہم سے کہا کہ آپ لنچ کے لیے اپنے ہوٹل جائیے اور میں سارا پروگرام مکمل کر کے اطلاع دیتا ہوں۔

کیموٹریکا، ڈھائی بجے ہم کیموٹریکا پہنچے۔ اس فرم کا نام مجھے پاکستان میں جناب وزیر آسٹریا نے ازراہِ کرم دیا تھا۔ نیز دہلی کے آسٹریائی سفارت خانے نے بھائی جان محترم کو دیا تھا۔ رگھون صاحب نے بھی ان کا پتہ دیا، مگر ہم ان کے ہاں پہنچے تو انکشاف ہوا کہ یہ تو یوگوسلاویہ سے مفردات درآمد کرتے ہیں اور آسٹریا کے دواسازوں کو فراہم کر دیتے ہیں اور بس۔ البتہ ایک ”سولونٹ“ یہ بناتے ہیں، جو دواسازی اور اشیائے افزائش حسن بنانے میں کام آتا ہے۔ ہم نے ان کے ہاں شوکیس میں مفردات دیکھے۔ بہت سے تو ہم پہچان گئے اور ہم نے اُن سے درآمد و برآمد کے موضوع پر بات چیت کی۔ ان سے کہا کہ ہم ہندستان یا پاکستان سے بعض مفردات بھیج سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے انھیں خاص دلچسپی ہوئی۔ سیاہ مرچ، سرخ مرچ اور مالٹے کے چھلکے، الائچی خورد اور سونٹھ وغیرہ یہ چاہتے تھے اور نرخ متوازن ہو تو بھارت یا پاکستان سے منگوانا چاہتے تھے۔ ہم نے کہا کہ آپ اپنی ضرورت لکھ بھیجیے۔ ہم نمونے اور نرخ روانہ کر دیں گے۔

رگھون صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ بھارت کے پاس افیون کی شاید ڈیڑھ ٹن مقدار فاضل ہے۔ آسٹریا میں کوڈین وغیرہ بنانے کے لیے کیموٹریکا افیون ترکی اور یوگوسلاویہ سے منگواتے ہیں۔ ذرا

"بائی دی وے" معلوم کر لیجیے کہ ترکی اور یوگوسلاویہ کے نرخ کیا ہیں تاکہ بھارت ان کو پیش کش بھیج سکے۔
میں نے کمپنی کے سربراہ ڈاکٹر میک چیف سے اس موضوع پر بات کی۔ افیون کا نام آتے ہی وہ، ان کی سکریٹری اور ایک چیف کیمسٹ صاحب جو ہمارے ساتھ شریکِ گفتگو تھے، بے حد دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ سب انگریزی زبان واجبی ہی جانتے ہیں۔ بمشکل مطلب ادا ہو سکا، لیکن یہ ہوشیار لوگ نرخ بتانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ میں نے بہر حال ان سے یہ کہہ دیا کہ ہمارے پاس ایک ٹن افیون ہے وہ فوراً فرمائش بھیجیں۔ انھوں نے نمونہ دیکھنے کے لیے کہا ہے۔

کیموڈیکا کے شوروم اور دفاتر وغیرہ سب ایرکنڈیشنڈ ہیں۔ مفردات کے شوکیسوں کا انداز پسند آیا۔ طریقہ یہ ہے کہ ۹ × ۹ انچ کے خانے بنائے گئے ہیں۔ اوپر کے ایک خانے میں مفرد دوا کے پودے کا فوٹو ہے اور اس کے نیچے اصل دوا رکھی گئی ہے۔

دیکھا جائے تو کیموڈیکا میں کوئی کام کی بات نہیں ہوئی اور ہم ایک گھنٹے بعد یہاں سے واپس ہوئے اور ہوٹل چلے گئے، تاکہ سفارت خانۂ ہند سے کل کا پروگرام معلوم کر لیں۔ چنانچہ ٹیلی فون کیا سفارت خانے میں ایک آسٹریائی خاتون انگریزی خوب بول لیتی ہیں۔ رگھون صاحب نے یہ انتظام کیا کہ یہ خاتون کل نو بجے سے ہمارے ساتھ رہیں گی۔ پہلے اسپتال دیکھے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے وقت مقرر کر لیے ہیں۔ یہ پروگرام نہایت معقول ہے۔ اس طرح ہم قلیل وقت میں زیادہ چیزیں دیکھ سکتے ہیں۔

الپائن: الپائن کا پتہ کراچی، دہلی اور ویانا کے سفارت خانۂ ہند تینوں جگہ سے ملا۔ ان سے پانچ بجے کا وقت طے تھا۔ ہم وقتِ مقررہ پر ان کے ہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر ایلز کو کارڈ بھیجے۔ وہ ذرا مصروف تھے۔ تاہم چند منٹ میں خود باہر آئے اور دس منٹ منتظر رہنے کے لیے کہا۔ انھوں نے معذرت کے ساتھ بتایا کہ وہ ایک نہایت اہم کام کر رہے ہیں۔ وہ عمدہ انگریزی بول رہے تھے۔ اندازہ ہوا کہ خاص تجارتی اور بہت تیز آدمی ہیں اور جب ہم دس منٹ بعد ان سے ملے تو انھوں نے انگریزی سے اپنی ناواقفیت کی معذرت چاہی، حالاں کہ وہ خاصی عمدہ انگریزی بول رہے تھے۔ ڈاکٹر ایلز نے جلد ہی بتا دیا کہ وہ دوا ساز نہیں ہیں بلکہ شیرنگ کمپنی (برلین) کے ایجنٹ ہیں۔ ہمیں ایک بار پھر مایوسی ہوئی اور صبح جو بات طے کی تھی کہ دوا سازی کے ادارے یہاں نہ دیکھے جائیں، وہی صحیح تھی۔ ہم نے آج کا نصف دن ضائع کر دیا اور ہمیں اس کا بڑا افسوس ہوا۔

پروگرام کی شکل کچھ اس طرح بگڑ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شام سے کس طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ ہم

آٹوبس کے دفتر گئے۔ ان کے پروگرام میں "ویانا بائی نائٹ" ہوتا ہے جو ۸½ بجے شروع کیا جاتا ہے۔ سوچا کہ رات ویانا کی سیر کی جائے۔ تفصیلات معلوم کیں تو پتہ چلا کہ ۸½ بجے ان کے دفتر جائیے، پھر فلاں جگہ پہنچ کر ڈنر کھائیے، فلاں جگہ ٹھیر کر ایک جام شراب نوش کیجیے، بارہ بجے تک ویانا کی روشنی دیکھیے اور پھر فلاں نائٹ کلب میں جاکر دادِ عیش دیجیے۔ پروگرام ۱½ بجے ختم ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ یہ سیر ہوئی یا عیاشی۔ اور پھر نائٹ کلب کی عریانی اور رنگینی اگر دیکھنی ہے تو اس کے لیے صحیح مقام پیرس ہے۔ یہ پروگرام پسند نہیں آیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بازاروں میں خوب پیدل گھوما جائے اور دکانوں کی سجاوٹ کے انداز ذہن نشین کیے جائیں تاکہ اپنے دواخانوں کے انداز کو آئندہ بدلنے میں سہولت ہو۔ آٹھ بجے یہ فیصلہ کیا کہ اگر آسٹریا کی بنی ہوئی کوئی فلم یہاں کے ماحول و زبان میں ہو تو آج دیکھ لی جائے، کیونکہ کل جو دیکھنا ہے اسے ہضم کرنے کے لیے شام خالی چاہیے۔ معلوم ہوا کہ کوئی فلم جرمن زبان میں یا آسٹریا کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ امریکی اور انگریزی فلمیں ہیں جو جرمن زبان میں "ڈب" کر دی گئی ہیں۔ ہم نے نہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

ہوٹل واپس پہنچے اور رات گئے تک ہم دونوں بھائی آئندہ کا پروگرام بناتے رہے اور کچھ مطالعہ بھی کیا۔ آج کا کھانا چونکہ بہت ردی اور ثقیل قسم کا تھا، اس لیے اسے تحلیل کرنے کے لیے بھی کچھ دیر جاگنا پڑا۔ گیارہ بجے سو گئے۔

محسوسات: ایک چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ عورتیں ہر شعبے میں بڑی کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ اب تک ہم جہاں گئے ہم نے عورتوں کو پیش پیش پایا۔ دکانوں پر اکثر جگہ عورتیں ہی خرید و فروخت کر رہی ہیں۔ استقبالیہ پر اکثر عورتیں ہیں۔ ہوٹل ڈی فرانس میں جہاں ہم ٹھیرے ہوئے ہیں، عورتیں ہی محاسب اور منتظم ہیں۔ کمروں کی دیکھ بھال اور صفائی تک پر عورتیں مامور ہیں۔ ایک سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں نے عورتوں کو تیز رفتار دیکھا۔ بازاروں میں وہ چلتی نہیں، حقیقتاً بھاگتی ہیں۔ ہر لمحہ کوئی نہ کوئی عورت بھاگ کر کہیں جاتی یا سواری پکڑتی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس مردوں کی رفتار اور چال ڈھال میں یہ بات نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ زبان کا مسئلہ بہت پریشان کن ہے۔ ہم اپنی بات کسی کو سمجھا نہیں سکتے، ورنہ اس کے اسباب ضرور دریافت کرتے۔

بچوں کے کھیل کود کے لیے پارک جگہ جگہ ہیں۔ بچے اکثر باسکٹ بال کھیلتے دکھائی دیے۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی سڑکوں پر خوبصورت پارک بنے ہوئے ہیں اور کافی تعداد میں بنچ موجود ہیں جہاں لوگ سستاتے نظر آتے ہیں۔ اکثر پارکوں کے ساتھ ریستوراں موجود ہیں۔ کئی بڑی سڑکیں ایسی دکھائی دیں جن کی پٹڑیاں بہت چوڑی ہیں اور ان پر گھاس لگی ہوئی ہے اور درختوں کا مسلسل سایہ ہے اور

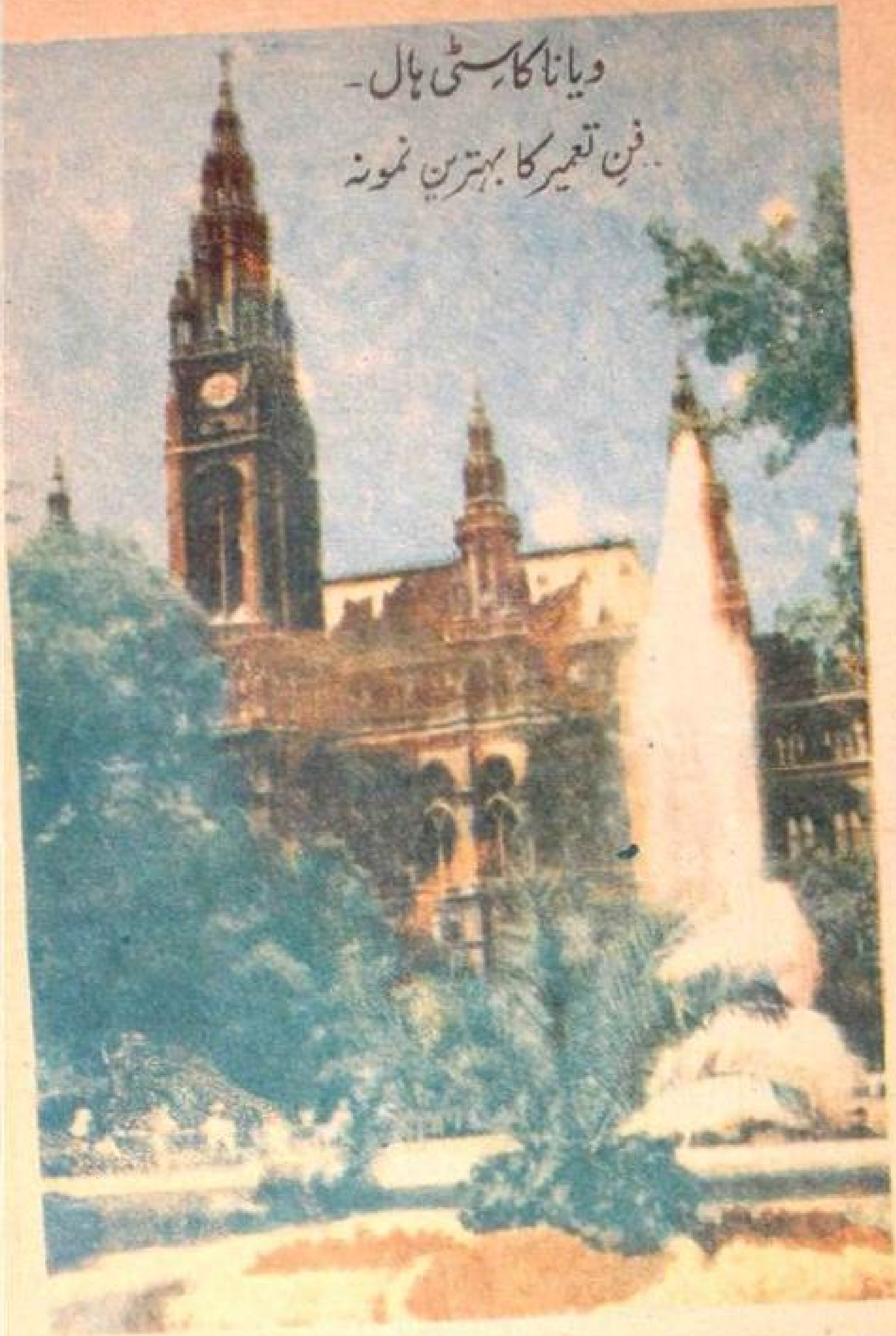
ذرا ذرا سے فاصلے پر بنچ پڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً سٹی ہال کو جانے والی سڑک اسی قسم کی ہے اور بڑی حسین ہے۔ ایسی سڑکوں کی گھاس اور درختوں کو باقاعدہ پانی دیا جاتا ہے۔ پانی دینے کا طریقہ ایسا ہے کہ چلنے پھرنے اور بیٹھنے والوں کو ذرا تکلیف نہیں ہوتی۔

صفائی: سڑکیں بہت صاف اور پاکیزہ ہیں۔ ان پر کوڑا کرکٹ مطلق نظر نہیں آتا۔ یقیناً لوگ اس کے عادی ہیں کہ سڑکوں پر کوئی چیز نہ پھینکیں۔ مجھے کسی سڑک پر کاغذ کا پُرزہ تک پڑا ہوا نظر نہیں آیا، حالاں کہ بعض سڑکوں پر مسلسل موٹریں چلتی ہیں اور ان کے ساتھ پٹریوں پر چلنے والوں کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ایسی سڑکوں کا یہ حال ہے جیسے کوئی دھو کر صاف کر کے ابھی گیا ہے۔ میں نے کسی شخص کو سڑک یا پٹری پر تھوکتے بھی نہیں دیکھا۔ البتہ جگہ جگہ سڑکوں پر اور پارکوں وغیرہ میں جالی کی ٹوکریاں آویزاں ہیں۔ لوگ ان میں ردّی کاغذ ڈالتے ہیں۔

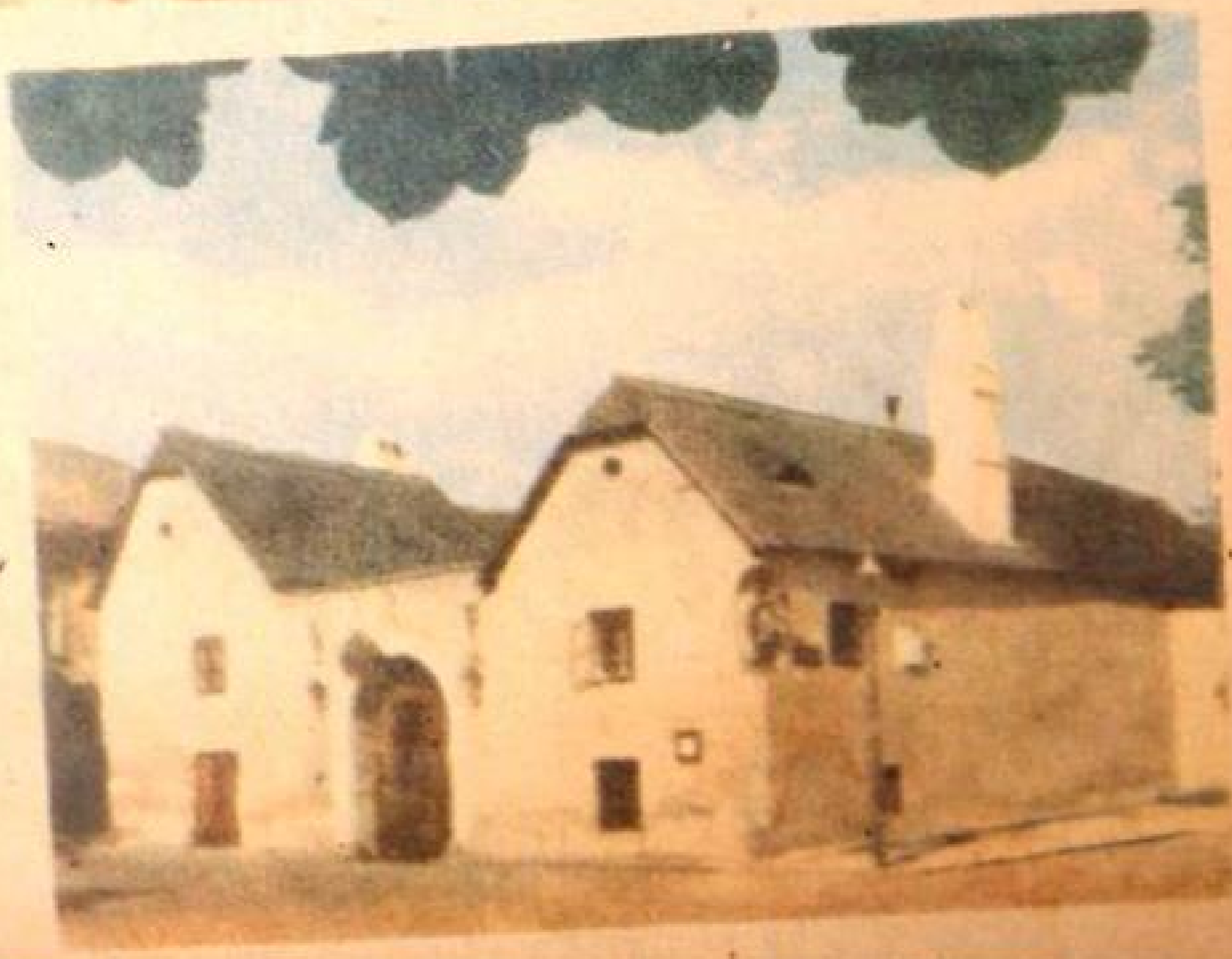
آپ اگر بازار میں سے گزریں تو "تباک" کے نام کے بورڈ قدم قدم پر دیکھیں گے۔ یہ سگریٹ، تمباکو، سگار کی دکان ہے۔ لوگ سگریٹ کافی پیتے ہیں، مگر سڑکوں پر سگریٹ کا جلا ہوا ٹکڑا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ لوگ عموماً سڑک پر چلتے وقت سگریٹ نہیں پیتے۔ وہ یا تو دکان ہی پر کھڑے ہو کر یا روش پر بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر پیتے ہیں۔

ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے۔ آج ہمیں یہاں آئے پورے چار دن ہو رہے ہیں ہمیں کوئی فقیر بھیک مانگتا نظر نہیں آیا۔ انگلستان وغیرہ کی طرح بھی نہیں کہ دیا سلائی کے بکس وغیرہ ہاتھ میں لے کر پھر رہے ہیں اور ٹوپی پھیلا رکھی ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ ان کا مقصد بھیک مانگنا ہے۔ یہ بات بھی یہاں نظر نہیں آئی۔ اس کا مطلب عام خوش حالی لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ قومی غیرت کے ماتحت ایسا نہیں کرتے۔ گمان غالب ہے کہ شہر میں محتاج خانے ضرور ہوں گے اور وہاں ایسے لوگوں سے جو کوئی روزگار حاصل نہیں کر سکتے، باقاعدہ کام لے کر معاوضہ دیا جاتا ہوگا۔ اس بارے میں تحقیقات کا موقع نہیں ملا۔

صحتِ عامہ: ایک یہ چیز نوٹ کرنے کی ہے کہ یہاں کے لوگ شاید رہائشی زندگی میں ہوا سے گھبراتے ہیں۔ اب تک جہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا، کھڑکیاں اور دروازے بند پائے۔ کھڑکیوں پر ڈبل دروازوں کے ساتھ شیشے والے کواڑ لگے ہوئے ہیں مگر ان کو کھولا نہیں جاتا۔ ہمارے ہوٹل میں بھی یہی حال ہے۔ مثلاً کھانے کا کمرہ بڑا عظیم الشان ہے یعنی بہت بڑا ہال ہے۔ اس میں قدِ آدم کھڑکیاں ہیں، مگر کسی وقت انھیں کھولا نہیں جاتا۔ موٹروں اور ٹیکسیوں تک کے شیشے چڑھے رہتے



ویانا کا سٹی ہال۔
فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ



ویانا کے مشہور مغنی
بیتھوون کی قیام گاہ

ہیں۔ بسوں کا بھی یہی حال ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ قدرے گرم ہوا چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لو ہے۔ یہاں کے لوگوں نے ایسی ہوا کو بالعموم پسند کیا۔ مگر اس کے باوجود دروازے کھولنے کی نوبت نہیں آئی۔

جہاں تک صحتِ عامۃ کا تعلق ہے، مجھے کمزور آدمی خال خال نظر آئے۔ کچھ وقت تو میں نے لوگوں کے چہرے اور جُثّے دیکھنے میں صرف کیا۔ میں نے عام طور پر ان کو سرخ و سفید اور تنومند پایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں عوام کی صحت بالعموم اچھی ہے۔

نلوں میں جو پانی آتا ہے وہ خوب تیز ٹھنڈا اور ہلکا نفیس ہوتا ہے۔ یہ شاید کوہستانی ہوا کا اثر ہے۔ آج کل دوپہر کو تو ذرا گرمی رہتی ہے لیکن صبح و شام خنک ہوا چلتی ہے اور رات کو باقاعدہ کمبل اوڑھنا پڑتا ہے۔ ہوا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ خواہ مخواہ لمبے گہرے سانس لینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ بات کہیں اور محسوس نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کی صحت بخش کیفیت دل و دماغ پر حاوی ہے۔

---

۴ ستمبر ۱۹۵۶ء ـــــ منگل

سال گزشتہ اس کا بڑا چرچا تھا کہ ویانا کے سارے اسپتال شہر سے ذرا باہر نئی عمارتیں بنوا کر ان میں منتقل کر دیے جائیں اور ان کو جدید انداز میں آراستہ کیا جائے۔ مگر یہ اسکیم آگے نہیں چل سکی۔ ممکن ہے زیر غور ہو۔ بھارتی سفارت خانے کی سکریٹری مسز گڈرم کوالمبر، جو ایک جرمن خاتون ہیں، آج ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ انگریزی خوب بول لیتی ہیں۔ ویانا میں پچھے سال سے بھارت کا سفارت خانہ قائم ہے۔ یہ اسی وقت سے کام کر رہی ہیں۔ مسٹر رگھوبن گو بہت ہی خشک قسم کے آدمی ثابت ہوئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے ہماری مدد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے مسز کوالمبر کو بطور ترجمان ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دے کر ہم پر بڑا کرم کیا ہے۔

جنرل اسپتال: پروگرام کے مطابق ہم نو بجے جنرل اسپتال پہنچ گئے۔ یہاں اسپتال کے اسسٹنٹ منیجر نے، جو خود بھی ڈاکٹر ہیں، ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ افسوس ہے کہ میں ان کا نام یاد نہ رکھ سکا۔ کل ان سے بچوں کے اسپتال کا معائنہ کرنے کے سلسلے میں پھر ملاقات کرنی ہے، لہٰذا کل ان کا نام ضرور معلوم کر لینا ہے۔ یہ ایک بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ پستہ قد، ملبوتری ناک، رخساروں پر باریک شریانیں (عروقِ شعریہ) دوڑ رہی ہیں۔ بال بھورے، پُتلیاں نیلگوں، پلکیں بھوری، چہرے پر سنجیدگی کے آثار، مجسمۂ شرافت۔ یہ انسان اسپتال کے مختلف شعبے دکھاتا پھرا۔ خود انگریزی زبان صرف چند جملوں کی حد تک جانتے ہیں۔ مسز کوالمبر ترجمان بنی رہیں۔

یہ اسپتال ۱۷۸۶ء میں قائم ہوا تھا۔ عظیم الشّان عمارت ہے، مگر اب پرانی معلوم ہوتی ہے۔ تاہم اس کے پرانے پن میں عظمت ہے۔ غیر اقامتی مریض یہاں آکر اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ شاید ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔ ڈاکٹر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مریضوں کی کثرت کے باوجود دھکا پیل نہیں ہے۔ جگہ جگہ مریضوں کے لیے اخبارات بھی رکھے ہیں، جنھیں وہ اپنی باری آنے تک پڑھتے ہیں اور اخبارات اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔

ڈاکٹر موصوف اس پرانی عمارت سے نکال کر ہمیں اسپتال کے نئے وارڈ میں لے گئے، جو ۱۹۵۳ء میں تعمیر ہوا ہے۔ یہاں جدید ترین انکشافات اور تحقیقات کی روشنی میں کام ہوتا ہے۔ سرطان

کے علاج کے لیے آئسوٹوپ استعمال ہوتا ہے۔ آئسوٹوپ اسٹیشن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہوف مین سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس طریقۂ علاج کی وضاحت کی۔ یہ پتلے دبلے بلند قامت پروفیسر بڑی اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ ان کی بات میں صفائی ہے۔ یقیناً ان کا ذہن صاف ہے اور یہ اپنے موضوع پر مشتبہ نہیں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے شعبے کو اسپتال سے علیحدہ ایک دوسری عمارت میں ہونا چاہیے، لیکن یہ انتظام ابھی مکمل نہیں ہوسکا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جدید تحقیقات خود بھی پائے تکمیل کو نہیں پہنچی ہیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ آئسوٹوپ کے سلسلے میں کام کی ابتدا دراصل جرمنی میں ہوئی تھی لیکن جو حالات پیش آئے، وہ ظاہر ہیں۔ پھر اس موضوع پر زیادہ کام انگلستان میں ہوا ہے اور ہالینڈ بھی ساتھ ساتھ کام کر رہا ہے۔

یہاں سے ہم ایسے وارڈ میں گئے جہاں اکثر جگر کے مریض داخل ہیں۔ جگر کا مریض زبانِ حال سے اپنا مرض بتا دیتا ہے۔ اس کا چہرہ بھی کیفیاتِ درون کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس وارڈ کے زنانہ اور مردانہ حصے الگ الگ ہیں۔ مردانہ وارڈ میں ایک مریض کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ سروسس آف دی لیور کا مریض ہے۔ مریض کی کیفیت یہ تھی کہ اس کا پیٹ بہت بڑھ گیا تھا، اور اطراف پر اوزیما تھا۔ چہرے پر بھی اوزیمائی کیفیت تھی۔ آنکھیں زرد اور پیلی تھیں۔ میں نے اس مریض کا چارٹ دیکھا۔ وہ چھ ہفتے میں اپنا بارہ پونڈ وزن کھو چکا ہے۔ اب تک کوئی دوائی علاج شروع نہیں ہوا ہے۔ ہر لحاظ سے جانچ پڑتال اور معائنے ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر انچارج یہ نہیں بتا سکے کہ وہ اس مریض کو آخر کیا دوا دیں گے۔ ذاتی طور پر مجھے شبہ تھا کہ یہ مریض واقعی سروسس آف دی لیور میں مبتلا ہے۔ مگر میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس موقع پر مجھے اپنے شبہ کا اظہار کرنا چاہیے یا نہیں۔

دماغی عوارض کے مریضوں کا ایک مستقل اور بڑا وارڈ ہے۔ اس میں ڈھائی سو مریض داخل ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹر انچارج نے بتایا کہ نو دس ہزار غیر اقامتی مریض ہر سال اس وارڈ میں آتے ہیں دماغی عوارض سے مراد صرف دماغی خرابی نہیں ہے، بلکہ صرع (مرگی) کے مریض، دماغی رسولی کے مریض بھی اس صف میں شامل ہیں۔ یہ حصہ بھی زنانہ، مردانہ اور بچوں کے الگ الگ وارڈوں پر مشتمل ہے۔ بچوں کے وارڈ میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بچوں کے لیے ہے۔ دیواروں پر بچوں سے متعلق تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ کھلونے رکھے ہوئے ہیں۔ پورا ماحول بچوں کا ہے۔ اس شعبے میں بچوں کے کھیلنے کا کمرہ، سونے کا کمرہ اور پڑھنے کا کمرہ سب الگ الگ ہیں۔ ہمیں بتایا گیا

کہ ایک گھنٹے بعد ایک پروفیسر صاحب تعلیم دینے کے لیے آنے والے ہیں۔

کھیل کے کمرے میں بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ کوئی ریل گاڑی چلا رہا تھا، کوئی لٹو گھما رہا تھا۔ بعض بچے باہر گھاس پر کھیل رہے تھے۔

یہاں دستخطوں کے لیے ایک بڑا رجسٹر ہے۔ ڈاکٹر انچارج نے کہا کہ نئی زبان میں دستخط کیے جانے سے بچے بڑی دل چسپی لیتے ہیں۔ بھائی جان محترم نے انگریزی، اردو اور ہندی تین زبانوں میں دستخط کیے۔ میں نے اپنا نام عربی رسم الخط میں لکھ دیا۔

حفظِ صحت کا ادارہ: ایک بجے ہم اس اسپتال کو دیکھنے سے فارغ ہوئے اور ہوٹل آئے۔ مسز کوا ٹمبر نے وعدہ کیا کہ وہ لنچ کے بعد کل کے پروگرام کی تفصیل بتائیں گی۔ چناں چہ ان سے ٹیلی فون پر بات ہوئی اور آج بھی چار بجے انسٹی ٹیوٹ آف ہائجین کا پروگرام بن گیا۔ کل کے پروگرام کے لیے ہمیں شام کے وقت مسز کوا ٹمبر سے ملنا ہے۔ وہ شام تک مزید لائحۂ عمل تیار کریں گی۔

بڑی قباحت یہ ہے کہ ان دنوں تعطیلات بس ختم ہی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی آسٹریا نیز جنیوا میں کوئی کانفرنس ہے جہاں اکثر اداروں کے ڈین اور انچارج وغیرہ شرکت کے لیے گئے ہوئے ہیں لہٰذا بعض اداروں میں پوری طرح کام شروع نہیں ہوا ہے۔

آج چار بجے جب ہم انسٹی ٹیوٹ آف ہائجین دیکھنے گئے تو یہی صورت درپیش ہوئی۔ ڈائرکٹر صاحب کانگریس میں ہیں اور باقی کارکن ہنوز چھٹی سے واپس نہیں آئے ہیں۔ ایک ڈاکٹر صاحب ملے اور ایک خاتون جو خود بھی ڈاکٹر ہیں ہم سے ملیں۔ انھوں نے کہا کہ میں صرف راؤنڈ ہی دے سکتی ہوں۔ کسی چیز پر روشنی نہیں ڈال سکتی اور نہ کسی طریق کار کی وضاحت کر سکتی ہوں۔ ہم نے اس ادارے کے مختلف شعبوں اور تجربہ گاہوں کو دیکھا۔ مجموعی اعتبار سے یہ ادارہ خوب ہے۔ خصوصاً جدید حصے میں جو کام ہو رہا ہے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا اور لیڈی انچارج زبان نہ جاننے کی وجہ سے سمجھا بھی نہیں سکیں۔ مختلف شعبوں پر محض ایک سرسری نظر ڈالنے میں پون گھنٹہ صرف ہو گیا۔

شام کو ٹہلنے کے لیے ہم نے ایک نئی سڑک کا انتخاب کیا اور ایک گھنٹہ اس بازار میں چلتے رہے۔ یہ سڑک آخر کار وہاں آ کر مل گئی، جہاں ہم دو دن پھر چکے تھے۔ ۸½ بجے ہوٹل واپس آ گئے۔ میں نے یہ حالات لکھے اور اس کے بعد بھائی جان محترم کے ساتھ مل کر اگلے روز کے پروگرام پر غور کیا گیا۔

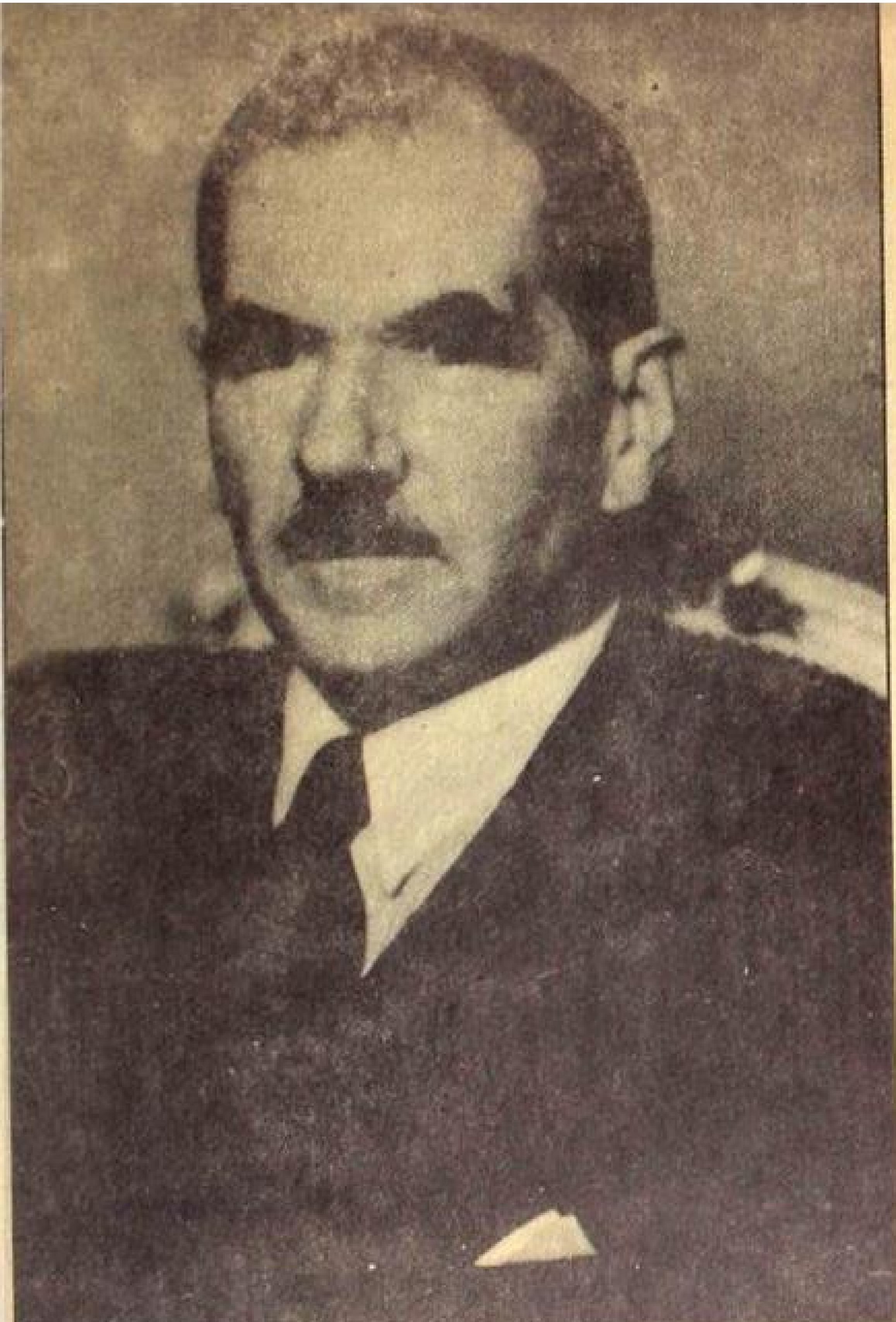
۵ ستمبر ۱۹۵۶ء ——— بدھ

آسٹرین کینسر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ: پروگرام کے مطابق آج کا دن بہت ہی مصروفیت کا ہے۔ لہٰذا ہم سویرے ہی نہا دھو کر اور ناشتے سے فارغ ہو کر چل پڑے۔ سب سے پہلے واہرنگ سٹراسے کے علاقے میں پہنچے، جہاں ایک ادارہ "انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل کیمسٹری" کے نام سے قائم ہے۔ اس کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر فرنز سیلخ ہیں، جو بلند قامت، پتلے دُبلے آدمی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت اُن کے ادارے میں سفیدی اور رنگ و روغن ہو رہا تھا۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور معذرت چاہی کہ تعطیلات اور کچھ آرائشی انتظامات کی وجہ سے ادارے کا سارا سامان اُلٹ پلٹ ہے اور وہ کوئی خاص چیز ہمیں نہیں دکھا سکے۔ پتہ چلا کہ اکثر اداروں کا تقریباً یہی حال ہے۔ دراصل ہم جیسے سیاحوں کے لیے جو تعلیم و تربیت کے ادارے دیکھنا چاہتے ہوں، یہ مہینہ زیادہ مناسب نہیں ہے، بلکہ جولائی، اگست اور ستمبر کے تین ماہ اسی طرح گزرے ہیں۔ البتہ پروفیسر موصوف نے بتایا کہ ایک پرائیویٹ ادارہ آسٹرین کینسر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قریب ہی ہے اور وہ خود اس کے شعبۂ تحقیقات کے سربراہ ہیں۔ اس کے ڈائرکٹر پروفیسر ڈینک ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو یہ ادارہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے اظہارِ شوق کیا۔ چنانچہ پروفیسر سیلخ ہمیں فوراً ہی اپنی موٹر میں بٹھا کر پروفیسر ڈینک کے ادارے میں لے گئے، جس کے نام کا تلفّظ ذرا مشکل سے ادا ہوتا ہے۔ بورڈ پر لکھا ہوا نام دیکھ کر ہم نے اسٹے اوسٹر کربس فورشنگز" پڑھا۔ پروفیسر سیلخ نے اس قدر جلد اپنی زبان سے ادا کیا کہ ہم پوری طرح سمجھ نہ سکے، اور دوہرانے کے لیے ان سے درخواست کرنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔

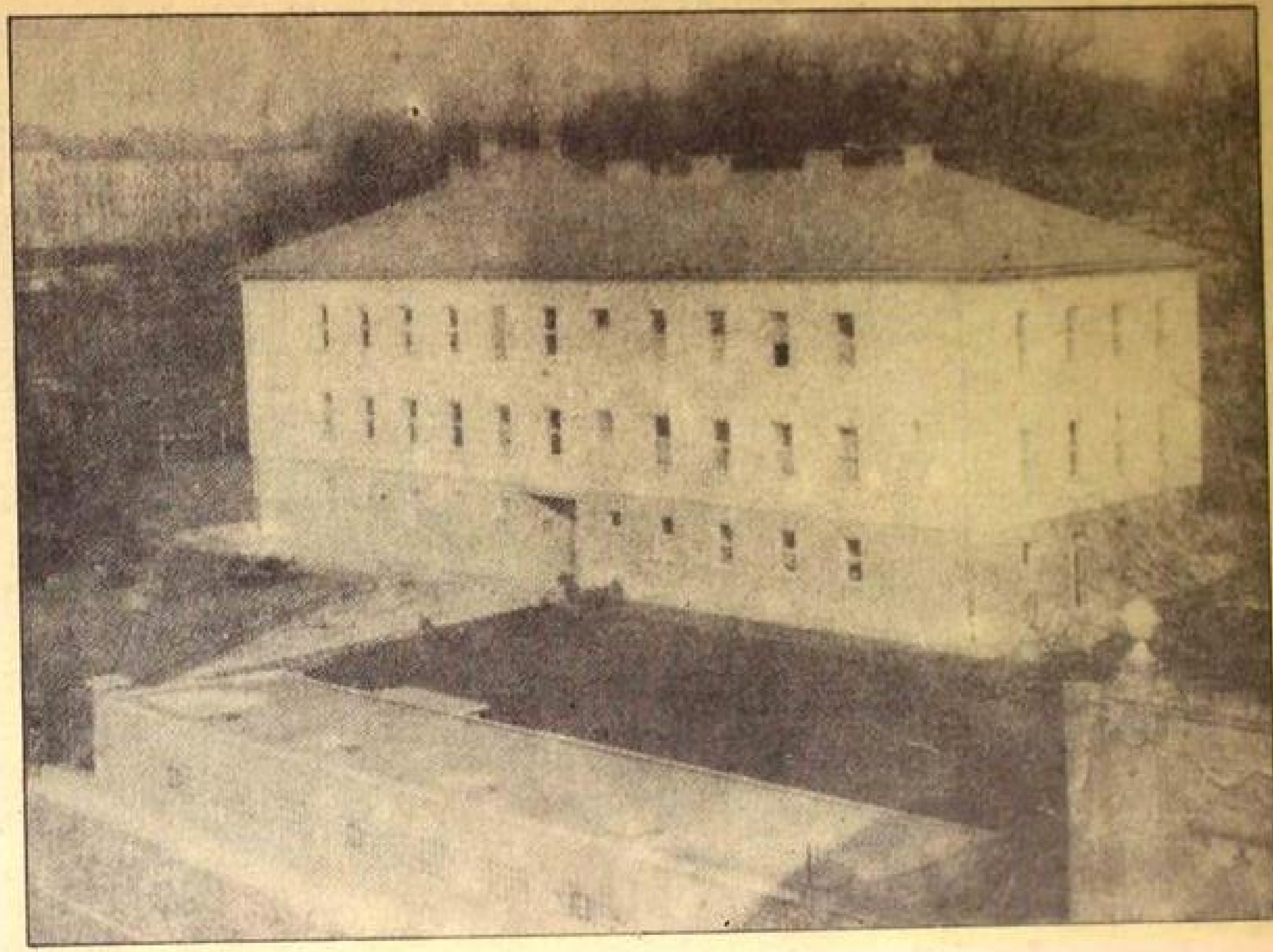
پروفیسر ڈی ڈبلیو ڈینک معمر آدمی ہیں۔ چہرہ گندمی، سفید بال، بھری مونچھیں، گہری آنکھیں جن پر پتلے فریم کی عینک لگاتے ہیں۔ وہ بھی بڑی گرم جوشی سے ملے۔ وہ ستمبر ۱۹۵۴ء سے سرطان کی تحقیقات کے آسٹریائی ادارے کے ڈائرکٹر ہیں۔ اس سے پہلے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۴ء تک ویانا کی سرجیکل یونیورسٹی کلینک کے سربراہ، ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ء تک گراز کی سرجیکل یونیورسٹی کلینک کے سربراہ، ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک ویانا میں "اڈولف اسپیٹل" کے شعبۂ جراحی کے سربراہ، اور اکتوبر ۱۹۰۴ء تک ویانا میں پروفیسر آنتن ایزل برگ کے معاون رہ چکے ہیں۔ وہ ۱۲ مارچ ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ گویا اب ان کی عمر تقریباً چوہتر سال تھی، لیکن انھیں دیکھ کر کوئی

بھی پچاس سال سے زیادہ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ ان کی صحت بہت عمدہ ہے اور اپنے کام میں اس قدر مستعد ہیں کہ انھیں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کراچی کے ڈاکٹر منظفر علی ان کے کلینک میں کام کر چکے ہیں اور اچھے سرجن ہیں۔ پروفیسر موصوف کا ادارہ زیادہ تر سرطان کی تحقیقات کا کام کر رہا ہے، کیونکہ سرطان کا صحیح اور تسلی بخش علاج ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے اکثر ادارے کوشاں ہیں کہ اس موذی مرض سے نجات پانے کی صورت نکل آئے۔ انھوں نے اپنے طریقۂ تحقیقات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اب تک اس ضمن میں کتنی کامیابی ہوئی ہے لیکن اسے بھی قابلِ اطمینان نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم امید کی شمع جلائے وہ مصروفِ عمل ہیں۔ ان کا سلوک بڑا مشفقانہ رہا۔ انھوں نے ہر بات بڑی تفصیل اور محبت سے سمجھائی۔ یہ ادارہ ایک بڑی خاموش آبادی میں واقع ہے۔ فی الحال دو منزلہ ہے۔ پہلی منزل میں تو اینی مل ہاؤس ہے۔ اس وقت اس میں دو ہزار چوہے چوہیاں ہیں۔ پروفیسر صاحب نے بتایا کہ تجرباتی کام میں ان کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ ادارے میں باقی کام کرنے والے بھی چھٹی پر ہیں۔ اس لیے ہر بات پروفیسر ڈینک ہی کو سمجھانی پڑی۔ تحقیقاتی حصے کے پھیلاؤ سے اندازہ ہوا کہ متعدد ماہرین مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ تجربات میں جوہری شعاعیں سب سے زیادہ کام آ رہی ہیں۔ انھوں نے رائے پیش کی کہ مستقبلِ قریب میں ایٹم سے بہت سی دکھ بیماریوں کے انسداد میں کام لیا جائے گا۔ ہم نے یہاں کے تجرباتی آلات کو بہت ہی پیچیدہ اور عجیب پایا۔ ان میں سے بعض خود پروفیسر ڈینک کی جدّتِ طبع کا کرشمہ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اگر سرطان کا مرض زیادہ پرانا نہیں ہوا ہے تو کامیابی یقینی ہے۔ البتہ زیادہ دن گزر جانے کے بعد اس پر قابو پانا ابھی ممکن نہیں ہوا ہے، لیکن حالات امید افزا ہیں۔ ان کی باتوں نے ہمیں کافی متاثر کیا۔ مگر ہم نے خود اپنی مصروفیات کا خیال رکھ کر رخصت کی اجازت چاہی اور اس طرح یہ ملاقات مختصر اور تشنہ رہی۔ کراچی پہنچ کر ان سے خط و کتابت کرنے کا ارادہ ہے۔ ہم نے پروفیسر سیلیخ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے نہ صرف ایک ادارہ دکھایا بلکہ ان کی بدولت ایک اعلیٰ شخصیت سے ملاقات ہو گئی۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ پروفیسر ڈینک کے حالاتِ زندگی اور ان کی خدمات کی تفصیل لکھ کر ہمیں تصویر کے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم اسے ہمدرد صحت میں شائع کر سکیں۔ آخر میں ہم نے ان دونوں کو پاکستانی اور ہندستانی تحائف بھی پیش کیے۔

فارماکولوجیکل انسٹی ٹیوٹ: وہاں سے رخصت ہو کر سیدھے ایک فارماکولوجیکل انسٹی ٹیوٹ



ڈاکٹر ڈبلیو ڈینک ←



ڈاکٹر ڈینک کا شفاخانہ اور تحقیقاتی ادارہ

میں پہنچے جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایف بروک ہیں جو انگریزی بہت عمدہ اور صاف بولتے ہیں۔ بھاری بھرکم انسان ہیں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ ویانا میں اسکارلٹ فیور (حمّی قرمزی) کیوں زیادہ لاحق ہوتا ہے۔ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اب یہ مرض کنٹرول میں آگیا ہے۔ پھر بھی باقی ہے اور ہمارا ملک اس معاملے میں بہت احتیاطی تدابیر اختیار کر رہا ہے۔ دق و سل کے ضمن میں انھوں نے بتایا کہ آسٹریا یورپ کا سب سے زیادہ متاثر ملک رہا ہے مگر اس مرض پر بھی قابو پایا جا چکا ہے میں نے رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ یورپ میں یہ عارضہ سب سے زیادہ ڈنمارک میں پھیلتا تھا۔ لیکن اب وہاں ایک بھی مریض دق یا سل کا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈنمارک کا معاملہ بڑا مختلف ہے۔ وہاں دق و سل کے کامل استیصال کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے گلّے سے اس مرض کو دور کر دیا ہے اور پھر بی سی جی کے ٹیکے بہت فراخ دلی سے لگائے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس ویانا میں یہ مرض گایوں میں اب بھی پایا جاتا ہے اور یہاں کے لوگ گائے کا کچا دودھ پینے کے عادی ہیں۔ انھیں لاکھ سمجھایا جائے کہ یہ طریقہ مضر ہے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ دکھ اٹھاتے ہیں لیکن پرانی عادت نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ کبھی کبھی مجھے بھی کچا دودھ پینا پڑ جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ کسی نے بڑے اصرار سے ایک پیالہ پیش کر دیا تو اس کا دل رکھنے کو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجبوراً اسے زہر کا گھونٹ سمجھ کر پی لینا پڑتا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن: وہاں سے رخصت ہو کر ہم ایک ادارے میں پہنچے جو تاریخ طب کے سلسلے میں بہت مشہور ہے۔ اس ادارۂ تاریخ طب کی تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ آسٹریا کی ویانا یونیورسٹی میں تاریخ طب پڑھانے کا دستور ۱۸۰۸ء سے رائج ہے لیکن اس موضوع کی تعلیم کے لیے کوئی علیحدہ پروفیسر مقرر نہیں ہوتا تھا جبکہ تمام پروفیسر اپنے اپنے مخصوص موضوع کی تاریخ پر خود ہی لیکچر دیتے تھے۔ ۱۹۳۳ء سے فرانز رومیو سیلگمان نے (جو ۱۸۰۸ء میں پیدا اور ۱۸۹۲ء میں فوت ہوئے تھے) اپنی زندگی تاریخ طب کی چھان بین کے لیے وقف کر دی اور ۱۸۶۹ء میں جب ان کی عمر ۶۱ سال تھی، وہ اس موضوع کے سب سے پہلے پروفیسر مقرر کیے گئے یعنی طب کے تمام شعبوں کی تاریخ پڑھانا ان کے سپرد ہو گیا۔ ان کے بعد تھیوڈور پشمان نے اور پھر رابرٹ فان ٹوبلے نے یہ منصب سنبھالا۔

۱۹۰۶ء میں میکس نوبرگر کو خیال آیا کہ ویانا میں تاریخ طب کا ایک علیحدہ ادارہ قائم کیا جائے۔ اس وقت ان کی عمر چالیس سال سے کچھ کم تھی۔ (وہ ۱۸۶۸ء میں پیدا اور ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے

ان کی کوششوں سے ویانا یونیورسٹی کی عمارت کے اس حصے میں جو شعبۂ طب کے لیے مخصوص تھا، تاریخ طب کے ادارے کے لیے صرف ایک کمرہ مل گیا۔ پہلا قدم اٹھانے کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

سات سال بعد جبکہ جگہ کی قلت کام کی رفتار میں حارج ہونے لگی تو یونیورسٹی کے قریب سرکاری اسپتال کے چند کمرے مل گئے۔ اس سہولت نے ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا اور بہت جلد یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہونے لگی، کیونکہ بہت سے نوشتے، کتابیں، تصاویر اور سامان وغیرہ جمع کر لیا گیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں تاریخ طب کے ادارے کو "جوزنیئم" نام کی ایک عمارت میں جگہ مل گئی، جو بلکہ ماریا تھریسا کے بیٹے شہنشاہ جوزف دوم نے ۱۷۸۵ء میں تعمیر کرائی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں فوجی معالجوں اور جراحوں کو تعلیم و تربیت دی جائے۔ اس وقت اسے بھی ایک یونیورسٹی کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۸۷۲ء میں جوزفینم کو بند کر دیا گیا کیونکہ فوجی معالجوں اور جراحوں کو یونیورسٹی کے عام طلبا کے ساتھ تعلیم و تربیت دینے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ جوزفینم کو تقریباً پچاس سال تک عجائب گھر کی حیثیت حاصل رہی۔ خود عمارت کی تعمیر بھی کلاسیکی انداز میں ہوئی تھی لیکن وہ عجائب گھر برائے نام تھا۔

۱۹۲۰ء میں جب تاریخ طب کا ادارہ اس میں منتقل ہوا تو طبی کتابوں اور قلمی نسخوں کے علاوہ ان مومی مجسموں کا ذخیرہ بھی، جو اسی موضوع سے متعلق تھے، ادارے کو مل گیا۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۵ء تک ڈاکٹر فرزے ژیون ادارے کے انچارج رہے اور پھر ڈاکٹر لیوپولڈ شون بوئر نے یہ عہدہ سنبھال لیا۔ وہ اب بھی اس کے قائم مقام ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں اور اس کے ساتھ ہی ویانا یونیورسٹی میں سرجری کے پروفیسر ہیں۔

اس وقت اس عمارت کے بائیس کمرے ادارۂ تاریخ طب کی تحویل میں ہیں۔ ان میں سے سات لائبریری کے لیے، چھے مومی مجسموں کے لیے، دو ویانا سے متعلق تاریخی امور کے لیے اور ایک عام تاریخ طب کے لیے مخصوص ہے۔ باقی چھے کمرے انتظامی عملے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

جب ہم وہاں پہنچے تو ڈائرکٹر صاحب موجود نہیں تھے۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایک خاتون ڈاکٹر مارلین یاپخ ہیں۔ یہ انگریزی ذرا تکلف سے بولتی ہیں۔ ادارے کا نظم و نسق سنبھالنے کے علاوہ تاریخ طب کی لیکچرار بھی ہیں۔ وہ جرمنی کے شہر آسٹر ویک میں ۲۶ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد انگلستان میں طباعت و اشاعت کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی

تعلیم آسٹر دیک میں پائی اور پھر ۱۹۴۱ء میں ویانا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف مڈیسین کی ڈگری حاصل کرلی ایک سال بعد ان کی شادی ڈاکٹر ہنس یاپخ سے ہوگئی۔ ۱۹۴۶ء سے وہ ادارۂ تاریخ طب میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ فالتو وقت میں علاج معالجہ بھی کرتی ہیں۔ امراض نسواں کی بطور خاص ماہر ہیں۔ انھوں نے تاریخ طب پر تقریباً تیس مقالے لکھے ہیں۔ ایک مجموعہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سال ایک اور طبی کتاب بھی مرتب کی ہے۔

یہ ادارۂ تاریخ طب کی ایک لاکھ کتابوں، قدیم کتبوں، تصویروں، دو سو سال پہلے کے بنے ہوئے مومی اعضائے انسان اور موڈلوں وغیرہ کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ کہا جاسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان اشیا کا اور کتابوں کا کوئی مطبوعہ کیٹلاگ نہیں ہے۔ عام کتب خانوں کی طرح وہاں بھی کارڈ سسٹم ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے بتایا کہ طباعت اس لیے نہیں کرائی جاتی کہ کوئی اس کا خریدار نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ دو کاپیاں تو ہم دونوں بھائی خرید سکتے ہیں۔

میری رائے اب بھی یہی ہے کہ ایسے اہم اور قیمتی ذخیرے کی ایک مطبوعہ فہرست ضرور ہونی چاہیے، ورنہ کسی کو، جب تک وہ ویانا نہ آئے، کیسے معلوم ہوگا کہ یہاں کیا ذخیرہ موجود ہے۔ اکثر کتابیں جرمن اور لاطینی میں اور کچھ انگریزی زبان میں ہیں۔ ادارے میں ایک مبسوط کتاب جالینوس پر موجود ہے مگر لاطینی زبان میں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا انگریزی ترجمہ نہیں ملتا۔ یہ کتنی افسوسناک بات ہے۔ شاید ایلوپیتھی کے ماننے والے نہیں چاہتے کہ جالینوس کا زیادہ ذکر ہو، کیوں کہ اس طرح بہت سے نام نہاد محققین کی قلعی کھلتی ہے۔ جیسے ہاردے نے دورانِ خون کا نظریہ اپنا کر عریب علامہ نفیس اور جالینوس کی کاوشوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا ترجمہ ہو جانے سے بہت سے راز یقیناً منکشف ہوں گے۔ ہم نے عربی کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ قانونِ شیخ کے تین نسخے اس لائبریری میں موجود ہیں۔ خود ابن سینا پر ایک مستقل اور ضخیم کتاب لاطینی زبان میں ہم نے دیکھی کہ شوکیس میں تبرکاً رکھی ہے۔ یہ شوکیس طبِ عربی کے شعبے میں ہے۔ دراصل یہاں رہ کر تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ جرمن اور لاطینی زبانوں کو جاننا لازمی ہے۔

موم کے بنے ہوئے ماڈل چھے بڑے وسیع ہالوں میں نمائش کے لیے رکھے ہیں اور یہ کام یقیناً حیرت انگیز ہے۔ جسمِ انسانی کے ہر ہر عضو کے مختلف ماڈل بنائے گئے ہیں اور بہت واضح ہیں۔ دورانِ خون کا پورا نظام ماڈل بنا کر دکھایا گیا ہے۔ عصبی نظام کو بھی ایک ماڈل سے ظاہر کیا ہے۔

دو سو سال قبل یہ موڈل اٹلی کے شہر فلورنس میں تیار ہوئے تھے۔ اور ان کی ایک نقل فلورنس کے عجائب گھر میں اب بھی موجود ہے۔ اسی طرح ایک نقل لندن میں تھی مگر وہ جنگ کے زمانے میں ضائع ہو گئی ہے۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحبہ کے اصرار پر ہم نے وزیٹرز بک میں اپنی رائے زبان اردو میں لکھی، اور انھیں سمجھا دیا کہ ہم نے کیا لکھا ہے۔ انھوں نے خوش ہو کر کہا کہ پاکستانی زبان میں یہ پہلی رائے لکھی گئی ہے۔

موٹنز مار خوف شفاخانۂ اطفال : بعد ازاں بچوں کے ایک اسپتال کی باری آئی جو موٹنز مار خوف شفاخانۂ اطفال کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے انچارج ڈاکٹر یونس صاحب ہیں۔ جب ان سے ہماری ملاقات ہوئی تو انھوں نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ ہمارے پاس کتنا وقت ہے تاکہ وہ اسی لحاظ سے اسپتال دکھائیں۔ ہم نے ڈیڑھ گھنٹے کا اندازہ پیش کیا۔

وہ ذرا چھوٹے قد کے دُبلے پتلے آدمی ہیں، چہرہ بھی سُتا ہوا ہے، مگر آدمی تیز معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام پر خوب حاوی ہیں۔ جب ڈاکٹر بروک (پروفیسر فارماکولوجی) کے سامنے اتفاقاً ان کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ وہ یعنی ڈاکٹر یونس اچھے سرجن نہیں ہیں، مگر پھر بھی ہوشیار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر بروک نے ان کے بارے میں صحیح رائے کا اظہار نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ وہ مرض کی تشخیص میں کبھی غلطی کر بیٹھیں مگر آپریشن کے معاملے میں شاید ان کا ہاتھ بہت صاف ہے۔ اس لیے کہ ہم نے ان کو آپریشن کرتے ہوئے خود بھی دیکھا ہے۔

ان ڈاکٹر صاحب کا نام ہم نے کارڈ پر JONAS لکھا ہوا دیکھا اور اپنے خیال میں اس کا تلفظ جونس کیا مگر ڈاکٹر بروک نے اصلاح کر کے یونس کر دیا۔ جرمن یا آسٹریا کی زبان میں جو جرمن زبان ہی سے مشتق ہے، J کو Y پڑھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر یونس صاحب نے اس اسپتال کے بارے میں بتایا کہ وہ تین شعبوں پر مشتمل ہے اور غیر اقامتی حصے کو شامل کیا جائے تو چار شعبے کہے جا سکتے ہیں۔ ایک شعبہ ایسے بچوں کا ہے جو سب سے الگ تھلگ (آئی سولیشن وارڈ میں) رکھے جاتے ہیں، وہ متعدی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک شعبہ کم سن بچوں کا ہے اور تیسرا شعبہ ذرا بڑے سمجھ دار بچوں کا ہے۔ یہ اسپتال شہر کے ایک حصے میں واقع ہے جہاں شور وغل زیادہ ہوتا ہے۔ ماحول کی اس خرابی کو ڈاکٹر یونس سختی سے محسوس کرتے ہیں لیکن سرمایہ کم ہونے کی وجہ سے اس کو کسی اور جگہ منتقل بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے مجبور ہیں۔

عمارت پرانی ہے۔ سو سال سے کم کی معلوم نہیں ہوتی۔

اس اسپتال میں ایک عجیب چیز یہ دیکھی کہ غالباً دو سو بستروں میں سے اکثر پر بچّے زائدہ اعور (اپنڈے سائٹس) میں مبتلا پائے گئے۔ ڈاکٹر یونس نے بتایا کہ ان کے ملک میں یہ مرض عام ہے ہیں نے اسباب دریافت کیے تو وہ زیادہ وضاحت نہ کر سکے۔ صرف اتنا کہا کہ ممکن ہے، التہابِ لوزتین کا ثانوی اثر ہو۔ انھوں نے اشارتاً یہ بھی کہا کہ یہاں مائیں اپنے بچّوں کے حق میں محض دوائی علاج سے مطمئن نہیں ہوتیں اور آپریشن کے بغیر انھیں چین نہیں آتا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر یونس دن میں کئی کئی آپریشن کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں اسپتال کا ایک شعبہ دکھا کر دوسرے ڈاکٹر صاحب کے سپرد کر دیا کیونکہ وہ آپریشن روم میں جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا، یہ ڈاکٹر صاحب آپ کو دوسرا شعبہ دکھا کر میرے پاس چھوڑ دیں گے۔ یہ بڑے بچّوں والا شعبہ تھا۔ وہ پلنگوں پر اس طرح بیٹھے تھے بلکہ بعض نیچے اتر کر اس طرح پھر گھوم رہے تھے کہ ان کے مریض ہونے پر شبہ ہونے لگا۔ معلوم ہوا کہ یہاں مریضوں کو زیادہ پابند نہیں رکھا جاتا تاوقتیکہ چلنا پھرنا یا اٹھنا بیٹھنا ان کے لیے مضر نہ سمجھ لیا جائے۔ ان ہوشیار بچّوں نے ہمیں دیکھ کر تالیاں بجائیں اور ہم سے بات کرنی چاہی لیکن زبان کا مسئلہ رکاوٹ بن گیا اور اس حصّے کے ڈاکٹر صاحب نے، جو خود بھی اچھی انگریزی نہیں جانتے تھے، ترجمان بننا گوارا نہ کیا۔ بعض شریر بچّے ہمارے لباس کی طرف اشارہ کر کے ہنسے۔ کیونکہ اسپتال کے سفید کوٹوں کے نیچے سے، جو ہمیں شروع ہی میں اصولی طور پر پہنا دیے گئے تھے، ہماری شیروانیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میری جناح کیپ بھی ان کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ ہم پندرہ بیس منٹ میں یہ شعبہ دیکھ کر آپریشن والے کمرے کے قریب آ گئے۔ اِس اثنا میں ڈاکٹر یونس اپنڈے سائٹس کا ایک آپریشن ختم کر چکے تھے اور وہ بچّہ میز پر سے اٹھایا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر ذرا فارغ تھے، اس لیے وہ ہم سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے کہا: ”میں ہندُستان دوبار جا چکا ہوں۔ دہلی میں یقیناً بعض اسپتال بہت بڑے ہیں۔ اردن اسپتال تو واقعی کافی جگہ میں پھیلا ہوا ہے، مگر افسوس ہے کہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اسے دیکھ نہیں سکا، کیونکہ وقت بہت کم تھا۔“

سلسلۂ گفتگو زیادہ طویل نہیں ہوا تھا کہ اتنے میں ایک بڑی بچّی جو کافی موٹی تھی، نیم بیہوشی کے عالم میں آپریشن تھیٹر میں لائی گئی۔ نرسوں نے فوراً مقام زائدہ اعور کی صفائی شروع کر دی اور دوسرے ہی سانس میں ڈاکٹر یونس اپنے آلات سنبھال چکے تھے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو سفید ٹوپیاں دیں اور ناک کے حصے تک ڈھک دینے والے نقاب اُڑھا دیے تاکہ ہم بھی قریب سے

آپریشن ہوتا دیکھ لیں۔" یہ بچی غیر معمولی طور پر موٹی ہے۔ اس کے جسم پر چربی کی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ اس لیے اس کے آپریشن میں دس منٹ سے زیادہ وقت صرف ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے شگاف دیا اور بڑی پھرتی سے زائدہ اعور باہر نکال لیا۔ کاٹ کر ٹرے میں ڈال دیا اور بچے کی ساختیں سینی شروع کر دیں۔ ابھی بالائی جلد باقی تھی کہ انھیں ایک دم خیال آیا "آپ کو گیارہ بجے دوسری جگہ جانا ہے۔ وقت قریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ مجھے خدا حافظ کہیے۔" چناں چہ ہم شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں ہم دونوں بھائیوں کی آپس میں گفتگو ہوئی۔ ہماری رائے اس معاملے میں یہ ہے کہ زائدہ اعور کا آپریشن اس ملک میں بھی فیشن میں داخل ہے۔ مقام اعور پر ذرا سا درد ہوا اور بس اپنڈے سائٹس تشخیص کر دیا۔ ڈاکٹر یونس نے خود بھی یہی بات کہی تھی کہ مائیں آپریشن کے بغیر مطمئن نہیں ہوتیں۔ محض دوائی علاج ان کی نگاہ میں نہیں جچتا۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ خواہ مخواہ چیر پھاڑ کی جائے۔ کوئی ان کے دل سے یہ غلط فہمی دور نہیں کرتا۔ جس موٹی بچی کا آپریشن ہوا، اس کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا کہ اسے معمولی سا درد محسوس ہوتا ہے اور بس۔

اس اسپتال میں دوسرے نمبر پہ بچے ہرنیا (فتق) کے مرض میں مبتلا پائے گئے۔ یہ مرض بھی بچوں میں کافی عام ہے۔ اس کا سبب ڈاکٹر یونس کو بھی معلوم نہیں۔

بچوں کے ایک اور اسپتال میں، ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم بچوں کے ایک دوسرے اسپتال میں پہنچے، جو گلانز نگاسی کے علاقے میں واقع ہے۔ سب سے پہلے ایک بت ڈاکٹر لیوپولڈ کا نظر آیا اور قریب ہی ان کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے۔ یہ اسپتال کے بانی ہیں۔ شروع میں چند ڈاکٹروں نے مل کر اس جگہ ایک اسپتال قائم کیا تھا، جو اچھی طرح چل نہ سکا اور بند ہو گیا۔ اب نئے سرے سے شروع ہو کر یہ کارپوریشن کے ماتحت ہو گیا اور وہی اس کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ اس اسپتال کے ڈائرکٹر جو مقامی زبان میں پرائی میریس کہلاتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈبلیو یسی گانگ ہیں۔ ہماری ان سے ملاقات ہوئی، مگر یہ انگریزی قریب قریب بالکل نہیں جانتے۔ تاہم جلدی ہی انھوں نے ایک بڑی نرس اور ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا انتظام کر دیا، جنھیں انگریزی میں کچھ شُد بُد ہے۔ وہ دونوں مل کر انگریزی میں مافی الضمیر بیان کر لیتے تھے اور ہم ان کی بات بہر حال سمجھ لیتے تھے۔ ہمیں یہاں بھی سفید کوٹ اوپر سے پہنائے گئے اور ہم اسپتال کے مختلف شعبے دیکھتے چلے۔

یہ اسپتال بنیادی طور پر ایسے بچوں کے لیے نہایت اچھی جگہ قائم کیا گیا ہے، جو قبل از وقت پیدا ہو جاتے ہیں۔ تاہم گنجائش ہو تو دوسرے بڑے بچے بھی داخل کر لیے جاتے ہیں اور بعض حالات

میں بچے ماؤں کے ساتھ داخل کیے جاتے ہیں۔

اسپتال اندر سے باہر تک بالکل سفید ہے۔ اس میں بھی آئی سولیشن کا شعبہ ہے۔ ہم نے دیکھا ایک بچہ "نمونیے کا ہے" ایک خناق کا ہے مگر اس کی تشخیص کامل نہیں ہوئی ہے۔ ویسے جنرل وارڈ کی تعریف یہ ہے کہ ہر ایک بڑے کشادہ کمرے میں چھ سے زیادہ بستر نہیں ہیں۔ ایک بڑا ہال ہے۔ غالباً بیس فیٹ چوڑا اور ۹۶ فیٹ لمبا۔ اس کو چھ حصوں میں شیشے کے بند پارٹیشنوں سے تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح چھ کمرے بن گئے ہیں مگر شیشوں کی وجہ سے ایک کونے پر کھڑے ہو کر دوسرے کونے تک دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا۔

ہم نے اکثر بچوں کے چارٹ دیکھ کر ان کے امراض اور حالات کو سمجھا۔ ایک چارٹ کی ہم نقل بھی کرا کے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ پاکستان میں بچوں کا علیحدہ کوئی ایسا اسپتال میرے علم میں نہیں ہے۔ ہندوستان میں بھی اس انداز کا کوئی اسپتال شاید نہیں ہے۔

اکثر جی چاہا ہے کہ میں کراچی میں بچوں کا اسپتال قائم کروں، لیکن مشکلات ایسی در پیش ہیں کہ دار ہی نہیں آنے دیتیں۔ حکومت کے اراکین ہر کام میں آڑے آجاتے ہیں اور کوئی کام کرنے نہیں دیتے۔ طبیہ کالج کے قیام کا معاملہ اسی لیے التوا میں ہے کہ حکومت نے دو سال سے زمین کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ آج بچوں کے یہ اسپتال دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ میرے ملک میں مجھ سے یہ خدمت لے لے۔ آمین، ثم آمین۔

اس اسپتال میں جگہ جگہ بچوں کی حسین و جمیل نئے نئے پوزوں میں تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض رنگین بھی ہیں۔ نرسوں کے جو بلے لگے ہوئے ہیں، ان پر بھی بچوں کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ نرسوں کا اندرونی لباس نیلا ہے اور اوپر سے سفید ایپرن پہن رکھے ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کے ساتھ داخل ہیں۔ ان کا لباس نیلا ہے۔

ہر وارڈ میں واش بیسن بڑی قسم کے لگے ہوئے ہیں یعنی بچے ان میں نہلائے جا سکتے ہیں۔ ہر وارڈ کے لیے ایک نرس مقرر ہے۔ ایسے ہر چھ وارڈوں پر ایک ہیڈ نرس کا کمرہ ہے جس میں وزن کرنے کی مشین وغیرہ رکھی ہوئی ہیں۔ ایک نئی چیز یہاں یہ دیکھی کہ قبل از وقت ولادت والے بچوں کو انکیوبیٹر سے گرم نہیں رکھا جاتا بلکہ لکڑی کے تابوت نما ڈھلچے بنا کر اسے کپڑے سے ڈھک دیا گیا ہے اور اس کے اندر ایک خاص بلب ہے جس میں نائٹروجنی تار لگے ہوئے ہیں۔ بلب کی حرارت اسے گرم رکھتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ انکیوبیٹر کے مقابلے میں یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوا ہے۔

ہم نے دریافت کیا کہ کیا اس اسپتال کی کوئی سالانہ رپورٹ شائع ہوتی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ملا۔ تاہم انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ صرف ہمارے لیے ایک رپورٹ تیار کرا کے بہت جلد بذریعہ ڈاک بھیج دیں گے۔

نیشنل لائبریری: شام کا وقت نیشنل لائبریری دیکھنے میں گزرا۔ ہم اس عظیم الشان کتب خانے کا صرف قدیم حصّہ دیکھ سکے، جو عمدہ کتابوں کا ذخیرہ ہونے کے علاوہ بہت خوبی سے آراستہ ہے۔ ایسی لائبریری میری نظر سے نہیں گزری۔ جگہ جگہ ادیبوں اور موسیقاروں کے مجسّمے قرینے سے رکھے ہیں۔ عمدہ چمکدار لکڑی کی الماریاں ہیں، جن میں تیرہ تیرہ خانے ہیں۔ تیرہ کا ہندسہ عیسائیوں میں، خصوصاً اہل جرمن میں بُرا سمجھا جاتا ہے، مگر یہاں ہر الماری کے تیرہ خانے ہیں۔ لائبریری کا جدید حصّہ یکم سے ۵ استمبر تک کے لیے بند ہے۔ اس لیے ہم اسے نہ دیکھ سکے۔ ہم نے جرمن زبان میں ایک کتاب اس لائبریری سے متعلق خریدی ہے۔

یہ لائبریری ۱۵۲۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں پندرہ لاکھ مطبوعہ کتابیں اور ۴۹ ہزار قلمی نسخے ہیں۔ لائبریری کے ایک مخصوص حصّے میں ایک لاکھ بیس ہزار نقشے، ۴۰ ہزار گیتوں کی دُھنیں، ایک لاکھ قدیم نوشتے، ایک لاکھ ۲۵ ہزار صرف تھیٹر سے متعلق کتابیں اور تین لاکھ تصاویر محفوظ ہیں جو صرف علم دوست لوگوں اور تحقیق کا کام کرنے والوں کو دکھائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں ۱۸۱ سائنسی لائبریریاں ہیں جہاں عام لوگ نہیں جاتے۔ عوام کی دلچسپی کے لیے ۵۲ سرکاری اور کئی سوتجی لائبریریاں ہیں جن کی کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے کتب خانے علیحدہ ہیں۔



شہرہ آفاق ایبے لائبریری کا ایک حصّہ





قومی تہوار کے موقع پر

۶ ستمبر ۱۹۵۶ء — جمعرات

کل کے روزنامچے میں یہ لکھنا رہ گیا کہ امریکن ایکسپریس کے کاؤنٹر پر جب میں نے سوئزرلینڈ کے لیے چیک بھُنایا تو یہاں ایک نوٹس پڑھ کر ذرا تعجب ہوا۔ اس نوٹس کا مفہوم یہ تھا کہ اپنے ہوائی جہاز اور ریل کے ٹکٹ بڑی حفاظت سے رکھیے۔ رُوپے پیسے سے چوکنّا رہیے۔ قیمتی چیزوں اور زر و جواہر کی حفاظت کیجیے۔ پتلون کی پچھلی جیب میں کوئی قیمتی چیز نہ رکھیے۔ اپنا بیگ ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے وغیرہ۔ ہم پاکستان اور ہندُستان میں دُکانوں پر، اسٹیشنوں پر یا بسوں میں "اپنی جیبوں سے ہوشیار رہیے" کے بورڈ دیکھتے ہیں مگر آسٹریا میں یہ پہلا نوٹس نظر سے گزرا ہی۔ کل ہم نے ویانا سے سوئزرلینڈ (زیورخ) تک کے ریل کے ٹکٹ امریکن ایکسپریس سے خرید لیے ہیں — ۷ کی صبح کو یعنی کل انشاءَ اللہ روانگی ہی۔ امریکن ایکسپریس والوں نے بتایا کہ ہم اپنے ساتھ صرف اپنا ہینڈبیگ رکھ سکتے ہیں۔ باقی سامان اسی گاڑی میں دوسرے سامان کے ساتھ رکھوانا پڑے گا — ہینڈبیگ کے علاوہ کوئی چیز ساتھ نہیں جا سکتی۔

سوئزرلینڈ کا فرانک ہر جگہ مل جاتا ہی۔ ایک پونڈ اسٹرلنگ کے بارہ فرانک ملے ہیں۔ یہی نرخ بھی ہی۔ اس طرح ایک فرانک تقریبًا ایک رپیہ دو آنے کے برابر ہوا۔ میں نے ۵ پونڈ کے ساٹھ فرانک احتیاطًا ریل وغیرہ کے لیے لے لیے ہیں۔ حالاں کہ ہمیں بتایا گیا کہ ریل میں آسٹریا کا شلنگ چلتا ہی۔ ویانا ریلوے اسٹیشن پر جو سامان ہم نے کسٹم پر چھوڑ دیا تھا اسے حاصل کرنے کے لیے امریکن ایکسپریس سے درخواست کی کہ وہ اسے حاصل کر کے ہمیں اسٹیشن پر دے دیں۔ باوجودیکہ ان کا ایک کلیرنگ ڈیپارٹمنٹ ہی، انھوں نے یہ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر یہ کام مجھے بھاگ دوڑ کر کے خود ہی کرنا پڑا۔ اس میں خاصا وقت صرف ہو گیا اور ۸۰ فرانک بھی خرچ ہوئے۔ امریکن ایکسپریس والوں نے درحقیقت ہر جگہ تنگ کیا ہی اور ان کو اس کا بھی لحاظ نہیں کہ ہم نے ان کی معرفت تقریبًا ۴ ہزار رپے کی بکنگ وغیرہ کرائی ہی۔ ان کے اس رویّے سے بڑی ذہنی تکلیف ہوئی ہی۔

سینٹ ڈوریم: آج کا پروگرام یہ ہی کہ ہمیں ویانا کا مشہور سینٹ ڈوریم دیکھنا ہی۔ اسے دکھانے کے لیے بھارتی سفارت خانے کی مسز کو اٹبر نے انتظام کر دیا ہی اور وقت مقرر کرایا ہی۔ ہمیں نو بجے وہاں پہنچنا ہی۔ راستے کا صحیح اندازہ نہیں ہی اور یہ جگہ کوئی پندرہ میل دُور ہی۔ اس لیے ہم ذرا دیر سے پہنچے۔

اس سینی ٹوریم کا حال بڑا دل چسپ ہے۔ زمانہ جنگ سے قبل یہ عمارت کسی دوسرے مقصد کے لیے بنی تھی پھر اس میں ایک چھوٹا سا اسپتال کھل گیا لیکن لڑائی شروع ہونے کے بعد جب جرمن طیاروں نے بمباری کی تو شہر کا دق وسل کا مرکز تباہ ہو گیا اور وہاں کے مریض یہاں منتقل ہو گئے اور یہاں صرف ایک ڈاکٹر کی پُرخلوص تنہا کوششوں سے بڑھتے بڑھتے یہ ایک قابلِ قدر سینی ٹوریم بن گیا ہے۔

ہم نے سکریٹری صاحبہ سے ملاقات کر کے اپنے کارڈ دیے۔ وہ بے چاری انگریزی بالکل نہیں جانتی تھیں تاہم انھوں نے ہماری بات کو کسی حد تک سمجھ لیا اور ٹیلی فون پر ڈائرکٹر سے بات کی۔ اس کے بعد اس خاتون نے ہمارے لیے کرسیاں سرکائیں اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھنے والے کہاں تھے۔ اس کمرے میں دق وسل کی جتنی کتابیں تھیں، ان ہی پر ایک نظر ڈال لی۔ ان میں جرمن زبان کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی کچھ کتابیں شامل تھیں۔

اتنے میں ایک پستہ قد کے نوجوان آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور انھوں نے ایک خاص انداز میں سکریٹری سے بات کی۔ پھر ہم سے مصافحہ اور تعارف ہوا یہی ڈاکٹر سگھاٹ ہربرٹ ہیں۔

ہم سے مختصر تعارف کے بعد یہ حضرت ایک خاص انداز سے سکریٹری صاحبہ سے باتوں میں لگ گئے۔ ہم سے باتیں کرتے کرتے یہ اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا چکے تھے اور اب کش پہ کش لگا رہے تھے۔ انھوں نے شاید ڈائرکٹر کو ٹیلی فون کیا، جو برابر کے کمرے میں تھے اور غالباً کچھ مصروف تھے۔ اس لیے ہمیں مزید انتظار کرنا پڑا اور یہ ڈاکٹر صاحب، سکریٹری صاحبہ سے گپ شپ کرتے رہے، جسے سمجھنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ تاہم سگریٹ پینے کا انداز، راکھ جھاڑنے کا طریقہ، باتیں کرنے کا طرز ـــــ یہ سب ایسی چیزیں تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شخص بڑا ہی بے نیاز ہے۔ اس کے باوجود یہ یقین تھا کہ سینی ٹوریم کو اچھی طرح دیکھنے میں یہ ہنس مکھ اور دل چسپ انسان، جس میں ہر شخص کا دل موہ لینے کی صلاحیت بھی ہے، بڑا مفید و معاون ثابت ہوگا۔ ابھی ہم یہ غور کر ہی رہے تھے کہ اس سے کس طرح سلسلہ گفتگو شروع کریں کہ برابر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور مسکراتا ہوا ایک چہرہ نظر آیا اور پھر یہ عظیم شخصیت ہمیں لینے باہر آ گئی۔ ہم ان سے مصافحہ کر کے ان کے ساتھ ان کے کمرے میں جا بیٹھے۔ یہی وہ شخصیت ہے تنہا جس کی کوششوں سے یہ معمولی اسپتال آج ایک بڑا سینی ٹوریم بن گیا ہے۔

چندیا تقریباً صاف ہے۔ صرف کانوں کے پاس کچھ بال باقی ہیں، جو سفید ہو چلے ہیں۔ مونچھیں ایسی ہیں جیسی کہ پرانے زمانے کے ڈاکٹروں یا سائنسدانوں کی ہُوا کرتی تھیں۔ بھرا ہوا چہرہ اور آنکھیں بڑی ہیں۔ اس شخصیت کو دیکھ کر فوراً محسوس ہو جاتا ہے کہ اس میں ہمہ تن منہمک ہو جانے اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت ہے۔

انگریزی کم جانتے ہیں۔ دق وسل میں تخصیص رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ اسپتال ان امراض کے لیے خاص صحت گاہ ہے۔ انھوں نے ہم سے پوچھا "کیا آپ بھی ان امراض میں تخصیص رکھتے ہیں؟" ہم نے جواب دیا "جی نہیں لیکن طبیب ہونے کے باعث ان بیماریوں کی اصلیت و حقیقت اور ان کے اسباب، طریقہ تشخیص اور علاج و پرہیز وغیرہ کو خوب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ بیماریاں ہمارے ملکوں میں خوب پھیلتی ہیں"۔

"بیشک انڈیا اور پاکستان میں دق وسل کے مریض کافی ہیں"۔ انھوں نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا اور پھر کہا "ڈاکٹر سگھاٹ صاحب آپ کو ہمارا سینی ٹوریم دکھائیں گے، کیا آپ فوراً جانا پسند کریں گے۔ ممکن ہے آپ کو دوسری جگہ مصروفیت ہو۔ ہماری طرف سے آپ کو آزادی ہے۔ ابھی جائیے اور جب تک آپ اسپتال میں ہیں ڈاکٹر سگھاٹ صاحب آپ کے ساتھ رہیں گے"۔

چنانچہ ہم دونوں بھائی اب ڈاکٹر سگھاٹ صاحب کے ساتھ یہ سینی ٹوریم دیکھنے چل پڑے۔ ان کے بارے میں جو رائے ہم نے قائم کی تھی، غلط نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنے اسپتال کا ہر شعبہ بکمال دلچسپی دکھایا اور کوئی شعبہ باقی نہ چھوڑا۔ وہ برابر کہتے رہے کہ کہیں بھی کوئی بات دریافت طلب ہو تو ضرور معلوم کیجیے اور کوئی تکلف ہرگز نہ کیجیے۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے ذرا جماؤ کے ساتھ کہا "مجھے خاص طور پر یہ دیکھنا ہے کہ آپ تشخیص امراض کے ذرائع کیا اختیار کرتے ہیں۔ آپ کا طریقہ علاج کیا ہے اور آپ کے مریضوں کا اقدار مرض (PROGNOSIS) کیا ہے؟"

"بے شک! میں آپ کو ہر چیز بتاؤں گا۔ ہم ایک راؤنڈ لے لیں۔ اس کے بعد میرے کمرے میں بیٹھیے گا اور پھر ہم تبادلِ خیالات کریں گے"۔

ہوتے ہوتے ہم بچوں کے وارڈ میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وارڈ کی انچارج لیڈی ڈاکٹر باہر ہی مل گئیں۔ ڈاکٹر سگھاٹ ان کو دیکھ کر دور ہی سے چلائے۔ میں یہ بتا دوں کہ جس کمرے میں ہم گئے، ڈاکٹر موصوف سے ہر آدمی کو خوش پایا اور یہ بھی سب سے بڑے خاص انداز میں ملتے ہیں اور مریضوں سے اس طرح پیش آتے ہیں کہ وہ ان کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر سگھاٹ کی اس خصوصیت نے ان کو اس سینی ٹوریم میں محبوب اور مقبولِ عام بنا رکھا ہے۔ بچوں کے کمرے میں جب گئے تو بچے ان کو دیکھ کر خوب خوش ہوئے۔ ہر ایک نے ان کو سلام کیا اور سلام سے کمرہ گونج اٹھا۔ انھوں نے بھی ان سے بڑے پیار کے ساتھ باتیں کیں۔ معالج اور مریض کے درمیان ایسا قریبی اور دلی تعلق قائم ہو جائے تو بیماری کا زور جلد گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

ہم دوسرے وارڈ میں جا رہے تھے اور وہاں سے بچے کھیلنے کے میدان میں جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ ایک ننھا سا بچہ اچانک آگے بڑھا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے اپنی زبان (جرمن) میں نہ معلوم کیا کہا کہ اس پر لیڈی انچارج اور ڈاکٹر وغیرہ خوب ہنسے۔ میں نے بچے کو پیار کیا اور سب بچوں کو تھپکا ذرا آگے جا کر ڈاکٹر نے بتایا کہ اس بچے نے یہ شکایت کی کہ فلاں بچے نے رات کو اپنا بستر گندہ کر لیا تھا!

اسپتال میں بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ باقاعدہ پڑھائی کے کمرے ہیں۔ ہم دو استانیوں سے ملے مجموعی حیثیت سے بچوں کے اس وارڈ کا ماحول انھوں نے ایسا بنا رکھا ہے کہ مریضوں کا ان پر شبہ ہی نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن بھر پڑھ لکھ کر شام کو اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں گے

اس طرح گھومنے پھرنے میں کوئی دو گھنٹے صرف ہو گئے اور اب ہم ڈاکٹر سگھاٹ کے کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے اپنے کمرے میں ایکسرے کی کئی پلیٹیں بھی منگوائیں اور ایکسرے پلیٹ کو روشن کار میں رکھ کر ہمیں مرض کے انجام کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"میری رائے ہے کہ قطع الریہ بڑی آخری درجے کی چیز ہے اور کافی غور و فکر اور معائنے کے بغیر پھیپھڑے میں ہوا بھرتے رہنا پرلے درجے کی حماقت ہے"

انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ "امریکا میں آپریشن کو دق و سل کے علاج کے واسطے حرفِ اول بنا لیا گیا ہے۔ ہم اسے غلط سمجھتے ہیں۔ میں خود امریکا میں رہا ہوں، مگر میں نے کبھی اس طریقِ علاج سے اتفاق نہیں کیا۔" ڈاکٹر نے پھر زور دے کر کہا "آپ ہی غور فرمائیے کہ جب پھیپھڑا غشاء الریہ سے چپک جائے تو ان کو چھڑائے بغیر پھیپھڑے میں ہوا بھرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ آپ اس تصویر میں دیکھیے۔ اس مریض کے بارے میں ایسا ہی ہوا۔ ایک اسپتال میں اس کو غلط نیموتھورکس سے سابقہ پڑا اور یہ صورت پیدا ہو گئی۔"

یہاں علاج کی صورت یہ ہے کہ سوئزرلینڈ کی بنی ہوئی دوا "ٹیبافن" کی پانچ ٹکیاں مریض کو دیتے ہیں اور اسی پر رکھتے ہیں۔ ضرورت ہو تو اسٹرپٹو مائی سین اور پی اے ایس بھی دیتے ہیں اور مریض اچھے ہو رہے ہیں۔

انھوں نے بتایا "ہمارے اسپتال میں شروع شروع میں ہزار میں سے چھے سو مریض مر جاتے تھے۔ اب ہزار میں سے چالیس پچاس کیس خراب ہوتے ہیں، باقی تن درست ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم معائنے پر زور دیتے ہیں اور صحیح دوا صحیح وقت پر تجویز کرتے ہیں۔"

میں نے سوال کیا "کیا آپ مریضوں کو خاص غذا بھی دیتے ہیں"۔

انھوں نے جواب دیا، "بالکل معمولی غذا جو عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ہرگز کوئی خصوصیت نہیں برتی جاتی۔"

"کیا آپ کے خیال میں آپ کے ملک میں دق وسل زیادہ ہے۔ کیا آپ کے پاس اعداد و شمار جمع ہیں؟"

"مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے پاس صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ مگر مجھے یقین کہ مرض قابو میں ہے۔ اور جدید طریقِ علاج نے اس پر قابو پانے کا موقع دے دیا ہے۔"

ہم نے ان سے اجازت چاہی۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کو ہاتھی دانت کا بنا ہوا سگریٹ ہولڈر پیش کیا، جو انھوں نے بہت پسند کیا اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ہم دونوں بھائی سگریٹ نہیں پیتے۔ اور یہ ملاقات اس کے بعد ختم ہوگئی۔

اوری اینٹل انسٹی ٹیوٹ: ۱۲½ بجے کے بعد ہم ڈاکٹر ہنس سالزر سے ملے جو ویانا یونیورسٹی میں اوری اینٹل انسٹی ٹیوٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب ان دنوں باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کو ہمارے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اس لیے پانچ بجے شام کا وقت طے ہوا اور ہم ہوٹل چلے گئے۔ اور پھر ٹھیک پانچ بجے دوبارہ پہنچ گئے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں اسلامیات پر خاصی معقول کتابیں لاطینی، انگریزی، جرمن اور اطالوی زبان میں موجود ہیں۔

بھائی جان محترم نے ان کتابوں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ ہم کتابوں کا صرف ایک کمرہ ہی اطمینان سے دیکھ سکے۔ باقی کتب انباروں کی شکل میں نکلی پڑی ہیں، کیوں کہ یہاں بھی مرمت اور سفیدی کا سلسلہ جاری ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی دیکھا، مفید اور معلومات افزا رہا۔ افسوس ہے کہ ان کے پاس بھی کوئی مطبوعہ فہرست کتب نہیں ہے۔ بس انڈکس ہے۔

یہاں آکر ایک بار پھر محسوس ہوا کہ جرمن زبان واقعی ایک ضروری زبان ہے اور اس میں قابلِ قدر ذخیرۂ علم موجود ہے۔ میں نے ڈاکٹر سالزر سے کہا، "کیا جرمن زبان سیکھنی واقعی مشکل بات ہے؟" انھوں نے کہا کہ اگر روزانہ دو گھنٹے پڑھی جائے تو چھ سات ماہ کافی ہیں۔ میں نے تفریحاً کہا کہ اگر میں شادی کر کے یہاں رہ جاؤں تو کیا مہارتِ تام ہو جائے گی۔ انھوں نے ہنس کر کہا، "بلاشبہ زبان سیکھنے کی یہ بڑی آسان صورت ہے، مگر آپ کو آسٹریا کی قومیت کا سرٹیفکیٹ تو نہیں مل سکے گا!"

ڈاکٹر سالزر سے دوبارہ ملاقات ہونے سے قبل ہم نے دو بجے سے پانچ بجے تک کا وقت

دیانا کی سیر کے لیے مخصوص کر دیا۔ ایک انگریزی داں شوفر مل گیا۔ اس کی اپنی پرائیویٹ موٹر بھی ہے۔ اس نے تمام شہر گھما دیا اور متعدد سنگین مجسموں کی تعریف کی۔ یہاں گوئٹے اور شیلے کے اِسٹیچو بھی ہیں اور موٹر اور ہوائی جہاز کے موجدوں کے بھی اور وہ شہر کے مناسب حصّوں میں نصب ہیں۔

یہ شخص بعض بڑی عمارتوں کے قصے سُناتا رہا۔ اس نے کئی باغ بھی دکھلائے (جو یوں تو شاداب تھے مگر محاورے کے اعتبار سے "سبز" نہیں تھے) ایک باغ تو خاص گلاب کے پھولوں کا تھا۔ اس میں دنیا بھر کے گلاب لگے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک تعارفی پرچہ لگا ہوا تھا۔ یہ باغ ٹی ہال کے سامنے ہے۔ ٹی ہال کے باہر سے ہم بارہا گزرے اور ہم نے وہ بالکنی بارہا دیکھی، فتح آسٹریا کے بعد جہاں کھڑے ہو کر اڈولف ہٹلر نے تقریر کی تھی۔ نہ معلوم کیوں مجھے اس مقام سے دلچسپی تھی!

اس باغ میں جگہ جگہ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں بچھی ہوئی ہیں جو تقریباً سبھی گھری ہوئی تھیں۔ سب کرسیاں ایک قطار میں ہیں۔ ہمیں شبہ ہوا کہ شاید وہ زمین میں گڑی ہوئی ہیں، مگر ایسا نہیں ہے۔ ہمیں ان بیٹھنے والوں کے سلیقے کی داد دینی پڑی جنھوں نے کبھی ان کرسیوں کو کھسکا کر بے جگہ کرنے کی جرات نہیں کی۔ آتے ہیں اور قاعدے میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

ان باغوں کو دیکھ کر ہمیں اپنے ملک کے باغوں کا خیال آیا جو مقابلتاً ذرا بھی تعریف کے قابل نہیں ہیں۔ یہاں کے ہر انداز میں عظمت ہے اور اس عظمت کا اثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آج کی سیر میں ہم نے شہزادہ یوجینو کا محل بھی دیکھا۔ اسے دیکھ کر ہم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ مغل بادشاہ خواہ مخواہ اِس لحاظ سے بدنام تھے کہ انھوں نے عمارتوں کی تعمیر اور آرائش پر بہت رُپیہ خرچ کر دیا۔ مغلوں کے محل اور قلعے اس کے سامنے فضول خرچی کی مثال نہیں سمجھے جا سکتے۔ اسی محل میں وہ جگہ بھی دیکھی جہاں نپولین کے بیٹے نے دق و سل میں انتقال کیا۔

جیسا کہ شروع میں بیان کیا جا چکا ہے، ترک آسٹریا پر کبھی حکمراں بن کر نہیں رہے، البتہ انھوں نے متعدد بار حملے کیے۔ ترکوں سے اپنے وطن کو محفوظ رکھنے کی یاد میں اہلِ آسٹریا نے اپنے ہاں کئی عمارتیں تعمیر کی ہیں اور باغ لگوائے ہیں جو واقعی یادگار رہیں۔ ایک عمارت طاعون کی یاد دلاتی ہے۔ کسی زمانے میں یہ مرض وہاں اس قدر پھیلا تھا کہ ملک کی نصف آبادی اس کی نذر ہو گئی تھی۔ اس سے چھٹکارے کے طور پر انھوں نے ایک یادگار تعمیر کر دی ہے۔

ہوٹل ڈی فرانس کے ڈائننگ ہال کا نگراں خوب آدمی ہے جتنے دن ہمارا قیام رہا یہ ہمارا

بڑا پُرتپاک خیر مقدم کرتا رہا۔ آج جب ہم ڈائننگ ہال پہنچے تو اس نے ہمیں ویانا کے خاص کھانے کھلائے۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کل صبح ہوٹل چھوڑ دیں گے۔ سُوپ ایک خاص قسم کا تھا، نہ معلوم بڑی لیسدار چیز اس میں کیا پڑی ہوئی تھی۔ بمشکل اس لیے کھا لیا کہ اس نگراں کی دل شکنی نہ ہو۔ میں نے کھانے کے بعد تمام لوگوں کو انعامات بھی دیے اور اپنے کمرے میں واپس جانے سے پہلے ہال پورٹر کو جو بہت ہی نفیس آدمی ہے، بل صبح ہی صبح تیار رکھنے کے لیے کہہ دیا۔

رات بستر پر لیٹ کر ویانا میں قیام کے دنوں کا جائزہ جب لیا تو محسوس ہوا کہ ہم نے یہاں کے لیے موزوں دن منتخب نہیں کیے اور پھر وقت بھی کم دیا۔ دیکھنے اور مطالعہ کرنے کی یہاں بہت سی چیزیں تھیں اور جو دیکھا وہ اتنا زیادہ ہے کہ اسے احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہو گیا ہے۔

میں نے بھائی جان محترم سے کہا کہ آخری شب ہے ویانا کی، کیوں نہ آج رات ویانا کی سیر کر لیں مگر وہ بھی مجھ سے کم تھکے ہوئے نہ تھے اور پھر شبِ ویانا ہماری دل چسپی کی چیز نہیں تھی۔

دیکھا جائے تو ویانا کی سیاحت کرنے والوں میں ہمارا شمار مشکل سے ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس ملک کی سیر و تفریح کا ایک بڑا عام مقصد یہ ہے کہ انسان وہاں پہنچ کر خوب عیش کرے اور دادِ عیش دیتا رہے۔ بالفاظِ دیگر

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

جیسے قول پر کاربند رہے۔ اس کے برعکس ہمارے مقصدِ سفر کے اندر ہی پہلوِ عیش کوشی کی اجازت دے ہی نہیں سکتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ یورپ میں سوئزرلینڈ کے بعد آسٹریا اور خصوصاً اس کا صدر مقام سیر و سیاحت کا ایک خاص مرکز ہے، اور ملک کو اس لحاظ سے بڑی آمدنی ہوتی ہے، بلکہ اس کا اقتصادی توازن سیاحوں کے دم سے قائم ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی قائم تھا کہ جب سفر کی موجودہ سہولتیں خواب و خیال تک میں نہیں آتی تھیں۔

آج سے دو سو سال پہلے ایک مورخ نے اس لحاظ سے تعجب کا اظہار کیا تھا کہ آسٹریا میں جتنے مقامی باشندے ہیں، اتنے ہی غیر ملکی بھی نظر آتے ہیں۔ آج اگر وہ مورخ زندہ ہوتا تو اسے اپنی رائے بدلنی نہ پڑتی، بلکہ زیادہ وثوق کے ساتھ کہنے کی جرأت کرتا۔

یہاں آنے والے سیاحوں کے لیے گرمی اور سردی کے دونوں موسم مناسب و موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دل چسپی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جاڑے میں برف پوش

پہاڑوں کی چوٹیوں پر اِسکی اِنگ کا کھیل سامان نشاط فراہم کرتا ہے تو گرمی کا موسم شروع ہو جانے پر انہی پہاڑوں کے دامن میں جھیلوں کی سطح تقریباً ویسی ہی رنگ رلیوں کے مواقع پیدا کرتی ہے۔ سنگیت اور سوانگ کی دل چسپیاں سال بھر اپنا رنگ ہر جگہ جماتی ہیں۔

یہاں ایک طرف بیماروں کے لیے اعلیٰ صحت گاہیں ہیں تو دوسری طرف قدردانانِ نوادر کے لیے ایسے عجائب گھر ہیں، جن کے قیمتی ذخیرے حقیقتاً نایاب کہے جا سکتے ہیں۔ کہیں دنیا کے ہنگاموں سے اکتائی ہوئی طبیعتوں کے لیے ایسے پُرسکون دیہات ہیں، جن کی رومان پرور خاموشیاں تکلم بلیغ بن کر ان سے ہمکلام ہوتی ہیں اور کہیں شور و شغب کے دلدادگان کے لیے نائٹ کلبوں میں وہ قہقہے سُنائی دیتے ہیں، جن سے کان گنگ ہو جائیں تو تعجب کا اظہار نہ ہو سکے۔

حکومت ان سب قسم کے سیاحوں کی راحت کا خاص خیال رکھتی ہے اور اس کے باقاعدہ اہتمام کے لیے کابینہ میں ایک وزارتِ سیاحت قائم ہے اور اسے وزارتِ تجارت کا مرتبہ حاصل ہے۔ قومی میزانیہ میں سے پچھلے سال اس مد میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر کے مساوی رقم خرچ کی گئی اور آمدنی تقریباً سات کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر ہوئی یعنی چھے کروڑ ڈالر کے مساوی رقم بچ گئی۔ اسی لیے آسٹریا کی اقتصادی بحالی کے لیے سیاحوں کی آمد و رفت کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

شاید ہم دونوں بھائیوں کی سیاحت سے اس ملک کو بہت بڑا فائدہ نہیں پہنچا، کیونکہ ہم وہاں کی عیش پرستانہ سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہیں لے سکے تھے۔

سوئزرلینڈ

(کشمیرِ یورپ)

۷ ستمبر ۱۹۵۶ء — جمعہ

ویانا سے زیورخ —— ریل میں

ہماری گاڑی صبح نو بجکر دس منٹ پر روانہ ہوئی اور ریلوے کے نظام اوقات کے مطابق رات کو پونے دس بجے پہنچے گی۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ ٹکٹ ہمارے پاس پہلے ہی سے موجود تھے اور ریزرویشن کا انتظام دہلی اور کراچی سے کرالیا گیا تھا۔ گاڑی کا نمبر ایک سو دس تھا۔ جب ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو گاڑی پر نمبر ۱۱۰ بہت نمایاں لکھا ہوا تھا اور ہمیں ریزرویشن کارڈ کی وجہ سے اپنے ڈبے میں پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہمارے پاس جو ریزرویشن کارڈ تھے ان کی ایک ایک نقل وہاں نشستوں پر لگی ہوئی تھی۔

ڈبہ مجموعی طور پر بہت اچھا تھا۔ اس میں صرف چار مسافر ہی بیٹھتے ہیں۔ ویسے ہمارے ملک کی طرح اس میں چھ آدمی بھی آسانی سے سما سکتے ہیں۔ امریکن ایکسپریس کے لوگوں نے ویانا میں بتایا تھا کہ ہمیں سامان الگ بُک کرانا ہوگا مگر یہاں سامان ہمارے ساتھ ہی رکھ گیا۔ گویا امریکن ایکسپریس نے کچھ غلط اطلاع دی تھی۔

ڈبے میں شیشے والی کھڑکی بہت بڑی تھی اور باہر کے مناظر بڑی خوبی کے ساتھ دیکھے جا سکتے تھے۔ ڈبے کو ہلکا گرم، نیم گرم یا خوب گرم رکھنے کے لیے پورے انتظامات تھے۔

گاڑی ٹھیک نو بج کر دس منٹ پر روانہ ہوگئی۔ روانگی کے وقت لاؤڈ اسپیکر پر ہماری ٹرین کو خدا حافظ کہا گیا۔ معلن نے ایک ہی مفہوم کے لیے کئی زبانیں استعمال کیں تاکہ بیشتر مسافر اسے اپنی زبان میں سمجھ لیں۔ گاڑیاں بجلی سے چلتی ہیں۔ ان کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک گھنٹے میں ستر میل تک جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ آسٹریا کے دو باشندے بیٹھے تھے۔ انگریزی زبان بالکل نہیں جانتے تھے اور ہم ان کی بولی سے نا آشنا تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان سے کوئی بات چیت نہ ہو سکی۔ مزاج میں زبردست تفاوت ہو تو اشاروں کی زبان بھی ایسے موقعوں پر کام نہیں دیتی۔ مثلاً برصغیر پاک و ہند میں حیدرآباد کے باشندے "ہاں" کہنے کے لیے سر اسی طرح ہلاتے ہیں، جیسے ہم "نہیں" کہنے کے لیے ہلاتے ہیں۔ ہم لوگ اور یورپ و ایشیا کی بہت سی قومیں سمتوں کے

درمیانی گوشوں کے لیے شمال مغرب، جنوب مغرب، شمال مشرق، جنوب مشرق کہتے ہیں لیکن جاپانی اسی مقصد کے لیے جنوب شمال، مغرب جنوب، مشرق شمال، مشرق جنوب کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور بہت سی باتیں ہیں جن میں مزاج، رسم و رواج، عادات و اطوار اور تہذیب و تمدن کے اختلاف کے باعث تفاوت پایا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں خاموش رہنا ہی بہتر ہوتا ہے، تاوقتیکہ گفت گو کے بغیر چارہ کار ہی نہ ہو۔

بھائی جان محترم مطالعے میں مشغول ہو گئے اور کبھی کبھی وہ سو بھی جاتے تھے۔ میں نے بھی کچھ پڑھنا چاہا مگر اس میں دل نہ لگا۔ نگاہیں کتاب کے صفحات کے بجائے صحیفۂ قدرت کے اوراق پر جم جانا چاہتی تھیں یہی جی چاہا کہ باہر کے مناظر سے، جو ہر آن بدلتے رہے ہیں، لطف اندوز ہوا جائے ——— سبزہ پوش پہاڑ، ہرے بھرے کھیت، مسکراتے ہوئے پھول، پانی کی شفاف نہریں، لال چھت والے چھوٹے چھوٹے مکانات مسلسل آباد تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ملک آباد ہے۔ کہیں خالی یعنی غیر آباد جگہ نہیں ہے۔

شام کے ساڑھے سات بجے آسٹریا اور سوئزرلینڈ کی سرحد آ گئی۔ "بش" کے مقام پر گاڑی ذرا زیادہ ٹھیری۔ پاس پورٹ چک کرنے کے لیے ایک صاحب آئے اور دیکھ کر چلے گئے۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور دیکھ کر چلا گیا۔ دس منٹ بعد تیسرا آدمی آیا اور اس نے پاس پورٹ پر مہر لگائی۔ میرے پاس پورٹ پر سفارت خانے نے تاریخ غلط ڈال دی تھی یعنی مہینے کے خانے میں ۱۲ کے بجائے ۲ کا ہندسہ لکھ دیا تھا، گویا فروری تک میرا ویزا کارآمد تھا۔ حالانکہ دسمبر ۱۹۵۹ء کے آخر تک کے لیے اجازت مانگی تھی۔ چونکہ باقی دوسری تاریخیں اگست کی تھیں، اس لیے اس نے ۲ کو خود ہی ۱۲ بنا کر مہر لگائی اور پاس پورٹ میرے حوالے کر دیا۔ ہم سے پوچھا گیا کہ کوئی چیز ظاہر تو نہیں کرنی یعنی کسٹم کے قابل کوئی چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم نے نفی میں جواب دیا۔ لیجیے، سامان بھی چک ہو گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ اگر پاس پورٹ کی یہی غلطی پاک و ہند کے درمیان سفر میں ہو جاتی تو یقیناً مجھے جہاں سے میں چلا تھا وہیں واپس کر دیا جاتا اور ذرا دھمکا کر خون بھی خشک کر دیا جاتا۔

چونکہ ہم لوگ آسٹریا سے سوئزرلینڈ کی حد میں داخل ہو رہے تھے، اس لیے پاس پورٹ ذرا احتیاط سے دیکھا گیا اور سامان کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی۔ اگر ہم براہ راست پاکستان سے جاتے تو اتنی نوبت بھی نہ آتی۔ وہاں جانے کے لیے ویزا کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا۔ اس ملک نے اپنے بہت سے دوست ملکوں کو رعایت دے رکھی ہے کہ ویزا کے بغیر آ جاؤ، کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ البتہ تمباکو سے تیار ہونے والی چیزیں اور شراب مقررہ مقدار میں لانے لے جانے کی پابندی ہے۔ کپڑے پیسے کی بھی جانچ پڑتال نہیں ہوتی، خواہ

کسی ملک کی کتنی ہی نقدی لے جائیے اور اپنے پاس رکھیے یا جس طرح جی چاہے، خرچ کر دیجیے۔ بنکوں میں سفری چیک کے علاوہ معیاری زرِمبادلہ کے سکے اور نوٹ بھی بھنائے جا سکتے ہیں۔

آخر میں ہمارے ساتھ ایک فرانسیسی سابق فوجی جنرل شریکِ سفر ہو گئے۔ ان سے باتیں ہوئیں یہ اسی گاڑی میں فرانس جا رہے تھے۔ یہی گاڑی آخری منزل میں لندن بھی جائے گی۔ انھوں نے اپنا فرانس کا پتہ دیا۔ پرانی وضع کے آدمی تھے اور اب تجارت کرتے تھے۔

ہم زیورخ رات کے پونے دس بجے یعنی وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں امریکن ایکسپریس کا آدمی ملا جو بہت تیز تھا۔ پانچ چھے منٹ میں ہم موٹر میں بیٹھ گئے اور بہت جلد ہوٹل سیوائے پہنچ گئے۔ یہاں ہمارے لیے پہلے ہی سے کمرے ریزرو تھے۔

ہوٹل سیوائے زیورخ کا بہترین ہوٹل نہیں ہے اور نہ وہ اتنا وسیع ہے کہ بیک وقت سینکڑوں مسافر اس میں ٹھیر سکیں، لیکن ہم نے اسی کو ترجیح دی تھی۔ ہم نے سنا تھا کہ اس میں وہ سکون میسر آ سکتا ہے جس کے ہم عادی ہیں۔ جوانی اور حسن کے شور و شغب سے ہم ذرا دور رہنا ہی چاہتے تھے۔ کئی لحاظ سے ہوٹل آسکٹ کو اس ملک میں بہترین مانا جاتا ہے۔ بڑی گنجائش کے علاوہ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ چارلس چہارم کے عہد سے اب تک کے کسی دور کی ثقافت و تہذیب کی ترجمانی و عکاسی کرنے والے کمروں اور ایوانوں میں آپ رہنا چاہیں تو پورے لوازم کے ساتھ اس کا اہتمام ممکن ہے۔ کمروں کی آرائش ہی نہیں، بلکہ کھانے پینے اور استعمال کی دوسری چیزیں دیکھ کر محسوس ہوگا کہ ہم اُسی زمانے کے ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ لذتِ کام و دہن کے علاوہ باصرہ اور سامعہ کی قوتوں کو محظوظ کرنے کے لیے بھی اسی زمانے کے لوازم کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اگر سوئزرلینڈ کے اس حصے پر کبھی مشرقی تہذیب اثر انداز ہوئی ہوتی اور اس ہوٹل میں اس تہذیب کی آئینہ داری کی جاتی تو بھائی جان محترم اور میں وہیں جا کر قیام کرتے۔

رات زیادہ آ گئی تھی اور سارا دن ریل گاڑی میں گزرا تھا، اس لیے آرام کرنا مناسب سمجھا اور میں بھائی جان کو "شب بخیر" کہہ کر بستر میں جا گھسا۔

زیورخ میں پہلی صبح

صبح کو ہم دونوں بھائیوں کے بیدار ہونے میں چونکہ ذرا سی بے قاعدگی رہی، اس لیے ایک ساتھ نماز نہ پڑھ سکے۔ جب میں معبودِ الٰہی کا شکریہ ادا کرکے کمرے میں لوٹا تو قبلہ بھائی جان حسبِ عادت مطالعہ میں مشغول تھے اور "سیر سوئزرلینڈ" ملاحظہ کر رہے تھے۔ میں بھی قریب پڑی ہوئی تاریخی اور جغرافیائی کتابیں اٹھا کر اپنی معلومات میں اضافہ کرنے لگا۔

سوئزرلینڈ کو یورپ کا ایک عجیب ترین ملک کہا جاتا ہے اور یقیناً یہ رائے بہت ہی صحیح ہے لیکن جب اس کے عجیب حالات پر نظر ڈال کر برصغیر پاک و ہند اور خاص طور پر پاکستان سے مقابلہ کیا جائے تو بہت سی باتیں یکساں پائی جانے کے باعث ہمیں زیادہ تعجب نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ عجیب بات تو اس ملک کی یہ ہے کہ وہاں ایک نہ دو پوری چار سرکاری زبانیں ہیں۔ پاکستان میں انگریزوں کے چلے جانے اور ملک کے آزاد ہو جانے کے باوجود انگریزی زبان کو فوقیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اردو اور بنگالی کو بھی سرکاری زبانوں کا درجہ دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سندھی، گجراتی، پشتو اور پنجابی کے لیے بھی لوگ آواز بلند کرتے ہیں کہ انھیں حکومت اپنی سرپرستی میں فروغ دے۔ اگرچہ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر ایک بڑا صوبہ بنا دیا گیا ہے لیکن جو فرق و امتیاز ان سب کے درمیان صدیوں سے چلا آرہا ہے، ہنوز اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اگر سابق صوبہ سندھ کا کوئی باشندہ صوبہ سرحد میں چلا جائے یا کوئی پنجابی نوجوان سندھ میں جا گھسے تو ہر شخص کو عوام سے بات چیت کرنے میں خاصی دقت ہوگی۔ یہی حال سوئزرلینڈ کا ہے۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر جہاں عموماً پڑھے لکھے لوگ ایک سے زیادہ زبانیں جانتے ہیں، اگر دیہات میں رہنے والے ایک علاقے سے دوسرے میں چلے جائیں تو بات چیت کرنے کے بجائے منھ تکتے رہ جائیں گے۔

بحیثیتِ مجموعی سارے ملک میں ۷۴ فی صد لوگ جرمن زبان، ۲۱ فی صد فرانسیسی زبان، ۴ فیصد اطالوی زبان اور صرف ایک فی صد رومانش زبان بولتے ہیں لیکن بعض علاقے ایسے ہیں جہاں کے ۹۵ فی صد باشندے صرف ایک ہی زبان جانتے ہیں۔ وہاں اگر اسی ملک کے کسی اور علاقے کا

آدمی آجائے تو گونگا بہرہ بن کر رہ جائے۔

زبانوں کا یہ فرق صرف زبان کی حد تک ہی نہیں ہے، بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی ان میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مختصر سے ملک کے اگر دو علاقوں کے باشندوں کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو غیر شخص انھیں دیکھ کر یہ تسلیم کرنے میں تامل کرے گا کہ ان کی قومیت ایک ہی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے پاکستان میں سندھیوں کا لباس پنجابیوں سے اور بنگالیوں کا لباس پٹھانوں یا مکرانیوں سے کسی طرح بھی مشابہت نہیں رکھتا ہے۔

یہی حال مذہب کا ہے۔ اس چھوٹے سے ملک میں جس کا رقبہ صرف سولہ ہزار مُربع میل اور آبادی پچاس لاکھ نفوس کے لگ بھگ ہے، عیسائی مذہب کے دونوں بڑے فرقوں کے پیرو بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ پروٹسٹنٹ لوگوں کا تناسب ۵۸ فی صد اور کیتھولک کا ۴۰ فی صد اور باقی دو فی صد دوسرے عقائد کے ماننے والے ملیں گے۔ اور یہ تناسب آج سے نہیں پوری ایک صدی سے بدستور قائم ہے۔ زبان کی طرح عقائد کے لحاظ سے بھی بعض علاقے ایک مسلک والوں کے لیے مخصوص ہیں لیکن عام طور پر ملی جلی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ لسانی یا مذہبی فرق و امتیاز کی بنیاد پر کبھی ان میں کوئی جھگڑا یا فساد نہیں ہوتا۔ بعض گھرانے ایسے بھی ملیں گے جن میں چند افراد ایک عقیدے کے اور باقی دوسرے عقیدے کے حامی ہیں اور بڑی پُرامن زندگی بسر کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے باشندوں میں سب سے بڑا فرق لسانی اور مذہبی ہی تھا جس نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرایا اور پھر بھی یہ جھگڑا پوری طرح نہ نمٹ سکا۔ اب بھی بھارت میں ہندو اور سکھ آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ جنوبی ہند کے دراوڑی نسل کے باشندے شمال والوں کو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ یہ سب چاہتے ہیں کہ الگ الگ اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں تاکہ آئے دن کے تنازعات مٹ جائیں۔

سخت تعجب ہوتا ہے کہ سوئزرلینڈ کے باشندوں میں قومی جذبہ اتنا گہرا کیوں ہے کہ جب ملک کے استحکام اور ترقی کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ سب صرف ایک مرکز پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں آنے پاتی۔ اس لحاظ سے سوئستانیوں کو نہ صرف یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں عجیب ترین اور ساتھ ہی قابلِ تعریف کہا جا سکتا ہے۔ ان کی امن پسندی نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی نوعیت کی ہے۔ جنگ تو بڑی چیز ہے، دنیا کی کسی قوم سے ان کا آج تک معمولی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ دُور کیوں جائیں، موجودہ صدی میں دو عالمگیر لڑائیاں ہوئیں، جن میں

سوئزرلینڈ کو چھوڑ کر یورپ کا ہر ملک کسی نہ کسی اعتبار سے شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن قابلِ ستائش ہیں اس ملک کے سیاست داں اور اربابِ اقتدار کہ وہ آگ کے شعلوں اور خون کی ندیوں سے اپنے دامن بچائے رہے۔ سیاہ یا سرخ دھبہ ان کے نام پہ نہ آنے پایا۔

ان کی امن پسندی صرف اپنی قوم تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قیامِ امن کے لیے وہ ہمیشہ دوسروں کو دعوت دیتے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ایسے بین الاقوامی ادارے بھی قائم کر رکھے ہیں جن کی انسان دوستی پر سب کو اعتماد ہے اور باقی دنیا کے لوگ ان اداروں کو تسلیم ہی نہیں کرتے، ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انجمنِ صلیبِ احمر ہے جسے ایک سوئستانی ہنری ڈونانٹ نے ۱۸۶۳ء میں قائم کیا تھا۔ شروع میں اس کا دائرۂ عمل اسی ملک تک محدود رہا اور چند مخلص نفوس خدمتِ خلق کے نام پر کام کرتے رہے لیکن بہت جلد یہ دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جہاں اس انجمن کی شاخ قائم نہ ہو، یا کم سے کم اس کے رضا کار نمائندے موجود نہ ہوں۔

قحط پڑے یا وبا پھیلے، زلزلہ آئے یا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑے، سیلاب آئے یا جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں، اس کے کارکن حوادثِ روزگار کا مطلق لحاظ نہ کرتے ہوئے ہر جگہ اور ہر حال میں پہنچ جاتے ہیں اور یہ اس کے مخلصانہ اور غیر جانب دارانہ طریقۂ کار کا اثر ہے کہ انھیں ہر حکومت ہر حال میں خدمات انجام دینے کی اجازت دے دیتی ہے اور اس کی اس ساکھ کا یہ عالم ہے کہ اس کے کارکنوں کو آج تک جان بوجھ کر نقصان نہیں پہنچایا گیا اور ان سے ان کی قومیت کے بارے میں کبھی بازپرس نہیں ہوئی، کیونکہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان کی قومیت بین الاقوامی ہوتی ہے۔

اس انجمن کے قیام کے کچھ ہی عرصے بعد ۱۸۷۰ء میں فرانس اور پروشیا کے درمیان محاذِ جنگ قائم ہوا اور پھر اس صدی میں دو عالمگیر لڑائیوں کے علاوہ بہت سے محاربات ہوئے۔ ان سب موقعوں پر اس انجمن اور اس کی لاتعداد شاخوں نے، جن میں سے بعض "انجمنِ ہلالِ احمر" اور "سازمان شیر و خورشید سرخ" کے نام سے مشہور ہیں، گراں قدر خدمات انجام دیں اور جب لڑائی جھگڑوں کے بازار سرد پڑ گئے اور زخمیوں، مریضوں، اور تارکانِ وطن کی ہنگامی امداد اور مستقل آبادکاری کے سوالات پیدا ہوئے تب بھی اس انجمن نے دستِ تعاون بڑھایا۔ طبی امداد ہی نہیں، اشیائے خوراک، لباس، رہائش اور تعلیم و تربیت تک کے ضمن میں اس کی اعانت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس انجمن کا سرخ نشان علامت ہے اس بات کی کہ انسان دوستی کے نام پر کوئی دستہ اس جگہ مصروفِ کار ہے

اور اسے دیکھتے ہی حد سے زیادہ جنگ پسند افراد کی بھی ہمت نہیں پڑ سکتی کہ وہ اس مقام پر گولہ باری کریں یا کسی قسم کا نقصان پہنچائیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس پر سوئزر لینڈ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اِس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خود سوئزر لینڈ کی اپنی کوئی فوج نہیں ہے، کیونکہ وہ بے حد امن پسند ہے، بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح وہاں بھی فوجی تربیت ہر باشندۂ ملک کے لیے لازمی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ فوج کے ہر سپاہی کو اپنی مدافعت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی جارحانہ اقدامات نہیں کر سکتا، بلکہ مدافعت کے وقت بھی اسے انتقامی کارروائی سے باز رکھا جاتا ہے۔

یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ امن پسندی کا یہ کردار اس قوم میں کس طرح پیدا ہوا جبکہ اس قوم کے آباؤ اجداد سینکڑوں سال پہلے لڑ بھڑ کر اس زمین پر زبردستی قابض ہوئے اور انھوں نے یہاں کے باشندوں کو بری طرح مار بھگایا تھا۔

تاریخ کا یہ باب اور اس سے بھی پہلے کے بعض مدھم نقوش حافظے کی لوح پر اُجاگر کرنے ضروری ہیں۔ تہذیب اور شائستگی کے دور سے بھی صدیوں پہلے اس زمانے میں جسے لوہے کا زمانہ کہا جاتا ہے "ہل ویتی" نام کے ایک جنگ جو قبیلے کے کچھ لوگ جو گال قوم سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے، اس علاقے میں گھس آئے، جسے اب سوئزر لینڈ کہا جاتا ہے اور اس وقت اس قبیلے نے اپنے نام پر اپنی بستی کا نام ہل ویتیا رکھا۔ یہ لوگ سیلٹ زبان بولتے تھے۔ پھر صدیاں گزرنے کے بعد جب روم کے شہنشاہ جولیس سیزر نے ساری دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے یورپ میں پھیلنا شروع کیا تو اس کی فوجوں نے اس سرزمین پر بھی جنگ آزمائی کی اور اپنے خیال کے مطابق وہاں کے وحشی باشندوں کو تہذیب سکھانا اپنا فرض سمجھ لیا۔ قیصر روم نے اپنے ملک کا قانون اور نظم و نسق کا طریقہ وہاں رائج کیا اور لاطینی زبان کو فروغ دیا۔

چوتھی صدی عیسوی سے نصرانی مذہب کا سکہ اس سرزمین پر چلنے لگا۔ جولیس سیزر کے انتقال کے بعد پانچویں صدی میں اس کا فوجی نظام مفتوحہ علاقوں میں دم توڑنے لگا۔ اس لیے حکومتِ وقت نے اپنے دستے وطن میں واپس بلا لینے مناسب سمجھے۔ ہل ویتیا کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ روم کی فوجیں تو چلی گئیں لیکن زبان و مذہب کے جو بیج انھوں نے وہاں بوئے تھے، وہ پھوٹ کر برابر سرسبز و شاداب ہوتے اور پروان چڑھتے رہے۔ کچھ عرصے بعد ۴۴۳ء میں برگنڈی کے رہنے والوں نے میدان خالی پا کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا جو موجودہ شہر جنیوا کے

آس پاس تھا۔ انھیں لڑنے اور کسی کا خون بہانے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ مدمقابل کوئی بڑی طاقت موجود ہی نہیں تھی۔ انھوں نے مقامی باشندوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ایک پُرامن فضا میں رہنا شروع کر دیا۔

انھوں نے لاطینی زبان سیکھی، نصرانی مذہب اختیار کیا اور حکومتِ روم کو پیغام بھیجا کہ ہم آپ کی سلطنت کے امین ہیں۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ بہت جلد جرمنی کے ایک اور قبیلے "الیمنی" نے چھاپہ مارا اور باقاعدہ قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ انھوں نے برگنڈیوں کو دریائے آر کے ساحل سے بھی پرے مار بھگایا اور دونوں قبیلوں کے درمیان پانی کا یہ تیز دھارا ہی سرحد بن گیا۔

ان فاتحین نے رومی سلطنت سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس صدی کے آخر میں خود روم کی حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ نو واردوں نے اپنی جرمن زبان کو بول چال کے لیے قائم رکھا اور رفتہ رفتہ عیسائی مذہب قبول کیا۔ دریائے آر، جو دونوں قبیلوں کے درمیان خطِ فاصل بنا ہوا تھا، تاریخی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ وہ آج بھی کثرت سے فرانسیسی اور جرمن زبانیں بولنے والوں کے درمیان ایک خط فاصل کا کام دے رہا ہے۔

۸۵۳ء میں جرمنی کے بادشاہ لوئی نے تمام اراضی گرجا کے سپرد کر کے حکم نافذ کیا کہ علاقے کا پادری وہاں صاحبِ اقتدار ہوا کرے گا۔ چناں چہ پادریوں کے خاندان یکے بعد دیگرے اس علاقے پر حکومت کرتے رہے اور کوئی ان کی من مانی کارروائیوں پر احتساب نہ کر سکا۔ اسی لیے اس کے بعد ایک عرصے تک زندگی کچھ ایسے انداز میں کروٹیں لیتی رہی کہ تاریخ میں بہت کم ذکر اس علاقے کا ملے گا۔

یہاں تک کہ ۱۲۱۸ء میں ہیبس برگ خاندان نے عنان حکومت سنبھالی تو اس کے ایک فرمانروا نے اپنا قائم مقام اس علاقے میں بھیج دیا۔ پادریوں کے طرف دار طبقے کو یہ بات ناگوار گزری اور ان میں غم و غصے کی لہر پھیلتی چلی گئی۔

کوئی بائیس سال بعد شویز نامی علاقے کے باشندوں نے شہنشاہ فریڈرک دوم تک رسائی حاصل کی اور نائبوں کا وسیلہ اور واسطہ ختم کر کے براہِ راست شہنشاہ کی ماتحتی قبول کر لی۔ یہ سودا بڑا مہنگا رہا۔ جلدی ہی لوگوں نے محسوس کر لیا کہ تھوڑی بہت آزادی، جو عوام کو حاصل تھی، آہستہ آہستہ سلب ہوتی جا رہی ہے۔ وطن پرستی کا جذبہ زور پکڑنے لگا۔ اس وقت ملک کے تین قبیلے، جو

شویز، اُری اور انٹر والڈن میں آباد تھے، کثیر التعداد اور زور آور تھے۔ انھوں نے یکم اگست ۱۲۹۱ء کو "ہمیشہ قائم رہنے والی انجمن" کی بنیاد رکھی اور حلفیہ عہد کیا کہ آپس میں متحد ہو کر غیر ملکی اقتدار کو ختم کر دیں گے، اور آزادی کے لیے اپنی مشترک دفاعی قوتوں کو بروئے کار لائیں گے۔ انھوں نے اپنی قوم کا منشور بھی تیار کر لیا۔ دیکھا جائے تو اسی روز سے ملک میں جمہوریت کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی۔ قریب کی بہت سی ریاستیں اس وفاق میں شریک ہو کر اس کا دائرہ وسیع کرنے لگیں۔

چونکہ اس جہاد میں شویز کے باشندے سب سے پیش پیش رہا کرتے تھے، اس لیے اسی نام کی رعایت سے وفاق کا نام سوئز پڑ گیا اور یہی نام تلفظ کے خفیف سے فرق کے ساتھ ملک کی دوسری زبانوں میں بھی رائج ہے۔ انگریزوں نے جو ہمیشہ دوسرے ملکوں، شہروں اور لوگوں وغیرہ کے نام اپنی ضرورت، سہولت اور مصلحت کے مطابق بدل دینے کے عادی ہیں، اسے سوئزرلینڈ کہنا شروع کیا اور چونکہ انگریزی زبان دنیا کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس لیے یہ نام زیادہ مشہور ہو گیا حتیٰ کہ سوئستانی بھی جب اپنے وطن سے باہر جاتے ہیں تو اپنے ملک کو سوئزرلینڈ ہی کہتے ہیں۔

ہرچند کہ مقامی باشندوں نے آزاد اور خود مختار رہنے کا عہد کر لیا تھا، لیکن پڑوسی ملک ان کی حریت پسندی کا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آئے دن اس ملک پر حملے ہوتے رہے اور کم سن وفاقی حکومت بار بار آگ اور خون کی ہولی کھیلتی رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مقامی لوگوں میں اتنی ہی شدت کے ساتھ جذبۂ اتحاد عمیق ہوتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں الگ تھلگ رہنے کے بجائے وفاق میں شامل ہوتی گئیں اور اس طرح ملک کا دائرہ وسیع ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اب نئے وفاقی آئین کے مطابق جو ۱۸۴۸ء میں منظور ہوا ہے، بائیس صوبے اس وفاق میں شامل ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ خود مختار لیکن مرکزی اعتبار سے قومی اسمبلی کے ماتحت ہیں۔ ہر صوبے کا آئین، مجلسِ انتظامیہ اور عدالت الگ ہے لیکن جب من حیث القوم کسی مسئلے پر غور کرنا پڑتا ہے تو وہ سب ایک ہیں۔ اسی طرح دفاع و مالیات اور تعلقاتِ خارجہ کے اعتبار سے صوبے کوئی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتے۔

جمہوری اصولوں کے لحاظ سے یہ ملک اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں پر ہر مسئلے کا فیصلہ بہ تصوابِ رائے سے ہوتا ہے اور ہر بالغ مرد اور عورت کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ حتیٰ کہ جب کوئی ٹیکس لگایا جاتا ہے تو اسے نافذ کرنے کے لیے بھی عوام کی رائے معلوم کر لی جاتی ہے۔ ۱۸۹۸ء میں جب ریلوے کے نظام کو قومی ملکیت بنایا گیا تو پہلا قدم اٹھانے سے پہلے استصوابِ رائے ضروری سمجھا گیا۔ صحت اور حادثات کے ضمن میں ہر شخص کے لیے بیمہ لازمی قرار دینے کے لیے ۱۹۰۰ء میں

رائے شماری ہوئی تو مخالف ووٹ زیادہ آئے اور تحریک رد ہو گئی۔ بارہ سال بعد یہ مسئلہ دوبارہ اٹھایا گیا۔ اس وقت تک لوگ اس کی افادیت کو محسوس کرنے لگے تھے۔ لہٰذا ۵۴ فی صد موافق، اور ۴۶ فی صد مخالف ووٹوں سے تجویز منظور ہو گئی۔ حتیٰ کہ جرم و سزا کا جو قانون اپنی آخری شکل میں مرتب ہوا، اس پر بھی عوام سے رائے لی گئی۔ سب بوڑھے لوگوں کو وظیفہ دینے کا مسئلہ ۱۹۴۷ء میں زیر بحث آیا تو ۸۰ فی صدی نے اس کی موافقت کی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد مجلسِ اقوام قائم ہوئی تو اس کا صدر مقام جنیوا میں رکھا گیا لیکن اس میں خود سوئزرلینڈ کی شمولیت کے لیے استصوابِ رائے ضروری سمجھا گیا۔ وفاق نے اس مجلس میں شرکت کر لی لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد تقریباً ویسے ہی اغراض و مقاصد کے لیے نئی انجمن "اقوامِ متحدہ" کے نام سے قائم ہوئی تو اس حقیقت کے باوجود اس انجمن کا یورپی دفتر اور بعض مخصوص اداروں کے دفاتر اس ملک میں قائم ہیں، وفاق نے اس میں شریک ہونا پسند نہیں کیا کیونکہ عوام کی رائے شمولیت کے خلاف رہی۔ بالفاظِ دیگر ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو طے کرنے کے لیے بھی جمہوریت کے اصولوں کو توڑا نہیں جاتا۔

تقریباً بارہ بجے بھائی جان محترم نے مجھے مخاطب کر کے کمرے کے مسلسل سکوت کو توڑا۔ ان کی رائے تھی کہ دوپہر کا کھانا ہوٹل ہی میں کھا کر باہر نکلا جائے اور پھر خوب اطمینان سے گھوم پھر کر لوٹا جائے۔

آج اور کل یعنی ہفتہ اور اتوار کے دو دن سرکاری طور پر تعطیل کے تھے، اس لیے اسپتال، دوا سازی کے کارخانے اور ادارے بھی برائے نام کھلتے ہیں اور کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں جانا مناسب نہ ہوتا، اس لیے ہم نے اس ملک کے لیے جو پروگرام مرتب کیا اس میں یہ دو دن یکسر سیر و تفریح کے رکھے تھے یعنی ایسے مقامات کا دورہ، جن کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہیں ہوتا۔ پروگرام کی بعض شقیں بھائی جان محترم کی ڈائری میں پہلے ہی سے درج تھیں اور باقی اتنی دیر کے مطالعے کے بعد لکھی گئی تھیں۔

زیورخ وفاق میں شامل ہونے والا پہلا آزاد صوبہ ہے جس کو کسی زمانے میں راجدھانی ہونے کا فخر بھی حاصل رہا ہے، اس لیے یہاں عمدہ قابلِ دید عمارتوں کے علاوہ ثقافتی نقوش بھی افراط سے ملتے ہیں، اور چونکہ یہ شہر بھی ملک کے بعض دوسرے بڑے شہروں کی طرح جھیل کے کنارے اور پہاڑ کے زیرِ سایہ واقع ہے، اس لیے دل چسپ قدرتی مناظر کے باعث ہمیشہ سیاحوں

کے لیے ایک محبوب مقام رہا ہے۔ ہر سیاح اس شہر سے ضرور گزرتا اور یہاں کے نقوش دل میں چھپا کر ساتھ لے جاتا ہے۔

کھانا زیادہ لذیذ ثابت نہیں ہوا۔ ہم نے محض تجربے کے طور پر بین الاقوامی کے بجائے صرف قومی نوعیت کی اشیائے خوراک کا آرڈر دیا۔ ان میں کوئی چیز بھی چٹپٹی نہیں تھی، بلکہ ہمارے معیار کا جہاں تک تعلق ہے، بالکل پھیکی تھی۔ نام ان کے اتنے ٹیڑھے تھے کہ جبڑوں کو غیر معمولی جنبش دیے بغیر ان کو صحیح تلفظ کے ساتھ دوہرانا مشکل تھا، اس لیے ان کو یاد رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہم بھنے ہوئے گردے اور پارچے بھی منگا سکتے تھے لیکن وہ گرم اور تازہ ہونے کے بجائے ریفریجریٹر میں سے نکال کر لائے جاتے اور ظاہر ہے کہ کیا چیز ہوتے۔ مٹھاس کے ضمن میں صرف دہی ملا جس میں شہد کی آمیزش نے بڑی لذت پیدا کر دی تھی۔ غالباً دونوں چیزیں خالص تھیں یعنی دہی واقعی گائے بھینس کے دودھ سے جمایا گیا تھا اور شہد مکھیوں کے چھتے سے نکال کر لایا گیا تھا۔ اپنے ملک میں آمیزش کے بُرے رواج نے ہر چیز کو "خالص" بنا کر کھانے والوں کا ذائقہ خراب کر دیا ہے۔ ہم نے بین الاقوامی قسم کے مینو کو کسی آئندہ موقع کے لیے ملتوی رکھا۔

کھانا کھا کر ہم دونوں بھائی باہر نکل گئے اور کرائے کی گاڑی لینے کے بجائے پیدل چلنا مناسب سمجھا تاکہ شہر کو اچھی طرح دیکھا جا سکے۔ حالاں کہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ شہر جس کی آبادی سات لاکھ کے قریب ہے، ایک بہت ہی وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔

دکانیں بہت خوبی سے آراستہ تھیں۔ شوکیسوں میں اندر فروخت ہونے والی ہر چیز کا ایک ایک نمونہ نظر آتا تھا۔ انھی کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ یہ دکان کس چیز کی ہے۔ ورنہ سائن بورڈ پر فرموں کے نام ملک کی تین بڑی زبانوں میں لکھے ہوتے ہیں جن میں سے کسی ایک کو بھی پڑھ کر سمجھ لینا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی ہم ایک نظر ان پر ڈالتے ضرور تھے کہ شاید کوئی لفظ پلّے پڑ جائے۔

کپڑے والی دکانوں میں سب سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ عورتیں ٹوٹی پڑ رہی تھیں معلوم ہوا کہ کوئی قومی تہوار قریب ہے جس کی وجہ سے خریداری ہنگامہ خیز ہو گئی ہے۔ سوتی اور ریشمی کے علاوہ ریان اور نائلون کے پارچہ جات بھی بڑی افراط سے ہر جگہ موجود تھے۔ ہر بزاز کی دکان سے ریڈی میڈ (سِلے سلائے) کپڑے بھی خریدے جا سکتے تھے۔ ہر شوکیس میں روغنی مٹی کے قدِ آدم مجسّمے پورا لباس پہنے نظر آتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ زنانہ مجسّمے خاص طور پر چہرے کے علاوہ سر سے

پاؤں تک ڈھکے ہوئے ہیں۔ کسی بھی دکان میں ایسا نیم تن مجسمہ ہم نے نہیں دیکھا جس کے سینے پر محرم لگا کر اس میں ہیجان انگیز حد تک جاذبیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ غالباً وہاں اس چیز کو عریانی کے زمرے میں لا کر مخربِ اخلاق سمجھا جاتا ہے۔

ایک دکان میں ہم ململ کا چالیس گز کا تھان دیکھ کر حیران رہ گئے، جس کا وزن مشکل سے ایک پونڈ ہوگا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ۱۶۹۰ء کی لڑائی کے بعد جب بہت سے فرانسیسی ترکِ وطن کر کے اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ پارچہ بافی کی یہ صنعت اپنے ساتھ لاتے تھے۔ بلا مبالغہ وہ ململ ڈھاکہ کی ململ کی یاد تازہ کرنے کے لائق تھی۔ ہم نے اس میں سے چند گز کپڑا خریدنا چاہا تاکہ نمونتہً کچھ سوغات اپنے ساتھ لے جائیں لیکن دکان دار نے شرافت سے کام لیکر ہم کو آگاہ کر دیا کہ سیاحوں کو یہ ململ ملک سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ باقی ہر چیز بے حساب لے جائی جاسکتی ہے۔

لکڑی کی دست کاریوں والی دکان میں جا کر بھی طبیعت خوش ہوئی۔ یہاں پہاڑی مقام کی آب و ہوا کا اثر تھا کہ وہاں کی چوبی مصنوعات بھی بالکل خطۂ کشمیر کی مصنوعات سے ملتی جلتی تھیں لیکن یہ گمان ہوتا تھا کہ وہاں سے چیزیں منگا کر یہاں فروخت کی جارہی ہیں۔ نقش و نگار اور کھدائی کا کام اتنا دیدہ زیب کہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہم پہلے سے یہ فیصلہ نہ کر چکے ہوتے کہ کسی ملک سے درزنی مصنوعات نہیں خریدی جائیں گی تو یادگار کے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور لیا جاتا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ان چیزوں کو باندھ کر کہاں کہاں پھرا جائے گا اور کسٹم کے خداوندان سے جان کیوں کر چھڑائی جائے گی!

سورج چھپنے کے کافی دیر بعد کہ جب فضا میں خنکی بھی کافی بڑھ گئی تھی، ہم ہوٹل واپس آئے۔ واپسی کے لیے ہم نے ٹیکسی لے لی کیونکہ ٹھیک طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اپنے ہوٹل سے کتنی دور اور کس سمت میں موجود ہیں اور غیر ملک میں راہگیروں سے راستہ پوچھنا کبھی کبھی خاصا تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

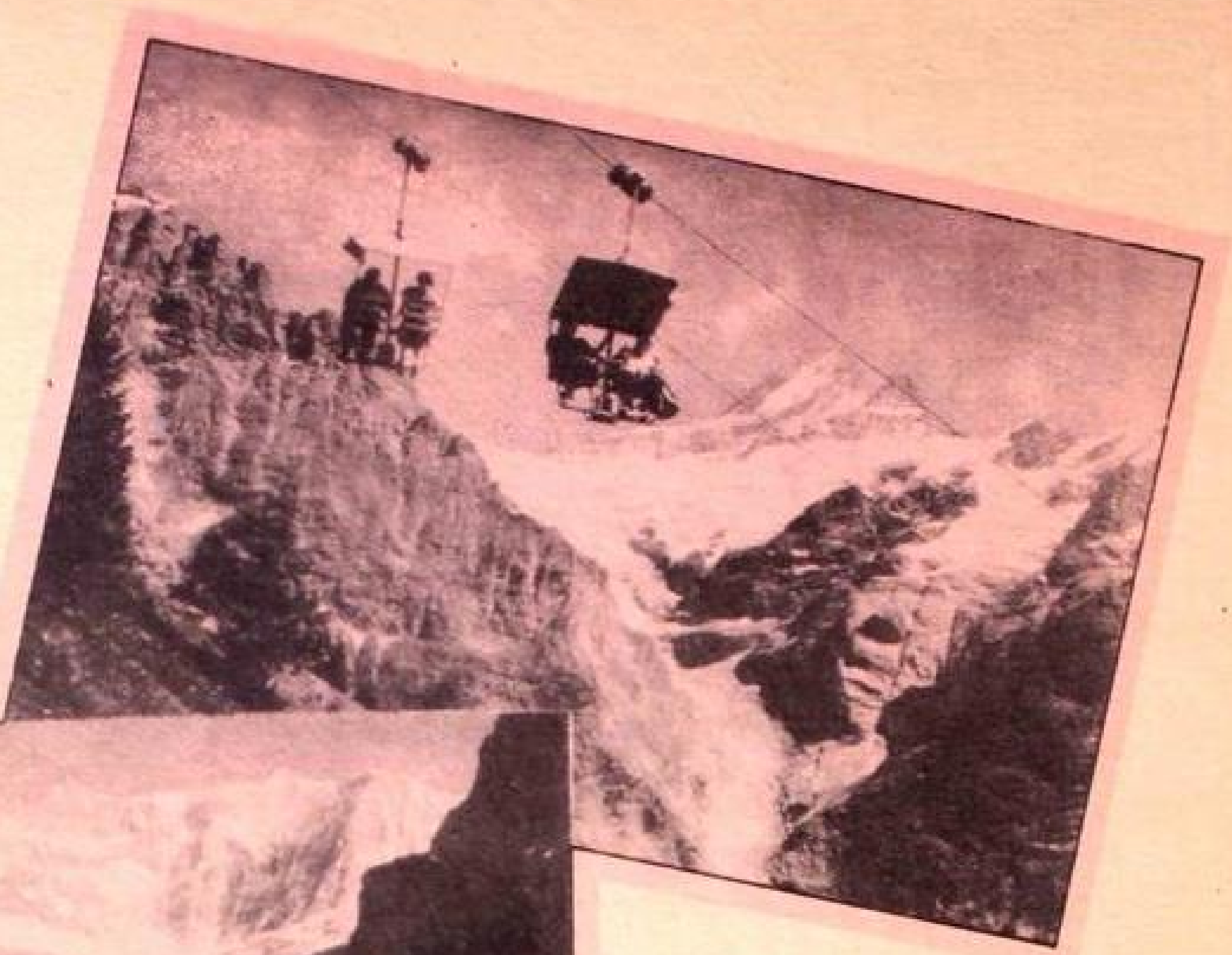
زیورخ سے گرنڈل والڈ

جیسا کہ ہم نے کل ہی پروگرام بنالیا تھا، صبح پانچ بجے ہم اٹھے اور ساڑھے چھے بجے بذریعۂ ٹرام صرف ۵۰ سنٹ کرایہ ادا کرکے اوپیرا ہاؤس کے قریب پہنچ گئے۔ یہ انٹرلاکن یعنی سیر و تفریح کے لیے جانے والی بسوں کا مرکز ہے۔ جلدی جلدی ہم بس میں بیٹھے اور بس حسبِ پروگرام ٹھیک وقت پر روانہ ہوگئی۔ بس چلنے کے بعد ہم نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا تو نگاہ کسی مرد پر رکی ہی نہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ عورتوں کا یہ ماحول ہمیں زیادہ پسند نہیں آیا۔ بھائی جان محترم سے ہیں، اور وہ مجھ سے زیادہ باتیں کرہی نہیں سکتے۔ رشتے کی نزاکت اور عمروں کے تفاوت کے باعث حجاب ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے۔ ہم دونوں بھائی ہمیشہ سے آپس میں زیادہ بولنے سے احتراز کرتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی مسئلہ تبادلِ خیالات کے لائق ہو، یا مشورہ طلب ہو، تفریحاً ہم آپس میں طبعاً بات نہیں کرسکتے۔

سوال یہ تھا کہ اب یہ ساڑھے چار گھنٹے کا سفر کیسے کٹے گا۔ ہر چند کہ یہ لمحے راستے کا حسن، دریاؤں اور جھیلوں کی پاکیزگی، برف پوش پہاڑوں کی رعنائی وغیرہ دیکھنے میں گزر جاتے، اور گزر ہی گئے، لیکن نمک مرچ بھی لگتا رہنا چاہیے تھا، ہمیشہ مٹھاس کھاتے رہنے سے جی بھر جاتا ہے۔ اس موقع پر مجھے برکات احمد صاحب حد سے زیادہ یاد آئے۔ وہ حضرت نمک مرچ خوب لگاتے رہتے ہیں اور بڑی بڑی کٹھن منزلیں غیر محسوس طریق پر طے کرادیتے ہیں۔

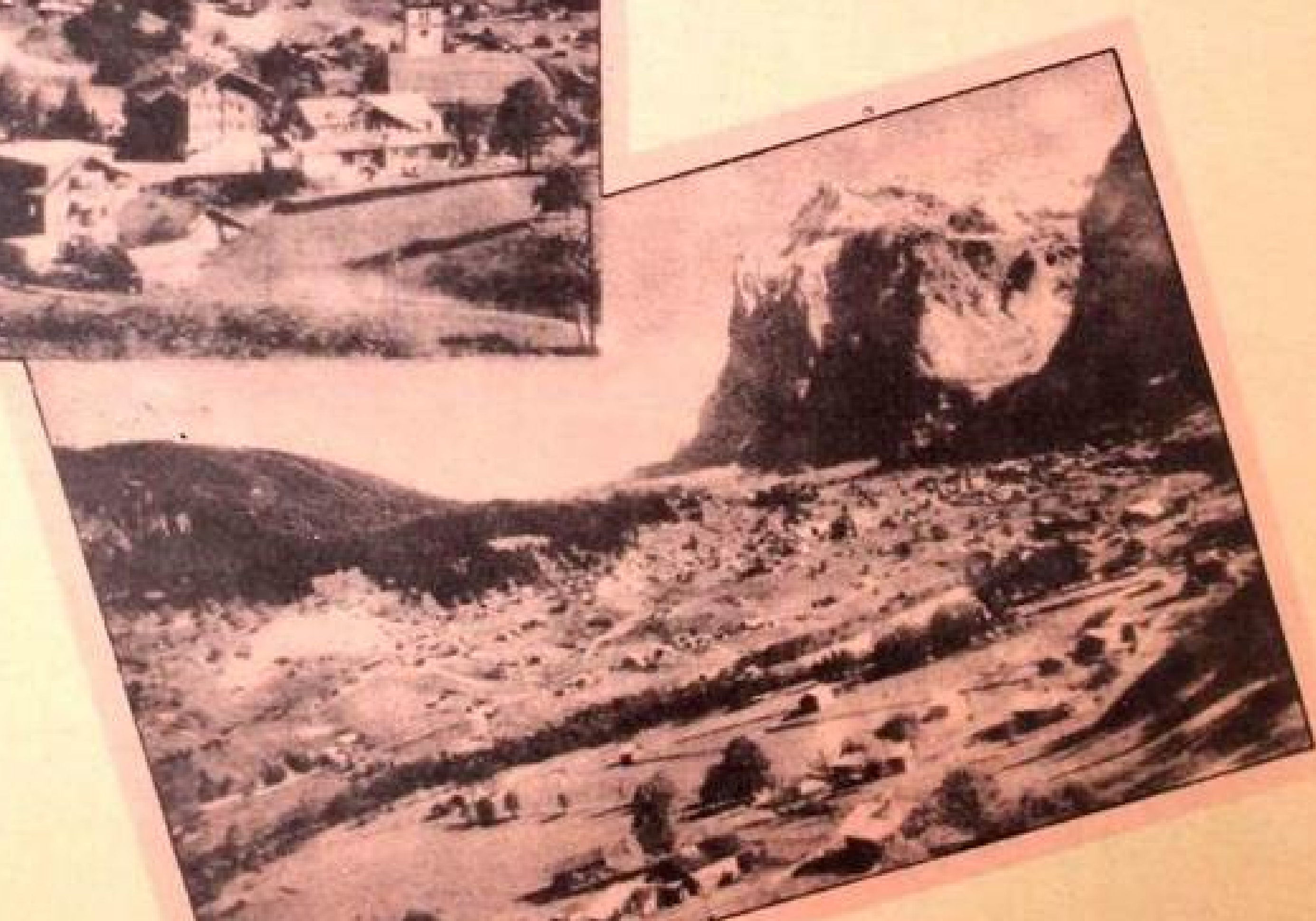
یہاں بھی زبان کا مسئلہ الجھن پیدا کررہا تھا۔ اگر گاڑی میں قریب کوئی مرد ہوتا تو اشاروں میں یا جملوں کے بجائے صرف لفظوں کی زبان میں کوئی بات پوچھی تو جاسکتی تھی۔ یہاں حال یہ ہے کہ موٹر کار کا ڈرائیور بھی صرف جرمن زبان بولتا ہے۔ ہم نے وہاں کسی سے یارانہ نہیں کیا تھا، لیکن زبان کا معاملہ ترکی سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

میرا دماغ اسی الجھن میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر برکات صاحب ہوتے تو شاید وہ سب سے پہلے یہی کہتے کہ ان کالے سروالیوں سے میں کیا پوچھوں۔ انھیں خاموش کردینا بہتر ہے۔





گرنڈل والڈ میں



اور انھیں خاموش کرنے کی ترکیب یہ ہوتی کہ ہم تینوں زور زور باتیں کرتے اور کسی مسئلے پر اس طرح بحث شروع کر دیتے کہ وہ اس کو لڑائی جھگڑا سمجھتیں اور اپنا قضیہ چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو جاتیں۔ وہ ہم کو اسی طرح حیرت سے دیکھتیں جیسے اب ہم ان کو حیرت، غم اور غصّے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ وہ یقیناً اپنا بولنا بھول جاتیں۔

اس بس میں چالیس سے کم عمر کی کوئی بھی خاتون نہیں تھی اور ساٹھ سے زیادہ کی ایک دو نہیں پوری چار موجود تھیں۔ کبھی کبھی وہ بھی رک کر باہر کے مناظر سے لطف اٹھانے لگتی تھیں، لیکن ہمارے لیے یہ بذاتِ خود منظر بن گئی تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ انھیں قدرت سے زیادہ دل چسپی ہے یا زندگی سے۔ دونوں سے اُنس، یا دونوں سے نفرت۔

ہم دونوں بھائی پچھلی سیٹوں پر گویا گوشہ نشین تھے۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا کہ ہم صرف قدرتی مناظر سے لطف اٹھائیں اور گاڑی کے اندرونی ماحول سے بے نیاز یا خالی الذہن ہو جائیں۔ یہ راستہ جس سے ہم گزر رہے ہیں، زیورخ سے سیدھا گرنڈل والڈ تک جاتا ہے اور راستے میں بس ایک آدھ جگہ رُکتی ہے۔ گرنڈل والڈ سے بھی کئی راستے پھوٹتے ہیں۔ ایک جنیوا چلا جاتا ہے، ایک برن کو اور ایک بازل کو۔ مگر ہمارے اس ٹور کا پروگرام انٹر لاکن اور گرنڈل والڈ جانا اور دوسرے راستے سے واپس آنا ہے۔ راستے میں لیوزرن بھی آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا ملک شاداب ہے۔ حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ ہے۔ اس سبزے کے ساتھ ہمہ رنگ کے خودرو پھول عجیب حُسن تضاد پیدا کرتے ہیں۔ سبز پوش اور برف پوش پہاڑ، جو دُور کھڑے سر اٹھائے جھیلوں میں جھانک رہے ہیں، ایک علیحدہ سماں پیدا کرتے ہیں۔ سرخ کھپریلوں کے مکانات نشیبی علاقوں سے بلندی تک بنے ہوئے ہیں اور پانی میں ان کا عکس، نفیس راستے اور سڑکیں، جہاں مٹی کا نام و نشان تک نہیں ہے، برف کی بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں، جو کبھی کبھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیں —— یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو دیکھ کر سوئزرلینڈ کی یہ کہانی سچی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا آباد کی تو زمین کا ایک حصّہ خالی رہ گیا اور مسالہ بھی ختم ہوگیا۔ یہ خالی حصّہ قدرت کو بُرا معلوم ہوا، لہٰذا اس نے پھر اپنے ہاتھ سے اسے بطورِ خاص آباد کیا۔ جنّت کی ہوائیں بخشیں، رنگ برنگ کے پودے لگائے، میووں کے درخت اگائے، پانی لاکر آبشار، ندیاں اور جھیلیں جاری کیں اور جو پانی ان سے بچ رہا، اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھینک کر وہیں یخ بستہ کر دیا تاکہ وقتِ ضرورت برف پگھل کر پھر پانی بنے اور انسان کے کام آئے۔

واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے یہاں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اُن ملکوں کو شکایت کرنی چاہیے جہاں اِن نعمتوں کا فقدان ہے اور سینوں میں طراوت پیدا کرنے کے لیے بس اللہ کا نام ہے اور باقی ریگستان ہے۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے تک ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے اور یہ دو گھنٹے نہ معلوم کیسے گزر گئے۔ ایک منظر آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ کسی جگہ جھیلوں میں سفید براق کی مانند بڑی بڑی بطخوں نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اچانک ہماری بس رک گئی۔

سامنے ایک ریستوراں تھا۔ یہاں ہمیں ناشتہ کر لینا چاہیے تھا۔ ہم اس جگہ کو یہاں کا دیہات کہہ سکتے تھے۔ مگر یہاں کا یہ گاؤں ہمارے ملک کے اچھے شہروں سے بھی بہتر ہے۔ یہ ریستوراں اگرچہ چھوٹا سا تھا مگر یہاں بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی بڑے ہوٹل میں کھانے کے کمرے میں جا بیٹھے ہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے ایسے صاف کہ نام کو کوئی دھبہ نظر نہ آئے۔ سفید پردوں پر بھی کوئی داغ نہیں۔ صاف میزیں اور آرام دہ کرسیاں، صاف ستھرے برتن اور چھری کانٹے چمکتے ہوئے۔ کھانا کھلانے والی خواتین کے لیے یہاں سیاہ لباس مقرر ہے اور وہ سیاہ لباس پر کمر سے گھٹنوں تک ایک جالی دار سفید کپڑا باندھے رہتی ہیں۔ لباس بالکل صاف ستھرا اور سفید پٹی تک پر کوئی نشان نہیں۔ میں نے متعدد ہوٹلوں اور ریستورانوں میں اس چیز کو بطور خاص نوٹ کیا ہے کہ سفید کپڑا صاف اور کلف دار تازہ دُھلا ہوا ہوتا ہے۔ گویا کہ یہ لوگ روزانہ اُجلا کپڑا استعمال کرتے ہیں۔

ہم نے ایک خاتون سے پوچھا کہ آپ انگریزی جانتی ہیں۔ جواب میں انھوں نے کہا "لٹل لٹل" (کم کم)، ہم نے ان کی وساطت سے انڈوں، کافی، مکھن اور بریڈ کا آرڈر دیا۔ بڑی نفاست سے اس خاتون نے ہمیں ناشتہ کرایا اور انگریزی میں ہمارا شکریہ ادا کیا اور میں نے اس کی زبان میں "تانکے نیل" (بہت بہت شکریہ) جواب دیا۔ میرے اس جواب پر وہ خاتون کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

یہاں ایک اور جرمن خاتون نے ازراہِ کرم مجھ سے کہا کہ کیا آپ جرمنی سمجھتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔ اس پر انھوں نے بڑی نرمی اور منجھی ہوئی انگریزی میں مجھ سے کہا "تو کیا آپ اسے پسند کریں گے کہ میں آپ کو کچھ بتاؤں؟" میں نے ذرا تامل کے بعد شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ اس گاؤں کی رہنے والی کوئی خاتون ہیں، مگر جب ہم بس میں آ کر بیٹھے تو دیکھا کہ وہ ہماری ساتھی ہیں۔ اب مجھے اپنے اس جواب پر افسوس ہوا اور میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اب گرنڈل والڈ پہنچ کر ان سے بات چیت کروں گا۔

ہم لیوزرن میں ٹھیرے نہیں، بس گزرتے چلے گئے۔ پھر انٹرلاکن آیا۔ اس کی جستہ جستہ سیر کی۔ جھیل کے ساتھ رہائشی ریستوراں دیکھے۔ باغات دیکھے۔ پھولوں سے چپہ چپہ آراستہ کیا گیا ہے۔ غرض عجیب جگہ ہے۔ سیلانیوں کے لیے اسے جنت کہا جاتا ہے۔ واقعی اس شہر میں بے حد جاذبیت ہے۔ ایک چھوٹا سا بازار ہے جس کی ہر ہر دکان آرائش کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ دل کشی کا یہ عالم ہے کہ ہر چیز خرید لینے کو جی چاہتا ہے۔ اس شہر میں ۶۵ ہوٹل ہیں، جن میں بیک وقت چار ہزار سیاح رہ سکتے ہیں۔

آخر کار ۱۱ بجے ہم گرنڈل والڈ پہنچ گئے۔ یہ علاقہ بجائے خود ایک صدی تک تفریح گاہ رہا ہے، مگر اب اس کی دل چسپی عظیم الشان پہاڑوں سے وابستہ ہے، بالخصوص برف پوش پہاڑ، جن کے سروں پر جمی ہوئی برف گھل گھل کر سینے سے ہوتی ہوئی، دامن تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں ایک راستہ پہاڑ کاٹ کر اور سرنگیں بنا بنا کر تیار کیا گیا ہے جو پہاڑ کے اس مقام تک لے جاتا ہے، جہاں سے برف کا گرنا اور پگھل کر بہنا واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سب سیلانی یہی منظر دیکھنے آتے ہیں، اور سچ بات یہ ہے کہ یہ منظر ہے بھی عجیب۔ میں نے اپنی عمر میں پہلی بار ایسا منظر دیکھا ہے۔ ایک آدھ فلم میں اس کا ہلکا سا عکس نظر آیا ہے لیکن فلم میں وہ بات کہاں! ہم بڑی دیر تک کھڑے اسے دیکھتے رہے، دیکھتے رہے، اور قدرت کے کرشموں کے قائل ہوتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیچے سنگلاخ کو دیکھ کر برف پگھل کر پانی پانی ہو رہی ہے اور سختی کے سامنے نرمی اختیار کر رہی ہے مگر جب وہ دیکھتی ہے کہ یہ بڑے بڑے عظیم الشان پتھر اور سنگلاخ چٹانیں اس کی راہ میں پھر بھی رکاوٹ ہیں تو اسے جیسے غصہ آ جاتا ہے اور وہ پورے زور کے ساتھ، پوری شدت کے ساتھ اور پورے جلال کے ساتھ اس سنگلاخ سے ٹکراتی ہے اور خود ہی پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اس شور و غل کو دور دور تک سنا جا سکتا ہے۔ آخر عزم راسخ کی فتح ہو جاتی ہے۔ پگھلی ہوئی یہ برف اپنا راستہ بنا لیتی ہے اور سنگلاخ اپنی جگہ کھڑے گویا اس کا منھ تکتے رہ جاتے ہیں۔ گو راستہ طویل ہے اور چھوٹی بڑی کتنی ہی رکاوٹیں حائل ہیں مگر آخر میں یہ منظر باقی رہ جاتا ہے کہ ایک صاف راستہ ہے جس کے دونوں طرف بڑے بڑے پتھر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور یہ پگھلی ہوئی برف بڑے آرام سے گزرتی چلی جاتی ہے اور آخر ایک بڑی جھیل یا دریا میں جا ملتی ہے اور اپنے وجود کو گھلا کر بنی نوع انسان کو اور دوسرے جانداروں کو طرح طرح سے فائدے پہنچاتی ہے۔ لوگ اس کے آغوش میں اٹھکھیلیاں بھی کرتے ہیں تیرتے بھی ہیں، کشتیاں بھی چلاتے ہیں۔ بڑے جہازوں کو یہ راستہ دیتی ہے، کھیتوں کو سیراب کرتی ہے، انسان اور حیوان کی پیاس بجھاتی ہے۔

بت پرستوں نے طرح طرح کی بے جان چیزوں کے سامنے سر جھکایا ہے، لیکن بہت کم نے برف کے تودوں کی پرستش کی ہے۔ حالانکہ برف کی پاکیزگی، نعومت اور لطافت اس بات کی متقضی ہے کہ اگر واقعی کائنات میں سے کسی بے جان کی پرستش کرنی ہے تو کیوں نہ برف کے پہاڑ کو اپنا دیوتا بنایا جائے۔

سوئزرلینڈ کو برفانی پہاڑوں اور ان کے سینوں سے پھوٹ نکلنے والے چشموں کی سرزمین کہنے کے علاوہ جھیلوں اور دریاؤں کا ملک بھی کہا جاسکتا ہے۔ اکثر دریاؤں کے کنارے بھروسے کے لائق نہیں ہیں کیونکہ موسم گرما میں پہاڑوں کی برف پگھلتے ہی ان میں سے اکثر میں سیلاب آجاتا ہے جس کہ ساحلی علاقے دور دور تک ڈوب جاتے ہیں۔ اس لیے دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کے برعکس جن کے شہر عموماً دریاؤں کے کنارے آباد ہیں، سوئزرلینڈ کے بہت سے بڑے شہر جھیلوں کے کنارے واقع ہیں۔ جنوب مغرب میں سب سے بڑی جھیل جنیوا اور شمال مشرق میں جھیل کونسٹنس ہیں۔ لیکن یہ دونوں کلیتہً سوئستانی سرحد میں نہیں ہیں۔ اول الذکر کا کچھ حصہ فرانس میں اور موخرالذکر کا کچھ حصہ جرمنی میں شامل ہے۔ اس لیے ملک کی سب سے بڑی جھیل نوشیتل ہے جس کا رقبہ ساڑھے بانوے مربع میل ہے۔ ایک اور بہت بڑی جھیل لاگومیگیور ہے جس کے ۱۴۳ مربع میل رقبے میں سے صرف ۳۰ مربع میل کا حصہ سوئزرلینڈ میں واقع ہے۔ اسی طرح جھیل لوگانو کا صرف ۲۰ میل کا علاقہ سوئزرلینڈ میں ہے اور باقی اٹلی میں ہے۔ اس کے بعد رقبے کے لحاظ سے لیوسرن، زیورخ، تھن، برنیز، موراٹ والنس اور سیماخ کی جھیلیں ہیں۔ آخرالذکر کا رقبہ صرف ساڑھے پانچ مربع میل ہے۔ اس کے بعد بہت ہی چھوٹی جھیلوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے گیارہ صرف آر کے طاس میں اور دو پو کے طاس میں واقع ہیں۔ جھیل جنیوا اتنی بڑی ہے کہ اس کے پانی سے طویل و وسیع دریائے رھون اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ بعض جھیلیں بہت بلندی پر بھی واقع ہیں۔ مثلاً جھیل ڈوبنسی، جو درہ گیمی کے قریب ۷۶۴۲ فیٹ کی بلندی پر ہے۔ ایک جھیل ایپچی نینسی، جو ۵۲۲۳ فیٹ کی بلندی پر ہے، اتنی حسین و دل فریب ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کا پانی نہایت شفاف ہے۔ تہہ کی ہر چیز صاف نظر آتی ہے اور اس کی سطح پر جب قریب کے برف پوش پہاڑوں خودرو درختوں اور جھاڑیوں کا عکس پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک دوسری رنگین دنیا زیر آب ہو اور چونکہ پانی عموماً پُرسکون رہتا ہے، اس لیے یہ جلوے ہمیشہ تسکین نظر ثابت ہوتے رہتے ہیں۔ ایک اور قابل دید جھیل مارجلنسی ہے جو ۷۷۶۶ فیٹ کی بلندی پر ہے۔ اس میں ہر وقت برف کے ٹیلے تیرتے پھرتے ہیں، جو قریب کے ایک عظیم الشان



پہاڑوں پر
سکی انگ





برف باری
کے بعد

برف پوش پہاڑ الٹش سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ ان سب بڑی چھوٹی جھیلوں کے کنارے اور آس پاس بڑے چھوٹے شہر قصبے اور دیہات آباد ہیں۔

سوئزرلینڈ میں برفانی تودوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہو کہ قریب کے چار پانچ ملک مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہو اور ان کا مجموعی رقبہ سات سو مربع میل ہو جو کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ حالانکہ برابر ان کی سطح گھلتی رہتی اور دریاؤں کو پانی پہنچاتی رہتی ہے۔ ایک برفانی تودہ، جو تیسنو کے علاقے میں ہو، ۱۳ مربع میل کا ہے۔ لمبائی کے لحاظ سے گورمز، جو کوہ ایلپس کے سلسلے میں ہو، سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہو۔ اس کا طول سوا نو میل ہو۔ اس کے علاوہ دو تودے ساڑھے سولہ اور دس میل لمبے بھی ہیں مگر ان کو خوبصورت نہیں کہا جا سکتا۔

جھیلوں اور برفانی تودوں کے ساتھ ساتھ آبشاروں کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہو جن کا شور پُرسکون جھیلوں کے سکوت پر ہمیشہ خندہ زن رہتا ہو۔ دریائے رائن کا تیز دھارا شاف ہوسن کے مقام پر سو فیٹ کی بلندی سے گرتا ہو، جس کی چوڑائی اس جگہ ۳۴۰ فیٹ ہوتی ہو۔ یہ آبشار سب سے زیادہ حسین سمجھی جاتی ہو، ورنہ ایک اور آبشار جو اسٹوباخ کے مقام پر ہو ایک ہزار فیٹ کی بلندی سے گرتی ہو لیکن سیاح اسے زیادہ پسند نہیں کرتے، کیوں کہ اس کے قریب بیٹھ کر انسان لطف اندوز ہونے کے بجائے پاگل ہو جانا چاہتا ہو۔ صرف بہرے یا بے حس لوگ اس کے بے پناہ شور کی تاب لا سکتے ہیں۔

سوئزرلینڈ ٹھنڈے اور گرم پانی کے چشموں کا ملک بھی ہو اور بعض دوسرے ملکوں کی طرح اس کے چشموں کے پانی میں بھی معدنی اجزا کی آمیزش ہمیشہ سے پائی جاتی ہو، اسی لیے صحت و تن درستی کے خیال سے ان کو استعمال کرنے کا رواج قدیم ترین زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ سنٹ مورٹز نامی شہر میں ادویاتی چشموں کے قریب کھدائی ہوئی تو لکڑی کے ایسے فریم برآمد ہوئے جو کانسی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان پر کندہ نقوش میں لوگوں کو چشموں کے کنارے چڑھاوا چڑھاتے اور دعائیں مانگتے دکھایا گیا ہو۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ ایسے چشموں کے کنارے شفاخانے کب تعمیر ہونے شروع ہوئے کیونکہ بہت ہی پرانے نوشتوں میں بھی ان کا ذکر پایا جاتا ہو۔ البتہ یہ حقیقت ہو کہ اب جو صحت گاہیں ایسے مقامات پر بنائی گئی ہیں وہ جدید ترین آلات اور ضروری سامان سے بھی لیس ہیں، اور مریضوں کو قدرتی نعمتوں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ نئی ایجادات کے استعمال کا بھی پورا موقع مل جاتا ہو۔ سولھویں صدی کے مشہور طبیب پیرے سیلسس فیفر نامی علاقے میں رہتا اور

مطب کرتا تھا۔ وہیں رہ کر اس نے گرم معدنی چشموں کے استعمال اور ان کی قدر و قیمت پر اہم کتابچے تحریر کیے اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ پچھلے تین سو سال میں شنزناخ، بیدن اور لیو کرباد میں اُبلتے ہوئے پانیوں کے قریب بیماریوں سے نجات پانے اور صحت و تن درستی کو قائم رکھنے کے آرزومند لوگوں کا برابر تانتا بندھا رہا ہے۔ ایسے چشموں کی کل تعداد ملک بھر میں تقریباً ڈھائی سو ہے اور عمدہ شفاخانے جن کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے، اکیس ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہو سکتی تھی لیکن حکومت نے ان کے نظم و نسق کے قاعدے بڑے سخت بنائے ہیں، جن پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے اور انھی چشموں کے قریب شفاخانے قائم کیے جا سکتے ہیں، جن کے پانی کا طبی تجزیہ کرنے کے بعد طے کر لیا گیا ہو کہ یہ کن کن بیماریوں کے لیے مفید ہیں اور اس میں ملے ہوئے اجزا ایک طویل مدت تک اپنی خصوصیات کو برقرار رکھیں گے۔ وہاں تشخیص امراض اور علاج معالجے کے لیے لازمی طور پر سند یافتہ طبیب مقرر کیے جاتے ہیں اور ان کے لیے حکم ہے کہ وہ سال میں ایک یا دو بار چشمے کے پانی کا کیمیاوی تجزیہ کر لیا کریں تاکہ ان کی افادیت کی طرف سے باقاعدہ اطمینان ہو جایا کرے کہ قدرت نے ان کی صلاحیت ابھی ختم نہیں کی ہے یا ان میں کوئی تغیر رونما نہیں ہو رہا ہے۔

تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ چشمے گری سنز میں ہیں جو ڈیڑھ سو وادیوں کا ضلع کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ کوہ ایلپس کے مشرقی دامن میں کسی قدر نشیب میں واقع ہے۔ ورنہ بعض اور علاقوں کے چشمے کافی بلندیوں پر بھی پائے جاتے ہیں۔ کئی چشمے ایسے بھی ہیں جن تک انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ ان تمام چشموں کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ بعض کے پانی میں صرف وہ نمک پائے جاتے ہیں جو جسم کے رگ و ریشے اور اعصاب کو مضبوط اور توانا رکھتے ہیں۔ بعض میں کاربونک ایسڈ، آیوڈین اور گندھک کی آمیزش ہوتی ہے، جو اندرونی اعضا کی صحت کے ساتھ ساتھ جسم کی بیرونی سطح کو جلدی امراض سے پاک و صاف رکھتی ہے۔ جوڑوں کا درد ہو یا خارش کا مرض، گُردوں میں خرابی ہو یا پھیپھڑوں میں نقص، معدے میں شکایت ہو یا اعصاب میں کمزوری، قدرتی طریقۂ علاج بہت جلد یا ذرا دیر میں سب کو شفا دیتا ہے۔

ایسے پانی کی دوائی تاثیر کے علاوہ مریضوں کے دل و دماغ پر جو نفسیاتی اثر پڑتا ہے، وہ بجائے خود بڑا اہم ہے۔ صحت بخش ماحول کا احساس ہی بہت سے لوگوں کو تن درست و توانا کر دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چشموں کے قریب کے علاوہ کسی اور مقام پر شفاخانے نہیں ہیں۔ یا معالج نایاب ہیں، بلکہ شفاخانوں اور طبیبوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ شاید بعض ترقی یافتہ ملک بھی

اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مثلاً آج کل مستند معالجوں کی تعداد چار ہزار چار سو کے قریب ہے گویا ہر ایک ہزار تین سو نفوس کے لیے ایک معالج موجود ہے۔ ان کے علاوہ دو ہزار کے قریب دندان ساز ہیں۔ چشموں اور آبشاروں سے دور عام بستیوں میں چھے سو کے قریب اسپتال ہیں، جن میں بہتر ہزار سے زیادہ مریض ہر وقت رہ کر علاج کرا سکتے ہیں۔ اسپتالوں میں داخل ہونے والے سبھی بیمار نہیں ہوتے بلکہ کچھ لوگ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہاں رہ کر اپنی صحت و توانائی کو قائم رکھنے کی سبیل نکالتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے معالج تشخیصِ امراض کے بجائے صرف قیامِ صحت کے لیے مناسب مشورے دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں حاملہ عورتیں ڈاکٹرنیوں، نرسوں اور دائیوں کا منہ صرف اس وقت دیکھتی ہیں جبکہ وضع حمل کا زمانہ بالکل قریب آجاتا ہے لیکن دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح سوئزرلینڈ میں بھی حاملائیں غنچے کی تیاری سے پھول کھلنے تک کوئی دس بار مشورے لیتی اور احتیاطی تدابیر اختیار کرتی ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کچھ عرصے پہلے ہر ایک ہزار نوزائیدہ بچوں میں سے ایک سو پچیس اپنی زندگی کے پہلے سال میں فوت ہو جاتے تھے۔ اب ان کی اوسط صرف ستائیس رہ گئی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں، کارخانوں اور دوسرے اداروں میں صحتی مشورے اور ہدایات دینے کے لیے باقاعدہ معالج رکھے جاتے ہیں اور ان کی خدمات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

معالجین میں امراضِ چشم کے ماہرین کی تعداد خاصی زیادہ ہے کیونکہ بعض علاقوں کے باشندوں کو ذرا سی بے احتیاطی کرنے پر آنکھوں کی شکایات لاحق ہو جاتی ہیں۔ مطلب ایسے علاقوں سے ہے جہاں قریب کے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں ہمیشہ برفانی تودوں سے ڈھکی رہتی ہیں اور موسم گرما میں سورج کی تیز شعاعیں ان پر پڑ کر ایسا انعکاس پیدا کرتی ہیں کہ رنگین شیشوں کی عینکوں کے باوجود، بسا اوقات آنکھوں میں چکاچوندسی پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے ہر وقت رنگین عینک چڑھائے رہنا ممکن نہیں ہے۔ بہت سی طبیعتیں ہر چیز کو ایک ہی رنگ میں دیکھنا گوارا نہیں کرتیں۔ قدرتی مناظر کا صحیح لطف کھلی آنکھ ہی سے میسر آسکتا ہے اور اس لیے کائنات کو عریاں نگاہوں سے دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

بس میں بیٹھے بیٹھے باہر کے مناظر نے مجھ پر اتنا گہرا اثر کیا کہ میرے حافظے کی لوح پر نہ جانے کون کون سے نقوش اُبھرتے چلے گئے اور کچھ دیر کے لیے تو میں ایسا مبہوت ہوا کہ اس ماحول کے پس منظر میں عہدِ ماضی کے بعض مناظر بھی اُجاگر ہونے لگے اور میں غائبانہ ان لوگوں کو ان کی مساعیٔ جمیل پر داد دیتا رہا، جنھوں نے انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہت ہی مفید کام انجام دیے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ آدمی اگر

عزم کرے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہی اور زندگی کا مقصد خدمت ہی کرنا ہی، انسانیت کو جگانا ہے تو پھر راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو جاتی ہی۔ بڑی بڑی مصیبتیں اور مشکلات لونڈی اور غلام بن جاتی ہیں۔

ہمارے ساتھ بس ان جرمن خاتون ہی نے یہ منظر دیکھنے کی ہمت کی۔ باقی کوئی نہیں گیا۔ میں نے ان کا بھی ٹکٹ خرید لیا۔ میں نے ان سے اپنے اس روکھے پن کی تو کوئی معافی نہیں مانگی جس کا اظہار میں نے غلط فہمی کی بنا پر اس ریستوراں میں کیا تھا، جہاں ناشتہ ہوا تھا۔ البتہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے طرزِ عمل سے ان کی اس رائے کی تکذیب کردوں گا، جو ضرور انھوں نے اپنے ذہن میں قائم کرلی ہوگی۔

یہ منظر دیکھ کر ہم ساڑھے بارہ بجے اوپر گئے اور ایک ریستوراں میں چلے گئے، جہاں ہم نے دوپہر کے کھانے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ جرمن خاتون گویا ہمارے لیے باقاعدہ گائڈ بن گئیں۔ ہم نے انھی کے ذریعہ کھانے کا آرڈر دیا۔ ان کے ساتھ ان کی ایک سہیلی بھی تھیں۔ ان کو بھی ہم نے کھانے پر مدعو کر لیا۔

ان خاتون نے برف دیکھتے ہوئے ہم سے اپنا پورا تعارف کرا دیا تھا۔ دراصل وہ جرمن تھیں مگر کئی سال سے لندن میں رہتی تھیں اور فی الوقت سفیر جاپان برائے انگلستان کے بچوں کی نرس تھیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر جاپان جرمنی کا کہنا مان لیتا اور ہٹلرِ اعظم کے کہنے پر سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کر دیتا تو یقیناً دنیا کا نقشہ اس وقت اور ہی ہوتا اور جرمنی اور جاپان آج کی طرح غلام نہ ہوتے۔ مجھے اس جاپانی سفیر پر رحم آیا، جو بے مقصد انگلینڈ میں ہی اور انگریزوں کی حکم عدولی نہیں کرسکتا اور اس جرمن خاتون پر بھی ترس آیا جو اپنا ملک چھوڑ کر غلامی در غلامی کرنے پر مجبور تھی۔

کھانے کا بل اصولی طور پر میں نے ادا کیا اور یہ جرمن خاتون اور ان کی سہیلی ہمارا بہت بہت شکریہ ادا کرنے لگیں، جس کی درحقیقت ضرورت نہیں تھی۔

ہم دونوں بھائیوں نے اپنے لیے ان دو مہمان خواتین کی فرمائش سے مختلف چیزیں منگائیں ہم نے سبزیوں اور اناجوں سے ترکیب پانے والی اشیائے خوراک کو ترجیح دی اور انھیں بھی خوب سونگھ سونگھ کر شروع کیا ہمیں معلوم تھا کہ وہاں بہت سی چیزوں میں شراب کی آمیزش بالکل اسی طرح ہوتی ہی جیسے ہمارے ہاں خوشبو کے لیے کیوڑہ کھانے کی بعض چیزوں پر چھڑک دیا جاتا ہی۔ وہ لوگ ذائقے کے لیے انگوری شراب ملاتے ہیں۔ غنیمت ہی کہ ایسی کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں آئی، یا کم سے کم ہم نے محسوس نہیں کیا۔ مٹھاس کے ضمن میں میرنگو چنٹیلی کو بہت پسند کیا۔ یوں تو یہ انڈے کی آمیزش سے تیار ہونے والا ایک قسم کا کیک تھا لیکن کریم کے بہت بڑے جزو نے اسے اس درجہ نرم کر دیا تھا کہ

ہونٹوں سے توڑنے کی نوبت آنے کا ذکر ہی نہیں تھا۔ وہ لبوں میں جنبش ہونے سے پہلے ہی معدے میں پہنچ کر ہضم ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے انگور بھی منگائے۔ غالباً اس ملک میں انگور کی کاشت اس کے کسی ایسے بیج سے شروع کی گئی ہے جسے رضوانِ جنت کی عنایت سے حاصل کیا گیا ہوگا۔ اتنا شیریں، لطیف اور خوش ذائقہ کہ کلّی غرارہ کر لینے کے بعد بھی اس کی لذّت ہمارے کام و دہن پر باقی رہی۔ اس کا چھلکا اتنا نرم اور گودے سے علیحدہ تھا کہ چٹکی کے ایک اشارے سے بالکل الگ ہو گیا، جیسے سانپ کی کینچلی اس کے جسم سے اتر جاتی ہے۔ اور اب جو منھ میں رکھا تو یہ معلوم ہوا کہ برف سے زیادہ سرد، شہد سے زیادہ میٹھی اور عطر بیز پھولوں سے زیادہ خوشبودار کوئی چیز خود بخود حلق سے نیچے اتر رہی اور سانس تک کو مہکا رہی ہے۔ بدذوق اور سخت دل لوگ اسی انگور کو گلا کر، سڑا کر شراب بناتے ہیں۔ سُنا ہے کہ اس کی کاشت اور بعد کے رکھ رکھاؤ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے ورنہ دوسری قسم کے ذرا سخت اور ترش انگور تو خودرو ہوتے ہیں اور کوئی نگاہ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھتا، صرف بھیڑ بکریاں اسے کھا کر اپنے جسم میں تازہ خون پیدا کرتی ہیں۔

واپسی تین بجے ایک نئے راستے سے شروع ہوئی۔ راہ میں متعدد شہر اور دیہات آئے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ آبادیوں کے درمیان فصل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ ملک مسلسل آباد ہے۔ لوگوں میں اکثر و بیشتر زندگی کی لہر انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے۔ شاید سبھی زندہ دل ہیں۔ ہماری بس جب بھی کسی ایسے راستے سے گزری، جہاں سڑک کے قریب ہی مکانات آباد ہیں اور مرد عورتیں یا بچے کھڑے دکھائی دیے تو انھوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارا پُرجوش استقبال کیا۔ سیاحوں کی بسیں مخصوص ہیں اور اپنے خاص رنگ کے باعث دور ہی سے پہچان لی جاتی ہیں۔ یہ لوگ ہر سیاح کا اس طرح خیر مقدم کرتے ہیں جیسے بہت ہی زیادہ انس ہو۔ ہمیں اکثر جگہ یہی منظر دکھائی دیا۔

۵ بجے کے قریب ہم ایک شہر کے وسط میں جا کر ٹھیرے۔ یہ شہر مونٹریہ ہے۔ یہاں ایک بڑے چوراہے پر ہم آ کر رک گئے۔ ایک طرف ایک بڑا ہوٹل ہے۔ دوسری طرف ٹاؤن ہال۔ ایک طرف شاید گرجا کی عمارت ہے، اور دوسری طرف دکانیں ہیں۔ بیچ میں پانی کا فوارہ لگا ہوا ہے۔ خاص طور پر چوراہوں پر اور بہت سے دوسرے مقامات پر بھی فوارے یہاں کی خصوصیت ہیں یعنی سارے سوئزرلینڈ کی خصوصیت ہے۔ ہر گاؤں، ہر قریہ اور ہر شہر میں یہ موجود ہیں اور رواں ہیں۔ ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ یہ خشک ہوں یا ان کے قریب کا منظر اداس اور پژمردہ ہو۔

جس چوراہے پر ہم کھڑے تھے، وہاں سے جس طرف بھی نگاہیں اٹھیں، کھڑکیوں میں پھولوں کے

گملے رکھے دکھائی دیے اور یہ چوراہا خاصا گوشۂ چمن معلوم ہونے لگا۔ رنگ برنگ کے پھول بہت ہی سلیقے اور خوش تعلیق طریقے سے لگائے گئے تھے۔ گملوں کے رکھ رکھاؤ میں کوئی بدسلیقگی نہیں تھی۔ یہاں آکر یہ بات ذہن میں آئے بغیر نہ رہی کہ قدرت کی فیاضی ادھوری اور نامکمل ہے جب تک کہ انسان میں ذوقِ لطیف موجود نہ ہو۔ خیر سڑکوں اور چوراہوں پر تو میونسپلٹی یا حکومت کی ہدایت پر سجاوٹ کی گئی ہوگی لیکن ہر گھر کے برآمدے اور کھڑکیوں میں آرائش کے لیے کس کا حکم ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مکینوں کے فطری رجحانات کا اس سے اندازہ ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کی تعریف کی جاسکتی تھی کہ قدرت کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کی صلاحیت اور سلیقہ ان میں موجود تھا۔ بعض بڑی سڑکوں پر پٹریوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی کیاریاں اور گھاس کے قطعات کا اہتمام کیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ چیزیں قانون کے زور سے پوری نہیں ہوتیں۔ یہ ملک کے باشندے ہیں جو ایسی باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ سوئزرلینڈ قدرت کے عطیات سے مالا مال ہے، لیکن ان عطیات کی محافظ حکومت نہیں ہے، یہاں کے لوگ ہیں جنھوں نے سوئزرلینڈ کی خوبصورتی اور حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

میں نے ابھی ابھی آپ کو بتایا ہے کہ بچے اور بڑے اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر ہر جگہ سیلانیوں کا استقبال کرتے ہیں، اس وقت ان کے چہروں پر مسرت کھلی ہوئی ہوتی ہے اور ان کی یہ مسکراہٹ اور ان کی یہ خیر مقدمی ان کی زندہ دلی کا واضح ثبوت ہے۔ میں اس سے بڑا ہی متاثر ہوا۔

شہر زیورخ میں آپ کتے، بلیاں، گائیں، گدھے، گھوڑے کہیں نہیں دیکھیں گے اور نہ علی الصباح مرغوں کی اذان سنائی دے گی، حالاں کہ آپ گوشت کھاتے ہیں، دودھ بھی افراط سے پیتے ہیں اور انڈے بھی ہر صورت میں نوش جان کرتے ہیں۔ دراصل شہر سے باہر دودھ والے جانوروں اور پرندوں کو پالا جاتا ہے اور وہاں بھی ان کو رکھنے کا خاص سلیقہ ہے۔ گائیں آبادیوں سے بالکل الگ چرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ مرغیوں کے لیے بڑے بڑے احاطے ہیں اور ان سب جانوروں کی دیکھ بھال کا خاص انتظام ہے۔ ان کو مختلف عوارض سے بچایا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی طرح ایسا یہاں نہیں ہوتا کہ گائے بیمار ہو کر مرنے کے قریب ہوئی اور اسے کاٹ کر لوگوں کو کھلا دیا یا دودھ دیتی گائے کو خواہ مخواہ کاٹ ڈالا۔ یہاں ان چیزوں پر کنٹرول ہے اور پورا نظم و ضبط ہے۔ یہ نظم و ضبط حکومت کی طرف سے عائد کردہ نہیں ہے، لوگوں نے اس ذمہ داری کو خود محسوس کیا ہے۔

تقریباً نو بجے بس نے ہمیں ہوٹل سیوائے پر لاکر چھوڑ دیا اور ہم نے لگے ہاتھوں کھانا کھا لیا۔ پھر اپنے کمرہ نمبر ۵۰۸ میں پہنچ گئے۔ نمازِ عشاء ادا کی۔ مجھے کچھ تھکن محسوس ہو رہی تھی، اس لیے جلدی ہی

سو گیا۔ بھائی جان محترم کچھ دیر اپنے جوتوں پر پالش کرتے رہے تاکہ صبح کو دقت نہ ہو پالش کا انتظام یہاں ہوٹل کی طرف سے ہے، مگر بھائی جان محترم اپنے جوتوں پر ہمیشہ خود ہی پالش کیا کرتے ہیں۔ اپنے وطن میں بھی نوکروں سے یہ خدمت کبھی نہیں لی۔ الحمدللہ میں بھی اس اصول پر عمل کرتا ہوں۔

جب ہم اپنے بنیان، موزے اور رومال خود دھو کر سوکھنے کے لیے کمرے میں لٹکاتے ہیں، تو دیکھنے والے ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، بلکہ ملازم تک زیرلب مسکراتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ اگر دن اڑتالیس گھنٹے کا ہو جائے یا ہفتہ چودہ دن کا اور ہماری مصروفیات اتنی ہی رہیں جتنی کہ اب ہیں تو شاید ہم کسی بھی ملازم سے کوئی خدمت نہ لیں۔ زمانہ طالب علمی میں سیر سپاٹے کے لیے کہیں باہر جاتے تو کھانے پینے کا اہتمام خود کرتے تھے۔ اس لیے بعض کھانے مجھے تیار کرنے آتے ہیں، اور ٹیڑھی بڑنگی روٹیاں بھی سینک لیتا ہوں۔ ان کو طباق کی طرح گول کرنا ضروری نہیں ہے۔ اپنی بے حد مصروفیات کے باعث یہ اور اس قسم کے دوسرے کام ملازموں سے لے لیے جاتے ہیں لیکن دل شرمندہ رہتا ہے کہ یہ طریقہ انسانیت کے خلاف ہے۔

---

۱۰ ستمبر ۱۹۵۶ء ——— پیر

زیورخ میں

نیویارک کے ہیرلڈ ٹربیون (پیرس ایڈیشن) میں آج صبح اٹھتے ہی یہ خبر پڑھی کہ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں فساد ہو گیا ہے اور صدر مرزا بذریعے ہوائی جہاز وہاں پہنچ گئے ہیں۔ ہمارے سفر کا پچھلا دور ایسے ملکوں میں رہا جہاں اخبارات تک انگریزی کے نہیں ملتے تھے اور نہ ہوٹل والے پاکستان سے خبریں سننے کے لیے اپنا ریڈیو استعمال کرنے دیتے تھے۔ زیورخ میں آ کر اخبارات ملنے لگے۔ چنانچہ آج کے اخبار میں اتر پردیش سے موصول ہونے والی ایک خبر شائع ہوئی ہے اور اسے اس طرح مرتب کیا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے فاقہ زدہ لوگ امریکی چاول کے بھوکے ہیں اور امریکی چاول نہ ملنے پر دنگا فساد کر رہے ہیں۔ اصل واقعہ نہ جانے کیا ہے۔ میں نے اخبار کا یہ تراشہ آغا محمد یعقوب دوداشی (نائب مدیر "ڈان" کراچی) کے نام روانہ کر دیا۔ اس کی پیشانی پر ایک سوالیہ نشان بنا دیا تاکہ وہ میرا مطلب سمجھ جائیں۔ خط تفصیل کے ساتھ لکھنے کی فرصت کہاں تھی، حاشیے پر اپنے دستخط کر دیے تاکہ وہ معلوم کر لیں کہ بھیجنے والا کون ہے۔

ہم نے جو پروگرام بنایا تھا اس میں ایک تبدیلی تو یہی تھی کہ انٹرلاکن اور لیوزرن کا فیصلہ اور پھر اسٹیمر سے جنیوا جانا ختم کر دیا تھا اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ زیورخ سے جنیوا تک کا لے لیا تھا، مگر ہم نے جب اپنے سامان کے وزن کا جائزہ لیا تو وہ بہت زیادہ تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ جتنے کا ہمارا ٹکٹ ہے، اس سے زیادہ خرچ سامان پر آ جائے گا اور پھر وقت کی بچت بالکل نہیں ہوگی اور اس کے برعکس تکلیف زیادہ ہوگی۔ ہوائی جہاز کے لیے دو بجے ٹرمنس پہنچنا ہوگا۔ وہاں سے بس میں ہوائی میدان جانا ہوگا، اور ہوائی میدان سے جہاز چار بجے روانہ ہوگا۔ آدھ گھنٹے میں جنیوا پہنچے گا۔ پھر وہاں سے ٹرمنس تک بس میں جانا اور پھر ٹیکسی میں ہوٹل پہنچنا ہوگا۔ گویا وہاں پہنچتے پہنچتے چھ بج جائیں گے۔ ریل کی صورت یہ ہے کہ وہ پانچ بجے روانہ ہوگی اور ساڑھے نو بجے جنیوا پہنچا دے گی۔ مجموعی طور پر یکساں وقت صرف ہوگا۔ کفایت کی صورت یہ ہے کہ ریل میں فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ ساٹھ فرانک میں آئیں گے جب کہ جہاز کے لیے ایک سو فرانک صرف کرنے ہوں گے۔ پھر سامان پر اندازاً سو فرانک مزید خرچ ہوں گے۔ ان سب پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہم نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ واپس کر کے ریل کے لے لیے۔ یہ سب

کارروائی وقت سے پہلے اس لیے کرالی کہ عین موقع پر دقّت نہ ہو یا ریل میں سیٹ نہ ملے اور ہم نہ اِدھر کے رہیں اور نہ اُدھر کے۔ حالانکہ یہ بھی معلوم تھا کہ فرسٹ کلاس کے بہت سے ڈبے خالی رکھے جاتے ہیں تاکہ وقتِ ضرورت کام آئیں۔

سوئزرلینڈ میں اگر ریلوے کا نظام ۱۸۴۷ء سے پہلے قائم نہیں ہوسکا اور جب قائم ہوا تو زیورخ اور بیدن کے درمیان محدود رہا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں کے باشندے قدامت پسند ہیں یا بہت ہی سادہ لوح ہیں، بلکہ اس کا سب سے بڑا سبب قدرتی طور پر زمین کی ایسی ساخت ہے کہ اس پر ریلوں کی آمدورفت کے لیے لوہے کی پٹریوں کا جال بچھانا آسان کام نہیں تھا بعض اہم شہر فاصلے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود فلک بوس پہاڑوں اور گہری وادیوں کے پُرپیچ راستوں میں اس طرح گھرے ہوئے ہیں کہ پرانی وضع کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں تو ان پر آسانی سے چل سکتی تھیں، لیکن لمبی لہکاری اور نسبتاً تیز رفتار ریل گاڑیوں کا نظام اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ ایک طرف مسافروں اور ریل کے عملے کے لیے اور دوسری طرف ریلوے لائن کے قریب اور نشیبی وادیوں میں بسنے والوں کے لیے مناسب حفاظتی تدابیر اختیار نہ کرلی جائیں۔ پھر ایسے ملک میں جہاں انجن کا سینہ گرم کرنے کے لیے کوئلہ یا کوئی اور ایندھن نایاب ہو یا باہر سے ایسی چیزیں بمشکل میسر آسکتی ہوں ضروری تھا کہ ریلوے نظام قائم کرنے سے پہلے برقِ آبی کے کارخانے قائم کیے جائیں تاکہ بجلی کی رَو بھاپ کا نعم البدل بن سکے۔ اور یہ کام بھی بجائے خود کچھ آسان نہیں تھا۔ چنانچہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں سوئزرلینڈ میں آمدورفت کا یہ طریقہ ذرا دیر میں رائج ہوا اور جب اسے رواج دینے کی ضرورت عوام نے محسوس کی تو وہ خود سرگاڑی اور پاؤں پہیہ بن گئے۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے باشندوں کو بالکل اسی طرح "ریلوے ہوگئی" جیسے کسی کو گٹھیا، بدہضمی یا پلوریسی ہوجاتی ہے۔

یہ ۱۸۷۲ء کا ذکر ہے۔ اس وقت منصوبہ بندی میں تیز رفتاری دکھانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حکومت نے ریلوے کا نظام اپنی تحویل میں لینے کے بجائے جملہ اختیارات نجی سرمائے سے قائم ہونے والی ریلوے کمپنیوں کو سونپ دیے تھے اور اس دوڑ میں آگے بڑھ جانے کے لیے ان میں مقابلہ چل پڑا تھا۔ ان میں سے بعض کمپنیاں کچھ دور گھسٹ کر ہمت ہار بیٹھیں اور ریل چلانے کے بجائے خود چل بسیں، اور بعض نے اپنا کام تو پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا لیکن آئندہ اس نظام کو

قائم رکھنے کی سکت ان میں باقی نہ رہی۔ اس لیے بعض ایسی دشواریوں کا انھیں بھی احساس ہونے لگا، جن کا اندازہ پہلے نہیں لگایا گیا تھا۔

دوسری طرف عوام جو نئی سواری کے لیے بے چین تھے، اس کو ناقص پاکر حکومت سے مطالبہ کرنے لگے کہ وہ یہ سارا نظام اپنی تحویل میں لے لے۔ ان کمپنیوں کا دستور یہ تھا کہ جب مرضی ہوتی گاڑیاں چلائی جاتیں اور جب مناسب معلوم نہ ہوتا، وہ روک دی جاتیں۔ پھر چونکہ بعض کمپنیاں خود ہی فوت ہو گئی تھیں، اس لیے زنجیر کی وہ کڑیاں بیچ بیچ میں سے گم شدہ رہیں، جن کو ایک سلسلے میں ملا دینا ان کا فرض تھا۔ انجام کار عوام کا جوش اور جوش کے باعث مطالبہ کامیاب رہا اور حکومت نے ۱۸۹۸ء میں تمام پرائیویٹ کمپنیوں کو توڑ کر اس نظام پر سرکاری ٹھپّہ لگا دیا۔ اس طرح بڑی شان کے ساتھ سوئس فیڈرل ریلوے کا افتتاح ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ ریلوے لائنوں کی کل لمبائی ۱۸۶۰ میل تھی۔ ایک چھوٹے سے پہاڑی ملک میں یہ بھی بہت ہے۔ نوّے فی صدی مسافر پرانے وسیلے چھوڑ کر ریل گاڑیوں میں سفر کرنے لگے۔

ریلوے لائنیں سب سائز کی ہیں اور ہر بلندی پر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ فراؤ ریلوے لائن کی تعمیر انجینیرنگ کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ وہ ۱۱ ہزار ۳ سو فیٹ کی بلندی سے گزرتی ہے۔ اس لحاظ سے یورپ میں سب سے زیادہ بلند اور جاذبِ توجہ ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تمام ریلیں بجلی سے چلتی ہیں۔ ان کو چلانے سے پہلے ایسے مناسب مقامات پر بجلی گھر تعمیر کرنے پڑے جہاں پانی کے تیز دھارے برقِ آبی تیار کرنے میں ممد و معاون ہو سکتے تھے۔ پھر بجلی گھروں کے محل وقوع کے لحاظ سے ریلوے لائنیں بچھانی پڑیں۔

ان ریلوے لائنوں نے ملک کے سیاسی استحکام کو بھی بہت فائدہ پہنچایا۔ چوں کہ وسطی علاقے میں بعض اونچے پہاڑ واقع ہیں، اس لیے شمال کے ڈانڈے جنوب سے ملانے کے لیے سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیر کر سرنگیں بھی بنانی پڑیں۔ بعض سرنگیں بہت ہی طویل ہیں۔ مثلاً سمپلون ۴ء۱۲ میل، سنٹ گوتھارڈ ۳ء۹ میل اور لوش برگ ۱ء۹ میل لمبی ہے۔ اس طرح اربابِ اقتدار کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ ایک حصے میں رہ کر دوسرے حصے کا نظم و نسق قائم رکھ سکیں۔

اس نظام کی افادیت پر ایک ہلکی سی ضرب اس وقت لگی جب ملک میں موٹر گاڑیوں نے

رواج پانا شروع کیا۔۔ ۱۹۱۰ء میں ان کی تعداد صرف سات ہزار تھی، جو چالیس سال بعد بڑھ کر ۳ لاکھ ۲۰ ہزار ہو گئی اور سیاح بھی جو ملک کے لیے ایک بڑا ذریعۂ آمدنی ہیں، ریلوں کو چھوڑ کر موٹروں میں سفر کرنے لگے۔ اس ترجیح کے لیے ان کے پاس دلیل یہ ہے کہ ان دل کش پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے بعض ایسے حسین مقامات بھی آتے ہیں جن کو ایک نظر دیکھ لینے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے کہ جوانی کے سائے کی مانند تیزی سے گزر جانے کے بجائے اٹھکھیلیاں کرنے والی بادِ بہاری کی طرح آہستہ آہستہ چلا جائے اور جہاں ضرورت ہو، نقش کفِ پا بن کر بیٹھ جایا جائے، تاکہ آئندہ کبھی ان رنگین لمحات کی یاد دل میں تازہ ہو تو یہ کہا جا سکے ؎

خوشا روزگارے، لود بہ نگارے
لبِ جوئبارے، بزیرِ چنارے

سوئٹزرلینڈ کے شہروں کے درمیان فاصلے اتنے قلیل ہیں کہ ہوائی ذریعۂ سفر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ دوسرے ملکوں تک پہنچنے کے لیے تو ہوائی جہازوں کا نظام قائم کیا گیا ہے لیکن ملک کے اندرونی حصوں کے لیے اسے کم فروغ حاصل ہوا ہے۔

ریلوے کا نظام اس ملک میں کافی ترقی پا جانے کے باوجود ادھورا کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پہاڑی مقامات کے بعض راستے ایسے ہیں جہاں ریل کی پٹری کسی عنوان بچھائی نہیں جا سکتی اور چونکہ ڈاک کا نظام قائم کرنا حکومت کا فرض ہے، اس لیے ایسے مقامات تک پہنچنے کے لیے ڈاک خانے کی طرف سے خاص قسم کی موٹر گاڑیاں چلائی گئیں۔ ان موٹر گاڑیوں سے بعض اوقات محکمے کو نقصان بھی ہوتا تھا کیونکہ اکثر مقامات تک صرف چار پانچ خط یا ایک دو منی آرڈر وغیرہ لے جانے کے لیے گاڑیوں کو طویل مسافت طے کرنی پڑتی اور اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے محکمے نے یہ تدبیر سوچی کہ ڈاک کی چیزوں کے علاوہ مسافروں کو بھی لے جانا شروع کر دیا اور اسے اتنا رواج دیا کہ لوگ اس کے عادی اسی طرح ہو گئے، جیسے بسوں میں سفر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لہٰذا محکمۂ ڈاک اپنا مقصد پورا کرنے کے ساتھ ساتھ خسارے سے بچنے، بلکہ فائدہ اٹھانے کے لائق ہو گیا۔ سوئٹزرلینڈ کی دیکھا دیکھی یہ نظام ایسے اور ملکوں نے بھی اختیار کیا جن کے ارضی طبقات کی ساخت اس سے ملتی جلتی تھی۔

اگرچہ ڈاک گاڑیوں کا اوّلین مقصد خطوط، پارسل، پیکٹ، منی آرڈر وغیرہ لے جانا ہے

لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان کی وجہ سے مسافروں کی آمد و رفت میں تاخیر ہو جائے۔ بالکل ریل گاڑیوں کی طرح ڈاک کے ڈبے چلتے ہیں اور اپنے مقررہ اسٹیشنوں پر صحیح وقت پر پہنچ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جن دیہات کے ڈاک خانے ان گاڑیوں کی آمد و رفت والی سڑک کے قریب واقع نہیں ہوتے وہاں ہرکارے ڈاک کا سامان لے کر پہلے سے پہنچ جاتے ہیں اور گاڑی صرف اتنی دیر رکتی ہے کہ اس گاڑی کی ڈاک وغیرہ لے کر آگے جانے والی ڈاک اس کے سپرد کر دی جائے۔ آندھی ہو یا برسات، گرمی ہو یا سردی ڈاک خانے کی یہ گاڑیاں برابر چلتی رہتی ہیں۔

ہم ہوائی جہاز کا ٹکٹ واپس کر کے اور ریل کا ٹکٹ لینے کے بعد مطمئن ہو گئے۔ پان امریکن ورلڈ سروس کے اب تک کے دفاتر سے جو واسطہ پڑا ہے، اس کا بڑا تلخ تجربہ ہوا اور میری رائے میں یہ لوگ قطعاً قابلِ بھروسہ نہیں ہیں، مگر یہاں زیورخ کے دفتر کے آدمی حیرت انگیز طور پر اچھے ہیں۔ بالخصوص ہمارا واسطہ جس آدمی (مسٹر میورخ) سے پڑا، وہ بہت ہی ہمدرد اور معاون ثابت ہوا اور ہمارا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر دیا اور ہمارے فائدے کا بھی خیال رکھا۔ ہم نے نجی طور پر اس سے کہا کہ کونٹونل اسپتال کی سکریٹری صاحبہ سے اسپتال دیکھنے کا وقت مقرر کرا دیں، تو بڑی خندہ پیشانی سے اس نے یہ کام کر دیا۔ ہم نے اس شخص کو ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک خوبصورت سگریٹ پائپ تحفۃً پیش کیا۔ اسے لے کر وہ بے حد خوش ہوا۔ ہم نے اس کے برتاؤ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آپ اچھے آدمی ہیں۔ امریکن ایکسپریس آپ پر فخر کر سکتا ہے۔

ہمارے تحائف کا بکس، جو بلغراد سے کھٹائی میں پڑا ہوا تھا، آخر کار زیورخ پہنچ گیا اور ہم اسے لینے کے لیے مین ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ یہاں یہ کسٹم میں رکا ہوا تھا۔ یہ ریلوے اسٹیشن اتنا بڑا ہے کہ یہاں کسی شعبے کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ مگر اچانک اور اتفاقاً میری نگاہ ایک آدمی پر پڑی جس کی ٹوپی پر INFORMATION لکھا ہوا تھا۔ اس سے میں نے پارسل حاصل کرنے کے لیے صحیح جگہ معلوم کی۔ اس نے فوراً مجھے صحیح جگہ پہنچا دیا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر معلومات کے دفتر ضرور ہوتے ہیں اور وہاں سے ہر قسم کی اطلاعات مل جاتی ہیں لیکن یہ چلتے پھرتے "مسٹر اطلاعات" نہیں دیکھنے میں آئے۔ یہ تو زندگی میں ہمارا پہلا تجربہ تھا۔

وہ رسید دکھانے پر جو ہمیں ویانا سے ملی تھی، پارسل فوراً آ گیا اور میں نے اسے کھول کر میز پر سامنے رکھ دیا۔ اس اہل کار نے کسی اور بڑے افسر کو بلایا اور میں نے اسے اپنے سفر کا لائحہ عمل بتایا اور کہا کہ یہ دوستوں کے لیے تحائف ہیں، کچھ اور نوعیت ان کی نہیں ہے، اس نے فوراً ایک

فرانک وصول کر کے پارسل ہمارے حوالے کر دیا۔

یہاں کے لوگ طبعاً اعتماد کرتے ہیں۔ بلغراد میں کسٹم والوں کی بدسلوکی اور اس جگہ کا حال دیکھ کر ان لوگوں کے لیے اچھی رائے قائم کرنی پڑی۔ یہاں اعتماد کا تو یہ حال ہے کہ ہر جگہ دکانوں کے باہر مال آراستہ ہے۔ فوٹو، البم، اخبار اور لکڑی کے کام کی جتنی چیزیں ہیں، سب باہر رکھی رہتی ہیں آپ پسند کیجیے اور دکان کے اندر جا کر پسندیدہ چیز دکھا کر قیمت ادا کر دیجیے۔

آج ایک مقام پر یہ چیز بھی مشاہدے میں آئی کہ دکانیں بند ہیں اور ضرورت کی چیزیں مثلاً سنگترے، مکھن، سگریٹ، دیا سلائی کے بکس وغیرہ ایک خانے دار الماری میں رکھے ہیں۔ آپ مقررہ قیمت ڈالیے۔ ایک مخصوص حصے کا ڈھکنا کھل جائے گا۔ آپ چیز لے جائیے۔ گویا دکان بند ہونے اور دکان دار کے موجود نہ ہونے پر کوئی دقت آپ کو نہ ہوگی۔

دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہاں مقررہ ناپ اور وزن کے کھوٹے سکے ڈال کر لوگ چوریاں نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ کراچی کے صدر ڈاک خانے میں ڈاک کے ٹکٹ بیچنے کی ایک مشین لگائی گئی تھی آپ ایک اِکنّی ڈالیے اور ٹکٹ باہر آجائے گا۔ ہمارے ہاں لوگوں نے کھوٹے سکے اور مقررہ سائز اور ناپ کے ٹکڑے بنا کر ٹکٹ چرانے شروع کر دیے۔ حتیٰ کہ یہ مشین ڈاک خانے والوں کو ہٹانی پڑی۔ ذرا اس فرق کو محسوس تو کیجیے۔ آپ کو ٹکٹوں کی ایسے وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے جب کہ عموماً ڈاک خانہ بند ہوتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ایسی مشینیں نصب ہو جائیں تو کیا ہمارا وقت بچنے کے ساتھ ساتھ ہمیں سہولت نہ ہوگی۔

ذرا ٹیلی فونوں کا حال سنیے۔ زیورخ میں چپے چپے پر، ہر چوراہے پر سرکاری ٹیلی فون لگے ہوئے ہیں۔ آپ بڑے اطمینان سے جب اور جس وقت چاہیں ٹیلی فون استعمال کیجیے۔ ٹیکسیوں کو بلانے کے لیے جگہ جگہ ٹیلی فون نصب ہیں اور ان کے ساتھ ہی ٹیلی فون کے نمبروں کی فہرست آویزاں ہے۔ آپ جس جگہ سے ٹیلی فون کریں، وہیں کھڑے ہو جائیے، ٹیکسی آپ کے سامنے آکر رک جائے گی اور زیادہ دقت نہیں لگے گا۔ خود ہم نے ایک بار ایسا کیا۔ اب ذرا کراچی میں پبلک ٹیلی فونوں کے حالِ زار پر غور کیجیے۔ ہماری حکومت نے عوام کی سہولت اور ضرورت کا خیال کرتے ہوئے بڑے اہتمام سے شہر میں متعدد جگہ یہ آلات لگوائے۔ یہ یقیناً ایک مفید اسکیم تھی اور متمدن شہروں میں ایسی چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ایک دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ کہیں ٹیلی فون کا رسیور غائب ہو گیا اور کہیں پورا آلہ کہیں اڑ گ

غلط طریقہ استعمال سے بے کار کر دیا گیا۔ بعض جگہ ٹیلی فون بوتھ کے دروازے ہی توڑ دیے گئے۔ بعض شریف زادوں نے ایسا بھی کیا کہ ڈاک خانے کی مشینوں کی طرح ٹیلی فون کے خانے میں سے بھی پیسے چرانے شروع کر دیے اور اس میں بھی کھوٹے سکے ڈالے گئے۔ غرض یہ ہے کہ ہر قسم کی ناجائز کارروائی کی گئی اور اس طرح اسکیم خاک میں مل گئی۔ گویا آرام اور ضرورت کی چیز ختم ہو گئی۔

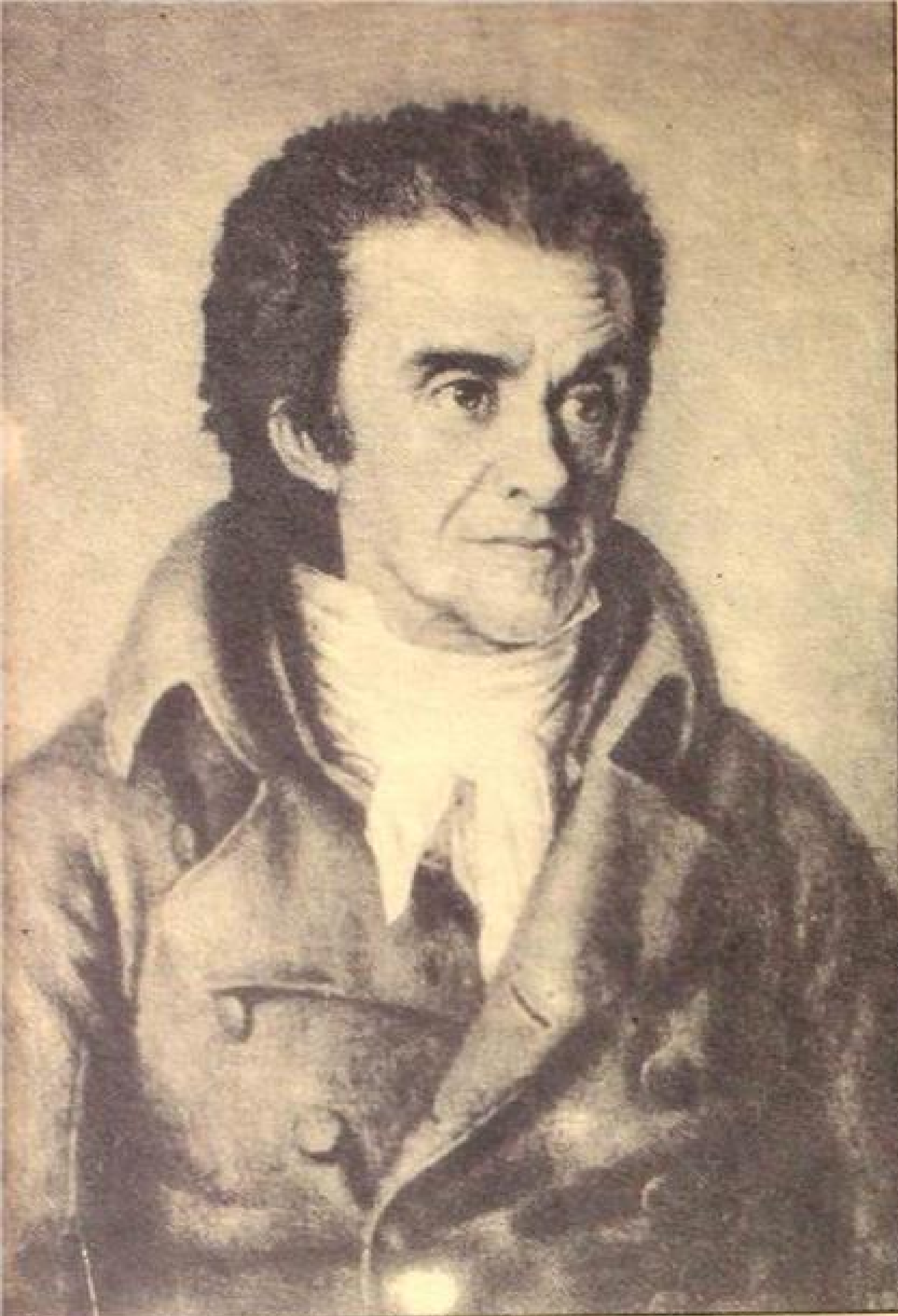
میرا خیال ہے کہ ٹیکسیوں کو بلانے کے لیے اگر ہمارے ہاں ایسے ہی فری ٹیلی فون لگ جائیں جیسے کہ یہاں لگے ہوئے ہیں تو اول تو سرے سے ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائیگا اور دوسرے یہ کہ محض چھیڑ خانی کی غرض سے ٹیکسی والوں کو خواہ مخواہ ٹیلی فون کیا جائیگا اور ان کے پہنچنے پر دور کھڑے ہو کر ان کا تماشہ دیکھا جائیگا۔ یہاں تک کہ ڈرائیور تنگ آ کر فون پر اعتماد کرنا چھوڑ دینگے اور اس طرح ضرورت مندوں کو نقصان پہنچے گا۔

یہ صورتِ حالات ایسی نہیں ہے کہ مایوس ہو کر ہم بیٹھ جائیں، بلکہ ہمیں اور ہماری حکومت کو سب پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ عوام کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اور کیونکر ایک صحت مند معاشرے کو جنم دیا جا سکتا ہے۔

میں اب تک یہاں کے حالات سنا ہی کرتا، یا کتابوں، رسالوں میں پڑھا ہی کرتا تھا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا لیکن اب یہ آنکھوں دیکھی بات ہے اور حقیقتاً میری گردن شرم سے جھک جاتی ہے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ ہمارے ملک کی فضا کیوں نہیں بدلتی۔ میرے دل میں تڑپ پیدا ہو رہی ہے کہ ہم کیوں کر ان حالات کو بدل سکتے ہیں۔

ہمارے آج کے پروگرام میں پستالوزیانم دیکھنا درج تھا۔

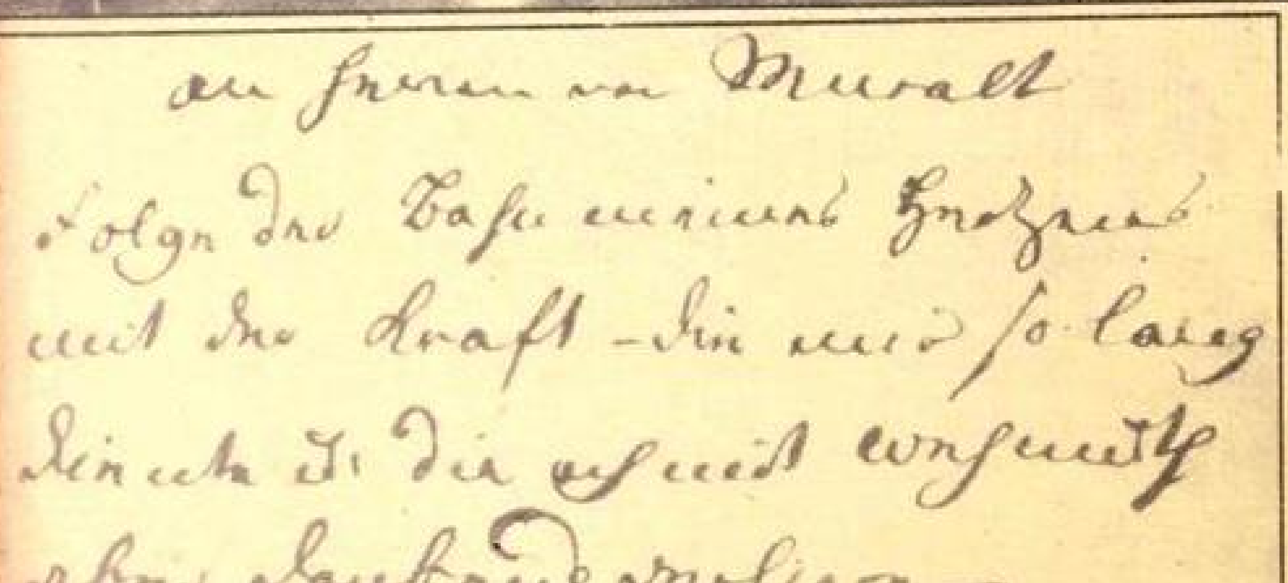
جوہان ہنریخ پستالوزی کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے۔ سوئٹسان کا یہ مصلح تعلیمات بمقام زیورخ ۱۲ جنوری ۱۷۴۶ کو پیدا ہوا اور ۱۷ فروری ۱۸۲۷ کو فوت ہوا تھا۔ وہ کم سن تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بچاری ماں نے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ شروع میں وہ سیاست میں حصہ لینے لگا لیکن جب اس کا عزیز دوست اور ساتھی بلنٹ شلی اچانک فوت ہو گیا تو اس کا بازو ٹوٹ گیا اور ہمت جواب دے گئی۔ اس نے سیاست کو چھوڑ کر تعلیمات کی طرف توجہ دی۔ یوں بھی وہ عوام کی اصلاح چاہتا تھا اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ سیاست کے میدان میں براہِ راست اصلاحی پہلو اختیار کر لینا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ صحیح نظامِ تعلیم کے ذریعے لوگوں کو پہلے ٹھیک راہ پر چلایا جائے تاکہ سیاست کا میدان خود ہی ہموار ہو جائے۔ اس نے خود ہی ایک مدرسہ قائم کیا اور کئی کتابیں لکھیں، مگر زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ لوگ چاہتے تھے کہ ہمارے بچے ذرا بڑے ہوتے ہی کام کاج



جوہان ہنریخ پستالوزی



پستالوزی اپنے
ایک شاگرد کیساتھ



پستالوزی کی ایک تحریر کا عکس

میں لگ جائیں۔ پڑھ لکھ کر کیا کریں گے۔ بہر حال انھیں وہی کام کرنا ہے جو باپ دادا کے وقت سے چلا آرہا ہے۔ جب باپ دادا نے نہیں پڑھا تو یہ پڑھ لکھ کر کیا تیر مار لیں گے۔ ۱۷۹۸ء میں فرانس نے سوئزرلینڈ پر حملہ کر دیا۔ لڑائی میں بہت سے مارے گئے۔ عورتیں اغوا کر لی گئیں اور بچے بے یار و مددگار باقی رہ گئے۔ جھیل لیوزن کے کنارے ان کا عارضی کیمپ تھا۔ بھلا والدین کا سایہ ختم ہو جانے کے بعد ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور دکھ درد کا خیال کون رکھ سکتا تھا۔ پستالوزی نے ان لاوارث بچوں کو ایک شکستہ خانقاہ میں جمع کیا اور اپنی پونجی صرف کر کے ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے علاوہ ان کی تعلیم کا بھی خیال رکھنے لگا۔ لیکن جون ۱۷۹۹ء میں فرانسیسی فوج نے اسپتال بنانے کے بہانے خانقاہ پر قبضہ کر لیا۔ تاہم وہ اس حق تلفی سے دل برداشتہ نہیں ہوا بلکہ اپنی اس "کثیر اولاد" کو ساتھ لیے نئے افق کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اسے جہاں بھی سہارا ملا، اس پر عارضی تکیہ کر لینا مناسب سمجھا۔ حتیٰ کہ ۱۸۰۵ء میں جھیل نوشیتل کے کنارے ایک مستقل جگہ مل گئی، جہاں رہ کر وہ پورے ۲۰ سال تک مفید خدمات انجام دیتا رہا۔ اس دوران میں اس نے متعدد کتابیں لکھیں بعض میں فلسفہ تعلیمات پر نہایت عالمانہ اور فاضلانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ ابتدائی سے اعلیٰ جماعتوں تک کے لیے کتب نصاب مرتب کیں اور ان میں اپنے نظریات کا خاص خیال رکھا۔ اس نے اٹھارھویں صدی کے شروع میں جو رائے قائم کی تھی۔ سارے یورپ اور یورپ سے باہر کے ملکوں کے لیے وہ آج بھی مشعلِ راہ ہے۔ ماہرین تعلیمات انھی نظریات کی روشنی میں لائحہ عمل تیار کرتے ہیں اور اس کے معیّن کردہ اصولوں پر چلتے ہیں۔ جب وہ زندہ تھا تو یورپ کے بڑے بڑے ماہرینِ تعلیمات اس سے ملنے آتے تھے اور آج جبکہ اسے فوت ہوئے دو سو سے زیادہ سال گزر چکے ہیں، لوگ اس کی یادگار عمارت میں آتے اور اپنے خیالات کو جِلا دیتے ہیں۔

پستالوزی ۱۸۲۵ء میں اپنے فرائض سے سُبک دوش ہو کر وطن واپس چلا گیا۔ اب اس میں کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ ابتدائی دُکھ درد کے غم و اندوہ نے اور بعد کی محنتِ شاقہ نے اسے نڈھال اور کمزور کر دیا تھا۔ یوں بھی اس کی عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ عام انسانوں کے قویٰ ۶۰۔۶۵ سال کے بعد جواب دے جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس نے بڑی ہمت سے کام لیا تھا۔ اسے پوری طرح احساس تھا کہ میں اس مشغلے کو ختم کرنے سے پہلے اپنے نظریات کی عملی طور پر تکمیل کر دوں، اور عزم و ارادے کے اس دھنی نے وہ سب کچھ کر دکھایا جو اس کے دل و دماغ پر مرتسم تھا۔ اس کی جملہ تصانیف اس کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کی

زندگی اور کارناموں پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہر صاحبِ نظر نے اس کی اعلیٰ خدمات کی داد دی ہے۔

ہم پستالوزیانم دیکھنے تو چلے گئے، مگر وہاں پہنچ کر افسوس ہوا کیوں کہ پرانی عمارت کی مرمت اور نئے حصوں کی تعمیر کے باعث ادارے کا کام تقریباً بند تھا اور کارکنوں کو چھٹی دے رکھی تھی۔ ایک صاحب، جو شاید انچارج تھے، اتفاق سے مل گئے۔ انھوں نے بتایا کہ کوئی ایک سو ہزار یعنی ایک لاکھ کتابیں بڑی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا موضوع تعلیم ہے۔ پھر نمائش کی بے اندازہ چیزیں ہیں۔ استادوں کی تربیت کا مرکز ہے۔ پھر بچوں کی علیحدہ لائبریری ہے، جو مکمل ہو چکی ہے اور فی الحال یہی دیکھی جا سکتی ہے۔ میں نے شعبۂ فروخت سے کچھ تصاویر خریدیں اور پھر ہم بچوں کی لائبریری دیکھنے چلے گئے۔

یہ دوسری منزل پر ایک صاف ستھری جگہ ہے۔ نیچے کی منزل میں دنیا بھر کے بچوں کی بنائی ہوئی رنگین تصاویر (پینٹنگز) جمع کی گئی ہیں۔ لائبریری کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۵ سال کے بچوں کے لیے ——— ۱۰ سال کے بچوں کے لیے ——— بڑے بچوں کے لیے۔ اگرچہ ہال ایک ہی جگہ ہے، مگر مختلف رنگوں سے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ننھے بچوں کے کمرے میں ننھی الماریاں اور ننھی ننھی کرسیاں رکھی ہیں۔ ان بچوں کی کتابوں پر نیلے رنگ کی ایک پٹی ہے۔ درمیانی عمر کے بچوں کے لیے سرخ رنگ منتخب کیا گیا ہے۔ اور سب سے بڑے بچوں کے لیے زرد رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان رنگوں کے فرق میں تفسیاتی پہلو پنہاں ہے۔ نیلا رنگ افقِ نظر کا ترجمان ہے۔ بچے کو اس منزل میں ذرا تیزی سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ سرخ رنگ طبیعت کی چونچالی اور کھلنڈرے پن پر دلالت کرتا ہے۔ زرد رنگ میں غور و فکر کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایک اور بات ہے، قوسِ قزح میں بھی رنگوں کی یہی ترتیب ہوتی ہے۔

لائبریری کا انداز نیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بچے انڈکس دیکھیں اور کتاب طلب کر لیں، بلکہ جدید امریکی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ کتابیں الماریوں میں سلیقے سے لگی ہوئی ہیں اور بچے خود خانوں میں سے ان کو پسند کر کے نکالتے ہیں۔ اس لائبریری میں فی الحال پانچ ہزار کتابیں ہیں۔ انچارج نے بتایا کہ ہفتے میں چار دن ۲ بجے سے ۵ بجے تک لائبریری کھلتی ہے۔ پرسوں کوئی ۳۶ کتابیں اِشوع ہوئی ہیں اور کوئی ڈھائی سو بچے اس لائبریری میں آئے ہیں۔

زیورخ میں بچوں کے لیے اور بھی لائبریریاں ہیں، مگر وہاں وہی پرانا انداز ہے کہ بچے انڈکس لیے کتابیں منتخب کر رہے ہیں۔ کتاب بچوں کے سامنے نہیں ہوتی۔ نئے طریقے کے مطابق کتاب بچے کے

سامنے ہوتی ہے اور وہ اس میں زیادہ دل چسپی لیتا ہے۔ انچارج نے مزید بتایا کہ ہم نے امریکا میں قائم بچوں کی لائبریریوں کی طرح بچے کی ہر کتاب جمع کرنے سے احتراز کیا ہے، بلکہ لائبریری میں داخل کرنے سے پہلے ہر کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ صحیح چیز جو بچوں کے لیے مفید ہو، کتب خانے میں آسکے۔ جو کتاب مضر سمجھی جاتی ہے اسے ہرگز داخل نہیں کیا جاتا۔ اس کے برعکس امریکا نفسیات میں مہارت کا دعوے دار ہے مگر وہاں بچوں کی لائبریریوں میں ایسی کتابیں بھی موجود ہوتی ہیں جو مفید ہونے کے بجائے مضر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری لائبریری میں کتابوں کی تعداد ابھی کم ہے۔

میرے دریافت کرنے پر انچارج نے بتایا کہ رنگوں میں فرق کا ایک اور منشا بھی ہے اور وہ یہ کہ بچہ جو کتاب پسند کر کے لاتا ہے، اسے دیکھ کر فوراً معلوم کر لیا جاتا ہے کہ یہ عمر کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔ زیادہ غور و خوض کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مثلاً ۵ سے ۹ سال عمر کا بچہ اگر زرد رنگ کی پٹی والی کتاب نکال لائے گا تو ہم اسے سمجھا سکیں گے کہ وہ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس طرح ہم غلطی سے بچ جائیں گے اور بچہ بھی غیر موزوں کتاب لے جا کر مایوس نہیں ہوگا۔

ہمارے پروگرام میں "پستالوزی چلڈرنز ویلیج" دیکھنے کا پروگرام بھی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ گاؤں میں ہے جو زیورخ سے کافی فاصلے پر ہے اور افسوس ہے کہ ہم اسے دیکھنے کے لیے نہ جا سکیں گے۔ حالاں کہ وہ قابلِ دید مقام ہے۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بچوں کا یہ شہر آباد ہوا اور اس میں وہ بچے رکھے گئے، جن کے والدین جنگ کے زمانے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ حکومت سوئٹزرلینڈ ان کے اخراجات کی کفیل ہے۔ پستالوزی نے اپنے عہد کی ایک لڑائی کے بعد ایسا ہی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس علاقے میں الگ الگ "کولونیاں" بنی ہوئی ہیں۔ ایک ملک کے بچے ایک ہی کولونی میں رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً اٹلی کی ایک کولونی ہے۔ اس میں تمام بچے وہ ہیں، جن کے والدین اطالوی تھے۔ ان کے لیے اطالوی استادوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اطالوی ثقافت و روایات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس طرح ہر ملک کے بچے الگ الگ آباد ہیں۔ تاہم وہ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے ہیں تاکہ نسلی یا قومی تعصب ان میں پیدا نہ ہو، بلکہ انفرادیت کے ساتھ ساتھ ان میں عالمی برادری کا تصور بھی رنگ جماتا ہے۔ یہ بستی یورپ کے بچوں تک محدود ہے۔ وہاں ایشیا یا مشرقِ وسطیٰ کے بچوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکالی گئی ہے۔ وہاں تعلیم ابتدائی درجے سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچے چاہیں تو اپنے ملکوں کو چلے جائیں اور وہاں سلسلہ تعلیم جاری رکھیں اور پسند کریں تو اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی سوئس یونیورسٹی میں داخل ہو جائیں۔

یہ تو رہا ایک مخصوص ادارے کا حال۔ مناسب یہ ہے کہ سارے نظامِ تعلیم پر ایک نظر ڈالی جائے۔

سوئزرلینڈ کے وفاقی آئین کی دو دفعات میں ابتدائی تعلیم کا ذکر ہے۔ دفعہ نمبر ۲۷ (۲-۳-۴) میں درج ہے کہ ابتدائی تعلیم کا انتظام کرنا صوبوں کا فرض ہوگا۔ یہ تعلیمی نظم ونسق مناسب و موزوں ہو اور کلیتہً شہری اربابِ حل وعقد کے سپرد ہو۔ ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور سرکاری مدرسوں میں مفت ہو۔ سرکاری مدرسوں میں ہر مذہب وملّت کے بچوں کا داخلہ عام ہوگا اور انھیں ضمیر و خیال کی آزادی نصیب ہوگی۔ ان کے عقائد کو نہ تو کچلا جائے گا اور نہ اس اعتبار سے ان کو کوئی سزا دی جائیگی۔ اگر کوئی ضلع ان قواعد کی تعمیل میں کوتاہی کرے تو وفاق اس سے باز پرس کر سکے گا۔

دفعہ نمبر ۴۹ (۱-۲-۳) میں بھی آزادئ خیال کے بنیادی اصولوں کی واضح طور پر حفاظت کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ضمیر اور عقائد کی آزادی ناقابلِ انفساخ ہوگی۔ کسی مذہبی انجمن میں شریک ہونے، مذہبی ہدایات پر عمل کرنے یا مذہبی فرائض ادا کرنے کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ نیز کوئی مذہبی رائے رکھنے یا اس کو ظاہر کرنے پر کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔

اعلیٰ تعلیم سے متعلق وفاقی آئین مجریہ ۱۸۴۸ء میں یہ دفعات قابلِ غور ہیں۔ دفعہ ۲۲۔ وفاق ایک سوئس یونیورسٹی اور فنیات کا ایک ادارہ قائم کر سکتا ہے۔ ۱۸۷۴ء کے آئین کی رو سے، جواب رائج ہے، دفعہ ۲۷ (۱) میں لکھا ہے کہ وفاق، فنیات کے موجودہ ادارے کے علاوہ ایک وفاقی یونیورسٹی اور دوسرے اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کرنے کا مجاز رکھتی ہے یا ایسے اداروں کو مالی امداد دے سکتا ہے۔ مالی امداد پانے والے اداروں کا نظم ونسق کمیشنوں کے ماتحت ہوتا ہے، جو وفاقی اربابِ اقتدار کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔

ہر تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے ضلعوں اور جمعیتوں کے اربابِ حل وعقد کا فرض یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ مدرسے میں داخل ہونے کے لائق ہر بچہ کسی سرکاری یا نجی مدرسے میں داخل ہے یا نہیں۔ اس موقع پر ایسے بچوں کی خاص تعلیم و تربیت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے جن کی دماغی صلاحیت میں نقص ہو یا وہ جسمانی اعتبار سے معذور ہوں۔

نجی مدرسوں کے لیے لازمی ہے کہ ان کا معیارِ تعلیم سرکاری مدرسوں کے معیار کے برابر ہو۔ چنانچہ بعض ضلعوں میں قانون نافذ ہے کہ سرکاری حکام نجی مدرسوں کا وقتاً فوقتاً معائنہ کر سکتے ہیں، اور آزمائش کے طور پر امتحان لے سکتے ہیں بعض ضلع ایسے بھی ہیں، جہاں سرکاری اور نجی مدارس کے طلبا کا امتحان ایک ساتھ لیا جا سکتا ہے، تاکہ تعلیم کا معیار یکساں رہ سکے۔

اس وقت جو اعداد و شمار دستیاب ہو سکے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہو کہ ابتدائی تعلیم کے نجی مدرسوں میں ۵۶۱۵۱ لڑکے اور ۵۶۱۰ لڑکیاں اور سرکاری مدرسوں میں ۲۳۱۶۲۳ لڑکے اور ۲۳۴۰۸ لڑکیاں، ثانوی تعلیم کے نجی مدرسوں میں ۲۷۹۲ لڑکے اور ۳۹۸۳ لڑکیاں اور سرکاری مدرسوں میں ۲۸۱۰۷ لڑکے اور ۲۸۰۵۹ لڑکیاں اور اعلیٰ تعلیم، تجارتی تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم کے نجی مدرسوں میں ۸۲۰۷ لڑکے اور ۳۰۵۶ لڑکیاں اور سرکاری مدرسوں میں ۲۶۴۰۸ لڑکے اور ۱۱۴۷ لڑکیاں داخل ہیں۔

کتب نصاب اور دوسرا تعلیمی سامان سرکاری طور پر تیار کرا کے ابتدائی مدارس کے طلبا اور طالبات میں مفت تقسیم کیا جاتا ہو۔ بعض نجی ادارے بھی مفت یا نصف قیمت پر کتابیں فراہم کرتے ہیں۔ کتابوں کی قیمت ہمیشہ برائے نام ہوتی ہو تاکہ ان کو خریدنے میں کوئی بار محسوس نہ ہو۔

اس ملک کا تقریباً تمام علاقہ چونکہ پہاڑی ہو، اس لیے مدرسوں تک آنے جانے میں بعض طلبا کو خاص دقت ہوتی ہو۔ اس لیے آئین کی مذکورہ بالا دفعہ ۲۷ (۱) کی رو سے جس میں وقتاً فوقتاً ترمیمات ہوتی رہی ہیں اور آخری ترمیم ۱۹ جون ۱۹۵۳ء سے رائج ہو، بعض ضلعوں کے مدرسوں کو اتنی مالی سہولت دی گئی ہو کہ ہر بچے کو لانے لے جانے کا معقول انتظام کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ مدرسہ سرکاری ہو یا نجی، اس کے لیے عمارت کی تعمیر، مرمت اور دیکھ بھال کا انتظام ضلع کے سپرد ہوتا ہو۔

ان تمام سہولتوں کی روشنی میں پاکستان کے تعلیمی نظام اور یہاں کی سہولتوں پر نظر ڈالی جائے تو اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی کہ اس ملک میں جہالت کا کیوں دور دورہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہو کہ پستالوزی نے سوئزرلینڈ میں جو شمع روشن کی تھی، وہ کم سے کم اس ملک میں خوب روشنی پھیلا رہی ہو۔

طبی تعلیم کے لیے سارے ملک میں پانچ میڈیکل اسکول ہیں اور اس وقت سند یافتہ اور تسلیم شدہ ۵ ہزار ۱۶۱ ڈاکٹر طبابت کرتے ہیں۔ گویا آبادی کے لحاظ سے تناسب نکالا جائے تو ہر ۹۷۶ باشندوں کے لیے ایک ڈاکٹر موجود ہو جبکہ پاکستان میں اس وقت پندرہ میڈیکل اسکولوں اور کالجوں کے باوجود ایلوپیتھی کے اعتبار سے تسلیم شدہ معالجین کی تعداد ۵ ہزار ۹ سو ۴۷ ہو۔ گویا ہر ۱۳ ہزار ۴ سو ۸۰ باشندوں کے لیے صرف ایک ڈاکٹر ہو۔ یونانی طبیبوں، ویدوں اور ہومیوپیتھوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا جا سکتا ہو کہ ان کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں اور ان کے مستند ہونے کا کوئی معیار مقرر نہیں ہو۔ سوئزرلینڈ کے پانچ میڈیکل کالج جنیوا، لوزین، بازل، برن اور زیورخ میں واقع ہیں۔ اول الذکر دو کالجوں میں ذریعۂ تعلیم فرانسیسی اور باقی تین میں جرمن زبان ہو۔ مدت تعلیم اور

نصاب کے لحاظ سے سب کالج یکساں ہیں۔ ان میں داخلے کے لیے ضروری ہے کہ طالبِ علم نے میچورائٹٹ (میٹرک کے برابر سند حاصل کرلی ہو۔ طلبا اور طالبات کے داخلے میں کوئی اِمتیاز نہیں برتا جاتا۔

داخلہ عموماً ماہِ اپریل میں ہوتا ہے۔ اگست اور ستمبر کے مہینوں میں کالج بند رہتے ہیں۔ چنانچہ آج کل بند ہیں۔ کُل مدّتِ تعلیم پانچ سال ہے۔ سوئزرلینڈ کے باشندوں کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ڈی ایف یعنی ڈپلومے فیڈرل کے نام سے سند دی جاتی ہے۔ غیر ملکی طلبا کو محدود تعداد میں داخلے کا موقع دیا جاتا ہے اور انھیں سی ایم یعنی سرٹیفکاٹ میڈیکلز کی سند ملتی ہے۔ حالانکہ نصابِ تعلیم بالکل یکساں ہوتا ہے اور طلبا ایک ساتھ تعلیم پاتے ہیں۔ غیر ملکیوں کو سند حاصل کرلینے کے باوجود اس ملک میں مطب کرنے کی اجازت نہیں، تاوقتیکہ حکومت سے بطورِ خاص اجازت حاصل نہ کرلی جائے۔ پانچ کالجوں سے مجموعی طور پر ہر سال تقریباً ۴ سو ۲۲ طلبا فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ باذل کا کالج سب سے زیادہ قدیم ہے۔ وہ ۱۴۶۰ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد زیورخ کا کالج ۱۸۳۶ء میں، برن کا ۱۸۳۴ء میں جنیوا کا ۱۸۷۶ء میں اور لوزین کا ۱۸۹۰ء میں قائم ہوا تھا۔ ان کالجوں میں تعلیم دینے کے لیے اساتذہ کی تعداد یہ ہے: باذل میں ۷۳، زیورخ میں ۱۰۲، برن میں ۹۳، جنیوا میں ۷۵ اور لوزین میں ۴۴۔ ان میں سے بعض اساتذہ پورے پورے وقت کام کرتے ہیں اور بعض چند گھنٹے کے لیے آتے ہیں۔ طلبا کی تعداد مختلف ہے۔ اس وقت باذل میں ۳۸۸ مرد، ۵۵ عورتیں، زیورخ میں ۴۱۷ مرد اور ۱۱۷ عورتیں، برن میں ۵۰۲ مرد، ۷۰ عورتیں، جنیوا میں ۷۷۶ مرد ۸۶ عورتیں اور لوزین میں ۴۸۰ مرد ۳۹ عورتیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہیں۔ تعلیمی نصاب یکساں ہونے کے باوجود ان کالجوں کی فیس مختلف ہے۔ باذل میں پانچ سو، زیورخ میں ۸ سو، برن میں سات سو، جنیوا میں نو سو اور لوزین میں ایک ہزار فرانک سالانہ وصول کیے جاتے ہیں۔ (ایک فرانک پاکستان کے ایک روپیہ دو آنے کے برابر ہوتا ہے) کُل مدّتِ تعلیم سب جگہ تقریباً ساڑھے چھے سال ہے۔ اگر کوئی طالبِ علم ڈاکٹری کے کسی موضوع پر سیر حاصل تحقیقات اور چھان بین کرنے کے بعد ایک طویل مقالہ لکھ دے تو اسے ایم ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔ ایم ڈی کی ڈگری لینے والے کے لیے لازمی نہیں ہے، ورنہ باقی طلبا کسی اسپتال میں چھے ماہ تک عملی تربیت پاتے ہیں۔ یہ زمانہ مدتِ تعلیم میں شامل ہے۔ اس کے بعد ہی انھیں مطب کی اجازت ملتی ہے۔ اجازت کے بغیر پریکٹس شروع نہیں کی جاسکتی۔

اس ملک کے وفاقی آئین کی دفعہ ۶۹ میں درج ہے کہ وفاق چھوت کی بیماریوں تیزی سے پھیلنے والی بیماریوں اور ان بیماریوں سے جو انسان اور حیوان دونوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ

خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ قواعد وضوابط مرتب کرسکتا ہے۔ چنانچہ صحت عامہ اور مدرسوں کے طلبا کی صحت سے متعلق قوانین اسی آئین کی روشنی میں بنائے گئے ہیں اور خاص طور پر استیصالِ تپ دق کے موضوع پر ۱۳ر جون ۱۹۲۸ء کو نافذ ہونے والا وفاقی قانون اسی آئین کا آئینہ دار ہے۔ ہر ضلع کے اربابِ تعلیمات کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماتحت مدرسوں میں اس قانون کے نفاذ اور عمل درآمد کا خیال رکھیں۔

وفاقی آئین کی دفعہ ۳۳ میں درج ہے کہ ضلع شریفانہ پیشے اختیار کرنے والے امیدواروں کے لیے لازم قرار دے سکتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیت کارکردگی کے بارے میں ثبوت فراہم کریں۔ اس مقصد کے لیے وفاقی آئین کے مطابق ایسے امیدواروں کو اپنی قابلیت کی ایسی سندیں فراہم کرنی ہوں گی جن کو سارے ملک میں جائز قرار دیا جاسکے۔ وفاقی آئین مجریہ ۱۹ر دسمبر ۱۸۷۷ء میں ایسی سندوں کا ذکر ہے، جو ڈاکٹروں، دواسازوں اور حیوانات کے سرجنوں کے بارے میں ہیں۔ ایک اور قانون ضمیمے کے طور پر ۱۲ر دسمبر کو جاری ہوا تھا جو دندان سازوں کے بارے میں ہے۔

اب زیوریخ کی سیر ہم نے کافی کرلی ہے اور تمام ضروری معلومات بھی فراہم ہوگئی ہیں۔ البتہ دیکھنے کے لائق اور دلچسپی کی چیز بس ایک کینٹونل اسپتال باقی رہ گیا ہے۔ اس کے لیے کل دس بجے کا وقت مقرر ہوا ہے۔ یہ دنیا کے اچھے اسپتالوں میں سے ایک ہے۔ انشاء اللہ کل اسے دیکھ کر ہم جنیوا چلے جائیں گے۔ آج کا زیادہ وقت تو بس ایسی ہی متفرق چیزوں میں گزر گیا۔

ڈھائی بجے یہاں کی مشہور آرٹ گیلری دیکھنے گئے۔ افسوس ہے کہ میں آرٹ کو ذرا مشکل سے سمجھتا ہوں، خصوصاً جدید آرٹ کو سمجھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے عمدہ طریقے سے اس پر اظہارِ خیال بھی نہیں کرسکتا۔ جدید آرٹ پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ پہلے وہ قلم بند کرلوں۔

کہتے ہیں کہ فرانس کی ایک حسین وجمیل رئیس زادی نے اپنے وقت کے ایک سب سے زیادہ مشہور اور باکمال آرٹسٹ کو بلاکر فرمائش کی کہ ہماری تصویر تیار کرو جسے جدید آرٹ کا بہترین نمونہ کہا جاسکے۔ فن کار نے مسلسل چالیس نشستوں کے بعد تصویر تیار کردی اور اس توقع کے ساتھ اسے پیش کیا کہ بہت زیادہ انعام ملے گا لیکن رئیس زادی نے ذرا منھ بنا کر کہا کہ مجھے ناک بالکل پسند نہیں ہے۔ تم نے اسے بہت ہی زیادہ بھدا کردیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے ستواں اور کسی قدر متناسب کردو۔ فن کار تصویر اٹھاکر اپنے نگار خانے میں لے گیا اور کئی دن تک بدحواس اور پریشان حال رہا۔ اسے کھانے پینے تک کا ہوش نہیں تھا۔ آخر تنگ آکر اس کی بیوی نے پوچھا کہ تم کس فکر و وحشت میں

مبتلا ہو۔ فن کار نے جواب دیا کہ رئیس زادی نے تصویر پسند نہیں کی اور میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں تصویر میں اس کی ناک ستواں اور کسی قدر متناسب کر دوں۔ بیوی نے تعجب سے کہا کہ پھر تمھیں کیوں تشویش ہے۔ وہ جس طرح حکم دیتی ہے، تعمیل کر دو۔ آرٹسٹ نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا، یہی تو باعث پریشانی ہے۔ تین دن سے دیکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے ناک لگائی کہاں ہے۔ نظر آجائے تو اسے درست کرنے کی کوشش بھی کروں۔

فن مصوری کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ جسم انسان کا ہو یا کسی حیوان کا، صحیح متناسب اعضا کے ساتھ اسے ہرگز نہ بنایا جائے، کیونکہ یہ کام تو کیمرے کا ہے کہ ہوبہو تصویر کھینچ کر رکھ دے۔ فن کار کا فرض ہے کہ وہ بنیادی خیال کی عکاسی پر سب سے زیادہ زور دے اور جہاں تک اعضا کا تعلق ہے، ان کو حرکت دیتے وقت جہاں خالی یا مناسب جگہ ملے رکھ دے۔ دیکھنے والے کی نظر ان پر پڑ ہی نہیں سکتی۔ اگر فن کار باکمال ہے تو صرف اس کے مرکزی خیال کے نقوش تصویر میں ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔

لہٰذا آرٹ گیلری کو دیکھ کر میرے محسوسات تو یہ تھے کہ اس عظیم الشان عمارت کو اور ایسی صاف ستھری نفیس جگہ کو کسی بہتر مصرف میں لانا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ اس میں کوئی اسپتال یا زچہ خانہ کھول دیا جائے۔ میں ان نازک مزاج اور نفیس الطبع لوگوں سے معافی چاہتا ہوں جو آرٹ کے دلدادہ ہیں اور حقیقتاً اسے سمجھتے ہیں اور داد دے سکتے ہیں۔ ویسے اس گیلری میں بہت قدیم دور کی پینٹنگز کے ساتھ ساتھ عصر جدید کی تصاویر بھی جمع کی گئی ہیں اور ان میں سلیقہ اور حسن مذاق سوئزرلینڈ کی روایات سے زیادہ ہی ہے۔ یہ اتنی پیچیدہ عمارت ہے کہ آخر میں ہم بھول بھلیوں کی طرح باہر نکلنے کا راستہ بھول گئے کئی چکر کھائے، مگر پھر پھر کر وہیں آگئے جہاں سے گئے تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ لوگ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چل پھر رہے تھے، ورنہ وہ ہمارے اس طواف کا زیادہ لطف اٹھاتے۔ ممکن ہے، ایسا ہو کہ ہماری طرح اور لوگ بھی "گم گشتہ راہ" ہوں اور اسی حال میں ہوں جس میں تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم پر عجیب کیفیت طاری ہے۔ بھلا آرٹ سے دلچسپی تھی ہی کس کم بخت کو اور راستہ بھول جانے کے بعد اور ایک ایک کمرے کے متعدد چکر کاٹ لینے کے بعد ہم آرٹ کو تو بالکل بھول ہی گئے اور باہر نکلنے اور بھاگ جانے کی فکر سوار ہو گئی، لیکن اچانک راستہ مل گیا اور باہر نکل ہی آئے۔

باہر نکلے تو بارش کے آثار تھے۔ پھُیاں پھُیاں، ننھی ننھی بوندیں پڑ بھی رہی تھیں۔ ارادہ کیا کہ جھیل میں موٹر بوٹ کی تفریح کی جائے۔ میں بارش کی وجہ سے تامل کر رہا تھا کہ وہ کہیں تیز نہ ہو جائے مگر بھائی جان

نے ارادہ کر ہی لیا اور ہم نیچے اتر گئے جہاں سے کشتی میں سوار ہوا جاتا ہے۔ کرایہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک گھنٹے کے ۲۰ فرانک ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ تفریح گراں ہے۔ ذرا سی دیر کے لیے ساڑھے بائیس روپے خرچ کیے جائیں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ چاہیں تو سیر کر لیں۔ بھائی جان محترم نے بھی رائے بدل دی۔

طے پایا کہ پیدل چل کر اور راستہ خود تلاش کرتے کرتے ہوٹل پہنچا جائے۔ اس راستے کی تلاش میں ایک بار ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں سے پھر پلٹے اور آدھ گھنٹے بعد اسی آرٹ گیلری کے دروازے پر آگئے جہاں سے بمشکل باہر نکل سکے تھے۔ یہاں سے راستے کے نقوش ذہن میں تھے، لہٰذا چھ بجے ہوٹل آگئے۔ غسل کیا۔ باہر خوب تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں کمبل لپیٹ کر بیٹھ گیا اور روزنامچہ لکھنے لگا۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ دل و دماغ ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ میں نے کمبل پھینک کر اٹھنا چاہا۔ بھائی جان محترم نے جو مطالعے میں مصروف تھے، فوراً پوچھا "کہاں چلے؟" میں نے جواب دیا کہ دماغ حاضر نہیں ہے، خون کی روانی سست ہے، ذرا خون دوڑا لوں، وہ دماغ کی طرف صحیح رفتار سے حرکت نہیں کر رہا ہے۔ بھائی جان محترم نے حکم دیا کہ بس دبکے بیٹھے رہو۔ میں انتظام کرتا ہوں ابھی۔ چناں چہ وہ اٹھے اور ایک نہیں، بڑے بڑے دو گلاس پانی کے بھر لائے اور مجھ سے کہا کہ لو غٹ غٹا کر پی لو، اور خوب خون دوڑا لو۔ میں نے دونوں گلاس لیے اور ایک دم پی گیا۔ لیکن فوراً ہی میں نے غور کیا کہ بھائی جان محترم کو اس قسم کی تکلیف میں نے کبھی نہیں دی تھی کہ میں بیٹھا رہوں اور وہ پانی لا کر مجھے دیں۔ بہت غور کیا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ کبھی ایسا ہوا ہو۔ آخر آج یہ حادثہ کیوں پیش آیا۔ لیکن اب تو پیش آ ہی گیا۔ خدا معاف کرے اور بھائی جان محترم بھی بھول جائیں۔

---

۱۱ ستمبر ۱۹۵۶ء ــــ منگل

زیورخ میں آخری دن

چونکہ آج شام زیورخ سے جنیوا روانگی ہے، اس لیے آج کے پروگرام پر ایک پیشگی نظر ڈالنی ضروری سمجھی۔ ہم نے اب تک کوئی خریداری نہیں کی تھی۔ دو تین گھڑیاں خریدنے کا ارادہ تھا، لیکن بھائی جان محترم کے پاس تین گھڑیاں پہلے سے موجود تھیں اور شاید کوئی مزید گھڑی لے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ یا بصورتِ دیگر کسٹم ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی اور پھر اجازت نامے کا سوال پیدا ہوتا۔ میں صرف ایک نئی گھڑی خرید کر کسٹم ادا کیے بغیر پاکستان میں لے جا سکتا تھا لیکن اس کام کے لیے یہاں مہلت نہیں مل سکی، اس لیے فیصلہ کیا کہ جنیوا میں دیکھا جائے گا۔ ہمارے سامنے طویل سفر تھا، اس لیے ہم کفایت بھی کر رہے تھے۔ روپیہ ہمارے پاس محدود تھا اور اس وقت تک کا اندازہ یہ تھا کہ ہم دونوں بھائی مل کر اوسطاً ۴۵ ڈالر روزانہ صرف کر رہے تھے۔

آج ہمیں سب سے اہم چیز دیکھنی تھی۔ دراصل اسی کو دیکھنے کے لیے ہم مزید ایک دن رکے تھے۔ یہ زیورخ کا نیا یونیورسٹی اسپتال ہے۔ اپنی موجودہ ہیئت میں اسے بالکل نیا اسپتال کہا جا سکتا ہے لیکن اسی قطعۂ زمین پر آج سے بہت عرصے پہلے ٹاژنگن کے ایک نواب نے ایک علاج گھر "روح القدس کے اسپتال" کے نام سے قائم کیا تھا۔ پھر دورِ اصلاحات کے بعد انیسویں صدی کے شروع میں قریب کی ایک خانقاہ اور گرجا گھر کے ایک حصے کو شامل کر لیا اور اس کا نام کینٹونل اسپتال رکھا گیا جو سو سال سے زیادہ مدت تک خدمات انجام دیتا رہا۔ اس دوسرے دور میں ملک کے دو مشہور ماہرین تعمیرات ویگمان اور زیدغر نے ۱۸۳۳ء میں تعمیر کا کام شروع کیا اور گیارہ سال میں اسے مکمل کیا تھا۔ موجودہ اسپتال پرانی بنیادوں پر تو نہیں لیکن اسی قطعۂ زمین پر واقع ہے۔ صرف چند حصے ہی صدی میں بنے تھے جو بجنسہٖ برقرار رکھے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جلدی امراض کا شفاخانہ ۱۹۲۴ء میں کھولا گیا تھا۔ چونکہ اس کی عمارت جدید ضروریات کو پورا کر سکتی تھی، اس لیے اسے مسمار کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ مشرقی اور مغربی سمت کے دو نئے بلاک بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر آراستہ کیے گئے ہیں۔ مشرقی بلاک سات منزلہ ہے۔ اس میں ۷۰۸ پلنگ بچھ سکتے ہیں۔ مغربی بلاک کی منزلیں نو ہیں۔ اس

میں صرف ۲۸۸ پلنگوں کی گنجائش ہے کیونکہ معائنے، تشخیص اور علاج معالجے کے کمرے، آپریشن تھیٹر، لیکچر روم وغیرہ بھی اسی حصے میں ہیں۔ نئے اور پرانے حصوں میں سب قسم کے بارہ سو مریض بیک وقت زیر علاج رہ سکتے ہیں۔ غیر اقامتی مریضوں کے وارڈ ان کے علاوہ ہیں۔ نئی عمارت پر جو پچھلے ہی سال مکمل ہوئی ہے، نو کروڑ چھتیں لاکھ سوئس فرانک لاگت آئی ہے۔

ہمارا دس بجے کا پروگرام طے تھا۔ چنانچہ ہم ٹھیک دس بجے وہاں پہنچ گئے اور سکریٹری نے ہمارے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کر دیا جو انگریزی خوب اچھی بولتی تھیں۔

ہم سے کہا گیا کہ سب سے پہلے ہمیں بالائی یعنی ساتویں منزل پر چلنا ہے۔ اس عمارت میں خودکار لفٹ قدم قدم پر لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک لفٹ کے ذریعے ہم ایک دم اوپر پہنچے جسے آخری منزل کی کھلی چھت کہا جا سکتا ہے۔ وہاں منتظمین نے پورے اسپتال کا ایک موڈل بنا کر ایک "شیش محل" میں بند کر رکھا تھا۔ خاتون محترم نے ہمارے سارے شعبوں کی تفصیل بتائی اور یہ حقیقت ہے کہ صرف ایک نظر ڈالنے سے ہر چیز بخوبی سمجھ میں آگئی کہ کہاں کہاں کون سے وارڈ اور شعبے ہیں۔

یہ موڈل دیکھنے کے بعد ہم لفٹ کے ذریعے اتر کر اس منزل میں آئے، جہاں ایمرجنسی کیسز آتے ہیں۔ کوئی اتفاقی حادثہ ہو یا اچانک کوئی بیماری یا ایسی مصیبت نازل ہو گئی ہو جس میں علاج معالجے کے لیے فوری مشورے کی ضرورت ہو تو اس صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے لیے یہاں بستر بالکل تیار ملتے ہیں اور فوری امداد کے لیے ہر چیز موجود رہتی ہے۔ ایمرجنسی کیسز جس راستے سے آتے ہیں وہ بالکل سڑک سے ملا ہوا ہے۔ یہاں کا دروازہ اس انداز کا ہے کہ ہر ایک جگہ کھڑے ہوتے ہی یا سایہ پڑتے ہی پٹ خود بخود کھل جاتے ہیں اور ایمبولنس کار سیدھی اندر داخل ہو جاتی ہے اور یہاں سے لفٹ کے ذریعے مریضوں کو مناسب جگہ پہنچا دیا جاتا ہے۔

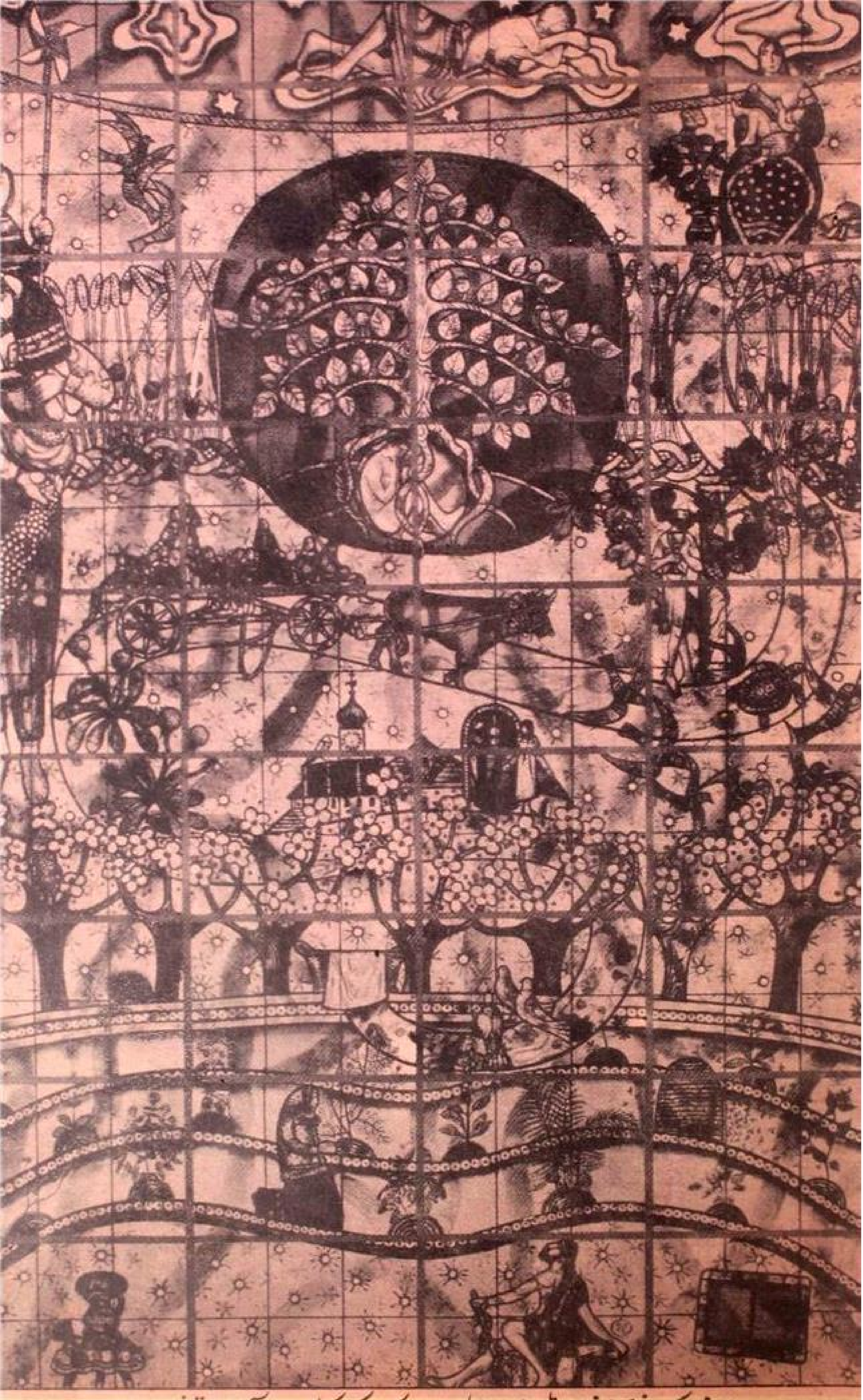
ہم نے ایک لیکچر روم دیکھا، جہاں پروفیسر طالب علموں کو جراحی کے موضوع پر لیکچر دیتے ہیں۔ آپریشن کے لیے مریض کو تیار کرنے کا کمرہ قریب ہے۔ سارا سامان ہر وقت مکمل رہتا ہے۔ اس لیکچر ہال میں دستاویزی فلم دکھانے یعنی فلم کے ذریعے مفہوم سمجھانے کا پورا انتظام ہے۔ قریب کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک لفٹ لگا ہوا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ لفٹ سیدھا پروفیسر کے کمرے میں جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے سیدھے لیکچر ہال میں اتر آتے ہیں۔

مریضوں کے کمرے دیکھے۔ بعض میں تین تین اور بعض میں پانچ پانچ بستر لگے ہوئے ہیں۔ چند خصوصی کمرے بھی ہیں۔ مریضوں کے پلنگوں میں ایسی کمانیاں تو دیکھی ہیں کہ ان کو دبانے سے، یا

موڑنے سے کسی بھی حصے کو اونچا نیچا کیا جا سکتا ہے اور جس زاویے پر رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں لیکن یہ کام ذرا طاقت چاہتا ہے اور عموماً دو آدمی مل کر اسے حرکت دے سکتے ہیں۔ لیکن ان پلنگوں میں یہ خوبی ہے کہ محض معمولی بٹن دبانے سے حسبِ منشا پوزیشن پیدا کی جا سکتی ہے۔ ذرا طاقت صَرف کرنی نہیں پڑتی حتیٰ کہ اگر مریض کوئی تبدیلی چاہے تو لیٹے لیٹے کر سکتا ہے۔ جن مریضوں کے لیے کسی قسم کی حرکت مضر ہو ان کے پلنگوں کے بٹن بند کر دیے جاتے ہیں۔ پھر ان کا استعمال ممکن نہیں ہوتا۔ بستر کے ساتھ ایک برقی لیمپ بھی ہوتا ہے جس میں سے تین قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ بہت ہلکی، ذرا تیز اور خوب تیز۔ کمرے کو گرم رکھنے کا انتظام نلکیوں کے ذریعے نہیں ہے بلکہ چھت میں ایسا اہتمام کیا گیا ہے کہ کمرہ خوب گرم رہتا ہے۔ ہوا کی آمد و رفت کے لیے بھی چھت ہی میں سے انتظام کیا گیا ہے۔ باہر کی کوئی آواز کمرے میں نہیں آ سکتی۔ دواؤں کے لیے ایک باقاعدہ الماری ہے۔ پھر ایک الماری ہر مریض کے پاس کپڑے وغیرہ رکھنے کے لیے ہے اور دوسری الماری میں پھل اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں رکھی جا سکتی ہیں۔ اس الماری میں بھی ہوا کی آمد و رفت کا علیحدہ انتظام ہے تاکہ پھل خراب نہ ہوں۔ غرض یہ ہے کہ کمرہ کیا ہے، ایک آرام گاہ ہے اور عجیب انتظام ہے۔

ہر پلنگ کے قریب ایک قدِ آدم کھڑکی ہے جس کا زیریں حصہ پلنگ کے بالکل متوازی رکھا گیا ہے، تاکہ مریض گردن اٹھائے بغیر باہر کی پُرلطف فضا کا نظارہ کر سکیں۔ عمارت کے چاروں طرف ساڑھے تین ایکڑ کے رقبے میں ایک خوشنما باغ ہے جس میں مستقل نوعیت کے طویل گھنے درختوں کے علاوہ موسم کے لحاظ سے اپنی بہار دکھانے والے پھول دار پودوں کی کیاریاں ہیں۔ ایسی بیلوں اور جھاڑیوں کا بطور خاص انتظام کیا گیا ہے، جن کو سدا بہار کہا جا سکتا ہے۔ اس باغیچے کے پھولوں سے کمروں کے اندر جگہ جگہ پھولدان سجائے جاتے ہیں۔

ایک کمرے کی آمنے سامنے کی دو کھڑکیوں میں جو عرض والی دیواروں میں لگی ہوئی ہیں، نہایت عمدہ نقشین شیشے جڑے ہوئے ہیں، جو کندہ کاری اور مصوری کے امتزاج کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ شیشوں کی سطح پر سرچشمۂ حیات کو ظاہر کرنیوالی مذہبی روایات کی جھلک تمثیلی انداز میں دکھائی گئی ہے۔ دونوں شیشوں کے رمزیہ نقوش کے ساتھ حُسنِ تضاد پیدا کرنے کے خیال سے عبارتیں بھی کندہ ہیں۔ ایک طرف حکیم بقراط کا حلف نامہ ہے اور دوسری طرف معالج کی ایک روایتی دعا۔ بقراط نے اپنے شاگردوں کے لیے عہد نامے کی صورت میں ایک مسودہ تیار کیا تھا، جو بجنسہٖ یا ذرا سی ترمیم کے ساتھ اب بھی دنیا کے بیشتر ملکوں میں رائج ہے۔ طب کا ہر طالب علم فارغ التحصیل ہونے پر ان الفاظ کو اپنی زبان سے دہرا کر ان پر عمل کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس حلف نامے کے الفاظ یہ ہیں:۔



زیورخ کے نئے یونیورسٹی اسپتال میں ایک کھڑکی کا قدِ آدم منقش شیشہ

حلف نامۂ بقراط

"مجھے قسم ہے اپالو طبیب کی، ایسکلے پی اَس معالج کی، جو دنیا کو صحت و تن درستی بخشتے ہیں، اور قسم ہے تمام دیوتاؤں اور دیویوں کے نام کی، میں ان سب کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اپنی استعداد اور صائب رائے کے مطابق، اس قسم کو اور اس عہد و پیمان کو ہمیشہ پورا کرتا رہوں گا۔

" میں قسم کھاتا ہوں کہ اپنے اس فن کے ضمن میں اپنے اُستاد کو اپنے والدین کے برابر رتبہ دوں گا۔ اسے اپنی معیشت میں حصّہ دار بناؤں گا۔ جب بھی اسے رُوپے پیسے کی ضرورت ہوگی، بے دریغ اپنے مال میں اسے شریک کر دوں گا، اس کے خاندان کے افراد کو اپنے بھائی بہن کے برابر سمجھوں گا، اور اگر وہ سیکھنا چاہیں تو یہ فن انکو سکھاؤں گا اور اس خدمت کا کوئی معاوضہ یا کسی قسم کی اجرت نہیں لوں گا۔ زبانی درس اور ہر قسم کی ہدایات اپنے بیٹوں کو دوں گا اور استاد کے بیٹوں کو اور ان شاگردوں کو بھی جنھوں نے طبیب کی حیثیت سے حلف اٹھایا ہے۔ ان کے سوا اور سب سے حقِ خدمت وصول کروں گا۔

" میں قسم کھاتا ہوں کہ اپنی استعداد اور صائب رائے کے مطابق بیمار کی امداد کے لیے صحیح طریقۂ علاج اختیار کروں گا اور ایذا رسانی یا غلط کاری کو کبھی قریب نہ آنے دوں گا۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ خواہ مجھ سے کتنا ہی کہا جائے، کسی کو زہر نہیں دوں گا اور نہ اس ضمن میں کوئی مشورہ دوں گا۔ اسی طرح میں کسی عورت کو پیسری یا کوئی ایسا آلہ نہ دوں گا جس سے اس کا حمل اسقاط ہو سکے۔ میں اپنی زندگی کو اور اپنے اس فن کو پاک اور مقدس بنائے رہوں گا۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ نشترِ استعمال نہیں کروں گا، حتیٰ کہ پتھری کے مرض میں مبتلا لوگوں کے لیے بھی استعمال نہیں کروں گا، بلکہ یہ موقع ان کو دوں گا جو اس فن کے اہل ہیں اور ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ جس گھر میں داخل ہوں گا، میرے داخلے کا مقصد مریض کی مدد کرنا ہوگا اور میں، ان تمام بُرے کاموں سے اور نقصان پہنچانے والے

افعال سے جو جان بوجھ کر کیے جاتے ہیں، احتراز کروں گا، خصوصاً کسی مرد یا عورت کے جسم کو، خواہ وہ قید و بند میں ہو یا آزاد، ناجائز تصرف میں نہیں لاؤں گا۔

"اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اپنے پیشے کے دوران میں جو کچھ دیکھوں گا اور سنوں گا اور اپنے پیشے سے الگ لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے جو کچھ میرے علم میں آئے گا کبھی بھی کسی پر ظاہر نہیں کروں گا اور اگر اس کی تشہیر و اشاعت نامناسب ہو تو ہمیشہ ایک مقدس راز کی طرح اسے اپنے سینے میں چھپائے رکھوں گا۔

"پس اگر میں اس قسم کا پابند رہوں اور عہد شکنی نہ کروں تو خدا کرے کہ ہمیشہ میرا نام روشن رہے، میں اپنی زندگی کا اور اپنے ہنر کا عروج دیکھوں، لیکن اگر میں اس سے انحراف کروں اور اپنی قسم کو توڑ دوں تو اس کے برعکس میرا ستیاناس ہو۔"

کمرے سے ملحق غسل خانہ دیکھا۔ بے حد صاف ستھرا تھا۔ ٹھنڈے اور گرم پانی کی الگ الگ ٹونٹیوں کے علاوہ نہانے کے ٹب خاص انداز کے تھے جس میں بھرے ہوئے پانی کا درجہ حرارت بہت دیر تک نہیں بدلتا۔ جس پائپ پر تولیہ لٹکا دیا جاتا ہے، وہ ہر وقت گرم رہتا ہے، اس لیے کہ تولیہ گیلا رہنے نہ پائے۔ ہر وارڈ کے باہر زرد، سرخ اور سبز روشنیوں کے بلب لگے ہوتے ہیں، تاکہ رنگوں کے امتیاز سے مخصوص اشارے سمجھے جا سکیں۔

باورچی خانہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں بیک وقت تقریباً چھ ہزار مریضوں کا کھانا تیار کیا جا سکتا ہے۔ حسب ضرورت بعض چیزیں بجلی سے اور بعض بھاپ سے تیار کی جا سکتی ہیں۔ اس میں گندگی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ایک حصے میں سبزیاں تیار ہو رہی تھیں تو دوسرے میں گوشت۔ ایک شعبہ بیکری کا تھا۔ کھانے کے سارے برتن اسٹین لیس اسٹیل کے ہیں۔ پھر یہ اہتمام ہے کہ فلاں وارڈ کی فلاں منزل پر فلاں فلاں مریضوں کو فلاں قسم کا کھانا جائے گا۔ کھانے کی جو مقدار مقرر ہے اس کا خیال کیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ سارا نظم و نسق قابلِ تحسین ہے۔ یہ سنٹرل کچن ہے، جس کی ہم سیر کر رہے ہیں۔ یہاں سے کافی مقدار میں کھانا موٹر ٹرالیوں کے ذریعے مختلف کمروں میں لیجایا جاتا ہے اور وہاں کے منتظمین پھر ہر مریض کے پاس اس کی خوراک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ سب کام اس قدر جلدی ہوتا ہے کہ مریض تک کھانا پہنچانے میں دیر نہیں لگتی۔ تمام مریض بیک وقت کھانا کھاتے نظر آتے ہیں۔

اس میں کیا شبہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ عظیم الشان چیز دیکھی ہے۔ اسے عجیب اور حیرت انگیز بھی کہا جا سکتا ہے۔ تشخیص، طریقِ علاج اور جراحی کے کمالات ایسے موضوعات ہیں کہ ان کا ذکر کیا جا سکتا۔

ہم زیادہ وقت وہاں صرف کرتے تو اس لحاظ سے بھی رائے قائم کر سکتے تھے لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس اعتبار سے بھی اس کا نظم و نسق بہت ہی اعلیٰ ہوگا۔

ہم دونوں بھائیوں کے دل میں بیک وقت یہی بات آئی کہ کچھ بھی ہو، چاہے صرف بیس پلنگ ہوں، اس نمونے کا ایک اسپتال ہمیں بنانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس آرزو کو پورا کرے اور ہم اپنے اپنے وطن میں اپنے بھائیوں کے لیے کوئی قابلِ قدر خدمت انجام دے سکیں۔ آمین۔

آج کی سیاحت کا ایک دل چسپ پہلو بھی ہے۔ ہم کینٹونل اسپتال سے ½ ۱۱ بجے فارغ ہو گئے تھے کھانا کھانے میں دیر تھی۔ اس لیے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہمارے پاس زیورخ کے صنعتی عجائب گھر کا ایک پتہ درج تھا۔ ایک بار سرسری طور پر اس کو تلاش کیا تھا، مگر نہیں ملا۔ سوچا کہ ٹیکسی لے کر اسے دوبارہ تلاش کیا جائے۔ ہم نے ٹیکسی والے کو پتہ دکھایا اور وہ اس طرح تیار ہوا جیسے بالکل ہی جانتا ہے، اور ہم نے دیکھا کہ وہ ہم کو ٹھیک اسی جگہ لے گیا، جہاں سے ہم کل واپس لوٹے تھے۔ مگر یہ ٹیکسی والا آگے بڑھتا چلا ہی گیا اور اس نے ایک بڑی عمارت کے سامنے ہمیں لا کھڑا کیا۔ واقعی عمارت کا نرالا انداز عجائب گھر کا سا تھا۔ ہم اتر پڑے اور ٹیکسی کو چلتا کر دیا۔ اندر داخل ہوئے ہمیں داخل ہوتے ہی چار پانچ گھوڑوں کی تصویریں دکھائی دیں۔ ذرا آگے بڑھے تو سامنے گھوڑے کا ایک بڑا ماڈل رکھا ہوا تھا۔ ٹکٹ کے کاؤنٹر پر ایک معمر خاتون سے معلوم کیا کہ کیا یہ صنعتی عجائب گھر ہے؟ مگر اس نے انگریزی زبان نہیں سمجھی اور ہمارے اشارے بھی ضائع گئے۔

آخر کار یہ سمجھ کر کہ گھوڑے اور گھوڑے کی طاقت (ہارس پاور) کا صنعت سے گہرا تعلق ہے، ہم نے ایک فرانک کے دو ٹکٹ خرید لیے اور اندر داخل ہو گئے۔ یہاں آکر عقدہ کھلا کہ واقعی یہ گھوڑوں سے متعلق پورا عجائب گھر ہے۔ سواری کے آلات، زینوں کے نمونے، ایڑوں کے نمونے، گھوڑے کا لباس، مختلف ممالک میں گھوڑوں سے ذوق و شوق کی تاریخ، مغلوں کے زمانے کی چند تصاویر۔ غرض گھوڑوں اور ان کے استعمال کی تاریخ پر یہ عجائب گھر ہے۔ ہمارے لیے تو یہ ایک حادثے سے کم چیز نہیں مگر آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ یہاں عجائب خانوں کی کیا کیفیت ہے۔

چار بجے ہوٹل کا بل وغیرہ ادا کر کے ہم مین اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اس وقت ساڑھے چار بجے تھے اور گاڑی ۵ بج کر ۱۱ منٹ پر روانہ ہونی تھی۔ قلی نے اپنے ٹھیلے پر سامان رکھا اور اندر ہال میں ٹھہر گیا۔ مجھے ایک ٹائم ٹیبل کے قریب لے جا کر اس نے اشاروں سے گاڑی کا نمبر، وقت اور پلیٹ فارم نمبر دکھایا، اور اشارے سے کہا کہ آپ بہت پہلے آگئے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ زبان نہ جاننے کا مسئلہ دقت پیدا کر رہا تھا۔

اگر یہ بات صاف ہو گئی کہ ہم اسٹیشن جاکر فوراً صحیح مقام پر پہنچ جائیں گے تو اطمینان ممکن ہے۔ کیونکہ اس لحاظ سے تو کامل یقین ہے کہ یہاں کی ریلیں منٹوں اور سکنڈوں سے چلتی، آتی اور جاتی ہیں۔ بہرنوع پانچ بجے قلی نے سامان کا ٹھیلہ دوبارہ گھسیٹا اور ہم دو تین منٹ میں پلیٹ فارم نمبر ۱۴ پر پہنچ گئے۔

گاڑی میں سامان رکھنے کے لیے قلی نے ایک بکس اندر رکھا اور فوراً ہی ہم سے ایک دل چسپ سوال کیا —— "یو سموک" (کیا تم سگریٹ پیتے ہو) ہم نے نفی میں جواب دیا تو قلی نے اپنا ٹھیلہ آگے بڑھا کر دوسرے کمرے میں سامان رکھنا شروع کر دیا۔ ایک بکس جو دوسری جگہ رکھ دیا تھا، اسے میں خود اٹھا کر اس نئے کمرے میں لے آیا اور لاکر رکھ دیا۔ قلی نے میری اس حرکت پر ذرا غور سے مجھے دیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہاں اکثر لوگوں کو اپنا سامان خود اٹھاتے اور لے جاتے دیکھا ہے۔ ہم طویل سفر کی وجہ سے "ہلکے" (کم سامان کے ساتھ) نہیں تھے، ورنہ ہم بھی قلی سے بے نیاز رہتے، کیونکہ یہاں سامان خود اٹھانا معیوب نہیں ہے۔ مجھے یہ اسپرٹ بہت پسند آئی۔ قلی ہم کو غیر ملکی جان کر یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ ہم سامان اٹھائیں گے، خصوصاً جب کہ ہم نے اس کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں۔

اب سوال یہ تھا کہ سگریٹ پینے یا نہ پینے سے کیا فرق پیدا ہوتا تھا۔ قلی نے ہمیں جس ڈبے میں بٹھایا، اس میں آخر کیا فرق تھا! اس ڈبے میں گھستے ہی ایک بات یہ نوٹ کی گئی کہ سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے لیے خاک دان یعنی ایش پوٹ اس میں نہیں تھا۔ اس انتظام پر تعجب ہوا اور مسرت بھی ہوئی کہ یہ لوگ ان چیزوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں، حالانکہ مذہبیاً یا اخلاقاً سگریٹ ان کے ہاں بری چیز نہیں ہے۔ کراچی کی بسوں میں جلی حروف میں لکھا رہتا ہے کہ سگریٹ نوشی منع ہے، مگر عمل اس پر بالکل نہیں ہوتا، بلکہ کنڈکٹر اور ڈرائیور خود اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہمارے ڈبے میں دو آدمی اور تھے۔ انھوں نے سگریٹ نہیں پیا اور ہم تو سگریٹ وغیرہ سے الحمدللہ بے نیاز ہی ہیں۔

یہاں بھی گاڑیاں اور ڈبے ویسے ہی ہیں جیسے کہ آسٹریا میں تھے اور ان کی تفصیل میں قلم بند کر چکا ہوں۔ یہاں انجن، ٹرینیں، ٹرامیں، بسیں، سب الیکٹرک سے چلتی ہیں۔ ان کی تفصیل بھی لکھ چکا ہوں، یہاں بجلی ہر کام کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

گاڑی ٹھیک ۵ بج کر ۱۱ منٹ پر زیورخ سے روانہ ہوئی اور ٹھیک ۹ بج کر ۴ منٹ پر جنیوا پہنچ گئی۔ یہاں امریکن ایکسپریس کا آدمی ہمارے لیے پہلے سے موجود تھا۔ صرف چار منٹ میں ہم ان کی

گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ ہم نیچے پہنچے ہی تھے کہ ٹیکسی میں سامان رکھا جا چکا تھا اور ہم پانچ منٹ میں ہوٹل پہنچ گئے۔ ایک منٹ میں ہم نے فارم بھر دیا اور دوسرے منٹ ہمارا سامان کمرے میں داخل کر لیا گیا اور ہم کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔ اوپر کمرے میں آئے تو سامان آراستہ تھا!

خدا جانے یہاں کے ملازموں کو ہم دونوں بھائیوں کی نفاست پسندی کا کیسے علم ہو گیا تھا ہر چیز اس طرح قرینے سے رکھی گئی تھی کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی غیر ملکی ہوٹل میں آکر ٹھیرے ہیں، بلکہ محسوس ہوا کہ وطن پہنچ کر اپنے مکان میں آگئے ہیں اور ہر چیز ہمیشہ کی طرح سلیقے اور قرینے سے رکھی ہے۔

ملازم عجیب رمز شناس انسان تھا، یا ہوٹل کی طرف سے اس کو اس قسم کی ہدایت کی گئی ہوگی کہ اس نے ہم دونوں بھائیوں کے پلنگوں کے درمیان چھوٹے سے ریک میں راہنما کتابوں اور جنیوا سے متعلق معلوماتی رسالوں کے علاوہ دیوانِ حافظ اور رباعیاتِ خیام کے مصور انگریزی ترجمے بھی رکھ دیے، تاکہ فالتو وقت میں ہم ان سے دل بہلا سکیں۔ دونوں ترجمے فٹز جیرالڈ کے تھے۔

جن مستشرقین نے فارسی اور اردو ادب و شعر کو انگریزی زبان میں رواج دیا ہے، ان میں سے فٹز جیرالڈ کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ حافظ و خیام کے جو ترجمے اس نے کیے ہیں، شاید کوئی اعلیٰ انگریزی داں ایرانی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دونوں شاعروں کی روح کے ساتھ اپنی روح کو ہم آہنگ کر کے ان کے کلام کے ترجمے اپنی زبان میں کیے ہیں اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

ہم یہ دونوں نسخے پہلے ہی دیکھ چکے تھے، بلکہ ہمارے کتب خانوں میں موجود بھی ہیں۔ تاہم ملازم کی فراست پر طبیعت خوش ہوئی اور فیصلہ کیا کہ یہاں سے روانہ ہوتے وقت اسے اس لحاظ سے بھی انعام دیا جائے گا۔

---

۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء ـــــــ بدھ

جنیوا میں پہلا دِن

استنبول کے ہوٹل ہلٹن سے ہم اس درجہ گھبرا گئے تھے کہ وہاں سے بھاگنے کو دل چاہتا تھا۔ خیال تھا کہ یہ ہوٹل یورپ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے حرفِ آخر ہے اور آئندہ اس جیسے ہوٹل سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوٹل جنیوا میں ڈور ھون میسّر آئے گا اور ہم ایک بار پھر اس جدّت اور انتہائی آرام سے پریشان ہوں گے، کیونکہ ہماری طبیعت ہمیشہ سے سادگی پسند رہی ہے۔

ابھی تک ٹھیک معلوم نہیں ہو سکا مگر مجھے یقین ہے کہ اس اہتمام میں امریکنوں کا ہاتھ ہے۔ یہی قوم بے پناہ پیسے والی ہے اور آرام طلب بھی ہے۔ یہ پیسے کے بل بوتے پر سب کچھ کر لینا چاہتی ہے۔ پیسے کی کثرت اور ان کی آرام طلبی نے اب انسان کی جسمانی قوت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ چنانچہ امریکی سپاہی لڑنے کی صلاحیت اور جرأت سے محروم ہے۔ یہ ساری قوم صرف سائنس کے بل پر جینا چاہتی ہے۔ اسی پیسے کے زور پر اس نے کئی ملکوں کو اپنی کوٹیوں میں شامل کر لیا ہے اور ان سے ناجائز استفادہ کو یہ جائز سمجھنے لگی ہے۔ خود آرام طلب ہے اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر لگانا چاہتی ہے۔ اس تماشہ کا مظاہرہ ہلٹن استنبول میں ہم دیکھ چکے ہیں اور اب ڈور ھون میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ ہلٹن سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ ان کے ہاں غسل خانے تک میں ٹیلی فون اور ریڈیو لگا ہوا ہے۔ اس قسم کے تکلفات سے ہماری طبیعت سخت الجھتی ہے۔

ہمارے کمرے میں دو بستر تھے۔ گدّے ایسے نرم کہ انسان آدھا اندر دھنس جائے۔ اس پر نہایت سفید چادریں اور اوپر سفید چادروں میں لپٹا ہوا کمبل، اور زیادہ سردی لگے تو اوپر سے اوڑھنے کے لیے نرم لحاف۔ دو نہایت نرم تکیے کہ سر رکھتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کہیں غائب ہو گیا۔ اور ضرورت ہوتی ہے کہ لیٹنے والا اٹھ کر اسے ڈھونڈھے کہ کہیں مستقل طور پر غائب نہ ہو جائے۔ دو گدّے دار صوفے لکھنے کی ایک بڑی میز، اس پر لکھنے کا پیڈ، لفافے، کاغذ وغیرہ، سب سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ سرہانے ایک لمبی الماری تھی۔ اس پر ٹیلی فون رکھا تھا اور ایک طرف ریڈیو لگا ہوا تھا۔ لیکن دراصل ریڈیو سیٹ نہیں تھا بلکہ صرف لاؤڈ اسپیکر تھا۔ ایک مرکزی کمرے میں ریڈیو بجتا ہے اور تمام کمروں کے لاؤڈ اسپیکر

اس آواز کو پھیلاتے ہیں۔ روشنیاں ہلکی اور تیز چھت میں آویزاں تھیں اور ٹیبل لیمپ بھی موجود تھے۔

اب غسل خانے کا حال سنیے۔ گرم اور ٹھنڈا پانی ہر وقت آتا ہے۔ منھ دھونے کے دو بیسن لگے ہوئے ہیں۔ اوپر شیشے کے شیلف سامان رکھنے کے لیے ہیں۔ تولیے بڑے اور چھوٹے موجود ہیں۔ بلیڈ صاف کرنے کا کپڑا الگ لٹکا ہوا ہے۔ شیو کر کے صاف کرنے کا نرم نرم کاغذ الگ ٹنگا ہوا ہے۔ نہانے کے لیے کشتی ہے۔ اس میں ایسا فوارہ ہے جس کو ہاتھ میں لے کر نہایا جا سکتا ہے۔ ایک فوارہ چھت میں لگا ہوا ہے۔ اس میں سے خوب تیزی کے ساتھ پھوار کے انداز میں پانی نکلتا ہے۔ ٹیلی فون بھی ایک کونے میں رکھا ہے۔ پاخانے کے کموڈ پر دو قسم کے کاغذ ہیں۔ ایک جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا اتنا بڑا ہے کہ کموڈ پر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ پانی کی چھینٹیں نہ اڑیں۔ کپڑے ٹانگنے کی الماریاں الگ ہیں۔

ہمارا کمرہ جھیل جنیوا کی سمت تھا۔ ہم خوبصورت شفاف پانی بہتا ہوا دیکھ رہے تھے اور پانی کا شور وغل بھی سن سکتے تھے کیوں کہ پانی میں بہت زور کی لہریں پڑتی تھیں، بالکل سمندر کی طرح۔ بہت ہی دل کش منظر تھا۔

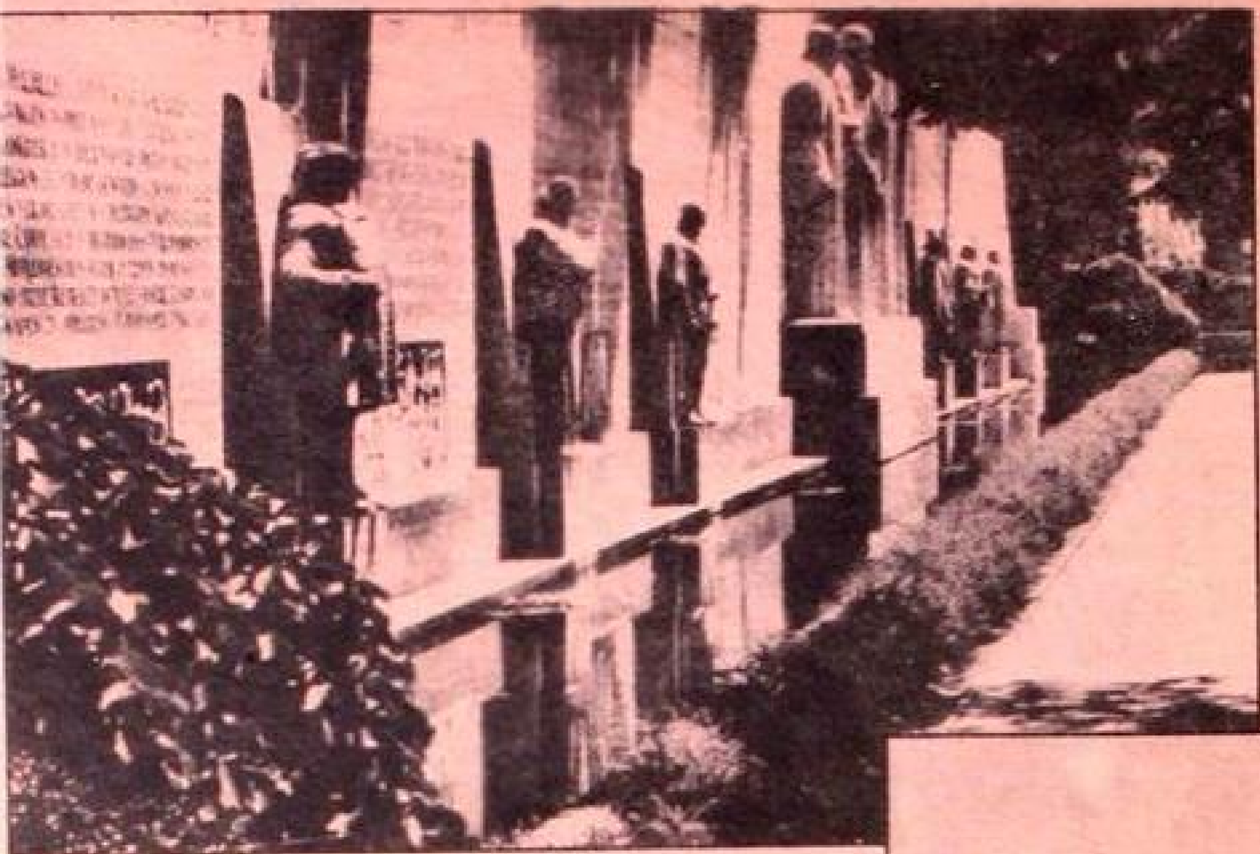
ہمارے ساتھ ہوٹل والوں کا برتاؤ برا تھا۔ اس میں زیادہ تر یورپ کے دوسرے ملکوں، یا امریکا وغیرہ کے باشندے آکر قیام کرتے تھے۔ اس لیے ہم ایشیائی لوگوں کے ساتھ یہ سفید قوم والے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ ہمارے علاوہ بھی اور لوگوں سے ان کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ استقبالیہ والے بات کا جواب معقولیت سے نہیں دیتے اور ان کے لب ولہجے میں غرور کی جھلک پائی جاتی تھی۔ آج ہی دوپہر کو ہم دونوں بھائی کھانے کے کمرے میں گئے اور جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے لیے دودھ اور ڈبل روٹی طلب کی۔ اس پر اس نے کہا کہ یہ چیز آپ کو اس جگہ نہیں دی جا سکتی۔ آپ دوسرے کمرے میں جا کر الگ بیٹھیے۔ حالانکہ یہ بات آج تک کسی اور جگہ نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ سے تو خیر کیا اٹھتا مجبوراً مجھے دوسری قسم کا بوجھل کھانا کھانا پڑا۔ مجھے اس شخص پر بڑا غصہ آیا، لیکن بھائی جان محترم کی وجہ سے برداشت کر لیا ورنہ سیدھا جنرل منیجر کے پاس جا کر شکایت کرتا کہ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہی شخص بل بھی بناتا ہے اور ورق پلٹتے وقت انگلی پر تھوک لگاتا ہے۔ چلتے وقت میں نے اسے اپنے پاس بلا کر کہا کہ جب تم ورق پلٹتے ہو تو انگلی منھ میں لے جاتے ہو اور اس پر تھوک لگاتے ہو۔ یہ اچھی عادت نہیں ہے۔ کوئی بھلا آدمی اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ حیرت سے میرا منھ تکنے لگا۔ جیسے اصل بات کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ یہ اس کی کمزوری تھی۔ میں نے یہ بات کئی دوسرے سفید چمڑی والوں کے سامنے زور سے کہی۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں نے اس کی بدتمیزی کا جواب تو دے دیا۔ میں نے اس کے

ساتھ ہی بل پر نوٹ لکھا کہ میرے ملک میں مہمانوں کی عزت کی جاتی ہے۔ لیکن یورپ کے ہوٹل دور صون میں مہمانوں کی ہتک کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اسے ۵ فرانک (تقریباً پانچ روپے دس آنے) ٹپ کے بھی دیے۔

یہ لفظ "ٹپ" انگریزی کے تین لفظوں "ٹو"، "انشیور"، "پرومپٹ نیس" کے ابتدائی تین حروف سے مل کر بنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ فالتو رقم ادا کرنے سے ہر کام کی تعمیل ذرا عجلت کے ساتھ یقینی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ دستور الٹا ہے کہ یہ فالتو رقم آخر میں بل کے ساتھ دی جاتی ہے۔ کسی کو کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ یہ ادائگی ہوگی بھی یا نہیں۔ مناسب ہے کہ ہوٹل میں میز پر بیٹھتے ہی رقم ادا کر دی جائے لیکن شاید اس میں یہ خدشہ ہے کہ پیسے وصول ہو جانے کے بعد ذرا کم خیال رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ یقین ہو سکتا ہے کہ اب بل کی اصل رقم کے علاوہ کچھ اور نہیں ملے گا۔

ہم اس ہوٹل کے تکلفات سے ویسے ہی پریشان تھے، یہاں کے بد تہذیب لوگوں نے زیادہ دل برداشتہ کر دیا۔ بہر صورت کام تو پورے کرنے ہی تھے۔ یوں بھی ہمیں کونسی چھاؤنی چھا کر بیٹھنا تھا۔ ۱۵ ستمبر کو برن جانے کا پروگرام تھا۔

بہت جلد ہم فارغ ہو کر بین الاقوامی مطالعوں کا ادارہ دیکھنے چل پڑے جو ولا بارٹن میں واقع ہے۔ افسوس ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ بند تھا۔ صرف سکریٹری صاحبہ اپنے کام میں مصروف تھیں۔ ہم نے ان کے دروازے کو کھٹکھٹایا اور اندر داخل ہوئے۔ ان صاحبہ کا انداز عجیب تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتی اور فوراً ہی کھولتی تھیں۔ ان کے استعجاب میں استفسار کی یہ جھلک تھی کہ تم ایشیائی یہاں کیسے پہنچ گئے۔ تاہم بات ملنساری کے ساتھ کی۔ انگریزی جانتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل تعطیلات ہیں۔ ۲۲ اکتوبر سے نیا "ٹرم" شروع ہو گا۔ انھوں نے ہمیں لائبریری دکھائی جس میں تقریباً تیس ہزار کتابیں مختلف موضوعات پر موجود ہیں۔ لائبریری میں انڈکس کے نمبروں میں ایک غلطی تھی۔ میں نے اسے پوائنٹ آؤٹ کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سکریٹری صاحبہ کے کمرے میں ایک دن پہلے کی تاریخ کلینڈر پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے ۱۱ سے بدل کر اسے ۱۲ کر دیا۔ انھوں نے دیکھا اور زیر لب مسکرا کر شکریہ ادا کرنے لگیں۔ انھوں نے ہمیں یہاں کے پراسپکٹس وغیرہ دیے۔ لائبریری کا انڈکس مصنّف کے نام اور موضوع کے اعتبار سے مرتّب کیا گیا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ کتاب کے نام سے بھی انڈکس تیار ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ مطالعے کے متمنّی کو مصنّف کے نام کے بجائے صرف کتاب کا نام یاد رہ گیا ہو۔ بھلا وہ کیونکر اسے تلاش کرے گا۔ انھوں نے یہ بات بھی نوٹ کر لی اور آئندہ خیال رکھنے کا وعدہ کیا۔



اصلاحات کی بین الاقوامی یادگار



مونٹ بلانک کے دامن میں



ننھے پودوں سے بنی ہوئی دھوپ گھڑی ۔

وہاں سے ہم ایک اور مقام دیکھنے چلے گئے جو اصلاح کی بین الاقوامی یادگار کے نام سے موسوم ہے اور یونیورسٹی کے احاطے میں موجود ہے۔ اسے اصلاح (ریفارمیشن) کی تاریخ کہا جاتا ہے۔ جماعتی عہدنامے پتھر پر نقش کیے گئے ہیں۔ مجسمے بھی بنائے گئے ہیں۔ ہم نے ایک نظر ان پر ڈالی اور ہمیں زیادہ دل چسپی یونیورسٹی سے ہوگئی۔ لہٰذا وہاں داخل ہو گئے۔ خیال تھا کہ شاید یہ موقع پھر نہ ملے۔

یہاں بھی ہم نے لائبریری دیکھنی چاہی لیکن چوں کہ تعطیلات تھیں، اس لیے یہاں کوئی نہ مل سکا۔ ہم خود ہی شفاف شیشوں میں سے کتابوں کے ٹائیٹل دیکھتے رہے۔ ملک کی تینوں بڑی زبانوں میں ہزاروں کتابیں رکھی تھیں۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ یونیورسٹی کے طلبا ان سے بہت کم استفادہ کرتے ہیں۔ اکثر کتابوں پر خاک جمی ہوئی تھی۔ موضوعات کے بارے میں زیادہ پتہ نہ لگ سکا، کیوں کہ ان زبانوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ کوئی وہاں موجود ہوتا تو بات چیت کے ذریعے کچھ معلومات فراہم کرتے۔ ہمارا منشا یہ تھا کہ لائبریریوں کے نظام اور رکھ رکھاؤ کے بارے میں صحیح اطلاعات حاصل کریں۔ خود ہماری لائبریری میں کئی ہزار مطبوعہ کتابیں اور قلمی نسخے موجود ہیں۔ ہم جدید وضع پر اس کی فہرست تیار کرنے کے متمنی ہیں تاکہ پڑھنے والے کو کتاب نکالنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہ لگے اور جب وہ اسے واپس رکھے تو غلطی کا امکان تک پیدا نہ ہو۔

یونیورسٹی سے ملحق ایک عجائب خانہ کھلا ہوا تھا۔ یہ جمادات اور حیوانات پر مشتمل ہے، اور واقعی اس میں متعدد چیزیں نئی اور بڑی حیرت انگیز ہیں۔ پرندوں کو ان کی اصل صورت میں دکھایا گیا ہے۔ کھال کے اندر بھوسا بڑی صفائی سے بھرا گیا ہے۔ پرقدرتی حالت میں موجود ہیں۔ یہ کام اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوتا ہے کہ اگر ہم نے ہاتھ ہلایا تو یہ پھر سے اُڑ جائیں گے۔ پرندوں کے گھونسلے، ان میں انڈے وغیرہ سب کچھ اصل حالت میں دکھائے گئے ہیں۔ ہمارے ملک کا مور بھی یہاں موجود ہے۔ بعض اور ملکوں سے بھی پرندے اور جانور منگا کر یہاں جمع کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ قابل دید جگہ ہے۔

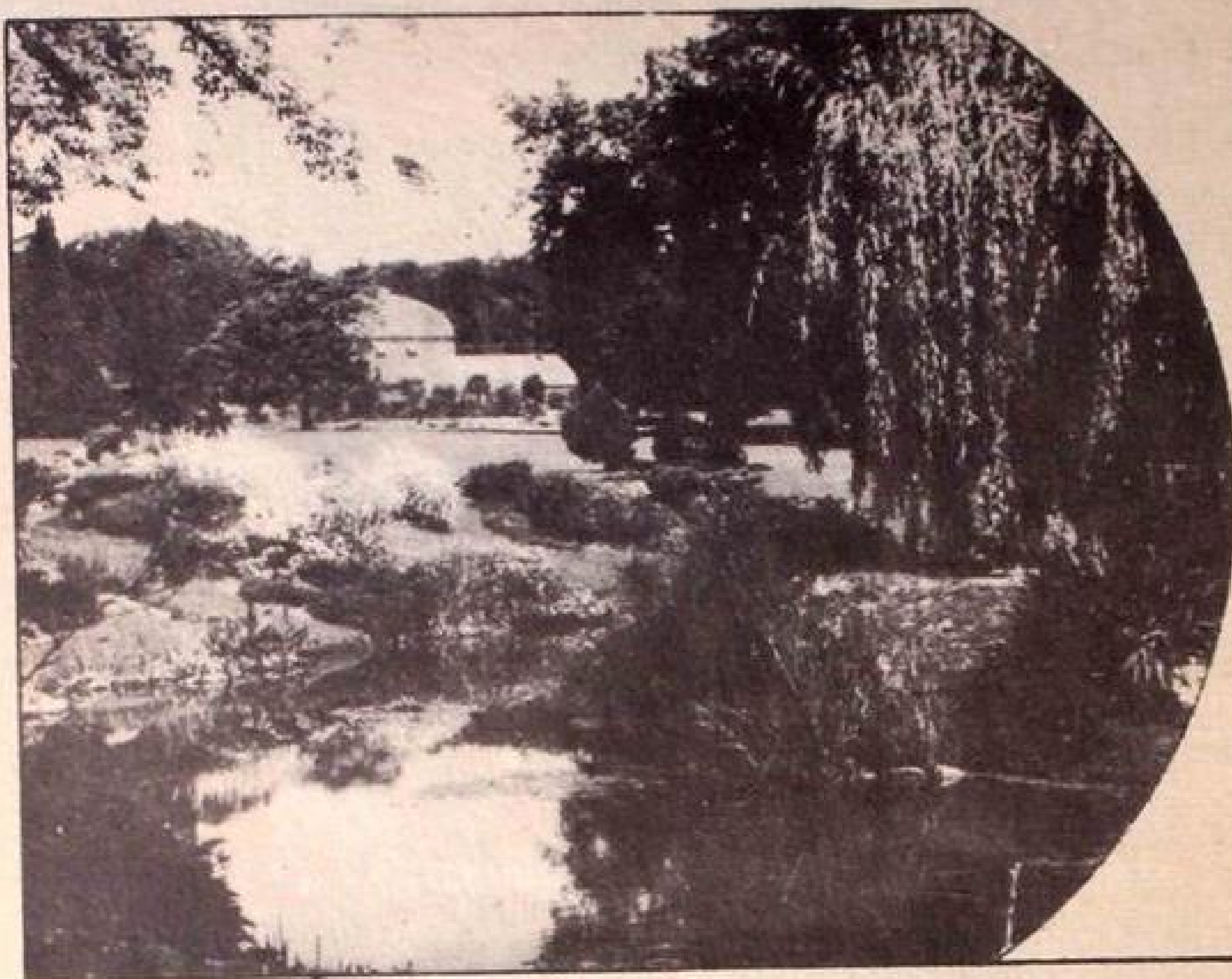
باغ نباتات میں: آج سہ پہر کے پروگرام میں دو چیزیں ہیں۔ انھیں آخر میں رکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ باغ نباتات میں وقت ہی ۲ سے ۵ بجے تک ہے۔ ہمیں موقع ملتا تو صبح ہی سے وہاں پہنچ جاتے۔

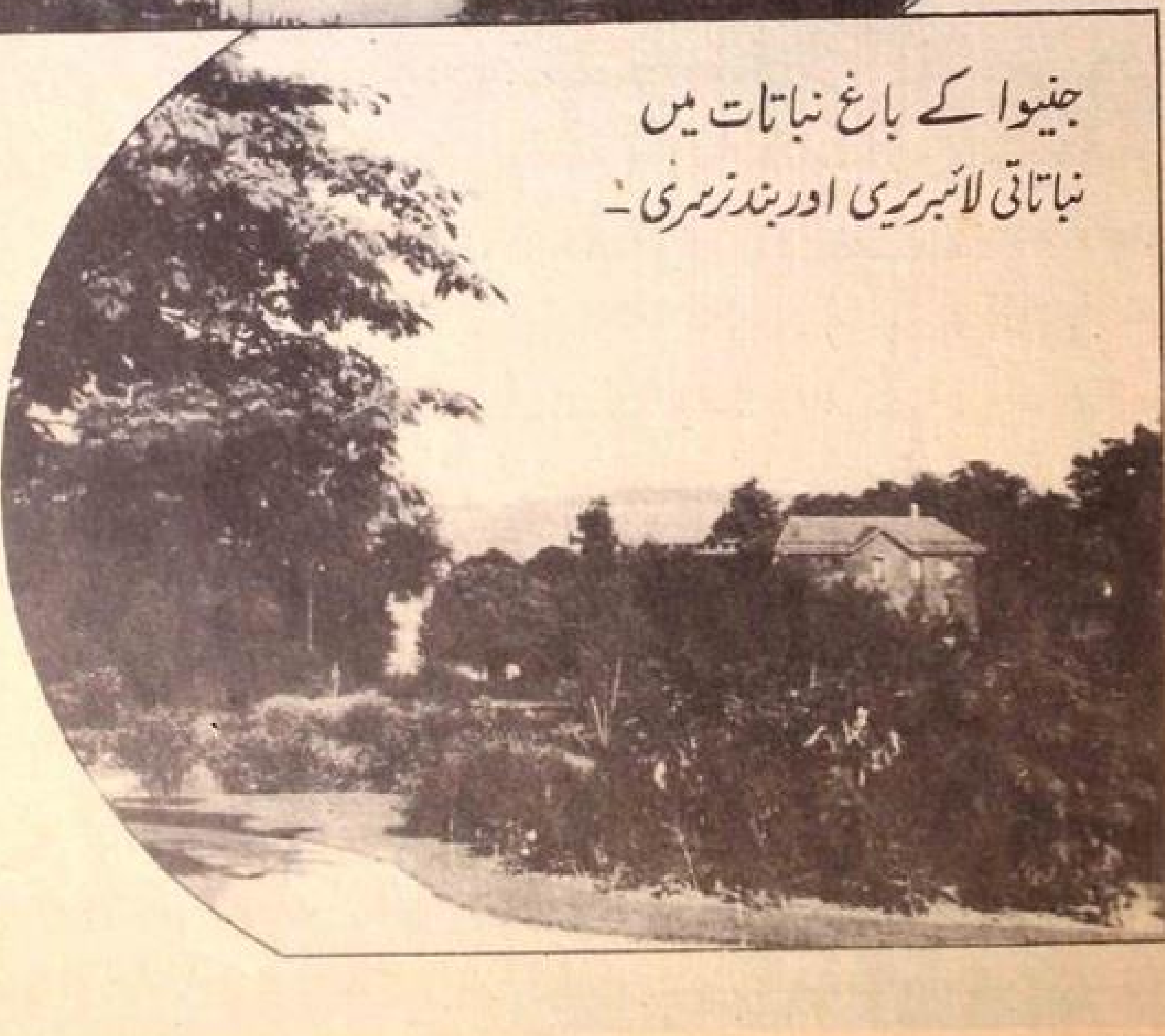
پونٹے ڈی لوزین کے مقام پر کنزرویٹوائر بوٹانیک کے نام سے اسے نباتات کا عجائب گھر کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی گھنٹی بجی۔ اس گھنٹی کا تعلق دروازہ کھولنے سے ہے۔ ایک

خاتون گھبرائی ہوئی بلکہ بھاگی ہوئی آئیں اور جب میں نے انگریزی میں ان سے بات کی تو وہ ہاتھ کا اشارہ کر کے اندر بھاگ گئیں - دروازے کے شیشوں میں سے اندر کا نقشہ نظر آرہا تھا - ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیلی فون کر رہی ہیں - دوسرے ہی لمحے ایک معمر خاتون اوپر سے بڑی تیزی سے نیچے آئیں اور انھوں نے انگریزی میں ہمیں سلام کیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہماری بات سمجھ سکیں گی چونکہ وہاں بھی چھٹیاں تھیں، اس لیے ڈائرکٹر ان دنوں پیرس گئے ہوئے تھے - لیکن معمر خاتون نے ازراہِ عنایت آمادگی ظاہر کی کہ وہ بطور خاص ہم کو پودوں اور دواؤں کے ذخیرے دکھا دیں گی۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہماری راہنمائی کی -

ایک وسیع کمرے میں پودوں اور دواؤں کو نمونوں کے طور پر اس طرح رکھا گیا ہو کہ بادی النظر میں وہ ایک لائبریری معلوم ہوتی ہو - وہاں کے منتظمین نے موٹے گتے کے بکس خاص انداز کے بنوا رکھے ہیں جن میں مختلف اشیا بھری ہوئی ہیں - ان پر نمبر ڈالے ہوئے ہیں - ایک فہرست میں نمبر دیکھ کر دوا یا پودے کا حال معلوم کیا جا سکتا ہو - انڈکسنگ کا یہ نظام میری سمجھ میں نہیں آیا - میں نے رائے پیش کی کہ ہر ڈبے پر دوا یا پودے کا نام ضرور ہونا چاہیے اور نمبر اس کے علاوہ ہو تاکہ تلاش کرنے میں سہولت ہو - اگر ایک شخص برگِ نیم کے بارے میں تحقیقات کرنی چاہے تو اسے کیوں کر معلوم ہوگا کہ برگِ نیم کس ڈبے میں ہو اور اس کا نمبر کیا ہو - نمبروں کی ترتیب کوئی معنے نہیں رکھتی - میں نے دو ایک ڈبے کھول کر دیکھے - پتے، شگوفے، پھول، پھل، چھال کے ٹکڑے وغیرہ بڑی صفائی کے ساتھ گتوں پر چپکا کر یا پن سے گاڑ کر ڈبے میں رکھے گئے تھے - ہر ڈبے میں اس پودے اور اس کے تمام اجزا کے خاکے الگ الگ تفصیل کے ساتھ دکھائے گئے تھے - میں نے دو ایک پودوں کا حال فہرست میں پڑھا - واقعی ہر چیز کا ذکر مفصل صورت میں کیا گیا ہو - کون سی چیز کہاں، کس موسم میں، کس حالت میں ملتی ہو - اس کے فائدے اور نقصانات کیا کیا ہیں - کن کن دواؤں میں کن کن مقاصد کے لیے اس سے کام لیا جاتا ہو - اندازاً اس کی قیمت کیا ہوتی ہو - اسے حاصل کرنے کے کیا طریقے ہیں -

وہ خاتون ذرا جلدی اپنا کام ختم کر کے وہاں سے چلا جانا چاہتی تھیں اور چوں کہ ان کی عنایتِ خاص سے ہمیں یہ موقع مل گیا تھا، اس لیے ہم نے آدھ گھنٹے سے زیادہ وہاں ٹھیرنا مناسب نہیں سمجھا - میں نے زیادہ زور اس خیال سے نہیں دیا کہ اس سارے نظام کو لندن پہنچ کر اطمینان سے سمجھا جائے گا، لیکن یہ حقیقت ہو کہ یہاں بھی پودوں وغیرہ کے نمونے لاتعداد ہیں - میں نے لاتعداد اس لیے کہا کہ خود ان خاتون کو صحیح تعداد معلوم نہیں تھی - میرا اندازہ ہو کہ وہ سب ڈبے





جنیوا کے باغ نباتات میں
نباتاتی لائبریری اور بند نرسری ۔

پچاس ہزار سے کم نہیں ہوں گے۔

برابر کے دوسرے وسیع کمرے میں نباتات پر لائبریری ہے۔ میں نے اس موضوع کی اتنی بڑی نباتاتی لائبریری کہیں اور نہیں دیکھی۔ دور تک کتابوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس جیسے کئی ہال ہیں اور ان سب میں کتابوں کی کل تعداد ایک لاکھ ہے لیکن سب کا موضوع صرف نباتات ہے۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ کم و بیش تمام ممالک سے جمع کی ہوئی مختلف زبانوں کی کتابیں وہاں موجود ہیں۔ انھوں نے جغرافیائی تقسیم کا لحاظ رکھا ہے۔ یعنی لائبریری کو ممالک کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہم نے کتب خانہ بڑی دل چسپی سے دیکھا۔ سکریٹری صاحبہ نے ہمیں بتایا کہ بہت سی کتابیں وہاں سے یونیورسٹی میں بھی منتقل کر دی گئی ہیں کیونکہ ان کو رکھنے کے لیے کافی جگہ نہیں تھی۔ انھوں نے بتایا کہ اب یہ انتظام ہو رہا ہے کہ اس سارے ادارے کو کسی بڑی عمارت میں لے جایا جائے۔ لیکن یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔

یہاں نباتات کے موضوع پر رسالے اور کتابچے بھی ساری دنیا سے آتے ہیں۔ ان کے مکمل فائل بڑے سلیقے سے بنا کر رکھے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ وہ ایک عجیب لائبریری ہے اور طبِ مشرقی کے ہم جیسے دلدادگان کے لیے ایسی جگہ ہے کہ وہاں سکون سے بیٹھ کر نباتات پر کام کیا جا سکتا ہے۔ میں نے برسبیل تذکرہ ان سکریٹری صاحبہ سے معلوم کیا کہ وہاں آ کر اور رہ کر اس لائبریری وغیرہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب انھوں نے بڑی دل چسپی کے ساتھ اثبات میں دیا۔ اس سے پہلے وہاں رہ کر کام کرنے کی درخواست کسی نے نہیں کی تھی۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا آپ اسی سفر کے دوران میں یہ کام شروع کر دینا چاہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ فی الحال یہ جائزے کا سفر ہے۔ یعنی محض نظری مطالعہ ہمارا منشا ہے۔ عملی مقاصد کے لیے دوسرا سفر بعد میں ہوگا۔ انھوں نے کچھ اس طرح اپنے شوق کا اظہار کیا جیسے وہ بہت جلد ہمیں مہمان بننے کی دعوت دینے والی ہیں۔

ان ہی خاتون نے یہ بھی بتایا کہ اس لائبریری کی بعض فاضل کتب منتظمین نے لندن کے ایک کتب فروش کے ہاتھ فروخت کر دی ہیں، جو پرانی کتابوں کا بڑا کاروبار کرتا ہے۔ انھوں نے مَیں سیلر کا پتہ مجھے دے دیا کیونکہ میں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ہم اپنے مطلب کی کتابیں اس سے خرید لیں گے۔ بہرحال ہمیں بھی اپنی لائبریری کو وسیع کرنا ہے اور اس میں امراض و طریقِ علاج کے علاوہ نباتات کے موضوع کی کتابیں بھی شامل کرنی ہیں۔ اب بھی کافی ذخیرہ جمع کر لیا ہے لیکن بہت کچھ کسر باقی ہے۔

اس لائبریری کی کوئی مطبوعہ فہرست نہیں تھی۔ البتہ انڈکس باقاعدہ ہے۔ ہم نے ان سے ۱۹۵۵ء کے ماہانہ رسالے خریدے۔ ہر ایک کی قیمت تین فرانک تھی۔ انھوں نے ہمیں ہفتہ وار شائع ہونے والا بلیٹن بھی دیا جو سائکلوسٹائل مشین کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے ہر رسالے میں کسی ایک پودے کا مفصل حال اور دوسری خبریں درج ہوتی ہیں۔ مطبوعات کی زبان فرانسیسی ہے۔ انگریزی میں وہاں سے کوئی چیز شائع نہیں ہوتی۔

غرض ہم اس عجیب و غریب جگہ سے بہت ہی متاثر ہو کر نکلے۔ انسان ارادہ کرے اور اس کے ساتھ ہی پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے پوری کوشش کرے تو ہر خواب کی تعبیر ممکن ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے کام کے لیے ہم بھی فی الحال خواب دیکھ رہے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ وہ شرمندۂ تعبیر کب ہوتا ہے۔

اسی لائبریری کے سامنے ایک باغ نباتات بھی ہے۔ ہم وہاں سے نکل کر اسے دیکھنے چلے گئے۔ وہاں سب دوائی پودے لگائے گئے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ ایلومینیم کی پلیٹ پر اس کا نام لکھا گیا ہے۔ کئی ہزار پودے ہیں۔ اتنے کم وقت میں سب کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ بس ایک سرسری نگاہ سب پر ڈالی گئی ان میں سے بہت سے جانے پہچانے تھے۔ بعض کو پہلی مرتبہ دیکھا جا رہا تھا۔ میں نے بھائی جان محترم سے کہا کہ یہ آپ کے دیکھنے کی چیز ہے۔ انھوں نے فوراً پلٹ کر سوال کیا، اور کیا تمھارے دیکھنے کی چیز نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ دیکھنے کی چیز تو ضرور ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میری حکومت کو اس قسم کے کاموں سے دل چسپی نہیں ہے۔ وہ اپنے مفاد سے وابستہ سیاسی الجھنوں میں سرگرداں ہے۔ عوام کے فائدے کے پہلو پر کم غور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آپ کے ملک کی حکومت کو اس قسم کے ہر کام سے بے انتہا دل چسپی ہے۔ آپ نے دہلی میں بدرپور کے علاقے میں زمین لے لی ہے۔ آپ فوراً ہی ایک باغ نباتات لگا سکتے ہیں۔ میری حکومت نے دو سال سے معاملے کو لٹکا رکھا ہے۔ زمین کا فیصلہ کسی طرح نہیں کیا جاتا۔ اس لیے آپ اس خیال سے دیکھیے کہ آپ کو یہ کام جلد کرنا ہے۔ میں سراپا آرزو بن کر آپ کی کوششوں کا ثمرہ دیکھوں گا، اور آپ کی کامیابی پر رشک کروں گا۔

جنیوا کا یہ باغِ نباتات حُسنِ اتفاق سے ایک جھیل کے کنارے واقع ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے، حتیٰ کہ خزاں کے موسم میں بھی یہاں خزاں کا زیادہ رنگ نہیں جمتا۔ اور چونکہ اقوام متحدہ کا یورپی دفتر، بین الاقوامی ادارۂ عمّال کا صدر مقام اور دوسری عالمگیر انجمنوں کے دفاتر قریب ہی واقع ہیں، اس لیے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ علاقہ شہر سے ذرا باہر ہے۔

اس باغ کو سوئزرلینڈ کے سب سے زیادہ پرانے باغوں میں شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی

داغ بیل ۱۸۱۷ء میں آگسٹن پائرمیس دا کینڈولے کے ہاتھوں پڑی تھی، جو جنیوا آکر یونیورسٹی میں علم نباتات کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ اس وقت اس کا محل وقوع ذرا مختلف تھا، یعنی اب اصل باغ کی سرزمین پر تو ایک مشہور عمارت بن گئی ہے جو دورِ اصلاحات کی یادگار کہلاتی ہے اور باغ نے ۱۹۰۱ء کے بعد سے قرب و جوار کے بہت سے قطعاتِ زمین کو گھیر لیا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اب اس کا رقبہ جو نو ایکڑ کے قریب ہے، کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے۔

اپنے قیام کے تقریباً سو سال بعد تک یہ باغ باقاعدہ ایک مدرسۂ نباتات اور ایک مثالی زرسری بنا رہا ہے۔ پھر سرکاری طور پر ایک تجربہ گاہ بن گیا یعنی دنیا بھر سے جھاڑیوں، بیلوں اور پھل والے درختوں کے نمونے منگا منگا کر ان کے نشو و نما کی کوشش کی جانے لگی۔ انھی تجربات کا نتیجہ ہے کہ یہاں مختلف پودوں کی ایسی ایسی قسمیں نظر آتی ہیں جو کسی اور جگہ مشکل ہی سے ممکن ہو سکتی ہیں شاید اس کے مقابلے میں برطانیہ کے کیو گارڈن کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی باغ کی پیداوار کو نباتات کے اس عجائب گھر میں محفوظ کیا جاتا ہے، جسے ہم ابھی ابھی دیکھ آئے ہیں۔

صدر دروازے سے باغ میں داخل ہوں تو فوراً سامنے ایک طویل خیابان نظر آتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف مسلسل قطاروں کی صورت میں لگے ہوئے ایسے عام درختوں نے جو ہر جگہ اُگتے نظر آتے ہیں، باغ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان درختوں کی، جو یقیناً بہت پرانے ہیں کاٹ چھانٹ نہیں کی گئی، اسی لیے وہ پرانے وضعدار لوگوں کی طرح دقیانوسی انداز میں چپ چاپ کھڑے نظر آتے ہیں۔

خیابان کے دائیں طرف والے حصے میں ایسے درخت لگائے ہیں جو اقتصادی اعتبار سے اہم اور مفید کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر غیر ملکی نژاد ہیں اور یہاں آکر رس بس گئے ہیں۔ بائیں طرف وہ پودے ہیں جن کو کوہ ایلپس کی چوٹیوں، دروں اور وادیوں سے لایا گیا ہے اور یہاں ان کے نشو و نما میں ذوقِ لطیف سے بھی کام لیا گیا ہے یعنی کہیں کہیں مصنوعی پہاڑیاں بنا کر ان پر محض بیلوں اور جھاڑیوں کو اس طرح چڑھایا گیا ہے گویا وہ اب بھی کوہ ایلپس کی کسی اونچی چوٹی ہی پر پھیل رہی ہیں۔

معلوم ہوا کہ مارچ، اپریل اور مئی کے تین مہینوں میں، کہ یہاں یہ زمانہ موسم بہار کا ہوتا ہے، یہ مصنوعی پہاڑیاں عجیب رنگ نکھارتی ہیں۔ رنگ برنگ کے پھول، اپنی وضع قطع اور بو باس سے زائرین کا دل موہ لیتے اور دماغ تر و تازہ کر دیتے ہیں۔ بعض درختوں کے پتے بھی اس

موسم میں اپنا رنگ بدل کر پھولوں کی برابری کرنے لگتے ہیں۔

بعض پودوں کی ترتیب ان کے وطن مالوف کے اعتبار سے کی گئی ہے یعنی کا کیشیا کا پچھیا چین، جاپان اور امریکا وغیرہ کے حصے الگ الگ ہیں۔ بڑی حد تک ہر جگہ کی آب وہوا کا لحاظ رکھنے کے لیے شیش محل بنائے گئے ہیں، جن میں غیر ملکی پودے رئیسوں اور نوابوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اور اگر سارے ملک میں خزاں کا دور دورہ ہو تب بھی وہ اپنے وقت پر بہار کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے قیام و بقا کے لیے مصنوعی گرمی یا سردی کے ذریعے مخصوص درجۂ حرارت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہمیں ایک مصنوعی تالاب کی سطح پر، جو ایسے ہی ایک بند کمرے میں تھا کنول کے پھول تیرتے دیکھ کر تعجب ہوا۔

آرٹ گیلری میں: ہم چار بجے باغ نباتات سے باہر نکلے۔ ہم نے اس توقع پر اپنی ٹیکسی چھوڑ دی تھی کہ یہاں سے دوسری ٹیکسی مل جائے گی، مگر نہیں ملی۔ ہم پیدل چلتے چلاتے بیس منٹ بعد ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہاں سے ٹیکسی مل گئی اور ہم ایک اور آرٹ گیلری میں چلے گئے، جو سوئزرلینڈ کی ثقافت اور تاریخ کی بیک وقت آئینہ دار ہے۔

اہلِ پنجاب کے بارے میں ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ کسی غیر ملکی سیاح نے پنجاب کے ایک طالب علم سے اس ملک کے کلچر (ثقافت) کے بارے میں سوال کیا تو طالبِ علم نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ ہمارا کوئی کلچر نہیں ہے، بلکہ ایگری کلچر (زراعت) ہے۔ یہی سوال اگر سوئزرلینڈ کے کسی باشندے سے کیا جائے کہ آپ کا کلچر کیا ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ جائے گا کیونکہ اس ملک کی ثقافت میں کوئی انفرادیت نہیں پائی جاتی، بلکہ اسے بہت سی ثقافتوں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے، جن کے مابین اتنا نمایاں فرق بلکہ تضاد ہے کہ بعض اوقات ایک علاقے کا رہنے والا دوسرے علاقے میں چلا جائے تو یہ ماننے میں اسے تامل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی ملک کے ایک اور حصے میں موجود ہے۔ لباس، بول چال، کھانا پینا، رہنا سہنا، ناچ گانے کا انداز اتنا جدا گانہ ہے کہ رشتۂ مماثلت کا سلسلہ مشکل سے جوڑا جا سکتا ہے۔

اس ملک کے ادیبوں اور شاعروں کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے لیکن وہ معدودے چند ادبا اور شعرا ایسی خوبیوں کے حامل ہیں کہ انھوں نے دنیا بھر میں نام پیدا کر لیا ہے۔ تاہم ان کی شہرت کا سہرا اس حقیقت کے سر ہے کہ انھوں نے اپنے وطن سے باہر قدم نکال کر قلم کے جوہر دکھائے اور نام پیدا کیا۔ یہی حال موسیقاروں اور رقاصاؤں کا ہے۔ ان کے گلے کے رس اور اعضا کے لوچ نے

اٹلی اور فرانس کی محفلوں میں پہنچ کر اپنا سکہ بٹھایا اور سننے اور دیکھنے والوں کا دل موہ لیا۔ مصوری نے البتہ ملک کی حدود ہی میں رہ کر موقلم کا حسن نکھارا، لیکن ان کے شاہکار بھی اب غیر ملکی عجائب گھروں اور نگار خانوں کی زینت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں ادبی رسائل بہت کم ہیں، اور ان کی اشاعت ہمیشہ قلیل رہتی ہے۔ اگر ملک میں چار زبانیں نہ بولی جاتیں تو شاید علمی اور ادبی محفلوں کا رنگ مختلف ہوتا۔

اس کے یہ معنے نہیں کہ سوئزرلینڈ نے علم و فن کے میدان میں صاحبانِ کمال پیدا نہیں کیے۔ اس زمانے میں کسی ملک کی علمی، ادبی اور فنی خدمات کو جانچنے کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ اس ملک کے باشندوں کو دیے جانے والے نوبل انعامات کی فہرست پر نظر ڈال لی جائے۔ اگرچہ اس بنیاد پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تاہم تحقیق کا ایک آلہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے سوئزرلینڈ کو بہت سے بعض ایسے ملکوں پر فوقیت حاصل ہے جن کی ثقافت کے نقوش بہت اُجاگر اور دیرینہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس صدی میں سوئزرلینڈ کے تقریباً سترہ باشندوں کو یہ اعزاز حاصل کرنے کا فخر حاصل ہے۔ صرف امن کے چھے نوبل انعامات اس ملک کو ملے ہیں ـــــــ تین افراد کو اور تین اداروں کو ـــــــ افراد میں سے سرِفہرست ہنری دوناںت کا نام ہے۔ انھیں انجمن صلیب احمر قائم کرنے اور اس کی خدمات کو ساری دنیا میں فروغ دینے پر انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ان کے بعد ایلی ڈکومن اور البرٹ گوباٹ کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں بین الاقوامی ادارۂ امن کے سربراہ رہے ہیں۔ سوئزرلینڈ کے تین ادارے ـــــــ بین الاقوامی ادارۂ امن، صلیب احمر کی بین الاقوامی کمیٹی اور بین الاقوامی ادارۂ مہاجرین بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اس ملک کے دو افراد یعنی ڈاکٹر گوئیلام اور ڈاکٹر پاؤلی کو طبیعات کے دو نوبل انعامات ملے ہیں۔ چار افراد ڈاکٹر ورنر، ڈاکٹر کارر، ڈاکٹر روزسکا اور ڈاکٹر ملرنے علم کیمیا میں۔ تین افراد یعنی ڈاکٹر کوشر، ڈاکٹر ہیس اور ڈاکٹر ریخ اسٹین نے طب کی دنیا میں اور کارل اسپٹلر اور ہرمان ہیسی نے ادبیات کے میدان میں نام پیدا کر کے یہ افتخار حاصل کیے۔ ان کے علاوہ ۱۹۵۱ء میں طب کا جو نوبل انعام ڈاکٹر تھیلر کو دیا گیا وہ قومیت کے اعتبار سے سوئستانی تھا۔ کیڑے مار سفوف ڈی ڈی ٹی، جو ساری دنیا میں مشہور ہے اور جسے ملیریا پھیلانے والے مچھروں کے استیصال کے لیے عالمی ادارۂ صحت نے اپنا سب سے بڑا ہتھیار بنا رکھا ہے، ایک سوئستانی دواساز کا کارنامہ ہے جس کو اسی ایجاد پر نوبل انعام ملا تھا۔

اس زمانے کا ایک بڑا مفکر اور سائنسداں البرٹ آئن اسٹائن اگرچہ پیدائش کے لحاظ سے سوئسٹانی نہیں تھا، تاہم نام ونمود حاصل کرنے سے قبل اس نے سوئزرلینڈ میں اعلیٰ تعلیم پائی اور وہیں کی قومیت اختیار کرلی تھی۔ وہ شہر برن کے پٹنٹ آفس میں معمولی طور پر ملازم تھا اور اسی ملازمت کے دوران میں جب کہ اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی، اس نے فلسفے میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی اور پھر سائنس کے میدانِ عمل میں داخل ہو گیا۔ علم وادب، دین ومذہب، قانون وحکمت اور کھیل کود کی دنیا میں بھی یہاں کے بعض اور لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔

تو یہ آرٹ گیلری، جسے ہم باغِ نباتات کی سیر کرنے کے بعد دیکھنے گئے، دل چسپی کے اعتبار سے خاص چیز ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم اسے صرف نصف گھنٹے دیکھ سکے، کیونکہ وہ روزانہ پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ اس میں تصاویر کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ مکمل تاریخ بن جاتی ہے۔ ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سجانے اور سنوارنے کا سلیقہ ان لوگوں کو خوب آتا ہے۔ ایک کمرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ دیواروں پر پرانی پٹینگز آویزاں ہیں، مگر یہاں دیوار پر کپڑے کا پردہ جھالردار لگایا جا رہا ہے، اس پر تصاویر لٹکائی جائیں گی۔ انفرادی تصاویر میں سے ہولبین دی ینگر کی ایک تصویر "آدم اور حوا" اس کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ خدا جانے اس میں کیا تحفگی ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر سر دھنتے ہیں اور اس کا دیدار خاص طور پر کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس فن کار کی اور تصاویر اچھی ہوں مگر مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھائی۔ میرے نقطۂ نظر سے آدم اور حوا کے مرقعے مضحکہ خیز ہیں، اسے دیکھ کر ہنسی بھی نہیں آتی، بلکہ کراہیت پیدا ہوتی ہے۔ اسلام میں تصاویر اور خصوصاً ایسی تصاویر بنانا تو قطعی ناجائز اور مذموم ہے لیکن خدا جانے نصرانیت کے علمبردار راہنما ایسی چیزوں کو کیونکر گوارا کر لیتے ہیں۔ آدم کی مونچھیں نہایت موٹی، بھدی اور سرخ رنگ کی ہیں، جسم ایسا پلپلا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ایک دم ورزش چھوڑ دینے والے پہلوانوں کا ہو جاتا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اسے ایک پہلوان کا گبری گیچر ہی کہہ لیجیے۔ یا زیادہ مناسب صورت میں یوں سمجھیے کہ ایک بہت ہی اکھڑ قسم کا گنوار بہت ہی حریص نگاہوں سے، جن میں شہوت پرستی کی جھلک پائی جاتی ہے، بیباکانہ انداز میں حوا کی طرف تک رہا ہے اور یہ مسماۃ اپنی نظیر آپ ہے۔ یا شاید تلاش کرنے پر اسکیمو قوم میں یا افریقہ کے مردم خور قبائل میں پائی جا سکتی ہے۔ نہایت موٹی عورت، جس کی پھولی ہوئی توند جلندھر کی، مراینہ یا پھر حاملہ ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ بالکل برہنہ ہے۔ صرف پھولوں کی ایک ڈالی سے جسم کے اس حصے کو چھپا رکھا ہے، جسے نام نہاد متمدن اقوام بھی کھلا رکھنا گوارا نہیں کرتیں، ورنہ سینے پر

لٹکی ہوئی دو "ہتھیلیاں" جو بالکل عریاں ہیں، تسکینِ نظر کے بجائے کرب و بے چینی پیدا کرتی ہیں اور سوچنا پڑتا ہے کہ یا اللہ یہ فن لطیف کا نمونہ ہے یا فن کثیف کا۔ بعض لوگ ایسی چیزوں کو دیکھ کر اس لیے بھی خاموش ہو جاتے ہوں گے کہ ایسے فن پر تنقید کرنا اور نقص نکالنا بدذوقی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ یا پھر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ فن لطیف کو سمجھنے کی آپ میں صلاحیت اور استعداد ہی نہیں ہے۔

اس قسم کی چیزوں سے قطع نظر اس آرٹ گیلری میں بعض تصاویر کو واقعی شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ایک تصویر میں جھیل کے کنارے سفید بگلوں کی قطار اور پس منظر میں برف پوش پہاڑ کی سفید چوٹیاں، جو جھیل کے نیلگوں پانی پر سایہ فگن ہیں، ایسا لطیف نظارہ پیش کرتی ہیں کہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

جنیوا جھیل کے کنارے: ساڑھے پانچ بجے ہم ہوٹل واپس آئے اور غسل کر کے ہلکا سا ناشتہ کر کے پھر باہر چلے گئے، تاکہ جھیل جنیوا کے کنارے کنارے دور تک ٹہلتے ہوئے جائیں۔ کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد ہم ایک جگہ ذرا ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کچھ اس لیے بھی کہ سامنے کا منظر بڑا حسین تھا۔ جھیل کے پانی میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے پر پھیلا کر گول کر لیے تھے۔ سامنے کئی بادبانی کشتیاں بھی چل رہی تھیں۔ وہ ذرا بڑی بطخیں معلوم ہو رہی تھیں کیونکہ ان کے بادبان بھی بالکل سفید تھے۔ پیچھے پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا اور کوہ ایلپس کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ بلانک جھیل کے نیلگوں پانی کی طرح نیلے آسمان کے نیچے بہت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک پہاڑی کے کونے میں سورج غروب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آخری کرنیں ہر آن شکل بدلتے ہوئے بادلوں کے بیچ بیچ میں قرمزی رنگ کی کوچیاں پھیر رہی تھے۔ مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی کے یہ الفاظ ایک دم یاد آ گئے:

THE WEALTH OF GOLD WAS SCATTERED IN THE RIFTS OF THE CLOUD.

اور اس کے ساتھ ہی علامہ نیاز فتحپوری نے جو دلکش ترجمہ اس جملے کا کیا ہے، حافظے کی لوح پر ابھرنے لگا (دولتِ زر بادلوں کے شگافوں میں پھیلی پڑی تھی)

کچھ دیر میں آسمان قرمزی سے سرخ ہو گیا، جیسے سورج کے غروب ہونے پر اسے غصہ آ گیا ہو۔ اس وقت جھیل کی سطح پر کرنوں کے آخری انعکاس نے ایک آگ سی لگا دی، جیسے

پانی پٹرول بن کر جل اٹھا ہو۔ میں نے سوچا کہ یہ جھیل اگر واقعی پٹرول کی ہو جائے تو سوئزرلینڈ کا روایتی امن فوراً خاک میں مل جائے، کیونکہ اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی طاقتوں کے درمیان تیسری جنگ عظیم اسی وقت چھڑ جائے اور جب ان میں سے کسی کا بس نہ چلے یا کامیابی ممکن نہ ہو تو بی جمالو کی طرح اس میں چنگاری ڈال کر دور کسی چوٹی پر بیٹھ کے تماشا دیکھیں بالکل اسی طرح جیسے نیرو نے روم کو آگ لگوا کر ایک پہاڑی سے اس کا نظارہ کیا تھا!

یہ اس لطیف منظر کی سحرکاری تھی کہ میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کہنا یہ تھا کہ سورج نے شام سیاہ قبا پر لالے کے پھول مارنے بند کر دیے اور ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی، گویا کہ جھیل کی دیوی نے اپنے سیاہ گھنے بال کھول کر ہر چیز کو ان میں لپیٹ لیا۔ کنارے کنارے دور دور تک لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں پر قمقمے روشن ہو گئے اور اب سماں بالکل ہی بدل گیا۔ قدرت کی بے پناہ فیاضیوں پر انسانی کمالات کا رنگ چڑھ گیا۔ پہاڑیوں پر مسلسل نظر آنے والے سرخ چھتوں کے مکانات بھی نظر سے اوجھل ہو گئے اور ان کی جگہ روشنی کے بلب اس طرح جھلملانے لگے جیسے آسمان پر ان گنت تارے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آسمان کا ایک ٹکڑا توڑ کر اور پہاڑ کا تکیہ بنا کر اسے ذرا ترچھے انداز میں رکھ دیا گیا ہو!

جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن پونے آٹھ بجے ہم وہاں سے اٹھ ہی گئے۔ اتنا طویل وقت تو انھی کاموں کو دیا جا سکتا تھا جو ہمارے مقاصدِ سفر کے ماتحت پروگرام میں شامل تھے، ہم بازاروں میں سے گھومتے گھامتے اور شوکیسوں میں گھڑیوں اور دوسری مصنوعات کی آرائش دیکھتے بھالتے نو بجے کے قریب ہوٹل پہنچ گئے۔ تاہم کھانا کھانے کے لیے آج نیچے نہیں گئے۔ ہلکی غذا کے طور پر دودھ اور کچھ پھل منگوا لیے۔

بھائی جان محترم نے کچھ دیر بعد برن میں بھارتی سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری مسٹر جمال قدوائی کو ٹیلی فون کیا۔ یہ شہر خاصے فاصلے پر ہے اور ملک کا صدر مقام ہے۔ میرا خیال تھا کہ ٹرنک کال ہوگی اور نمبر ملانے میں کافی دیر لگے گی۔ لیکن ایسا محسوس ہوا کہ قدوائی صاحب اسی ہوٹل کے کسی اور کمرے میں دوسرے نمبر پر موجود ہیں۔ آپریٹر کو ہدایت دینے کے ایک ہی منٹ بعد ہم سے کہا گیا کہ بات کیجیے، قدوائی صاحب لائن پر منتظر ہیں۔ بھائی جان محترم نے دل کھول کر ان سے گفتگو کی۔ تین منٹ بعد سلسلہ منقطع کرنے کا سوال بھی نہیں تھا۔

اپنے ملک کا یہ حال ہے کہ اگر کراچی سے لاہور بات کرنی ہو تو ایکسپریس کال کے لیے کم سے کم



جینوا میں
آتشبازی کا
ایک منظر





جھیل جنیوا کے کنارے

ایک گھنٹے ٹھیرنا پڑتا ہے اور اگر معمولی کال ہو تو ۴-۵ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ بات ادھوری ہے کہ آپریٹر نے ڈانٹا، "وقت ختم" اب یا تو مایوس ہو کر رسیور رکھ دیجیے یا اس کی خوشامد کیجیے کہ تین منٹ اور دو، ڈبل چارج دیں گے۔ بعض اوقات تو سارا دن گزر جانے کے بعد اس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب ہماری کال منسوخ کر دیجیے۔ آخر زندگی کے اور کام بھی ہیں ، ٹیلی فون کی گھنٹی پر کان لگا کر کس طرح زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

قدوائی صاحب سے بھائی جان محترم کے تعلقات اچھے ہیں۔ انھوں نے زیورخ میں بھی ہمیں اپنی رائے سے مطلع کیا تھا اور پروگرام بنا کر بھیجا تھا۔ اب ہم ان سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ عالمی ادارہ صحت اور انجمن صلیب احمر کے دفاتر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مناسب انتظام کرا دیں۔ کراچی سے میں تعارفی خط لانا بھول گیا تھا۔

آج لندن ٹائمز میں ایک چھوٹی سی خبر یہ پڑھی کہ ڈاکٹر خان صاحب نے اپنا خیال بدل کر مسٹر سہروردی کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کر لیا ہے اور مسٹر سہروردی آج ۱۲ ستمبر کو اپنی کابینہ کا اعلان کرینگے جس میں ۱۲ میں سے ۶ وزیر ری پبلکن ہوں گے۔ چونکہ دو تین دن سے انگریزی اخبار نہیں ملا تھا اور ہم وطن کے حالات سے لاعلم تھے، اس لیے یہ خبر ایک دم عجیب سی معلوم ہوئی۔ سوچتے رہ گئے کہ آخر کیا صورت پیدا ہوئی ہے کہ مسٹر سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم بنائے جا رہے ہیں اور کس طرح چودھری محمد علی کو علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سیاست کو شطرنج کی بازی سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن ہمارے ملک میں تو یہ بازی نہایت شاطرانہ انداز میں کھیلی جا رہی ہے اور چالوں سے پتہ نہیں چلتا کہ بازی گر آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں یا مخالفانہ انداز میں یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ تبدیلی ایسی نہ ہو جیسی وہ سوچی سمجھی چال جبکہ ایک شاطر جان بوجھ کر اپنا مہرہ اس لیے پٹواتا ہے کہ فریق مخالف اس لالچ میں پھنسے اور ساری بازی کا رنگ بدل جائے۔

---

۱۳ ستمبر ۱۹۵۶ء — جمعرات

جنیوا میں دوسرا دن

ابھی نو بجے صبح برن سے قدوائی صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے دو نام اور لکھوائے: ایک سنٹر آف اورینٹل سائنس کا اور دوسرا دوا سازی کے ایک ادارے کا۔ انھوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ ہم عالمی ادارۂ صحت اور صلیبِ احمر کے دفاتر کس خیال سے دیکھنے چاہتے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ ان کے تنظیمی حالات سے واقف ہونا ہمارا مقصد ہے۔ ان دونوں کی زنجیروں کی کڑیاں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور کام میں کوئی نقص پیدا ہونے نہیں پاتا جس کا مطلب یہ ہے کہ اصول اور قاعدے بڑے نپے تُلے اور سوچے سمجھے ہوں گے اور ان کو عمل میں لانے والے بڑے مخلص ہوں گے۔ ہمارا منشا سمجھ کر انھوں نے کہا کہ میں ابھی جنیوا میں اپنے دفتر ٹیلی فون کرتا ہوں۔ وہاں کے کونسلر مسٹر الگزینڈر ہیں۔ ان کو ہدایات دیجائینگی وہ دوبارہ ہمیں مطلع کریں گے کہ کام بن گیا یا نہیں۔ اور پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا۔

قدوائی صاحب کی یہ دل چسپی کہ ابھی ہم انھیں ٹیلی فون کرنا ہی چاہتے تھے کہ خود ان کا ٹیلیفون آگیا، ہمارے لیے بہت اطمینان کا باعث ہوئی۔ جنیوا میں بھارت کے سفارت خانے کا دفتر ہے مگر پاکستان کا شاید کوئی دفتر یہاں نہیں ہے، اس لیے پتوں کی جو کتاب ہوٹل سے ملی ہے، اس میں کوئی ذکر اس کا نہیں ہے۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو بڑی افسوس ناک بات ہے۔ زیورخ اور جنیوا خاص طور پر ایسے مقامات ہیں کہ ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہمارے ملک کے دفتر ضرور ہونے چاہییں اور ان کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ وہ پاکستان کے سیاحوں کے ساتھ تعاون کریں اور انکی مدد کریں۔

میں برن میں پاکستان کے سفیر کبیر ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مالک صاحب کو تین خط لکھ چکا ہوں اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ بازل میں "سیبا" نامی دوا ساز کمپنی دیکھنے کا انتظام کر دیں۔ اب تک کوئی جواب نہیں آیا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس ہمارا پروگرام پہلے سے موجود ہے۔ مجھے توقع نہیں ہے کہ وہ یہ انتظام کر سکیں گے۔ غالباً قدوائی صاحب ہی ہمارے لیے یہ زحمت بھی گوارا کریں گے۔

ادھر لندن میں پاکستان کے ہائی کمیشن سے جناب سبطِ حیدر کا خط آیا ہے۔ حیدر صاحب سے بھی میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ اسی لیے انھوں نے بڑی محبت سے ہمارے انتظامات کے بارے میں

مشورے دیے ہیں اور لکھا ہے کہ ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے جو کام ہوا انھیں لکھ کر بھیج دیا جائے۔ نیز پارک ڈیوس، مے اینڈ بیکر اور گلیکسو لیبارٹریز اور ان سب کے کارخانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر انھیں دیکھنا چاہیں تو وہ ابھی سے انتظامات شروع کر دیں۔ حیدر صاحب کے خط سے بڑا اطمینان ہوا اور مسرت بھی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

جمال قدوائی صاحب نے دوبارہ ٹیلی فون کیا اور دو پتے نوٹ کرائے۔ ایک تو سینٹر آف اورینٹل سائنس کے ڈاکٹر برگر کا اور دوسرا سوتر لیبارٹریز کے ڈائرکٹر کا۔ اور تاکید کی کہ ان کو ضرور دیکھ لیں۔ سوتر سے انھوں نے طے بھی کر دیا کہ تین بجے ان کے ہاں جانا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ جنیوا میں بھارت کے کونسلر مسٹر الگذنڈر کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عالمی ادارۂ صحت اور صلیب احمر کے دفاتر میں جانے کے لیے مناسب اوقات مقرر کرا دیں۔

ہمارے آج ہی کے پروگرام میں جیواڈان بھی ہے جو یہاں ساٹھ سال سے خوشبو اور ایسنس بنانے والا مشہور کارخانہ ہے۔ ہم ہمیشہ انھی سے خوشبوئیں خریدتے ہیں۔ چند چیزیں اور نوٹ کر رکھی ہیں، مگر وہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ بین الاقوامی ادارۂ عمال کا دفتر بھی بہر حال دیکھنا ہے۔

ہم یہ سب پروگرام لے کر مسٹر الیگذنڈر کے پاس پہنچ گئے۔ نوجوان آدمی ہیں۔ عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی، چہرا ابھرا ہوا، کشادہ پیشانی، بات میں تحکم ہے، لہجہ تیز ہے، لیکن خوش اخلاق اور باتمیز ہیں۔ اپنے عملے پر انھیں پورا اختیار حاصل ہے۔ ان کی غلطیوں پر ناراض تو نہیں ہوتے مگر ان کو نااہل سمجھتے ہیں اور طنز کرتے ہیں۔ ٹراونکور کے رہنے والے ہیں۔

مسٹر الیگذنڈر نے اپنے ایک مددگار مسٹر چودھری کو بلا کر کہا کہ عالمی ادارۂ صحت اور انجمن صلیب احمر کو ٹیلی فون کر کے وقت مقرر کیے جائیں۔ ادارے میں کوئی ڈاکٹر کول (انڈین) ہیں۔ ان سے کل ساڑھے دس بجے ملنا طے ہو گیا۔ انجمن کے ڈائرکٹر صاحب سے کل ہی ساڑھے گیارہ بجے کا وقت مقرر ہوا ہے۔ وہ خود سارے دفاتر میں گھما کر اس کی تشکیل اور نظم و نسق کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں گے۔

یہ دو اہم باتیں طے ہو گئیں۔ اس کے بعد ہم نے جیواڈان کو ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے ڈیڑھ بجے کا وقت دیا۔ بلکہ انھوں نے اپنی موٹر بھیجنے کا خیال ظاہر کیا کہ وہ آ کر ہمیں لے جائے گی تاکہ ہمیں زحمت نہ ہو، مگر ہم نے اسے پسند نہیں کیا۔

سنٹر آف اورینٹل سائنس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر برگر بہت مصروف تھے، اس لیے ان سے بات نہ ہو سکی اور کوئی مناسب وقت مقرر نہ ہو سکا۔

ان تمام ضروری انتظامات میں سوا گیارہ بج گئے اور آج کی صبح خالی رہ گئی۔ ہم واپس ہوٹل ہی آ گئے، تاکہ ڈیڑھ بجے تک تیاری کر لیں اور اخبار وغیرہ بھی دیکھ لیں۔ آج کے لندن ٹائمز سے پتہ چلا کہ مسٹر سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے ہیں۔ انھوں نے حلف اٹھا لیا ہے۔ اسی اخبار میں ان کی تقریر چھپی ہے، جو حلف اٹھانے کے بعد انھوں نے نشر کی تھی۔ انھوں نے وہ سب وعدے کیے ہیں جو ان سے پہلے کے وزیر اعظم کر چکے ہیں اور ان برائیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کا رونا سب رو چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کی وزارت کب تک قائم رہتی ہے۔ شاطر کا ہاتھ جب تک مہرے پر نہ پڑے، وہ بساط پر پڑا رہے گا، اور جب کوئی نئی چال سوجھی تو پٹ کر رہ جائے گا اور اگر اس سے قبل فریقِ مخالف کے کسی مہرے کی زبردست شہ پڑ گئی تو پھر بازی کا رنگ پلٹ جائے گا۔ مات ہو جائیگی۔ شاید پیدل ہی ہو جائے۔ سہروردی صاحب کو گھوڑ دوڑ کا بہت شوق ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ کسی اسپ تازی کی دولتی انھیں مات دے جائے اور یہ گھبرا کر میدان سے نکل بھاگیں۔ گھوڑا جب بساط کے وسط میں ہو تو آٹھ گھر روکتا ہے اور اس کی شہ میں کوئی مہرہ اعراب میں بھی نہیں آ سکتا۔ سہروردی اس حقیقت سے ضرور واقف ہوں گے اور موجودہ بساطِ سیاست کے رخ کو دیکھ کر مات کا نقشہ بٹھائیں گے، ورنہ کسی ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جائیں گے۔

یقیناً پاکستان کے لیے یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے کہ یہاں اس قدر جلد جلد انقلابات آئیں اور کوئی وزارت نچنت ہو کر ملک کی بھلائی کا کام نہ کر سکے۔ قائدِ ملت مرحوم کے بعد سے اب تک جتنی وزارتیں بنی ہیں، وہ اب تک اپنے ذاتی استحکام کی کوششوں میں لگی رہی ہیں اور ملک کے حقیقی مفاد کے لیے کوئی تعمیری اور ٹھوس کام نہیں کیا ہے۔ اس ملک کے لوگ ہی خوش نصیب ہیں اور کچھ پروردگار کی عنایت ہے، جو پاکستان اتنا بھی سنبھلا رہا ہے، ورنہ پانی میں بتاشے کی طرح اس کے بیٹھ جانے میں کیا کسر باقی ہے۔ وزارتوں کے اس حال کی وجہ سے اور امریکا سے غلط طور پر ہر معاملہ کرنے کی وجہ سے باہر کے ملکوں میں ہماری عزت کو بڑا صدمہ پہنچا ہے جسے میں اپنے اس سفر میں بری طرح محسوس کر رہا ہوں اور مجھے اس لحاظ سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ ہمارا ملک صحیح راستے پر چل کھڑا ہو، ہم دنیا کے سامنے سربلند ہو سکیں۔ ہماری طاقت حقیقی طاقت بن جائے اور ہمارا استحکام آزادانہ ہو جائے۔ ہمارا ملک دوسرے ممالک کا محتاج نہ رہے۔ ہم سرخرو رہیں اور منھ دکھانے کے قابل ہوں۔ آمین۔

جیوا ڈان: ایک بجے ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے اور جیوا ڈان کی فیکٹری کی طرف چل پڑے

جو شہر سے سات کلو میٹر دور ہے۔ ڈرائیور کو پہنچنے میں دقت ہوئی، تاہم پوچھتے پچھاتے ہم ٹھیک ڈیڑھ بجے منزل پر پہنچ گئے۔ اوپر سے ہم نے نظر ڈالی تو فیکٹری بڑی چیز معلوم ہوئی اور اندر جا کر دیکھنے پر بھی وہ واقعی بڑی چیز ثابت ہوئی۔ ہم اس حد تک تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں شعبۂ مشرقِ بعید کے ڈائرکٹر صاحب نے ہمارا خیر مقدم کیا اور انھوں نے بتایا کہ بھارت اور پاکستان کے شعبے کے انچارج ان دنوں رخصت پر ہیں، اس لیے وہ یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بہر حال ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا گیا اور اس کے بعد انھوں نے سوال کیا کہ کیا آپ کو ہماری فیکٹری کا جنیوا آ کر معلوم ہوا ہے۔

ہم نے ذرا تعجب سے انھیں بتایا کہ ہم نے تو ہمیشہ ہی جیواڈان سے اپنی ضرورت کی خوشبوئیں منگائی ہیں۔ جیواڈان ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سالِ گزشتہ ہی ہم نے پاکستان میں تقریباً بیس ہزار کا سامان منگوایا تھا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے، آپ کا فائل مجھے نہیں مل سکا۔ ہم نے کہا کہ آپ ہمدرد کی مد میں تلاش کیجیے۔ شاید آپ نے ہمارے ناموں سے تلاش کیا ہے۔ انھوں نے وہیں سے ٹیلی فون کیا۔ اپنی زبان میں کچھ سمجھایا اور ۳-۴ منٹ میں ہمدرد کراچی اور ہمدرد دہلی کے الگ الگ فائل آ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے ہاں واقعی ریکارڈ بڑے سلیقے سے رکھا جاتا ہے۔

اب ان کا اندازِ گفتگو بدل گیا۔ انھوں نے ہمیں فیکٹری کے اس شعبے سے دکھانا شروع کیا جہاں خام سامان آتا ہے۔ پھر یہ سامان جہاں اسٹور کیا جاتا ہے، پھر جہاں سے دوسرے شعبوں میں تقسیم ہوتا ہے اور تقسیم کا طریقہ سمجھایا۔ خام سامان کی جانچ پڑتال کرنے اور انالٹیکل لیبارٹری میں تجزیہ کرنے کا پورا انتظام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی خراب خام مال آ جائے، جس کا اثر تیار شدہ مال میں نقص پیدا کر دے۔

ان کا اپنا ورک شاپ ہے جہاں یہ مشینیں خود درست کر لیتے ہیں اور بناتے بھی ہیں۔ انھوں نے مقطر کرنے کی چھوٹی اور بڑی مشینیں دکھائیں، جہاں سب چیزوں کے ایسنس تیار ہوتے ہیں۔ خوشبوؤں اور ایسنسوں کو رکھنے کا الگ الگ انتظام ہے۔ ایک حصے میں ایک ہی خوشبو رکھی جاتی ہے۔ پھر یہ خوشبوئیں فضا میں نہیں پھیلتیں۔ گویا ان کو حفاظت سے رکھنے کا معقول اہتمام کیا گیا ہے تاکہ وہ ہوا میں مل کر پھیل نہ سکیں۔ ایسا ہو تو اسے بدنظمی اور پھوہڑپن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ان کا پیکنگ ڈپارٹمنٹ (جہاں خوشبوئیں بھری جاتی ہیں، اور شیشیوں پر لیبل لگتے ہیں) بہت

ہی عمدہ ہے۔ اس کا نقشہ دوسرے صفحے پر اپنی یادداشت کے لیے بنا رہا ہوں۔ ہمیں یہ فیکٹری سرسری طور پر دیکھنے میں بھی ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔

افسوس ہے کہ ان ڈائرکٹر صاحب کا نام یاد نہیں رہا۔ ہم نے ان کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا تھا اور توقع تھی کہ وہ اپنا کارڈ ہمیں دے دیں گے، مگر وہ بھول گئے یا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی مادری زبان فرانسیسی تھی، مگر انگریزی بھی مفہوم ادا کرنے کی حد تک بول لیتے تھے، جو ہمارے لیے کافی تھا۔ ہم بھی کوئی فرسٹ کلاس انگریزی نہیں بولتے، جو دوسروں سے توقع رکھیں۔ آدمی بہت معقول تھے۔ واپسی پر ہمیں خود ہی اپنی موٹر چلا کر چھوڑنے آئے (ہماری ٹیکسی کو انھوں نے پہلے ہی رخصت کر دیا تھا)

اب یہ لوگ اپنے ادارے کو جدید وضع پر لا رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک موڈرن لیباریٹری تیار کی ہے۔ واقعی خوب ہے۔ پیکنگ ہال وغیرہ نئے بنے ہیں، جو ایرکنڈیشنڈ ہیں۔ کارکنوں کے آرام کے لیے بڑا معقول انتظام ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ ہم اسے حاصل کریں۔ لیکن یہ کارکن بھی کیسے ہیں کہ دل وجان سے کام کرتے ہیں۔ ہم ہر شعبے میں بلا اطلاع پہنچے، مگر کوئی کارکن خالی بیٹھا، سگریٹ پیتا یا گپیں لڑاتا نہیں پایا گیا۔ ہر ایک کام میں ہمہ تن مصروف تھا۔ ایسے ہی کارکنوں کو آرام پہنچانے کے لیے دل چاہتا ہے۔

جیوا ڈان کی ابتدائی تاریخ بڑی دل چسپ ہے۔ مسٹر جیوا ڈان نے زیورخ میں شہر کے بیچ میں کسی چھوٹے سے مکان کے اندر یہ کام شروع کیا تھا۔ وہاں پڑوسیوں نے شکایت کی کہ ایسا کام شہر میں نہیں ہونا چاہیے۔ مسٹر جیوا ڈان وہاں سے گویا نکال دیے گئے اور یہ جنیوا آگئے۔ اور یہاں آکر انھوں نے یہ جگہ شہر سے باہر لے لی۔ کام شروع کر دیا اور پوری تن دہی سے رات دن مصروف ہو گئے۔ میں نے تصور کی آنکھ سے ماضی کے دھندلکوں میں دیکھا۔ ہمدرد دواخانے کی ابتدا بھی کچھ اسی انداز میں ہوئی تھی۔ لیکن اس موضوع پر کسی آئندہ فرصت میں لکھنا ہے۔ آج جیوا ڈان کی یہ صورت ہے کہ اس کی پانچ فیکٹریاں ہیں۔ ایک فرانس میں، ایک ریاست ہائے متحدہ میں اور باقی دو ملکوں کے نام یاد نہیں رہے۔ صدر مقام سوئزرلینڈ ہی میں ہے، جہاں سے ہدایات وغیرہ جاری ہوتی رہتی ہیں۔ پانچ فیکٹریوں کے علاوہ مختلف کمپنیوں سے ان کا تعلق ہے، جن کو وہ تھوک مال برائے فروخت تیار کر کے دیتے ہیں۔ خریداروں میں افراد کے علاوہ دوائیں اور اشیائے خوراک تیار کرنے والی کمپنیاں تقریباً ساری دنیا میں ہیں، جن کے پاس ان کا سامان براہِ راست جاتا ہے۔

ٹھیک تین بجے ہم سوتر لیباریٹریز پہنچ گئے۔ یہاں سکریٹری صاحبہ انگریزی بالکل ہی نہیں جانتی تھیں، چنانچہ

ایک اور صاحبہ کو بطورِ خاص بلایا گیا جو اشاروں اور کنایوں سے ہمیں دوسری عمارت میں لے گئیں جو اسی احاطے میں تھی۔ وہاں ہم کو ایک میٹنگ ہال میں بٹھا دیا گیا اور پھر کچھ اشارے کرکے چلی گئیں پانچ منٹ کے بعد ایک صاحب تشریف لائے، جنھوں نے اپنا تعارف تو نہیں کرایا، البتہ ہم نے اندازہ کرلیا کہ یہ ڈائرکٹر یا ادارے کے کوئی اور ذمے دار افسر ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ "خوشخبری" سنائی کہ وہ اپنی فیکٹری نہیں دکھا سکیں گے۔ ہمیں صبح کو مسٹر الیگزنڈر نے احتیاطاً بتایا تھا کہ سوئزرلینڈ کے کارخانے دار اپنی فیکٹری دکھانے میں سخت تامل کرتے ہیں بلکہ رازداری برتتے ہیں۔ اس کا تجربہ یہاں آتے ہی ہوگیا۔ اگر ہم جیوا ڈان کے خریدار نہ ہوتے تو شاید وہ بھی اجتناب کرتے، جیسا کہ انھوں نے ہم سے تحقیق کرلیا تھا کہ ہم کیمسٹ تو نہیں ہیں۔

ان صاحب کو ہم نے فوراً اطمینان دلایا کہ ہم ان کی فیکٹری دیکھنے کے واقعی مشتاق ہیں ہم مطالعی دورے پر سوئزرلینڈ آئے ہیں۔ کئی ملکوں کی سیاحت کر چکے۔ کئی اور ملکوں میں جانا باقی ہے اور چونکہ معالج ہیں، اس لیے متعلقہ چیزوں سے دل چسپی ہے۔ اسی لیے قدوائی صاحب کے ایما پر یہاں آگئے ہیں، مگر وہ صاحب بڑی خوبی سے ٹالتے رہے۔

انھوں نے بتایا کہ وہ بالخصوص کیلسیم کے انجکشن اور مرکبات تیار کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ان کا ایک مرکب کیلسیم اور حیاتین ج اور ب کے ساتھ ہے۔ میں نے سوال کیا کہ اس میں حیاتین د کیوں نہیں ہے۔ کیلسیم کے انجذاب کے لیے حیاتین د ضروری ہے۔ اس کا کوئی جواب انھوں نے نہیں دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ خود ڈاکٹر نہیں ہیں اور اگر ہیں تو زیادہ سمجھ دار نہیں ہیں۔ یا پھر ان کی خاموشی رازداری ہی کی بنا پر ہوگی۔

انھوں نے ہم کو ایک فولڈر دیا اور بتایا کہ یہ وجع المفاصل کی دوا انھوں نے بنائی ہے۔ اسے دیکھ کر میں نے ان سے سوال کیا "کیا وجع المفاصل قابلِ علاج مرض ہے؟ اور آپ کی یہ دوا اس بیماری کو دور کردیتی ہے؟"

اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اس مرض کا علاج تو مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تو ارگا پائیرین قسم کی دوا ہو جو مُسکّن ہے۔ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے ایک سوال بھی کیا کہ کیا ان کی فیکٹری اسرول پر کچھ کام کر رہی ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ اس دوا پر اب تک اور جگہ بہت کچھ کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے علم میں ہے کہ اس دوا میں اب تک کتنے الکلائڈز معلوم ہو چکے ہیں؟ اس کا انھوں نے

نفی میں جواب دیا۔

یہ صاحب اپنی فہرستِ ادویہ لینے گئے۔ میں نے بھائی جان محترم سے اجازت چاہی کہ ان ڈاکٹر صاحب کو چکرا دوں اور تنگ کر دوں یعنی ان سے سوالات کروں جن کا یہ جواب نہ دے سکیں، اور میں جواب بھی دیتا رہوں۔ مگر بھائی جان محترم کی طبیعت میں جو سنجیدگی ہے، اس کی بنا پر انھوں نے منع کر دیا۔

واپس آکر انھوں نے فہرست دکھائی جو جرمن زبان میں ہے۔

میں نے ان کو بتایا کہ ہم پاکستان اور بھارت سے آرہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پاکستان میں "جیکم سن" ان کے ایجنٹ ہیں۔ میں نے آخر میں ان صاحب کو باخبر کیا کہ ہم سیبا کمپنی دیکھنے جا رہے ہیں اور مرک (جرمنی) نے اپنی فیکٹری دکھانے کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ ہم بازل کے راستے ہائڈل برگ ہو کر ڈامسٹاٹ جائیں گے۔ میں نے ان کو دعوت دی کہ جب آپ پاکستان آئیں تو کراچی میں مجھ سے ملیں اور میں آپ کو ہمدرد فیکٹری کی ہر چیز دکھاؤں گا۔ ذرا بخل نہیں کروں گا۔ کوئی "آہنی پردہ" درمیان نہیں ہوگا۔

بین الاقوامی ادارۂ عمال: سوئزر سے ہم بہت جلد فارغ ہو گئے۔ اس لیے ہم نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ ہمیں بین الاقوامی ادارۂ عمال دیکھ لینا چاہیے۔ چنانچہ ٹیکسی لے کر ہم وہاں پہنچ گئے اور اپنا تعارف کرایا۔ جاتے ہی ان کے رجسٹر میں، جو وزیٹروں کے لیے ہے، میں نے اردو میں دستخط کیے اور پتہ بھی اسی رسم الخط میں لکھا۔ شاید ان کے رجسٹر میں یہ پہلا اردو نام اور پتہ درج ہوا ہے۔ کیوں کہ اس موٹے رجسٹر میں لاطینی حروف کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں کوئی نام نظر نہیں آیا۔

یہ ادارہ اقوامِ متحدہ کے مخصوص اداروں میں سے ایک ہے لیکن خود اس کے قائم ہونے سے بہت پہلے وجود میں آیا تھا یعنی ۱۱ر اپریل ۱۹۱۹ء کو جبکہ معاہدۂ وارسا کے تیرھویں حصے کے طور پر اس کا دستور العمل تمام متعلقہ ملکوں نے مان لیا تو وہ دائرۂ وجود میں آگیا اور "مرحوم" مجلسِ اقوام سے وابستہ ہو کر کام کرنے لگا۔ پھر اس مجلس کے ختم ہو جانے کے بعد بھی بحالت "بیوگی" قائم رہا اور جب اقوام متحدہ قائم ہوئی تو اس سے ناتا جوڑ کر گویا "نکاح ثانی" کر لیا۔ خدا اس کا سہاگ برقرار رکھے۔ اس وقت دنیا کے ۸۰ ملک اس کے ممبر ہیں۔ اس کے سالانہ بجٹ کی رقم ۵۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ ہوتی ہے، جو ممبر ملکوں سے لے کر جمع کی جاتی ہے۔ پاکستان بھی اپنی بساط کے مطابق اس میں حصہ لیتا ہے یعنی وہ ۰.۷۲ فی صدی چندہ دیتا ہے۔ یعنی اگر بجٹ کی رقم سو روپے ہو تو پاکستان کو صرف گیارہ آنے دینے پڑیں گے۔ پھر بھی یہ

رقم دو لاکھ ستر ہزار روپے سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس ادارے کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، مزدوروں کی حالت سدھارنا اور معاشرتی انصاف کی اس طرح ترویج کرنا ہے کہ دنیا میں دیرپا امن قائم کرنے میں مدد مل سکے۔ اس مقصد کی تحصیل کے لیے ادارہ حکومتوں، مالکوں اور مزدوروں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مشترک مسائل پر غور کرتے ہیں۔ اس کی مجلسِ انتظامیہ میں حکومتوں کے بیس، مالکوں کے دس اور مزدوروں کے دس نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ یہ مجلس اور اس کے بعد ادارے کی کانفرنس جن موضوعات پر غور کرتی ہے، ان میں مزدوروں کی اجرت، کام کے اوقات، مزدوری شروع کرنے کے لیے کم سے کم عمر کا تعین، مختلف پیشہ وروں کے کام کے حالات، اجرتوں کے علاوہ دوسری قسم کے معاوضے، معاشرتی بیمے، تنخواہ سمیت چھٹیاں، کارخانوں میں حفاظتی سامان، روزگار دلانے والے دفاتر کا قیام، مزدوروں کے لیے تفریحات کا انتظام، ان کا طبی معائنہ اور انجمن بنانے کی آزادی وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ادارہ حکومت کے لیے وقتاً فوقتاً اور سال کے سال رپورٹیں شائع کرتا رہتا ہے تاکہ انھیں معلوم ہو سکے کہ دنیا کے دوسرے حصّوں میں مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کام ہو رہے ہیں۔ مالکوں اور مزدوروں کے مابین کس قسم کے تعلقات قائم ہیں اور جب جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے تو اسے کیوں کر چکایا جاتا ہے۔ اگر کہیں بنیادی اصولوں سے انحراف کیا جا رہا ہے تو اس کا سدباب کس طرح ہو سکتا ہے۔ ادارے کی جنرل کانفرنس سب سے زیادہ اختیارات رکھنے والی جماعت ہے۔ اس کا اجلاس سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ اس میں ہر ملک کے چار نمائندے یعنی دو حکومتوں کے اور ایک ایک مالکوں اور مزدوروں کے شرکت کرتے ہیں۔ کانفرنس میں زیادہ تر قانون، ضابطوں، معاہدوں اور اقرار ناموں کے مسودے مرتب ہوتے اور منظور کیے جاتے ہیں، تاکہ تمام ممبر ملک ان کی توثیق کریں، عمل میں لائیں اور اس طرح ساری دنیا میں محنت و مزدوری کا یکساں معیار قائم کیا جا سکے۔ اس وقت تک سو سے زیادہ ضابطے اور معاہدے منظور ہو چکے ہیں، جن کو عمل میں لانے کے لیے کم و بیش ستر سو توثیق نامے ادارے کے دفتر میں وصول ہو چکے ہیں۔ حقیقتاً یہ ادارہ مزدوروں کی بھلائی کے لیے ایک نعمت ہے۔ یہ اپنی سی کوشش کر لیتا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی حکومت یا کسی ملک میں کارخانوں کے مالک ایمان نگل کر ادارے کے قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر دینا چاہیں تو یہ کیا کر سکتا ہے۔ یہ صرف اخلاقی دباؤ ڈالتا ہے۔ اس کے پاس نہ پولیس فورس ہے اور نہ فوجی طاقت، جس سے کام لے کر کسی کو مجبور کر دے۔

یہ بات اس کے فرائض و اختیارات میں بھی نہیں ہے۔

یہ ادارہ اپنے ماہرین فن مختلف ملکوں میں بھیجتا ہے، تاکہ وہاں کے مزدوروں اور کاریگروں کو کام میں مہارت حاصل کرنے میں مدد دی جاسکے۔ یہ وظیفے دے کر طلبا کو غیر ملکوں میں بھی بھیجتا ہے تاکہ نئے کام نئے انداز میں سیکھے جاسکیں۔ اگر کسی ملک کو اپنے مزدوروں کے لیے کلیں یا دوسرے آلات درکار ہوں تو ان کی فراہمی کا انتظام ادارے کی طرف سے کیا جاسکتا ہے۔

ادارے کے سربراہ یعنی ڈائرکٹر جنرل مسٹر ڈیوڈ اے مورس ہیں جو ان دنوں جنیوا میں نہیں ہیں۔ پاکستان میں اس ادارے کے نمائندے مسٹر ایم اسلم (پاکستانی) ہیں اور آئی ایل او کورسپونڈنٹ کہلاتے ہیں۔ ادارے کے صدر دفتر میں بھی کئی پاکستانی کام کرتے ہیں لیکن ان سے ہماری کوئی واقفیت نہیں ہے۔

ہماری طرح کچھ اور لوگ بھی ادارے کے صدر دفتر میں اس کی سیر کرنے آئے ہوئے تھے۔ چناں چہ دفتر کی طرف سے ایک گائڈ تمام شعبے دکھانے کے لیے مقرر کردیا گیا جو بہت ہی دل چسپ تھا۔ اس کی باتوں اور حرکتوں پر ہر شخص ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتا تھا لیکن وہ ہنسی ہنسی میں سب کچھ سمجھاتا اور سوالوں کا جواب دیتا رہتا تھا۔ اس کی معلومات سطحی نہیں تھیں۔

ہم نے دیکھا کہ اس ادارے کے مختلف کمروں، خصوصاً جلسہ گاہوں کی آرائش و زیبائش میں ادارے کے ممبر ملکوں نے فراخدلی سے حصہ لیا ہے۔ کہیں دروازوں کے پردے ایک ملک کی طرف سے پیش کش کے طور پر وصول ہوئے ہیں تو دروازوں کے شیشے دوسرے ملک نے فراہم کیے ہیں۔ ایک ہال میں ایک ملک کی پینٹنگز آویزاں ہیں تو اس کے برآمدوں میں دوسرے ملک سے آئے ہوئے مجسمے رکھے ہیں۔ قالین کسی کے ہیں تو روشنی کے جھاڑ کسی اور کے۔ ادارے کی بین الاقوامیت کا رنگ ان چیزوں سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔

آخر میں ہمارے گائڈ نے ہم سب کو ایک زینے کی سیڑھیوں پر کھڑا کرکے زور سے کہا کہ آپ سامنے کی تصویر ملاحظہ کریں اور اس کے ساتھ ہی ہم نے "تھینک یو فور دی وِزِٹ" (آپ کی تشریف آوری کا شکریہ) کا جملہ سنا اور دیکھا کہ گائڈ صاحب غائب ہوچکے ہیں۔ چناں چہ ہم نے باہر کا راستہ دیکھا۔ یوں بھی دفاتر کے بند ہونے کا وقت قریب آگیا تھا۔

ہوٹل واپس آکر ہم نے غسل کیا اور آج پھر جھیل کے کنارے ٹہلنے چلے گئے اور وہیں ایک ہوٹل میں کھانا کھایا، جس کا بل ۲۹ فرانک ۷۰ سنٹ کا آیا۔ تقریباً ۳۳ روپے کے اس کھانے کی تفصیل ذرا قابل غور ہے۔ کُل پانچ چیزیں ہمیں نصیب ہوئیں (۱) ٹماٹر کا شوربہ۔ ایک تولے (۲) چاول اُبلے ہوئے

۵ تولے (۳)، مرغ کی دو بوٹیاں (۴)، سلاد کی ایک ننھی سی پلیٹ اور (۵) آئس کریم ایک چھٹانک۔ اللہ تعالیٰ اپنا رحم فرمائے۔ ابھی ہمارے سفر کے پروگرام کا بڑا حصّہ باقی ہے۔ پردیس میں کسی سے رُپے مانگنے نہ پڑ جائیں!

جنیوا میں ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ یہاں لوگ زیادہ محتاط نہیں ہیں اور ان کی طبیعت میں نفاست ذرا کم پائی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ سگریٹ پی کر باقی ٹکڑے سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ پھل کھا کر چھلکے پھینکنے والے بھی نظر آئے۔ جگہ جگہ کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا حالانکہ باقاعدہ دن میں دو بار راستوں کی صفائی ہوتی تھی۔

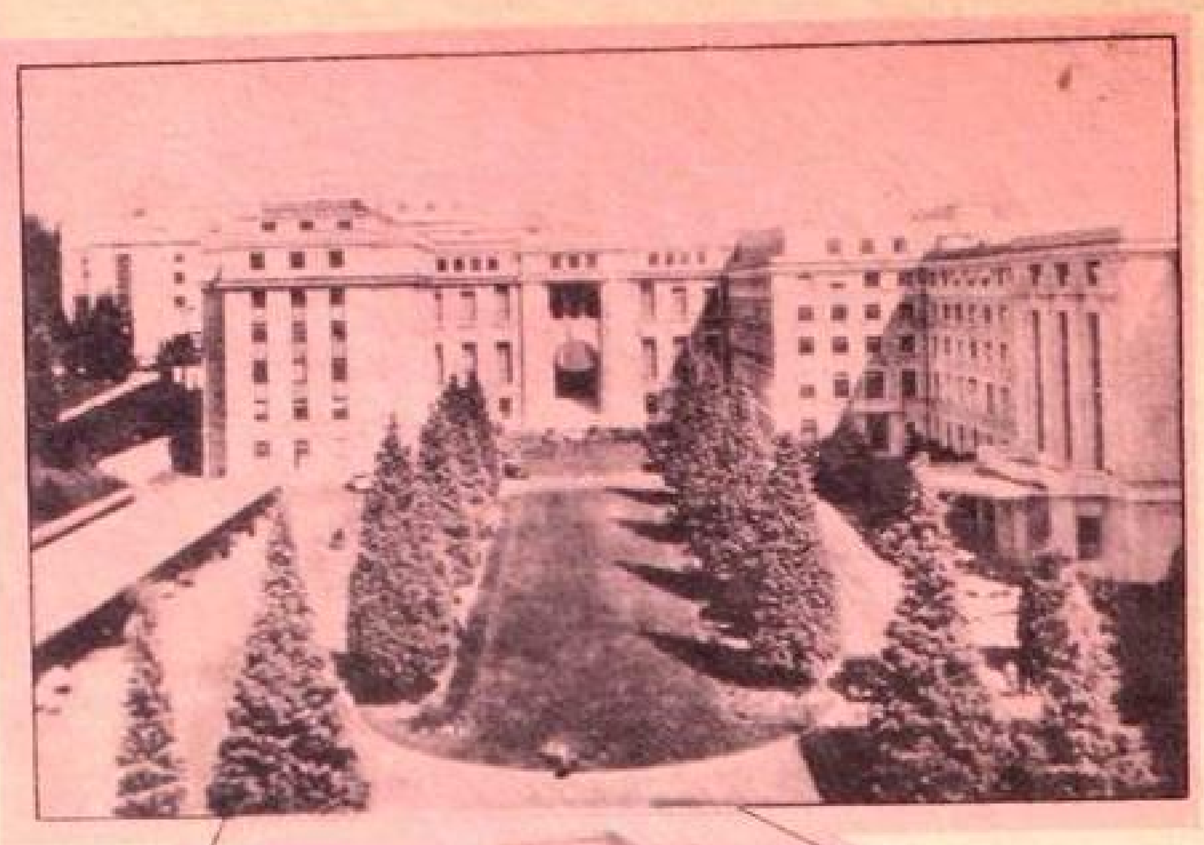
ایک چیز جو ہم سُنا کرتے تھے اور کبھی یقین نہیں کرتے تھے، یہاں آ کر مان لینی پڑی۔ وہ یہ کہ سڑک کے کنارے، روش کے قریب اور دوسرے غیر محفوظ مقامات پر اخبارات کسی چیز سے دبے رکھے ہیں تاکہ ہوا سے اڑ نہ جائیں اور ان کے قریب ہی گلّہ رکھا ہے۔ لوگ اخبار اٹھاتے ہیں، اور گلّے میں پیسے ڈال دیتے ہیں۔ رات کو یا کسی وقت اخبار والا آتا ہے اور باقی اخبارات اور گلّہ لے جاتا ہے۔ اسے کبھی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ ایمان داری قابلِ تعریف ہے۔

جنیوا میں ایک اور دن

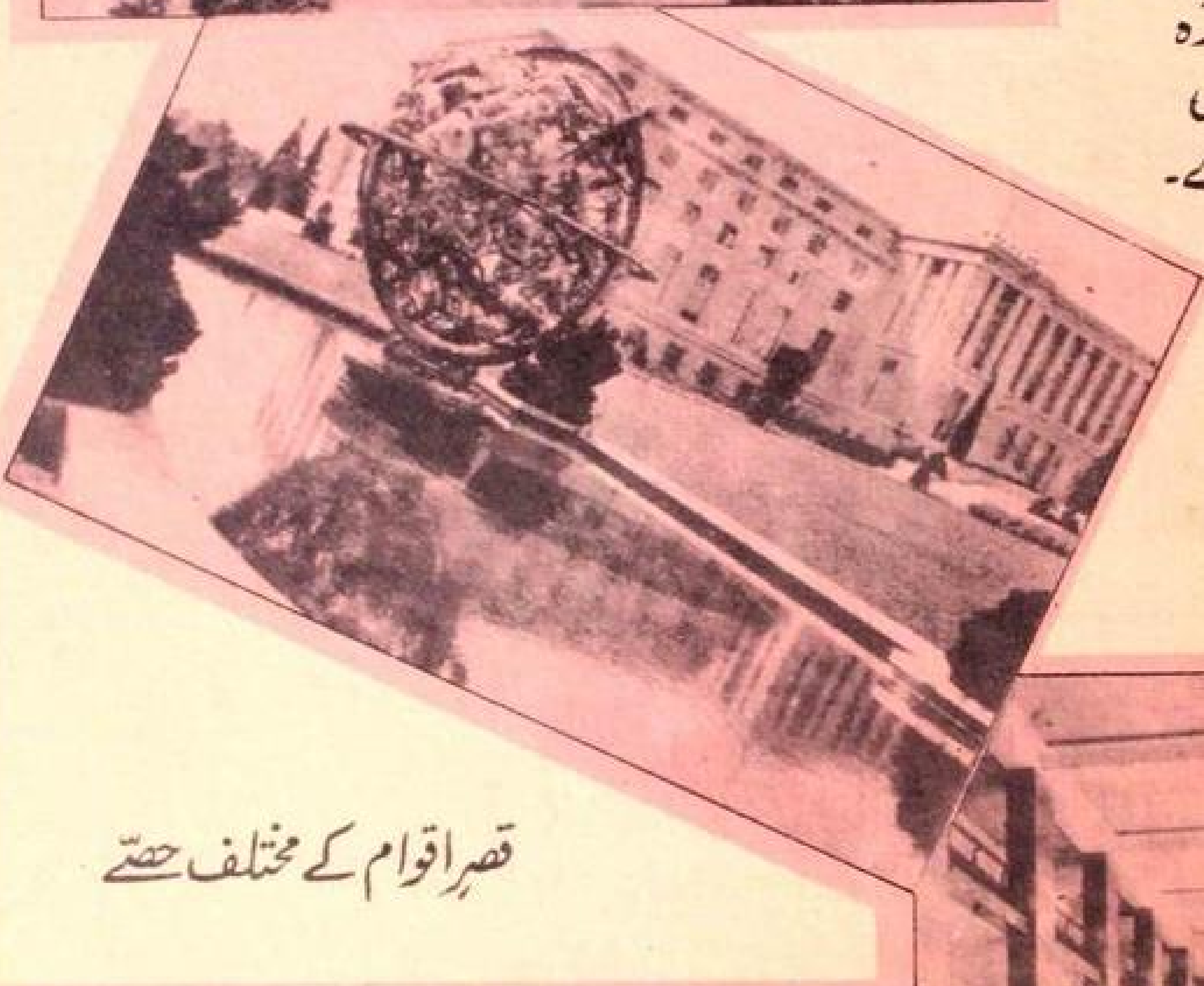
آج چند ضروری خطوط لکھنے کی وجہ سے ہمیں دیر ہوگئی۔ ہم دونوں کو اپنے اپنے مطب، اپنی اپنی فیکٹریاں اور دفاتر یاد آ رہے ہیں۔ اگرچہ یہ یقین ہے کہ سارے کام معیّنہ اصولوں اور قاعدوں کے مطابق ہو رہے ہوں گے کیونکہ ہمارے علاوہ اور ذمے دار لوگ بھی وہاں موجود ہیں، لیکن کبھی کبھی بے اطمینانی سی پیدا ہو جاتی ہے اور میرا جی چاہنے لگتا ہے کہ پھُر سے اُڑ کر وطن پہنچ جاؤں اور جس طرح بعض بادشاہ بھیس بدل کر اپنی رعیت کے حالات کا جائزہ لیتے تھے میں بھی پتہ چلاؤں کہ کس کس کو اپنے فرائض کا احساس ہے اور کون کون لاپروائی برت رہا ہے۔ علاوہ ازیں گھر کے لوگ بھی یاد آتے ہیں، خصوصاً اپنی اکلوتی بچّی سعدیہ جسے میں بہ مشکل اپنے سے جُدا کرتا ہوں، وہ ماں کے بغیر چند دن رہ سکتی ہے لیکن میری جُدائی اسے شاق گزرتی ہے۔

عالمی ادارۂ صحت میں: خط ڈاک کے سپرد کرنے کے بعد ہم ٹھیک ساڑھے دس بجے قصرِ اقوام میں پہنچ گئے۔ اس (PALAIS DES NATIONS) کے نصف حصے میں عالمی ادارۂ صحت کے دفاتر، کانفرنس ہال وغیرہ ہیں اور باقی نصف میں اقوامِ متحدہ کا یورپی دفتر قائم ہے۔ گویا ساری عمارت اقوامِ متحدہ کی تحویل میں ہے۔ اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ باپ کا ترکہ اولاد ہی کو ملتا ہے۔ اقوامِ متحدہ مجلسِ اقوام کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ عمارت پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد جنیوا کے آریانا پارک میں تعمیر کی گئی تاکہ مجلسِ اقوام کے دفاتر اس میں کھولے جا سکیں۔ اس کے احاطے کی لمبائی سوا میل کے قریب ہے اور جس حصے پر عمارت بنی ہوئی ہے، اس کا رقبہ اٹھارہ ہزار مربع میٹر ہے۔ اس پر ایک کروڑ ڈالر لاگت آئی تھی جبکہ آج کل کے مقابلے میں وہ سستے دن تھے۔ اسی کے ایک حصے میں امریکہ کے مشہور ارب پتی راک فیلر کے دیے ہوئے بیس لاکھ ڈالر سے ایک لائبریری قائم ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کے دفتر میں پہنچتے ہی ڈاکٹر کول سے ملاقات ہوئی جو ہندستانی نژاد ہیں اور تقریباً چار سال سے یہاں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے مختصراً ادارے کے بارے میں بتایا کہ یہ کیا کرتا ہے اور کس طرح خدمات انجام دیتا ہے۔ اس کی مالی حالت کیا ہے اور اس کے علاقائی دفاتر کہاں کہاں قائم ہیں۔

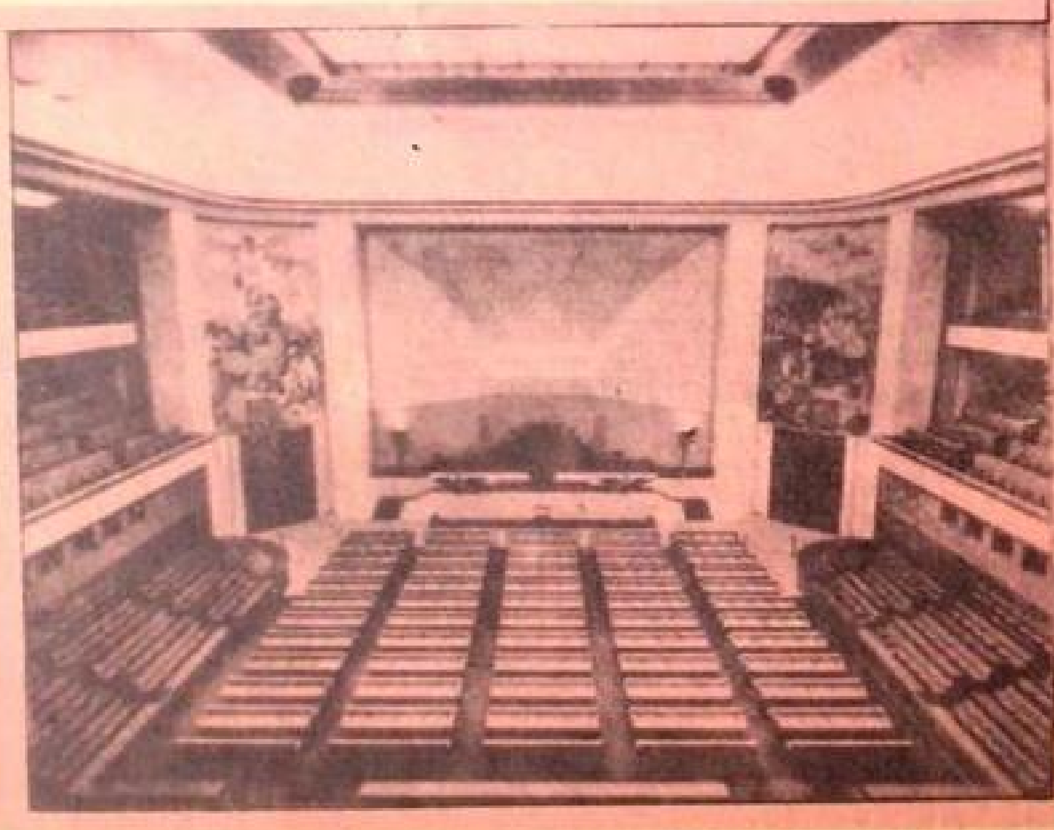


جنیوا میں
قصرِ اقوام
جس کا بڑا
حصہ اب
اقوامِ متحدہ
کی تحویل
میں ہے۔



قصرِ اقوام کے مختلف حصے





انھوں نے ہنس کر کہا کہ آپ لوگ تو حکیم ہیں اور دیسی دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں ایلوپیتھی کو آپ کس طرح سمجھ سکیں گے۔ ان کا منشا یہ تھا کہ ہم یہ ادارے دیکھ کر کیا کریں گے، جن کے طریقِ کار میں صرف ایلوپیتھی کو دخل حاصل ہو۔ جہاں تک ان کے سوال کا تعلق تھا ہم نے کہا کہ ترقی کے لیے ہر میدان وسیع ہو۔ ہمارے ملک میں واقعی اتنی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں کہ اگر ان پر پوری طرح ریسرچ ہو جائے تو قیامِ صحت اور بیماریوں کے استیصال کے لیے نئے راستے کھل سکتے ہیں۔

بھائی جان محترم نے جب راؤلفیا سرپنٹینا (دوا ءالشفا بوٹی) کے بارے میں بتایا کہ کس طرح سب سے پہلے جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ نے ۱۹۲۰ء میں مریضوں پر آزمایا اور اسے مفید پایا تھا۔ پھر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے مزید تحقیقات کیں اور اب ساری دنیا میں اس کا چرچا ہو اور اس پر کام ہو رہا ہے، تو ڈاکٹر کول ہمارے سفر کا مقصد سمجھ گئے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم دیسی ادویہ پر تحقیق کا ایک پروگرام سامنے رکھتے ہیں اور دیسی مرکبات کو معیاری بنانا چاہتے ہیں۔

میں نے بر سبیلِ تذکرہ ایک اعتراض بھی کر دیا۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب! یہ تو بتلایئے کہ اقوامِ متحدہ نے جب اپنے چارٹر میں یہ لکھا ہو کہ قوموں کے مابین نسلی، قومی، مذہبی، لسانی، علمی، فنی، ثقافتی اور اقتصادی اعتبار سے کوئی فرق و امتیاز نہیں برتا جائے گا اور جب اس کے مخصوص ادارے ہر ملک کے جغرافیائی، تاریخی اور موسمیاتی حالات کو مدِنظر رکھ کر وہاں وہی کام کرتے ہیں جو اس علاقے کے لوگ چاہتے ہیں، تو پھر علاج معالجے کے معاملے میں ان کا گلا کیوں گھونٹا جاتا ہے؟ اقوامِ متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے عرب ممالک میں ماہرین بھیج کر فروغِ تعلیم کی کوشش کی تو ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ عربی زبان اور عربی رسم الخط کو چھوڑ کر لاطینی حروف اختیار کرو، اور انگریزی یا فرانسیسی بولنے لگو۔ اس کے ادارۂ خوراک و زراعت نے بنگال اور برما وغیرہ کے قدرتی وسائل کو دیکھ کر وہاں کے لوگوں سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم چاول اور مچھلی کے بجائے بھٹے کھاؤ تو پھر آپ کا یہ عالمی ادارۂ صحت کیا حق رکھتا ہو کہ مشرقی دنیا میں مشرقی طب کو نظر انداز کر کے صرف ایلوپیتھک طریقِ علاج کو فروغ دے؟ تپِ دق کے خلاف مہم چلانے کے لیے صرف بی سی جی کے ٹیکوں ہی کو مقبول بنانے کی کوشش کیوں کی جائے؟ کیا ملیریا سے بچنے کا صرف یہی ایک طریقہ رہ گیا ہو کہ ڈی ڈی ٹی نام کا سفوف چھڑک کر ان مچھروں کو مارنے کی ناکام کوشش کی جائے، جن میں خود ادارے کے ماہرین کی رپورٹ کے بموجب اس سفوف کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو، اور وہ مرنے کے بجائے زیادہ سرگرمیِ عمل کے ساتھ اپنے ہتھیار استعمال کرتے ہیں؟ ہم لوگ ایلوپیتھی

کے خلاف ہرگز نہیں ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ مریض کے مزاج، اس کے ماحول، آب وہوا اور اس کی اقتصادی اور معاشرتی حالت کو کیوں نظر انداز کیا جائے؟

ڈاکٹر کول کچھ اس انداز سے مسکرائے جیسے وہ بھی ان دلائل کو دل سے مانتے تو ضرور ہیں مگر حالات کی رَو کے سامنے مجبور ہیں۔

میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا کہ یہ باتیں یونہی زبان پر آگئیں، ورنہ اس وقت ہمارا مقصد تو آپ کا ادارہ دیکھنا ہے۔ چلیے، آپ کی مصروفیات پر اس سے زیادہ ٹیکس نہیں لگنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے خود ہی ازراہِ کرم ہمیں اپنے ساتھ لے جاکر ادارے کے مختلف شعبے دکھائے۔ دراصل ہمیں اس ادارے کی تنظیم کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کرنا تھا، کیوں کہ یہ سب باتیں تو کتابوں میں موجود ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ اس عمارت، دفتروں اور جلسہ گاہوں وغیرہ کو اچھی طرح دیکھ لیں۔ اس پس منظر کے ساتھ کتابوں کے مطالعے میں یقیناً دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اگر کوئی یہاں آکر کام کرنا چاہے اور لائبریری سے استفادہ کرنا چاہے تو اس کے لیے آسانیاں بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔

۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر کول صاحب نے ہمیں دروازے پر لاکر چھوڑ دیا۔ ہم نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے خود یہ زحمت اس لیے گوارا فرمائی تھی کہ ہم بھی برصغیر پاک وہند کے باشندے ہیں۔ پھر قدوائی صاحب کی فرمائش کا اثر تھا اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر حفیظی صاحب جن کا درحقیقت یہ کام تھا، اس روز رخصت پر تھے۔ وہ دفتر میں موجود نہیں تھے۔

عالمی ادارۂ صحت کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے۔ اس کے قیام کا مقصد دنیا بھر کے انسانوں کے لیے صحت کا بلند ترین معیار حاصل کرنا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں وہ دو قسم کی خدمات انجام دیتا ہے ——— معاشرتی اور فنی ——— اول الذکر کے ضمن میں وہ ممبر ملکوں کے واقف کار لوگوں کو مزید تربیت دیتا ہے کہ ملیریا، تپ دق، خارش، جنسی امراض، گھونگے سے پیدا ہونے والی بیماریوں، تراخوما، جذام، طاعون، ہیضے اور چیچک سے کیونکر بچایا جائے۔ زچہ وبچہ کی دیکھ بھال کس طرح ہو، تاکہ وہ زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکیں۔ معیاری غذائیں بہم پہنچانے کے لیے کیا صورتیں اختیار کی جائیں اور ماحول کی صفائی کا کیونکر خیال رکھا جائے تاکہ صحتِ عامہ برقرار رہے اور بیماری قریب نہ آنے پائے۔

جہاں تک اس کے وسائل کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے خاطر خواہ نہ سہی، بڑی حد تک





جنیوا کے قصر اقوام میں
اسمبلی ہال



کامیابی ہو رہی ہے۔

فنی اعتبار سے یہ ادارہ امراض کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے، ان کی اطلاعات دوسروں تک پہنچاتا ہے، طفیلی کیڑوں اور زہریلے مادوں سے جو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، ان کے بارے میں تحقیقات کے منصوبے بناتا اور عمل میں لانے کے لیے تعاون کرتا ہے۔ اس ضمن میں بہت سی کتابیں اور مفید رسالے بھی شائع کرتا رہتا ہے۔ اس نے ایک مخزن الادویہ بھی مرتب کر کے یقیناً مفید کام انجام دیا ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں ان دیسی ادویہ کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے جو دنیا کے دو تہائی باشندوں میں رائج ہیں اور مقامی حیثیت کے اعتبار سے زیادہ مقبول ہیں اور بلاشبہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مخزن الادویہ ادھوری ہے۔

شروع میں اس ادارے کی تشکیل ہنگامی صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے عمل میں آئی تھی لیکن جب اس کی خدمات کو مفید سمجھا گیا تو فیصلہ ہوا کہ اسے مستقل بنیادوں پر قائم کر دیا جائے۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے ایما پر طلب کی ہوئی بین الاقوامی صحت کانفرنس میں ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو اس کا دستور العمل منظور ہو گیا اور جب قاعدے کے مطابق ۲۶ ملکوں نے اس دستور کی توثیق کر دی تو ۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو یہ ادارہ وجود میں آ گیا۔ چنانچہ اسی اعتبار سے ہر سال ۷ اپریل کو عالمی یومِ صحت منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر بھی صرف ایلوپیتھک طریقۂ علاج کی سرپرستی ہوتی ہے۔

اس کی جنرل کانفرنس کے اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جنیوا ہی میں منعقد ہوں بلکہ ہر اجلاس کسی ممبر ملک میں طلب کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اس کے مستقل اراکین کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے اور تین ایسوسی ایٹ ممبر ہیں۔ اس کا سالانہ بجٹ ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں سے پاکستان ۷۷ ہزار ڈالر کے قریب ادا کرتا ہے۔

کام میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے ادارے نے اپنے چھے علاقائی دفاتر قائم کر رکھے ہیں تاکہ جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے خدمات انجام دی جا سکیں۔ ان ہی میں سے ایک مشرقی بحیرۂ روم کا علاقہ کہلاتا ہے، جس میں پاکستان بھی شامل ہے۔ اس کا صدر دفتر اسکندریہ میں ہے۔ بھارت جنوب مشرقی ایشیا کے علاقائی دفتر میں شامل ہے۔ ڈاکٹر ایم جی کنڈاؤ ادارے کے ڈائرکٹر جنرل ہیں جو برازیل کے باشندے ہیں۔ ڈاکٹر ایم پی کول صاحب مشاورتی خدمات کے محکمے کے انچارج ہیں اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر کہلاتے ہیں۔

یہ ادارہ مختلف ملکوں میں خدمات انجام دیتا ہے۔ ان کی تفصیل آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ اقوام متحدہ کا بچوں کا فنڈ جسے عرف عام میں یُونی سیف کہا جاتا ہے، اس کے کاموں میں ہر لحاظ سے تعاون کرتا ہے، بلکہ مالی اعتبار سے بڑی امداد دیتا ہے۔

ادارے کے دفتر سے باہر نکلتے وقت میں نے ایک خاص کام یہ کیا کہ قریب کی ایک دکان سے جو وزیٹرز کے لیے مختلف قسم کی مصنوعات اور دل چسپی کی چیزیں فروخت کرنے کے لیے ہے، ادارے کی عمارت کا ایک خاکہ جو پوسٹ کارڈ کی صورت میں تھا، خرید لیا اور وہیں کھڑے کھڑے خیریت کے چند الفاظ لکھ کر وہ کارڈ فضل حق قریشی کے نام مرکز اطلاعات اقوام متحدہ کراچی کے پتے پر روانہ کر دیا جہاں وہ افسر اطلاعات کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ یہ تخصیص اس لیے کی کہ عالمی ادارۂ صحت اقوام متحدہ کے مخصوص اداروں میں سے ایک ہے۔ آغا محمد اشرف صاحب اسی مرکز اطلاعات میں ڈائرکٹر تھے لیکن تبدیل ہو کر نیویارک جا چکے ہیں، ورنہ ایک کارڈ ان کے نام بھی بھیجتا اور نیویارک میں ان کا پورا پتہ معلوم نہیں تھا۔

انجمن صلیب احمر کے صدر دفتر میں: ساڑھے گیارہ بجے ٹھیک ہم بین الاقوامی صلیب احمر کے دفتر پہنچ گئے، جو قصر اقوام کے سامنے ہی واقع ہے۔ اس کی عمارت پر انجمن کا بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر بیکٹٹ صاحب سے ملاقات طے ہو گئی تھی مگر وہ کسی کانفرنس سے فارغ نہیں ہو سکے تھے، لہٰذا انھوں نے اپنے نائب کو ہمارے پاس بھیجا۔ ان کو ہم نے اپنا منشا سمجھایا۔ اتنے میں ایک معمر خاتون ہم میں شریک ہو گئیں اور ہم کافی دیر تک اسپتالوں اور فنی اداروں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہ خاتون انجمن کے ہر موضوع پر اچھی طرح حاوی ہیں اور معلوماتی سوال کا تسلی بخش جواب دے سکتی ہیں۔ خود بڑے دورے کر چکی ہیں اور امریکی اسپتالوں سے بہت متاثر ہیں۔

چونکہ انجمن صلیب احمر کی ابتدا سوئزرلینڈ سے ہوئی ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ اس ملک میں اس کا انتظام سب سے اعلیٰ ہے۔ انجمن کے صدر دفتر سے ملحق اسپتال اور تربیتی مرکز بھی ہیں۔ اسپتال میں یوں تو ہر قسم کے مریضوں کو رکھنے کا انتظام ہے لیکن اتفاقیہ حادثات کا شکار ہونے والوں پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اسی لیے ایسے آلات اور سامان کا معقول انتظام ہے جو ایمرجنسی کیسز میں زیادہ ضروری ہوتے ہیں، چنانچہ بلڈ پلازما کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ تربیت کے ضمن میں نرسوں کی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ غیر ملکوں کی عورتیں بھی یہاں



سوئِستان کی انجمن
صلیب احمر کی بلڈ
ٹرانسفیوژن لیباریٹری
میں پلازما تیار کرنے کے
شعبے



انجمن صلیب احمر کے زیر اہتمام نرسنگ کی تربیت

اگر کام سیکھتی ہیں اور یہاں کی تربیت یافتہ نرسیں عموماً دنیا کے ہر حصے میں مل سکتی ہیں۔ ابتدائی طبی امداد کے ڈھنگ سکھانے کے علاوہ یہ جذبہ ان میں پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ خلوصِ نیت کے ساتھ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنائیں۔ نرسنگ ایک اچھا پیشہ ضرور ہے لیکن اگر اسے صرف روزگار ہی سمجھا جائے تو صحیح خدمت انجام نہیں دی جا سکتی۔ دوا کی تاثیر کو جب تک تیماردار کے دل کی حرکت کے ساتھ سمویا نہ جائے، مفید نتائج مشکل سے برآمد ہوتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کی مجلسِ صلیبِ احمر نے ایک یہ بڑا کام بھی اپنے ذمے لے رکھا ہے کہ وہ نادار بچوں کے لیے عمدہ قسم کے آرام دہ بستر فراہم کرتی ہے۔ تقریباً ایک سو بستر ہر مہینے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ یہاں کے ماہرین کی رائے ہے کہ اگر محنت و مشقت کا پورا دن گزارنے کے بعد پُرسکون نیند میسر آجائے تو حصولِ صحت کے لیے وہ ایک بڑی نعمت ہے اور بچوں کے لیے اس نعمت کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔ بستروں کے علاوہ بچوں کے لیے لباس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔

۲۰-۲۵ منٹ کی گفتگو کے بعد نائب صاحب ہم سے الگ ہو گئے اور وہ خاتون ہر چیز باقاعدگی کے ساتھ دکھانے لگیں۔ ایک خاص الماری میں اُن پانچ اشخاص کی تصاویر بڑے سلیقے سے لگی ہوئی تھیں جنھوں نے اس کام کی ابتدا کی تھی۔ اسی خانے میں وہ ابتدائی ضابطہ بھی محفوظ ہے جو انجمن کا منشور سمجھا جاتا ہے۔ اسی الماری میں بڑے احترام کے ساتھ قرآن مجید کا ایک مطلّا قلمی نسخہ بھی ہے جو ۱۰۰۰ء کا ہے۔ ان خاتون نے بتایا کہ چونکہ ریڈ کراس کے بنیادی اصول قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں، اس لیے اس کو وہاں رکھا گیا ہے اور اس سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ بات مجھے پہلی بار معلوم ہوئی اور میں اس سے بہت ہی متاثر ہوا۔ افسوس ہے کہ خود مسلمان اس کتابِ مقدس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھاتے اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہیں اور دوسرے لوگ اس کی قدر کر رہے ہیں۔ ان خاتون نے ہمیں کانفرنس کے کمرے بھی دکھائے اور آخر میں ریکارڈ روم دکھایا جہاں انڈکس سسٹم پر کارڈ اور ریکارڈ محفوظ کیا جاتا ہے۔

انھوں نے چلتے وقت ہمیں ریڈ کراس کے بارے میں ایک پمفلٹ بھی دیا جو مختصر لیکن معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلا کہ بیماروں، زخمیوں اور لڑائی کے دوران میں قیدیوں کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے ایک انجمن قائم کرنے کا بنیادی خیال اس وقت پیدا ہوا کہ جب ۱۸۶۲ء میں ہنری دونانت نے ایک کتابچہ لکھ کر جنیوا میں شائع کیا جس کا نام "سووینر دا سولفرینو" تھا۔ جنگِ اطالیہ کے دوران میں قتل و غارت گری کے جو ہولناک مناظر دونانت نے دیکھے تھے، اُن کو

دل ہلا دینے والے انداز میں کتابچے کے اندر درج کیا گیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ طبی امداد نہ مل سکنے کے باعث زخمیوں کو میدانِ جنگ ہی میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا تھا کیونکہ لڑائی کی افراتفری میں جب تن درست لوگوں کی پروا کسی کو نہیں ہوتی تو زخمیوں اور بیماروں کا خیال کون رکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ زندگی کا انسانیت سوز پہلو ہے جس کو دونانت نے خوب ملامت کی۔ انھوں نے ایسے موقعوں پر ہمدردانہ خدمات انجام دینے کے لیے انجمن کی تشکیل کا تصور پہلی بار پیش کیا اور امید ظاہر کی کہ دنیا بھر کی جنگجو قومیں بھی ایک ایسے بین الاقوامی مقدس ضابطے کی توثیق کے لیے آمادہ ہو جائیں گی جس کی رُو سے بیماروں، زخمیوں اور قیدیوں کے دکھ درد میں بلا امتیازِ رنگ و نسل و مذہب صرف انسانیت کے نام پر شریک ہوا جا سکے۔ ان کی صدائے احتجاج بے نیلِ مرام نہ رہی۔ اس خیال کی حمایت میں فوراً جلسے شروع ہوئے اور انجمن کی تشکیل کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر ہو گیا جس میں ہنری دونانت کے علاوہ سوئس فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ڈوفو، گستاف موئنیر، ڈاکٹر لوئی آپیا اور ڈاکٹر تھیوڈور مونوئر شامل ہوئے۔ یہی پانچ اس تحریک کے ابتدائی رکن سمجھے جاتے ہیں۔ انجمن کے ساتھ ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اس کمیشن کی سرکردگی میں ایک بہت بڑا اجتماع ۲۶ تا ۲۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء جنیوا میں منعقد ہوا، جس میں حکومتوں کے ۳۶ ماہرین نے شرکت کی اور صلیبِ احمر کے بنیادی اصول طے کر لیے گئے۔ پھر کوشش ہوئی کہ اس ضابطے کی روشنی میں انجمن کی شاخیں دنیا بھر میں قائم ہو جائیں، اور حکومتیں اس کی بین الاقوامی قانونی حیثیت کو تسلیم کر لیں کیونکہ اس کے بغیر اصل مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر ۸ اگست ۱۸۶۴ء کو سفارتی سطح پر ایک اور کانفرنس جنیوا میں ہوئی اور جنیوا کنونشن کے نام سے اس انجمن کا منشور ۲۶ حکومتوں نے تسلیم کر لیا جس میں کچھ ترمیمیں بعد میں ہوتی رہی ہیں اور مسودہ ۶ جولائی ۱۹۰۶ء کو مکمل ہو گیا جس میں پھر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس وقت دنیا کا شاید ہی کوئی ملک یا علاقہ ایسا ہو جہاں اس انجمن کی شاخیں کام نہ کر رہی ہوں۔ اگر کسی جگہ ان کا مرکز نہیں ہے، تو کسی دوسرے مرکز کے رضاکاروں کو وہاں پہنچنے میں تامل نہیں ہوتا۔

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو اس انجمن کے تقریباً دو ہزار رضاکاروں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر بے لوث خدمات شروع کر دیں۔ اگر دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کسی ملک کی طرف سے ضابطے کی خلاف ورزی ہوئی تو اس پر سخت احتجاج کیا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ متعلقہ

ملکوں نے اپنی غلطی یا بھول چوک کی معافی مانگی اور آئندہ احتیاط برتنے کے وعدے کیے۔ لڑائی کے بعد اس کا دائرۂ عمل زیادہ وسیع ہو گیا۔ اراکین کی تعداد بڑھ گئی اور زیادہ جوش عمل کے ساتھ خدمات انجام دی جانے لگیں۔ لڑائی میں زخمی یا قید ہونے والوں کے خطوط کا تبادلہ بھی اس انجمن نے اپنے ذمے لے لیا، کیونکہ اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔

اس ادارے کی شاخیں بعض اسلامی ملکوں میں "انجمن ہلالِ احمر" کے نام سے کام کر رہی ہیں، لیکن ان کا بنیادی مقصد، اصول اور طریقۂ کار یکساں ہے۔ ایران کی انجمن "سازمانِ سرخ شیر و خورشید" کہلاتی ہے۔ نام کچھ بھی ہو، مطلب کارِ خیر سے ہے تاکہ تڑپتی ہوئی انسانیت کو سکون میسر آ سکے۔

لڑائی کے علاوہ اگر کوئی اور بلائے ناگہانی یا قہرِ آسمانی نازل ہو تب بھی ان انجمنوں کے رضاکار دستِ تعاون بڑھاتے ہیں اور امن و عافیت کے دنوں میں بھی طبی خدمات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

آج ہمارے سنجیدہ کام سارے ختم ہو گئے، اس لیے سوچا کہ لاؤ لگے ہاتھوں پرانے جنیوا کی ایک جھلک بھی دیکھ لیں۔ چنانچہ ہوٹل سے اترے اور اس خیال سے کہ شاید راستے میں کسی دکان سے گھڑی وغیرہ کی خریداری ممکن ہو جائے، ہوٹل ہی سے امریکن ایکسپریس کا چک بھنا لینا چاہیے، میں نے ۲۰ پونڈ کا چک ہوٹل کے منیجر کو دیا۔ اس نے ۲۳۲ سوئس فرانک میرے حوالے کیے، حالانکہ زیورخ میں ہوٹل سیوائے میں ۲۴۰ فرانک ۵۰ سنٹ ملے تھے اور یہ حساب درست تھا۔ میں نے اعتراض کیا، مگر اس نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سوئز کنال کی وجہ سے نرخ میں فرق آ گیا ہے۔ میں نے ۲۳۲ فرانک لے لیے اور اس سے رسید مانگی۔ اس نے رسید نہیں دی۔ مجھے شبہ ہو گیا کہ یہ شخص ۲۰ پونڈ پر ۸½ فرانک کم دینا چاہتا ہے جو نو روپے نو آنے کے ہوئے۔ میں فوراً امریکن ایکسپریس کے دفتر گیا اور وہاں ۱۰ پونڈ کا چک بھنایا۔ انھوں نے زرِ مبادلہ کی مقررہ شرح کے مطابق رقم ادا کی اور باقاعدہ رسید نمبر ۵۱۳۹۶۶ کاٹ دی۔ میں ہوٹل واپس آیا اور خزانچی کو رسید دکھا کر اس سے پوچھا کہ امریکن ایکسپریس پر نہر سویز کا اثر کیوں نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، مگر بے غیرت ذرا شرمندہ نہ ہوا۔ میرا چک واپس کر دیا اور میں نے فرانک لوٹا دیے۔ یہ چک بھی میں نے امریکن ایکسپریس میں جا کر بھنایا۔ انھوں نے وہی ۲۴۰ فرانک ۵۰ سنٹ دیے۔

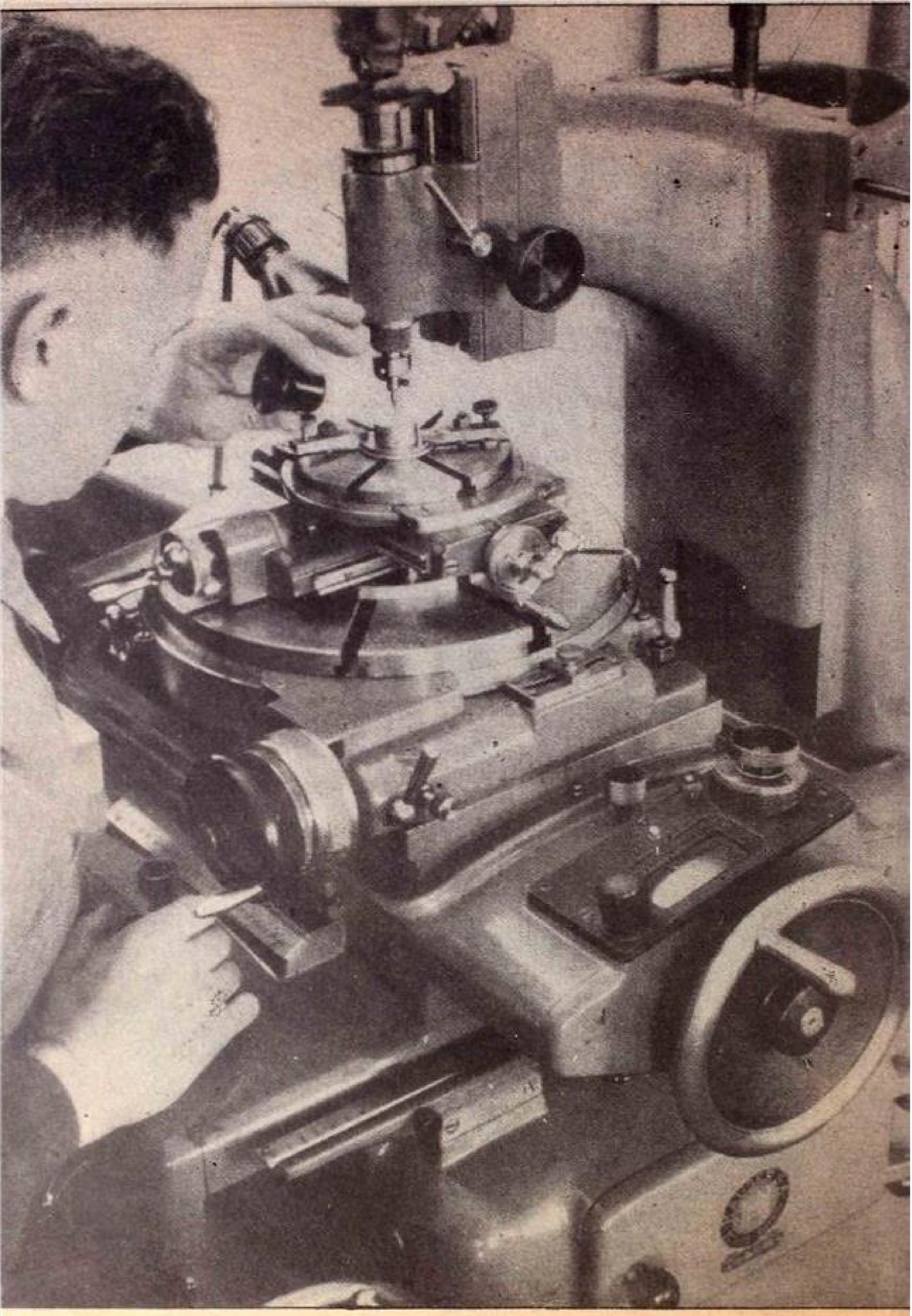
اب تحقیق ہو گیا کہ یہ ہوٹل امریکنوں کا ہے یا اس کے نظم و نسق میں ان کا ہاتھ ہے۔ یہاں بھی وہی

لوٹ کھسوٹ تھی جس کا مظاہرہ ہم استنبول کے ہلٹن ہوٹل میں دیکھ آئے تھے۔ استنبول ہلٹن میں نرخ زیادہ ہیں لیکن وہاں بھی اس قسم کی ڈاکہ زنی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ہر آدمی مہذب اور شائستہ ہے۔ یہاں ہر آدمی بدتمیز اور ناہنجار ہے۔ مجھے اس ہوٹل سے سخت نفرت ہو گئی۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ اب روانگی کے وقت تک وہاں کھانا بھی نہیں کھائیں گے۔

گھڑیوں کی خریداری: بازار میں ایک بڑی سی دکان نظر آئی جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں گھنٹے گھڑیاں، ٹائم پیس، اصطرلات وغیرہ سلیقے سے رکھے تھے۔ بہت سے گھنٹے کام بھی کر رہے تھے۔ دکان پر بہت سے گاہک تھے لیکن ہمارے داخل ہوتے ہی ایک سیلز مین ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم نے بتایا کہ ہم گھڑی چاہتے ہیں جو سوغات کے طور پر دی جا سکے۔ خوشنما ہو، لیکن مضبوط اور دیر تک کام دینے والی ہو۔ اور دام بھی زیادہ نہ ہوں۔ آخری جملہ اس لیے کہہ دیا کہ وہ ہم کو سیاح سمجھ کر ہوٹل والوں کی طرح اسامی نہ بنانے لگے۔ بہت سے نمونے دیکھنے کے بعد ہم نے میاں عبدالمعید کے لیے ایک ٹیبل واچ اور بی فریدہ کے لیے ایک لوکٹ واچ خریدی۔ ان کو پسند آ جائے تو ہمارے حسنِ انتخاب کی داد مل جائے۔ ان دونوں کی قیمت ۸۸ فرانک تھی۔ بہت سے گھنٹے دلچسپ کھلونوں کی طرح تھے۔ ہر ساعت کے بعد ان میں باجا بجتا ہے، پریاں رقص کرتی نظر آتی ہیں، مرغ اذان دیتا ہے، کتا بھونکتا ہے، ہرن کلیلیں بھرتے ہیں، آبشار گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کچھ گھنٹے ایسے بھی تھے کہ جن میں تاریخیں نظر آنے کے علاوہ، جو بہت عام ہیں، سورج کا طلوع و غروب، درجۂ حرارت اور کئی قسم کے نظامِ اوقات نظر آتے ہیں۔ ان کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ ہم نے بنانے والوں کی صرف تعریف کی، جس پر دکان کے کارکن بہت خوش ہوئے اور ہمارے قصیدے کے معاوضے میں اپنی گھڑیوں کی مکمل فہرست حوالے کر دی کہ اگر ضرورت ہو تو ہم پاکستان سے فرمائش بھیج دیں۔

گھڑی سازی: سوئزرلینڈ میں گھڑی سازی کی ابتدا اگرچہ سولھویں صدی میں ہو گئی تھی لیکن دوسری صنعتوں کے مقابلے میں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ اس زمانے میں اس چیز کی مانگ زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت اور کافی بعد کے زمانے تک اس ملک میں پارچہ بافی کی صنعت عروج پر رہی۔ اس میں سوتی اور ریشمی قسم کے کپڑے شامل ہیں۔ چنانچہ جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے تک نے وہاں کے پارچہ جات کی تعریف کی ہے۔

تاہم جوں جوں زمانہ گزرتا رہا اور انسان میں وقت کی قدر و قیمت کا احساس بڑھتا گیا، گھڑیوں کی صنعت نے اپنے لیے ایک مقام پیدا کر لیا۔ یہاں کے صنعت کاروں نے گھڑی کے پرزے



سوئزرلینڈ کے ایک بہت بڑے کارخانے میں گھڑیاں تیار کرنے سے پہلے ہر پُرزے کی
الگ الگ جانچ پڑتال کی جاتی ہے

بنانے میں وہ مہارت پیدا کی کہ بلا مبالغہ اس وقت دنیا کا کوئی ملک سوئزرلینڈ کا مقابلہ اس لحاظ سے نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ برطانیہ، کنیڈا اور امریکا وغیرہ جیسے صنعتی ملک بھی بازی جیتنے سے قاصر ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ موخر الذکر ملکوں میں اور بھی بہت سی صنعتیں ایسی ہیں، جو مزدور اور کاریگر طبقے کو اپنے اندر جذب کر لینے کے لیے کافی ہیں، البتہ اس کی فوقیت کا ایک سبب نفسیاتی بھی ہے۔ سوئزرلینڈ کے لوگ اپنی صنعتوں کو فروغ دیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے، کیونکہ زرعی پیداوار کی بے پناہ کمی کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کثیر مقدار میں مصنوعات برآمد کی جائیں۔ جو ملک اشیائے خوراک کے بڑے حصے کو درآمد کرنے کے لیے مجبور ہو، وہ صنعت و حرفت میں ترقی نہ کرے تو گذارا کیوں کر ممکن ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ گھڑی سازی کی صنعت ہی نے اس ملک میں زیادہ فروغ کیوں پایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اس صنعت کی ابتدا گھریلو صنعتوں کی صورت میں ہوئی تھی اور اب بھی اگرچہ ملک بھر میں چار سو سے زیادہ ایسے کارخانے قائم ہیں جہاں بیشتر کام مشینوں کے ذریعے ہوتا ہے، لاتعداد گھروں میں فالتو وقت کا مشغلہ گھڑیوں کے پرزے بنانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرزے بنانے والے چار سو بڑے کارخانوں کے مقابلے میں ایک سو سے زیادہ کارخانے صرف اس کام کے لیے ہیں کہ پرزوں کو جوڑ کر گھڑیاں بناتے رہیں۔

سوئستانی گھڑیوں کی خوبی کا راز یہ ہے کہ اکثر گھرانے، ایک سائز کی، ایک قسم کی گھڑی کے ایک ہی پرزے پر ساری توجہ صرف کرتے ہیں اور اس کی ساخت میں خصوصی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک خاص سائز کی زنانہ گھڑی میں لگانے کے لیے کمانی ایک گھرانے کی میراث ہو گئی ہے تو اس کا کوئی فرد، کوئی دوسرا پرزہ نہیں بنائے گا اور جو سوئیاں بنا رہا ہے، سوئیاں ہی بناتا رہے گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ایک ہی چیز کو برابر بناتے رہنے سے قدرتی طور پر مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس وقت سوئزرلینڈ میں جتنی گھڑیاں اور گھنٹے وغیرہ تیار ہوتے ہیں، ان کا ۹۵ فی صد حصہ برآمد کر دیا جاتا ہے اور صرف ۵ فی صد ملک کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کی کل برآمدی تجارت میں گھڑیوں کی تجارت کا ۲۰ فی صدی حصہ ہے۔ ملک کے تقریباً ساٹھ ہزار انسان گھڑی سازی کے بڑے کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور گھریلو دستکاری کے طور پر جتنے افراد اس میں مصروف ہیں، ان کا شمار آسان نہیں ہے۔ شروع میں نوشیتل نامی ضلع اس صنعت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اہمیت اب بھی اسے حاصل ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی کئی صوبے جن میں جنیوا، شاف ہوسن، سولوتھرن،

بیل اور گرانچز شامل ہیں، قابلِ ذکر ہو گئے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کے لوگ ہر معاملے میں فراخدل اور انسان دوست ہیں لیکن گھڑی سازی کے ضمن میں ان کو ایک لحاظ سے "بخیل" کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی صنعت کا راز نہ تو کسی کو بتاتے ہیں اور نہ کسی کے سامنے اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مبادا کوئی ان کی تکنیک لے اُڑے۔ لہٰذا اگر ان کے کارخانے دیکھنے کے لیے باہر کا کوئی آدمی آ جائے تو وہ پتے کی چیز بتاتے اور نہ دکھاتے ہیں۔ اگر لالچ دے کر کوئی غیر ملکی حقیقتِ حال سے واقف ہونا چاہے تو اسے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بھوکا مرتا انسان بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ہر شخص میں یہ احساس بدرجۂ اتم موجود ہے کہ اگر ہماری یہ صنعت ہمارے خاص انداز میں دوسروں نے سیکھ لی تو ہمارا قومی افتخار ختم ہو جائے گا۔ ماہرین کے تبادلے کے تحت اس ملک کے بہت سے کاریگر اور فنکار دوسرے ملکوں میں کام سکھانے کے لیے چلے جاتے ہیں لیکن آج تک کسی گھڑی ساز نے اس منزل میں اپنا قدم ملک سے باہر نہیں نکالا ہے۔

گھڑیوں کے ضمن میں اس ملک کی ایک وادی خصوصیت کے ساتھ بہت مشہور ہے۔ اس کو عام طور پر "گھڑی سازوں کا سائبیریا" کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں اس قدر سردی ہوتی ہے کہ ملک کا کوئی حصہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاید اتنی سردی صرف سائبیریا ہی میں ہوتی ہوگی۔ حالانکہ اس علاقے میں برف شاذونادر ہی گرتی ہے لیکن اس کے چاروں طرف کوہ ایلپس کی بلند چوٹیاں ہیں جو ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ انھی برف پوش پہاڑوں کی خنکی اس علاقے کو "یخ داں" بنائے رکھتی ہے۔ وہاں کے ایک سب سے بڑے بوڑھے گھڑی ساز نے جو ایک سو سال سے زیادہ عمر پا کر فوت ہوا، ایک بار اپنے بیان میں کہا تھا، "میں اس وادی میں تین بار حرارت پیما کے پارے کو شدید سردی کے باعث جمتے ہوئے دیکھ چکا ہوں"۔ اس بوڑھے کا نام لوئی علی رچرڈ تھا۔ آخر وقت تک اس کی نگاہ اتنی اچھی رہی کہ خوردبین کی مدد کے بغیر وہ گھڑی کے چھوٹے سے چھوٹے پرزے کو صحیح جگہ پر کس دیتا تھا۔

یہ علاقہ فرانس کی سرحد کے قریب جورا پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے اور تین چھوٹی چھوٹی بستیوں پر مشتمل ہے جو لابریوائن، لے پونٹس ماٹرل اور لاسیگنے کہلاتی ہیں۔ ان کی آبادی علی الترتیب ایک ہزار، پندرہ سو اور گیارہ سو ہے۔ یہاں کے رہنے والے شاذونادر ہی ملک کے کسی اور حصے میں سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں اور اگر کوئی چلا جائے اور وہاں جا کر کہے کہ میں اس وادی کا رہنے والا ہوں تو لوگ گہری نظر سے اسے دیکھتے ہیں کہ اسے ہمارے علاقے میں پسینہ تو نہیں آ رہا ہے۔ محض تجارتی تعلقات کی بنا پر یہاں کے لوگوں کو وادی کے باہر والوں سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ ضروریات

زندگی کی ہر چیز ان کو وہیں میسر آجاتی ہے۔ وہاں کے ہر شخص کا معیارِ زندگی بہت بلند ہے۔ آرائش کی ہر چیز گھر میں موجود ملتی ہے، سوائے ریفریجریٹر کے، جس کی ضرورت قدرتی طور پر وہاں محسوس نہیں ہوتی!

گھڑی سازی میں اعلیٰ مہارت کے علاوہ یہاں کے لوگ خصوصاً عورتیں کھانا پکانے میں بڑا کمال اور انفرادیت رکھتی ہیں۔ بلکہ اکثر جوان عورتوں کو شادی کے لیے اچھا رشتہ اسی وقت ملتا ہے جب کھانا پکانے کے اعتبار سے ان کی شہرت ہوجاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے بعض گھرانے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ لڑکی کے جوان ہوتے ہی کوئی ریستوراں عارضی طور پر کرائے پر لے لیتے ہیں اور خود کام شروع کردیتے ہیں۔ جب لوگ سنتے اور دیکھتے ہیں کہ یہ عمدہ کھانے کس باکمال لڑکی نے تیار کیے ہیں تو شادی کے پیغامات آنے شروع ہوجاتے ہیں اور پھر لڑکی کے ماں باپ کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ ان رشتوں میں سے بہترین منتخب کریں۔ لڑکی کی شادی ہوجانے کے بعد یہ گھرانا وہ ریستوراں کسی اور ایسے گھرانے کے سپرد کردیتا ہے، جس کی لڑکی جوان ہو اور رشتے کی تلاش ہو۔

ان تینوں بستیوں کے باشندے ایک دوسرے کے بہت قریب ہونے کے باوجود آپس میں کچھ رقابت رکھتے ہیں اور اس رقابت کے جذبے میں بعض دفعہ مضحکہ خیز حرکتیں بھی کر بیٹھتے ہیں مثلاً ایک بار ان میں سے ایک بستی میں آگ لگ گئی۔ ہمدردی کے طور پر دوسری بستی کے کچھ لوگ آگ بجھانے کے لیے آگئے تو پہلی بستی والوں نے ان کو یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ جاؤ یہ ہماری آگ ہے، ہم خود اسے بجھائیں گے۔ تم کیوں خدائی فوجدار بن کر آئے ہو۔ ان کی اس ازلی رقابت کی ایک وجہ بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمیشہ حرکت میں رہنے والی تقویمی گھڑی جس میں مہینوں کی تاریخوں کے علاوہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے مدارج بھی واضح طور پر نظر آتے ہیں، اسی علاقے کے رہنے والے ایک شخص امیلی ہوگونن نے ایجاد کی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد سے آج تک ہر بستی کے لوگ مدعی ہیں کہ وہ ہمارا آدمی تھا اور اس کے کمالات پر ہمیں فخر حاصل ہے۔ درحقیقت اس شخص کا مکان ایسی جگہ واقع تھا جہاں تینوں بستیوں کے کنارے ایک دوسرے سے ملتے کہے جاسکتے ہیں۔

چند سال کی بات ہے کہ پونٹس دا مارٹل کے ایک گھڑی ساز نے دعویٰ کیا کہ اس نے ایسی گھڑی ایجاد کی ہے جس میں چابی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ پاگلوں کی طرح خوشی کے نعرے لگاتا گلیوں میں بھاگتا پھرا اور جب لوگ اسے پکڑ کر اس کے کارخانے میں لائے تاکہ وہ اپنے زمانے کی سب سے حیرت انگیز ایجاد دکھائے تو گھڑی بند پڑی تھی اور کوشش کے باوجود دوبارہ نہ چل سکی۔ لوگوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ تاہم وہ مایوس نہیں ہوا، چنانچہ بغیر چابی کی گھڑی بنانے کا سہرا اسی کے سر رہا۔

ان گھڑی سازوں کی ایک اور خوبی بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ یہاں کے لوگوں کو عموماً زبان دانی میں بڑا کمال حاصل ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ملیں گے کہ جو ملک کی چاروں زبانیں بے تکان بولتے ہیں اور ان میں لکھ پڑھ بھی سکتے ہیں اور اس کے باوجود ان کے اصل مشاغل مختلف النوع ہیں۔ مثلاً ایک گھڑی ساز صاحب چھ زبانیں جاننے کے علاوہ عمدہ موسیقار اور ماہر نباتات بھی ہیں اور اکثر ان موضوعات پر اظہارِ خیالات کرتے رہتے ہیں۔ ایک گڈریے صاحب بھیڑیں چرانے کے علاوہ پانچ زبانوں میں غیر ملکوں سے تجارتی خط و کتابت کرتے ہیں اور اس طرح بھی انھیں کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔

چند سال ہوئے، شہنشاہِ حبشہ ہیل سلاسی نے اپنی کابینہ کے جملہ اراکین کے لیے ہیرے اور زمرد جڑی ہوئی نہایت خوبصورت گھڑیاں تیار کرائیں تو فرمائش لے پونٹس مارٹل ہی کے ایک گھڑی ساز کو بھیجی گئی۔

ہوٹل واپس آنے کے بعد ڈاک دیکھی تو دہلی کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا ۲ ستمبر کو انتقال ہو گیا ہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ آج جو لندن ٹائمز ملا، اس میں پاکستان سے متعلق کوئی چیز درج نہیں تھی۔ یہ ۷ ستمبر کا اخبار تھا۔

ہمیں معلوم ہوا تھا کہ جنیوا میں جھیل کے اُس پار ایک ریستوراں ہے جہاں سبزیاں ہی ملتی ہیں سوچا کہ آج رات کا کھانا وہاں جا کر کھایا جائے۔ لہٰذا تیار ہو کر چل پڑے۔ یہ ریستوراں بمشکل ملا اور پھر بھی بند تھا۔ اس کا نام ویگو تھا۔ یہ پلیس دو مولارد کے قریب ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنا بڑا اور مشہور ریستوراں بند کیوں ہے۔ مجھے گمان ہوا کہ شاید تمام پکانے والوں کو ان دنوں سیٹھ برلا نے اپنے ہاں مصروف کر لیا ہے۔ وہ آج کل بغرضِ آرام جنیوا آئے ہوئے ہیں چونکہ سبزی خور ہیں، اس لیے یہ خیال آیا۔

ہمارے ٹیکسی والے نے بڑے چکر دے کر اور گھما کر ہمیں ایک اور ریستوراں کے سامنے جا کھڑا کیا۔ یہاں باہر بورڈ لگا ہوا تھا کہ "انڈین ڈشز" تیار رہتی ہیں۔ ہم ویسے ہی آج کل "بیضہ و ماہی" کھاتے کھاتے تنگ آ گئے تھے اور گوشت کھانے میں ہچکچاہٹ تھی کہ نہ جانے جانور کو کیوں کر ذبح کرتے ہوں گے۔ گو ہماری رائے میں مرغ جائز ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ اذان دیتا ہے اور ذبح ہونے سے قبل خود اللہ اکبر کہہ دیتا ہے۔ کبھی کبھی سہواً یا اضطراری حالت میں ہم گوشت پر بھی ہاتھ صاف کر چکے ہیں، لیکن بہت کم۔ اللہ اس اعتبار سے شاید ہمیں معاف کر دے گا کہ جانور کو کاٹنے والے کم از کم اہلِ کتاب ضرور ہیں!

خیر تو اس ریستوراں میں ہم گھس گئے۔ "مینو" دیکھا۔ کئی قسم کے کھانے تھے۔ دال چاول، بھاجی، چپاتی، اچور، پاپڑ۔ دوسرا "مینو" تھا، چکن کری، چاول، بھاجی، پاپڑ۔ ایک مینو تھا، شامی کباب، چاول، دال، سبزی، اچار، میٹھی چٹنی۔ بہت دنوں بعد ایسی لذیذ اور اپنی طرف کی چیزوں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ یہ تو نہیں بتاؤں گا کہ میں نے کن کن لذائذ پر ہاتھ صاف کیا، تاہم کھایا خوب بقول شخصے ہفتے سے ہفتے تک کا کھا لیا۔ کھانا اچھا تھا۔ ہمیں خیال ہوا کہ اپنے ملک کا کوئی باورچی ان لوگوں نے "امپورٹ" کر لیا۔ یا یہاں کا کوئی آدمی کھانا سیکھ کر واپس آگیا ہو۔ ہم نے تحقیق کرنی چاہی، مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ سب لوگ فرانسیسی زبان بولتے تھے۔ ہم جیسے سیاح اشاروں میں باتیں کر رہے تھے اب کوئی بتائے کہ ایسی حالت میں ہم اپنا عندیہ کن اشاروں میں ان کو سمجھائیں اور وہ جو اشارے کریں، ان کو ہم کس طرح سمجھیں اور پھر بھی صورت اگر یہ ہو کہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" تو بتائیے کس کا سر پھوڑیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہم ان کو اتنا بھی نہیں سمجھا سکے کہ ہم کوئی میٹھی چیز کھانی چاہتے تھے۔

آج کل نیند بڑی "نفیس قسم" کی آ رہی ہے۔ بلکہ "گھوڑے بیچ" قسم کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کراچی میں جو بے قاعدگی اور بے چینی اور چار، ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ نہ سونے کی عادت ڈال لی تھی، اس کی کمی یہاں پوری ہو رہی ہے۔ تمام دن کی تھکن کے بعد دس بجے جو لیٹتا ہوں تو صبح چھ بجے تک شاید کروٹ بھی نہیں لیتا۔ میں سوچتا ہوں کہ کام کے ساتھ لگے ہاتھوں آرام بھی خوب کر لوں۔ پھر دو سال کے لیے تازہ دم ہو جاؤں گا اور زیادہ تن دہی سے کام کروں گا۔ لہٰذا غذا اور نیند کے معاملے میں "فضول خرچی" سے کام لے رہا ہوں۔

جنیوا سے برن روانگی

یہاں کی ریلوں میں اتنی بار سفر کرنے کے بعد آج پہلا موقع ہے کہ ٹرین لیٹ ہے اور ہنوز پلیٹ فارم پر بھی نہیں آئی ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم سگنل ہوا اور گاڑی دندناتی ہوئی آگئی۔ روانگی کا وقت ۱۱ بجے، مگر ٹرین ۱۱ بج کر ۶ منٹ پر روانہ ہوئی۔ اب ہم سوئزرلینڈ کا دہلی اور لکھنؤ دیکھ کر سوئزرلینڈ کا شہر کراچی دیکھنے جا رہے ہیں!

زیورخ میں جرمن زبان کا اثر ہے اور جنیوا میں فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے۔ ان دونوں شہروں کے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں وہی سوچتے ہیں، جو دہلی اور لکھنؤ والے آپس میں ایک دوسرے کی بابت خیال کرتے ہیں۔ سلاست اور فصاحت کے میدان میں ایک دوسرے پر خود کو فوقیت دینی چاہتا ہے۔ کچھ بھی ہو، واقعہ یہ ہے کہ زیورخ کے لوگ بہرحال اچھے ہیں اور یقیناً اچھے ہیں۔ جنیوا کے لوگ زیادہ تر اینگلو انڈین قسم کے ہو چکے ہیں۔ وہ سوئس ہیں نہ فرانسیسی۔ ہنس کی چال چلتے ہیں اور اکثر اپنا بھرم کھو بیٹھتے ہیں۔

برن ملک کا صدر مقام ہے۔ ہم ٹھیک ایک بج کر ۱۳ منٹ پر وہاں پہنچے۔ گاڑی وقت سے ذرا پہلے پہنچ گئی تھی۔ اس لیے پلیٹ فارم سے ذرا دور اسے روک دیا گیا اور پلیٹ فارم پر اسے وقتِ مقررہ پر لگایا گیا۔ اسٹیشن زیادہ شاندار نہیں ہے۔

امریکن ایکسپریس کا آدمی ہمیں یہاں بھی ملا۔ سامان اتروا کر روانہ ہوئے تھے کہ جناب قدوائی صاحب ملے۔ ہم نے ان کو تقریباً ۱½ بجے کا وقت لکھ بھیجا تھا، مگر وہ جانتے تھے اور وقت دریافت کر لیا تھا، اسی لیے وقت پر آگئے۔ ورنہ دقت ہوتی۔ ان سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی۔

خاصا لمبا قد ہے۔ سینہ کشادہ، بھرا ہوا جسم، صحت بھی ماشاءاللہ اچھی ہے۔ سر کے بال کھچڑی ہو چلے ہیں۔ عمر زیادہ نہیں، ۴۰ سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ بھارت کے سفارت خانے کی موٹر ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ ہمارا سامان اس میں رکھوا دیا گیا اور ہم ہوٹل روانہ ہو گئے۔ امریکن ایکسپریس کے آدمی کو وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ قدوائی صاحب نے ہوٹل میں ہمارا سامان رکھوایا اور پھر ہمیں اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ ان کا شدید اصرار تھا کہ ہم ان کے مکان پر ٹھیریں مگر ہم ہوٹل میں کمرہ

بک کرا چکے تھے اور یہ ایک مہینے پہلے کی بات تھی، اسے منسوخ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔

قدوائی صاحب کے ہاں پہنچے۔ نمبر ۷، امورش ٹراشے میں چوتھی منزل پر ان کی رہائش تھی۔ لفٹ لگا ہوا تھا۔ بیگم قدوائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہماری منتظر ہی تھیں اور کھانا بھی گویا تیار تھا۔ بھائی جان محترم کے بارے میں وہ جانتی تھیں کہ دہی ان کی مرغوب چیز ہے۔ دہی کو تمام یورپ میں تلفظ یا ساخت کے ذرا سے فرق کے ساتھ یوگھرٹ کہا جاتا ہے اور اسی نام سے خرید و فروخت ہوتی ہے۔ میرے لیے اگرچہ دودھ کا بھرا ہوا جگ موجود تھا، مگر میں نے سب کے ساتھ کھانا ہی کھایا۔

کھانے کے بعد کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور ۳ بجے ہم ان کی موٹر میں شہر دیکھنے روانہ ہوئے۔ ڈرائیور ہمارا گائڈ بنا اور اس نے پارلیمان کی عمارت دور سے دکھائی۔ پھر ایک جگہ لے گیا، جہاں بہت سے مرد، عورتیں اور بچے ایک گھیرے میں کھڑے تھے۔ قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ایک نشیبی حصے میں ریچھ پالے ہوئے ہیں اور لوگ انھیں گاجریں اور بسکٹ کھلا رہے ہیں۔ میدان کے چار حصے تھے۔ دو حصوں میں دو دو ریچھ تھے اور باقی دو میں تماش بین کھڑے انھیں دیکھ رہے تھے۔

یہ ریچھ گاجروں کے بڑے شوقین تھے۔ بچے گاجروں کے ٹکڑے پھینکتے تو یہ منھ میں لپک لیتے اور زمین پر نہ گرنے دیتے۔ ایک ریچھ ہاتھ جوڑ جوڑ کر سلام کرتا رہا۔ دوسرا سر پر ہاتھ رکھ کر نئی وضع کا سلام کر رہا تھا۔ ایک ناچ رہا تھا۔ یہ لوگوں کے اشارے بھی خوب سمجھتے تھے۔

ڈرائیور ایک گھنٹہ گھر پر لے گیا جو بہت بڑا تھا۔ چار بجنے والے تھے۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگ جمع تھے۔ چار بجے تو اس طرح کہ پہلے ایک ہاتھی ایک خانے سے نکلا اور سونڈ ہلاتا چلا گیا۔ پھر ریچھ ایک گولائی میں چکر کاٹنے لگے اور اس کے بعد ایک فولادی انسان لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگانے لگا۔ اس نے وقت کے مطابق چار ہتھوڑے مارے۔ یہ آواز اتنی تیز تھی کہ دور دور تک سنائی دی ہوگی۔

سارا شہر آج ہفتہ منا رہا ہے۔ دکانیں بند ہیں اور یوں بھی کوئی نیا شہر دیکھنا ہو تو موٹر میں سوار رہ کر مقصد کس طرح پورا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہم نے ہوٹل آکر موٹر کو واپس کر دیا اور ساڑھے چار بجے تیار ہو کر دوبارہ باہر نکل گئے۔

سب سے پہلے ہم پاکستان کے سفیر جناب ڈاکٹر اے ایم مالک کے مکان پر گئے، جو نمبر ۴۳ پر تلے سٹراسے پر واقع ہے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ ۷ ستمبر کو ویانا گئے ہیں۔ ان سے ملاقات نہ ہونے کا بڑا افسوس ہوا۔ ان سے ملے ہوئے دو ڈھائی سال ہو چکے تھے۔ یہ پہلے ہمارے ملک میں وزیر صحت و محنت رہ چکے تھے اور ناظم الدین حکومت کی تبدیلی پر انھوں نے خود دوسری وزارت میں جانا گوارا

نہیں کیا تھا۔ لہٰذا سوئزرلینڈ میں انھوں نے سفیر بننا گوارا کر لیا تھا۔ اب گویا عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر بڑی حد تک گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ آسٹریا میں بھی پاکستان کے سفیر تھے۔ اسی لیے دیانا گئے تھے۔ ان کی بیگم آسٹریا کی ہیں۔ ہم نے ان کی بیگم کو کراچی کی ان پارٹیوں میں کبھی نہیں دیکھا جہاں عورتیں عموماً کھل کھیلتی نظر آتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ شادی کے بعد سے وہ نماز وغیرہ کی بھی خوب پابند ہو گئی ہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کو اسلام کا درس دیا کرتی ہیں۔

ہم نے بازار میں آ کر پیدل گھومنا شروع کر دیا۔ یہاں بھی دکانوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ ان کے شوکیسوں میں خوب روشنی ہوتی رہتی ہے اور صرف ضروری چیزیں پیسے ڈالنے کے بعد حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ چھٹی کے روز عام خریداری نہیں ہوتی۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ کوئی میلہ دیکھنے کی خاطر نکلے ہیں۔ بازاروں میں خوب چہل پہل تھی کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا ہم نے گھنٹہ بھر میں کافی سیر کر لی، لیکن بالکل خاموشی کے ساتھ۔ کبھی کبھی آپس میں مختصراً تبادلِ خیالات ہو جاتا تھا۔ بات چیت میں شریک ہونے والا اور کون تھا!

ہمیں رات کا کھانا بھی قدوائی صاحب کے ساتھ کھانا تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ آج کا کھانا وہ خود تیار کریں گی کیونکہ گھر کی باورچن، جو ایک ولائتی عورت تھی، دیسی کھانے تیار کرنے نہیں جانتی تھی اور بیگم صاحبہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہم کو مغربی انداز کے کھانے کھلائیں۔ یہ دعوت اس لحاظ سے بہت ہی "جاذبِ ذہن" تھی۔ ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بہت دن کے بعد ہم یورپ میں رہتے ہوئے کراچی اور دہلی تھوڑی دیر کے لیے پہنچ جائیں گے۔ یعنی یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ ہم اپنے ہی وطن میں ہیں۔ اس لیے تکلفاً بھی اس دعوت سے انکار نہیں ہو سکا، تاہم یہ احساس ضرور تھا کہ وہ ہماری خاطر یہ زحمت گوارا کریں گی۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے ان کے ہاں پہنچ گئے اور ساڑھے دس بجے تک ان کے ہاں رہے۔ بہت دن بعد چپاتی نظر آئی اور سرخ مرچ کے وہ سالن جو یورپ بھر میں نایاب کہے جا سکتے ہیں، اگر کسی ریستوراں میں ان کا اہتمام بھی ہو تو مالوی مدن کی سی بات پیدا نہیں ہوتی۔ بعض لوگ باورچیوں کے پکائے ہوئے کھانے کو اچھا سمجھتے ہیں لیکن اپنی رائے یہ ہے کہ عورت جب مسالہ گھی، پیاز کے ساتھ بھونتی ہے یا بعض سالنوں کو آخر میں بگھارتی ہے تو ذائقے میں اس کی نسائیت کا پرتو بھی شامل ہو جاتا ہے، بلکہ اصل بگھار اس سے ملتا ہے۔ اسی لیے میرے نزدیک عورت کے تیار کیے ہوئے کھانوں میں زیادہ لذت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات ہر عورت پر صادق نہیں آ سکتی۔ اس میں سلیقہ اور کام کرنے

کا خلوص ضرور ہو، ورنہ گھر کی عورت بھی بھٹیارن بن کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ بیگم قدوائی کے تیار کیے ہوئے کھانوں میں جو لذت تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے مسالوں کے ساتھ اپنا یہ احساس بھی سمو دیا تھا کہ یہ دونوں مہمان مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور اس پر جان دینے والے ہیں۔ کوئی سقم رہ گیا تو یہ اعتراض کر بیٹھیں گے۔ میں یہ تو نہیں بتاؤں گا کہ انھوں نے کیا کیا نعمتیں تیار کیں۔ مجھے ڈر ہے کہ صرف سننے سے کسی کی نظر نہ لگ جائے اور اگرچہ وہ کھانے ہضم ہوتے بھی عرصہ گزر چکا ہے لیکن نفسیاتی اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ نظر اپنا کام کرے اور مجھے بدہضمی ہو جائے، اور یوں بھی کیا ضروری ہے کہ میں اس لذت میں کسی اور کو شریک کروں۔

بیگم قدوائی کئی زبانیں جان گئی ہیں۔ انگریزی بھی خوب بولتی ہیں۔ اس چیز کا لطف کھانے کی میز پر آتا رہا۔ بہت سے لطیفے سنے اور سنائے گئے۔ ایک مزے دار بات یہ ہے کہ وہ ایک سالن میں نمک ڈالنا بھول گئیں۔ اسی سے ثابت ہو سکتا تھا کہ انھیں خود یہ اہتمام بہت عرصے بعد کرنا پڑا تھا۔

کھانا شروع کرنے سے قبل ہم نے بلا تکلف کہہ دیا کہ ہم ہوٹلوں اور ریستورانوں میں چھری کانٹے سے کھاتے کھاتے تنگ آگئے ہیں۔ ہم ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ چناں چہ سب نے ہاتھ سے کھانا کھایا۔ ہاتھ سے کھانے میں جو لطف آتا ہے، چھری کانٹے سے کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں کہ انگلیوں کے لمس کی جو کہربائی قوت کھانے کے ساتھ مل جاتی ہے، وہ حیاتین آتا ئی کا کام دیتی ہے۔ یورپ و امریکا کے لوگ جو انگلیوں سے نہیں کھاتے، اسی لیے دواؤں کی شیشیوں میں وٹامن تلاش کرتے ہیں اور چوں کہ انگلیاں گوشت اور ہڈیوں سے بنی ہوتی ہیں، اس لیے کھانے میں قدرتی طور پر انگلیوں کے لمس سے گوشت کو فربہ اور ہڈیوں کو مضبوط کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ باتیں کچھ اس طرح جا کر کہیں کہ بیگم قدوائی کو یقین آگیا اور اگر عین وقت پر بھائی جان محترم میری طرف دیکھ کر مسکرا نہ پڑتے تو یہ باتیں ان کے دل میں بیٹھ جاتیں۔

برن کے لوگ اپنے آپ کو "خالص سوئس" سمجھتے ہیں اور جنیوا یا زیورخ کے لوگوں کو "خالص" نہیں گردانتے۔ یہ وہی بات ہے جس طرح ہمارے ہاں دیہات کے لوگ اپنے آپ کو اصلی سمجھتے ہیں اور شہر والوں کو نقلی اور نقّال کہتے ہیں۔ ویسے عموماً، مگر برن کے لوگ خصوصاً بہت "ریزرو" رہتے ہیں اور غیر ملکیوں سے تو خاص طور پر بے تعلق رہنا چاہتے ہیں۔ دعوت پر کسی غیر ملکی کو شاذ و نادر ہی مدعو کرتے ہیں۔

ہم نے قدوائی صاحب کی بچی کے لیے کچھ مٹھائی اور ٹافی وغیرہ خرید لی تھی لیکن اسے ٹیکسی ہی میں بھول گئے تھے۔ رات کو ہوٹل آئے تو یہ سامان جوں کا توں ہوٹل کے استقبالیہ میں رکھا ملا۔ ٹیکسی ڈرائیور ہوٹل میں واپس کر گیا تھا۔ یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور تک کا معیارِ اخلاق یہ ہے اور ہمارے ملک میں لوگ قرض لے کر بھی مکر جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس چیز کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہاں کے لوگ بعض برائیوں کے باوجود ایمان دار ضرور ہیں۔ ایک آدھ شخص بُرا ہو تو اس سے ساری قوم پر حرف نہیں آتا۔

رات کو ۱۱ بجے ہوٹل واپس آنے پر یہ بھی معلوم ہوا کہ بون (جرمنی) سے برادر عزیز میاں محبوب الٰہی کا ٹیلی فون آیا تھا اور انھوں نے دوبارہ فون کرنے کو کہا تھا۔ ہم نے انتظار کیا مگر صدائے برنخاست انھیں موقع نہیں ملا۔ برادرِ عزیز ۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ء کو فارمیسی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی سے بون روانہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ان کو دیکھنے کے لیے طبیعت بے قرار تھی۔ ٹیلی فون سے آس پیدا ہوئی کہ چلو بجلی کی لہروں کے وسیلے ہی سے ان کی آواز تو سن لی جائے گی، مگر مایوس ہو جانا پڑا۔ ہم نے ان کو لکھا تھا کہ وہ ۸ ستمبر کو ہائیڈل برگ (جرمنی) پہنچ جائیں اور جرمنی میں ہمارے پندرہ روزہ قیام میں بالکل ہمارے ساتھ رہیں۔ نہ معلوم وہ ٹیلی فون پر کیا کہنا چاہتے تھے۔ تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں وہ یہ اطلاع تو نہیں دینا چاہتے تھے کہ امتحان ہو رہے ہیں اور اس لیے ہائیڈل برگ نہ پہنچ سکیں گے۔ اگر ایسا ہو تو پھر بہت ہی زیادہ مایوسی ہو گی کہ اتنے قریب آ کر بھی ان سے ملاقات کی صورت نہیں نکل سکی۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ نہ جانے وہ ان تین سال میں کیا ہو گئے ہوں گے۔ موٹے ہوئے ہیں یا پہلے کی طرح دُبلے پتلے ہی ہیں۔ جرمن زبان تو یقیناً انھوں نے خوب سیکھ لی ہو گی۔ ذریعۂ تعلیم ہونے کے علاوہ عام بول چال میں اس کے سوا اور کون سی زبان بولی جاتی ہو گی۔ جرمن زبان سیکھنا ان کی تعلیم کا جز ہے۔ کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کی تیاری اس کے علاوہ ہے بلکہ اصل تعلیم یہی ہے۔ میں نے دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب کرے اور وہ جلد وطن واپس آ کر ہمدرد کراچی میں دوا سازی کا پورا شعبہ سنبھال لیں۔ ان میں کام کی صلاحیتیں تو پہلے بھی تھیں، مگر اب ان میں طاق ہو گئے ہوں گے۔ انھیں ہمدرد دواخانے سے اتنی محبت ہے کہ انھوں نے اس لفظ کو اپنے نام کا جزو بنا لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایم۔ ای ہمدرد کہلواتے ہیں۔ بون میں بھی ان کے جاننے والے اس حقیقت سے کم واقف ہوں گے کہ ان کے نام میں ایم ای محبوب الٰہی کے ابتدائی حروف ہیں اور دراصل یہی ان کا نام ہے۔

جمال قدوائی صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر مالک صاحب سفیر پاکستان نے سیبا کمپنی دیکھنے کا معاملہ طے کرا دیا ہے اور وہاں پہنچ کر ہم اسے ضرور دیکھ سکیں گے۔ معلوم ہوا کہ کوئی مرشد صاحب سفارت خانۂ پاکستان میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے قدوائی صاحب کو بتایا تھا۔ میں نے مرشد صاحب کو ٹیلی فون کر کے دوسرے دن ۱۰½ بجے دفتر میں ان سے ملاقات کے لیے وقت مقرر کر لیا تھا۔

آج ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ شریف الحسن صاحب بحیثیت پریس اتاشی یہاں موجود ہیں۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا تھا کہ وہ واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے میں متعین ہیں۔ ان سے بھی کل ملاقات کرنی ہے۔ وہ بھی دہلی کے رہنے والے ہیں اور ان سے دیرینہ واقفیت ہے۔ بہت قابل اور مخلص انسان ہیں۔

آج کی یادداشت میں ایک قابلِ ذکر بات رہ گئی اور وہ یہ کہ جب ہم ٹیکسی میں بازار سے گزرتے وقت ایک جگہ ٹھیرے تو ڈرائیور نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اس ملک کے وزیر مالیات ہیں۔ وہ صاحب چھتری ہاتھ میں لیے ایک خاتون کے ہمراہ پیدل چلے جا رہے تھے۔ بھیڑ بھاڑ میں ان کو ذرا مشکل سے راستہ بنانا پڑتا تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ انھیں دیکھ کر لوگ احتراماً سلام کرتے تھے، اور وہ جھک کر جواب دیتے جاتے تھے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ اس ملک میں صدر مملکت اور کابینہ کے وزرا ذرا بھی کر و فر نہیں دکھلاتے، جو ہم اپنے ملک میں دیکھتے ہیں کہ صدر یا وزیر اعظم کی کار کسی راستے سے گزرنے والی ہوئی تو آدھ گھنٹے پہلے راستوں پر آمد و رفت بند کرا دی۔ یہاں وزرا عام آدمیوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ آسمانی مخلوق میں اپنا شمار نہیں کراتے۔ صدر حکومت کی گاڑی پر نہ تو پرچم لہراتا ہے اور نہ آگے پیچھے حفاظتی دستے موٹر سائیکلوں اور موٹر گاڑیوں میں گزرتے ہیں۔ نہ سپاہی سیٹیاں بجاتے ہیں، نہ راستے مسدود ہوتے ہیں۔ یہ چیز یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ یہاں صحیح معنوں میں جمہوریت قائم ہے۔ ملک کے ہر باشندے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی لیے ہر تحریک یا تجویز کو منظور کرانے، یا قانون کو نافذ کرنے سے پہلے استصواب رائے کر لیا جاتا ہے۔ یہاں "کنٹرولڈ ڈیموکریسی" کا سکہ نہیں چلتا۔

---

۱۶ ستمبر ۱۹۵۶ء —— اتوار

برن میں

برن میں ایسی کوئی خاص چیز تو نہیں ہے جسے دیکھا جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، مگر ایک تو یہ ملک کا صدر مقام ہے۔ تمام سفارتی دفاتر یہاں قائم ہیں۔ یہیں حکومت کی پالیسیاں روایات کے سانچے میں ڈھلتی ہیں اور ملک کے مستقبل کا ہر عنصر یہیں تشکیل پاتا ہے اور دوسرے یہ کہ یہاں بے پناہ سکون ہے۔ جنیوا کے ہنگامے اور زیوریخ کے شور یہاں نہیں ہیں۔ بھاگ دوڑ نہیں ہے۔ معمول کے مطابق لوگ اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے ہیں۔ گویا ہموار میدان میں بہنے والے دریا کی طرح زندگی تلاطم سے مبرا ہے۔ سوئزرلینڈ میں برن تیسرے درجے کا شہر ہے۔ آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے بھی کم ہے۔ یا لوگ زیادہ تر خانہ نشین ہیں۔ سڑکوں پر بہت کم نظر آتے ہیں "سائٹ سی اِنگ" کے لیے یہاں کوئی دلچسپ چیز نہیں ہے۔ اسی لیے شاید سیاح ادھر کا رُخ کم کرتے ہیں مگر ہم جیسے سیلانی تو برن آئے بغیر نہیں رہ سکے۔

پاکستانی سفارت خانے کے مرشد: ۱۰ بجے سب سے پہلے پاکستانی سفارت خانے پہنچے۔ اتوار کے باوجود جانا پڑا، کیونکہ وقت مقرر ہو چکا تھا۔ اس لیے یقین تھا کہ وہاں چھٹی نہیں ہوگی یا کم سے کم مرشد صاحب ضرور ملیں گے۔ ہوٹل والے نے جو پتہ لکھوایا تھا، اس پر وہاں پہنچ کر محسوس ہوا کہ ہم غلط جگہ آگئے ہیں۔ یہ سفارت خانہ نہیں ہے، بلکہ گھر ہے کسی کا۔ میں نے یہاں گھنٹی بھی نہیں بجائی۔ ڈرائیور سے کہا کہ گائڈ بک نکال کر دیکھو۔ اتفاق سے اس میں صحیح پتہ مل گیا اور اس طرح ہم سفارت خانے پہنچ ہی گئے۔

وہاں جناب مرشد مع اپنے عملے کے موجود تھے اور کام کر رہے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ لیکن تعارف تفصیل کے ساتھ ہوا۔ وہ کراچی میں رہتے ہوئے وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سکریٹری تھے اور اب لندن سے تبدیل ہو کر یہاں آئے ہیں اور بحیثیت کاؤنسلر متعین ہیں۔ بنگال ان کا وطن ہے، اور جناب محترم ابوالقاسم فضل الحق گورنر مشرقی پاکستان کے عزیز ہیں۔

یہ کوئی آئی سی ایس قسم کے بزرگ نہیں ہیں۔ سیدھے سادے آدمی ہیں اور بلاشبہ خوب ہیں بڑے تپاک سے ملے اور فوراً ہمارا فائل منگوایا کہ اب تک کیا کیا ہوا ہے۔ فائل دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا

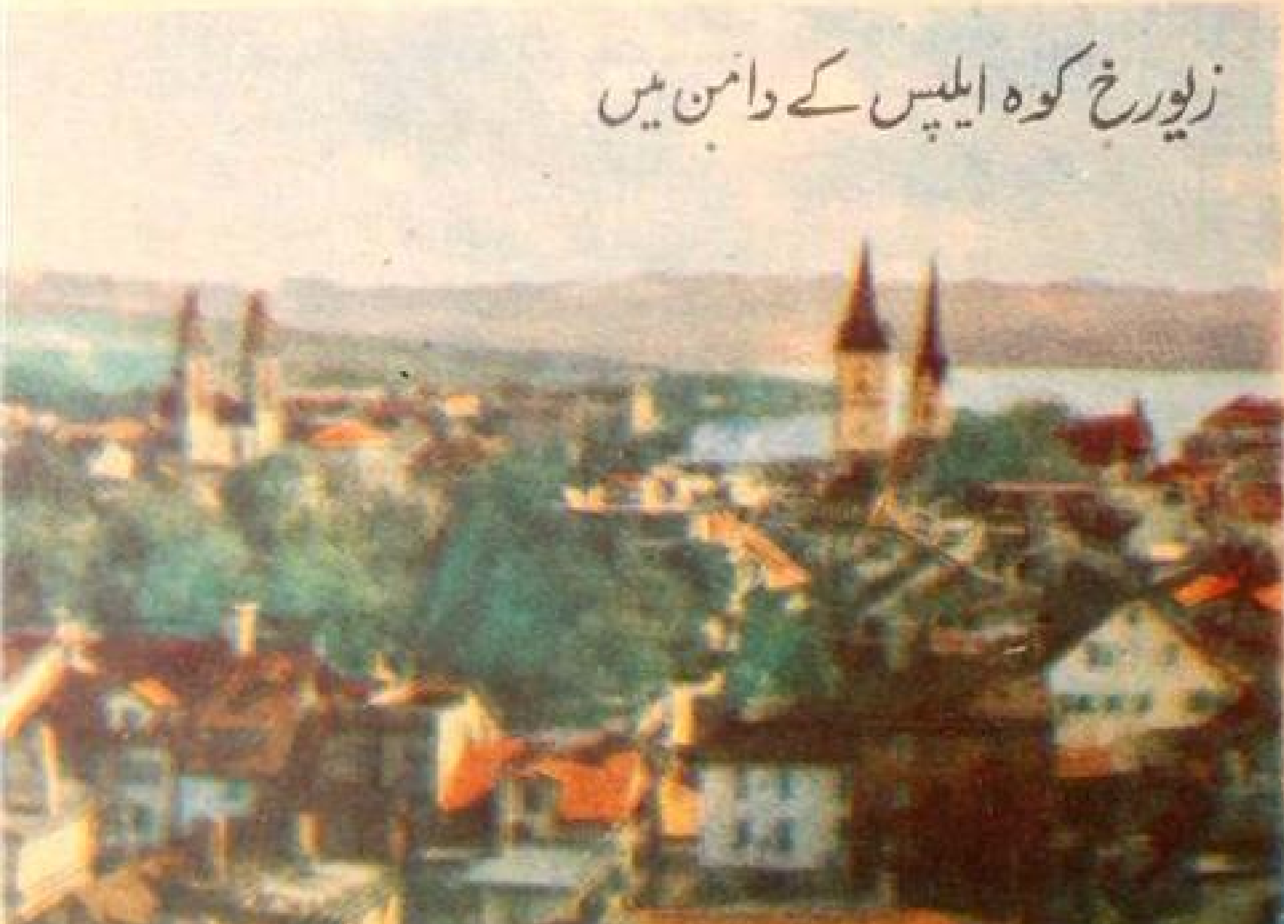


برن کوہ منسٹر کے دامن میں









زیورخ کوہ ایلپس کے دامن میں

کہ ویانا سے ۳ ستمبر کو جو خط میں نے لکھا تھا، اس کی بنیاد پر انھوں نے سینڈوز اور سیبا کمپنیوں کو خط لکھ دیے تھے۔ سینڈوز کا جواب آچکا تھا، لیکن سیبا نے ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ مرشد صاحب نے اس خط کی نقل مجھے دے دی جو سفارت خانے نے سیبا کو لکھا تھا۔ سینڈوز کا پتہ اور فون نمبر لکھ دیا تاکہ ہمیں سہولت ہو جائے۔

میں نے دریافت کیا "جناب آج اتوار ہے اور آپ کے دفتر میں کام ہو رہا ہے۔ یہ کیا صورت ہے؟"

مرشد صاحب نے بتایا کہ آج کل کام ذرا زیادہ ہے، اس لیے آج اسے نمٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے سفارت خانے کے کام کے انداز پر کوئی گفتگو نہیں کی کیوں کہ یہ میری حدود سے باہر ہے اور نہ مجھے اس سے دلچسپی ہے۔ البتہ میں یہ جاننا ضرور چاہتا تھا کہ زیادہ کام کیوں ہے اور اس ملک میں یہ دفتر کیا کیا خدمات انجام دیتا ہے۔

ہمارے سفارت خانے کی عمارت بہت اچھی ہے اور دفاتر بڑے سلیقے کے ہیں۔ اب تک میں نے جتنے بھی ایشیائی سفارت خانے دیکھے تھے، ان میں اور اس سفارت خانے میں بڑا فرق پایا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ مجھے ان سفارت خانوں سے بہت کم مدد ملی ہے مگر یہ سفارت خانہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدد کے لیے آمادہ ہے بلکہ ہم مدد نہ لیں تو اسے شکایت ہوگی۔ مرشد صاحب سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے نہایت اچھا سلوک کیا۔ مجھے برن میں ہر قسم کی مدد دینے کے لیے کہا بلکہ فرانس اور ہالینڈ کے سفارت خانوں کو تعارفی خطوط فوراً لکھوائے اور ٹائپ کرا کے میرے حوالے کر دیے اور پھر بھی یہی کہتے رہے کہ لندن میں ڈپٹی ہائی کمشنر اقبال اطہر صاحب کو خط لکھوا دوں، اسپین میں خط لکھوا دوں۔ لیکن ہم نے صرف ہالینڈ اور فرانس کے لیے خطوط کو کافی سمجھا۔ باقی کے لیے انھیں تکلیف دینی نہیں چاہی۔ لیکن انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کام نامکمل رہ گیا ہے۔

وہ بہت اچھے آدمی ثابت ہوئے اور انکی وجہ سے یہ سفارت خانہ اپنے ملک والوں کے لیے ضرور مفید ثابت ہوگا۔ ان سفارت خانوں کا یہاں ذکر نہیں ہے جو ریٹائرڈ اور پنشن یافتہ لوگوں کی زیر نگرانی چل رہے ہیں یا ایسے لوگ متعین ہیں، جن کو جان بوجھ کر میدانِ سیاست سے ہٹانے کے لیے "ملک بدر" کر دیا گیا ہے۔

یہ عجیب بات معلوم ہوئی کہ دعوتوں میں بالعموم خواتین کو یہاں مدعو نہیں کیا جاتا۔ حکومت کی اور خاص ضیافتوں میں عورتیں بالکل نہیں بلائی جاتیں۔ میں حیران تھا کہ یہ تو یورپ ہے۔

یہاں یہ "پردہ" کیوں ہمارے ہاں تو عورتیں پردہ اٹھا کر مردوں سے دو قدم آگے چل رہی ہیں اور پھر بھی کہتی ہیں کہ نسوانی حقوق کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ خدا جانے وہ کس منزل پر پہنچنا چاہتی ہیں۔

سوئٹزرلینڈ میں بالعموم شراب زیادہ بنتی ہے اور خوب پی جاتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ فرانس اور اٹلی کے بعد تیسرا نمبر سوئٹزرلینڈ کا ہے۔ ہم نے اپنے ملک میں دیکھا ہے کہ بعض لوگ آم کے باغات بڑے ذوق و شوق سے لگاتے ہیں اور نئے آم پیدا کرنے کے تجربے کرتے ہیں۔ پھر اپنے پھل دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔ شراب کے بارے میں یہی حال سوئٹزرلینڈ کا ہے۔ یہاں گھر گھر شراب بنتی ہے اور ہر شہر اپنی شراب میں کوئی خصوصیت پیدا کرتا ہے اور اس پر ناز کرتا ہے۔

ڈاکٹر ہیسگ سے ملاقات: ابھی ہم پاکستان کے سفارت خانے ہی میں تھے کہ ڈاکٹر ہیسگ کا ٹیلی فون آگیا۔ وہ دس منٹ میں ہم سے ملنے کے لیے وہیں آ رہے تھے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے جنیوا میں صلیبِ احمر کا دفتر دیکھتے وقت بون کے بلڈ ٹرانس فیوژن سنٹر دیکھنے کے لیے دل چسپی ظاہر کی تھی۔ چنانچہ سلسلہ یہاں تک ملتا چلا گیا۔ سفارت خانے میں ہم کو بتایا گیا کہ کل سہ پہر کو ڈاکٹر ہن ری ہماری تلاش میں تھے۔ آج وہ کہیں مصروف ہیں۔ اس لیے انھوں نے ڈاکٹر ہیسگ کو ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے۔ وہ ہمیں یہ مرکز دکھائیں گے

بلڈ پلازما وغیرہ بنانے کا یہ ادارہ سوئٹزرلینڈ میں صلیبِ احمر کے تحت کام کر رہا ہے اور یقیناً ایک اہم مرکز ہے۔ ان کا طریقۂ کار یہ ہے کہ عطیے کا خون جگہ جگہ سے جمع ہو کر یہاں آتا ہے اور یہاں کیفیت کے مطابق اس کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ نقل الدم کے لیے اسے تیار کیا جاتا ہے۔ بوتلوں میں پیک ہوتا ہے۔ سب سے اہم چیز بتانے کی یہ ہے کہ یہ حضرت دل چسپی لینے والوں کے ساتھ کس درجہ دل چسپی لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ہن ری صلیبِ احمر کے اسپتال سے وابستہ ہیں اور انھوں نے کل سہ پہر کو ہمارا انتظار کیا تھا لیکن ہمیں خبر نہیں تھی اور جب ہم نہیں ملے تو پاکستانی سفارت خانے کے پریس اتاشی جناب شریف الحسن صاحب سے ملے اور ہمیں دریافت کیا اور اس کے بعد انھوں نے سینٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہیسگ کو مقرر کر دیا کہ وہ ہم کو ڈھونڈھیں اتوار کے باوجود اور جب کہ وہ مرکز بند بھی تھا انھوں نے ہمیں ڈھونڈھ نکالا اور ادارہ کھلوا کر اس کا ایک ایک شعبہ خود ہمیں دکھایا۔ ہم ان کی اس دل چسپی سے بے حد متاثر ہوئے۔ دراصل کام اسی طرح کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہم ڈاکٹر ہیسگ کے کمرہ میں گئے تو اسے بہت زیادہ سادہ پایا۔ انھوں نے خود کہا کہ بجائے اس کے کہ ہم اعلیٰ قسم کا فرنیچر رکھیں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ایسا فریز کا بہتر سے بہتر سامان اپنے ہاں جمع کریں۔ مجھے ان کی یہ بات

بہت اچھی معلوم ہوئی۔ انھوں نے ہمارے لباس کی تعریف کی کیونکہ ہم مشرقی انداز میں ملبوس تھے۔ شیروانی، سیدھا پاجامہ —— انھوں نے کہا کہ میں نے بہت سے پاکستانیوں کو بالکل مغربی انداز میں دیکھا ہے لیکن اپنی روایات کو قائم رکھنا اور غیر ملکوں میں جاکر بھی ان کا احترام کرنا بہت بڑی بات ہے۔ ہمیں اُن کا یہ ریمارک بہت اچھا معلوم ہوا۔

½۱۲ بجے ہم یہاں سے فارغ ہو کر جمال قدوائی صاحب کی قیام گاہ پر گئے اور ان کے ہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد قدوائی صاحب نے ہمیں دریا کی سیر کرائی۔ آج سورج چمک رہا تھا، اور اتوار کا دن تھا، اس لیے دریا کے کنارے سیلانیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ عورتیں اور مرد، بچے اور بوڑھے گویا سب گھروں سے نکل کر دریا پر آگئے تھے۔ کوئی تیر رہا تھا، کوئی ٹہل رہا تھا۔ کچھ لوگ ریستوراں میں بیٹھے تھے اور بہت سے لوگ چڑیا گھر کے جانوروں سے دل چسپی لے رہے تھے اس چڑیا گھر میں بھی ایسا کوئی جانور نظر نہ آیا جو ہمارے لیے نیا ہوتا

غرض یہ دریا کا کنارا عجیب تھا۔ دہلی کے اوکھلے سے بھی بڑی چیز تھی۔ کوئی تین میل پیدل چلنے کے بعد ہم اور قدوائی صاحب ہوٹل آگئے اور یہاں قدوائی صاحب نے ہمیں خدا حافظ کہہ دیا۔

سفارت خانے میں میاں محبوب الٰہی کے دو خط بون سے آئے تھے۔ ان کو غور سے پڑھا۔ انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ ہائیڈل برگ میں بھلا کیا رکھا ہے۔ ہمیں میونخ آنا چاہیے، مگر ہم نے اندازہ لگایا کہ پروگرام کی اس تبدیلی سے الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ نقشہ سامنے رکھا تو یہی فیصلہ کیا کہ پروگرام تبدیل نہ کیا جائے۔ لہٰذا میاں محبوب کو کسی قسم کی اطلاع یا جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا۔

یہاں کے ہوٹل والے سے میں نے امریکن ٹریولر چک، ایک پونڈ کا بھنایا اس نے صرف ۱۰ فرانک دیئے۔ حالانکہ ۱۱ فرانک ۵۰ سنٹ دینے چاہیے تھے۔ اس کی یہ زیادتی مجھے بہت بری معلوم ہوئی۔ غالباً اس نے وقت سے فائدہ اٹھایا تھا کہ آج اتوار کی وجہ سے امریکن ایکسپریس کا دفتر بھی بند تھا، ورنہ میں وہی کرتا جو جنیوا میں کیا تھا اور اس ہوٹل والے کو بھی رقم واپس کر کے چک لے لیتا۔ صبر شکر کر کے ۱۰ فرانک رکھ لیے ½۱ فرانک کا گھاٹا اٹھایا۔ گویا پاکستانی ۱ روپے ۱۱ آنے کم ملے۔

ہوٹل کے پیچھے ہی ریلوے اسٹیشن ہے۔ ہم ½۶ بجے پیدل اسٹیشن پہنچ گئے، کیونکہ امریکن ایکسپریس کا آدمی نہیں آیا تھا اور سامان پہنچوانے کا ذمہ ہوٹل والوں نے لے لیا تھا۔ تاہم جب گاڑی میں بیٹھ گئے تو کمپنی کا آدمی بھاگا ہوا آیا اور بہت ہی جھک کر معذرت چاہی۔ غنیمت ہے کہ اسے احساس تو تھا، ہم نے بھی کوئی شکایت نہیں کی۔

گاڑی ۸ بجکر ۲۴ منٹ پر بازل پہنچی تھی مگر وہ یہاں سے ۱۱ منٹ لیٹ روانہ ہوئی۔

۱۷ ستمبر ۶۵۶

شہر دوا سازی ــــ بازل میں

بازل میں دل چسپی کی کافی چیزیں ہیں لیکن اگر اسے "دوا سازی کا شہر" کہا جائے تو بے جا نہیں کہ یہاں سیبا، سینڈوز، لاروش اور گائگی، دنیا کی چار مشہور دوا ساز کمپنیاں ہیں اور سچ یہ ہے کہ بازل میں ہم انھی کو دیکھنے آئے ہیں۔ سینڈوز کے بارے میں تو اطمینان تھا کہ اسے دیکھنے کا انتظام سفارت خانہ پاکستان کے جناب مرشد صاحب نے کر دیا تھا، باقی کے بارے میں طے کرنا تھا۔ چناں چہ ناشتے سے جلد تر فارغ ہو کر میں نے ٹیلی فون سنبھال لیا اور ایک ایک کر کے سب سے وقت طے کر لیا۔ گائگی کو چھوڑ دیا کہ ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔

ہوٹل کے منیجر صاحب نے ہمارے لیے ایک بڑی شاندار موٹر منگوا دی اور ہم اس میں سب سے پہلے "سیبا" پہنچ گئے۔ یہاں ڈاکٹر جان اربن نے ہمارا استقبال کیا اور ہم ان کے ساتھ ڈاکٹر تے ننگر صاحب کے ہاں پہنچ گئے جو پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ کے علاقے کی تجارت کے نگراں ہیں۔ ان دونوں سے خاصی مفصل گفتگو ہوئی۔ طبِ مشرقی جس کے ہم حامل ہیں، اس کا ذکر آیا اور میں نے ان کو اس کے بارے میں بتایا۔ میں نے یہ بھی راز نہیں رکھا کہ ہم خود دوا ساز بھی ہیں اور سیبا کی فیکٹری اس لیے بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ کچھ مفید چیزیں اخذ کر سکیں۔ مجھے تعجب ہے کہ اس کے باوجود انھوں نے پوری فراخ دلی سے اور ہماری منشا کے عین مطابق اپنی فیکٹری کا حصہ حصہ دکھایا۔ سیبا میں کم و بیش پانچ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ لنچ کا وقت ہو گیا۔ ڈاکٹر تے ننگر صاحب نے کھانے پر اصرار کیا مگر ہم ان کا دلی شکریہ ادا کر کے اپنے ہوٹل آ گئے۔ چلتے وقت میں نے ڈاکٹر اربن کو جنھوں نے فیکٹری دکھائی، ہاتھی دانت کا ایک سگریٹ ہولڈر پیش کیا، جسے انھوں نے بخوشی قبول کیا۔

لنچ کے فوراً بعد ہم سینڈوز میں پہنچ گئے۔ یہاں ڈاکٹر رڈولف زوبکی اور ڈاکٹر ٹی۔ لے شنزل ہمارے منتظر تھے۔ ان دونوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم ان کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھے اور ڈاکٹر زوبکی ہمیں سینڈوز لیبوریٹریز دکھانے کے لیے لے چلے۔ ہم نے جو جو شعبے دیکھنے کی خواہش کی انھوں نے بلا تردد دکھائے اور خاصی تفصیل کے ساتھ۔ ان کا کام بہت صاف ستھرا ہے۔ بالخصوص کیلسیم کے امپولز جس شعبے میں تیار ہوتے ہیں وہ ان کی خصوصیت ہے۔ ۴ بجے تک ہم سینڈوز میں رہے۔ آخر میں جب ڈاکٹر شنزل صاحب کے پاس آئے تو انھوں نے ہمیں ایک ایک کتاب "سوئزرلینڈ" پر تحفتہً دی۔

واپسی کے لیے انھوں نے اپنی موٹر ہمیں دی جس میں بیٹھ کر ہم لاروش پہنچ گئے۔ یہاں ڈاکٹر رنگز صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شکایت کی کہ ہم نے ان کے لیے وقت کم اور تنگ رکھا ہے۔ ڈاکٹر رنگز نے ہمیں ڈاکٹر پرائٹز سے ملایا جو نگرانِ ادارہ ہیں۔ ہمدرد دہلی کا ان سے ایک تعلق یہ ہے کہ ہمدرد دہلی لاروش کی ساختہ حیاتین اپنی دوا سازی میں استعمال کرتا ہے۔ جب اس قسم کا تعارف ہوا تو حالات مختلف ہو گئے اور فیکٹری بند ہو جانے کے باوجود بھی ہم حیاتین سازی کے ہر ہر شعبے کو دیکھتے رہے اور سمجھتے رہے۔ ہر حیاتین کی تیاری کے لیے الگ الگ مگر بڑے عظیم الشان شعبے ہیں اور بڑی پیچیدہ مشینری ہے۔

اتنی دیر ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر پرائٹز کو سیدھے ڈنر پر جانا پڑا۔ انھوں نے ہم سے ڈنر کے لیے شدید اصرار کیا مگر بھائی جان محترم نے اسے مناسب سمجھا کہ ہوٹل پہنچ کر تازہ دم ہو جائیں اور اپنے ہی ہوٹل میں کھانا کھائیں۔ ڈاکٹر پرائٹز خود ہمیں ہوٹل پہنچا گئے۔

رات کو جب ہم نے دن کی کارکردگی کا جائزہ لیا اندازہ ہوا کہ دوا سازی کے بارے میں ہم نے آج کافی سیکھا ہے۔

اشاریہ
(انڈکس)

(ی)

یورپ نامہ

"یورپ نامہ" کا حصّہ اول آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اِس کے مُطالعہ کے بعد کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اظہارِ خیال فرمائیں اور اپنی رائے سے مصنف کو مطلع فرمائیں۔

"یورپ نامہ" کا آئندہ پروگرام مندرجہ ذیل ہے۔ اس کے مُطابق تیاری جاری ہے اور جلد ہی یہ حصے پیش کیے جاتے رہیں گے۔

یورپ نامہ حِصّہ دوم : جرمنی اور ہالینڈ کے حالاتِ سفر پر مشتمل ہوگا
یورپ نامہ حِصّہ سوم : انگلینڈ اور فرانس کے حالاتِ سفر پر مشتمل ہوگا
یورپ نامہ حِصّہ چہارم : اسپین کے حالاتِ سفر پر مشتمل ہوگا۔
یورپ نامہ حِصّہ پنجم : اٹلی اور یونان کے حالاتِ سفر پر مشتمل ہوگا

ہمدرد اکیڈمی نیو ٹاؤن۔ کراچی۵

مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی

۴۹۶